خاموشِ وفا

خان آصف

پیش لفظ

محبت کی عظیم یادگار ''تاج محل'' آج بھی اپنی خوب صورتیوں اور رعنائیوں کے سبب اہلِ دل کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ اگرچہ وقت اور فضائی آلودگی نے اس کی تابناکی کو متاثر کیا ہے مگر پھر بھی اسلامی فنِ تعمیر کا یہ اعلیٰ ترین نمونہ اپنی مثال آپ ہے۔ دنیا بھر کے لوگ اس سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی عمارت کو دیکھنے آتے ہیں جو آج بھی پوری شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ ایستادہ ہے۔

محبت کی یہ نشانی مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے اپنی محبوب بیوی ''ممتاز محل'' کے لئے تعمیر کرائی تھی۔ شاہ جہاں اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ شاید ہی کسی مغل شہنشاہ نے اتنی محبت کی ہو۔ یہ ناول ''خاموش وفا'' دراصل اُسی مغل بادشاہ کی داستانِ حیات ہے، جس نے عہدِ وفا نبھایا اور اہلِ وفا میں جس کا شمار ہوا۔ جو شہزادہ خرم سے شاہ جہاں بنا۔

اس ناول کو میرے والد صاحب نے 1989ء میں اخبارِ جہاں میں لکھا اور ان بکھرے ہوئے اوراق کو سمیٹ کر کتابی شکل میں لانے کا سہرا القریش پبلی کیشنز کو جاتا ہے۔

یہ خوب صورت ناول صرف محبت کے عہد و پیمان یا جذباتیت پر مبنی نہیں بلکہ اس میں قاری کو مغل شہنشاہ جہانگیر سے لے کر شاہ جہاں کے حالاتِ زندگی اور مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال جیسے حساس موضوعات بھی ملیں گے۔ اس ناول کا اندازِ بیاں اس قدر دلچسپ، خوب صورت اور جامع ہے کہ کسی موڑ پر بھی قاری کا انہماک نہیں ٹوٹے گا۔ اتنی مفصل اور عرق ریزی سے اس داستانِ مغلیہ کو پیش کرنا بلاشبہ ان کا ہی وصف ہے۔ میں اُمید کرتی ہوں کہ ان کی دیگر تصانیف کی طرح اس تحریر کو بھی آپ کی پذیرائی حاصل ہوگی۔

اسماء خان آصف

لال قلعہ آگرہ کے شاہی محل سے کچھ فاصلے پر ایک اور خوب صورت مکان ہے، جس کے ایک آراستہ کمرے میں ایک تیرہ سالہ حسین دوشیزہ محوِ خواب ہے۔ اس لڑکی نے ابھی جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا ہے۔ یہ عمر ایسی نہیں ہوتی کہ انسانی جذبات برانگیختہ ہو جائیں۔ مگر شاہی محل کی رنگین فضاؤں نے دوشیزہ کی اُمنگوں اور آرزوؤں کو وقت سے پہلے بیدار کر دیا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کی حُسن پرستی اور کیف و نشاط کی مجلسوں نے قلعے میں رہنے والے ہر شخص کو رنگین خواب دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے۔

وہ دوشیزہ بھی ماحول کے زیرِ اثر کئی دن سے مسلسل ایک ہی خواب دیکھ رہی ہے۔

تا حدِ نظر نرم و نازک پودوں کی طویل قطاریں ہیں، رنگا رنگ پھول، نسیمِ صبا کے جھونکوں سے سرشار ہو کر شاخوں پر جھوم رہے ہیں، نئی نئی کلیاں چٹک رہی ہیں اور ان پر ہلکی ہلکی بارش کی پھوار پڑ رہی ہے۔ تتلیاں انجانی زبان میں پھولوں کو نغمے سنا رہی ہیں اور بھنورے کلیوں سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ دوشیزہ، چمن کی روشوں سے بے حجابانہ گزر رہی ہے۔ دفعتہً ایک جگہ وہ جھجک کر رک جاتی ہے۔ پھولوں کے عقب سے دو انسانی آنکھیں اُبھرتی ہیں اور اس کے رخساروں پر نقش ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دوشیزہ ان نامحرم آنکھوں کو اتنے قریب پا کر بارِ حیا سے سمٹ جاتی ہے۔ اور پھر خوف سے گھبرا کر اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس کا پورا بدن پسینے سے شرابور ہے۔ وہ شدید پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ کمرے کی فضا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہر چیز اپنی جگہ موجود ہے، نیلگوں فانوس کی مدھم روشنی خواب کا سا سماں پیدا کر رہی ہے۔ مگر دوشیزہ کی نیند اُڑ چکی ہے اور وہی خوب صورت آنکھیں خواب گاہ میں بھی اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔

پھر وہ آنکھیں ہمہ وقت لڑکی کا پیچھا کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ وہ کم سن دوشیزہ ان آنکھوں کے سحر میں مبتلا ہو کر پریشان سی رہنے لگی۔ ماں باپ نے بیٹی کی اُداسی کا سبب پوچھا تو اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اپنے راز پر گہرا پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر ملازمہ ماہ رخ کی آنکھوں سے یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکا۔

ماہ رخ نے دوشیزہ سے انتہائی رازداری کے لہجے میں کہا۔ ”بی بی! میں تمہاری ہمدرد ہوں، مجھ سے دل کی بات کہہ ڈالو۔ میری آنکھیں تمہارے چہرے پر کوئی اور ہی تحریر پڑھ رہی ہیں۔“

آنکھوں کے ذکر پر دوشیزہ چونکی اُٹھی.....اور پھر رونے لگی۔

ماہ رخ نے آگے بڑھ کر اپنے آنچل سے اس دوشیزہ کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

''میری وفاداریوں پر یقین کرو، بی بی! میں تمہیں آخری سانس تک مایوس نہیں کروں گی۔ تمہارے باپ کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں۔''

ماہ رخ کا لہجہ اس قدر جذباتی اور پُر جوش تھا کہ وہ دوشیزہ پگھل گئی اور اس نے اپنی ملازمہ کو ان آنکھوں کے بارے میں بتا دیا، جو سوتے جاگتے اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ وہ آنکھیں مغل شہزادے خرم (شاہ جہاں) کی آنکھیں تھیں۔ کشادہ، روشن اور بھورے رنگ کی آنکھیں جن کی پتلیاں سیاہ تھیں۔

ماہ رخ اچانک اُداس اور پریشان سی نظر آنے لگی۔

دوشیزہ اپنی ملازمہ کی یہ بدلی ہوئی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ ''کیا میں نے کوئی گناہ کر دیا ہے؟'' دوشیزہ کی آواز لرز گئی تھی۔

ماہ رخ کھوئے کھوئے انداز میں اپنی آقا زادی کے دلکش چہرے کو دیکھنے لگی جس کی رنگت اُڑی اُڑی سی نظر آ رہی تھی۔

''تم خاموش کیوں ہو ماہ رُخ؟'' دوشیزہ نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔

ماہ رُخ نے خیالوں کی دنیا سے نکلتے ہوئے چونک کر جواب دیا۔ ''نہیں بی بی! ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ تمہارا یہ فعل گناہ ہے یا کچھ اور۔''

دوشیزہ کے چہرے پر وحشتوں کے گہرے رنگ نمایاں ہو گئے تھے۔

ماہ رخ نے ایک مختصر سے سکوت کے بعد دوبارہ کہا۔ ''مگر تم نے ان آنکھوں کو کہاں دیکھا ہے؟''

''گزشتہ دنوں۔ شہنشاہ جہانگیر کی تخت نشینی کے موقع پر جب سترہ دن تک جشنِ نوروز منایا گیا تھا۔'' دوشیزہ رک رک کر بول رہی تھی۔

''کیا ان آنکھوں میں تمہارے لئے بھی کوئی پیغام تھا؟'' ماہ رخ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

''ان آنکھوں میں مجھ جیسی ایک عام لڑکی کے لئے کیا پیغام ہوگا؟'' دوشیزہ کی آواز بجھی بجھی سی تھی۔ ''وہ تو بڑی بے پروا اور بے نیاز سی آنکھیں ہیں۔''

''پھر ان آنکھوں کے خواب کیوں دیکھ رہی ہو؟'' ماہ رخ نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔'' دوشیزہ بہت بے بس نظر آ رہی تھی۔

''ابھی وقت ہے، مجبوریوں کے حصار سے نکل جاؤ۔ ورنہ اس معصوم سی جان پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔'' ماہ رخ نے اسے سمجھانا چاہا۔

یکایک دوشیزہ کے تیور بدل گئے اور اس کے افسردہ چہرے پر غصے کی جھلک نمایاں ہو گئی۔

''یہ نصیحت تو کوئی شخص بھی کر سکتا ہے، کیا تم اسی لئے میری غم خواری کا دم بھر رہی تھیں؟'' دوشیزہ کا لہجہ اچانک بہت تلخ ہو گیا تھا۔

''نہیں، نہیں.....میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔'' ماہ رخ نے گھبرا کر کہا۔ ''ایک ملازمہ اپنی حدود سے آگے بڑھ گئی تھی، آپ آقا زادی ہیں، جو دل چاہے کریں۔''

دوشیزہ نے محسوس کر لیا تھا کہ ماہ رخ اُس کے خاندانی مرتبے سے ڈر گئی ہے، اس لئے فرار کی راہ اختیار کر رہی ہے۔

''ماہ رخ! وقت کے اس حادثے نے تمہیں میرا رازدار بنا دیا ہے۔'' دوشیزہ نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس بات پر یقین آ جانا چاہئے کہ تم کوئی کنیز نہیں، میری حقیقی غمگسار ہو، تم سے دل کی بات کہہ کر میں کسی قدر سکون محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے مشورہ دو کہ میں کدھر جاؤں؟ اگر وہ آنکھیں اسی طرح میرا تعاقب کرتی رہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔''

''آپ مجھے سوچنے کے لئے ایک رات کی مہلت دیں۔'' ماہ رخ نے جواباً کہا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ کوئی غلط مشورہ میرے آقا کی بیٹی کو تباہ کر ڈالے۔ خدا نہ کرے، اگر ایسی صورتِ حال پیش آ گئی تو میری زندگی جو پہلے ہی ایک عذاب ہے، جیتا جاگتا جہنم بن جائے گی۔''

❀.....❀.....❀

تیرہ سالہ دوشیزہ جو شہزادہ خرم کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی، اس کا نام ارجمند تھا۔ وہ مرزا غیاث بیگ کی پوتی تھی اور غیاث بیگ، اکبر کے دورِ حکومت میں ہندوستان آیا اور ترقی کرتے کرتے اہم عہدے تک پہنچا، پھر معتوب ہو کر نکالا گیا۔ جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے دوبارہ غیاث بیگ کو طلب کیا اور وزیر مال (خزانہ) بنا دیا۔ ارجمند، اعتقاد خان کی بیٹی تھی جو آگے چل کر تاریخ میں آصف خان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے علاوہ ارجمند کو ایک اور اعزاز بھی حاصل تھا کہ وہ ''ہندوستانی قلوپطرہ'' نور جہاں کی حقیقی بھتیجی تھی۔

جب ارجمند، شہزادہ خرم کے عشق میں مبتلا ہوئی، اس وقت نور جہاں کا شوہر شیر افگن مارا جا چکا تھا۔ ہندو مؤرخوں کا خیال ہے کہ شیر افگن کو شہنشاہ جہانگیر کے اشارے پر قتل کیا گیا اور اس قتل کی وجہ عشق کی وہ چنگاریاں تھیں جو نورالدین جہانگیر کے دل میں دوبارہ بھڑک اُٹھی تھیں۔

اس کے برعکس انگریز مؤرخ، جہانگیر کو سازش کے الزام سے بری سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں شیر افگن کی موت ایک حادثاتی موت تھی، جس کا جہانگیر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) اکبر کی زندگی ہی میں نور جہاں کی زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا، پھر جب اکبر کو ولی عہدِ سلطنت کے عشق کا علم ہوا تو اس نے مہرالنساء (نور جہاں) کے باپ، مرزا غیاث الدین کو بلا کر سخت لہجے میں کہا کہ وہ جلد از جلد اپنی بیٹی کی شادی کر دے۔ غیاث الدین نے فوری طور پر علی قلی (شیر افگن) کا انتخاب کیا اور اکبر کی منظوری کے بعد نور جہاں کی شادی کر دی۔ اس وقت اس کا فراد اعورت کی عمر سترہ سال تھی۔ جہانگیر نے اس جذباتی حادثے کو فراموش کر

دیا اور نور جہاں اس کی زندگی سے نکل گئی۔ پھر جب اکبر نے شہزادہ سلیم کو میواڑ کے رانا کے خلاف جنگی مہم پر روانہ کیا تو علی قلی بھی اس کے ساتھ تھا۔ اگر جہانگیر کے دل میں نور جہاں کے شوہر کی طرف سے کوئی حاسدانہ جذبہ موجود ہوتا تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتا اور علی قلی کو جنگ کے دوران بہت آسانی کے ساتھ ٹھکانے لگا دیتا اور جہانگیر کی اس حرکت پر کسی کو سازش کا گمان بھی نہ ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب اسی دوران علی قلی نے اپنی تلوار سے ایک شیر کو ہلاک کیا تو جہانگیر نے اس کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے اسے ''شیر افگن'' کا خطاب دیا۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہانگیر کا دل شیر افگن کی طرف سے آئینے کی طرح صاف تھا۔ لیکن جب شہزادے نے باپ کے خلاف بغاوت کی تو شیر افگن اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شیر افگن کی طرف سے جہانگیر کے دل میں بال آ گیا اور اس کا ذہن غبار آلود ہو گیا۔

پھر جب اکبر کے انتقال کے بعد 3 نومبر 1605ء کو جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے شیر افگن کا قصور معاف کر دیا اور اسے جاگیر دے کر بنگال روانہ کر دیا۔ اس وقت بنگال کے حالات بہت زیادہ غیر تسلی بخش تھے اور افغان، ہندوستان کے گوشے گوشے سے سمٹ کر وہاں جمع ہو رہے تھے تاکہ اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کر سکیں۔

شاہی مخبروں نے فوراً جہانگیر کو خبر دی کہ شیر افگن بھی افغان سرداروں کے ساتھ سازش میں مصروف ہے۔ جہانگیر نے کسی تاخیر کے بغیر بنگال کے گورنر کو حکم دیا کہ وہ شیر افگن کو بلا کر اس معاملے کی تحقیق کرے اور اگر وہ مجرم قرار پائے تو اسے گرفتار کر کے دارالحکومت آگرہ بھیج دیا جائے۔

قطب الدین نے شاہی حکم کے مطابق شیر افگن کو طلب کر لیا۔ شیر افگن کے آتے ہی مسلح محافظوں نے اسے ایک سازشی سمجھ کر چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شیر افگن اپنی یہ توہین برداشت نہ کر سکا اور اس نے مشتعل ہو کر قطب الدین پر حملہ کر دیا۔ مسلح محافظ تیزی سے جھپٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے شیر افگن کو ہلاک کر ڈالا۔

شیر افگن کے قتل کے بعد اس کی بیوی مہر النساء (نور جہاں) اور بیٹی لاڈلی بیگم کو آگرہ بھیج دیا گیا۔ جہانگیر نے نور جہاں کو اپنی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی خدمت پر مامور کر دیا۔

پھر جب ایک جشنِ بہار کے موقع پر جہانگیر نے نور جہاں کو دیکھا تو پرانی یادوں کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے۔ اس وقت نور جہاں کی عمر پینتیس سال تھی۔ مگر وہ آج بھی سولہ سترہ سال کی ایک حسین دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔ اگر نور جہاں کی بیٹی، لاڈلی بیگم کو اس کے برابر کھڑا کر دیا جاتا تو دونوں ہم عمر بہنیں نظر آتیں۔ حُسن کی اس کرشمہ سازی نے جہانگیر کو مسحور کر دیا تھا۔

پھر شاہی محل کے رازداروں نے یہ بات محسوس کر لی کہ جہانگیر ایک بیوہ عورت میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ بیوہ عورت جو اپنی دوشیزگی کے زمانے میں اس کی محبوب رہ چکی تھی۔

❀.....❀.....❀

وہ رات ماہ رخ پر بہت بھاری تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ارجمند کو کیا مشورہ دے؟ اگر ایک معصوم دوشیزہ اسی طرح اپنے سینے میں عشق کو پرورش کرتی رہی تو پھر وہ دن دُور نہیں، جب بے قرار آرزوؤں اور بے چین جذبوں کا یہ آتش فشاں اس کے پورے وجود کو راکھ کا ایک ڈھیر بنا کر رکھ دے گا۔ ماہ رخ نہیں چاہتی تھی کہ زمین کے ایک گوشے میں رہنے والی دوشیزہ آسمان پر چمکنے والے مہتاب کی تمنا کرے۔ ارجمند اور شہزادہ خرم کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل تھی۔

خود ماہ رخ نے بھی ایک دن اسی انداز کا خواب دیکھا تھا۔ اس کی ماں بچپن میں دنیا سے گزر گئی تھی اور باپ، جہانگیر کے محافظ سپاہیوں میں شامل تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد ماہ رخ نے شاہی محل میں پرورش پائی تھی۔ پھر جب وہ جوان ہوئی تو اس کے باپ کو جہانگیر کے دوسرے بیٹے شہزادہ پرویز کا محافظ بنا دیا گیا۔ ماہ رخ انتہائی دلکش نقش و نگار کی لڑکی تھی۔ اسے جو بھی دیکھتا، بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ محل کی رنگین فضاؤں نے ماہ رخ کے مزاج میں بھی شوخیاں بھر دی تھیں۔ اس نے چھپ چھپ کر کئی بار شہزادہ پرویز کو دیکھا اور اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ ماہ رخ، شاہی کنیزوں کی زبانی ایسے بے شمار افسانے سن چکی تھی کہ کس طرح ایک شہزادے کی نظر ایک خادمہ پر پڑی اور پھر ایک دن وہ خادمہ، ملکہ بن گئی۔ اس قسم کی جھوٹی کہانیوں نے ماہ رخ کو گمراہ کر دیا تھا۔ اور پھر وہ خیالوں کی دنیا میں اپنے آپ کو تختِ سلطنت پر جلوہ افروز دیکھنے لگی۔ اس نے کئی مرتبہ خواب میں دیکھا کہ شہزادہ پرویز اسے ہیروں سے مرصع تاج پہنا رہا ہے۔

پھر ایک دن وہ حادثہ پیش آ گیا، جس نے ماہ رخ کی دنیا زیر و زبر کر ڈالی۔

وہ جان بوجھ کر پرویز کے سامنے آ گئی اور مغل شہزادے کی نظریں اس کے دلکش چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

دوسرے روز پرویز نے اس کے باپ کو بلا کر کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنی بیٹی کو ہماری خدمت پر مامور کر دو۔''

''یہ کیسے ممکن ہے شہزادہ عالم!'' ایک انجانے خوف سے ماہ رخ کے باپ کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ''میں آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔''

''اب ہمیں تمہاری خدمت کی ضرورت نہیں۔'' شہزادہ پرویز نے آمرانہ لہجے میں کہا۔ ''تم اسی وقت قصرِ شاہی میں رہ سکتے ہو، جب تمہاری بیٹی ہماری خدمت کے لئے دل و جان سے آمادہ ہو جائے۔ تمہیں یقین کر لینا چاہئے کہ جب ہم ظلِ الٰہی شہنشاہ جہانگیر کے بعد ہندوستان کی تقدیر کے مالک بن جائیں گے، اس وقت تمہاری بیٹی بھی ملکۂ عالیہ کا تاج پہن لے گی۔''

''میں بہت حقیر شخص ہوں شہزادہ عالم!'' ماہ رخ کا باپ، بھکاریوں کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔ ''مجھ پر رحم کیجئے کہ میری بیٹی کسی طرح بھی آپ کے لائق نہیں ہے۔''

''یہ ہم جانتے ہیں کہ یہاں کون، کس قابل ہے؟'' شہزادہ پرویز کی رعونت اپنی جگہ

برقرار تھی۔

"تو پھر مجھے قصرِ شاہی سے نکل جانے کی اجازت دیجئے۔ میں ہندوستان کے کسی بھی ویران گوشے میں سما جاؤں گا۔" غریب سپاہی نے بدمست شہزادے کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

مگر پرویز کے غرور و تکبر کا مظاہرہ کچھ اور شدت اختیار کر گیا۔ "ہماری مرضی کے بغیر قصرِ شاہی میں نہ کوئی داخل ہو سکتا ہے اور نہ یہاں سے باہر جا سکتا ہے۔ اگر تُو کسی طرح یہاں سے فرار بھی ہو گیا تو ہندوستان کی زمین کا کوئی گوشہ تجھے پناہ نہیں دے گا..... اور اگر تُو کسی گمنام جگہ مر کر دفن ہو گیا تو زمین ہمارے خوف سے تیری لاش کو اُگل دے گی۔"

مجبور سپاہی کھڑا ہو گیا۔ اُس کی غیرت بیدار ہو چکی تھی۔ "شہزادہ عالم نے میری ہر درخواست حقارت سے ٹھکرا دی، آپ کو اس کا اختیار ہے کہ دولت و اقتدار کے نشے میں انسان ایسے ہی خدائی دعوے کرتا ہے۔ مگر اتنا اور سن لیجئے کہ میری زندگی میں یہ ممکن نہیں۔ جب ان کاندھوں پر سر باقی نہیں رہے گا تو شاید آپ کی یہ خواہش پوری ہو جائے۔"

"تو پھر اپنے ہاتھوں سے اپنا سر کاٹ دے کہ ایسے بیکار اور بے قیمت سروں کو کاندھوں پر باقی رہنا بھی نہیں چاہئے۔" شہزادہ پرویز نے اپنی تلوار نکالی اور ماہ رخ کے باپ کے سامنے زمین پر پھینک کر چلا گیا۔

اسی رات ایک مجبور مگر غیرت مند سپاہی نے دریائے جمنا میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔ اور ماہ رخ سے کہا گیا کہ اس کا باپ غسل کرنے دریا میں اُترا تھا مگر اتفاق سے وہاں پانی بھی گہرا تھا اور اس کا بہاؤ بھی تیز تھا۔ مزید یہ کہ اسی جگہ بھنور پڑ گیا تھا۔ نتیجتاً وہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ غم سے نڈھال ماہ رخ کئی دن تک یہی سوچتی رہی کہ ایک تیراک فوجی، پانی کے معمولی سے گرداب میں کس طرح ڈوب گیا؟ اب اسے کون بتاتا کہ جسے وہ اپنا محبوب سمجھ رہی ہے، اسی شخص نے اس کے باپ کو خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر کچھ دن بعد ماہ رخ کو شہزادہ پرویز کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ باپ کی موت کا ماتم کرنے کے باوجود وہ بہت خوش تھی کہ اسے اپنے محبوب کی قربت حاصل ہو گئی تھی۔ پرویز نے اسے بہت سنہرے خواب دکھائے۔ ملکۂ عالیہ بننے اور ہندوستان پر حکمرانی کے خواب..... وہ ظاہری طور پر مغل شہزادیوں سے زیادہ حُسن رکھنے والی لڑکی تھی..... مگر اُس کا مقدر شہزادیوں جیسا نہیں تھا۔ انجام کار ماہ رخ، شہزادہ پرویز کے بستر کی ایک بدنما شکن بن کر رہ گئی۔

اور ایک روز اُس پر یہ خوف ناک راز فاش ہو گیا کہ اس سے پہلے بھی شہزادے کے عشرت کدے میں کئی لڑکیاں داخل ہو چکی ہیں۔ آنکھوں میں ملکۂ عالیہ بننے کے خواب سمائے ہوئے..... اور پھر ان سب کی آنکھوں سے وہ خواب چھین لئے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن ان کی زندگیاں ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گئیں۔ ماہ رخ کو بھی اب محسوس ہونے لگا تھا کہ شہزادہ پرویز اُس سے بیزار ہوتا جا رہا ہے۔

اور پھر وہی ہوا، شہزادے نے ایک رات اس سے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ "اب تُو شاہی محل میں اپنے لئے کوئی اور جگہ تلاش کر لے۔ تجھے یہاں عیش و آسائش کی بھرپور رعایت حاصل ہو گی..... اور اگر تُو گھریلو زندگی گزارنا پسند کرے تو تیری شادی کسی سپاہی سے کر دی جائے۔"

جواب میں ماہ رخ نے شہزادہ پرویز کے قدموں کو اپنے آنسوؤں سے بھگو دیا۔ مگر سیاست کے بت، اشکوں کی معمولی حرارت سے نہیں پگھلتے۔

اپنے محبوب کے عشرت قدے سے بچھڑنے کے بعد ماہ رخ کی زندگی ایک عذاب بن گئی۔ وہ کچھ دنوں تک اسی انتظار میں رہی کہ شاید شہزادے کو اپنا کوئی وعدہ یاد آئے اور وہ کسی روز اسے خلوت میں طلب کر کے اپنے جارحانہ سلوک کی معافی مانگے اور اس کے بے جان خوابوں میں نئی روح پھونک دے۔ مگر یہ محض دیوانگی تھی۔ شوریدہ سر اور ناآسودہ تمناؤں کا فریب تھا..... آتشیں انتظار میں ماہ رخ کی راتیں جلتی رہیں..... اور خلشِ درد سے اُس کے دن دھواں دیتے رہے۔

اس دوران ماہ رخ نے ایک بار یہ بھی سوچا کہ وہ شہزادہ پرویز کے عشرت کدے میں داخل ہو جائے اور کسی طرح اسے خنجر سے قتل کر کے بے وفائی کے اس باب کو ہمیشہ کے لئے بند کر دے..... یا پھر شراب کے جام میں زہر ملا کر دیدے۔ (واضح رہے کہ مغل شہزادوں میں شاہ جہاں اور عالمگیر کے علاوہ سب کے سب نوعمری کے زمانے سے شراب پیا کرتے تھے اور بادہ نوشی ایک معاشرتی رسم بن کر رہ گئی تھی) اس خیال کے آتے ہی ماہ رخ لرز کر رہ گئی۔ وہ اپنے محبوب کو کس طرح ہلاک کر سکتی تھی۔ پھر وہ مجبور لڑکی، شہزادہ پرویز کی درازیٔ عمر کی دعائیں کرنے لگتی اور اپنی بدنصیبیوں کا ماتم۔

ماہ رخ کی محبت بہت عجیب تھی۔ محبت کی قربت سے محروم ہوئی تو اس پر رضامند ہو گئی کہ وہ کم سے کم ایک نظر اس شخص کو دیکھ لیا کرے، جس نے کچھ دن پہلے اُسے ملکۂ ہند بننے کے خواب دکھائے تھے۔ ماہ رخ کی یہ حسرت بھی کئی کئی ماہ کے طویل انتظار کے بعد پوری ہوتی تھی۔ شہزادہ پرویز اسے کسی شاہی تقریب میں نظر آ جاتا تھا یا پھر کبھی کبھی محل کی کسی راہ داری سے گزرتے ہوئے۔ وہ بہت دُور سے اپنے محبوب کو دیکھتی اور آنسو بہا کر رہ جاتی۔

پھر جب ماہ رخ نے اندازہ کر لیا کہ شہزادے کو اپنے اس فعل پر کوئی ندامت نہیں ہے بلکہ وہ پہلے سے زیادہ مسرور و مطمئن نظر آ رہا ہے تو اسے اپنی بے مقصد زندگی سے شرم آنے لگی۔ پھر یہ ندامت اس حد تک بڑھی کہ ماہ رخ اپنے باپ کے راستے پر چل پڑی۔ اس نے دریائے جمنا میں کود کر خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر اتفاق سے آصف خان کے ایک سپاہی نے اُسے بچا لیا۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی کہ اسے مر جانے دیں۔ مگر سپاہی یہ کہہ کر اُسے اپنے آقا کے پاس لے آیا۔

"سپاہی صرف دشمنوں کو ہلاک ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے، کسی عام انسان کو نہیں۔"

آصف خان نے ماہ رخ سے کئی سوالات کئے۔ ماہ رخ نے اپنی محرومیوں کی داستان سے

شہزادہ پرویز کے جھوٹے عشق اور بے وفائی کا ذکر حذف کر دیا اور اپنی تنہائی کو اس طرح بیان کیا کہ آصف خان کے دل میں اس کے لئے بے پناہ ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ پھر وہ ارجمند کی ملازمہ کی حیثیت سے آصف خان کے گھر کام کرنے لگی۔ یہاں اسے ماں باپ کی محبت بھی ملی اور ایک چھوٹی بہن کا پیار بھی۔ اہلِ خانہ کے حسنِ سلوک کی وجہ سے دوسرے لوگ اسے آصف خان کے خاندان ہی کا ایک فرد سمجھنے لگے۔

اور خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے اس پر ارجمند کو روکنے کی ذمے داری آپڑی تھی۔ وہ معصوم ارجمند بھی اسی کی طرح تباہی کے راستے پر جا رہی تھی۔ ماہ رخ ساری رات جاگتی رہی اور پھر ایک فیصلہ کر کے پچھلے پہر سو گئی۔

❀.....❀.....❀

ارجمند، ماہ رخ سے بات کرنے کے لئے بہت زیادہ بے چین نظر آ رہی تھی۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی وہ خود ماہ رخ کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ماہ رخ رات زیادہ دیر تک جاگنے کی وجہ سے خلافِ معمول سورج نکلنے کے بعد تک سوتی رہی۔ جب ارجمند نے اُسے اٹھایا تو وہ ندامت کے لہجے میں کہنے لگی۔

''معاف کرنا بی بی! اب تو میری نیندوں پر بھی آپ کا قبضہ ہو گیا۔ رات بھر آپ ہی کے خواب دیکھتی رہی۔''

''تم نے کیا دیکھا ماہ رخ؟'' ارجمند نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

''یہی کہ آپ کو ایسے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔'' ماہ رخ ہر حال میں اپنی آقا زادی کو اس عذاب سے بچانا چاہتی تھی۔ ''تمہارے اور شہزادے خرم کے درمیان بہت فاصلے ہیں۔ میں رات بھر ان فاصلوں کے متعلق غور کرتی رہی ہوں۔ مگر یہ فاصلے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔''

''کیسے فاصلے؟'' ارجمند نے بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا۔

''وہی جو میرے اور آپ کے درمیان حائل ہیں۔'' ماہ رخ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میرے اور تمہارے درمیان تو کوئی فاصلہ نہیں۔'' ارجمند کی سادہ لوحی اسی طرح برقرار تھی۔

''آپ آقا زادی ہیں اور میں ایک ملازمہ۔'' ماہ رخ بہت محتاط ہو کر بول رہی تھی کہ کہیں ارجمند کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ مگر پھر بھی وہ حقائق بیان کرنے پر مجبور تھی۔ ''اگر کوئی ملازم آپ کا رشتہ مانگے تو پھر آپ اسے کیا جواب دیں گی؟ کیا آپ اسے اپنی زندگی کا رفیق بنا لیں گی؟''

ماہ رخ کے سوال پر ارجمند کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اب اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ فاصلہ کسے کہتے ہیں۔ ارجمند نے چند لمحوں میں اس بلند دیوار کو دیکھ لیا تھا، جو اس کے اور شہزادہ خرم کے درمیان سر اُٹھائے کھڑی تھی۔

''آپ کے باپ اور دادا شہزادہ خرم کے باپ شہنشاہ جہانگیر کو اس طرح سلام کرتے ہیں کہ ان دونوں کے سر سجدے کی حالت میں ہوتے ہیں۔''

(شہنشاہ جلال الدین اکبر نے رسمِ سجدہ کی بنیاد ڈالی تھی اور جہانگیر نے بھی اس رسم کو برقرار رکھا تھا۔ بڑے سے بڑا درباری جب شہنشاہ کے حضور پہنچتا تو اسے اپنے حکمراں کو اس طرح سجدہ کرنا پڑتا تھا، جیسے وہ بندگی کی رسم ادا کر رہا ہو۔)

ارجمند کے گلاب جیسے چہرے پر مایوسیوں کا دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔

''میری معصوم آقا زادی! آپ شہنشاہوں کو نہیں جانتیں۔'' ماہ رخ نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے اپنے آپ کو خدائی کے درجے پر فائز کر لیا ہے۔ ان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہم جیسے انسان سجدے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں اور اکثر لوگوں کے سجدے تو قبول بھی نہیں ہوتے۔''

''پھر کیا ہو گا ماہ رخ؟'' یہ کہتے کہتے ارجمند کی غلافی آنکھوں میں آنسو چھلک اُٹھے۔

''منزل تلاش کرنے کے بجائے اسی راستے سے اپنے گھر کی طرف لوٹ آؤ۔'' ماہ رخ نے ارجمند کو ترکِ محبت کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی وقت بھی ہے بی بی! اور تمہارے قدموں میں اتنی طاقت بھی ہے کہ واپس آ سکتی ہو۔''

''نہیں ماہ رخ! میرے قدم جواب دے چکے ہیں۔'' ارجمند واپس جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ ''میں اس راستے پر ہی سفر کروں گی۔ اب مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔''

ماہ رخ گھبرا گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ معصوم سی لڑکی عشق کی رہ گزر پر انتہا تک چلی گئی ہے۔ ماہ رخ نے ارجمند کا دامن پکڑ لیا۔ ''میں آپ کو تنہا جانے نہیں دوں گی۔ آپ شوق سے یہ خواب دیکھیں۔ مگر ہوش مندوں کی طرح۔ اگر آپ کے لئے میری زندگی بھی کام آ جائے تو میں اس قربانی سے گریز نہیں کروں گی۔''

ماہ رخ کی التجا پر ارجمند رک گئی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''پہلے آپ شہزادہ خرم کی آنکھوں میں اپنا مقام تلاش کریں۔'' ماہ رخ نے ارجمند کو دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ کس طرح؟'' ارجمند نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا میں خود ان کے سامنے چلی جاؤں اور اپنے جذبوں کا اظہار کر دوں؟''

''نہیں! اس طرح تم شہزادے کی نظروں سے گر جاؤ گی۔'' ماہ رخ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''پہلے شہزادہ خرم کا سامنا کرو مگر دُور سے، ایک مخصوص فاصلے کے ساتھ۔ پھر یہ دیکھو کہ تمہیں سامنے پا کر تمہارے محبوب کے چہرے پر کیسے رنگ اُبھرتے ہیں۔''

''میں انہیں کیسے دیکھ سکتی ہوں ماہ رخ؟'' یہ کہتے کہتے ارجمند کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ ''یہ آنکھیں تو ان کے رُوبرو اُٹھتی ہی نہیں۔'' ارجمند یکایک بدحواس نظر آنے لگی تھی۔

"پھر اس نگرانی کی خدمت میرے لئے چھوڑ دیجئے۔" ماہ رخ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مگر اُس کی مسکراہٹ میں شگفتگی نہیں تھی۔ ماہ رخ کو یہ باتیں کرتے وقت اپنا محبوب شہزادہ پرویز اور اُس کی بے وفائی یاد آ رہی تھی۔

ارجمند جوشِ جذبات میں ماہ رخ سے لپٹ گئی۔ "تم میری کتنی ہمدرد ہو۔" ارجمند کی آواز میں عجیب سا ارتعاش تھا۔ "خدا کرے کہ تم بھی بہت جلد اپنی منزل سے ہمکنار ہو جاؤ۔ مگر اس کے بعد ہمیں نہ بھول جانا۔" اپنی رازدار کی طرف سے حوصلہ افزا جواب پا کر وہ کسی شرابی کی طرح سرشار نظر آ رہی تھی۔

اب ماہ رخ اپنی آقا زادی کو کیا بتاتی کہ وہ منزل کے قریب جا کر بھی ناکام لوٹ آئی ہے اور محرومیوں کے گرد و غبار میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ شکستہ دل اور ناکام آرزو ہونے کے باوجود وہ ارجمند کی خوشیوں میں شریک ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مگر میں انہیں کہاں دیکھوں گی؟" یکایک ارجمند نے چونک کر پوچھا۔

"کل شہنشاہ جہانگیر تمام شہزادوں، وزیروں اور امیروں کے ساتھ مینا بازار تشریف لائیں گے۔ اسی موقع پر تم ان کی آنکھوں کو دوبارہ دیکھ سکو گی، جن کے طلسم میں تمہارے ہوش و حواس بھی کھو گئے ہیں اور نیندیں بھی۔"

ارجمند رقص کے سے انداز میں واپس چلی گئی۔

اور ماہ رخ بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ دعا کرنے لگی۔

"اے میرے خدا! اس معصوم لڑکی کو میری طرح آتشِ فراق میں نہ جلانا۔ میں تو تیری مفلس و حقیر مخلوق تھی، اس لئے جھلس کر رہ گئی..... مگر یہ امیر زادی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے گی، جل کر خاک ہو جائے گی..... اور پھر یہ خاکِ پریشاں اس کی ذات کو دنیا کی نظروں میں تماشا بنا ڈالے گی۔"

❀.....❀.....❀

جس شہزادے نے ایک حسین دوشیزہ کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی، وہ 5 جنوری 1592ء کو لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ یہ شہزادہ خرم کی پیدائش سے کئی سال پہلے کا واقعہ ہے۔

مغل شہنشاہ، جلال الدین اکبر کی فتوحات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا مگر اُس کی ایک بیوی، سلطان سلیمہ بیگم کی اُداسیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اکبر اپنی اس محبوب بیوی کے عیش و آرام کا بہت خیال رکھتا تھا۔ انتہائی قیمتی لباس اور نایاب زر و جواہر کی کثرت نے سلیمہ بیگم کے ظاہری حُسن کو بڑھا دیا تھا لیکن دل کی دنیا روز بروز ویران ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن خلوت میں سلیمہ بیگم نے اکبر سے کہا۔

"ظلِ الٰہی! اگر خودکشی مذہباً جائز ہوتی تو میں اب تک آپ کا بخشا ہوا کوئی قیمتی ہیرا کھا کر

موت کی گہری نیند سو چکی ہوتی۔"

اکبر، سلیمہ بیگم کے درد سے بخوبی واقف تھا۔ بے اولاد ہونے کا غم اُسے کسی شمع کی مانند لحظہ بہ لحظہ پگھلائے جا رہا تھا۔ اکبر نے اس سلسلے میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے بہترین ویدوں اور حکیموں کو طلب کیا تھا۔ شروع شروع میں ان مایہ ناز معالجوں نے بڑے دعوے کئے تھے، مگر تقدیر کے آگے ان سب کی تدبیروں نے شکستِ فاش کھائی تھی۔ اور پھر ایک دن تمام طبیبوں نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔

"اگر ظلِ الٰہی چاہیں تو ہم سب کے سر قلم کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے اپنے دعوے میں انتہائی جھوٹے ثابت ہوئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر خدا ہی اپنا فیصلہ بدل ڈالے تو ملکۂ عالیہ کے اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ ورنہ طبی تجزیہ کہتا ہے کہ ملکۂ عالیہ قدرتی طور پر بانجھ ہیں اور اس بیماری کا علاج کسی حکیم کے پاس موجود نہیں۔"

یہ سن کر اکبر کا چہرہ بھی اُتر گیا تھا اور اس نے بجھے دل کے ساتھ حکیموں کو انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا تھا۔ پھر جب سلیمہ بیگم کی اُداسیاں حد سے بڑھیں تو شہنشاہ اکبر نے ملک کے نامور نجومیوں کو تنہائی میں طلب کر لیا۔ تمام نجومی اپنی اپنی پوتھیاں (کتابیں وغیرہ) کھول کر بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک کاغذات پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے کے بعد تمام جوتشیوں نے متفقہ طور پر دبے لفظوں میں اعلان کر دیا۔

"ستاروں کا کوئی قران اور کوئی نظر مہارانی کے حق میں نہیں ہے۔ ہمارا گیان یہی کہتا ہے کہ اگر "انہونی" ہو جائے تو الگ بات ہے ورنہ "ہونی" یہی ہے کہ ملکۂ عالیہ بے اولاد رہیں گی۔"

ایک بار پھر محرومی کے احساس نے سلیمہ بیگم کے گلابی چہرے کو دھوئیں کا ہم رنگ بنا دیا۔

جب بوڑھے اور تجربہ کار نجومی اپنی اپنی پیش گوئیاں کر چکے تو نسبتاً ایک جوان جوتشی، ہرگوبند نے شہنشاہ اکبر اور ملکہ سلطان، سلیمہ بیگم کے آگے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"میں یہ بات مانتا ہوں کہ ستاروں کی کوئی نظر مہارانی کے حق میں نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ہی مجھے میرا علم یہ بھی بتاتا ہے کہ بہت جلد ایک "انہونی" ہو کر رہے گی اور ملکۂ عالیہ ایک ایسے بچے کو گود لے لیں گی، جس کی قسمت کا ستارہ بہت عروج پر ہو گا اور وہی بچہ آگے چل کر پورے ہندوستان کی قسمت کا مالک ہو گا۔

ہرگوبند کی پیش گوئی بڑی عجیب تھی۔ دوسرے پیشہ ور نجومیوں نے ہرگوبند کی مستقبل بینی پر شدید طنز کئے مگر وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔

وقتی طور پر سلیمہ بیگم، ہرگوبند کے الفاظ سے بہل گئی اور اکبر بھی خوش ہو گیا کہ شریکِ حیات کے احساسِ محرومی نے خود اسے بھی فکر و تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

پھر کوئی دو سال بعد وہ "انہونی" ہو کر رہی۔ جہانگیر نے 1556ء میں مارواڑ کے راجہ اودے سنگھ کی لڑکی، راج کماری مان متی سے شادی کی تھی۔ مان متی کو عرفِ عام میں "جگت

گوسائیں" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ مان متی بھی گزشتہ پینتیس سال سے بے اولاد تھی۔ مان متی کے بارے میں بھی درباری نجومیوں کی یہی پیش گوئی تھی کہ اس کی گود ہری نہیں ہو سکتی۔ شاہی طبیب بھی اتفاق رائے سے یہی کہتے تھے کہ مان متی اپنے بعد اپنا کوئی وارث نہیں چھوڑے گی۔

پھر 1592ء میں وہ "انہونی" سامنے آ گئی۔ چھتیس سال بعد جب راج کماری مان متی محرومیوں اور اُداسیوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوب چکی تھی، اس وقت اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری سننے کو ملی۔ مان متی کے بطن سے ایک خوبصورت لڑکا پیدا ہوا تھا۔

شاہی خاندان کی رسم کے مطابق بیٹے کی پیدائش کے چھٹے دن جہانگیر نے شہنشاہ اکبر سے درخواست کی کہ ظلِ الٰہی جشنِ نشاط میں تشریف لائیں اور نوزائیدہ بچے کو اس کا نام عطا کریں۔

اکبر نے بڑے والہانہ انداز میں اپنے خوبصورت پوتے کو دیکھا اور جوشِ محبت سے مضطرب ہو کر معصوم بچے کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

"واللہ! یہ بچہ، اکبر کے خوابوں کی تعبیر ثابت ہو گا۔" جلال الدین اکبر نے سرشار لہجے میں کہا۔

اس کے بعد شہنشاہ نے نومولود شہزادے کو "خرم" نام دیا اور اسی دن بچے کو سلطان سلیمہ بیگم کے حوالے کر دیا گیا۔

جب شہزادہ خرم چار سال چار ماہ اور چار دن کا ہوا تو مکتب کی رسم ادا کی گئی۔ اس موقع پر شاندار جشن بھی منایا گیا اور شہزادے کی تعلیم و تربیت کے لئے بہترین اتالیق و استاد مقرر کئے گئے۔ شہزادہ خرم فطری طور پر بہت ذہین اور غیر معمولی حافظے کا مالک تھا۔ اگر ایک بار کسی چیز کو دیکھ لیتا تو وہ اپنے پورے خدوخال کے ساتھ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتی تھی۔

خرم کا فوجی اتالیق، سپہ سالار مہابت خان تھا۔ مہابت خان کا اصلی نام زمان بیگ تھا۔ وہ ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ اس نے میدانِ جنگ میں مغل سلطنت کے استحکام کے لئے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی تھیں۔ جہانگیر نے تخت نشیں ہوتے ہی زمان بیگ کو "مہابت خان" کے نام سے سرفراز کیا۔ اعزاز پانے والا دوسرا شخص، ارجمند کا دادا مرزا غیاث بیگ تھا، جسے وزیر مال بنانے کے ساتھ ساتھ "اعتماد الدولہ" کا لقب عطا کیا گیا تھا۔

جن دنوں ارجمند، شہزادے کے عشق میں مبتلا ہوئی تھی، اس سے کچھ روز پہلے خرم کو سات ہزاری ذات اور پانچ ہزاری سوار کا منصب دیا گیا تھا۔

اس خبر نے ارجمند کے علاوہ اور بھی بہت سے دلوں میں تلاطم پیدا کر دیا کہ شہنشاہ جہانگیر اور مغل شہزادے "مینا بازار" میں تشریف لائیں گے اور اپنے روشن چہروں کے دیدار سے قلعہ کے مکینوں کی آنکھوں کو منور کریں گے۔

آگرے کا قلعہ، سلطان سکندر لودھی نے تعمیر کرایا تھا۔ پہلے یہ قلعہ پتھر، اینٹ اور چونے

سے تعمیر کیا گیا تھا۔ مغل حکمران شہنشاہ اکبر نے 1572ء میں قلعے کی تعمیر کا آغاز کیا۔ اس بار قلعے کو سرخ پتھر سے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ قلعہ نو سال کی مدت میں مکمل ہوا اور اس پر بیس لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ قلعے کی اونچائی 30 گز، حصار کی دیوار کی چوڑائی 10 گز، خندق کی چوڑائی 30 گز اور گہرائی 12 گز ہے۔

اس قلعے کے باغ میں خاص خاص مواقع پر مینا بازار لگتا تھا۔ مینا بازار میں صرف خواتین ہی مختلف سامان کی دکانیں آراستہ کرتی تھیں۔ یہ شاہوں کی ایک مخصوص تفریح تھی، جس کے ذریعے وہ شاہانہ رعب و جلال اور بخشش و عطا کے مظاہرے کرتے تھے۔

جب سہ پہر کے قریب ارجمند، ماہ رخ کے ساتھ مینا بازار پہنچی تو وہاں اس کی پھوپھی مہر النساء (نور جہاں) پہلے سے موجود تھی۔

"اب کیا ہو گا، ماہ رخ؟" ارجمند نے دور سے نور جہاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی پھوپھی سے دُور دُور رہو گی۔" ماہ رخ نے بہت غور سے نور جہاں کی جانب دیکھا۔ شیر افگن کی موت کا سوگ ختم ہو چکا تھا اور اب نور جہاں انتہائی زرق برق لباس میں کسی حسین دوشیزہ کی طرح جلوہ گر نظر آ رہی تھی۔ نور جہاں کو دیکھ کر ارجمند اور ماہ رخ دونوں وقتی طور پر حسد کا شکار ہو گئی تھیں۔ نور جہاں پینتیس سال کی عمر میں بھی تمام نوعمر دوشیزاؤں سے زیادہ شاداب اور جوان نظر آ رہی تھی۔

"آؤ، آگے چلیں۔" ماہ رخ نے سرگوشی کے انداز میں ارجمند سے کہا۔ "تم اس دکان پر موجود رہو گی، جہاں سے شہنشاہ اور شہزادے پہلے گزریں گے۔ ایسی جگہ کھڑا ہونا بیکار ہے، جہاں کسی کی نظر ہی نہ پڑ سکے اور اگر کوئی ایک نگاہ دیکھ بھی لے تو سرسری انداز میں گزر جائے۔"

ارجمند دھڑکتے دل کے ساتھ خاموشی سے چلتی رہی۔ اور پھر اس دکان پر پہنچ گئی، جو باغ کے سرے پر سجائی گئی تھی۔ اور اسی مقام سے مینا بازار کی سیر کا آغاز ہوتا تھا۔ ارجمند، عورتوں کا جوش اور تجسس دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر دبے لہجے میں ماہ رخ سے پوچھتی ہے۔

"ان عورتوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"بی بی! جو مرض آپ کو لاحق ہے، یہ عورتیں بھی اسی بیماری میں مبتلا ہیں۔" ماہ رخ نے بہت آہستہ لہجے میں کہا مگر اس کی آواز سے گہری تلخی جھلک رہی تھی۔ "ان میں سے چند عورتیں اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں، جو زیادہ قیمت کی لالچ میں اپنا سامان فروخت کرنے آئی ہیں۔ مگر بیشتر تعداد ان خواتین کی ہے، جو شاہ یا شہزادوں یا امراء کی منظورِ نظر بننے کے جنون میں یہاں تک آئی ہیں۔ ان عورتوں کو ذرا غور سے دیکھو۔ دکانوں سے زیادہ ان کے چہرے اور جسم آراستہ ہیں۔ غازے کے رنگ میں ڈوبے ہوئے چہرے اور عطر کی خوشبو میں بسے ہوئے جسم۔ یہ مینا بازار نہیں، آقا زادی! یہ عورتوں کی نیلام گاہ ہے جس میں بدنصیب اور بے خبر عورتیں اپنے آپ کو نیلام کرنے آتی ہیں۔ یہ چھوٹے قد کی خواتین، شاہی محل کے میناروں کو چھونے کی کوشش کر رہی

ہیں۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ یہ اس کشمکش میں اپنی جان دے دیں گی مگر قصرِ شاہی کے بلند میناروں کو آخری سانس تک نہیں چھو سکیں گی۔"

یہ تلخ اور ہمت شکن گفتگو سن کر ارجمند کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ ماہ رخ کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے انتہائی شوخ لہجے میں کہا۔

"بی بی! سنبھل جاؤ۔ شاہ اور شہزادوں کی سواریاں آنے ہی والی ہیں۔ اگر میں کچھ دیر کے لئے آپ سے دُور چلی جاؤں تو پریشان نہ ہونا۔ مجھے اس ہجوم میں آپ کی پھوپھی مہرالنساء پر بھی نظر رکھنی ہے کہ آخر وہ اتنے شوخ اور بھڑکیلے لباس میں مینابازار کیوں آئی ہیں؟ ان کے بارے میں، میں نے یہی سنا تھا کہ وہ سیاہ کپڑے استعمال کرتی ہیں اور ہر وقت اپنے شوہر کا ماتم کرتی رہتی ہیں۔

"میرے پھوپھا، شیرافگن کے انتقال کو کئی ماہ ہو چکے ہیں۔" ارجمند نے اپنی پھوپھی مہرالنساء کی وکالت کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"مگر پھر بھی ایک بیوہ عورت کو مینابازار میں اس طرح نہیں آنا چاہئے تھا۔ تم سے بھی زیادہ شوخ اور رنگین لباس ہے ان کا۔" ماہ رخ نے ایک بار پھر نورجہاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو تھوڑے ہی فاصلے سے ملبوسات کی ایک دکان پر موجود تھی اور بار بار باغ کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "انہیں بھی کسی کا انتظار ہے بی بی!" ماہ رخ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ آپ کی محترم پھوپھی کس کا انتظار کر رہی ہیں؟ اور اسی انتظار پر تمہارے مستقبل کا انحصار ہے۔"

"آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو، ماہ رخ؟" ارجمند نے پریشان ہو کر کہا اور مہرالنساء (نورجہاں) کی طرف دیکھنے لگی۔ واقعتاً اس کی مضطرب نظریں بار بار باغ کے دروازے کی جانب اُٹھ رہی تھیں۔

"ابھی تم میری باتوں کا مفہوم نہیں سمجھو گی، آقا زادی!" ارجمند نے بدستور تلخ لہجے میں کہا۔ "میں محلاتِ شاہی کی راز دار ہوں۔ اور خوب جانتی ہوں کہ کون کس طرف دیکھ رہا ہے۔"

ارجمند، ماہ رخ سے کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی کہ اچانک مینابازار میں مسلح فوجیوں کا ایک دستہ داخل ہوا۔ کچھ دیر تک وہ سپاہی مینابازار کا جائزہ لیتے رہے کہ یہاں کوئی مرد یا مشکوک شخصیت تو موجود نہیں۔ پھر وہ تمام فوجی بہت تیزی سے واپس چلے گئے۔

"یہ شہنشاہ کی آمد کا اعلان ہے۔" ماہ رخ نے ارجمند سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

ارجمند کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

اور پھر ہر طرف نقیبوں کی پُرشور صدائیں گونجنے لگیں۔

"ہوشیار باش..... حدِ ادب..... ظلِ الٰہی، شہنشاہ ابوالمظفر نورالدین جہانگیر تشریف لا رہے ہیں۔"

ارجمند نے گھبرا کر ماہ رخ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بے ترتیب سانسوں کے ساتھ کہنے لگی۔ "میں شہزادے کا سامنا کس طرح کروں گی، ماہ رخ؟"

"اپنے دل کو قابو میں کرو بی بی!" ماہ رخ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو شاید عمر بھر تمہیں کف افسوس ملنا پڑے۔ ابھی شہزادہ خرم کے دل پر کسی دوشیزہ کی محبت قابض نہیں ہو سکی ہے۔ تم ان کی آنکھوں کو غور سے دیکھو۔ ہو سکتا ہے کہ ان آنکھوں میں تمہارے لئے کوئی پیغام محفوظ ہو۔"

کچھ دیر بعد ہی شہنشاہ جہانگیر، مینابازار میں داخل ہو گیا۔ جلالِ شاہی کا یہ عالم تھا کہ مینابازار میں کھڑی ہوئی عورتوں کی سانسیں رک گئی تھیں۔ اس وقت مینابازار میں تقریباً آٹھ سو خواتین موجود تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ آسمان سے لال قلعہ کے باغ میں مختلف لباس پہن کر پریاں اُتر آئی ہوں۔

اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن۔

شہنشاہ جہانگیر کے پیچھے بڑا شہزادہ خسرو تھا، اس کے بعد شہزادہ پرویز، پھر شہزادہ شہریار اور سب سے آخر میں شہزادہ خرم۔ باغ میں داخل ہوتے ہی جہانگیر کی نظر ارجمند پر پڑی اور پھر مختلف عورتوں کے چہروں سے گزرتی ہوئی، نورجہاں کے رُخِ تابناک پر ٹھہر گئی۔ ماہ رخ نے ایک بار پھر نورجہاں کی طرف دیکھا۔ وہ بہت زیادہ بے چین نظر آ رہی تھی۔ جہانگیر آہستہ آہستہ نورجہاں کی طرف بڑھنے لگا۔

شہزادہ خسرو، عورتوں کے سلسلے میں خلافِ توقع ایک قناعت پسند انسان تھا۔ اسے اپنی بیوی سے حد درجہ محبت تھی، اس لئے بے نیازانہ گزر گیا۔

شہزادہ پرویز کی حریصانہ نظریں چند لمحوں کے لئے ارجمند کے چہرے پر جم گئیں مگر ماہ رخ کو قریب پا کر وہ فوراً ہی آگے بڑھ گیا۔ ماہ رخ کے دل میں ایک تیز نشتر سا اُتر گیا لیکن اس کے زخم کو دیکھنے اور خاموش چیخ کو سننے والا اس ہجوم میں کوئی نہیں تھا۔

شہزادہ شہریار طبعاً ایک عیاش نوجوان تھا، اس لئے چاروں طرف گھبرا گھبرا کر دیکھ رہا تھا۔

آخر میں شہزادہ خرم، ارجمند کے قریب سے گزرا اور اس کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ خرم ایک خاص محویت کے عالم میں ارجمند کو دیکھ رہا تھا۔ ماہ رخ نے چند ساعتوں میں ان آنکھوں کے پیغام کو پڑھ لیا اور ارجمند کو تنہا چھوڑ کر اس طرف بڑھنے لگی، جہاں شہزادہ جہانگیر، نورجہاں سے باتیں کر رہا تھا۔

ماہ رخ کی اتنی ہمت تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ شہنشاہ جہانگیر کے قریب پہنچ کر والیٔ ہندوستان کی گفتگو سنے مگر پھر بھی وہ اس مقام تک ضرور پہنچ گئی تھی، جہاں سے انسانی چہروں پر آنے والے رنگوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔

جہانگیر نے مہرالنساء (نورجہاں) کے قریب ٹھہر کر ایک عجیب سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"مہرو! تم کیسی ہو؟"

یہ الفاظ ادا کرتے وقت جہانگیر کے ذہن میں ماضی کی یادوں کا ایک ایک نقش روشن ہو گیا تھا اور چہرے پر سترہ اٹھارہ سال پرانے زخموں کا عکس اُبھر آیا تھا۔

جواب میں نور جہاں نے مسحور کن نظروں سے اپنے اس محبوب کی طرف دیکھا تھا، جو ہندوستان کی زمین پر بسنے والے بے شمار انسانوں کی تقدیروں کا مالک تھا۔ پھر اُس کے احمریں ہونٹوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔

"ظلِ الٰہی کے رحم و کرم کے سہارے جی رہی ہوں۔" نور جہاں کے جواب میں احساسِ محرومی بھی تھا اور قسمت کے جارحانہ عمل کی شکایت بھی۔ وہ عمل، جس کے تحت اس کا شوہر موت کی گہری نیند سو گیا تھا اور خود اس نے بیوگی کی قبا پہن لی تھی۔

ماہ رخ نے کچھ فاصلے سے نور جہاں کے چہرے کا مشاہدہ کیا۔ خوبصورت بیوہ کے رخسار، گرمیٔ جذبات سے لو دینے لگے تھے۔ کسی مجسمے کی طرح ترشا ہوا بدن بارِ حیا سے سمٹ گیا تھا اور آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔

ماہ رخ کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ نور جہاں اپنے بہتر مستقبل کی تلاش میں اس ماضی کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں شہنشاہ جہانگیر کا ناکام عشق شرر فشاں تھا۔

ماہ رخ جو کچھ دیکھنا چاہتی تھی، وہ ایک ہی نظر میں سامنے آ گیا۔ اس لئے وہ تیزی سے پلٹ کر ارجمند کی طرف آئی، وہاں کچھ اور ہی صورتِ حال تھی۔ شہزادہ خرم محویت کے عالم میں ارجمند کو دیکھے جا رہا تھا..... اور ارجمند پسینے میں نہائی ہوئی کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور جسم میں ہلکی ہلکی لرزش موجود تھی۔ ماہ رخ کے سارے مشورے رائیگاں گئے تھے..... اور ارجمند نے شہزادے کی آنکھوں کا پیغام پڑھنے کی بجائے اب اپنے آپ ہی کو کھو دیا تھا۔

شہزادہ خرم کے حیرت و سکوت کے باعث ماہ رخ کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں مینا بازار میں موجود سینکڑوں خواتین اس راز کو نہ جان لیں اور یہ محبت قبل از وقت ایک تماشا بن کر نہ رہ جائے۔ اس لئے وہ بے باکی کے ساتھ آگے بڑھی اور پُر جوش لہجے میں کہنے لگی۔

"شہزادۂ عالم کی خدمت میں یہ کنیز سلام پیش کرتی ہے۔"

جلترنگ جیسی ایک نسوانی آواز نے شہزادہ خرم کی محویت کا طلسم توڑ دیا۔ اس نے چونک کر ماہ رخ کی طرف دیکھا جو نیم قد جھکی ہوئی، ادب و احترام کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"سیدھی کھڑی ہو جاؤ۔ ہمیں نیاز مندی کے یہ آداب پسند نہیں۔" خرم نے بارعب آواز میں کہا۔

ماہ رخ گھبرا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ شہزادہ خرم کی اس سادگی نے اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔

"تم کون ہو؟" خرم کے لہجے سے جلالِ شاہی نمایاں تھا مگر آواز بہت نرم اور شیریں تھی۔

"میں ارجمند بانو کی خادمہ ہوں۔" ماہ رخ نے اپنی آقا زادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ آپ کے وزیر اعظم آصف خان کی صاحب زادی ہیں۔" ماہ رخ نے موقع غنیمت جان کر ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ وہ دنوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کرنا چاہتی تھی۔

خرم کے چہرے پر حیرت کا ہلکا سا عکس اُبھرا مگر اس نے ماہ رخ کے سامنے ارجمند بانو کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ماہ رخ کو شہزادے کی تہذیب اور شائستگی کا یہ انداز بہت پسند آیا۔

پھر ماہ رخ نے دیکھا کہ شہزادہ خرم کا ہاتھ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے شہزادے نے اپنے گلے کا ہار اُتار کر ماہ رخ کی طرف بڑھا دیا۔ ماہ رخ ایک بار پھر خرم کی شرافت و انسانیت کی قائل ہو گئی تھی۔ اس نے دربارِ جہانگیر میں بارہا ایسے مناظر دیکھے تھے کہ جب شہنشاہ کسی سے خوش ہو کر اپنی کوئی ذاتی چیز انعام میں دیا کرتا تھا تو حکمراں کے چہرے پر عجیب سا احساسِ برتری نمایاں ہوتا تھا اور وہ انعام میں دی جانے والی چیز کو دربار کے فرش پر پھینک دیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس شہزادہ خرم نے ماہ رخ کو اپنا قیمتی ہار اس طرح دیا کہ جیسے کوئی شخص اپنے کسی دوست کو تحفہ دے رہا ہو۔

ماہ رخ نے کئی بار جھک کر شہزادے کو سلام کیا اور خرم انتہائی باوقار انداز میں چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

❀.....❀.....❀

"تم نے شہزادے کی آنکھوں میں کیا دیکھا، آقا زادی؟" رات کے وقت تنہائی میں ماہ رخ نے ارجمند بانو سے پوچھا۔

"تم مجھے بار بار آقا زادی نہ کہا کرو۔" ارجمند نے جھنجلا کر کہا۔ "تم مجھ سے عمر میں بھی بڑی ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری محسن بھی ہو اور راز دار بھی..... اس لئے مجھے تکلف کا یہ مظاہرہ پسند نہیں۔" ارجمند نے ماہ رخ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک نئی بحث چھیڑ دی تھی۔

"تقدیر نے میرے اور آپ کے درمیان جو فرق قائم کیا ہے، میں اسے مٹانا نہیں چاہتی۔" ماہ رخ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور آپ عام آقاؤں کی طرح سلوک بھی تو نہیں کرتیں۔ مجھے اس گھر میں اپنوں کی سی محبت حاصل ہے، اس لئے میں جو کچھ کہتی ہوں، دل کی گہرائیوں سے کہتی ہوں۔"

"تو پھر تم مجھے صرف ارجمند بانو کہہ کر پکارا کرو۔"

"پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ زبان تو بڑے فریب میں مبتلا کر دیتی ہے۔" ماہ رخ کے لہجے

سے تلخی جھلک رہی تھی اور اسے شہزادہ پرویز کے زبانی وعدے یاد آ رہے تھے۔ ''بات صرف دل کی ہوتی ہے اور میرے دل میں جو کچھ ہے، اسے خدا بہتر جانتا ہے۔ تم کہاں اس فضول گفتگو میں اُلجھ گئیں۔ تم میرے سوال کا جواب دو۔ کیا تم نے ان آنکھوں کو پڑھنے کی کوشش کی تھی؟''

''بس ایک بار میں نے ان آنکھوں کو دیکھا، پھر میری نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔'' ارجمند نے شرماتے ہوئے کہا اور اس کا گلنار چہرہ پہلے سے زیادہ سرخ نظر آنے لگا۔

''مگر میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔'' ماہ رخ ہنستے ہوئے بولی۔ اس نے اپنے دل کے زخموں کی خلش کو چھپا لیا تھا اور ایک معصوم دوشیزہ کی خوشی کی خاطر ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ سجالی تھی۔

''تم بہت خوش نصیب ہو بی بی! دونوں طرف کے حالات تمہارے حق میں ہیں۔''

''دونوں طرف سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' ارجمند نے چونک کر پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ اب یہ فاصلے ختم ہو جائیں گے۔'' ماہ رخ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''دونوں طرف کے حالات..... پھر یہ فاصلے..... تم بہت اُلجھی ہوئی گفتگو کر رہی ہو ماہ رخ!'' ارجمند نے مضطرب لہجے میں کہا۔ وہ ماہ رخ کی زبان سے براہِ راست سب کچھ سننا چاہتی تھی۔

''میں کل تک تمہارے مستقبل کی طرف سے بہت مایوس تھی ارجمند بانو!'' ماہ رخ نے پہلی بار بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''مگر اب میری آنکھیں تمہیں کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔''

''تمہارے اندازوں میں یہ انقلاب کیسے آ گیا؟'' ارجمند نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

''پہلے شدید مایوسی اور اب اتنی اُمیدیں۔ کہیں یہ تمہاری نظر کا فریب نہ ہو ماہ رخ؟'' اچانک ارجمند کے چہرے پر پریشانیوں کے سائے لرزنے لگے تھے۔

''نہیں بی بی! یہ فالِ بد اپنے منہ سے نہ نکالو۔'' ماہ رخ نے بڑی محبت سے اپنا ہاتھ ارجمند کے احمریں ہونٹوں پر رکھ دیا۔ ''تم بہت قسمت والی ہو کہ تم نے انجانے میں ایک فرشتے کا انتخاب کر لیا۔''

ارجمند اپنے محبوب کی تعریف سن کر کچھ اور شرما گئی۔

''شہزادہ واقعی فرشتہ ہے۔'' ماہ رخ نے خرم کی مزید تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ بدمست، وحشی اور مغرور انسانوں کی دنیا میں یہ فرشتہ کہاں سے آ گیا۔ تم تو شہزادے کی آنکھوں کی تاب نہ لا سکیں، مگر میں نے ان آنکھوں کو بہت غور سے دیکھا ہے۔ ان آنکھوں میں بڑی معصومیت ہے۔ ان آنکھوں میں ہوس کا شائبہ تک نہیں۔ اور وہ آنکھیں فریب کار نہیں ہو سکتیں۔ یہی تمہاری خوش قسمتی کی علامت ہے۔'' شہزادہ خرم کی آنکھوں کا ذکر کرتے ہوئے ماہ رخ اپنے خیالوں میں کھو گئی تھی اور اس کے ذہن کے پردے پر شہزادہ پرویز کی سفاک، قاتل اور بے وفا آنکھیں اُبھر آئی تھیں۔

''تم کس انقلاب کا ذکر کر رہی تھیں؟'' ارجمند نے ماہ رخ کو کچھ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

ماہ رخ اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آئی اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہنے لگی۔ ''اگر وہ انقلاب نہ آتا..... تو شاید.....'' ماہ رخ نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

''آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ماہ رخ؟'' ارجمند ایک بار پھر جھنجلاہٹ کا شکار ہو گئی۔ ''آج تمہاری ساری باتیں نامکمل اور مبہم ہیں۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔''

ماہ رخ نے چونک کر ارجمند کی طرف دیکھا اور پھر وہ ایک کم سن لڑکی کی ذہانت پر مسکرانے لگی۔ ''ہاں بی بی! میں تم سے ایک بات چھپا رہی ہوں۔''

''مجھ سے؟'' ارجمند نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''مجھے تم پر شک نہیں ہے، مگر تمہاری کم عمری اور جذباتیت سے ڈرتی ہوں۔'' ماہ رخ نے صاف صاف کہا۔ ''یہ عمر بڑی نازک ہوتی ہے۔ معمولی سے حادثے کی خبر سن کر انسان بدحواس ہو جاتا ہے اور پھر اسے اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا۔ شاید تم بھی یہ خبر سن کر اسی طرح بے قرار ہو جاؤ۔''

''کون سی خبر؟'' ارجمند کے تجسس اور اضطراب میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''مگر تم اپنے دل و دماغ پر قابو رکھو گی۔'' ماہ رخ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ایک سمندر کی طرح گہرائی اختیار کرنا ہے۔ جس طرح مختلف دریا اور نالے، سمندر میں گر کر اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں، اسی طرح شاہی محل کا ہر راز تمہارے سینے میں دفن ہو جانا چاہئے۔ میں تمہیں دوسرے لوگوں کے معاملات میں پتھر کے ایک بت کی مانند دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ بت، جو اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے بے شمار ناپسندیدہ مناظر کو دیکھتا رہتا ہے مگر اس کے ہونٹ کسی بھی موسم میں حرکت نہیں کرتے۔''

ماہ رخ یکایک بہت زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگی۔

''میں جس انقلاب کا ذکر کر رہی ہوں، اس کا مختصر احوال یہ ہے کہ شہنشاہ جہانگیر تمہاری پھوپھی مہرالنساء (نورجہاں) میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ پہلے مجھے شبہ تھا مگر کل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شہنشاہ کے چہرے پر وہی رنگ موجود تھا، جو ابتدائے عشق میں ہر انسان کے چہرے پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ تمہاری پھوپھی، مہرالنساء بھی شاہی حرم میں داخل ہونے کے لئے بے چین نظر آتی ہیں۔ میں نے دونوں کے چہروں پر ایک ہی رنگ دیکھا ہے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے ماہ رخ؟'' ارجمند کو اپنی پھوپھی کے عشق کا ذکر سن کر ایک عجیب سی شرمندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ ''وہ تو ایک بیوہ عورت ہیں۔ شکستہ حال اور غم زدہ۔''

''بیوگی کا زمانہ ختم ہو چکا۔'' ماہ رخ نے بے باکانہ انداز میں کہا۔ ''تم نے نہیں دیکھا کہ انہوں نے سیاہ ماتمی لباس اتار کر سرخ رنگ کے کپڑے پہن لئے ہیں۔ سرخ رنگ پُرجوش زندگی

کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بیوہ عورت کا ظاہری جسم مر چکا۔ اب ان کے اندر ایک بھرپور عورت زندہ ہے جو اس عمر میں بھی تم سے، مجھ سے اور لاکھوں دوشیزاؤں سے زیادہ جوان نظر آتی ہے۔"

ارجمند کی خوبصورت آنکھیں حیرت کی زیادتی سے کشادہ ہو گئی تھیں۔

"میں اسی انقلاب کا ذکر کر رہی تھی۔" ماہ رخ نے انتہائی رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "بی بی! لال قلعے میں اس قسم کے بے شمار انقلاب پرورش پا رہے ہیں۔ تم ایسے تمام انقلابات کو خاموشی سے دیکھتی رہو گی، کوئی تبصرہ نہیں کرو گی تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی پوری بساط کو اُلٹ سکتا ہے۔ یہ انقلاب ابھی تک تمہارے حق میں ہے۔ آگے خدا علیم و خبیر ہے کہ کل کیا ہو گا؟"

ارجمند کو اپنی پھوپھی کا فسانۂ محبت سن کر ایک صدمہ سا ہوا تھا مگر اس نے جلد ہی اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ شاید اس لئے کہ وہ خود بھی شہزادہ خرم کے عشق میں مبتلا تھی۔

"یہ انقلاب میرے حق میں مفید کس طرح ہو سکتا ہے؟" ارجمند نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"اگر شہنشاہ جہانگیر اپنے عشق میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں بھی منزلِ مراد مل سکتی ہے۔"

شہزادہ پرویز کے عشرت کدے کی زینت بننے کے بعد ماہ رخ اپنی عمر سے کہیں زیادہ حوادث آشنا اور تجربہ کار ہو گئی تھی۔ "شاید میں نے غلط کہا ارجمند بانو! شہنشاہ یقیناً اپنے عشق میں کامیاب ہوں گے۔ انہیں کون روک سکتا ہے؟ وہ ہندوستان میں رہنے والے ہر شخص کی تقدیر کے مالک ہیں..... اور آپ کی پھوپھی مہرالنساء کا شمار بھی ان کی ادنیٰ رعایا میں ہوتا ہے۔ اور رعایا، شہنشاہ کی مرضی کے خلاف کس طرح سرکشی اختیار کر سکتی ہے۔"

ارجمند، ماہ رخ کی باتیں سن کر دم بخود رہ گئی

"شہنشاہ کی کامیابی تمہاری کامیابی ہے۔" ایک مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد ماہ رخ نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"اگر تمہاری پھوپھی، ملکۂ ہند بن جاتی ہیں تو راستے کے بڑے بڑے پتھر خود بخود ہٹ جائیں گے۔ وہ اپنی بھتیجی کے لئے کم سے کم اتنا تو کر سکتی ہیں کہ مخالفت کے طوفان کو اپنی طاقت سے روک دیں۔"

"کیسی مخالفت؟" ارجمند کے ذہن میں عجیب عجیب وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔

"یہی کہ اگر شاہی خاندان کے افراد تمہاری اور شہزادہ خرم کی اس قربت کو ناپسند کرتے ہیں تو ملکۂ ہند درمیان میں مداخلت کر کے شہنشاہ کو تم دونوں کی طرف جھکا سکتی ہیں۔" ماہ رخ نے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ، مہرالنساء کو خوش کرنے کے لئے تمہارے اور شہزادہ خرم کے رشتے کو فوری طور پر منظور کر لیں۔ یہ ایک قسم کی رشوت ہو گی۔ اور عشق میں ایسی رشوتیں عام ہوتی ہیں۔"

ماہ رخ کی باتیں سن کر ارجمند کے چہرے پر ناقابلِ بیان خوشی رقص کرنے لگی۔ "تم بہت ذہین ہو ماہ رخ! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم حالات کے ایسے ایسے نازک پہلوؤں پر غور کر

رہی ہو۔ میری اور تمہاری عمر میں تین چار سال ہی کا تو فرق ہے۔ پھر تمہارے ذہن میں اتنا دُور تک سوچنے کی صلاحیت کہاں سے آئی؟"

"حادثات سب کچھ سکھا دیتے ہیں بی بی!" ماہ رخ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"حادثات؟" ارجمند پریشان سی نظر آنے لگی۔

"میرے حادثات کی پرسش اور شمار کا وقت نہیں۔" ماہ رخ کے ذہن میں ناگہاں ایک نیا اندیشہ سر اُبھارنے لگا تھا۔ "تمہیں بہت جلد اپنا سفر طے کرنا ہو گا، ارجمند بانو! مجھے یاد آیا کہ تمہاری ایک پھوپھی زاد بہن بھی ہے، مہرالنساء (نور جہاں) کی بیٹی لاڈلی بیگم۔ جو عمر میں یقیناً تم سے ایک دو سال بڑی ہو گی۔ لاڈلی بیگم کی شکل میں مجھے ایک اور خطرے کا احساس ہو رہا ہے۔"

"خطرہ؟" معصوم ارجمند کا ذہن عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ کبھی کسی بات پر وہ خوش ہو کر پھولوں سے بھری شاخ کی مانند جھومنے لگتی تھی اور کبھی اس کے چہرے کا رنگ کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد ہو جاتا تھا۔ ماہ رخ نے نئے خطرے کا ذکر کیا تو وہ دہشت زدہ سی نظر آنے لگی۔

"پہلے مجھے اس خطرے کا احساس تک نہیں تھا۔" ماہ رخ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "مگر اب یہی خطرہ مجھے ایک مستقل عذاب نظر آ رہا ہے۔ مہرالنساء بیگم کو اپنے ساتھ اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کی فکر بھی لاحق ہو گی۔ اگر وہ شہنشاہ کے حرم میں داخل ہو جاتی ہیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں ملکۂ عالیہ بننے سے نہیں روک سکتی۔"

"یہ دعویٰ تم کس بنیاد پر کر رہی ہو ماہ رخ؟" ارجمند بانو نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"میری طرح آپ بھی شہنشاہ کی تمام بیگمات سے واقف ہیں۔" ماہ رخ کی آواز میں ایک عجیب سا جوش شامل تھا۔

"کیا کوئی بیگم، ظاہری حُسن میں آپ کی پھوپھی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟"

ارجمند کچھ لمحوں کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گئی اور پھر آہستہ سے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "تم ٹھیک کہتی ہو ماہ رخ!"

"شاید آپ کی معصومیت اس بات کی گواہی نہ دے سکے۔ مگر یہ کنیز کسی حد تک شہنشاہ کے مزاج کو پہچانتی ہے۔ وہ شراب کے عادی ہیں..... اور شراب ہمیشہ انسان کو حُسن پرستی، رقص، موسیقی اور شاعری کی طرف مائل کرتی ہے۔ مہرالنساء بیگم میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔ وہ ذہین ہونے کے ساتھ بہت حسین خاتون ہیں۔ میں نے شاہی محل کے رازداروں کو سرگوشیوں میں باتیں کرتے دیکھا ہے کہ شہنشاہ انہیں نوعمری کے زمانے میں بہت شدت کے ساتھ چاہتے تھے۔ وقت کی تیز آندھیوں نے عشق کے جذبے پر حالات کی گرد ڈال دی تھی۔ مگر اب موسم سازگار ہو گیا ہے اور خوشگوار ہواؤں نے سارا غبار صاف کر دیا ہے۔ میرے خیال میں شہنشاہ کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور جیسے ہی وہ انقلابی لمحہ آیا، آپ اپنی آنکھوں سے مہرالنساء بیگم کو ملکۂ عالیہ کی صورت میں تختِ شاہی پر جلوہ گر ہوتے ہوئے دیکھیں گی۔ پھر ایک ملکہ کے لئے کیا

مشکل ہے کہ وہ لاڈلی بیگم کی شادی کسی شہزادے سے کر دے..... اور شہنشاہ اپنی محبوب ملکہ کا دل جیتنے کے لئے فوراً اس بات پر آمادہ ہو جائیں گے۔ شہزادہ خسرو، شہزادہ پرویز، شہزادہ شہریار اور شہزادہ خرم..... ملکہ عالیہ ان میں سے کسی بھی شہزادے کا انتخاب کر سکتی ہیں۔"

حالات کا یہ رخ سامنے آتے ہی ارجمند بانو کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور اس کی شہابی رنگت پر مایوسیوں کا دھواں پھیلنے لگا۔ "پھر میں کیا کروں ماہ رخ؟" ارجمند بانو کی آواز دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"ابھی تو حالات کا سمندر خاموش ہے۔" ماہ رخ نے اپنی آقا زادی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "صرف طوفان کا اندیشہ ہے مگر ابھی طوفان آیا نہیں ہے۔ آپ اپنے عشق کے سفینے کو ساحل کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی رہیں لیکن اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں، کسی بھی وقت ہواؤں کا رخ بدل سکتا ہے۔ احتیاطی تدبیر کے طور پر آپ اپنے سفر کو تیز تر کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ شہزادہ خرم کل بھی مینا بازار میں تشریف لائیں گے۔ اور ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ بھی جلوہ افروز ہوں۔ اس لئے مجھے مہر النساء بیگم کی سرگرمیوں پر نظر رکھنی ہے اور تمہیں شہزادہ خرم کا استقبال کرنا ہے۔ مگر یاد رہے کہ جوشِ جذبات میں اپنی سطح سے نیچے نہ گر جانا..... اور یہ بھی نہ ہو کہ تم شہزادے کے سامنے محض پتھر کا ایک بت بن کر رہ جاؤ۔"

❀.....❀.....❀

وہ رات ارجمند نے شدید بے قراری کے عالم میں گزاری۔ کبھی نیند کے بوجھ سے پلکیں بند ہو گئیں اور کبھی کسی ناپسندیدہ خواب نے اسے ڈرا کر جاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کئی بار خواب میں یہ منظر بھی دیکھا کہ اس کی پھوپھی زاد بہن، لاڈلی بیگم اپنے ہاتھوں میں پھولوں کا ہار لے کر شہزادہ خرم کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ارجمند بانو صبح دیر تک سوتی رہی۔ پھر جب بیدار ہوئی تو اس کا ذہن بوجھل تھا اور چہرے پر بے خوابی کے سے آثار نمایاں تھے۔ ماہ رخ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بی بی! تمہیں ابھی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم محبت کے شبستان میں محوِ خواب نہیں بلکہ ایک ایسے جنگی محاذ پر کھڑی ہو، جس کے پیچ و خم روز بہ روز بڑھتے چلے جائیں گے۔ اس جنگ میں کبھی ایسا بھی ہو گا کہ تم آسانی سے فتح حاصل کر لو گی۔ اور کبھی یوں بھی ہو گا کہ اپنا حق چھیننے کے لئے تمہیں کسی کی حسرتوں کا خون بہانا پڑے گا۔"

"نہیں ماہ رخ! میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔" ارجمند نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آقا زادی! تمہیں ایسا کرنا ہو گا۔" ماہ رخ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "محبت پھولوں کی سیج کے ساتھ ایک خاردار بستر بھی ہے۔ اگر تم نے ان کانٹوں کو نہیں ہٹایا تو پورا جسم لہولہان ہو جائے گا۔"

ارجمند بانو نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور اپنی ظاہری آرائش کا اہتمام کرنے لگی۔ آج اس نے ماہ رخ کے اصرار پر زیادہ شوخ اور دلکش لباس پہنا تھا۔

پھر جب وہ دونوں مینا بازار کی طرف جانے لگیں تو انہیں "امر سنگھ دروازے" سے داخل ہوتی ہوئی کچھ غیر مقامی عورتیں نظر آئیں۔ لال قلعہ آگرہ کے تین بڑے دروازے تھے۔ دہلی دروازہ..... ہاتھی دروازہ..... اور امر سنگھ دروازہ۔ دہلی دروازہ اور ہاتھی دروازہ صرف مغل فوجوں کے لئے مخصوص تھا۔ امر سنگھ دروازہ عام رعایا کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ جب شاہی محل میں کوئی تقریب ہوتی تو اسی دروازے سے گزر کر لوگ اندر آتے تھے یا پھر اس خاص موقع پر جب شہنشاہ "جھروکہ درشن" میں بیٹھ کر عوام کو اپنے دیدار سے شرف یاب کرتا تھا اور ان کی درخواستیں سنتا تھا۔ "جھروکہ درشن" کی بنیاد اکبر اعظم نے ڈالی تھی۔ اس طرح ایک حکمران مہینے میں ایک یا دو بار اپنی رعایا سے براہِ راست رابطہ قائم رکھتا تھا۔

امر سنگھ دروازے سے گزر کر جو مقامی عورتیں مینا بازار میں داخل ہو رہی تھی، ان کا تعلق ایران، افغانستان، ازبکستان، یونان اور انگلستان سے تھا۔ ارجمند بانو نئے نئے خدوخال کی عورتوں کو مختلف لباسوں میں دیکھ کر ماہ رخ سے پوچھتی ہے کہ یہ خواتین کہاں سے آئی ہیں؟

"ان عورتوں کا تعلق دُور دراز کے ملکوں سے کہا۔" ماہ رخ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یہ عورتیں اپنے اپنے ملکوں کی مصنوعات لے کر آئی ہیں تا کہ شہنشاہ اور دیگر امراء ان چیزوں کو مہنگے داموں خرید سکیں اور اس طرح ان کی تجارت کو فروغ حاصل ہو سکے۔"

ارجمند بانو بہت دلچسپی سے غیر ملکی عورتوں کو مینا بازار میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتی ہے اور پھر اس مخصوص دکان پر جا کر ٹھہر جاتی ہے، جہاں شہزادہ خرم نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ ابھی ارجمند اور ماہ رخ کو مینا بازار پہنچے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ انہیں باغ کے دروازے پر مہر النساء بیگم نظر آئی۔ آج وہ تنہا تھی۔ ماہ رخ اس تبدیلی پر چونک اٹھی۔ اُس کے بے قرار ذہن نے فوراً ہی نور جہاں کی اس تنہائی کا جواز تلاش کر لیا۔

"بی بی! ادھر دیکھو۔" ماہ رخ نے ارجمند بانو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہاری پھوپھوی حضور تشریف لا رہی ہیں۔ آج بھی ان کے لباس کی شوخی کا وہی عالم ہے..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لاڈلی بیگم ان کے ساتھ نہیں ہے۔"

ارجمند کا معصوم ذہن، ماہ رخ کی گفتگو کے پیچ و خم کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ حیرت زدہ نظروں سے منہ کھولے ہوئے، ماہ رخ کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

"مہر النساء بیگم کی تنہا آمد بے سبب نہیں ہے ارجمند بانو!" ماہ رخ نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "یقیناً آج مینا بازار میں کوئی نیا گُل کھلے گا۔ تم اپنے گرد و پیش پر نظر رکھنا۔ اور ان قیمتی لمحات کو فضول نہ گنوا دینا جو کسی کسی انسان کو قسمت سے میسر آتے ہیں۔"

اتنے میں مہر النساء اپنی بھتیجی کے قریب پہنچ گئی۔ ارجمند نے سر جھکا کر بڑے ادب سے اپنی

پھوپھی کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

مہرالنساء نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر رسمی دعائیں دیں، پھر پلٹ کر ماہ رخ کی طرف دیکھا۔ ماہ رخ نے بھی جواباً بہت زیادہ خم ہو کر سلام پیش کیا۔

''یہ کون ہے ارجمند؟'' مہرالنساء بیگم نے بھتیجی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یہ میری..... بہن..... ہیں۔'' ارجمند نے رک رک کر جواب دیا۔ وہ ماہ رخ کو اپنی کنیز کہہ کر پکارنا نہیں چاہتی تھی۔

''تمہاری بہن؟'' مہرالنساء کی کشادہ اور روشن پیشانی پر کئی بل پڑ گئے۔

''نہیں بیگم صاحبہ!'' ماہ رخ نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ میری آقازادی کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ مجھے اپنی بہن کا درجہ دے رہی ہیں۔ ورنہ میں ایک ادنیٰ کنیز ہوں۔'' ماہ رخ کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا اور اسے اپنے کنیز ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں تھی۔

مہرالنساء نے ایک بار پھر ماہ رخ کی طرف بغور دیکھا اور پھر بڑے عجیب سے لہجے میں کہنے لگی۔ ''مادر ملکہ کو بھی ایک ہوشیار کنیز کی ضرورت ہے اور ہمیں تیرے چہرے پر ذہانت کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں۔'' مہرالنساء نے جہانگیر کی سوتیلی ماں، سلیمہ بیگم کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ سلیمہ بیگم، اکبر اعظم کی وہی لاولد بیوہ تھیں، جنہوں نے شہزادہ خرم کو گود لے کر پرورش کیا تھا۔ اور جب نور جہاں، بیوہ ہو کر شاہی محل پہنچی تو جہانگیر نے اسے بھی سلیمہ بیگم کی خدمت پر مامور کر دیا تھا۔ ''ہم بھائی صاحب سے کہیں گے کہ وہ ماہ رخ کو ہمیں دے دیں۔'' مہرالنساء نے ارجمند بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ارجمند، پھوپھی کے ارادے دیکھ کر سناٹے میں آ گئی مگر زبان سے کچھ نہیں بولی۔

ماہ رخ فوراً ایک قدم آگے بڑھی اور بڑے احترام کے ساتھ سر جھکا کر کہنے لگی۔

''بس، بیگم صاحب کے حکم کی دیر ہے، یہ کنیز اس اعزاز پر ہمیشہ ناز کرے گی۔ بہت دن سے میرے دل میں بھی یہ خواہش تھی کہ مادر ملکہ کی خدمت انجام دے سکوں۔ اور آج خوش قسمتی سے وہ دن بھی آ گیا۔''

مہرالنساء بیگم کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ اُبھر آئی، جس کا مفہوم سمجھنا آسان نہیں تھا۔

پھر جب مہرالنساء بیگم، میناباز ار کی دکانوں پر نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھ گئی تو ارجمند نے بدحواس لہجے میں کہا۔

''تم نے یہ کیا، کیا ماہ رخ؟..... تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟ پھر میرا کیا ہوگا؟'' یہ کہتے کہتے ارجمند کی آواز لرزنے لگی تھی۔

ماہ رخ نے آگے بڑھ کر ارجمند کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے لیا اور دعائیہ لہجے میں کہنے لگی۔

''خدا میرے اس چاند کو کبھی زوال سے ہم کنار نہ کرے..... نہ کبھی اسے گہن لگے..... اور

نہ کبھی کوئی سیاہ بادل کا ٹکڑا اسے چھپائے..... مسرتوں کی یہ روشنی ہمیشہ برقرار رہے۔ میں تو جان بوجھ کر مادر ملکہ کی خدمت میں جا رہی ہوں..... اور اس میں بھی تمہارا ہی فائدہ ہے بی بی!''

''میں کچھ بھی نہیں سمجھی، ماہ رخ! خدا کے لئے تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔ اس تنہائی میں میرا دم گھٹ جائے گا۔'' ارجمند کی خوب صورت آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی جھلکنے لگی۔

ماہ رخ نے اپنے دونوں ہاتھ کھینچ لئے اور ارجمند بانو سے سرگوشیاں کرنے لگی۔

''مادر ملکہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد میں شہزادہ خرم کے بھی قریب ہو جاؤں گی اور مہرالنساء بیگم کی حرکات و سکنات پر بھی نظر رکھ سکوں گی۔''

یہ سن کر ارجمند کے بجھے ہوئے چہرے پر شادابی کا رنگ لوٹ آیا۔ مگر اب بھی اسے کئی اندیشے پریشان کر رہے تھے۔

''خدا کرے، مہرالنساء بیگم مجھے آقا سے مانگ لیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آج کل انہیں میری شدید ضرورت ہے۔'' ماہ رخ کی سرگوشیاں جاری تھیں۔ ''اگر میں کسی طرح تمہاری پھوپھی کے نزدیک پہنچ گئی تو بہت سے اُلجھے ہوئے مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر تمہیں کچھ دنوں کے لئے اپنے آپ پر قابو پانا ہوگا۔ کہیں تمہاری بے قراریاں اس راز کو فاش نہ کر دیں کہ میں تمہاری رازدار ہوں اور تم شہزادہ خرم سے محبت کرتی ہو۔ تمہیں ہر حال میں مہرالنساء بیگم کے سامنے محتاط رہنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر چند لمحوں کے لئے ماہ رخ خاموش ہو گئی، پھر انتہائی شوخ و شریر لہجے میں کہنے لگی۔ ''اچھا، اب تم اپنے محبوب کا انتظار کرو۔ وہ شاہ خوباں، جان صد بہاراں بس آنے ہی والا ہے۔''

اس طرزِ تخاطب پر ارجمند شرما گئی اور اس مخملیں گھاس کو دیکھنے لگی، جو اس کے قدموں کے نیچے بچھی ہوئی تھی۔

❀.....❀.....❀

پھر کچھ دیر بعد ہی نقیبوں کی پُرشور آوازیں، شہنشاہ جہانگیر کی آمد کا اعلان کرنے لگیں۔ اچانک میناباز ار پر سناٹا سا چھا گیا اور لوگوں کو اپنے دلوں کی دھڑکنیں رک جانے کا گمان ہونے لگا۔ جہانگیر جدھر سے بھی گزرتا، میناباز ار کی عورتیں یا تو گھبرا کر سجدے میں چلی جاتیں یا پھر دونوں ہاتھ باندھ کر اپنی گردنوں کو اس طرح جھکا لیتیں کہ جیسے انہیں زمین کے سوا کسی دوسری چیز کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس عالم میں کسے خبر ہوتی کہ جہانگیر کس کام سے آیا تھا۔

عورتوں کے اس ہجوم میں صرف دو خواتین ایسی تھیں کہ جنہیں ہر قدم پر ہوشیاری سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ ارجمند نے اپنی پھوپھی مہرالنساء کی طرف پشت کر لی تھی اور مسلسل باغ کے دروازے کی جانب دیکھے جا رہی تھی کہ اس کا محبوب اسی راستے سے گزر کر آنے والا تھا۔ ارجمند

نے پہلے سے ہی اپنے محبوب کی راہوں میں آنکھیں بچھا دی تھیں۔ دوسری ماہ رخ تھی جو ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر شہنشاہ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

ماہ رخ کی آنکھیں جہانگیر سے زیادہ انجمن آراء کا تعاقب کر رہی تھیں۔ انجمن آراء، دربارِ جہانگیری کی سب سے بڑی مطربہ تھی اگرچہ اب اس کی جوانی آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی، مگر آواز میں وہی کھنک تھی۔ انجمن آراء، شہنشاہ کو شراب پلایا کرتی تھی اور جب جہانگیر اپنی خواب گاہ میں سونے کے لئے چلا جاتا تو انجمن کوئی پُر کیف راگ چھیڑ دیتی اور اس وقت تک گاتی رہتی، جب تک ہندوستان کا حکمراں گہری نیند نہ سو جاتا۔ آج بادشاہ خلافِ توقع اپنے امراء کے بغیر میناباز ار آیا تھا۔ بس درباری مطربہ انجمن تھی، جو شہنشاہ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ابھی ماہ رخ اس تبدیلی اور انجمن آراء کی آمد کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ شہنشاہ، مہرالنساء بیگم کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ مہرالنساء احترامِ شاہی کے طور پر نصف قد تک جھک گئی اور ایک خاص ادا کے ساتھ والیٔ ہند کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

جہانگیر کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ اُبھر آئی اور آنکھوں میں اس خمار کی کیفیت پیدا ہو گئی، جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ماہ رخ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب شہنشاہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کے خواب ناک رنگوں کا مشاہدہ نہ کر سکی۔

''مہرو! تمہیں عام انسانوں کی طرح ہمارے حضور خم نہیں ہونا چاہئے۔'' جہانگیر نے سحر زدہ سے لہجے میں کہا۔

''عالم پناہ! کنیز اپنی حیثیت سے خوب واقف ہے۔'' مہرالنساء آہستہ آہستہ سیدھی ہوئی اور جھکی جھکی نظروں کے ساتھ بولی۔

''ہم تمہاری حیثیت جانتے ہیں کہ تم کون ہو۔'' جہانگیر نے کہا اور شاہی قبا کی جیب سے ہیرے کی ایک انگوٹھی نکال کر مہرالنساء کی طرف بڑھا دی۔ ''اسے قبول کر لو تا کہ آج رات ہم چین کی نیند سو سکیں۔''

مہرالنساء نے انگوٹھی کے درمیان دمکتے ہوئے ہیرے کو دیکھا۔ ''ظلِ الٰہی کی ایک رات پر کنیز کی ساری زندگی کا سکون قربان۔ مگر یہ کیا ہے؟''

''ہمارے جذبوں کی ترجمان..... اور ہماری بے قراریوں کی زبان۔'' جہانگیر نے تیز لہجے میں کہا۔ ''مہرو! ہمارے اس حقیر تحفے کو قبول کرنے میں تاخیر سے کام نہ لو۔ کہیں میناباز ار میں موجود سینکڑوں عورتوں کی نظریں ہمارے تعاقب میں نہ ہوں اور ہماری ذات عام لوگوں کے درمیان ایک تماشا بن کر نہ رہ جائے۔''

مہرالنساء کا پورا جسم لرزنے لگا اور چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ ''عالم پناہ! میں اس تحفے کے قابل نہیں ہوں۔ خدا کے لئے، مجھ غریب پر رحم کیجئے۔'' مہرالنساء کی آواز کانپ رہی تھی۔

''غریب تو ہم ہیں مہرو! کہ اتنے آدمیوں کے سامنے تم سے اپنی نذر قبول کرنے کے لئے تم سے مسلسل التجا کر رہے ہیں۔''

نور جہاں مجبور ہو گئی اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے انگوٹھی لے لی۔

جہانگیر نے سکون کی سانس لی اور پھر آہستہ سے بولا۔ ''انجمن آراء تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اسے مایوس نہ کرنا۔''

یہ کہہ کر شہنشاہ دوسری دکانوں کا سرسری جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ماہ رخ کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں۔ اس نے جہانگیر کے جاتے ہی اپنی نظروں کا زاویہ تبدیل کر لیا تھا اور میناباز ار میں اس طرح کھڑی تھی، جیسے وہ کسی اور طرف دیکھ رہی ہو۔ لیکن اس صورت میں بھی اس کی نگاہوں کا مرکز مہرالنساء کی ذات تھی۔ شہنشاہ کے جانے کے بعد مطربہ انجمن آراء، مہرالنساء کے پاس ٹھہر گئی اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ ماہ رخ نے محسوس کیا کہ مہرالنساء بار بار اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ میناباز ار میں کوئی عورت اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ نہیں لے رہی ہے تو وہ انجمن آراء کی طرف متوجہ ہو گئی۔

ماہ رخ نے بھی فوراً ہی اپنا زاویہ تبدیل کر لیا۔ اب اس کی نظروں کے سامنے ایک اور عجیب منظر اُبھر رہا تھا۔ ماہ رخ نے دیکھا کہ انجمن آراء باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئی اور پھر اس نے ایک گلابی رنگ کا لفافہ مہرالنساء کی طرف بڑھایا۔ مہرالنساء نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور بہت تیزی سے وہ لفافہ لے لیا۔ انجمن آراء مسکراتی ہوئی اسی راستے پر چلی گئی، جدھر سے شہنشاہ جہانگیر گزرا تھا۔

❀.....❀.....❀

ماہ رخ پلٹ کر ارجمند بانو کی طرف آئی۔ وہ بار بار پریشان نظروں سے باغ کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دُور دُور تک شہزادہ خرم کی آمد کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ماہ رخ نے اپنی آقا زادی کے اضطراب کا اندازہ کر لیا اور پھر قریب آ کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی۔

''اس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ شہزادۂ عالم ضرور تشریف لائیں گے۔''

ارجمند اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اچانک ماہ رخ کی آواز سن کر اُچھل پڑی اور پھر شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔

''تم نے تو دبے پاؤں آ کر مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ بات کرنے کا یہ کوئی انداز ہے؟'' ارجمند بانو کی گفتگو سے جھنجلاہٹ اور تلخی نمایاں تھی۔

''بی بی! مجھ پر غصہ کیوں اُتار رہی ہو؟'' ماہ رخ نے شریر لہجے میں کہا۔ ''یہ شکایت شہزادہ خرم سے کیجئے گا کہ انہوں نے آپ کو طویل انتظار کی کشمکش میں کیوں مبتلا کیا؟''

ارجمند کو فوری احساس ہو گیا کہ وہ جوشِ جذبات میں احتیاط کے راستے سے ہٹ گئی ہے۔

''معاف کرنا ماہ رخ! میں.....''

ابھی ارجمند اپنی بات مکمل کرنے بھی نہیں پائی تھی کہ ماہ رخ درمیان میں بول اُٹھی۔

''نہیں بی بی! تمہیں معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ کم بخت مرض ہی ایسا ہے کہ انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔''

ارجمند کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ماہ رخ نے تیز سرگوشی میں تنبیہہ کی۔ ''خاموش ہو جاؤ۔ مہرالنساء بیگم اسی طرف آ رہی ہیں۔''

چند لمحوں بعد مہرالنساء ان دونوں کے قریب آ گئی۔ پھر رسمی طور پر اس نے اپنی بھتیجی کا حال پوچھا اور فوراً ہی ماہ رخ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ماہ رخ! میں نے کل رات ہی مادر ملکہ (سلیمہ بیگم) سے تیرے بارے میں بات کی تھی۔ انہیں واقعتاً اس بڑھاپے میں ایک کنیز کی ضرورت ہے۔ میں جلد ہی بھائی صاحب سے کہہ کر تجھے اس خدمت پر مامور کر دوں گی۔''

ماہ رخ نے بڑے عاجزانہ انداز میں شکریہ ادا کیا اور مہرالنساء بیگم تیز قدموں سے قصرِ شاہی کی طرف چلی گئی۔

''تم اپنی پھوپھی حضور کے ہاتھ میں وہ گلابی لفافہ دیکھ رہی ہو!'' ماہ رخ نے ایک بار پھر سرگوشی کرتے ارجمند بانو سے کہا۔ ''اس لفافے میں شہنشاہ کا پیغامِ محبت بند ہے۔''

احساسِ شرم و ندامت سے ارجمند کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو؟ کوئی گناہ کرے اور تمہیں حجاب آئے۔'' یکایک ماہ رخ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''شہنشاہ جہانگیر سترہ اٹھارہ عورتوں کے شوہر ہیں اور اپنی محبت کے لئے بے شمار کنیزیں رکھتے ہیں۔ اور مہرالنساء ایک جوان بیٹی کی ماں ہیں۔ مگر دونوں اس عمر میں بھی لڑکے لڑکیوں کی طرح خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ شاہی محل ہے ارجمند بانو! یہاں ہر شخص اپنے خوابوں کی تعبیر کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ پھر تم کیوں ایک پتھر کا بت بن کر رہ گئی ہو؟ تیز رفتاری کا مظاہرہ نہ سہی، مگر کچھ تو آگے بڑھو۔ اگر اسی طرح اس بھیڑ میں خاموش اور بے حس و حرکت کھڑی رہیں تو لوگ تمہارے خوب صورت جسم کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔'' ماہ رخ اُسے ایک انتہائی تجربہ کار عورت کی طرح شاہی محل کی فضا کے متعلق اسرار و رموز سمجھا رہی تھی۔ پھر یکایک اس نے باغ کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ شہزادہ خرم تنہا مینا بازار کی جانب آ رہا تھا۔

''اب میں جا رہی ہوں..... خدا کے لئے اس موقع کو برباد نہ کر دینا۔'' یہ کہہ کر ماہ رخ دوسری طرف چلی گئی۔ مگر اس کی نظریں شہزادہ خرم اور ارجمند کی مسلسل نگرانی کر رہی تھیں۔

❀.....❀.....❀

شہزادہ خرم آہستہ آہستہ باغ میں داخل ہوا اور ارجمند کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ اپنے محبوب

کو اس قدر نزدیک پا کر ارجمند کی سانسیں بے ربط ہو گئیں اور جسم پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری ہو گیا۔

''ارجمند بانو! آپ کیسی ہیں؟'' خرم کی نرم و شیریں آواز اُبھری اور ارجمند کو ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی جادوگر نے اس کے دل و دماغ کو مسحور کر دیا ہو۔

وہ شہزادے کی طرف سے پرسش حال کا جواب دینا چاہتی تھی مگر اس کے ہونٹ پھڑا کر رہ گئے تھے۔ یکایک ارجمند کو ماہ رخ کی باتیں اور مشورے یاد آنے لگے۔ پھر اس نے بمشکل تمام اپنی لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے یہ الفاظ ادا کئے۔

''شہزادۂ عالم کی دعاؤں کے طفیل زندہ ہوں۔''

''ہم شہزادۂ عالم نہیں، صرف خرم ہیں۔'' ایک حکمراں کے بیٹے کا یہ عجیب انکسار تھا۔ ''خدا تمہیں زندگی کے ہر معرکے میں ارجمند رکھے۔''

بڑی عجیب دعا تھی۔ ارجمند نے ایک لمحے کے لئے اپنے محبوب کی طرف دیکھا، پھر فوراً ہی اس کی نظریں جھک گئیں۔

شہزادہ خرم ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے ارجمند کو سرخ گلاب کا ایک پھول پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اس دنیا کے لالہ زار میں صرف گلاب کے پھول پسند ہیں۔ ہماری اس نذر کو قبول فرمائیے تاکہ یہ گلاب ہمیشہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرے۔''

ارجمند بارِ حیا سے کچھ اور سمٹ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاب لینا چاہا مگر اس کا جسم پتھر کا ہو کر رہ گیا تھا۔

چند ساعتیں اسی سکوت اور کشمکش کے عالم میں گزر گئیں۔ پھر شہزادہ خرم اُداس لہجے میں بولا۔

''شاید ہمارا یہ تحفہ تمہارے شایانِ شان نہیں ارجمند بانو! مگر ہم بھی کیا کرتے؟ ہمارے پاس پھولوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ ہم اپنی محبوب ہستی کو سیم و زر کے غلاف میں لپٹے ہوئے خار پیش کر دیتے۔''

ارجمند کو شہزادہ خرم کی اس سادگی نے بے قرار کر دیا اور بے اختیار اس کا ہاتھ آگے بڑھ گیا۔ ''شہزادہ عالم! یہ پھول تو میری زندگی سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔'' یہ کہہ کر ارجمند نے خرم کے ہاتھ سے گلاب کا پھول لے لیا۔

''ہم شکرگزار ہیں کہ آپ نے پھول کی قدر و قیمت کو سمجھا اور ہمیں سرفراز کیا۔'' خرم نے سحرکار لہجے میں کہا اور شاہانہ وقار کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا واپس چلا گیا۔ شہزادے کو مینا بازار کے رنگ و آرائش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف ارجمند کے لئے آیا تھا اور اس سے چند باتیں کر کے شاہی محل کی طرف لوٹ گیا۔

ماہ رخ، ارجمند سے تھوڑے فاصلے پر موجود تھی اور پورے ہوش و حواس کے ساتھ محبت کی منزل کے دونوں مسافروں کی رفتار کا جائزہ لے رہی تھی۔ شہزادہ خرم کے چلے جانے کے باوجود وہ ارجمند کے قریب نہیں آئی۔ ماہ رخ اس کے انہماک میں خلل ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے

اندازہ کرلیا تھا کہ ارجمند کی نظریں اس راستے پر جمی ہوئی ہیں، جس سے ابھی ابھی اس کا محبوب گزرا ہے۔

جب شہزادہ خرم نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ارجمند، گلاب کے پھول کو دیکھتی رہی، جو اس کے محبوب کا پہلا تحفہ تھا۔ پھر کیف و نشاط کے اثر سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور بے اختیاری کے عالم میں ارجمند نے پھول کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ عجیب سرشاری کی کیفیت تھی کہ اسے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ ارجمند نے گھبرا کر دیکھا، ماہ رخ اس کے قریب کھڑی تھی۔

''محبت کی مشکل ترین راہ میں پہلی کامیابی مبارک ہو۔'' ماہ رخ نے شدید جذباتی لہجے میں کہا۔ وہ اپنے دل کے زخموں کی سوزش کو فراموش کر کے مسکرا رہی تھی۔ ''کیا خوبصورت اور پاکیزہ تحفہ ہے۔'' ماہ رخ نے پھول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! واقعتاً تم بہت خوش نصیب ہو۔ خدا تمہاری خوش بختی کو دشمنوں کی نظر بد سے محفوظ رکھے۔''

''یہ سب کچھ تمہاری رفاقتوں کے سبب ہے ماہ رخ!'' ارجمند بانو نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نہ ہوتیں تو خدا ہی جانتا ہے کہ میرا کیا حال ہوتا؟''

''کچھ نہیں ہوتا، آقا زادی!'' ماہ رخ کا لہجہ اچانک بجھ کر رہ گیا تھا۔ ''ایک میرے نہ ہونے سے گردشِ روز و شب نہیں ٹھہر جاتی۔''

''تمہارے نہ ہونے سے زمانے کی رفتار میں تو کوئی فرق نہ پڑتا مگر ارجمند کی زندگی میں یقیناً ایک کمی آجاتی۔ میری دعا ہے کہ خدا تمہیں بھی جلد از جلد آسودۂ منزل کرے۔''

''میری فکر چھوڑو بی بی!'' ماہ رخ ایک بار پھر جبراً مسکرانے لگی۔ ''میرا حال کیا پوچھتی ہو؟ وہ مسافر ہوں کہ منزل بھی جسے یاد نہیں۔''

❀.....❀.....❀

وہ رات، مرزا غیاث بیگ کے خاندان کے لئے نئی فتوحات اور نئی خوشیوں کی رات تھی۔ ایک ہی گھرانے کے دو افراد بیک وقت اپنے اپنے ریشمی بستروں پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ نیند ان کی آنکھوں سے دُور تھی اور وہ جاگتے میں خمار انگیز اور رنگین خواب دیکھ رہے تھے۔

ان دو افراد میں سے ایک علی قلی (شیر افگن) کی بیوہ مہر النساء بیگم تھی، جو سلطان سلیمہ بیگم کے برابر والے کمرے میں ایک عجیب سے اضطراب کا شکار تھی۔ کبھی وہ بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیتی، کبھی بے تابانہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتی، کبھی مومی شمع کو غور سے دیکھنے لگتی جو آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ اور کبھی شہنشاہ جہانگیر کے اس خط کو پڑھنے لگتی، جو درباری مغنیہ انجمن آراء نے اس کے حوالے کیا تھا۔ مشک و عنبر کی خوشبو میں بسا ہوا ایک ایک حرف اس کی نظروں کے سامنے رقص کر رہا تھا۔ جہانگیر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''جان عالم پناہ! اب ہم زیادہ دن تک صبر نہیں کر سکتے۔ تمہیں ہماری مجبوریوں کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ ہم ایک عاشق جاں سوختہ کے ساتھ ایک ذمے دار شہنشاہ بھی ہیں۔ اگر ہم اپنے شب و روز تمہاری یادوں کی نذر کر دیں گے تو اس مظلوم رعایا کا کیا ہوگا، جو ہمہ وقت ہمیں پکارتی رہتی ہے۔ ہم اس وقت بھی زنجیرِ انصاف کی گونج سن رہے ہیں۔ کوئی نہ کوئی فریادی ہمیں آواز دے رہا ہوگا۔ تم نے کبھی اپنے شبستان سے نکل کر نہیں دیکھا کہ ایک شخص، جسے ساری دنیا شہنشاہ جہانگیر کے نام سے یاد کرتی ہے، وہ کتنے زمانے سے تمہارے در پر فریاد کر رہا ہے۔''

خط پڑھ کر مہر النساء پر ایک عجیب سی ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ ایک لمحے کے لئے اسے خیال آیا کہ وہ سلیمہ بیگم کے حصار سے نکل کر جہانگیر کے شبستانِ محبت میں داخل ہو جائے اور شہنشاہ کے قدموں پر سر رکھ کر کہے کہ اے میرے محبوب! میں رسموں کی ایک ایک زنجیر توڑ کر چلی آئی ہوں۔ اب مجھے دنیا کسی بھی نام سے پکارے، مگر اب میں صرف تیرے لئے ہی زندہ رہوں گی۔ اور ایک دن تیری ہی آغوشِ وفا میں دم توڑ دوں گی۔ یہ خیال آتے ہی وہ بے قرار ہو کر دروازے کی طرف بڑھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے ایک اور خیال نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

''مہر النساء! ابھی شہنشاہ کے جذبوں کو اور مشتعل ہو جانے دے..... ابھی اس آگ کو اور بھڑکنے دے..... کہیں ایسا نہ ہو کہ جہانگیر کی آغوش تک پہنچتے پہنچتے جذبات کے یہ شعلے سرد ہو جائیں۔ اور پھر تیری ذات ایک تماشا بن کر رہ جائے۔''

اس خیال کے آتے ہی مہر النساء کے بے قرار قدم ٹھہر گئے اور وہ دوبارہ بستر پر دراز ہو گئی۔ اب وہ بہت زیادہ پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ شہنشاہ کے حد سے بڑھتے ہوئے اضطراب نے اسے ایک عجیب سی آسودگی بخشی تھی۔

دوسری طرف ارجمند بانو، شہزادہ خرم کے دیئے ہوئے پھول کو انتہائی محویت کے عالم میں دیکھے جا رہی تھی۔ کبھی وہ اس گلاب کو اپنے آتشیں رخساروں سے مس کرتی اور کبھی احمریں ہونٹوں سے لگا لیتی۔ آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ چاروں طرف کیف و نشاط کا ایک لامحدود سمندر ہے، جس کی سرور انگیز موجیں اسے بہائے لئے جا رہی ہیں۔ پھر اسی جذب و مستی کی کیفیت سے دوچار ہو کر وہ حضرت شیخ سعدیؒ کی یہ غزل گانے لگی۔

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست !
تا نہ پنداری کہ تنہا می روی !

(اے میرے محبوب! سعدی کی آنکھیں اور دل تیرے ساتھ ساتھ ہیں تاکہ تجھے یہ خیال نہ آئے کہ تُو اس سفر میں تنہا ہے)

❀.....❀.....❀

وہ رات، ارجمند بانو کے لئے جس قدر رنگین تھی، صبح اتنی ہی زیادہ سنگین تھی۔ اس کی پھوپھی، مہرالنساء بیگم آئیں اور آصف خان سے کہنے لگیں۔

''بھائی صاحب! کچھ دن کے لئے اپنی خادمہ ماہ رخ کو ہمارے حوالے کر دیں۔ مادر ملکہ کی نگہداشت کے لئے ایک ہوشیار اور ذمے دار کنیز کی اشد ضرورت ہے۔''

آصف خان اپنی بہن کی درخواست کو مسترد کر سکتا تھا مگر مادر ملکہ کے حوالے نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ ماہ رخ کو عارضی طور پر اپنے گھر سے رخصت کر دے۔ پھر بھی اُس نے یہ شرط عائد کر دی کہ ماہ رخ کے جانے سے ارجمند تنہا رہ جائے گی۔ اس لئے ماہ رخ کچھ وقت روزانہ یہاں گزارے گی۔ مہرالنساء نے فوراً ہی اپنے بھائی کی یہ شرط مان لی۔ آصف خان کو کیا معلوم تھا کہ اس کی بہن، مادر ملکہ کی خدمت کے بہانے سے ماہ رخ کے ذریعے اپنا ایک مخصوص کام کرانا چاہتی ہے۔

مگر ماہ رخ اور ارجمند جانتی تھیں کہ مہرالنساء بیگم کی آمد کا کیا مقصد ہے؟ ماہ رخ جاتے جاتے ارجمند سے ملی اور اسے تسلی دے کر شاہی محل چلی گئی۔

''میرے پیچھے پریشان نہ ہونا کہ میں تمہارے ہی کام سے قصرِ شاہی جا رہی ہوں۔ میں کچھ دیر کے لئے روزانہ یہاں آؤں گی اور تمہیں بتاؤں گی کہ محبت اور سیاست کی بساط پر کون کون سے مہرے کس کس طرح حرکت کر رہے ہیں۔''

ارجمند، ماہ رخ کے جانے سے بہت زیادہ اُداس تھی۔ مگر اس اُداسی نے اس وقت وحشت کا رنگ اختیار کر لیا، جب ارسلان بیگ گھر میں داخل ہوا۔

ارسلان بیگ، آصف خان کے دور کا ایک رشتہ دار تھا۔ اُس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان تھی۔ ایرانی نژاد ہونے کے سبب ارسلان کا رنگ سرخ و سفید تھا، مگر چہرے کے نقوش بہت بھونڈے تھے۔ وہ چند سال پہلے ایران سے ہجرت کر کے دہلی پہنچا تھا۔ مرزا غیاث بیگ نے اُسے دربارِ اکبری میں پیش کیا۔ ارسلان بیگ بنیادی طور پر ایک سپاہی تھا، اس لئے غیاث بیگ کی سفارش سے اسے شاہی فوج میں ملازمت مل گئی۔ ارسلان کو فنونِ سپہ گری کے علاوہ شعر و شاعری سے بھی گہرا شغف تھا۔ وہ خود تو شاعر نہیں تھا مگر اسے فارسی کے عظیم شعراء کا بیشتر کلام حفظ تھا۔ اس کے علاوہ اسے بے شمار لطائف یاد تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ارسلان بیگ انتہائی حاضر جواب اور خوشامدی نوجوان تھا۔

جب تک اکبر اعظم زندہ رہا، ارسلان کے جوہر نہ کھل سکے۔ مگر جیسے ہی جہانگیر تخت نشیں ہوا، ارسلان کے دن بھی پھر گئے۔ خوشامدانہ عادتوں اور مگر صفات نے اسے دربارِ جہانگیری کی ایک نمایاں شخصیت بنا دیا۔ شہنشاہ کچھ دن تک ارسلان کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اس کا نام مصاحبوں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔

ارسلان بیگ کی ایک خاص ادا تھی، جس نے اُسے شہنشاہ کے قریب پہنچا دیا تھا۔ دربارِ

شاہی میں سجدہ کرنے کی رسم، جلال الدین اکبر نے رائج کی تھی۔ پھر اس کے انتقال کے بعد جہانگیر نے بھی اسی رسم کو جاری رکھا تھا۔ سجدے کی یہ رسم اس طرح ادا کی جاتی تھی کہ درباری پہلے گھٹنوں کے بل زمین پر جھکتے تھے اور پھر اپنے سر فرش پر ٹیک دیا کرتے تھے۔ اس حالت میں ان کے دونوں ہاتھ بھی زمین کو چھو لیتے تھے۔

ارسلان بیگ بھی دربار میں داخل ہو کر عام انسانوں کی طرح رسمِ سجدہ ادا کرتا تھا مگر اُس کی ایک عادت مخصوص تھی کہ وہ سر جھکاتے وقت با آواز بلند شہنشاہ جہانگیر کو مخاطب کر کے کہتا تھا۔

''خداوندِ ہندوستان اس گناہ گار بندے کا سلام قبول فرمائیں۔''

ایک درباری کی زبان سے یہ ناجائز تعریف سن کر جہانگیر کے ہونٹوں پر فاتحانہ تبسم اُبھر آتا اور چہرے پر غرور و کبر کا رنگ کچھ اور نمایاں ہو جاتا۔ پھر اسی بدترین خوشامد نے ارسلان بیگ کو خاص مصاحبوں کی صف تک پہنچا دیا۔ ارسلان بیگ فرصت کے لمحات میں جہانگیر کو دلچسپ لطائف سنا کر ہنساتا۔ اور کبھی عظیم فارسی شعراء کے کلام سے والیٔ ہند کو محظوظ ہونے کا موقع فراہم کرتا۔ نتیجتاً جہانگیر نے کئی بار اسے بیش بہا انعامات اور جاگیروں سے نوازا تھا۔ ارسلان بیگ سے اکثر درباری ڈرتے تھے کہ کہیں وہ کسی کی شکایت نہ کر دے اور پھر اس پر شاہی عتاب نازل ہو جائے۔ یہی وہ اسباب تھے، جنہوں نے خود فریبی کی حد تک ارسلان کو گمراہ کر دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو مملکتِ ہندوستان کی بااثر شخصیت سمجھنے لگا تھا۔

دُور کا عزیز ہونے کی وجہ سے ارسلان بیگ کبھی کبھی آصف خان کے گھر آیا کرتا تھا۔ ایک دن اُس کی نظر، ارجمند بانو پر پڑی اور وہ اس حسین دوشیزہ کی زلف کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ ارسلان بیگ نے کئی بار ارجمند بانو کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ارسلان کا خیال تھا کہ وہ اپنی چرب زبانی سے ایک معصوم لڑکی کو بہت جلد شیشے میں اُتار لے گا۔ لیکن ارسلان کو اس وقت شدید مایوسی ہوئی، جب ارجمند نے اسے سلام کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ارجمند کو نہ اس کی صورت پسند تھی اور نہ خوشامدانہ عادت۔

پھر اسی بے رخی کے سبب ارسلان کے دل میں ارجمند کی طرف سے گرہ پڑ گئی۔ اور اس نے طے کر لیا کہ وہ اس سرکش لڑکی کو حاصل کر کے ہی رہے گا۔ ارجمند کی شدید ناگواری کے باوجود ارسلان نے ایک بار اور بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آصف خان کی لڑکی کو ایک قیمتی ہار پیش کیا۔ یہ وہی ہار تھا، جو اسے شہنشاہ جہانگیر نے بطور انعام دیا تھا۔

ارجمند بانو تحفے کا نام سن کر برافروختہ ہو گئی اور اس نے انتہائی غضب ناک لہجے میں کہا۔

''اگر آپ نے آئندہ یہ بے شرمی کا عمل دہرایا تو میں بابا جان سے شکایت کر دوں گی۔''

ارجمند کو اس قدر غصے میں دیکھ کر ارسلان بیگ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ پھر وہ چپ چاپ باہر جانے لگا تو ارجمند نے دوبارہ اسے انتہائی سخت لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اور یہ بھی سن لیجئے کہ آپ پھر کبھی میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں غیر انسانی سلوک روا

رکھنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔"

اس واقعے کے بعد ارسلان کی چھوٹی چھوٹی کینہ توز آنکھوں میں کئی رنگ اُبھر کر ڈوب گئے تھے۔

ارجمند کی بارگاہِ جمال سے ٹھکرایا ہوا ارسلان بیگ آج نئے ارادے لے کر آصف خان کے پاس آیا تھا۔ پہلے تو اس نے حسبِ عادت آصف خان اور اس کی بیوی کی تعریف میں لمبے چوڑے قصیدے پڑھے، پھر اپنی تنہائی کا ماتم کرتے ہوئے کہا۔

"میں ہندوستان میں اکیلا ہوں اور یہاں آپ کے سوا میرا کوئی عزیز موجود نہیں۔ اگر ماں باپ زندہ ہوتے تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ مجبوراً مجھے اپنی زبان سے کہنا پڑ رہا ہے کہ....."

ارسلان نے مصنوعی شرم کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات نامکمل چھوڑ دی۔

"صاف صاف کہو ارسلان! تم بھی ہمارے بیٹے کی طرح ہو۔" آصف خان نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

پھر ارسلان بیگ نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کرلیں۔"

آصف خان اور اس کی بیوی دونوں چونک اُٹھے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ارسلان بیگ اور ارجمند بانو میں ازدواجی رشتہ بھی قائم ہوسکتا ہے۔

"کیا آپ کو میری خاندانی حیثیت پر کوئی اعتراض ہے؟" ارسلان بیگ نے آصف خان اور اس کی بیوی کو خاموش پا کر کہا۔

"نہیں بیٹے!" آصف خان نے رک رک کر کہا۔ "تم تو ہمارے ہی خاندان کے ایک فرد ہو۔"

"پھر کیا آپ کے نزدیک میری معاشی حیثیت مشکوک ہے؟" ارسلان بیگ کا لہجہ یکایک پُرجوش ہوگیا تھا۔ "اس سلسلے میں شہنشاہ جہانگیر بھی میری سفارش کرسکتے تھے مگر میں ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے ظلِ الٰہی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔" ارسلان بیگ کی چرب زبانی کا آغاز ہوگیا تھا۔

"نہیں، اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" آصف خان نے کہا۔ "ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں مگر ارجمند ابھی بہت کم عمر ہے۔" آصف خان یہ تو جانتا تھا کہ ارسلان بیگ کی خوشامدانہ حرکتیں اسے کسی دن بھی کسی بڑے منصب پر پہنچا سکتی ہیں لیکن ایک انسان کی حیثیت سے وہ ایک ناپسندیدہ شخصیت تھا۔ آصف خان خود مصاحبت کو پسند نہیں کرتا تھا اس لئے ارسلان بیگ کا وجود بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ دوسرے ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے بھی ارسلان بیگ اس قابل نہیں تھا کہ وہ ارجمند جیسی حسین لڑکی کا شریکِ زندگی بن سکے۔ مجبوراً آصف خان نے ارجمند کی کم عمری کو بنیاد بنا کر گریز کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اس وقت آپ صرف نسبت طے کردیں۔ شادی کے لئے دو تین سال کا انتظار کیا جاسکتا ہے۔" ارسلان بیگ نے بے باک لہجے میں کہا۔

آصف خان کو ارسلان کی یہ بے تکلفی پسند نہیں آئی تھی مگر پھر بھی اس نے انتہائی ضبط وتحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں ارجمند کی مرضی کے بغیر یہ رشتہ منظور نہیں کرسکتا۔"

"مشرقی لوگوں میں یہ رسم ناپسندیدہ ہے کہ شادی سے پہلے وہ لڑکی کی مرضی معلوم کریں۔" ارسلان بیگ نے درپردہ آصف خان کی اس دلیل کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے خاندان کی یہ روایت تو کبھی نہیں رہی۔"

"میرے خاندان کی یہی روایت ہے۔" اچانک آصف خان کا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔ "میں نہیں جانتا کہ مشرق کے دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں۔ مگر ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنی لڑکی کی مرضی کو اہمیت دوں۔"

ارسلان بیگ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ارجمند کی مرضی جانتا تھا مگر پھر بھی اپنی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ ارجمند بانو سے دریافت کرلیں مگر اس کا لحاظ رکھیں کہ رشتہ مانگنے میں پہل میری جانب سے ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر ارسلان بیگ چلا گیا۔

دربارِ جہانگیری کے بدترین خوشامدی کے جاتے ہی آصف خان کی بیگم نے اپنے شوہر سے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے اس رشتے کے بارے میں؟"

"رشتے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟" آصف خان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔ "میں زبان کے بھکاریوں اور پیٹ کے کتوں کو پسند نہیں کرتا۔ دربارِ شاہی میں ایک مسخرے یا میراثی سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور پھر خاندانی اعتبار سے بھی ہماری برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ اسے اپنے ہی خاندان کا ایک فرد تسلیم کررہے تھے۔" آصف خان کی بیوی نے چونک کر کہا۔

"تم اس راز کو نہیں جانتی بیگم!" آصف خان کے ہونٹوں سے آگ برس رہی تھی۔ "اپنے باپ کی طرف سے وہ ہمارا قریبی عزیز ہے مگر اس کے مرحوم باپ نے ایک ایرانی کنیز سے شادی کرلی تھی جس کے نتیجے میں اہلِ خاندان نے اس سے ترکِ تعلق کرلیا تھا۔ ایک کنیز زادہ میری بیٹی ارجمند کا شوہر کس طرح ہوسکتا ہے؟ یہ ممکن ہی نہیں بیگم۔"

"اگر اس نے شہنشاہ کو درمیان میں لانے کی کوشش کی؟" بیگم نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر شہنشاہ کو میری گزارشات بھی سننی پڑیں گی۔" آصف خان کا لہجہ بدستور شرربار تھا۔

"اگر شہنشاہ نے آپ کو مجبور کیا؟" بیگم کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

"میں شہنشاہ کو اپنی خدمات یاد دلاؤں گا..... اور اگر میری خدمات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا تو میں ہندوستان چھوڑ کر ایران چلا جاؤں گا۔ اور اگر شہنشاہ کے دباؤ میں آ کر ایران کی زمین نے بھی مجھے قبول نہیں کیا تو کسی دُور دراز کے ملک جا کر گم نامی اور غربت کی زندگی گزارنا پسند کر لوں گا۔ مگر اپنی بیٹی کا ہاتھ اس بھکاری کے ہاتھ میں نہیں دوں گا، جو ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں شہنشاہ کو خداوند کہہ کر پکارتا ہے۔"

آصف خان کی بیوی خاموش ہو گئی۔ وہ خود بھی ارسلان بیگ کو پسند نہیں کرتی تھی۔ مگر جب اس عیار شخص نے شادی کے معاملے میں جہانگیر کی مداخلت کا ذکر کیا تو ایک عورت ہونے کی وجہ سے وہ شاہی رعب و جلال سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔

ارجمند بانو چھپ کر اپنے باپ کی تمام گفتگو سن رہی تھی۔ پھر جب اس نے آصف خان کی طرف سے مکمل انکار کا لفظ سن لیا تو شدتِ جذبات سے ارجمند کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر اس نے زیرِ لب اپنے باپ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"میرا عظیم باپ..... مہربان اور شفیق باپ..... اولاد کے حقوق ادا کرنے والا باپ۔"

❀.....❀.....❀

دوسری طرف شہزادہ خرم کے روز و شب میں ایک عجیب سا انقلاب آ گیا تھا۔ ہر وقت پُرجوش اور اپنے کاموں میں غرق رہنے والا شہزادہ اب اُداس رہنے لگا تھا۔ کئی دن سے اس نے جنگی تربیت بھی حاصل نہیں کی تھی۔ سپہ سالار مہابت خان، خرم کا فوجی اتالیق تھا۔ اور شہنشاہ کی طرف سے مہابت خان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ جلد از جلد شہزادے کو فنونِ سپاہ گری میں کامل کے درجے تک پہنچا دے۔ مہابت خان خرم پر بہت زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ اور خود شہزادے کو بھی بس ایک ہی لگن تھی کہ وہ جلد از جلد میدانِ جنگ کی سیاست کے ایک ایک راز کو سمجھ لے۔ مگر چند روز سے خرم بے دلی کا شکار نظر آنے لگا تھا۔ اس نے تلوار ایک طرف رکھ دی تھی اور جنگی تربیت کے میدان میں گھنٹوں خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہتا تھا۔ مہابت خان نے کئی بار شہزادے سے اس کی اُداسی کا سبب پوچھا مگر خرم نے ہر مرتبہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے بات کو ٹال دیا۔

مہابت خان ایک جہاندیدہ شخص تھا۔ اس نے شدید محنت کے بعد "سپہ سالاری" کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ شاہی محل کی رنگین فضا اور اپنے تجربات کی روشنی میں اس نے شہزادے کے چہرے پر لکھی ہوئی اُداسی کا مفہوم سمجھ لیا۔ اور پھر جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔

"ظلِ الٰہی! اب شہزادہ عالم کو شمشیر و سناں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھ گناہ گار کی آنکھیں اس وقت کوئی اور ہی منظر دیکھ رہی ہیں۔"

"صاف صاف کہو مہابت خان!" جہانگیر کے لہجے میں جلالِ شاہی سے زیادہ تشویش کے

آثار نمایاں تھے۔

"آپ کے اس ادنیٰ غلام کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہزادۂ عالم کسی کی زلف کے اسیر....."

مہابت خان نے ڈرتے ڈرتے کہا اور اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

"نہیں مہابت خان! تمہاری آنکھیں بہت بڑا دھوکا کھا رہی ہیں۔" جہانگیر نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "خرم اس بے راہ روی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ پندرہ سال کا ہونے کے باوجود اس نے آج تک شراب کا ایک قطرہ نہیں چکھا۔ جب کہ اس عمر میں دوسرے شہزادے "شراب کی نہر" پی جاتے ہیں۔"

"ظلِ الٰہی! پھر یہ غلام مجبور ہے۔ آپ شہزادۂ عالم سے ان کی اُداسی کا سبب دریافت کر سکتے ہیں۔" مہابت خان نے سر جھکا دیا۔

جہانگیر کچھ دیر تک اپنے خیالات میں ڈوبا رہا، پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مہابت خان کو چلے جانے کا حکم دیا۔ مہابت اُلٹے قدموں واپس چلا گیا اور جہانگیر نے فوراً ہی اپنی درباری مطربہ انجمن آراء کو طلب کر لیا۔

"انجمن! ہمیں سپہ سالار مہابت خان نے اطلاع دی ہے کہ شہزادہ خرم کسی نامعلوم لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ ہم ذاتی طور پر اس خبر کو نامعتبر قرار دیتے ہیں مگر پھر بھی احتیاط کا تقاضا ہے کہ تم اس معاملے کی تحقیق کرو۔"

انجمن آراء، جہانگیر کے قدموں کو بوسہ دے کر رخصت ہونے لگی تو جہانگیر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم بہت رازداری کے ساتھ خرم کی نگاہوں کا تعاقب کرو گی، اسے کسی بھی حال میں یہ شک نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔"

❀.....❀.....❀

درباری مطربہ، انجمن آراء، سائے کی طرح شہزادہ خرم کے ساتھ ساتھ تھی۔ اور خرم کو احساس تک نہیں تھا کہ ایک درباری کنیز کی دو ہوشیار آنکھیں مسلسل اس کی نگرانی کر رہی ہیں۔ آج بھی روزانہ کی طرح خرم نے اپنے فوجی اتالیق مہابت خان سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میری طبیعت بدستور خراب ہے، اس لئے میں شمشیر زنی نہیں کر سکوں گا۔"

مہابت خان، شہزادے کی بہانہ سازی کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا تھا مگر پھر بھی اس نے ہلکی سی تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"شہزادۂ عالم! شمشیر زنی بہت بے وفا فن ہے۔"

خرم نے چونک کر اپنے اتالیق (استاد) کی طرف دیکھا۔ "بے وفا؟"

"ہاں میرے آقا زادے!..... شمشیر اسی وقت تک قابو میں رہتی ہے، جب تک اس پر انسانی

انگلیوں کی گرفت مضبوط رہے اور بازو مسلسل حرکت کرتے رہیں۔'' مہابت خان بڑی احتیاط کے ساتھ شہزادے کو سمجھا رہا تھا۔ ''اگر آپ ایک دن کے لئے بھی مشق چھوڑ دیں گے تو شمشیر کی بے وفائی کا آغاز ہو جائے گا اور وہ آپ سے نظریں چرانے لگے گی۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آپ نے کئی دن سے شمشیر کو چھوا تک نہیں ہے..... پھر آپ ہی فرمائیں کہ اس کی بے وفائی کا انداز کیا ہوگا؟''

مہابت خان نے عجیب سوال کیا تھا۔ خرم سے فوری طور پر کوئی جواب نہیں بن پڑا اور وہ حیرت زدہ نظروں سے اپنے سپہ سالار کو دیکھتا رہا۔

''شہزادہ عالم!'' مہابت خان نے دوبارہ خرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شمشیر، مردوں کی محبوبہ ہے..... اور آپ تو جوانمرد ہیں۔ مردوں کے مرد۔'' مہابت خان نے ''محبوبہ'' کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا تھا۔

اس لفظ کو سن کر خرم کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ اُبھر آیا اور اس کی نظروں کے سامنے ارجمند کی ہوش ربا تصویر رقص کرنے لگی۔ شہزادہ کچھ دیر کے لئے محبوبہ کے لفظ کی تاثیر میں کھو کر رہ گیا۔

اس دوران مہابت خان بہت غور سے شہزادے کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ خرم بہت جلد سنبھل گیا اور اس نے انتہائی پُرجوش لہجے میں کہا۔

''ہم تمہیں مایوس نہیں کریں گے مہابت خان! شمشیر ہی ہماری محبوبہ ہے۔'' خرم کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ سے نئے عزائم کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''بس کچھ دن کی بات ہے، طبیعت بہل جائے گی۔ پھر رقصِ شمشیر شروع ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر خرم فوجی تربیت گاہ کے میدان سے نکل کر شاہی محل کی طرف جانے لگا۔

مہابت خان پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ''کیا آپ کو شاہ بابا کے الفاظ یاد ہیں؟'' مہابت خان نے شہزادے کو اس کا ماضی یاد دلاتے ہوئے کہا۔

شاہ بابا کا نام سن کر خرم کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور یکایک چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ ''کیا کہا تھا، شاہ بابا نے؟''

''پیدائش کے بعد جب اکبر اعظم نے پہلی بار آپ کا روشن چہرہ دیکھا تو فرمایا کہ یہی میرا حقیقی وارث ہے۔'' مہابت خان نے شہزادے کے سامنے اس کے دادا کے الفاظ اس طرح دہرائے کہ خرم کچھ دیر کے لئے ساکت ہو کر رہ گیا۔ گزرے زمانے کا ایک ایک نقش اس کے ذہن میں زندہ تصویروں کی طرح اُبھر آیا تھا۔

''ہم شاہ بابا کی روح کو آزار نہیں پہنچائیں گے، مہابت خان!'' شہزادے نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اپنے دادا کو یاد کر کے خرم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''تختِ ہندوستان کے کئی وارث موجود ہیں، ہمیں اقتدار کی کوئی خواہش نہیں۔'' شہزادے نے عجیب سی بے نیازی کا

مظاہرہ کیا۔

''مگر شاہ بابا کے علاوہ خود ظلِ الٰہی بھی آپ کے سر پر تاجِ شاہی دیکھنا چاہتے ہیں۔'' مہابت خان بڑی ذہانت سے خرم کو راستے پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

شہزادہ خاموش کھڑا رہا۔

''تاج پہن لینا آسان ہے مگر اس کا سر پر برقرار رکھنا بہت مشکل ہے شہزادہ عالم!'' مہابت خان اپنے تجربات کی روشنی میں خرم کو حکمرانی کا ایک نیا سبق سکھا رہا تھا۔ ''شہنشاہوں کو میدانِ جنگ کے سوا کسی دوسری شے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، ان کے صرف دو ہی مشاغل ہوتے ہیں۔ اپنے بازوؤں کو مضبوط کرنا..... اور دشمنوں کو مغلوب کرنے کے منصوبے بنانا..... ہر وقت جاگنا اور مسلسل عمل کرنا..... بس شہنشاہی کے یہی آداب ہوتے ہیں..... تخت کے وارثوں کو اپنے گردوپیش سے بے نیاز نہیں ہونا چاہئے۔ سیاست کے مذہب میں بے خبری بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ گناہ خدا تو معاف کر سکتا ہے، مگر اس کے بندے کبھی معاف نہیں کرتے۔'' مہابت خان نے درپردہ خرم کو بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

شہزادے نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا شاہی محل کی طرف چلا گیا۔ اس دوران خرم کو یہ احساس تک نہیں ہو سکا کہ درباری مطربہ، انجمن آراء ایک مخصوص فاصلے سے اس کا تعاقب کر رہی ہے۔

۞.....۞.....۞

آج بھی مینابازار کی وہی رونق تھی۔ مگر حیرت انگیز طور پر شہنشاہ جہانگیر تشریف نہیں لائے تھے۔ آج امراء اور وزراء کی ایک کثیر تعداد مینابازار میں موجود تھی۔ سامان فروخت کرنے والی عورتیں، شہنشاہ کی غیر موجودگی کے سبب بہت زیادہ پُرجوش نظر نہیں آ رہی تھیں۔ جہانگیر اپنی شاہانہ نوازشات کا مظاہرہ کرنے کے لئے سستی چیزیں بھی مہنگے داموں خرید لیا کرتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کے دم سے مینابازار میں مسرتوں کا ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔

آج جب شہنشاہ نہیں آیا تو امیر و وزیر خوش تھے کہ والیٔ ہند کی موجودگی میں ان کی نظریں فرش پر جمی رہتی تھیں اور انہیں مینابازار کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع میسر نہیں آتا تھا۔ اس کے برعکس تاجر خواتین میں سرد مہری سی تھی کہ آج ان کی مصنوعات کا سب سے بڑا خریدار مینابازار سے دُور شاہی محل کے ایک مخصوص کمرے میں شغلِ بادہ نوشی کر رہا تھا۔

مہرالنساء اسی ناز و ادا کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تھی اور بے چین نظروں سے باغ کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماہ رخ بھی مینابازار میں موجود تھی، مگر مہرالنساء کا حکم تھا کہ وہ تمام وقت اس کے ساتھ رہے۔ اور اگر شہنشاہ تشریف لے آئیں تو اس پر لازم ہے کہ وہ مہرالنساء کو تنہا چھوڑ کر مینابازار کے کسی گوشے میں چلی جائے۔ ماہ رخ اس قسم کے احکام کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

مہرالنساء کو انتظار کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی مگر شہنشاہ جہانگیر نے مینابازار کو رونق نہیں بخشی۔ مہرالنساء بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگی۔ اس نے گھبرا کر اپنی کنیز سے کہا۔

''ماہ رخ! تُو ذرا باغ سے باہر نکل کر دیکھ کہ شہنشاہ کی آمد کے کوئی آثار ہیں یا نہیں؟''

ماہ رخ نے فوراً ہی مہرالنساء کے حکم کی تعمیل کی اور مینابازار سے نکل کر کچھ دُور تک چلی گئی۔ راستے میں اس نے کئی امیروں اور سرداروں کو مینابازار کی طرف آتے ہوئے دیکھا مگر شاہ کی سواری کی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ پھر وہ ارجمند بانو کو تنہا دیکھ کر خوشی سے بے قرار ہو گئی۔ یہ ملاقات کا ایک اچھا موقع تھا۔

ارجمند قریب آ کر ماہ رخ سے لپٹ گئی اور اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارے جانے کے بعد ہمارے گھر میں ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے۔''

''کیسا ہنگامہ؟'' ماہ رخ پریشان نظر آنے لگی۔

ماہ رخ نے ارسلان بیگ کا مختصر تعارف کراتے ہوئے پورا واقعہ تفصیل سے سنا دیا۔ وہ بات ہی اتنی پریشان کُن تھی۔ ماہ رخ، مہرالنساء کے حکم کو فراموش کر کے ارسلان بیگ کی سرگرمیوں پر غور کرنے لگی، پھر فکر آمیز لہجے میں بولی۔

''کیا آقا اس رشتے پر آمادہ نظر آتے ہیں؟'' ماہ رخ کا اشارہ، آصف خان کی طرف تھا۔

''وہ تو سخت برہم ہیں۔ لیکن ارسلان کی خوشامدانہ عادتوں سے خوف زدہ ہیں۔'' ارجمند نے صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر ارسلان نے شہنشاہ کو مداخلت کرنے پر آمادہ کر لیا تو پھر کیا ہو گا ماہ رخ؟ بابا جان نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اس رشتے کے سلسلے میں شہنشاہ کے حکم کی خلاف ورزی بھی کر سکتے ہیں۔ اور تم جانتی ہو کہ اس حکم عدولی کا انجام کیا ہو گا؟'' یہ کہتے کہتے ارجمند کے چہرے پر وحشت سی طاری ہو گئی تھی۔

ماہ رخ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ حالات اس قدر خوف ناک رخ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ جب ان ہنگامی لمحات میں ماہ رخ کو کوئی تدبیر نہیں سوجھی تو اس نے ارجمند کو صبر و ضبط کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں پریشان کرنے کے لئے ارسلان بیگ، مینابازار بھی آ سکتا ہے۔ اگر وہ آ جائے تو مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس زہریلے کیڑے کو بہت احتیاط کے ساتھ مارا جائے گا۔ اس کے اندر پایا جانے والا زہر تمہیں بدنام بھی کر سکتا ہے۔ اور پھر تم شہزادہ خرم کی نظروں سے گر بھی سکتی ہو۔''

''میں اس حیوان کو کہاں تک برداشت کروں، ماہ رخ؟'' ارجمند کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگی تھی۔

''بس کچھ دن اور۔'' ماہ رخ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں آج رات مہرالنساء بیگم سے رخصت لے کر گھر آؤں گی، پھر اس حیوان کا بھی مستقل علاج ہو جائے گا۔''

''یہ پھوپھی حضور کو کیا سوجھی تھی ماہ رخ! کہ وہ تمہیں ہمارے گھر سے شاہی محل لے گئیں۔''

ارجمند بانو شدید جھنجلاہٹ کا شکار نظر آ رہی تھی اور آج پہلی بار مہرالنساء کی طرف سے اس کے دل میں ناپسندیدگی کے جذبات پیدا ہوئے تھے۔

''وہ اپنے دل سے مجبور ہیں بی بی!'' ماہ رخ نے فضا کی سنجیدگی کو دور کرنے کے لئے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''انہیں اپنے عشق کی نامہ بری کے لئے مجھ جیسی کنیز کی ضرورت ہے۔''

''آخر اس عورت کو کیا ہو گیا؟'' ارجمند بانو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے ایک حاسد لڑکی کے انداز میں اپنی پھوپھی کے کردار پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے آقا زادی!'' ماہ رخ نے گھبرا کر کہا۔ ''تمہیں اپنی پھوپھی کے ہر عمل اور ہر سلوک کو بڑے حوصلے سے برداشت کرنا ہو گا۔ اگر خدانخواستہ تمہارے جذبات مہرالنساء بیگم تک منتقل ہو گئے تو بساط اُلٹ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک شہنشاہ کی منظورِ نظر ہیں۔ اور تم ایک شہزادے کی محبوب ہو۔ ان کا محبوب بااختیار ہے اور تمہارا محبوب بے اختیار۔ خدا کے لئے، صبر و ہوش سے کام لو۔''

ابھی ارجمند بانو کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ اس نے ارسلان بیگ کو سامنے سے آتے ہوئے دیکھا۔ ارجمند کے چہرے پر اچانک ہوائیاں سی اُڑنے لگیں۔ پھر وہ غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''ماہ رخ! تمہارا اندازہ درست تھا۔ وہ نامراد یہاں بھی آ پہنچا۔''

ماہ رخ نے کسی گھبراہٹ یا انتشار کا مظاہرہ کئے بغیر سامنے کی طرف دیکھا۔ ارجمند کی ناپسندیدہ شخصیت اس سے کچھ فاصلے پر موجود تھی۔

''تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اور اگر وہ ناہنجار تمہاری قربت حاصل کرنے کی کوشش کرے تو جوشِ جذبات میں بدحواس نہ ہو جانا۔ ابھی تمہارے راستے میں بہت سے بھاری پتھر آئیں گے۔ یہ تو ایک حقیر سا تنکا ہے۔ اگر تم نے حوصلے سے کام لیا تو اسے ہوا کا ایک معمولی سا جھونکا اُڑا کر لے جائے گا۔ جاؤ! خدا تمہارے خوب صورت چہرے اور روشن و تابناک مستقبل کو دشمنوں کی نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔''

ارجمند تیزی سے باغ کے دروازے میں داخل ہو گئی اور ماہ رخ، مہرالنساء کے حکم کے مطابق شہنشاہ جہانگیر کی آمد کے آثار تلاش کرنے لگی، اسی دوران ارسلان بیگ بھی ماہ رخ کے قریب سے گزرا، اس کی تنگ پیشانی اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں دیکھ کر ماہ رخ پیچ و تاب کھانے لگی۔ پھر جب وہ آگے بڑھ گیا تو ماہ رخ نے زیرِ لب کہا۔

''بھوتوں جیسی شکل و صورت..... اور ایک پری زاد کی چاہت..... ارسلان بیگ! تجھ پر ہزار بار خدا کی لعنت۔''

ابھی ماہ رخ غائبانہ ارسلان بیگ پر اپنے غصے اور ملامت کا اظہار کر رہی تھی کہ اسے

درباری مطربہ، انجمن آراء نظر آئی جو سیدھی مینا بازار کی طرف آ رہی تھی۔ کل ماہ رخ نے اسی وقت انجمن آراء کو شہنشاہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ درباری مطربہ کی تنہا آمد اس بات کا ثبوت تھی کہ آج شہنشاہ، مینا بازار تشریف نہیں لائیں گے۔

ماہ رخ فوراً پلٹ پڑی اور بہت تیزی کے ساتھ مہرالنساء بیگم کے پاس پہنچ کر کہنے لگی۔

''آج ظلِ الٰہی اپنے دیدار سے رعایا کی آنکھوں کو روشن نہیں فرمائیں گے۔'' ماہ رخ نے اس قدر شائستہ لہجے میں کہا کہ مہرالنساء چونک اُٹھی۔ اب اُسے کیا معلوم تھا کہ ایک غریب سپاہی نے خونِ جگر صرف کر کے اپنی بیٹی کو مذہبی اور مجلسی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا تھا۔

''تجھے کیسے معلوم، ماہ رخ؟'' مہرالنساء کا لہجہ بجھا بجھا تھا اور چہرے کے گلابی رنگ میں بھی اچانک زردی سی جھلکنے لگی تھی۔

''درباری مغنیہ انجمن تنہا بازار کی طرف آ رہی ہے۔'' ماہ رخ نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''انجمن کی آمد کا شہنشاہ سے کیا تعلق ہے؟'' مہرالنساء کو ایک بار پھر ماہ رخ کی ذہانت نے چونک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کل جب عالم پناہ، مینا بازار میں تشریف لائے تھے تو میں نے انجمن کو ان کے ساتھ دیکھا تھا۔'' ماہ رخ نے بہت ہوشیاری کے ساتھ اپنی گفتگو کا زاویہ تبدیل کر دیا۔ ''میں یہ بات قیاس کے طور پر کہہ رہی ہوں کہ شاید آج ظلِ الٰہی جلوہ فرمانہ ہوں۔''

''تُو بہت ذہین ہے ماہ رخ!'' مہرالنساء نے اپنی کنیز کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''آج ہمیں یقین آ گیا کہ ہماری نظریں چہرہ شناسی میں کبھی دھوکا نہیں کھاتیں۔''

ماہ رخ نے نصف قد تک خم ہو کر مہرالنساء بیگم کا شکریہ ادا کیا۔

''اب تُو مینا بازار کی سیر کر سکتی ہے۔ اگر ہمیں ضرورت محسوس ہوئی تو تجھے دوبارہ طلب کر لیں گے۔'' مہرالنساء کے لہجے میں کسی ملکہ کی طرح تمکنت اور بے نیازی تھی۔

ماہ رخ، مہرالنساء سے اجازت لے کر ارجمند کی طرف آئی۔ وہاں ارسلان بیگ کسی بلائے ناگہانی کی طرح مسلط تھا۔ اور ارجمند دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ پھر جب اس نے ماہ رخ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی۔

''آؤ ماہ رخ! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے ارجمند، ماہ رخ کی طرف بڑھی۔

ارسلان بیگ انتہائی بے حسی اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتا ہوا ارجمند کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پھر جب ماہ رخ قریب پہنچ گئی تو اس نے ارجمند سے پوچھا۔ ''یہ کون لڑکی ہے؟''

ارجمند خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

''میں تم سے پوچھ رہا ہوں، ارجمند! یہ کون لڑکی ہے؟'' اس بار ارسلان بیگ کا لہجہ کسی قدر

سخت تھا۔

''آپ کو میرے ذاتی معاملات سے کیا غرض ہے؟'' ارجمند کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

''اگر مجھے غرض نہیں ہوگی تو پھر کسے ہوگی؟'' ارسلان نے اونچی آواز میں کہا۔

''آپ کو کس نے میرا نگراں مقرر کیا ہے؟'' ارجمند بانو، ماہ رخ کی ہدایات کے باوجود خاموش نہ رہ سکی۔

''آپ کے بابا جان نے۔'' ارسلان بیگ مسلسل بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''مجھے کسی نگراں کی ضرورت نہیں ہے۔'' ارجمند کے لہجے کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

''میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔'' ارسلان بیگ اس قدر با اختیار لہجے میں بول رہا تھا کہ جیسے ارجمند اس کی شریکِ حیات ہو۔

ارجمند کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ ارسلان بیگ کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ماہ رخ درمیان میں بول اُٹھی۔

''اچھا بی بی! میں جا رہی ہوں۔ میری وجہ سے آپ مینا بازار کی سیر کے لطف کو کیوں غارت کر رہی ہیں؟ میں کل کسی وقت آ جاؤں گی۔ آپ یہاں کی ہر چیز کو بہت غور سے دیکھیں کہ انسانی ہاتھوں نے کیسی کیسی مصنوعات بنائی ہیں۔'' ماہ رخ نے اشاروں میں ارجمند کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک حیوان کی وجہ سے اس کی آقا زادی، مینا بازار میں ایک تکلیف دہ تماشا بن کر رہ جائے۔

❀.....❀.....❀

درباری مطربہ انجمن آراء آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مہرالنساء کے قریب پہنچی اور اس نے نصف قد سے زیادہ جھک کر شاہ کی محبوبہ کو عاجزانہ سلام پیش کیا۔

نامہ بر کنیز کو دیکھ کر مہرالنساء کی گردن کج ہو گئی اور اس نے بڑے مغرور لہجے میں کہا۔

''انجمن! تُو یہاں کیسے آئی ہے؟''

''شہنشاہ کا ایک خاص پیغام لے کر۔'' انجمن نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا اور گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

یہ سن کر مہرالنساء کی گردن کا کج کچھ اور نمایاں ہو گیا۔ اب اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ رنگ اُبھر آیا تھا۔ مہرالنساء نے دُور تک مینا بازار کی دکانوں اور امراء کے ہجوم پر نظر ڈالی اور پھر یہ کہہ کر باغ کے ایک سنسان گوشے کی طرف بڑھنے لگی۔

''میرے پیچھے پیچھے چلی آ۔''

انجمن نے بہت غور سے اس عورت کی طرف دیکھا، جو بیوہ ہونے کے ساتھ ساتھ عمر رسیدہ بھی ہو چکی تھی۔ درباری مطربہ کو محسوس ہوا کہ مہرالنساء کے آگے آج بھی بے شمار نوخیز

لڑکیوں کا حُسن بے اثر ہے۔ پھر انجمن نے مہرالنساء کے چلنے کا انداز دیکھا۔ وہ اس طرح قدم رکھ رہی تھی، جیسے اس کے پیروں کے نیچے شہنشاہِ ہندوستان کا دل ہے اور وہ اس دل کو پامال کر کے آگے بڑھ رہی ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ جہانگیر، مہرالنساء کی قربت کے لئے کیوں بے قرار ہے۔

کچھ دُور چل کر مہرالنساء، باغ کے ایک ایسے گوشے میں ٹھہر گئی، جہاں دُور دُور تک کسی متنفس کا گزر نہیں تھا۔

''شہنشاہ اپنے خط کا جواب پانے کے لئے سخت مضطرب ہیں۔'' انجمن آراء نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی طرف سے اس بے پروائی کا مظاہرہ کوئی مناسب عمل نہیں۔''

مہرالنساء کے چہرے پر فتح کا ایک اور رنگ اُبھر کر ڈوب گیا، پھر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

''انجمن! مجھے بتا کہ شہنشاہ اتنے بے قرار کیوں ہیں؟ اگر میں ان کے حرم میں داخل نہ ہو سکی تو کون سی قیامت آ جائے گی۔''

''عالم پناہ خود ہی اپنے جذبات کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔'' انجمن آراء نے بہت محتاط لہجے میں کہا۔ ''میں نے ظلِ الٰہی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ آپ کے روبرو بیان کر دیئے ہیں۔ ویسے یہ ایک عام حقیقت ہے کہ انسان اپنی پسندیدہ چیز حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتا ہے۔''

''تُو خوب جانتی ہے انجمن! کہ شہنشاہ کی مملکت ایک بازار ہے اور بازار میں بے شمار اشیاء موجود ہیں۔'' مہرالنساء نے بے نیازی کے ساتھ کہا۔ ''شہنشاہ اتنے بااختیار ہیں کہ وہ کسی بھی چیز کو آسانی سے خرید سکتے ہیں۔ نہ کوئی انکار کی جرأت کر سکتا ہے..... اور نہ کوئی ان کے مقابل کھڑا ہو سکتا ہے۔ وہ جسے چاہیں، خرید لیں۔ پھر مجھ بیوہ پر یہ التفات مسلسل کیوں ہے؟''

مہرالنساء نے درباری مطربہ کو ایک سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر انجمن آراء ایک زمانہ شناس عورت تھی، اس لئے خوب صورتی سے دامن بچا گئی۔

''یہ آپ کے اور شہنشاہ کے ذاتی معاملات ہیں۔ ایک کنیز ان رازوں کو کس طرح سمجھ سکتی ہے؟''

مہرالنساء نے اسی قسم کے کئی سوالات کئے مگر انجمن کے سینے میں دبا ہوا کوئی لفظ باہر نہ آ سکا۔ وہ صرف خط کے جواب کے لئے اصرار کرتی رہی۔

مہرالنساء مایوس ہو گئی اور پھر اس نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ کہا۔

''شہنشاہ کی بارگاہ میں ہمارا ابھی سلام پیش کر دینا اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا کہ بہت جلد عالم پناہ کے گرامی نامے کا جواب ایک کنیز ماہ رخ کے ذریعے ارسال کر دیا جائے گا۔''

''وہ کنیز کون ہے؟..... میں اُسے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' انجمن آراء نے سوال کیا۔

''کیا یہ ضروری ہے؟'' مہرالنساء نے بڑی نخوت کے ساتھ پوچھا۔

''آپ تو شاہی حرم سرا کے آداب سے واقف نہیں، مہرالنساء بیگم!'' انجمن آراء نے کہا۔ ''جب تک آپ کی کنیز قاصد سے میرا تعارف نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ عورت قصرِ شاہی کے اہم مقامات سے کس طرح گزر سکتی ہے؟''

انجمن آراء کی زبان سے اپنا نام سن کر مہرالنساء کو عجیب سا احساس ہوا۔ وہ ''ملکہ عالیہ'' کا لفظ سننے کی خواہش مند تھی۔ مگر یہ خواہش سینے میں گھٹ کر رہ گئی کہ ابھی وہ صرف مہرالنساء تھی..... اور ملکہ کے منصبِ خاص تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مہرالنساء کا دل چاہا کہ وہ تمام حجابات توڑ کر جہانگیر کے حرم میں داخل ہو جائے اور شہنشاہ سے کہے کہ اسے اپنے ہاتھوں سے تاجِ زرنگار پہنا دیں اور اپنے درباریوں کو اس کے حضور خم ہو جانے کا حکم دے دیں۔ ملکہ عالیہ بننے کی آرزو بڑی شدید تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو اب تک حصولِ اقتدار کے سیلاب میں یا تو غرق ہو چکی ہوتی یا ساحلِ مراد پر پہنچ کر ملکہ عالیہ کا خطاب حاصل کر چکی ہوتی۔ مگر مہرالنساء بیگم، آہنی اعصاب رکھنے والی عورت تھی۔ وہ اپنے زخمی شکار کا خون بہتا دیکھ کر ایک عجیب سی لذت محسوس کرتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ مسلسل جہانگیر کو نظرانداز کر رہی تھی۔

مہرالنساء بہت جلد خیالات کی دنیا سے نکل آئی اور انجمن آراء کو لے کر دوبارہ مینا بازار میں آئی۔ اب اُس کی بے قرار نظریں چاروں طرف ماہ رخ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ کچھ دیر کی جستجو کے بعد ماہ رخ اُسے دکانوں کے سامنے والی قطار میں کھڑی نظر آئی۔ مہرالنساء نے ماہ رخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انجمن آراء سے کہا۔

''اس لڑکی کو بلا کر یہاں لے آ۔ وہی میری کنیز ہے۔'' مہرالنساء کا لہجہ حاکمانہ تھا۔

اور پھر جب انجمن آراء، ماہ رخ کو لے کر واپس آئی تو مہرالنساء نے درباری مطربہ سے کہا۔

''اس کا نام ماہ رخ ہے۔ آئندہ یہی تجھ سے رابطہ قائم کرے گی۔ اس کے نقش و نگار کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کنیزوں کے ہجوم میں تُو اس کے چہرے کو بھول جائے اور مجھے دوبارہ زحمت اُٹھانی پڑے۔''

مہرالنساء کی بات سن کر انجمن آراء کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم اُبھر آیا۔

''نہیں مہرالنساء بیگم! ایسا نہیں ہو گا۔ شہنشاہ کسی ایسے شخص کو اپنی قربت کا اعزاز نہیں بخشتے، جس کا حافظہ کمزور ہو۔''

یہ کہہ کر انجمن آراء نے مہرالنساء کی خدمت میں رخصتی سلام پیش کیا اور کچھ دُور جا کر ملبوسات کی ایک دکان پر کھڑی ہو گئی۔

انجمن آراء کے جاتے ہی مہرالنساء، ماہ رخ سے مخاطب ہوئی۔

''آج رات میں تجھے ایک اہم ذمے داری سونپنے والی ہوں۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گئی تو تجھے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا جائے گا۔''

"میں بیگم صاحبہ کی ایک ادنیٰ خادمہ ہوں۔ بس میرے لئے یہی اعزاز کافی ہے۔" ماہ رخ نے جان بوجھ کر جذباتی گفتگو کا سہارا لیا۔

"تُو بہت سلیقہ مند اور ذہین ہے ماہ رخ!" مہرالنساء بیگم نے اپنی کنیز کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں یقین ہے کہ تُو ایک دن بہت عروج حاصل کرے گی۔" مہرالنساء نے اپنے مطلب کے لئے ماہ رخ کی حوصلہ افزائی کی اور پھر یہ کہتی ہوئی شاہی محل چلی گئی۔

"اب تُو شام تک مینا بازار کی سیر کر لے۔ مگر عشاء کے بعد قصرِ شاہی ضرور آ جانا۔"

❀.....❀.....❀

ماہ رخ بہت خوش تھی کہ اسے کچھ دیر کے لئے اس غلامانہ خدمت سے نجات ملی۔ اب ارجمند اور شہزادہ خرم کو قریب لانے کے لئے آزادی کے ساتھ کوئی نیا منصوبہ بنا سکتی تھی۔ مگر ماہ رخ کی یہ خوشی اس وقت خاک میں مل گئی، جب اس نے ارسلان بیگ کو کسی نازل شدہ بلا کی طرح ارجمند کے ساتھ دیکھا۔ ماہ رخ آہستہ آہستہ ان دونوں کی طرف بڑھی اور مخصوص فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے ایک دکان پر ٹھہر گئی۔

ارسلان بیگ، ارجمند بانو سے کہہ رہا تھا

"آپ میری خواہش کے احترام میں یہ لباس خرید لیں۔" ارسلان بیگ نے ایک رنگا رنگ پیرہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ارجمند اور ارسلان بیگ ایک یونانی عورت کی دکان پر کھڑے تھے، جو مقامی زبان سے نا آشنا تھی۔ اس لئے ارسلان بیگ بہت روانی کے ساتھ ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر بول رہا تھا۔

"میں آپ کی خواہش کا احترام کرنے کی پابند نہیں ہوں۔" ارجمند نے انتہائی حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "اور پھر میں وزیراعظم آصف خان کی بیٹی ہوں۔ جو آپ سے کہیں زیادہ قوتِ خرید رکھتی ہے۔"

ماہ رخ برابر کی دکان پر منہ پھیرے کھڑی تھی، مگر اس کے سننے کی تمام تر قوتیں ارجمند اور ارسلان بیگ کی گفتگو پر مرکوز تھیں۔

"میں جانتا ہوں ارجمند!" ارسلان بیگ نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

ارجمند اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھی۔ "آپ ادب کے ساتھ میرا نام لیا کریں۔ میں ارجمند نہیں، ارجمند بانو ہوں۔" آصف خان کی بیٹی کا لہجہ بدستور تحقیر آمیز تھا۔

"ارجمند بانو!" ارسلان بیگ انتہائی بے شرمی کے ساتھ مسکرایا۔ "وزیراعظم آصف خان میری اور تمہاری شادی کی منظوری دے چکے ہیں۔ اس لئے میں تمہیں اس یادگار موقع پر کوئی قیمتی تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں۔" ارجمند چراغ پا ہو گئی۔ "میں نے اس قدر ڈھٹائی کے ساتھ

جھوٹ بولنے والا انسان آج تک نہیں دیکھا۔ آپ میرے والد محترم پر تہمت تراش رہے ہیں۔ اب میں ایک لمحے کے لئے آپ کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"چند لمحوں کی بات نہیں ارجمند بانو! تمہیں تو مجھے زندگی بھر برداشت کرنا ہوگا۔" ارسلان بیگ کی پست حرکتیں اپنے عروج کو پہنچ گئی تھیں۔

"ارسلان بیگ! تجھے اس بات کا لحاظ رہنا چاہئے کہ میں سرِ بازار چیخ بھی سکتی ہوں۔" ارجمند بانو نے مجبور ہو کر اپنی روایتی شائستگی کو ترک کر دیا تھا۔

"سرِ بازار چیخنے میں تمہاری ہی رسوائی ہے۔" ارسلان بیگ نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ارجمند بانو! تم میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں دل و جان کی گہرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں۔" ارسلان بیگ نے یکایک خوشامد شروع کر دی۔

"اور میں اپنی روح کی گہرائیوں کے ساتھ تم سے نفرت کرتی ہوں۔ ایسی نفرت جو آج تک ایک انسان نے کسی دوسرے انسان سے نہیں کی ہوگی۔" غصے کی شدت نے ایک لمحے کے لئے ارجمند کے خدوخال کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے اور لہجے دونوں سے آگ برس رہی تھی۔

"میں اس نفرت کو محبت میں بدل کر چھوڑوں گا۔" یکایک ارسلان بیگ کا لہجہ بھی سخت ہو گیا تھا۔ "میں خداوندِ ہندوستان کا مصاحبِ خاص ہوں۔ اور وہ یہ طاقت رکھتے ہیں کہ وہ تمہیں ایک ادنیٰ کنیز کی حیثیت سے میرے حرم میں داخل کر دیں۔"

اس دھمکی کے بعد ارجمند بانو کچھ اور برہم ہو گئی۔ "میں تیرے خداوند کو نہیں پہچانتی۔ میں صرف شہنشاہ جہانگیر کو جانتی ہوں۔ وہ ایک منصف و عادل حکمران ہیں۔ اور اگر شاہ نے بھی میرے ساتھ ناانصافی کی تو میں ان کے حکم کو بھی نظرانداز کر دوں گی۔"

"یہ باغیانہ عادت اچھی نہیں ارجمند بانو!" ارسلان بیگ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دم بہ دم گہری ہوئی جا رہی تھی۔ "اگر یہی کلمات خداوند تک منتقل ہو جائیں تو تمہارے خوش حال گھرانے پر قیامت بھی نازل ہو سکتی ہے۔" یہ ایک اور سنگین دھمکی تھی۔

ارجمند کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی مگر اس طرح کہ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

ارسلان بیگ کی ناشائستہ گفتگو اور جارحانہ دھمکیوں کے الفاظ سن کر ماہ رخ کے دل و دماغ بھی جل اُٹھے تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ وہ اسی وقت ارجمند بانو کے گھر جائے اور ارسلان بیگ کی تمام باتیں آصف خان کے گوش گزار کر دے۔ اور صاف صاف کہہ دے کہ ایک ذلیل فطرت انسان کی خباثتوں کا سیلاب ان کے دروازے تک آ پہنچا ہے۔ اگر اس سیلاب کو بروقت نہیں روکا گیا تو یہ کثیف پانی اُن کی دستارِ فضیلت کو آلودہ کر دے گا یا بہا کر لے جائے گا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ اس کی باتیں سن کر آصف خان کے جذبات بے قابو ہو سکتے ہیں اور ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ ایک ہنگامہ جو صرف اس کی آقازادی کے خاندان کو

رسوائیوں کی سیاہی سے داغ دار بنا دے گا اور اس بے غیرت انسان کا کچھ نہیں بگڑے گا، جو شہنشاہ کو خداوند کہہ کر پکارتا ہے۔

ماہ رخ نے بڑی مشکل سے اپنے جلتے ہوئے جذبات پر قابو پایا۔ پھر اس نے اچانک ارجمند کی آواز سنی۔ ''میں گھر جا رہی ہوں۔ آپ میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔''

ماہ رخ نے پلٹ کر دیکھا۔ ارسلان بیگ، ارجمند کے قریب کھڑا تھا اور اسی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ گھر چلوں گا۔ بابا جان میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

ارجمند نے مزید کچھ نہیں کہا اور اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لئے زور زور سے گھاس پر پاؤں مارتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ماہ رخ نے اپنی آقا زادی کو جاتے ہوئے دیکھا تو خود بھی دبے قدموں کے ساتھ ان دونوں کے عقب میں چلنے لگی۔ ابھی اس نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سامنے کچھ فاصلے پر شہزادہ خرم نظر آیا۔ وہ مینا بازار کی دونوں قطاروں پر نظر ڈالتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ ماہ رخ کو ایسا محسوس ہوا، جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔

''شہزادہ عالم، ارجمند کو ارسلان بیگ کے ساتھ دیکھ کر کیا سوچیں گے؟'' اس سوال نے چند ساعتوں کے لئے ماہ رخ کو بدحواس کر دیا تھا۔ بڑی خوف ناک صورتِ حال تھی۔ ماہ رخ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ارسلان بیگ کی صورت میں نازل ہونے والا عذب ارجمند کی زندگی بھی تباہ کر سکتا تھا۔ ماہ رخ لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ دل ہی دل میں دعا کرنے لگی۔

''اے خدا! ارجمند بانو کی مدد کر کہ آج وہ صرف تیرے رحم و کرم کی محتاج ہیں۔''

اور پھر وہ اسی طرح دعائیں کرتی ہوئی ارجمند بانو کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

پھر تمام فاصلے ختم ہو گئے۔ شہزادہ خرم نے بڑی عجیب نظروں سے ارجمند کی طرف دیکھا اور بے نیازانہ گزرنے کی کوشش کی۔ مگر ارسلان بیگ نے خرم کا راستہ روک لیا اور اس قدر جھک کر سلام کیا کہ اس کے ہاتھ شہزادے کے قدموں کو چھونے لگے۔

''صاحبِ عالم! اپنے ایک ادنیٰ نمک خوار کا سلام قبول فرمائیے۔''

''سیدھے کھڑے ہو جاؤ ارسلان!'' شہزادہ خرم نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہمیں یہ ہندوانہ رسم پسند نہیں۔''

ارسلان بیگ سیدھا ہو گیا اور اس نے ارجمند بانو کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ارجمند کا پورا جسم پتھر کی مانند ہو گیا تھا اور آنکھیں زمین میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔

''تم صاحبِ عالم کو نہیں جانتیں؟'' ارسلان بیگ، ارجمند بانو سے مخاطب ہوا۔ ''آپ خداوندِ ہندوستان کے صاحبزادے خرم ہیں۔ ہمارے آقا، فردوس مکانی شہنشاہ بابر کے تخت و

تاج کے وارث، تم نے صاحبِ عالم کی خدمت میں سلام عرض نہیں کیا۔''

ارجمند اپنے ہونٹوں کو کیا جنبش دیتی، شرم و ندامت سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

''صاحبِ عالم!'' ارجمند کو ساکت دیکھ کر ارسلان بیگ نے کہا۔ ''دراصل یہ آپ کے رعبِ شاہی سے لرزاں ہیں۔ صاحبِ عالم کی بلند اقبالی سے دہشت زدہ ہو کر اکثر لوگ اپنی طاقتِ گفتار کھو دیتے ہیں۔'' ارسلان، ارجمند بانو کی شکایت کر رہا تھا۔

شہزادہ خرم نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر ارجمند پر ڈالی۔ وہ کسی مجرم کی طرح خاموش کھڑی تھی۔

''یہ مرزا ابوالحسن، وزیراعظم آصف خان کی دختر ہیں۔'' ارسلان بیگ نے دوبارہ کہا۔ ''میری ہونے والی شریک حیات۔'' ارسلان بیگ نے جھوٹ اور بے غیرتی کی انتہا کر دی تھی۔

ارجمند لرز کر رہ گئی مگر اس کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہو سکی۔ وہ شہزادہ خرم کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا چاہتی تھی لیکن رسوائی کے خوف نے اسے کسی گونگے کی طرح بے زبان بنا دیا تھا۔

شہزادہ خرم نے دوبارہ ارجمند کی طرف نہیں دیکھا۔ ایک لمحے میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ شہزادے نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارسلان بیگ سے کہا۔ ''تمہیں یہ رشتہ مبارک ہو۔''

خرم کے چند الفاظ نے ارجمند کے دل کی دنیا زیروزبر کر کے رکھ دی۔ وہ شہزادے کے سامنے ارسلان کی بے حیائی کے خلاف احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ مگر شرم دامن گیر رہی۔ پھر جذبات کی گھٹن اس قدر بڑھی کہ ارجمند تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مینا بازار سے باہر چلی گئی۔

ارسلان بیگ نے شہزادہ خرم کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''صاحبِ عالم! آپ کا یہ گناہ گار غلام، ارجمند بانو کی طرف سے معافی کا خواستگار ہے۔''

''کیسی معافی؟'' شہزادہ خرم نے بڑے حوصلے کے ساتھ اپنے جذبات پر قابو پایا تھا۔ ارسلان بیگ کو اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکا کہ خود صاحبِ علم بھی ارجمند کی محبت میں گرفتار ہیں۔

''اس جرم کی معافی کہ ارجمند، حضور کی خدمتِ عالیہ میں سلام پیش نہ کر سکی۔'' ارسلان بیگ کے دونوں ہاتھ ابھی تک اسی انداز سے جڑے ہوئے تھے۔ ''میرا خیال ہے کہ شرم و حیا نے اس کی زبان پر مہر لگا دی تھی۔ بس یہی وجہ تھی کہ وہ صاحبِ عالم کی شان میں گستاخی کی مرتکب ہوئی۔''

''اگر کوئی شخص ہمارے حضور دل سے سلام پیش نہیں کرتا تو ہم ذاتی طور پر اسے مجرم نہیں سمجھتے۔'' شہزادہ خرم نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ صاحبِ عالم کے جاتے ہی ارسلان بھی تقریباً بھاگتا ہوا ارجمند بانو کے قریب پہنچ گیا۔ ارجمند خلافِ توقع خاموش تھی۔ اس نے ارسلان سے اس بے حیائی کے مظاہرے پر کوئی شکایت نہیں کی۔ بس چپ چاپ اپنے مکان کی طرف

بڑھتی رہی۔

❀.....❀.....❀

ماہ رخ، شہزادہ خرم سے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھی۔ پھر جیسے ہی شہزادہ اس کے نزدیک آیا، ماہ رخ نے خم ہو کر اسے سلام کیا۔ خرم نے حسبِ عادت مسکرا کر جواب دیا اور پوچھنے لگا۔

''ماہ رخ! تم ٹھیک ہو؟'' شہزادہ خرم کی یہ خاص عادت تھی کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے انسان کو بھی ''تم'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس نے کسی ادنیٰ ترین شخص کو بھی ''تُو'' کہہ کر نہیں پکارا۔

''شہزادہ عالم کی دعاؤں کے طفیل مجھے کچھ نہیں ہوا۔ مگر میری آقا زادی پر قیامت نازل ہو رہی ہے۔'' شدتِ جذبات سے ماہ رخ کی آواز لرز رہی تھی۔

''کیسی قیامت؟'' خرم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ میری آقا زادی کی مجبوریوں کا ایک طویل افسانہ ہے۔ میں چند لمحوں میں اسے سرِ بازار بیان نہیں کر سکتی۔'' ماہ رخ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

''اب سنانے کو کیا باقی رہ گیا ہے ماہ رخ؟'' خرم کی آواز سے بھی دل کا درد جھلک رہا تھا۔

''کاش! اگر ہمیں پہلے معلوم ہوتا کہ ارجمند بانو، ارسلان بیگ سے منسوب ہیں تو ہم کبھی اس گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ ہم اپنی نظروں کی اس لغزش پر ہمیشہ شرمندہ رہیں گے۔ اب ارجمند بانو کا تصور بھی ہمارے لئے حرام ہے۔''

''شہزادۂ عالم!'' ماہ رُخ رونے لگی۔ ''آپ اس طرح میری آقا زادی پر گزرنے والی قیامت کا مشاہدہ نہیں کر سکیں گے۔ آپ اس حقیر و ذلیل کنیز کو اپنی فرصت کے چند لمحات کی بھیک دے دیجئے۔ پھر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وزیر اعظم آصف خان کے مکان کو جلا کر رکھ کر دینے کے لئے سازشوں کی کیسی کیسی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ صاحبِ عالم! آپ کو خدا کا واسطہ، مجھے مایوس نہ کیجئے گا کہ آپ کی بخشش و عطا پر ارجمند بانو کی زندگی کا انحصار ہے۔'' یہ کہتے کہتے ماہ رخ، شہزادہ خرم کے قدموں پر جھک گئی۔

''اُٹھو ماہ رخ!..... یہ کیا کرتی ہو؟'' خرم نے کسی قدر ناگوار لہجے میں کہا۔ ''کیا تم نہیں جانتیں کہ ہمیں اس قسم کے تمام شاہی آداب سے نفرت ہے۔''

''پھر اپنی تنہائی کے چند لمحات اس غلام زادی کے دامن میں ڈال دیجئے۔'' ماہ رخ نے زمین سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ہم تمہیں کسی دن فرصت کے لمحات عنایت کر دیں گے۔ مگر تم ان ساعتوں کا کیا کرو گی؟'' شہزادہ خرم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کسی دن نہیں صاحبِ عالم!'' ماہ رخ کی بدحواسی کا وہی انداز تھا کہ وہ ایک وحشت زدہ لڑکی نظر آ رہی تھی۔ ''آج رات..... صرف آج کی رات..... چند لمحوں کی بھیک..... صرف چند

ساعتوں کی بخشش۔ پھر آپ کو اندازہ ہو گا کہ ارجمند بانو پر کیا گزر رہی ہے۔''

شہزادہ خرم شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ آخر کچھ دیر بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''تم رات کے وقت قصرِ شاہی میں کس طرح داخل ہو گی؟''

''شاید صاحبِ عالم کو خبر نہیں کہ مہر النساء بیگم نے مجھے مادر ملکہ، سلیمہ بیگم کی خدمت پر مامور کر دیا ہے۔'' ماہ رخ نے خرم کے سامنے یہ نیا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

شہزادے کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے خوشی کی پرچھائیاں نظر آئیں مگر دوسرے ہی لمحے گہری اُداسی چھا گئی۔ ارسلان بیگ کی گفتگو نے اس کا دل توڑ دیا تھا مگر یہ خرم کی بلند ہمتی کی دلیل تھی کہ وہ نوعمری میں اس جانگداز حادثے سے گزرنے کے باوجود اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔

''مادر ملکہ کے سو جانے کے بعد میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو سکتی ہوں۔'' ماہ رخ نے خرم کو خاموش دیکھ کر کہا۔

''ماہ رخ.....!'' شہزادہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ ''تم نصف شب کے بعد بارہ دری میں چلی آؤ۔ اس وقت تک محل کے تمام لوگ سو چکے ہوں گے۔''

ماہ رخ کے چہرے پر ناقابلِ بیان خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر فوراً ہی اس کی نظر درباری مطربہ انجمن آراء پر پڑی، جو دبے قدموں سے اسی طرف آ رہی تھی۔

شہزادہ خرم نے ماہ رخ کے اس طرح خاموش ہو جانے کو محسوس کر لیا اور پھر فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ مغنیہ انجمن آراء قریب آ چکی تھی۔ اس نے بے اختیار جھک کر شہزادے کو سلام کیا اور ماہ رخ کو عجب سی نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

انجمن آراء کے جانے کے بعد ماہ رخ نے شہزادہ خرم سے کہا۔ ''صاحبِ عالم! مجھے انجمن آراء کی آمد پر شک ہے۔''

''کیا شک؟'' خرم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ ماہ رخ کی معنی خیز گفتگو پر ذرا بھی نہیں گھبرایا۔

''کنیز کو ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت دیر سے آپ کا تعاقب کر رہی ہے۔'' ماہ رخ نے رک رک کر کہا۔

''ہم گناہ گار نہیں ہیں ماہ رخ!'' شہزادہ خرم نے جواباً کہا۔ ''تعاقب اور نگرانی سے گناہ گار ڈرتے ہیں۔''

''پھر بھی، احتیاط اچھی چیز ہے شہزادہ عالم!'' ماہ رخ نے اس طرح کہا کہ جیسے کوئی عمر رسیدہ بزرگ کسی بچے کو نصیحت کر رہا ہو۔

خرم بے دلی کے ساتھ مسکرایا اور ماہ رخ اجازت طلب کر کے قصرِ شاہی کی طرف چلی گئی۔

❀.....❀.....❀

ارجمند بانو اس حال میں گھر پہنچی کہ اس کی آنکھیں [illegible] ہوئی تھیں اور چہرے پر رنج و

الم کے گہرے سائے لرز رہے تھے۔ ماں نے بیٹی کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئی۔ پھر جب ارجمند سے اس کا سبب پوچھا تو وہ غضب ناک لہجے میں کہنے لگی۔

''مادرِ گرامی! آج ارسلان بیگ نے مجھے مینا بازار میں بہت رسوا کیا ہے۔ وہ تمام وقت میرے ساتھ ساتھ رہا۔ بار بار تحائف قبول کرنے کے لئے اصرار کرتا رہا اور اس نے ایک مرتبہ مجھے اپنی شریکِ حیات کہہ کر پکارا۔ آخر اسے یہ حق کس نے دیا ہے؟'' یہ کہہ کر ارجمند بانو رونے لگی۔

اسی وقت آصف خان بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اور جب بیوی نے ساری صورتِ حال اس کے گوش گزار کی تو آصف خان شدتِ غضب سے کانپنے لگا۔ ''اس نے ہمارے خاندان کے اثرات قبول نہیں کئے اور آخر وہ ایک کنیز زادہ ہی ثابت ہوا۔ میں نے اس ذلیل خوشامدی کو ٹالنے کے لئے تمہاری مرضی کا سہارا لیا تھا بیٹی!'' آصف خان نے ارجمند بانو کو مخاطب کر کے کہا۔ ''مگر آج کے بعد سے اس پر میرے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ تمہیں جو اذیت پہنچی ہے، اس کا ازالہ بہت جلد ہو جائے گا۔ ارسلان بیگ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ظلِ الٰہی کا مصاحب ہونا اتنا بڑا اعزاز نہیں کہ اس کے ہاتھ وزیراعظم کے گریبان تک پہنچ جائیں۔ اور آصف خان خاموش کھڑا رہے۔ تمہارے باپ کی جنبش لب پر اس کے دست و پا بھی کاٹے جا سکتے ہیں اور زبان بھی۔ اس کی لاش بھی دریائے جمنا کے حوالے کی جا سکتی ہے اور اس کے جسم کو آگ میں جلا کر راکھ بھی ہوا میں منتشر کی جا سکتی ہے۔'' آصف خان کے ہونٹوں سے قہر و نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا۔ ''بیٹی! میری مروّت اور وضع داری کے سبب یہ حادثہ پیش آیا۔ اس سلسلے میں تمہارا باپ مجرم ہے۔ اور اس گناہ کا یہی کفارہ ہے کہ تم ارسلان بیگ کے لئے کوئی ایک سزا منتخب کر لو۔ اگر تم چاہو تو ایک ہی وقت میں تمام سزاؤں کا انتخاب کر سکتی ہو۔ تمہارے باپ نے شہنشاہ جہانگیر کو ''خداوند'' کہہ کر یہ ترقی حاصل نہیں کی ہے۔ خدا کی لامحدود رحمت ہمیشہ اس خاندان پر سایہ فگن رہی ہے۔ مجھے جو کچھ ملا ہے، وہ خدا کے فضل اور میری شب و روز کی محنتوں کا صلہ ہے۔ میں اپنی آبرو کی خاطر وزراتِ عظمیٰ کے اس بلند مینار کو مسمار کر سکتا ہوں، جسے تعمیر کرنے کے لئے دوسرے لوگ شہنشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں۔''

ارجمند نے بے اختیار باپ کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ''نہیں بابا جان! میں آپ کو اس آزمائش سے نہیں گزرنے دوں گی۔ مجھے اس پر ناز ہے کہ میں آپ جیسے شفیق و مہربان باپ کی بیٹی ہوں۔ اگر آپ نے ارسلان کو زبان دے دی ہے تو میں آپ کے ایک ایک لفظ پر بخوشی قربان ہونے کے لئے تیار ہوں۔ میری زندگی آپ کی محترم ذات سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔''

''نہیں جانِ پدر! ایسا نہیں ہو سکتا۔'' بیٹی کے جذبات دیکھ کر آہنی اعصاب رکھنے والا باپ بھی رونے لگا۔ میں نے اس بے غیرت ارسلان سے کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔ پہلے میں نے تیری مرضی کی آڑ لے کر اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی، مگر اب وہ یہاں آئے گا تو میں اسے اس کی

حقیقت بتا دوں گا۔''

ایک طوفان گزر چکا تھا، مگر دوسرے طوفان کی آمد کا خطرہ ارجمند کو خون کے آنسو رُلا رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے بستر پر دراز تھی اور خیالوں کی دنیا میں شہزادہ خرم کی خوب صورت آنکھوں کو دیکھ رہی تھی، جہاں اُداسیوں اور شکایتوں کے بے شمار طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ یہ بڑی جاں گسل ساعتیں تھیں۔ ان اذیت ناک لمحوں میں ارجمند کو ماہ رخ کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن مہرالنساء کی مداخلت کے سبب ماہ رخ اس سے دُور جا چکی تھی۔ اور ارجمند کے دل میں اپنی پھوپھی کے لئے ناپسندیدگی کے جذبات اُبھر رہے تھے۔

❀.....❀.....❀

جب عشاء کے بعد مادر ملکہ، سلیمہ بیگم گہری نیند سو گئیں تو ماہ رُخ دبے پاؤں مہرالنساء بیگم کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ماہ رخ نے آہستہ سے دستک دی۔

''اندر چلی آؤ ماہ رخ!.....دروازہ کھلا ہے۔'' مہرالنساء بیگم کی بارُعب آواز سنائی دی۔

ماہ رخ آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے سامنے ایک ہوش ربا منظر تھا۔ مہرالنساء بیگم سفید باریک ریشمی کپڑوں میں ملبوس اپنے بستر پر نیم دراز تھی۔ ماہ رخ کی آنکھیں جھک گئیں۔ وہ مہرالنساء کے حُسن کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔ اگرچہ وہ خود بھی ایک حسین لڑکی تھی، لیکن آج ایک پینتیس سالہ بیوہ کے سامنے وہ اپنے آپ کو بہت زیادہ بدصورت سمجھنے لگی تھی۔ مہرالنساء کو باریک لباس میں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے آگ کے بھڑکتے ہوئے سرخ شعلوں نے سفید چاندنی کی قبا پہن لی ہے۔

''بیٹھ جاؤ ماہ رخ!'' مہرالنساء نے اپنے پیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ماہ رخ، مہرالنساء کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

مہرالنساء سیدھی ہوئی اور اس نے اپنے دائیں جانب رکھا ہوا ایک سرخ لفافہ اُٹھایا۔ پھر ماہ رخ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''تُو جانتی ہے کہ اس لفافے میں کیا چیز پوشیدہ ہے؟''

ماہ رخ نے گھبرا کر نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔

''اس لفافے کا راز صرف خدا جانتا ہے یا بیگم صاحبہ۔''

''مگر آج رات تُو بھی اس راز میں شامل ہو جائے گی۔'' مہرالنساء بیگم کا لہجہ حاکمانہ تھا۔ ''یہ میرا ایک ذاتی خط ہے، جو شہنشاہ جہانگیر کے نام لکھا گیا ہے۔''

ماہ رخ سب کچھ جانتی تھی، مگر قصداً اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہی تھی۔

''تجھے یہ خط، عالم پناہ کے حوالے کرنا ہے۔'' مہرالنساء نے حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ انجمن آراء تجھے شہنشاہ کے حضور جانے نہیں دے گی۔''

''پھر میرے لئے کیا حکم ہے بیگم صاحبہ؟'' ماہ رخ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"تُو براہِ راست یہ خط، شہنشاہ کے ہاتھوں میں پہنچائے گی۔" مہرالنساء بیگم کا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔ "اگر انجمن آراء تیرا راستہ روکے تو اُسے جھڑک دینا کہ یہی ہمارا حکم ہے۔ پھر جب تُو شہنشاہ کے روبرو پہنچ جائے تو عالم پناہ کے چہرے کا جائزہ لینا کہ اس پر کیسے کیسے رنگ آ کر گزر رہے ہیں۔"

ماہ رخ نے ایک نظر مہرالنساء کی طرف دیکھا۔ آج اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ غرورِ حُسن کیا ہوتا ہے۔ مہرالنساء سر سے پاؤں تک تکبر اور بے نیازی کا ایک زندہ مجسمہ نظر آ رہی تھی۔ ماہ رخ نے اس کے ہاتھوں سے خط لے لیا، پھر جانے کے لئے اجازت طلب کرنے لگی۔

"ابھی ٹھہر!" یہ کہہ کر مہرالنساء نے اپنے بائیں ہاتھ پر رکھی ہوئی شمع کی طرف دیکھا اور دوبارہ ماہ رخ سے مخاطب ہوئی۔ "تُو خوب جانتی ہے کہ اس شمع کی زندگی زیادہ سے زیادہ ایک رات ہے۔ صبح کے قریب اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور اگر صاحبِ خانہ چاہے تو شمع کو کسی وقت بھی بجھا سکتا ہے۔" جیسے ہی کمرے میں مہرالنساء کے الفاظ کی گونج ختم ہوئی، اس نے شمع کو پھونک مار کر بجھا دیا۔ اب کمرے میں صرف فانوس روشن تھا اور شمع بجھ چکی تھی۔ "تُو نے دیکھا ماہ رخ! یہ شمع ہماری ہلکی سی سانس کو بھی برداشت نہ کر سکی اور اپنا وجود کھو بیٹھی۔"

ماہ رخ، مہرالنساء کے اس عمل کو دیکھ کر چونک اُٹھی۔ ابھی وہ شمع کے بجھائے جانے کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ مہرالنساء نے اس کا نام لے کر کہا۔

"ماہ رخ! اب تُو ہمارے ایک راز سے واقف ہو چکی ہے۔ اگر کسی مقام پر زبان کو لغزش ہوئی تو تیرا انجام بھی شمع سے مختلف نہیں ہو گا۔ ہم تجھے صبح تک جلنے کا موقع نہیں دیں گے، بلکہ سرِ شام ہی بجھا دیں گے۔"

"کنیز ایک رازداں کے فرائض سے بخوبی واقف ہے۔" ماہ رخ نے جواباً کہا اور کمرے سے نکل کر شہنشاہ کے خلوت کدے کی طرف چلی گئی۔

۞.....۞.....۞

مہرالنساء کے اندیشے درست تھے۔ جہانگیر کی خواب گاہ کے باہر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ انہوں نے ماہ رخ کو روک کر آنے کا سبب پوچھا۔ ماہ رخ نے انجمن آراء سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک سپاہی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور ایک حسین لڑکی دروازے میں نمودار ہوئی۔ ماہ رخ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ انجمن آراء نہیں تھی۔ سپاہی نے سرگوشی کے انداز میں اس سے کچھ کہا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد دروازہ دوبارہ کھلا۔ اس مرتبہ انجمن آراء کا چہرہ نظر آیا تھا۔ درباری مطربہ نے مسکرا کر ماہ رخ کی طرف دیکھا، پھر سپاہیوں سے مخاطب ہو کر بولی۔

"اس لڑکی کو اندر آنے دیا جائے کہ یہ بھی شہنشاہ کی ایک کنیز ہے۔"

سپاہیوں نے ماہ رخ کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ ماہ رخ جھجکتے ہوئے خواب گاہ کے اندر داخل ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ سامنے ہی شہنشاہ جہانگیر جلوہ افروز ہوں گے۔ مگر ماہ رخ کا اندازہ غلط نکلا۔ وہاں اس کنیز کے علاوہ کوئی تیسرا فرد موجود نہیں تھا، جو پہلی بار خواب گاہ کے دروازے میں نمودار ہوئی تھی۔ انجمن آراء نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ماہ رخ دوسرے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں بھی ہوشربا حُسن رکھنے والی ایک کنیز موجود تھی۔ انجمن آراء اس کمرے سے گزر کر تیسرے کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ کمرہ خالی تھا۔ یہاں پہنچ کر انجمن آراء نے اس سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم مہرالنساء کا کوئی پیغام لے کر آئی ہو؟"

ماہ رخ نے اثبات میں اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

"تو لاؤ، وہ خط مجھے دے دو۔" انجمن آراء نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"میں خود عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ خط پیش کروں گی۔" ماہ رخ نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "بیگم صاحبہ کا یہی حکم ہے۔"

"اس وقت شہنشاہ سے کوئی شخص نہیں مل سکتا۔ خواہ وہ کسی بھی مرتبے کا مالک ہو۔" انجمن آراء کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

"تو پھر مجھے واپس جانے کی اجازت دی جائے۔" ماہ رخ نے بے جھجک ہو کر کہا۔ "میں ایک امین ہوں اور امانت کی حقیقت کو سمجھتی ہوں۔"

انجمن آراء چند لمحوں کے لئے ساکت کھڑی رہی، پھر دبے قدموں چوتھے کمرے میں داخل ہوئی۔ اور یہی شہنشاہ جہانگیر کی خواب گاہ تھی۔ ماہ رخ کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ شہنشاہ کتنے پردوں کے اندر رہتا ہے اور اس تک رعایا کا پہنچنا کس قدر دشوار ہے۔ انجمن آراء فوراً ہی واپس آ گئی اور ماہ رخ سے شہنشاہ کے حضور جانے کے لئے کہا۔

پھر جیسے ہی ماہ رخ نے خواب گاہ کا دروازہ کھولا، وہ مختلف خوشبوؤں کے سیلاب میں غرق ہو گئی۔ قالین پر قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا، جیسے وہ زمین کے اندر اُترتی چلی جا رہی ہے۔ ماہ رخ اس شاہانہ ماحول سے اتنی خوف زدہ ہوئی کہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گئی۔

"لڑکی! تجھے دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ تُو مہرالنساء بیگم کی قاصد ہے اور ہم اسی لئے تیری طرف الطاف و کرم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔"

ماہ رخ نے گھبرا کر دیکھا۔ دروازے سے دائیں جانب شہنشاہ ابوالمظفر نورالدین جہانگیر بستر پر دراز تھے۔ ماہ رخ لرزتے قدموں سے اُٹھی اور سجدے میں چلی گئی۔ جہانگیر نے اسے غور سے دیکھا۔ سجدہ کرتے وقت ماہ رخ نے مہرالنساء کا دیا ہوا لفافہ ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ لفافہ دیکھ کر شہنشاہ کے جذبات میں ایک زلزلہ آ گیا تھا مگر اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ جہانگیر ایک کنیز کے سامنے اپنے دل کی مجبوریاں ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"اے مہرالنساء کی نامہ بر! اُٹھ کہ ہم نے تیرا سجدہ قبول کیا۔" جہانگیر کی پُر جلال آواز گونجی۔

شہنشاہ کے جلال نے ماہ رخ پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے قالین پر پڑا ہوا لفافہ اٹھایا اور والیٔ ہند کے حضور پیش کر دیا۔

اب جہانگیر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اُس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر لفافہ چاک کر ڈالا۔ شہنشاہ گلابی رنگ کے کاغذ پر تحریر شدہ عبارت کو بے قراری کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ مہرالنساء نے ہندوستان کے فرمانروا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ظلِ الٰہی! یہ ادنیٰ کنیز خون کے دریا سے گزر کر آپ کی پناہ گاہ تک پہنچی ہے۔ اب میں نہیں چاہتی کہ کوئی میرے تنِ ریزہ ریزہ کی مسیحائی کرے۔ آپ کی عنایاتِ خسروانہ سے میرے دل کا ایک ایک زخم خون دینے لگا ہے۔ اگر عالم پناہ چاہتے ہیں کہ میں دوبارہ اپنی حسرتوں کے خون سے غسل کروں تو ہندوستان کا مالک پورا اختیار رکھتا ہے کہ وہ جس کو جس طرح چاہے، تماشا بنا ڈالے۔"

خط پڑھ کر شہنشاہ جہانگیر نے سرخ لفافے کو غور سے دیکھا، جو انسانی خون کے ہم رنگ نظر آ رہا تھا۔ جہانگیر پہلے ہی نور جہاں کی ذہانت کا معترف تھا، اب مزید قائل ہو گیا۔ پھر اس نے انجمن آراء کو آواز دی۔ درباری مطربہ تیز قدموں سے خواب گاہِ شاہی میں داخل ہوئی۔

جہانگیر نے انجمن آراء کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکی کا دامن اشرفیوں سے بھر دے۔"

جب ماہ رخ اُلٹے قدموں واپس جانے لگی تو جہانگیر نے اُسے مخاطب کیا۔ "مہرالنساء بیگم سے کہہ دینا کہ ہم قیامت تک ان کا انتظار کریں گے۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ شہنشاہ جن سے محبت کرتے ہیں، وہ حسرتوں کے خون میں نہیں نہاتے۔ مشک و عنبر اور گلاب و زعفران سے ان کا غسل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ عالم پناہ کا دل گزرگاہِ عام نہیں ہوتا۔ یہ سعادت کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔"

ماہ رخ اپنے دامن میں شاہی اشرفیاں سمیٹ کر دوبارہ مہرالنساء کے کمرے میں پہنچی۔ اور جب اس نے شہنشاہ کا پیغام منتقل کیا تو مہرالنساء کے گلنار چہرے پر شرم و حیا کی ایک لہر سی آئی اور بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں فتح کے نئے رنگ دمکنے لگے۔

❀.....❀.....❀

ماہ رخ کے جاتے ہی انجمن آراء نے ایک جامِ سرخ لبریز کر کے جہانگیر کو پیش کیا اور پھر شہزادے کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"عالم پناہ کیا ابھی تک مہرالنساء بیگم اپنی ضد پر قائم ہیں؟" انجمن آراء، جہانگیر کی ایک معتمد کنیز تھی، جو اکثر شاہی رازوں میں شریک رہا کرتی تھی۔

"نہیں انجمن! یہ ضد نہیں، مہرالنساء کا خوف ہے۔ شیر افگن کے قتل نے اسے ہماری طرف

سے بدگمان کر دیا ہے۔ اور یہی بدگمانی اسے مجبور کر رہی ہے کہ وہ ہم سے اپنے مستقبل کی ضمانت طلب کرے۔"

"کنیز کی گستاخی معاف! آپ کی درخواست گزاری، شاہانہ وقار کے سخت منافی ہے۔" انجمن نے جہانگیر کے پیروں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"تُو نے سچ کہا انجمن! کہ ہمارا اقتدار ایک لمحے میں اس کا جسم خرید سکتا ہے۔" جہانگیر نے آہستہ آہستہ شراب کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر ہم جسم پر نہیں، مہرالنساء کے دل و دماغ پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔"

"فی الحال تو ان کی بھتیجی ارجمند بانو، شہزادہ خرم کے دل پر حکومت کر رہی ہیں۔" انجمن آراء کے ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

جہانگیر کے لئے بڑی حیران کن خبر تھی۔ اس نے ایک ہی سانس میں باقی شراب ختم کی اور انجمن آراء سے مخاطب ہوا۔ "کیا تُو نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟" جہانگیر کے لہجے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ابھی ابھی جو لڑکی، مہرالنساء بیگم کا خط لے کر آئی تھی، وہ دراصل وزیرِ اعظم آصف خان کی کنیز ہے۔" انجمن آراء نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "مہرالنساء بیگم نے ذاتی پیغام رسانی کے لئے اس لڑکی کو عارضی طور پر اپنے بھائی سے مستعار لے لیا ہے۔ آج شام ہی میں نے شہزادہ خرم کو مینا بازار میں اسی لڑکی سے طویل گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت صاحبِ عالم کچھ پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے اسی بنیا پر یہ اندازہ قائم کیا ہے کہ شہزادہ خرم، ارجمند بانو کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے ہیں۔"

"نہیں انجمن! یہ ممکن نہیں۔" جہانگیر کی آواز معمول سے زیادہ بلند تھی۔ "کہاں وہ وزیر زادی ارجمند بانو، جس کا خاندان ہمارے بزرگوں کے رحم و کرم سے اس مقام تک پہنچا اور کہاں شہزادہ خرم، ابن شہنشاہ، ابن شہنشاہ، ابن شہنشاہ، ابن شہنشاہ۔" جوشِ جذبات اور احساسِ غرور سے جہانگیر کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ "جس کے آباؤ اجداد نے چار پشتوں تک ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک پر حکومت کی ہو۔ اور جس کے مورثِ اعلیٰ امیر تیمور نے ساری دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا ہو، اس خاندان کا وارث ایک معمولی لڑکی کے قدموں پر اس طرح جھک جائے گا، ہمیں یقین نہیں آتا انجمن!" کچھ عالمِ مستی تھا اور کچھ حالتِ غضب، جس سے مغلوب ہو کر جہانگیر کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "یہ رشتہ ہمیں منظور نہیں۔ اس رشتے کو بلا تاخیر منقطع کر دو۔ ارجمند اور خرم کا کوئی جوڑ نہیں۔ خاک کو آسماں سے کیا نسبت؟"

اِدھر شہنشاہ جہانگیر، خرم کی قسمت کا فیصلہ سنا رہا تھا اور اُدھر شہزادہ، بارہ دری میں بے چینی کے ساتھ ماہ رخ کا انتظار کر رہا تھا۔

❀.....❀.....❀

ماہ رخ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اور مہرالنساء کا یہ حال تھا کہ وہ ایک ایک بات تفصیل سے معلوم کر رہی تھی۔ کبھی پوچھتی کہ شہنشاہ اپنے بستر پر کس طرح دراز تھے؟ کبھی اس کا سوال ہوتا کہ شہنشاہ نے اِس کو دیکھ کر کس قسم کے تاثرات کا اظہار کیا؟ اور کبھی پوچھتی کہ خط پڑھ کر شہنشاہ کے چہرے پر کیسے کیسے رنگ اُبھرے تھے؟ مہرالنساء کے سوالوں کی یلغار سے ماہ رخ پریشان تھی۔ اسے احساس تھا کہ زیادہ وقت ہو گیا ہے اور کہیں شہزادہ عالم کشمکشِ انتظار سے گھبرا کر واپس نہ لوٹ جائیں۔ اور اگر ایسا ہو گیا.....؟ ماہ رخ اس سے زیادہ سوچنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے اپنے ذہن کو وسوسوں اور اندیشوں کی قید سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ مگر مہرالنساء کا وہی حال تھا۔ اسے اپنے حُسن کی برتری اور شہنشاہ کے عشق کی مجبوری کے سوا کسی چیز کی فکر نہیں تھی۔ وہ مغرور عورت تو ماہ رخ کی زبان سے بس ایک ہی بات سننا چاہتی تھی کہ شہنشاہ جہانگیر اس کی محبت میں دیوانگی کی حد تک پہنچ گئے ہیں اور کچھ دنوں اپنا گریبان چاک کرنے والے ہیں۔ ماہ رخ کو پیچھا چھڑانے کے لئے بالآخر ایک کھلے ہوئے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

''بیگم صاحبہ! اگر آپ نے بہت جلد التفاتِ خاص سے کام نہیں لیا تو عالم پناہ اپنی ذات کو مکمل طور پر شراب میں غرق کر دیں گے۔''

یہ سن کر مہرالنساء بے اختیار ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ناقابلِ بیان خوشی رقص کر رہی تھی۔ وہ بستر سے اُٹھی اور دیوانہ وار اپنی کنیز سے لپٹ گئی۔ انسانی نفس بھی عجیب چیز ہے۔ وہ اپنی غرض کے لئے آقا اور غلام کا فرق بھی مٹا دیتا ہے۔ اور اسی غرض کی خاطر وہ خدا بن بیٹھتا ہے اور ہم جنسوں کو اپنی مخلوق سمجھنے لگتا ہے۔ مہرالنساء بیگم کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ماہ رخ نے جھوٹ بولا تھا اور مہرالنساء اسی جھوٹ کو سننے کے لئے بہت دیر سے بے قرار نظر آ رہی تھی۔

''خدا تیری زبان مبارک کرے، ماہ رخ!'' مہرالنساء کے بدن میں ہلکی ہلکی لرزش تھی اور زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔ ''ابھی شہنشاہ کی وحشتوں میں اور اضافہ ہونے دے۔ حُسن ہمیشہ عشق کو خلش اور درد کی سوغات دیتا ہے۔ عشق کا منصب یہی ہے کہ سینے سے مسلسل دھواں اُٹھتا رہے۔ اور حُسن اپنی خواب گاہ میں بے خبر سوتا رہے۔ ابھی ہم عالم پناہ کو اور تڑپائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ ہماری پناہ مانگنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ پھر ہم سوچیں گے کہ ان کے سجدۂ شوق کو شرفِ قبولیت بخشا جائے یا نہیں؟''

آج ماہ رخ کو اندازہ ہوا تھا کہ مہرالنساء کتنی ذہین اور سفاک عورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی ماہ رخ کو یہ احساس بھی ہوا کہ مہرالنساء کا شمار دنیا کی چند خوش نصیب عورتوں میں ہوتا ہے۔ بظاہر وہ ایک بیوہ تھی اور دنیا والے اسے بدنصیب کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اس کی خوش قسمتی کس انداز میں کروٹیں لے کر بیدار ہو رہی ہے۔

آخر رات کے بارہ بجے مہرالنساء نے ماہ رخ کو زمرد کی ایک قیمتی انگوٹھی دے کر رخصت کیا۔ ماہ رخ دبے قدموں مادر ملکہ کے کمرے میں آئی اور اس نے دیکھا کہ سلیمہ بیگم گہری نیند سو

رہی ہیں۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر تیز رفتاری کے ساتھ بارہ دری کی طرف جانے لگی، پھر طویل راہ داریوں سے گزر کر شہزادے تک پہنچی۔

خرم، بارہ دری کے ایک سنسان گوشے میں ماہ رخ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مکمل اندھیری رات تھی۔ جب شہزادے نے ایک سائے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو وہ مضطرب ہو کر آگے بڑھا۔

''کون ہے؟''

خرم جانتا تھا کہ وہ ماہ رخ ہو گی۔ مگر پھر بھی اس نے آنے والے کا تعارف ضروری سمجھا۔

''میں ماہ رخ۔ شہزادہ عالم کی ادنیٰ ترین کنیز۔'' ماہ رخ نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا اور تیز قدموں سے خرم کے قریب پہنچ گئی۔

''تمہیں ہمارے انتظار کی اذیت کا اندازہ ہے ماہ رخ؟'' شہزادے نے جس مہذب انداز میں شکایت کی تھی، اسے محسوس کر کے ماہ رخ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہاں مہرالنساء بیگم کا حاکمانہ لہجہ اور کہاں خرم کا دلنشیں انداز کہ ایک کنیز بھی شہزادے سے گفتگو کر کے اپنے آپ پر فخر محسوس کرے۔

''شہزادہ عالم! آج مادر ملکہ کو سونے میں دیر ہو گئی۔ اس لئے کنیز بروقت نہ پہنچ سکی۔'' ماہ رخ نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں ماہ رخ! تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید ہم ہی وقت سے کچھ پہلے چلے آئے تھے۔'' خرم نے انتہائی معصومیت اور سادگی سے کہا۔ ''تم کسی تاخیر کے بغیر ہمیں صورتِ حال سے آگاہ کرو کہ ہم اپنا صبر و قرار کھو چکے ہیں۔''

ماہ رخ نے شہزادے کو ارسلان کے بارے میں تمام تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

''میرے آقا! وزیراعظم، آصف خان نے اس بددات کو ٹالنے کے لئے ارجمند بانو کی مرضی کا سہارا لیا تھا۔ اور آقا یہ بات خوب جانتے تھے کہ ارجمند بانو اپنے گھر کی چار دیواری میں بھی ارسلان بیگ کی موجودگی کو برداشت نہیں کرتی ہیں۔ پھر یہ رشتہ کس طرح ممکن تھا؟ آقا نے سوچا تھا کہ وہ خوش اسلوبی کے ساتھ ارسلان سے کہہ دیں گے کہ ارجمند ابھی شادی کے لئے آمادہ نہیں اور بات ختم ہو جائے گی۔''

''مگر اسے یہ جرأت کس طرح ہوئی کہ وہ ہمارے سامنے ارجمند بانو کو اپنی شریکِ حیات کہہ کر پکارے۔'' خرم نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دعویٰ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک اس میں ارجمند کی مرضی شامل نہ ہو۔''

''شہزادہ عالم!'' ماہ رخ کے دل میں درد کی ایک تیز لہر اُٹھی۔ ''آپ ایک غیرت مند دوشیزہ کی مجبوری کو اس کا اقرار سمجھ رہے ہیں۔''

''ہمیں سمجھانے کی کوشش کرو ماہ رخ! ہم کسی کے دل کا حال نہیں جانتے۔'' خرم کا لہجہ

بہت اُداس تھا۔ ''ہمیں تو ارجمند بانو سے بس اتنی شکایت ہے کہ انہوں نے ہمارا تحفہ کیوں قبول کیا؟ اگر در پردہ صورتِ حال مختلف تھی تو ہمارے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا ہوتا۔ خدا کی قسم! ہم ان شہزادوں میں سے ہرگز نہیں، جو رعایا پر اپنی جارحانہ مرضی مسلط کر دیتے ہیں۔ بخدا! ہم واپس لوٹ جاتے اور اس حادثے پر صبر کر لیتے۔ مگر پھر بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم ارجمند بانو کو فراموش کر دیتے۔ بے شک وہ ہمارے شبستانِ اختیار میں داخل نہ ہوتیں لیکن ہم ان کی یادوں کو اپنے حریمِ دل میں اس طرح سجا کر رکھتے کہ آخری سانس تک ہمارے ہونٹوں پر ان ہی کا نام ہوتا۔ افسوس! ارجمند بانو نے ہمیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔''

ماہ رخ شہزادے کی زبان سے یہ باتیں سن کر سناٹے میں آ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کس طرح خرم کی بدگمانیوں کو دُور کرے۔ ارسلان بیگ کی کمینگی نے ارجمند کے گرد ایک ایسا حصار کھینچ دیا تھا، جسے توڑنا بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی اس جاں نثار کنیز نے اپنی آقا زادی کی محبت کو ناکامی سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔

''اگر شہزادہ عالم میری جاں بخشی فرمائیں تو میں کچھ کہنے کی جسارت کروں۔'' ماہ رخ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تم خوب جانتی ہو ماہ رخ! کہ ہم کوئی جابر حاکم نہیں۔'' شہزادہ خرم نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ''تم گفتار و اظہار میں مکمل طور پر آزاد ہو۔''

''بصد ہزار معافی! شہزادہ عالم نے ارجمند بانو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔'' ماہ رخ نے پُراعتماد لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ارسلان بیگ نے وزیراعظم آصف خان کو بھی دھمکی دی تھی اور ارجمند بانو کو بھی تنبیہہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ان دونوں کی طرف سے انکار کیا گیا تو شہنشاہ جہانگیر اس معاملے میں براہِ راست مداخلت کریں گے۔ ارسلان بیگ کو عالم پناہ کی مصاحبت پر اس قدر ناز ہے کہ وہ بے دھڑک مینا بازار میں پہنچ کر ارجمند بانو پر مسلط ہو گیا۔'' یہ کہہ کر ماہ رخ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔

''خدا کے لئے خاموش نہ رہو، ماہ رخ! کہ ہمارا دم گھٹا جا رہا ہے۔'' شہزادہ خرم نے بے قرار ہو کر کہا۔

''شہزادہ عالم اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ ارجمند بانو صرف آپ کے لئے مینا بازار آئی تھیں۔ میں نے آقا زادی سے ایک دن پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی محبت کا سفر تیزی سے طے کریں، ورنہ وہ کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتی ہیں۔''

''کیسا حادثہ؟'' خرم نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہی حادثہ، جس کے اثرات اندھیروں کے باوجود مجھے صاف صاف نظر آ رہے ہیں۔'' ماہ رخ نے شدید جذباتی لہجے میں کہا۔ ''اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو گا صاحبِ عالم! کہ ایک معصوم اور وفا پرست دوشیزہ کا محبوب اس کی طرف سے بدگمان ہو جائے۔ ارجمند بانو آپ سے

اپنی مجبوریاں بیان کرنے کے لئے تنہا مینا بازار آئی تھیں مگر وہ ذلیل شخص، ارسلان بیگ بھی وہاں پہنچ گیا اور پھر جاتے جاتے اس نے آپ کے دل میں بھی بدگمانیوں کا بیج بو دیا کہ یہ پھوٹ کر تناور درخت بن جائے۔ میں صاحبِ عالم کے حضور یہ درخواست لے کر آئی ہوں کہ آپ بارہ دری میں اسی جگہ ایک مرتبہ ارجمند بانو کو ملاقات کا شرف بخش دیں۔ پھر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ارسلان بیگ نے انہیں ''شریکِ حیات'' کیوں کہا؟ وہ ایک انتہائی عیار انسان ہے۔ اس کی کمینگی مسلسل ارجمند کے گرد جال بچھا رہی ہے تاکہ ایک شریف النفس دوشیزہ تہمتوں اور بدنامیوں کا شکار ہو جائے اور پھر اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے کہ وہ ارسلان بیگ کی بیوی بننے پر آمادگی کا اظہار کر دے۔ میں جانتی ہوں کہ ارسلان بیگ ایک ہوشیار شاطر ہے، مگر وہ ارجمند بانو کے جسم پر تصرف حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر خدانخواستہ شاہی محل سے تہمتوں کا غبار اُٹھا اور اس نے ارجمند بانو کی دوشیزگی کے دامن کو آلودہ کر دیا تو وہ غیرت مند لڑکی جان دیدے گی لیکن ارسلان بیگ جیسے حیوان کو اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول نہیں کرے گی۔ شہزادۂ عالم! جلدی کیجئے۔ کہیں وہ نامراد، ظلِ الٰہی کے حضور پہنچ کر میرے آقا، آصف خان کو مجبور نہ کر دے۔ عالم پناہ کے ہونٹوں کی ایک جنبش، ارجمند کے مقدر کا فیصلہ کر سکتی ہے۔''

شہزادہ خرم بہت دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں کھڑا رہا، پھر بہت شکستہ لہجے میں بولا۔

''ہم ارسلان بیگ جیسے خوشامدی غلام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ مگر پھر بھی وہ عالم پناہ کا منہ چڑھا مصاحب ہے۔''

''پھر کیا ارجمند بانو کی ذات اسی طرح سازشوں کا ہدف بنی رہے گی؟'' ماہ رخ نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

''ہم اسے ارجمند بانو کے حوالے سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے۔'' شہزادہ خرم نے ماہ رخ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ سازشیں کر کے ارسلان بیگ کو قتل کرا دیں۔ بے شک! اُس نے ارجمند بانو کی شان میں گستاخی کی ہے اور ہماری شدید خواہش ہے کہ وہ ہمارے سامنے ارجمند سے معافی مانگے۔ مگر یہ بھی ممکن نہیں۔ ہم ارجمند بانو کی رُسوائی سے ڈرتے ہیں۔ اگر ہمارا مقابل کوئی اعلیٰ ظرف انسان ہوتا تو ہم خود براہِ راست اُس سے گفتگو کرتے۔ لیکن وہ سفلی فطرت رکھنے والا ایک کینہ پرور شخص ہے۔ اگر ایک بار بھرے دربار میں اس کی زبان پر ارجمند بانو کا نام آ گیا تو پھر ارسلان کی لاش کے ٹکڑے کر کے بھی اس گناہ کا کفارہ ادا نہیں ہو سکے گا اور ہم ساری عمر ایک ناقابلِ بیان اذیت میں مبتلا رہیں گے۔ اس لئے صبر کرو اور خدا کے فیصلے کا انتظار کرو کہ اسی کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔ اور وہ کبھی ناانصافی نہیں کرتا۔ اور اپنے بندوں کے لئے اس کی ذات بہت مہربان اور رحیم ہے۔''

''اور اگر اس دوران اس خبیث فطرت شخص نے عالم پناہ کو مداخلت پر مجبور کر دیا؟'' ماہ رخ کا سوال بہت فکر انگیز تھا۔

"تم عالم پناہ کو نہیں جانتیں ماہ رخ!" شہزادے کے لہجے سے باپ کے لئے ایک خاص عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "ظلِ الٰہی ایک منصف مزاج حکمران ہیں۔ وہ ایک کمزور انسان کے مقدمے کو بھی پوری توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔ اور اگر وہ حق پر ہو تو اس کے ساتھ مکمل انصاف کرتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ارسلان بیگ جیسا معمولی شخص، شہنشاہ کے سامنے وزیر اعظم آصف خان کی بیٹی کا رشتہ مانگنے کی جرأت کر سکے۔" یہ کہہ کر شہزادہ خرم کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

حُسن پرستی اور عیش کوشی کے باوجود شہنشاہ نورالدین جہانگیر ایک انصاف پسند حکمران تھا۔ تاجِ شاہی پہننے اور تخت نشین ہونے کے بعد جہانگیر نے جو سب سے پہلا حکم جاری کیا تھا، وہ انصاف کی زنجیر کا نصب کرنا تھا۔ جب "زنجیرِ عدل" نصب ہو گئی تو جہانگیر نے قریہ قریہ اور شہر شہر یہ اعلان کرا دیا۔

"میں شہنشاہ نورالدین جہانگیر اپنی رعایا کو خبردار کرتا ہوں کہ اگر عدالت کے کارکن مظلوموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں تو ستم رسیدہ انسانوں کو لازم ہے کہ وہ انصاف کی زنجیر تک پہنچیں۔ پھر اسے مسلسل ہلاتے رہیں۔ یہاں تک کہ زنجیر کی آواز میرے کانوں تک پہنچ جائے۔ اگر کوئی مظلوم، رات کے وقت فوری انصاف کا طلب گار ہے تو میں اس کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ میری نیند کی پروا نہ کرے۔ پوری طاقت کے ساتھ زنجیر کو گردش دے تاکہ میں خواب سے بیدار ہو جاؤں۔"

انصاف کی یہ زنجیر تیس گز لمبی تھی اور چار من خالص سونے سے تیار ہوئی تھی۔ اس میں ساٹھ گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ زنجیر کا ایک سرا "شاہ برج" کے کنگرے سے باندھ دیا گیا اور دوسرا سرا دریائے جمنا کے کنارے نصب شدہ سنگ میل سے۔ اس ذیل میں شہنشاہ جہانگیر نے یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ اگر حکومت کا کوئی بااختیار شخص کسی مظلوم کو "زنجیرِ عدل" تک پہنچنے سے روکے تو بے دریغ اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔

شہزادہ خرم نے شہنشاہ کی اسی انصاف پسندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اس سے پہلے کہ ارسلان بیگ کوئی سازش کرے، آپ خود عالم پناہ سے گفتگو کیوں نہیں کرتے؟" ماہ رخ نے شہزادہ خرم کو خاموش پا کر کہا۔

"نہیں ماہ رخ! حضور کے سامنے ہم لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتے۔" خرم نے رک رک کر کہا۔ "ہم کس زبان سے ارجمند کا نام لیں گے؟ ہمیں ان کی یہ رسوائی گوارہ نہیں۔"

"پھر اس محبت کا کیا انجام ہو گا، صاحبِ عالم!" ماہ رخ نے انتہائی تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "نامِ خدا، وہ اب جوان ہو چکی ہیں۔ کہیں سے بھی رشتے کا کوئی پیغام آ سکتا ہے۔ اس وقت شہزادۂ عالم کیا کریں گے؟"

"صبر اور صرف صبر۔" شہزادہ خرم نے جواباً کہا۔ "ہم روح کی گہرائیوں سے مشیّت خداوندی کے قائل ہیں۔ وہ جو کچھ کرے گا، بہتر کرے گا۔"

"صاحبِ عالم! یہ تو ایک نہایت کمزور دلیل ہے۔" ماہ رخ، شہزادے کی سادگی کے سبب کسی قدر بے تکلف ہو گئی تھی۔ "آخر انسانی جدوجہد کس چیز کا نام ہے؟ پہلے آپ بھرپور کوشش کریں۔ پھر اگر نتیجہ برخلاف نکلے تو اسے مقدر کا نام دیجئے۔"

"ماہ رخ! بس ہم اتنا ہی اختیار رکھتے ہیں کہ اپنے دل کو ارجمند بانو کے سوا کسی دوسری عورت کی گزرگاہ نہیں بننے دیں گے۔" خرم کے لہجے میں سچائی بھی تھی اور دل کا درد بھی شامل تھا۔ "اگر شہنشاہ ہم سے فرمائیں کہ ایک طرف ہندوستان کا تخت و تاج ہے اور دوسری جانب ارجمند بانو، تو ہم اپنی محبت کا انتخاب کریں گے، جو ہماری پہلی اور آخری محبت ہے۔"

ماہ رخ بہت دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ اس بات کا انتظار کرتی رہی کہ شاید خرم، ارجمند سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کرے مگر اس سلسلے میں شہزادے کی زبان پر مہر سی لگ گئی تھی۔ مجبور ہو کر خود ماہ رخ نے کہا۔

"آپ کی اور ارجمند کی ایک ملاقات بہت ضروری ہے۔"

"مگر یہ ملاقات کس طرح ہو گی؟" اندھیرے کے سبب وہ شہزادے کے تاثرات کا جائزہ لینے سے قاصر تھی۔ مگر خرم اپنے لہجے سے بہت سراسیمہ نظر آ رہا تھا۔

"آپ کی ملاقات اسی بارہ دری میں اور اسی وقت ہو گی۔" ماہ رخ نے صاف صاف کہا۔

"آقازادی آپ سے ملنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے سخت بے قرار ہیں۔"

"اب کسی صفائی کی ضرورت نہیں ماہ رخ!" شہزادہ خرم نے کہا۔ "اب ہمارا دل ان کی طرف سے آئینے کی طرح شفاف ہے۔" شہزادہ خود بھی ارجمند سے ملنے کے لئے بے قرار تھا۔ مگر ماہ رخ کے سامنے اسے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔

❀.....❀.....❀

دوسرے دن درباری امور سے فارغ ہونے کے بعد شہنشاہ جہانگیر نے سپہ سالار مہابت خان کو خلوت میں طلب کر لیا۔ مہابت خان اس اچانک طلبی پر پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

"تیرا خیال ٹھیک تھا، مہابت خان!" جہانگیر نے پُرجلال لہجے میں کہا۔ "شہزادہ خرم راستہ چلتے چلتے بھٹک گیا ہے۔ ہمیں انجمن آراء نے خبر دی ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کا وارث دل کی بیماری میں مبتلا ہے۔"

مہابت خان نے سر جھکا دیا۔ "ظلِ الٰہی! اگر غلام کی حقیر رائے کو اہمیت دیں تو اس وقت شہزادے کو غم گساری کی ضرورت ہے۔"

"آخر تُو کیا کہنا چاہتا ہے مہابت خان!" جہانگیر کی آواز میں تلخی کی آمیزش تھی۔

"یہ عمر بہت نازک ہوتی ہے عالم پناہ!" مہابت خان نے بدستور سر جھکائے ہوئے کہا۔ "شہزادے کی رہنمائی فرمائیں۔ جبر کے ساتھ نہیں، وہ آپ کی محبت کے محتاج ہیں۔"

"کیسی محبت؟" جہانگیر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"شہزادۂ عالم کے جذبات پر حکم کے پہرے نہ بٹھائیں۔" مہابت خان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میں ظلِ الٰہی کے اس انصاف کو آواز دے رہا ہوں، جس کی ساری دنیا میں دھوم ہے۔"

"ہم انصاف سے کام لینا چاہتے ہیں مہابت خان! مگر شہزادے کا انتخاب غلط ہے۔" جہانگیر کی آواز میں وہی سختی موجود تھی۔

مہابت خان نے سر اٹھا کر شہنشاہ کی طرف دیکھا، مگر کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا۔

"تو ہمارا وفادار بھی ہے مہابت خان! اور رازدار بھی۔" جہانگیر نے گفتگو کا انداز بدلا۔

"ساری دنیا جانتی ہے کہ میں حضور کا نمک خوار ہوں اور ظلِ الٰہی کے رحم و کرم سے اس درجے تک پہنچا ہوں۔" مہابت خان کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور سر مزید جھک گیا تھا۔

"اس سے پہلے کہ شہزادے کی محبت ایک تماشا بن جائے، ہم تجھ سے مشورہ چاہتے ہیں۔" جہانگیر نے تیز لہجے میں کہا۔ "کیا وزیرِاعظم آصف خان، خاندانی اعتبار سے ہماری برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے؟"

مہابت خان چونک اُٹھا اور اس نے لمحے میں اندازہ کر لیا کہ مرزا غیاث بیگ کے خاندان کی کوئی لڑکی، شہزادہ خرم کی منظورِ نظر ہے۔

"امیر تیمور صاحبقران کی نسل کو آصف خان کے خاندان سے کیا نسبت ہے؟ کہاں فاتح عالم کے وارث اور کہاں چھوٹے چھوٹے علاقوں کے حاکم۔" مہابت خان نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم شہزادہ خرم کی رہنمائی کریں اور آصف خان کی بیٹی ارجمند بانو کو اپنی بہو کی حیثیت سے تسلیم کر لیں؟" جہانگیر کے جلال میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ "ہم نہیں سمجھتے کہ اس شادی سے ہمیں کوئی سیاسی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔"

"پھر بھی اس احسان کا بوجھ اُتارا جا سکتا ہے جو مرزا غیاث بیگ کے باپ، خواجہ محمد شریف نے جنت آشیانی شہنشاہ ہمایوں پر کیا تھا۔" مہابت خان نے بہت آہستہ لہجے میں ادب کے ساتھ عرض کیا۔

جہانگیر یکایک گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اسے وہ وقت یاد آنے لگا، جب شہنشاہ ہمایوں نے شیر شاہ کے مقابلے میں شکست کھا کر ایران کی طرف ہجرت کی تھی۔ آصف خان کے دادا، خواجہ محمد شریف رازی نے ہمایوں کی بہت دلجوئی کی اور غریب الوطنی کے عالم میں ایک معزول حکمران کو سہارا دیا۔ مغل سلطنت پر آصف خان کے بزرگوں کا یہ ایک بڑا احسان تھا۔ اس احسان کو اکبر نے بھی یاد رکھا اور جہانگیر نے بھی فراموش نہیں کیا۔ اب مہابت خان نے اس احسان کی یاد دلائی تو جہانگیر بھڑک اُٹھا۔

"تُو کس احسان کی بات کرتا ہے مہابت خان؟" یکایک جہانگیر کے لہجے سے آگ برسنے

لگی تھی۔ "حضرت عرش آشیانی اکبر اعظم نے خواجہ محمد شریف کے فرزند، مرزا غیاث بیگ پر اپنی نوازشات کی بارش کر کے اس احسان کا قرض اُتار دیا تھا۔ پھر جب مرزا غیاث بیگ اپنی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کے سبب معزول کر دیا گیا تو ہم نے اپنے دورِ حکومت میں اس کے سابقہ گناہوں کو معاف کر کے نئے اعزاز سے سرفراز کیا۔ مزید یہ کہ غیاث بیگ کے بیٹے آصف خان کو وزارتِ عظمیٰ کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچایا۔ خواجہ محمد شریف رازی نے صرف جنت آشیانی شہنشاہ ہمایوں پر احسان کیا تھا۔ اور ہم مسلسل اُس کی دو نسلوں پر احسان کر چکے ہیں۔ پھر تُو کس قرض کی بات کر رہا ہے مہابت خان! ہم نے تو وہ قرض سُود در سُود ادا کر دیا ہے..... اور سچ تو یہ ہے کہ اب خواجہ محمد شریف کی روح ہماری زیرِ بارِ احسان ہو گی۔"

بات اچانک بگڑ گئی تھی۔ مہابت خان گھبرا گیا مگر وہ بنیادی طور پر سپاہی زادہ تھا، اس لئے فوراً ہی اپنے اعصاب پر قابو پا کر بولا۔ "ظلِ الٰہی! میرا مطلب اس احسان سے نہیں تھا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ عالم پناہ نے خواجہ محمد شریف کے خاندان پر بے شمار احسانات کئے ہیں۔ دراصل میری زبان لڑکھڑا گئی اور میں ایک انتہائی غلط بات کہہ گیا۔ میں اپنی اس حرکت پر بے حد شرمندہ ہوں۔" مہابت خان نے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "ایک سپاہی اس سے زیادہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ مرزا غیاث بیگ کے خاندان پر آخری احسان کر دیں کہ اس کے بعد شہزادہ خرم اپنے راستے پر لوٹ آئیں گے۔"

"وہ کس طرح؟" جہانگیر کے چہرے پر ناگواری کے آثار بدستور نمایاں تھے۔

"اگر ارجمند بانو کی نسبت، شہزادۂ عالم سے کر دی جائے تو سلطنتِ مغلیہ کے وارث جذباتی طور پر آسودہ ہو جائیں گے اور پھر سارے کام یکسوئی کے ساتھ انجام دے سکیں گے۔" مہابت خان نے اپنے شہنشاہ کو بڑی ذہانت کے ساتھ ایک مفید مشورہ دیا تھا۔

جہانگیر سوچنے لگا۔

"اس نسبت کا وقفہ طویل بھی ہو سکتا ہے۔" مہابت خان نے شہنشاہ کو خاموش پا کر کہا۔ "اگر اس دوران عالم پناہ سیاسی مفادات حاصل کرنا چاہیں تو شہزادے کی دوسری شادی بھی کی جا سکتی ہے۔"

جہانگیر چونک اُٹھا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "آج ہمیں اندازہ ہوا کہ تُو صرف شمشیر زن ہی نہیں، سوچنے والا دماغ بھی رکھتا ہے۔"

"میں شہزادے کو اُداس نہیں دیکھ سکتا، عالم پناہ!" مہابت خان نے عرض کیا۔ "وہ شاہانِ مغلیہ کے ذہین اور سعادت مند وارث ہیں۔ ان کی بے دلی اور ذہنی پریشانی حکومت کے لئے کوئی نیک فال نہیں ہو گی۔ میں شہزادے کے ذہن کو ہر فکر سے آزاد اور بازوؤں کو مسلسل حرکت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہم تیرے مشوروں پر غور کریں گے کہ آج تُو نے پہلی بار بہت ذہانت کی باتیں کی ہیں۔"

جہانگیر اپنے سپہ سالار سے خوش نظر آ رہا تھا۔

مہابت خان فوراً سجدے میں گر گیا۔ پھر اُٹھا اور آہستہ آہستہ اُلٹے قدموں چلتا ہوا بارگاہِ شاہی سے نکل گیا۔

❀.....❀.....❀

درباری مطربہ انجمن آراء، شہنشاہ کی خدمت میں حاضر تھی اور جہانگیر مسلسل شہزادہ خرم کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

''کیا ظلِ الٰہی کی طبیعت کچھ ناساز ہے؟'' انجمن آراء نے شوخ لہجے میں پوچھا۔ وہ جہانگیر کی رازدار ہونے کے سبب کسی قدر بے تکلف ہو گئی تھی۔ انجمن آراء بہترین مطربہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوب صورت عورت بھی تھی۔ وہ گزشتہ دس سال سے جہانگیر کی خدمت انجام دے رہی تھی۔ شروع میں اس کا خیال تھا کہ بعض دوسری کنیزوں کی طرح ایک دن وہ بھی جہانگیر کی بیوی کا درجہ حاصل کر لے گی۔ مگر انجمن آراء کی زندگی میں ابھی تک وہ مبارک دن نہیں آیا تھا۔ موسیقی میں درجۂ کمال رکھنے کے علاوہ انجمن آراء ایک اچھی شاعرہ بھی تھی۔ اور جہانگیر کو فنونِ لطیفہ سے بے پناہ عشق تھا۔ اسی وجہ سے انجمن آراء، شہنشاہ کے قریب ہوتی چلی گئی اور پھر ہندوستان کے حکمران کو اپنا محبوب سمجھنے لگی۔ انجمن، جہانگیر سے بے اندازہ محبت کرتی تھی۔ شہنشاہ کو بھی اس کا بہت خیال رہتا تھا۔ مگر انجمن ابھی تک بیوی کا درجہ حاصل نہیں کر سکی تھی۔

''ہماری طبیعت ٹھیک ہے انجمن!'' جہانگیر نے اپنی درباری مطربہ کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''مگر ہم شہزادہ خرم کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ ہمیں بظاہر اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔''

''ارجمند کے ساتھ شہزادہ خرم کی شادی کر دیجئے۔'' انجمن آراء نے بے ساختہ کہا۔

''ہم نے تو تجھے حکم دیا تھا کہ تُو ان دونوں کے درمیان ناقابلِ شکست دیوار کھڑی کر دے۔'' جہانگیر نے گزشتہ شب کی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''کنیز اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے؟ وہ تو محض ایک مجبور عورت ہے۔'' انجمن نے اُداس لہجے میں کہا۔ ''اور مجھ گناہ گار سے جدائی کا یہ منظر برداشت بھی نہیں ہو گا۔ آتشِ عشق کو وہی سمجھ سکتا ہے عالم پناہ! جس کے دل میں خود آگ لگی ہو۔'' انجمن آراء درپردہ اپنی محرومیوں کا ماتم کر رہی تھی۔

''ہم شہزادے کو بزدل عاشق کے بجائے ایک بے خوف سپاہی دیکھنا چاہتے ہیں۔'' جہانگیر نے انجمن کی دلیل کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

''ظلِ الٰہی! سپاہی بھی عشق کرتے ہیں۔'' انجمن نے برجستہ کہا۔ ''کشت و خون ان کا مشغلہ سہی، مگر ان کے جسم بھی گوشت پوست کے بنے ہوتے ہیں۔ اور ان کے جسموں میں ایک نازک

سا آبگینہ، جس کا نام دل ہے، وہ بھی دھڑکتا ہے۔ کنیز کے خیال میں اس شادی سے صاحبِ عالم کے مستقبل پر اچھا اثر مرتب ہو گا۔''

''تو کیا تُو بھی خرم کی وکالت کر رہی ہے؟'' اچانک جہانگیر کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

''میں تو دنیا کے ہر عاشق کی وکالت کروں گی، عالم پناہ!'' انجمن آج بہت بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ''شہزادے کی وکالت اس لئے کر رہی ہوں کہ وہ بہت حساس انسان ہیں۔ نہ وہ شراب پیتے ہیں اور نہ ہی شاہی کنیزوں سے دل بہلاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی زندگی میں بس ایک بار ہی محبت کرتے ہیں۔ اگر ان کی محبت ناکام ہو جائے تو زندگی ایک بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ شہزادہ خرم اس حادثے کا شکار ہوں۔ ان کے کاندھوں پر سلطنتِ مغلیہ کی بھاری ذمہ داریاں ہیں۔ عالم پناہ، شہزادے کو کسی نئی آزمائش میں مبتلا نہ کریں۔ اور پھر ارجمند بانو کوئی غلام زادی بھی نہیں کہ ظلِ الٰہی ان کے گھر جاتے ہوئے شرم محسوس کریں۔'' انجمن آراء نے اس طرح شہزادہ خرم کی وکالت کی کہ جہانگیر حیران رہ گیا۔

پھر اس نے انجمن کو اپنی خلوت گاہ سے رخصت کر دیا اور تنہائی میں سوچنے لگا۔

یکایک جہانگیر کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی اور وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سپہ سالار مہابت خان اور انجمن آراء دونوں شہزادہ خرم کی سفارش کر رہے تھے۔ مگر ایک اور سفارش ان دونوں سفارشوں سے زیادہ طاقت رکھتی تھی اور وہ مہرالنساء بیگم کی غائبانہ سفارش تھی۔ جہانگیر کو محسوس ہوا، جیسے شراب کی مستی میں ایک اور نشہ شامل ہو گیا ہے۔ یہ خمار مہرالنساء کے تصور سے وابستہ تھا۔ اور ارجمند بانو بھی مہرالنساء سے خاندانی تعلق رکھتی تھی۔

''اس بت کافر کو رام کرنے کا یہ ایک بہترین موقع ہے۔'' جہانگیر خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا۔ ''اس رشتے سے آصف خان کی وفاداریوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ شہزادہ خرم کے دل و دماغ پر چھا جانے والے مایوسیوں کے بادل بھی چھٹ جائیں گے۔ اور مہرالنساء کے دل میں بھی کئی نرم گوشے پیدا ہو جائیں گے۔''

جہانگیر، مہرالنساء سے جبراً بھی شادی کر سکتا تھا۔ مگر شہنشاہ کی انصاف پسند طبیعت اس ظلم کی قائل نہیں تھی۔ حالات نے جہانگیر کو ایک عجیب سے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اکثر باخبر لوگ دبی دبی سرگوشیوں میں کہا کرتے تھے کہ شہنشاہ نے مہرالنساء کو حاصل کرنے کے لئے اس کے شوہر شیرافگن کو قتل کرایا ہے۔ حالانکہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا، جس نے بدقسمتی سے جہانگیر کو مہرالنساء کی نظروں میں بھی مجرم بنا دیا تھا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ مہرالنساء نے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اگر جہانگیر، شیرافگن کو قتل کرانا چاہتا تو وہ بہت پہلے یہ کام کر چکا ہوتا۔ پھر اس نے اٹھارہ سال بعد شیرافگن کے قتل کا منصوبہ کیوں بنایا؟ اس سوال کا جواب خود مہرالنساء کے پاس بھی نہیں تھا۔ نتیجتاً جہانگیر کی زندگی ایک تہمت بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے دل سے مجبور تھا۔

شہزادگی کے زمانے میں شہنشاہی تک اس نے مہرالنساء کو کبھی فراموش نہیں کیا تھا۔ اب جبکہ مہرالنساء ایک کنیز کی زندگی بسر کر رہی تھی تو اس عالم میں جہانگیر کو روکنے والا کون تھا؟ مگر اس نے ایک بار بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ بس خاموشی سے مہرالنساء کا دل جیتنے کی کوشش کرتا رہا۔

پہلے اس نے مہرالنساء کے باپ، مرزا غیاث بیگ کے سارے قصور معاف کر کے اسے وزیرِ خزانہ کے عہدے پر فائز کیا۔ پھر مہرالنساء کے بھائی ابوالحسن کو آصف خان کا خطاب دے کر اسے وزارتِ عظمیٰ کے منصب تک پہنچایا۔ جہانگیر کے یہ تمام اقدامات محض اس لئے تھے کہ مہرالنساء کے تمام شبہات دُور ہو جائیں اور جب وہ اس کے حرم میں داخل ہو تو دل و نگاہ پر کسی قسم کی بدگمانی سایہ فگن نہ ہو۔

جہانگیر، مرزا غیاث بیگ اور آصف خان کو اہم وزارتیں دے کر مہرالنساء کی خدمت میں دو رشوتیں پیش کر چکا تھا اور اب اس نے اچانک تیسری رشوت پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ رشوت، ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی شادی کی صورت میں پیش کی جانے والی تھی۔ بظاہر جہانگیر نے اس رشتے کو اپنے طور پر منظور کر لیا تھا، مگر پھر بھی وہ ایک بار شہزادہ خرم کو آزمانا چاہتا تھا۔

❀.....❀.....❀

ماہ رخ، ارجمند بانو کو اس بہانے سے شاہی محل لے آئی تھی کہ چند روز وہاں رہے گی تو اس کا دل بہل جائے گا۔ آصف خان اور اس کی بیوی کو ماہ رخ پر پورا اعتماد تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ارجمند کی پھوپھی، مہرالنساء شاہی محل میں موجود تھی۔ اس لئے ماں باپ نے قصرِ شاہی میں بیٹی کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ماہ رخ اپنے منصوبے کی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ پھر اس نے شہزادہ خرم کو مطلع کر دیا اور یہ طے پا گیا کہ محبت کے دو مسافر، بارہ دری کی منزل پر پہنچ کر رات کی تنہائی میں پہلی بار ملاقات کریں گے۔

پھر جب وہ رات آئی تو ارجمند بانو بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگی۔

''ماہ رخ! میں شہزادۂ عالم کا سامنا کس طرح کروں گی؟'' ارجمند نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''رات کا اندھیرا تمہاری اس مشکل کو آسان کر دے گا۔'' ماہ رخ نے انتہائی شوخ لہجے میں کہا۔ ''اگرچہ ساری بدگمانیوں کا خاتمہ ہو چکا ہے، لیکن پھر بھی تمہارا ملنا بہت ضروری ہے۔ شہزادہ عالم بھی اس ملاقات کے لئے بہت بے قرار نظر آتے ہیں۔''

''ماہ رخ! میں رُسوائیوں سے بہت ڈرتی ہوں۔'' ارجمند نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''رُسوائیاں ان کا مقدر بنتی ہیں، جن کے دلوں میں کھوٹ ہوتا ہے۔'' ماہ رخ کا لہجہ یک بیک پُر جوش ہو گیا تھا۔ ''تم اپنے اس محبوب سے ملنے جا رہی ہو، جو بہت حیا دار ہے۔ اگر میں شہزادے کی آنکھوں میں ہوس کی ہلکی سی پرچھائیں بھی دیکھ لیتی تو تم سے صاف صاف کہہ دیتی

کہ بی بی! اپنے گھر لوٹ جاؤ۔'' ماہ رخ بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔ ''گھبراؤ نہیں کہ میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ اگر خدانخواستہ رسوائی کے تیر تمہاری طرف آئے تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گی کہ وہ سب کے سب اس کنیز کے سینے میں اُتر جائیں گے۔''

''میں تم پر ناز کرتی ہوں ماہ رخ! تمہاری جاں نثاریاں تمام شبہات سے بالاتر ہیں۔''

❀.....❀.....❀

پھر شہزادہ خرم اور ارجمند بانو کی زندگی کے سب سے زیادہ سنسنی خیز لمحات آ گئے۔ دو محبت کرنے والے، بارہ دری کے سنسان گوشے میں ایک دوسرے کے مقابل خاموش کھڑے تھے اور دونوں کے درمیان اندھیرے کی دیوار حائل تھی۔ ماہ رخ بھی کسی نادیدہ خطرے کے پیشِ نظر کچھ فاصلے پر موجود تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ مگر اب تک دونوں میں سے کسی کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی تھی۔

آخر شہزادے نے اس سکوت کو توڑا۔

''ارجمند بانو!..... ہماری طرف سے سلامِ محبت قبول فرمائیے۔''

چند الفاظ نے ارجمند کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے موسم بہار نے برفانی ہواؤں کا لباس پہن لیا ہے۔ ارجمند کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

''ارجمند بانو! ہم اس خاموشی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔'' شہزادہ خرم نے ٹھہر ٹھہر کر اس طرح کہا جیسے اس کے ہونٹوں سے شہد ٹپک رہا ہو۔

''شہزادہ عالم! آپ کی یہ کنیز بھی خدمتِ عالیہ میں تسلیمات پیش کرتی ہے۔'' ارجمند بانو کی آواز لرز رہی تھی اور اسے محسوس ہوا کہ ہوائیں مزید سرد ہو گئی ہیں۔

''ارجمند بانو! آپ کنیز نہیں۔'' شہزادہ خرم نے رک رک کر کہا۔ ''ماں باپ کے بعد آپ ہمارے لئے دنیا کی سب سے محبوب ہستی ہیں۔''

خرم کی زبان سے محبوب کا لفظ سن کر ارجمند بانو، پھولوں سے بھری ہوئی شاخ کی طرح جھومنے لگی۔ ''شہزادۂ عالم! اگر اس ذرّہ نوازی پر میں اپنی جان بھی دے دوں تو یہ ایک حقیر ترین قربانی ہو گی۔''

''ارجمند بانو! ہمیں شہزادۂ عالم نہ کہو کہ اس سے اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ صرف خرم کہہ کر پکارو کہ اب ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے۔''

''شہزادۂ عالم! مجھے اس حکم کی بجا آوری سے معذور سمجھا جائے۔'' اب ارجمند بانو کسی قدر سنبھل گئی تھی۔ ''میں آخری سانس تک بھی آپ کا نام اپنی زبان پر نہیں لا سکوں گی۔ اگر مجھے اختیار ہوتا تو میں شہنشاہِ عالم کہہ کر پکارتی۔ اور شاید یہ لفظ بھی آپ کے احترام کی ترجمانی کرنے

سے عاجز رہ جاتا۔"

ارجمند کے طرزِ گفتار نے شہزادہ خرم پر سحر سا طاری کر دیا تھا۔ "ارجمند بانو! آج ہماری خوش قسمتی کا دائرہ مکمل ہو گیا۔ کل تک ہم ایک نامکمل انسان تھے۔ بے شمار لوگ ہمارے جاہ و جلال کے آگے سر جھکاتے تھے مگر ہمیں کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی تھی۔"

"پھر آج کیا ہو گیا شہزادۂ عالم؟" ارجمند کی جھجک آہستہ آہستہ دُور ہوتی جا رہی تھی۔

"آج آپ نے ہمارے سر پر فاتح کا تاج رکھ دیا۔ فاتح محبت، فاتح دل۔ ہم اس فتح پر ہمیشہ نازاں رہیں گے کہ یہ فتح، دنیا میں بڑے بڑے شہنشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔"

ہوائیں کچھ اور سرد ہو گئی تھیں..... ارجمند کے بدن کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"شہزادۂ عالم اس کنیز سے بدگمان تو نہیں ہیں؟" اچانک ارجمند نے ایک نیا سوال کر ڈالا۔

"ارجمند بانو! ہم نے آج تک کسی کو کوئی آزار نہیں پہنچایا۔ مگر ہمارا دل چاہتا ہے کہ ارسلان بیگ کو اس کے جرم کی ایسی سزا دیں کہ زمانہ یاد رکھے۔" شہزادہ خرم بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔ "ہم اس بدذات کو اس وقت تک معاف نہیں کریں گے، جب تک وہ آپ کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے گناہِ عظیم کی معافی طلب نہیں کرے گا۔"

"مگر وہ بابا جان کو دھمکی دے کر گیا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر اس کے معاملے میں براہِ راست مداخلت کریں گے۔" ارجمند نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم مطمئن رہو ارجمند! کہ عالم پناہ کا انصاف اندھا نہیں ہے۔" شہزدہ خرم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے خدا پر بھروسہ رکھو۔ اگر منزلِ فراق بھی آ جائے تو غم نہ کرنا کہ ہمارے دلوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔"

ارجمند بانو خاموش کھڑی رہی۔

"ہماری محبت کا تحفہ قبول کیجئے۔" شہزادہ خرم نے سرشاری کے لہجے میں کہا۔ "ہمیں گلاب کے پھولوں سے محبت ہے اور یہی پھول ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔"

ارجمند نے گلاب کا پھول لینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اندھیرا ہونے کے سبب قریب کی چیزیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس لئے ارجمند کا ہاتھ، خرم کے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ ارجمند گھبرا کر پیچھے ہٹی اور یہ کہتے ہوئے واپس جانے لگی۔

"شہزادۂ عالم! کنیز کو رخصت کی اجازت دیجئے۔ میرے پاس آپ کا پہلا تحفہ محفوظ ہے اور اسی طرح محفوظ رہے گا۔ بس ایک پھول کافی ہے، جو میرے خوابوں کے چمن کو ہمیشہ مہکاتا رہے گا۔"

۞.....۞.....۞

دوسرے دن رات کے وقت شہنشاہ جہانگیر نے شہزادہ خرم کو اپنی خواب گاہ میں طلب کر لیا۔

"ہمیں خبر ملی ہے کہ آج کل تم شمشیر زنی کی مشق میں حصہ نہیں لے رہے ہو۔" جہانگیر نے خرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

شہزادہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے جھوٹ بھی بول سکتا تھا، مگر وہ باپ کے سامنے ایسا نہ کر سکا اور خاموش کھڑا رہا۔

"ہم تمہاری خاموشی کا سبب بھی جانتے ہیں خرم!" اب جہانگیر کے لہجے سے ہلکی سی تلخی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ "ہمیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ اتنی جلد تمہارے بازو شل ہو چکے ہیں اور اب تم میدانِ جنگ کی بجائے شبستانِ محبت میں پناہ ڈھونڈنے لگے ہو۔"

شہنشاہ کی زبان سے یہ انکشاف سن کر خرم چونک اٹھا اور پھر فوراً ہی ندامت کے ساتھ سر جھکا لیا۔

"مہابت خان کہتا ہے کہ اب فردوس مکانی شہنشاہ بابر کے وارث کے آہنی ہاتھ، شمشیر کے بجائے کسی دوشیزہ کی زلف چھونے کے لئے بے قرار ہیں۔" جہانگیر نے واضح الفاظ میں اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

خرم کا سر مزید جھک گیا اور اب اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمایاں ہونے لگے تھے۔

"تمہاری خاموشی ہمیں مجرم ثابت کر رہی ہے۔" جہانگیر نے تیز لہجے میں کہا۔

"ظلِ الٰہی! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" آخر بہت دیر بعد خرم نے زبان کھولی۔

"یہ جرم نہیں تو کیا ہے کہ ہم تمہیں نغمۂ شمشیر سنانا چاہتے ہیں اور تم کسی پازیب کی جھنکار سن رہے ہو۔" جہانگیر کا لہجہ مزید سخت ہو گیا تھا۔ "کیا یہ سنگین گناہ نہیں کہ تم سلطنتِ مغلیہ کے مستقبل سے ایک خوفناک کھیل کھیل رہے ہو؟"

خرم اپنے باپ کے اس سوال کا کیا جواب دیتا؟ اسے معلوم تھا کہ اس کے تینوں بھائی شہزادہ خسرو، شہزادہ پرویز اور شہزادہ شہریار شراب نوشی اور دیگر رنگینیوں میں مشغول رہتے تھے مگر شہنشاہ نے کبھی ان کا احتساب نہیں کیا۔

"ہم تمہارا جواب سننا چاہتے ہیں خرم!" شہزادے کو خاموش پا کر جہانگیر نے کہا۔

"عالم پناہ! میری ایک ذاتی خواہش کی کیا حیثیت ہے؟ میں تو سلطنتِ مغلیہ کے وقار کی خاطر اپنی زندگی بھی قربان کر سکتا ہوں۔" شہزادہ خرم نے باپ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"اگر ایک طرف تمہارا باپ ہو اور دوسری طرف ارجمند بانو..... تو پھر تم کس کا انتخاب کرو گے خرم؟" جہانگیر نے بیٹے کی آزمائش کے لئے ایک عجیب سوال کر ڈالا تھا۔

"ظلِ الٰہی! آپ کی ذات کا کسی سے کیا تقابل ہے؟" خرم نے اثر انگیز لہجے میں کہا۔ "آپ میرے لئے اس دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہیں۔"

"اگر ہم تمہیں یہ حکم دیں کہ تم ارجمند کا خیال چھوڑ دو؟" جہانگیر نے اپنے بیٹے کو ایک اور آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔

"میں ارجمند کو چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنے تصورات پر قابو نہیں پا سکتا۔" خرم نے عرض کیا۔

"یادوں کے سلسلے میں انسان بہت مجبور ہے عالم پناہ!"

خرم کا جواب سن کر چند لمحوں کے لئے جہانگیر کو اپنی محبت یاد آ گئی۔ وہ خود بھی مہرالنساء کی یادوں کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

"اگر ہندوستان کا تاج و تخت، ارجمند کے مقابل ہو تو پھر تم کس طرف جاؤ گے؟" شہنشاہ جہانگیر نے ایک اور نازک سوال کیا۔

"میں تاج و تخت چھوڑ دوں گا۔" خرم نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر کہا مگر اپنی زبان سے ارجمند کا نام نہیں لیا۔

"پھر ایک عام انسان کی طرح زندگی بسر کرو گے؟" جہانگیر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"خدا اپنے رازوں کو بہتر جانتا ہے۔" خرم کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔ "وہ مجھے جس حال میں رکھے گا، میں اس پر قناعت کر لوں گا۔"

"اگر ہم ارجمند کی شادی کسی اور شخص سے کر دیں؟" جہانگیر اس وقت اپنے باپ اکبر اعظم کے لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ اذیت ناک منظر اُبھر آیا تھا، جب مہرالنساء کو شاہی محل سے دُور کرنے کے لئے اکبر اعظم نے مرزا غیاث بیگ کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی علی قلی (شیر افگن) سے کر دے۔

"میں شہنشاہ کے اس فیصلے کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کروں گا۔" شہزادہ خرم نے معصومانہ لہجے میں کہا۔ "عالم پناہ مجھے زندگی کے ہر محاذ پر اپنا فرمانبردار پائیں گے۔"

شہزادے کی سعادت مندی دیکھ کر جہانگیر بھی جذباتی ہو گیا۔ "خرم! ہمارے قریب آؤ۔"

شہزادہ دست بستہ آگے بڑھا اور والیٔ ہند کے روبرو گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ جہانگیر نے شدید محبت کے زیر اثر خرم کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

"تم عرش آشیانی اکبر اعظم کے بھی محبوب فرزند ہو اور ہمارے بھی۔ اہلِ وفا کی یہی نشانیاں ہوتی ہیں خرم!" جہانگیر انتہائی اثر انگیز لہجے میں بول رہا تھا۔ "ہم جانتے ہیں کہ شبِ فراق کسے کہتے ہیں اور اس اندھیرے میں اہلِ دل پر کیا قیامت گزرتی ہے۔ ہم تمہیں اور ارجمند کو جدا نہیں ہونے دیں گے۔ مگر ہمارے یہ الفاظ تمہاری ساعتوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں کہ دل کی دنیا الگ ہے..... اور سیاست کی دنیا الگ..... ان دونوں میں توازن رہنا چاہئے۔ تم محض ایک عاشق ہی نہیں، فردوس مکانی حضرت شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے تخت کے وارث بھی ہو۔ بس اب جاؤ اور مہابت خان کی نگرانی میں رقصِ شمشیر شروع کر دو۔"

یہ مژدۂ جانفزا سن کر شہزادہ خرم بے قرار ہو گیا اور اس نے مزید جھک کر جہانگیر کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

"مجھے بابا حضور کے انصاف سے یہی توقع تھی۔"

جہانگیر نے خرم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم اسی طرح ہماری نوازشوں کے زیر سایہ رہو گے۔"

۞.....۞.....۞

ارسلان بیگ کو پورا یقین تھا کہ وزیر اعظم آصف خان اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر ارجمند بانو کو شادی کے لئے آمادہ کر لے گا۔ اور پھر مینا بازار میں ارجمند کی مجبورانہ خاموشی نے بھی اسے حوصلہ دیا تھا۔ وہ اپنی ان ہی خوش گمانیوں کے نشے میں جھومتا ہوا آصف خان کے گھر پہنچا۔ مگر اس وقت وہ حیران رہ گیا، جب دربان نے اسے گھر کے اندر جانے سے روک دیا۔ ارسلان بیگ اپنی اس بے عزتی پر چیخنے لگا۔ اس کی تیز آوازیں سن کر آصف خان باہر آیا اور ارسلان بیگ کو مخاطب کر کے بولا۔

"تجھ پر اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ اگر آئندہ تُو نے اس طرف کا رُخ کیا تو میں بہت سختی سے پیش آؤں گا۔ تُو نے مینا بازار میں ارجمند کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کی مناسب سزا یہی تھی کہ تیری زبان کے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ مگر مجھے عالم پناہ کا لحاظ ہے کہ تُو اسی زبان سے انہیں خداوند کہہ کر پکارتا ہے۔ میرے گھر کی دیواریں اس قدر بے غیرت انسان کا وجود برداشت نہیں کر سکتیں۔" یہ کہہ کر آصف خان مکان کے اندر چلا گیا اور ارسلان بیگ بہت دیر تک دربان کو دھمکیاں دیتا رہا کہ اس بدسلوکی کے بہت بھیانک نتائج برآمد ہوں گے۔

۞.....۞.....۞

وہ انتہائی مبارک لمحات تھے، جب شہنشاہ جہانگیر نے آصف خان کو طلب کر کے شہزادہ خرم و ارجمند بانو کے رشتے کی بات کی۔ آصف خان کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر جب اسے احساس ہوا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہے تو اس نے دوزانو ہو کر شہنشاہ سے عرض کیا۔

"ظلِ الٰہی! میں اس قابل نہیں ہوں کہ مجھے اس طرح شرف یاب کیا جائے۔"

"ہم تمہاری بہت قدر کرتے ہیں آصف خان!" جہانگیر نے پُر جلال لہجے میں کہا۔ "جاؤ! اپنے اہلِ خاندان کو مطلع کر دو کہ مابدولت بہ نفس نفیس تمہارے یہاں تشریف لائیں گے اور کل ہی نسبت کی یہ رسم ادا کی جائے گی۔"

جب آصف خان، شاہی خلوت گاہ سے نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا تو فرطِ مسرت سے اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کو یہ خوش خبری سنائی تو گھر کے در و دیوار تک عالمِ سرخوشی میں رقص کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ایک خادمہ کی زبانی ارجمند بانو نے بھی یہ خبر سنی اور اسے چند ساعتوں کے لئے سکتہ سا ہو گیا۔ پھر جب ہوش و حواس بحال ہوئے تو ارجمند نے اپنا کمرہ بند کر لیا اور بہت دیر تک سجدے کی حالت میں ایک ہی جملہ دہراتی رہی۔

"اے خدا! تُو اپنے گناہ گار بندوں کو بھی مایوس نہیں کرتا۔"

پھر ارجمند بانو نے اسی خادمہ کو ماہ رخ کے نام یہ پیغام دے کر قصرِ شاہی کی طرف روانہ کیا کہ وہ جلد از جلد یہاں آنے کی کوشش کرے۔ ماہ رخ نے مادر ملکہ اور مہر النساء بیگم سے اجازت طلب کی اور دیوانہ وار اپنی آقا زادی کے گھر پہنچی۔ ماہ رخ سمجھ رہی تھی کہ شاید ارجمند، شہزادہ خرم سے ایک اور ملاقات کی خواہش مند ہے۔ مگر جب تنہا کمرے میں ارجمند کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو حیرت کی زیادتی سے ماہ رخ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر رونے لگی۔

"بی بی! خدا نے مجھ گناہ گار کی دعا سن لی۔ اب تم حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی درگاہ پر حاضری دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں نے دعا مانگی تھی کہ اگر میری آقا زادی اور شہزادہ خرم کا رشتہ طے ہو جائے گا تو میں حضرت شیخ کے مزار پر چادر چڑھاؤں گی۔"

"میں نے بھی تمہیں اسی لئے بلایا تھا۔" ارجمند بانو نے شرماتے ہوئے کہا۔ "میں بھی روز و شب یہی دعا کرتی رہی ہوں۔" یہ کہتے کہتے ارجمند کا سر جھک گیا اور چہرے کی گلابی رنگت مزید گہری ہو گئی۔

"دونوں کی دعاؤں کا مرکز ایک ہی تھا۔ خدا تمہیں یہ خوشی مبارک کرے۔" ماہ رخ نے اپنی آقا زادی کی روشن پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ اس وقت اسے شہزادہ پرویز بہت شدت سے یاد آ رہا تھا، جس کی بے وفائی نے ایک غریب زادی کی زندگی بدل ڈالی تھی۔

❀.....❀.....❀

چاندی کا ایک رتھ فتح پور سیکری پہنچ کر حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ سیکری شہر، آگرہ سے سترہ اٹھارہ کوس کے فاصلے پر ہے۔ سیکری کا قصبہ ہی وہ میدانِ جنگ تھا، جہاں بابر نے رانا سانگا کے مقابلے پر مکمل فتح حاصل کی تھی۔ شہنشاہ اکبر نے اسی مناسبت سے اس کا نام "فتح پور" رکھا۔ پھر یہاں شہر آباد کیا اور عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرائیں۔

چاندی کے رتھ میں ارجمند بانو، اس کی قریبی رشتے دار کچھ لڑکیاں اور ماہ رخ موجود تھی۔ رتھ کے دونوں طرف چار چار مسلح شہسوار، گھوڑوں پر چل رہے تھے۔ آصف خان نے خواتین کی حفاظت کے خیال سے اپنے سپاہیوں کو رتھ کے ساتھ ساتھ روانہ کیا تھا۔

جیسے ہی ارجمند بانو اور دوسری پردہ دار خواتین چادر لے کر مزار کی طرف بڑھیں، ایک شکستہ حال فقیر نے نعرہ زنی شروع کر دی۔

"راستے سے ہٹ جاؤ..... ملکۂ عالیہ تشریف لا رہی ہیں..... ہٹ جاؤ، بے ادبو!..... ہٹ جاؤ، ملکۂ عالیہ کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

ماہ رخ کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"کیا ہوا ماہ رخ؟" ارجمند بانو نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"آپ یہ آواز سن رہی ہیں؟" ماہ رخ نے کہا۔

"ہاں! کوئی بے چارہ مفلس و نادار فقیر ہے۔" ارجمند نے اس کی ظاہری حالت پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں آقا زادی! یہ عام فقیر نہیں ہے۔" ماہ رخ نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔ "میں اس شخص کو جانتی ہوں۔ یہ مبارک شاہ قلندر ہے۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی سے بات نہیں کی۔ آج پہلی بار بول رہا ہے..... اور آپ کو ملکۂ عالیہ کہہ کر پکارا ہے۔"

ارجمند نے مڑ کر برقعہ کی جالی سے اس فقیر کو دیکھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی، پریشان بال، جسم پر بس ایک میلی سی چادر۔

مبارک شاہ قلندر مسکرایا اور پوری طاقت سے چیخا۔ "ملکۂ عالیہ کا اقبال بلند ہو۔"

عجیب آواز تھی۔ ارجمند لرز کر رہ گئی۔ اب اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دوبارہ قلندر کی طرف دیکھ سکے۔

"چلو ماہ رخ!" یہ کہہ کر ارجمند آگے بڑھ گئی۔

پھر جب حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزارِ مبارک پر چادر چڑھانے اور دعائیں مانگنے کے بعد ارجمند واپس آنے لگی تو اس نے ماہ رخ کے ذریعے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ اپنے ہمراہ لائے ہوئے چاندی کے تمام روپے ایک ایک کر کے فقیروں میں تقسیم کر دے۔ اس کے ساتھ ہی ارجمند نے روپوں سے بھری ہوئی ایک پوری تھیلی مبارک شاہ قلندر کو اپنے ہاتھ سے پیش کی۔

مبارک شاہ نے کسی بھوکے فقیر کی طرح چاندی کے سکوں کی تھیلی ارجمند کے ہاتھ سے لے لی۔ ارجمند کو ماہ رخ کے اندازے پر افسوس ہوا کہ وہ شخص بھی عام گداگروں کی طرح تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے مبارک شاہ نے ارجمند کے سر پر تھیلی کو اس طرح گردش دی، جیسے کوئی صدقہ اُتار رہا ہو۔ پھر تھیلی کا منہ کھولا اور تمام سکے راستے پر بکھیر دیئے اور زور زور سے چیخنے لگا۔

"ضرورت مندو! آؤ اور ملکۂ عالیہ کا دیا ہوا تحفہ، دامن میں سمیٹ لو۔"

مبارک شاہ کی آواز سنتے ہی تمام فقیر بکھرے ہوئے چاندی کے سکوں پر ٹوٹ پڑے۔

راستے بھر ارجمند پر عجیب سی کیفیت طاری رہی۔ اس نے آج تک ایسا بے نیاز شخص نہیں دیکھا تھا۔ رہ رہ کر اس کے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ "سامنے سے ہٹ جاؤ..... ملکۂ عالیہ تشریف لا رہی ہیں۔"

❀.....❀.....❀

دوسرے دن آصف خان کا گھر رنگوں اور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ 28 مارچ 1607ء کا ایک روشن و تابناک دن تھا، جب ابوالمظفر شہنشاہ نورالدین جہانگیر، آصف خان کے گھر تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے اپنی ہونے والی بہو ارجمند بانو کو انگوٹھی پہنائی، جس میں

پچیس قیراط کا ایک نادر یاقوت، آگ کے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔

اس تقریب میں مہرالنساء بیگم بھی شریک ہوئی تھی اور اس نے دنیا کو دکھانے کے لئے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ جب تک شہنشاہ جہانگیر، آصف خان کے گھر موجود رہا، مہرالنساء بھی اس کے روبرو حاضر رہی۔ پھر ایک موقع پر چند لمحوں کی تنہائی پاتے ہی اس نے جہانگیر کو مبارکباد پیش کی۔

جواب میں شہنشاہ نے کہا۔ ''مہرو! تمہاری خاطر ہم یہاں تک آپہنچے ہیں۔''

یہ سن کر مہرالنساء کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اُٹھ کر خواتین کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔

❀.....❀.....❀

شہنشاہ جہانگیر سونا چاہتا تھا، مگر زنجیرِ عدل کی گھنٹیوں کے مسلسل شور نے اُسے سونے نہیں دیا۔ ارسلان بیگ شدید غصے کے عالم میں پوری طاقت کے ساتھ زنجیر کو گردش دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ جہانگیر بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک آمر کی نیند میں خلل ڈالنے والے کو سنگین سزا بھی مل سکتی تھی۔ مگر جہانگیر اپنے جاری کردہ حکم کا پابند تھا۔ اس نے کسی جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر درباری مطربہ، انجمن آراء سے کہا۔

''یہ کون مظلوم ہے، جو رات کے اندھیرے میں ہمارے انصاف کو پکار رہا ہے؟..... اسے اسی وقت ہماری بارگاہِ جلال میں پیش کرو۔''

انجمن آراء نے مسلح محافظوں کو شہنشاہ کا حکم سنایا اور تھوڑی دیر بعد ارسلان بیگ، جہانگیر کی خواب گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔

''ارسلان بیگ! آخر تجھ پر کیا افتاد پڑی ہے کہ تُو نے ہمارے آرام کے وقت زنجیرِ انصاف کو گردش دی۔'' جہانگیر اپنے مصاحب کو سامنے پا کر شدید حیرت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ''تُو دن کے اُجالے میں بھی شرفِ باریابی پا سکتا تھا۔ تجھے یہاں روکنے والا کون ہے؟''

ارسلان بیگ نے کوئی جواب نہیں دیا اور جہانگیر کے بستر کے قریب پہنچ کر سجدے میں گر گیا۔ ''خداوندِ ہندوستان کا اقبال بلند ہو۔'' ارسلان نے حسبِ عادت بدترین خوشامد کا سہارا لیا۔

''ہم نے تیرا سجدہ قبول کیا۔'' جہانگیر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''ہمیں بتا کہ ہماری مملکت میں کس بدبخت نے تجھے آزار پہنچایا ہے؟''

ارسلان بیگ لرزتے قدموں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ جہانگیر نے اس کی طرف بغور دیکھا۔ ارسلان ایک بہترین نقال تھا۔ اس کی آنکھیں مصنوعی آنسوؤں سے لبریز تھیں اور چہرے پر مظلومیت کے گہرے سائے نظر آ رہے تھے۔

''خداوند! میں تو وہ بدنصیب ہوں کہ آپ کی خدائی بھی میرے کام نہ آسکی۔'' ارسلان بیگ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

''اس ظالم کا نام لے ارسلان! جس نے تجھے زنجیرِ انصاف کھینچنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔''

یکایک جہانگیر کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا۔

''آپ کے وزیراعظم آصف خان نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا، خداوند!'' ارسلان بیگ زاروقطار رو رہا تھا۔ ''میں آپ کے انصاف کو آواز دیتا ہوں عالم پناہ! کہ آپ کے آستانۂ جاہ و جلال کے سوا اس دنیا میں میرے لئے کہیں کوئی پناہ نہیں ہے۔''

آصف خان کا نام سن کر شہنشاہ کچھ دیر کے لئے ساکت ہو گیا تھا۔ ''آصف خان نے تجھ پر کیا ظلم ڈھایا ہے؟'' اب جہانگیر کے لہجے میں پہلے جیسی تپش اور گرج موجود نہیں تھی۔

''خداوند! وزیراعظم آصف خان ایک غاصب ہے۔'' ارسلان بیگ نے کہا۔ ''اس نے میری حق تلفی کی ہے۔''

''آصف خان کے جرم کی تفصیلات بتا، ارسلان!'' جہانگیر کے لہجے کا وہی جاہ و جلال لوٹ آیا تھا۔ ''اگر اس کا جرم ثابت ہو گیا تو ہم اپنے انصاف کی قسم کھاتے ہیں کہ تجھے مایوس نہیں کریں گے۔ وہ مملکت کا وزیراعظم ہو یا خود مابدولت کا کوئی شہزادہ۔ ہمارا دستِ انصاف، مجرموں کے گریبان تک پہنچنے میں کسی رعایت سے کام نہیں لیتا۔''

''آصف خان کا جرم بہت نازک اور سنگین ہے عالم پناہ!'' ارسلان بیگ نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں خداوندِ ہندوستان کی آتشِ جلال نہ بھڑک اُٹھے۔ اور پھر اس آگ کے شعلوں میں یہ گناہ گار بندہ جل کر راکھ ہو جائے۔ پہلے مجھے امان دیجئے خداوند! پھر میں آصف خان کا جرم بیان کروں گا۔''

''اگر تُو سچا ہے تو ہم تجھے امان دیتے ہیں'' جہانگیر نے کہا۔ ''ہماری آتشِ جلال سے تجھے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔''

''ظلِ الٰہی! میں آصف خان کا جرم سرِ دربار بیان کروں گا۔'' ارسلان بیگ، جہانگیر کی طرف سے جاں بخشی کا اعلان سن کر مطمئن ہو گیا تھا اور اب اس نے اپنی شاطرانہ چالیں چلنا شروع کر دی تھیں۔ اس نے مجھے بھری محفل میں ذلیل کیا تھا۔ اس لئے خداوند کے انصاف کا یہی تقاضا ہونا چاہئے کہ آصف خان کو بھی میری طرح بھرے دربار میں رسوا کیا جائے۔''

یہ جہانگیر کے لئے بڑا مشکل مقام تھا کہ ایک درباری مصاحب کے نامعلوم مقدمے میں وہ ملک کی اہم ترین شخصیت کو اس طرح سرِ دربار طلب کر لے اور پھر ارسلان بیگ کے بقول آصف خان کو ذلیل و رسوا کرے۔

''پہلے ہم تیری فریاد کی نوعیت پر غور کریں گے، پھر اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ آصف خان پر بھرے دربار میں مقدمہ چلایا جائے یا کسی گوشۂ تنہائی میں۔''

ارسلان بیگ پریشان سا نظر آنے لگا۔ اسے اپنی خوشامد اور عیاری پر ناز تھا مگر وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ ہندوستان کا حکمران خوشامد پسند ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذہین فرمانروا بھی ہے۔ جہانگیر شراب کے نشے میں غرق ہونے کے باوجود بھی ہمہ وقت جاگتا رہتا

تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ شہنشاہِ عالم سرشاری میں مست و بے خود ہو گیا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی جہانگیر کی آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔

''کیا خداوند اس لئے آصف خان کو گوشۂ تنہائی میں طلب کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے وزیراعظم ہیں..... اور آپ کا یہ بندۂ بے دام کوئی عہدہ نہیں رکھتا؟'' ارسلان بیگ نے فریاد کا انداز اختیار کیا۔

''ارسلان! تُو ناشکرگزاری اور احسان فراموشی کا ثبوت دے رہا ہے۔'' جہانگیر کا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا تھا۔ ''کیا تیرے لئے یہ شرف کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھے مصاحبت کا اعزاز بخشا ہے؟ اور کیا ہم نے تجھ سے یہ نہیں کہا کہ انصاف کرتے وقت اپنے شہزادوں اور ایک عام انسان میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے؟ پھر تُو آصف خان کا نام لے کر ہم پر جانبداری کا الزام کیوں عائد کر رہا ہے؟''

''نہیں آقائے نعمت! میرا یہ مفہوم ہرگز نہیں تھا۔'' ارسلان بیگ دوبارہ سجدے میں گر گیا۔ پھر فوراً ہی اُٹھ کر بولا۔ ''غلام کی خواہش ہے کہ عالم پناہ اس کے مقدمے کا فیصلہ سرِ دربار کریں۔''

''ہمارا وقت برباد نہ کر۔'' جہانگیر کا لہجہ قہرناک ہو گیا تھا۔ ''آخر آصف خان نے تجھ پر کیا ستم توڑے ہیں؟ ہم تیری زبان سے ان کی تفصیلات سننا چاہتے ہیں۔''

''آصف خان نے مجھ سے میری زندگی چھین لی۔'' ارسلان بیگ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ جہانگیر چونک کر ارسلان کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر ارسلان بیگ نے لرزتی ہوئی آواز اور مصنوعی آنسوؤں کے ساتھ اپنی مظلومیت کی داستان شہنشاہ کو سنا ڈالی۔

''آصف خان، ارجمند کے ساتھ میری نسبت پر راضی ہو گئے تھے۔ مگر جب میں دوسرے موقع پر تاریخ طے کرنے کے لئے ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے اپنے ملازمین کے سامنے مجھے ذلیل کر کے باہر نکال دیا۔ اب میں خداوندِ ہندوستان سے انصاف طلب کرتا ہوں کہ میرے ساتھ اس قدر توہین آمیز مذاق کیوں کیا گیا؟ اگر انہیں انکار ہی کرنا تھا تو مجھ سے وعدہ کیوں کیا؟ اور پھر میرے چہرے پر یہ سیاہی کیوں مل دی؟''

عجیب و غریب انکشاف تھا۔ ارسلان نے اس دوشیزہ کا نام لیا تھا، جو عنقریب شہنشاہِ ہندوستان کی بہو بننے والی تھی۔ صورتِ حال کی نزاکت کے بارے میں سوچ کر جہانگیر کو پسینہ سا آ گیا۔ وہ کچھ دیر تک شدتِ حیرت کے عالم میں خاموش بیٹھا رہا، پھر بہت آہستہ لہجے میں بولا۔

''کیا آصف خان نے ارجمند بانو سے تیری نسبت طے کر دی تھی؟''

''جی ہاں عالم پناہ!'' ارسلان بیگ نے بڑی بے شرمی کے ساتھ ایک کھلا ہوا جھوٹ بولا۔

جہانگیر کی کشادہ پیشانی پر پسینے کے کچھ اور قطرے نمایاں ہو گئے۔

''پھر اس کا مطلب ہے کہ ہم بھی ظالموں کی قطار میں کھڑے ہیں اور ہم نے تجھ سے تیرا

حق چھین لیا ہے۔''

''نہیں خداوند!'' ارسلان بیگ نے تیزی سے آگے بڑھ کر جہانگیر کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ''اگر میں عالم پناہ کی لغزش کا تصور بھی کروں تو کافر ہو جاؤں۔ حضورِ والا کو کیا خبر تھی کہ آصف خان پوشیدہ طور پر اپنی بیٹی کی نسبت مجھ سے طے کر چکے ہیں۔''

''تو اس بات پر یقین رکھ ارسلان! کہ ہم تیرے مقدمے کی رُوداد ضرور سنیں گے۔ مگر یہ مقدمہ دربارِ شاہی میں پیش نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ذاتی نوعیت کا مسئلہ ہے..... اور اس قسم کے مسائل بھرے دربار میں طے نہیں کئے جا سکتے کہ اس طرح شرفاء کی تذلیل ہوتی ہے۔''

''اور عالم پناہ! آپ کے اس بندۂ بے دام کا کیا ہو گا، جسے آصف خان نے اپنے ملازمین کے ہاتھوں ذلیل کرایا ہے۔''

''اس کا ازالہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب آصف خان تیرے گھر آئے تو اس کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جائے۔'' جہانگیر نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ بدکلامی کرے تو زیادہ سے زیادہ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ وہ شخص بھی جواباً وہی الفاظ دہرائے۔''

جہانگیر کا فیصلہ سن کر ارسلان بیگ کا چہرہ اُتر گیا۔ دراصل ارسلان بیگ، آصف خان کو دربارِ شاہی میں مجرم کی حیثیت سے لا کر اپنی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ تاکہ ایک طرف آصف خان سینکڑوں درباریوں کی نظروں میں ذلیل ہو جائے اور دوسری طرف ارجمند کی بے داغ شخصیت تہمتوں کے گرد و غبار سے اس طرح آلودہ ہو جائے کہ وہ اعلیٰ نسل خواتین کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ وہ سیاہ فطرت انسان بیک وقت باپ اور بیٹی کو اپنی انتقامی کارروائیوں کا ہدف بنا رہا تھا۔

اس کے علاوہ ارسلان بیگ نے یہ منصوبہ بھی ترتیب دیا تھا کہ اس رسوائی کے بعد ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کے بیچ شکوک و شبہات کی ایک ناقابلِ شکست دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ مگر جہانگیر نے اس مقدمے کو دربار میں پیش کرنے کی اجازت نہ دے کر اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ارسلان بیگ اپنی شکست پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے شہنشاہ جہانگیر کے انصاف سے یہ توقع تھی کہ والیٔ ہندوستان، آصف خان کو مجرم کی حیثیت سے ضرور طلب کرے گا اور ممکن ہے کہ یہ خبر اُڑتے اُڑتے خرم تک بھی پہنچ جائے اور شہزادہ کسی نہ کسی عنوان ارجمند بانو سے بدگمان ہو کر اس رشتے سے انکار کر دے۔ ارسلان بیگ نے اپنی پریشان خیالی کی بنیاد پر اُمیدوں کے کئی محل تعمیر کر لئے تھے مگر اُسے یہ خبر نہیں تھی کہ آصف خان کی وفادار کنیز ماہ رخ بہت پہلے شکوک و شبہات کی تمام دیواروں کو مسمار کر چکی ہے۔

پھر جب ارسلان بیگ، خلوت گاہِ شاہی سے واپس جانے لگا تو شہنشاہ جہانگیر نے اچانک ایک نیا سوال کر ڈالا۔

"کیا ارجمند بانو بھی اس نسبت پر رضامند تھی؟"

ارسلان بیگ گھبرا گیا مگر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ "خداوند بہتر جانتے ہیں کہ شرفاء میں شادی سے قبل عورت و مرد کے درمیان کوئی رسم و راہ نہیں ہوتی۔" ارسلان نے ایک مضبوط دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ "صرف والدین کے اقرار سے اندازہ کرلیا جاتا ہے کہ لڑکی بھی اس رشتے پر رضامند ہے۔ ویسے مینابازار میں ایک دن ارجمند بانو میرے ہمراہ تھی۔ اس وقت شہزادۂ عالم تشریف لائے تو میں نے ارجمند کا تعارف کراتے ہوئے ان سے کہا تھا کہ یہ میری شریکِ حیات ہے۔ اگر ارجمند راضی نہ ہوتی تو یقیناً احتجاج کرتی۔ لیکن خداوند کے جاہ و جلال کی قسم! ارجمند نے انکار میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ پھر میں نے اس کی خاموشی سے اندازہ کرلیا کہ وہ اس رشتے پر دل سے آمادہ ہے۔" یہ کہہ کر ارسلان بیگ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگیا۔

جہانگیر ایک ناقابلِ بیان اذیت میں مبتلا تھا۔ ایک اور نیا انکشاف سن کر اس کا پورا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا۔

ارسلان بیگ نے اپنی پیش کردہ دلیل میں مزید رنگ بھرنے کے لئے دوبارہ کہا۔

"اگر خداوند کو میری بات پر شک ہو تو شہزادۂ عالم سے مینابازار میں پیش آنے والے اس واقعے کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔"

"ہم کل آصف خان کو اسی وقت اپنے حضور میں طلب کریں گے۔" جہانگیر نے پُرجلال لہجے میں بولنے کی کوشش کی مگر آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ شہنشاہ کا دل بجھ کر رہ گیا ہے۔

"اگر تیرا دعویٰ درست ثابت ہوا تو ہم ارجمند اور خرم کی نسبت توڑ دیں گے۔ لیکن اپنے انصاف کو بدنام نہیں ہونے دیں گے۔"

ارسلان بیگ نے آخری سجدہ ادا کیا اور اُلٹے قدموں خلوت گاہِ جہانگیری سے نکل کر اپنے مکان کی طرف چلا گیا۔

❀.....❀.....❀

ارسلان کے جاتے ہی جہانگیر نے درباری مطربہ، انجمن آراء کو طلب کیا۔ انجمن آراء، شہنشاہ کی ظاہری حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

"نصیبِ دشمناں، عالم پناہ کے مزاج تو ٹھیک ہیں؟" انجمن آراء کے لہجے سے شدید اضطراب جھلک رہا تھا۔

"آج تو کیف و نشاط کا دن ہے ظلِ الٰہی! کہ شہزادۂ عالم آپ کے الطافِ کریمانہ سے اپنی مراد کو پہنچے ہیں۔" انجمن آراء نے خرم اور ارجمند کی منگنی کی تقریب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کاش! تمہیں اس راز کا پہلے سے علم ہو جاتا تو ایک غریب شخص ہمارے فیصلے سے متاثر نہ ہوتا۔" جہانگیر نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

"کون شخص عالم پناہ؟" انجمن آراء نے جہانگیر کی بگڑی ہوئی کیفیت دیکھ کر ایک جامِ سرخ پیش کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں جہانگیر نے ارسلان بیگ کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا واقعہ سنا دیا۔

پھر جیسے ہی جہانگیر خاموش ہوا، انجمن آراء بے اختیار بول اُٹھی۔

"ظلِ الٰہی! ارسلان جھوٹ بولتا ہے۔ اس جیسے معمولی انسان کو ارجمند بانو سے کیا نسبت ہے؟ اگر ایک لمحے کے لئے حضورِ والا کی نظرِ کرم ہو جائے تو ارسلان بیگ کو کوئی بھیک دینے والا بھی نہ ہو۔"

"یہ تو سچ ہے انجمن! مگر ارسلان بیگ بذاتِ خود بھی ایک خاندانی آدمی ہے۔ اس کا مرزا غیاث بیگ اور آصف خان سے قریبی رشتہ ہے۔" جہانگیر نے انجمن آراء کی تحقیر آمیز گفتگو کے جواب میں کہا۔

"اگر یہ حقیقت بھی ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" انجمن آراء بہت زیادہ پُرجوش نظر آ رہی تھی۔ "ارجمند بانو جیسی حسین و جمیل دوشیزہ اس بدہیئت انسان کی شریکِ حیات نہیں بن سکتی۔ کہاں وہ مہذب و نستعلیق اور غیرت مند لڑکی..... اور کہاں وہ بدکار خوشامدی، جو "خداوند" کہہ کر حضور کی خوشنودی حاصل کرتا ہے۔"

"انجمن! تُو ارسلان بیگ سے حسد رکھتی ہے کہ وہ ہمارے اتنے قریب کیوں ہے۔" ایک لمحے کے لئے جہانگیر کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم اُبھر آیا۔

"ظلِ الٰہی نے بجا فرمایا۔ میں ارسلان سے اس لئے جلتی ہوں کہ عالم پناہ کا ابرِ کرم ایک بنجر زمین پر برستا ہے..... وہ زمین، جہاں بدنما پتھروں کے سوا کچھ نہیں۔" جوشِ جذبات سے انجمن کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

"کبھی یوں بھی ہوتا ہے انجمن! کہ ہم کچھ ناکارہ لوگوں کو بھی نواز دیتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو یہ کم ہمت اور بے کار انسان کہاں جائیں؟" جہانگیر نے اپنے جاہ و حشم کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے تاج و تخت کے سائے میں جہاں بے شمار آدم زاد سانس لے رہے ہیں، وہاں ایک ایسا جانور بھی سہی، جسے ہمارے بعد کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ بدترین خوشامدی ہے۔ مگر پھر بھی ہمارا وفادار ہے۔"

"یہ وفاداری ہے عالم پناہ! کہ اس نے آپ کو شدید اذیت میں مبتلا کر کے آپ کی آنکھوں سے نیند چھین لی۔" انجمن آراء کا لہجہ مزید سخت ہوگیا تھا۔ "اگر وہ وفادار ہوتا تو اپنی جان دے دیتا لیکن آخری سانس تک یہ راز فاش نہ کرتا۔ کیا وہ بدنہاد یہ نہیں جانتا کہ ارجمند بانو کا آپ سے کیا رشتہ ہے؟"

جہانگیر، انجمن آراء کی باتیں سن کر حیران رہ گیا تھا۔

"وفاداری اسے کہتے ہیں کہ اگر ارسلان کو دار پر بھی کھینچ دیا جاتا تو وہ اپنی زبان سے

ارجمند بانو کا نام نہ لیتا۔" جہانگیر کو خاموش پا کر انجمن آراء نے کہا۔ "وہ سفلی جذبات رکھنے والا بدطینت شخص، ارجمند بانو کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر انجمن....." جہانگیر نے رک رک کر کہا۔ "ارسلان کا تو دعویٰ ہے کہ ارجمند بھی اس رشتے پر رضامند تھی۔ مگر ہماری مداخلت نے اس تعلق کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔"

"اگر زمین و آسمان بھی اپنے محور سے ہٹ جائیں تو میں اس دعویٰ پر یقین نہیں کروں گی۔" انجمن آراء بہت زیادہ مشتعل ہو گئی تھی۔ "اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آصف خان نے اپنی بیٹی کی نسبت ارسلان سے طے کر دی تھی تو پھر وہ میری نظروں میں آصف خان نہیں رہیں گے۔"

جہانگیر، انجمن آراء کی باتیں سن کر مزید پریشان نظر آنے لگا تھا۔ "حقائق کچھ بھی ہوں، مگر ہم اس مقدمے کا فیصلہ ضرور کریں گے۔"

"آپ فیصلہ کریں ظلِ الٰہی! مگر ارسلان کے خوشامدانہ لہجے سے متاثر نہ ہوں۔" انجمن آراء نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ "میرے خیال میں یہ ایک کھلی ہوئی سازش ہے، جس سے آصف خان کے پورے خاندان کی رسوائی کا اندیشہ ہے۔ اور خود صاحب عالم کا سکون بھی غارت ہو جائے گا۔ میں نے شہزادے کے چہرے پر آج ناقابلِ بیان خوشی رقص کرتے دیکھی ہے۔ خدا اُن کی اس خوشی کو ہمیشہ برقرار رکھے۔"

"یہ سب تیری قیاس آرائیاں ہیں انجمن!" جہانگیر اُس کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ "ہمیں اس وقت تک چین نہیں آئے گا، جب تک ہم فریقین کے بیانات اپنے کانوں سے نہ سن لیں۔"

انجمن آراء خاموش ہو گئی اور جہانگیر اپنے اضطراب کو دور کرنے کے لئے نصف شب تک شراب پیتا رہا۔ پھر آدھی رات کے بعد اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ بے ہوشی کی نیند سو جانے پر مجبور ہو گیا۔

انجمن آراء کچھ دیر تک جہانگیر کے قدموں پر سر رکھے ہوئے بیٹھی رہی۔ انجمن کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر اس نے انہیں پلکوں سے گرنے نہیں دیا۔ وہ خود ایک ناکام محبت تھی، اس لئے ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی جدائی کے خوف سے بہت زیادہ بے چین نظر آ رہی تھی۔

۞.....۞.....۞

دوسرے دن درباری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد جہانگیر نے رات کے وقت آصف خان اور ارسلان بیگ کو خلوت میں طلب کر لیا۔ آج تمام دن جہانگیر پر ایک بے قراری کی سی کیفیت طاری رہی تھی۔ شہنشاہ کے چہرے کی اُداسی کو درباریوں نے بھی محسوس کیا تھا، مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے فرمانروا سے ناسازیٔ طبع کے بارے میں کچھ پوچھ سکے۔ جہانگیر تھکے قدموں کے ساتھ دربار سے اُٹھا تھا۔ پھر اپنی خلوت گاہ میں پہنچ کر بستر پر لیٹا رہا تھا۔

اسی دوران شہنشاہ نے انجمن آراء کو حکم دیا تھا کہ آج وہ معمول سے زیادہ تیز شراب پیش کرے۔

"عالم پناہ اپنی صحت کی طرف سے خوفناک غفلت برت رہے ہیں۔" انجمن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"تجھے کیا معلوم انجمن! کہ ہمارے دل و دماغ کیسے طوفان کی زد پر ہیں۔" آج جہانگیر کل سے زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ "ہمیں کیف و سرور میں غرق کر دے کہ ہم آرام سے سانس لے سکیں۔ اور دعا کر کہ ایسے نازک موقع پر جہانگیر کا انصاف سربلند رہے۔ اگر ارسلان بیگ اپنے دعویٰ میں سچا ثابت ہوا تو ہم شہزادہ خرم کا دل بھی توڑ دیں گے.....اور ہمیں اس کی پروا نہیں ہو گی کہ ٹوٹنے والا دل ہمارے محبوب بیٹے کا دل ہے۔"

انجمن آراء اچانک رونے لگی۔

"خاموش ہو جا انجمن!" جہانگیر نے اپنی درباری مطربہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "ہم مظلوم نہیں کہ تُو ہماری حالت پر آنسو بہا رہی ہے۔ اس وقت نہ ہم کسی کے باپ ہیں اور نہ کسی کے عزیز۔ ہم مکمل طور پر غیر جانبدار ہیں۔ اور ہمارا کام صرف انصاف کرنا ہے۔"

انجمن، خلوت گاہِ شاہی سے رخصت ہو گئی تو آصف خان اور ارسلان بیگ سر جھکائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ارسلان بیگ نے حسبِ عادت جہانگیر کو سجدہ کیا مگر آصف خان محض گردن جھکائے کھڑا رہا۔ وزیر اعظم آصف خان بھی شہنشاہ کو سجدہ کرتا تھا لیکن صرف دربار کی حد تک کہ یہ ایک ناگزیر رسم تھی۔

"ارسلان! اُٹھ اور اپنا مقدمہ پیش کر۔" جہانگیر نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

ارسلان نے وہی واقعات دہرانا شروع کر دیئے، جو کل رات شہنشاہ کے حضور بیان کئے جا چکے تھے۔ ارسلان بیگ نے واقعات میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی، مگر آج ان میں رنگ آمیزی بہت زیادہ تھی۔

اس دوران جہانگیر، آصف خان کی طرف مسلسل دیکھتا رہا۔ وزیر اعظم ہند کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا اور اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

جب ارسلان بیگ خاموش ہوا تو جہانگیر نے اپنے وزیر اعظم سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے آصف خان؟"

بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔ آصف خان نے بمشکل تمام اپنے غصے پر قابو پایا، مگر پھر بھی اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"ایک بات کے سوا ارسلان کی بیان کردہ پوری داستان مکمل جھوٹ پر مبنی ہے، مگر مجھے حیرت ہے عالم پناہ! کہ اس نے آپ کے روبرو جھوٹ بولنے کی ہمت کس طرح کی؟"

"تم اس بات کی وضاحت کرو، جو سچ ہے۔" جہانگیر نے سخت لہجے میں کہا۔

"اس نے براہِ راست مجھ سے ارجمند بانو کا رشتہ طلب کیا تھا۔" آصف خان نے ارسلان

بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص اپنی خاندانی حیثیت کو جانتے ہوئے بھی مجھ سے اس طرح آنکھ ملا کر بات کرے گا۔

''اس کی خاندانی حیثیت کیا ہے؟'' اچانک جہانگیر نے سوال کیا۔

آصف خان چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا، پھر بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔

''عالم پناہ! مجھے شرم آتی ہے کہ میں کسی شخص کے ذاتی عیب دوسروں کے سامنے بیان کروں۔'' آصف خان ایسے اذیت ناک لمحات میں بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''بات بہت بگڑ چکی ہے آصف خان!'' جہانگیر نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تجھے بتانا ہوگا کہ ارسلان بیگ کون ہے؟''

''خدا مجھے معاف کرے کہ میں ظلِ الٰہی کے حکم سے مجبور ہو گیا ہوں۔'' آصف خان کے چہرے پر اچانک ندامت و شرمساری کا ہلکا سا عکس اُبھر آیا تھا۔ ''اس شخص سے ہمارا بہت دُور کا رشتہ تھا۔ اور وہ رشتہ بھی اس وقت ختم ہو گیا تھا، جب اس کے باپ نے ایک بدنام رقاصہ سے شادی کر لی تھی۔ اس کی ماں کا تعلق ایک نیچ خاندان سے تھا، جس کے نتیجے میں تمام اہلِ خاندان نے اس کے باپ سے ہر قسم کی رسم و راہ ترک کر دی تھی۔''

ابھی آصف خان کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ارسلان بیگ بدحواس ہو کر بول اُٹھا۔

''خداوند! یہ میری مرحوم ماں پر ایک تہمت ہے۔''

جہانگیر نے ارسلان کی طرف غور سے دیکھا، اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ ''تم اپنی بات جاری رکھو۔'' شہنشاہ نے آصف خان سے کہا۔

''جس شخص کا خاندانی پس منظر اس قدر تاریک ہو، اسے کون اپنی بیٹی دے سکتا ہے؟'' یکایک آصف خان کا لہجہ تحقیر آمیز ہو گیا تھا۔ ''کیا میری بیٹی ارجمند اپاہج تھی یا اس میں کوئی دوسرا عیب تھا کہ میں اس شخص سے رشتہ کرنے پر مجبور ہو جاتا؟''

''مگر اس کا دعویٰ ہے کہ تم ارجمند کی نسبت زبانی طور پر طے کر چکے تھے۔'' جہانگیر نے جرح کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر تم نے اچانک کوئی وجہ بتائے بغیر اس پر اپنے گھر کے دروازے بند کر دیئے اور ملازمین کو حکم دیا کہ وہ اس کی تذلیل کریں۔''

آصف خان کی رگوں میں دوڑنے والا خون جل رہا تھا مگر شہنشاہ کے احترام کے پیشِ نظر وہ ہر الزام کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

''عالم پناہ! میں کیا عرض کروں کہ اس شخص نے ارجمند بانو کو مینا بازار میں شہزادہ خرم کے سامنے اپنی شریکِ حیات کہہ کر پکارا تھا۔ پھر جب ارجمند نے مجھ سے اس کی شکایت کی تو میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور میں نے سخت تنبیہہ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ یہ آئندہ مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھے۔''

''مگر تم نے اس سے کوئی وعدہ ضرور کیا تھا۔ ورنہ یہ ہمارے سامنے فریاد کی جرأت نہیں کر

سکتا تھا۔'' جہانگیر نے ارسلان بیگ کی دلیل کو دہراتے ہوئے کہا۔

''میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا عالم پناہ!'' شدتِ غضب سے آصف خان کی آواز بدستور لرز رہی تھی۔ ''یہ کہہ کر اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی کہ ابھی ارجمند شادی کی عمر کو نہیں پہنچی ہے..... اور پھر مجھے اس کی مرضی بھی معلوم کرنی ہے، اس کے بعد جو مناسب ہوگا، وہی کیا جائے گا۔''

جہانگیر حیرت سے آصف خان کی طرف دیکھنے لگا۔

''اور یہ ٹالنے کی کوشش بھی محض عالم پناہ کے وقار کی خاطر تھی؟''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو آصف خان؟'' جہانگیر چونک اٹھا۔

''اس شخص نے پُرزور لہجے میں کہا تھا کہ ظلِ الٰہی عنقریب مجھ سے اس رشتے کی بات کرنے والے ہیں۔ یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے دھمکی کے انداز میں دوبارہ عالم پناہ کا حوالہ پیش کیا۔ مجبوراً میں نے سکوت اختیار کر لیا۔ بس یہی میرا جرم ہے۔''

''یہ جرم نہیں ہے آصف خان!'' اچانک جہانگیر کے جسم میں ایک نئی خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ''یہ تمہاری جاں نثاری ہے کہ تم نے اپنے شاہ کے حوالے کو بھی قابلِ احترام سمجھا۔''

اس کے بعد جہانگیر انتہائی قہرناک لہجے میں ارسلان بیگ سے مخاطب ہوا۔

''کنیز زادے! تُو نے اپنی حقیقت نہیں پہچانی اور شرفاء کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ تُو نے ارجمند بانو کا خواب دیکھنے کی جرأت کس طرح کی؟ کیا اس جرم میں ہم تیری آنکھیں نکال دیں؟ اور تُو نے ایک وزیر زادی کو شریکِ حیات کہہ کر کیوں پکارا؟ کیا اس گناہ پر ہم تیری زبان کاٹ دیں؟ اور تُو نے اپنی بے ہودہ خواہش کی تکمیل کے لئے شہنشاہ کا نام نامی کیوں استعمال کیا؟ ..... کیا اس کی سزا کے طور پر ہم تیرے جسم کے ٹکڑے کر دیں؟'' جہانگیر کے ہونٹوں سے نفرت و غضب کی آگ برس رہی تھی۔

ارسلان بیگ فوراً سجدے میں چلا گیا اور چیخنے لگا۔

''خداوند رحم!..... خداوند رحم۔ وزیرِ اعظم کی خاموشی نے مجھے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا..... اور اسی بنیاد پر میں نے ظلِ الٰہی سے انصاف مانگا تھا۔''

''اب ہمارا انصاف یہی ہے کہ تُو ہماری نظروں سے دُور ہو جا اور ہماری مملکت کی حدود سے بھی نکل جا۔'' جہانگیر نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

''میں خداوند کی خدائی سے نکل کر کہاں جاؤں گا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ عالم پناہ میرے قتل کا حکم جاری کر دیں۔'' ارسلان بیگ، جہانگیر کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔ ''ظلِ الٰہی کے جاہ و جلال کی قسم! ان مبارک قدموں کے سوا میرے لئے مشرق سے مغرب تک کہیں کوئی پناہ نہیں ہے۔'' اب ارسلان بیگ کی ہچکیاں چیخوں میں بدل گئی تھیں اور وہ ماتمی لہجے میں فریاد کر رہا تھا۔

بالآخر خوشامد کی تیز آگ سے جہانگیر کے نفس کا بت پگھل گیا۔ ارسلان بیگ کے سوا اسے

خداوند کہہ کر پکارنے والا کوئی شخص پورے دربار میں موجود نہیں تھا۔ بس اسی وجہ سے جہانگیر اسے معاف کرنے کے لئے مجبور ہو گیا تاہم اس نے ایک شرط عائد کرتے ہوئے کہا۔

''اگر وزیراعظم آصف خان تجھے معاف کر دیں تو پھر ہم بھی تیرے اس گناہ سے چشم پوشی کر لیں گے۔''

یہ سنتے ہی ارسلان بیگ اُٹھا اور آصف خان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''عالم پناہ کے ایک لفظ پر ہزار آصف خان قربان۔'' وزیراعظم ہندوستان نے بصد احترام کہا۔ ''میں ظلِ الٰہی کے جاہ وجلال کے صدقے میں اسے معاف کرتا ہوں۔''

ارسلان کے سر سے قضا کا خوف ٹل چکا تھا۔ اس نے اطمینان کی گہری سانس لی اور غلامانہ انداز میں جھک کر آصف خان کا شکریہ ادا کیا۔

''مگر ابھی ہمارا انصاف مکمل نہیں ہوا ارسلان!'' اچانک شہنشاہ جہانگیر نے کہا۔ ''تجھے اس پاک نہاد بی بی سے بھی غائبانہ معافی مانگنی ہو گی، جس کا نام ارجمند بانو ہے اور جو ہماری بیٹی کا درجہ رکھتی ہے۔''

حکم شاہی سے مجبور ہو کر ارسلان نے ان الفاظ میں غائبانہ طور پر ارجمند بانو سے معافی مانگی۔

''اگر آئندہ عفت مآب شہزادی کی طرف سے میرے ذہن میں کوئی فاسد خیال پیدا ہو تو خدا اسی دنیا میں میرا منہ کالا کر دے۔''

ارسلان بیگ کی قسمت میں جس قدر رُسوائیاں لکھی ہوئی تھیں، وہ سب ظاہر ہو چکی تھیں۔ مگر پھر بھی وہ خوش قسمت تھا کہ خلوت گاہِ شاہی میں اس کی ذلت کے مظاہروں کو دیکھنے والا کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔

دوسرے دن ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی نسبت کے سلسلے میں ایک جشنِ خاص کا اہتمام کیا گیا۔ تمام امراء اور وزراء کو خوشی کے اس موقع پر انعام و اکرام سے نوازا گیا اور ملازمین کی جھولیاں چاندی کے سکوں سے بھر دی گئیں۔ اس کے بعد شہسواری اور شمشیر زنی کے مقابلے ہوئے۔ اور پھر ہاتھیوں کی لڑائی کا خوف ناک تماشا ہوا۔ آخر میں گیانی، آتمارام کو اپنے ساحرانہ کمالات دکھانے کے لئے بلایا گیا۔

آتمارام ایک بوڑھا ہندو تھا۔ اس نے تمام عمر شادی نہیں کی مگر بے شمار داسیاں اُس کی خدمت میں لگی رہتی تھیں۔ دریائے جمنا کے کنارے ایک سنسان گوشے میں درختوں کے درمیان اس کی جھونپڑی تھی اور وہ دن رات اپنی تپسیا (ریاضت) میں لگا رہتا تھا۔

آتمارام بظاہر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا، مگر اس کے کمزور جسم میں بے پناہ طاقت تھی۔ اس نے شہنشاہ اکبر کے دور میں اپنے فن کے بڑے عجیب مظاہرے کئے تھے۔ آتمارام، سات گھوڑوں کی گردنوں میں رسیاں باندھ کر اپنے بدن کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ پھر ایک شخص کو بھگانے کے لئے ان پر تازیانے برساتا تھا۔ گھوڑے چوٹ کھا کر بھاگنے کی کوشش

کرتے تھے، مگر آتمارام ساتوں رسیوں کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر گھوڑوں کو روک لیا کرتا تھا۔ اُس کے اسی کمال کو دیکھ کر اکبرِ اعظم نے اسے ''گیانی'' کا خطاب دیا تھا۔ اکبر کے خیال میں یہ اس کی روحانی طاقت تھی۔ مگر مسلمان علماء کا خیال تھا کہ آتمارام کے اندر کوئی شیطانی روح حلول کر گئی ہے۔ ورنہ ایک بوڑھا شخص سات گھوڑوں کو کس طرح روک سکتا تھا۔ اکبر ایک آزاد خیال، غیر مذہبی انسان تھا اس لئے ہندو جوگی اور سادھو بھی اس کے دربار میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اکبر کو گمراہ کرنے میں جہاں شیخ مبارک کے دونوں بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کا ہاتھ تھا، وہاں آتمارام بھی شہنشاہ کو ورغلانے میں پیش پیش تھا۔ اسی نے سب سے پہلے علی الاعلان کہا تھا۔

''شہنشاہ اکبر موجودہ زمانے میں سب انسانوں سے بلند ہیں اور وہ آدمی کے روپ میں بھگوان کے اوتار ہیں۔ اور انہیں دھرتی پر اس لئے بھیجا گیا ہے کہ ان کی رہنمائی میں انسانوں کی بے چین اور گناہ گار روحیں مکتی (نجات) حاصل کر سکیں۔''

آتمارام ہی نے سب سے پہلے اکبر کو اُکسایا کہ وہ ایک جھروکہ تعمیر کرائیں اور پھر صبح کے وقت رعایا کو ''درشن'' دیا کریں۔ اس کے علاوہ آتمارام نے اکبر کو گیان حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتایا تھا۔ بہت دنوں تک اکبر کا یہ معمول رہا کہ وہ علی الصباح ایک پرانی ویران عمارت میں ہندو جوگیوں کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا تھا۔ شہنشاہ کی آنکھیں بند ہوتی تھیں اور وہ سر جھکا کر گیان حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ الغرض یہ کہ ابوالفضل اور فیضی نے اکبر کو ''پیغمبر'' بننے کی ترغیب دی اور آتمارام نے اسے زمین پر بھگوان کا اوتار بنا ڈالا۔ اکبر نے آتمارام کی ان ہی خدمات سے خوش ہو کر اُسے ''گیانی'' کا خطاب دیا تھا۔

اور آج وہی بوڑھا گیانی، قلعہ کے طویل وعریض میدان میں اپنے کرتب دکھانے آیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنا پرانا شعبدہ دکھایا اور سات گھوڑوں کو اس طرح روک لیا جیسے وہ کاغذ کے گھوڑے ہوں۔ شہنشاہ سے لے کر ایک عام تماشائی تک گیانی کے اس کرتب پر حیران رہ گیا..... پھر آتمارام نے گھوڑوں کی رسیاں کھول کر انہیں میدان میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام رسیاں بڑے بڑے سانپوں میں تبدیل ہو گئیں اور ان زہریلے کیڑوں نے تماشائیوں کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ اکثر حاضرین گھبرا کر کھڑے ہو گئے مگر جہانگیر اپنی جگہ پُرسکون حالت میں بیٹھا رہا۔

اس دوران گیانی نے چیخ کر کہا۔

''یہ سانپ میرے تابع ہیں۔ ان سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

پھر اس کے ساتھ ہی آتمارام نے اپنے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ سارے سانپ دوبارہ رسیوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس کے بعد آتمارام نے ایک رسّی کو اوپر کی طرف اُچھالا۔ حاضرین یہ شعبدہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ رسّی کھنچی چلی گئی اور پھر یوں محسوس ہونے لگا جیسے رسّی آسمان

کی بلندیوں تک چلی گئی ہے۔ تماشائی اپنی سانسیں روکے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک آتمارام نے رسّی کا سرا پکڑا اور اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ بڑا حیران کن منظر تھا۔ آتمارام بہت تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا اور پھر دیکھنے والوں کو ایسا لگا، جیسے گیانی آتمارام، آسمان پر پہنچ کر غائب ہو گیا ہو۔ کچھ دیر تک لوگوں کو رسّی لٹکتی ہوئی نظر آئی مگر آتمارام وہاں موجود نہیں تھا۔

شہنشاہ جہانگیر نے اپنے قریب کھڑے ہوئے امراء سے بے ساختہ کہا۔ ''یہ گیانی بھی کمال کا آدمی ہے۔ آج اس نے اپنے فن کا جو مظاہرہ کیا ہے، وہ ناقابلِ یقین ہے۔''

ابھی جہانگیر کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ گیانی آتمارام، رسّی کے سہارے نیچے اُترتا دکھائی دیا۔ حاضرین شدید حیرت و استعجاب میں مبتلا تھے۔ آتمارام تیزی سے زمین پر اُترا اور پھر اسی رفتار سے چلتا ہوا جہانگیر کے سامنے پہنچ کر سجدے میں چلا گیا۔

شہنشاہ نے آتمارام کا سجدہ قبول کیا اور اس کا دامن اشرفیوں سے بھرنے کا حکم دیا۔

''نہیں سمراٹ! میں سونے چاندی کا بھوکا نہیں ہوں۔'' گیانی آتمارام نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں تو راج سنگھاسن (تختِ شاہی) کے لئے شبھ کامنائیں (نیک خواہشات) لے کر دیوتاؤں کے پاس گیا تھا۔ اور دیوتاؤں نے میری پرارتھنا (درخواست) قبول کر لی۔''

''گیانی! تیرے دیوتا ہمارے بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' جہانگیر نے آتمارام سے پوچھا۔

''دیوتا آپ سے بہت پرسن (خوش) ہیں۔'' آتمارام نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''سمراٹ کو ہر یدھ (جنگ) میں وجے پراپت (حاصل) ہو گی۔''

''تیری کوئی اور خواہش گیانی؟'' جہانگیر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ کے شترو نشٹ ہو جائیں اور راج سنگھاسن اسی طرح جگمگاتا رہے۔'' گیانی نے کہا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میدان سے نکل گیا۔

اس کے بعد جشن کی تقریب ختم ہو گئی۔ لیکن ارسلان بیگ کے ذہن میں خیالات کے نئے طوفان اُٹھنے لگے۔

❀.....❀.....❀

ارسلان بیگ نے بڑی حیرت سے آتمارام کی شعبدہ بازیاں دیکھی تھیں اور پھر وہ دل ہی دل میں گیانی کی روحانی طاقتوں کا قائل ہو گیا تھا۔

پھر اسی رات ارسلان بیگ، آتمارام کی جھونپڑی کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں ایک طاقتور دربان موجود تھا۔ منڈے ہوئے سر اور پیلے کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک مضبوط جسم رکھنے والا سادھو۔ وہ گیانی آتمارام کا نائب بھی تھا اور خادم بھی۔ اس کا نام دھرم پال تھا۔ ارسلان بیگ کو دھرم پال نے دروازے پر روک دیا۔

''ابھی کچھ ناریاں، گیانی جی کے پاس موجود ہیں۔ جب وہ فارغ ہو جائیں گی تو میں ان سے تمہارے لئے اجازت طلب کروں گا۔''

تھوڑی دیر کے بعد کچھ عورتیں اندر سے نکلیں اور اپنے گھروں کی طرف چلی گئیں۔ اندھیرے کی وجہ سے ارسلان ان کے چہرے نہ دیکھ سکا۔ عورتوں کے جاتے ہی دھرم پال اندر گیا اور گیانی جی نے ارسلان بیگ کو فوراً ہی باریابی کی اجازت دے دی۔ ارسلان بیگ بہت خوش تھا۔ وہ گیانی جی کے کمرے میں داخل ہوا تو اندر کئی چراغ جل رہے تھے اور مٹی کے طباقوں میں مختلف خوشبوئیں سلگ رہی تھیں۔ کمرہ بہت صاف ستھرا تھا مگر ہر چیز سے سادگی ظاہر ہو رہی تھی۔ گیانی آتمارام کو شہنشاہ جہانگیر کی طرف سے ہر سال قیمتی تحائف دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے ہندو جاگیردار اسے بے شمار قیمتی نذریں پیش کرتے تھے مگر اس کے باوجود آتما رام بہت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ارسلان بیگ کو گیانی کی اس عادت نے بہت متاثر کیا۔

''لڑکے! تُو شاہی محل چھوڑ کر یہاں کیوں آیا ہے؟'' آتمارام نے کہا اور ارسلان بیگ فرطِ حیرت سے گیانی کے قدموں میں جھک گیا۔

''مہاراج! آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں شاہی محل سے تعلق رکھتا ہوں؟'' ارسلان بیگ کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''ہم انتریامی (دلوں کا حال جاننے والے) ہیں۔'' آتمارام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اپنا حال بیان کر۔ تُو بہت دُکھی نظر آتا ہے۔''

ارسلان بیگ خود بھی زبردست نقال تھا۔ اس نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ آتمارام نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اب کیوں روتا ہے بالک؟ جب تُو گیانی کی چوکھٹ پر آ گیا تو سمجھ لے کہ تیرے سارے دُکھ دُور ہو گئے۔''

ارسلان بیگ نے اپنی داستانِ غم سنانی شروع کر دی۔

''میری ماں ایک ستم رسیدہ ہندو عورت تھی، جو شہنشاہ ہمایوں کے فرار کے وقت کسی طرح ایران پہنچ گئی اور پھر اسے لوگوں کے سامنے رقص کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔ یہاں تک کہ ایک دن میرے باپ نے اس سے شادی کر لی۔ میرا باپ ہندوستانی وزیراعظم آصف خان کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا مگر جب اس نے میری ماں سے شادی کی تو اہلِ خاندان برہم ہو گئے اور اس سے ترکِ تعلق کر لیا گیا۔ پھر میری پیدائش کے کچھ دن بعد ہی باپ کا انتقال ہو گیا۔ یہ بڑا سنگین وقت تھا۔ میری پرورش کے لئے ماں کو دوبارہ بڑے بڑے ایرانی جاگیرداروں کی محفلوں میں رقص کرنا پڑا۔ ماہ و سال بہت سختی سے گزرتے رہے مگر میری ماں نے ہمت نہیں ہاری اور میری تعلیم جاری رکھی۔ پھر جب میں بیس سال کا ہوا تو ماں بھی دنیا سے رخصت ہو گئی لیکن مرنے سے پہلے اس نے مجھ پر یہ راز فاش کر دیا کہ وہ بنیادی طور پر ایک ہندو عورت تھی، جس نے جبراً اسلام

قبول کرلیا تھا۔ اکثر لوگ دلکش نقش و نگار اور سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے میری ماں کو ایرانی سمجھتے تھے مگر یہ راز صرف میں جانتا ہوں کہ وہ ہندو تھیں اور انہیں مذہب بدلنے پر مجبور کیا گیا تھا۔"

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ارسلان بیگ کی ماں نے ہندوؤں کی چھوت چھات سے تنگ آ کر ہمایوں کے دور میں اسلام قبول کرلیا تھا اور درباری رقاصہ بن کر اپنی زندگی گزار دی تھی۔ اس دوران شیر شاہ سے شکست کھا کر ہمایوں ایران کی طرف فرار ہو گیا۔ ارسلان کی ماں بھی شہنشاہ کی نمک خواری کا حق ادا کرنے کے لئے ایران چلی گئی۔ اور پھر ایک تقریب میں رقص دیکھ کر ارسلان کا باپ اس خوب صورت عورت کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ پھر یہ محبت رنگ لائی اور ارسلان کے باپ نے اس سے شادی کر لی۔ ارسلان بیگ نے آتمارام سے اس حد تک سچ بولا تھا کہ شوہر کی موت کے بعد اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا اور اس نے اپنے بیٹے کی پرورش کے لئے دوبارہ ایرانی جاگیرداروں کی محفلوں میں ناچنا شروع کر دیا تھا۔ مگر یہ کھلا ہوا جھوٹ تھا کہ اس کی ماں نے جبراً اسلام قبول کیا تھا۔ ارسلان بیگ نے آتمارام کو متاثر کرنے کے لئے اپنی مظلومیت کی داستان بہت رنگ آمیزی کے ساتھ سنائی۔

"تیری کہانی بہت دردناک ہے بالک!" ارسلان بیگ خاموش ہوا تو آتمارام بولا۔ "اب تُو کیا چاہتا ہے؟" گیانی نے سوال کیا۔

"مجھے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور میں اسی کے مذہب کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہوں۔" ارسلان بیگ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مجھے ہندوستانی مسلمانوں سے بھی نفرت ہے اور ایرانی مسلمانوں سے بھی کہ ان دونوں نے مجھے اور میری ماں کو بڑے آزار پہنچائے ہیں۔ میں ان سب سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔" ارسلان بیگ کے ہونٹوں سے نفرتوں کے زہر کی بارش ہو رہی تھی۔ "میرے انتقام کا پہلا ہدف آصف خان اور اس کا خاندان ہے۔ میں اس کی بیٹی ارجمند کو سرِ بازار رُسوا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تُو اکیلا کس کس سے انتقام لے گا بالک؟" آتمارام مسکرانے لگا۔

"میں کس قابل ہوں مہاراج۔" ارسلان نے گیانی کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ "انتقام تو آپ لیں گے، اپنی روحانی طاقتوں کے ذریعے۔ میں چاہتا ہوں کہ ارجمند اور شہزادہ خرم ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔"

گیانی آتمارام نے پہلے کچھ منتر پڑھنے کے بعد ارسلان بیگ کو ہندو دھرم میں داخل کیا، پھر انتہائی رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"تُو دنیا کے سامنے مسلمان رہے گا اور جہانگیر کے دربار پر گہری نظر رکھے گا کہ وہاں کون کون آتا ہے اور کیا باتیں کرتا ہے؟ ویسے ہم نے جہانگیر کو اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ وہ دوبارہ اپنے مذہب کی طرف لوٹ کر آ سکے۔ وہ ساری زندگی عورت اور شراب کے نشے میں غرقاب رہے گا۔ ہم نے اس کے باپ اکبر کو بھی نصف سے زیادہ ہندو بنا کر گمراہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے

کہ ان دونوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن شہزادہ خرم سے ہمیں بہت خطرات لاحق ہیں۔ ہمارا گیان بتاتا ہے کہ جہانگیر کا یہ بیٹا اتنی آسانی سے زیرِ دام نہیں آئے گا۔ تُو اس کے قریب تر ہو جا اور اسے شراب کا عادی بنا دے۔ یہاں تک کہ وہ درباری کنیزوں میں دلچسپی لینے لگے۔ پھر ہمارے منتر اس پر بہت تیز اثر کریں گے اور تیرا انتقام پورا ہو جائے گا۔"

"اور ارجمند کا کیا ہوگا مہاراج؟" ارسلان نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہم بہت جلد اس کے اور خرم کے درمیان نفرت کا بیج بو دیں گے۔" آتمارام نے ارسلان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ مگر سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ شہزادہ خرم گناہوں میں ملوث ہو کر اپنے دل کو سیاہ کر ڈالے۔ جن کے سینے بدکاریوں کے رنگ سے کالے ہو جاتے ہیں، ان پر ہمارا جادو بہت تیز اثر کرتا ہے۔"

"مگر شہزادہ خرم میری پہنچ سے بہت دُور ہے۔" ارسلان نے قبل از وقت ہی اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا۔

"اپنی کوششیں جاری رکھ!" آتمارام نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ کام اتنے آسان نہیں ہوتے۔ حکومتوں کو زیر و زبر کرنے میں کبھی برسوں اور کبھی صدیاں لگ جاتی ہیں۔ تُو جہانگیر کو خرم کی طرف سے بدگمان کر دے۔ پھر ہم ارجمند کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیں گے۔"

ارسلان، آتمارام کی شعبدہ بازیوں کو اُس کی روحانی طاقت سمجھ کر بہت خوش تھا کہ اس طرح وہ آصف خان اور اس کے اہلِ خاندان سے بہت جلد انتقام لے لے گا۔

❁.....❁.....❁

نسبت طے ہو جانے کے بعد ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ماہ رخ نے اس تقریب کے فوراً بعد بارہ دری کی ملاقات کا انتظام کیا۔ اس بار قدرے بے تکلفی کی فضا پیدا ہو گئی مگر اب بھی ارجمند اور خرم کے درمیان ایک مخصوص فاصلہ برقرار تھا۔

"ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے ارجمند بانو! کہ اتنی جلدی یہ فاصلے ختم ہو جائیں گے۔" خرم نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ "ظلِ الٰہی کا ہم پر بہت احسان ہے کہ جلالت مآب نے ہمارے خوابوں کو تعبیر بخش دی۔"

"مگر شاہوں کے فیصلے بدل بھی جاتے ہیں، شہزادۂ عالم!" ارجمند بانو نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

"ہم جانتے ہیں کہ عالم پناہ کا انصاف کسی موسم سے متاثر نہیں ہوتا۔" خرم نے جواباً کہا۔ مگر تم ابھی سے یہ باتیں کیوں سوچ رہی ہو؟"

"ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب ہواؤں کا رخ بدل جائے۔" ارجمند

کے لہجے کی اُداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ ”کل میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ہم دونوں ایک دلکش مقام پر کھڑے ہیں کہ اچانک کسی طرف سے ایک عورت نمودار ہوتی ہے، پھر آپ کو اپنے ساتھ لے کر چلی جاتی ہے اور میں چیختی رہ جاتی ہوں۔ آپ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں مگر میری طرف لوٹ کر واپس نہیں آتے۔“

”اپنے ذہن کو وسوسوں سے آزاد کرو، ارجمند!“ خرم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ خواب نہیں، تمہاری پریشان خیالی ہے۔“

”ہوسکتا ہے کہ میرے اندیشوں نے خواب کی شکل اختیار کر لی ہو۔“ ارجمند نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔ ”مگر صاحبِ عالم! یہ تمام بادشاہوں کا مزاج رہا ہے کہ ان کے حرم میں کئی کئی بیویاں اور بے شمار کنیزیں داخل ہوتی ہیں۔ کیا آپ بھی ان ہی شاہوں کی روش پر چلیں گے؟“

”ہم بادشاہ نہیں، صرف خرم ہیں۔“ شہزادے نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ”اور ہم نے تاج پہن بھی لیا تو تمہیں دکھا دیں گے کہ اہلِ دل کس طرح محبت کرتے ہیں اور اس خودغرض دنیا میں وفا کس شے کا نام ہے۔“

خرم کے ان الفاظ نے ارجمند کے خون کی گردش تیز کر دی تھی۔ ”خدا کرے کہ وفا کی شرم رہ جائے۔“ ارجمند کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

شبنم گرتی رہی، ہوائیں سرد ہوتی چلی گئیں اور چاند آہستہ آہستہ ڈھلتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ارجمند گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور رخصت کی اجازت طلب کرنے لگی۔

خرم نے ایک لمحے کے لئے اس کے ہاتھوں کو چھوا اور کہنے لگا۔ ”اب یہ ہاتھ ہمارے جسم کا ایک حصہ ہیں، جانِ آرزو!.....اب جاؤ، خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔“

۞.....۞.....۞

اسی زمانے میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا عرس شروع ہوگیا۔ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے ایک نسبتِ خاص ہونے کے سبب جہانگیر بہت شان و شوکت کے ساتھ عرس کی تقریبات کا اہتمام کرتا تھا۔ اگرچہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ اُس کے بچپن ہی میں دنیا سے گزر گئے تھے، لیکن شیخ کے وصال کے بعد بھی جہانگیر کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص اُس کے سامنے حضرت سلیم چشتیؒ کا نام لیتا تو وہ باادب ہو کر بیٹھ جاتا۔ اور اگر کوئی سوال کرنے والا، حضرت شیخ کے حوالے سے مانگتا تو جہانگیر سوالی کو اُس کی طلب سے اتنا زیادہ دے دیتا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ جہانگیر کی یہ عقیدت محض اس لئے تھی کہ وہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی دعاؤں سے پیدا ہوا تھا اور ان ہی دعاؤں کے طفیل اسے ہندوستان کی حکومت حاصل ہوئی تھی۔

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ مشہور بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا نام شیخ بہاء الدینؒ تھا، جو اجودھن (پاک پٹن) سے ہجرت کر کے لدھیانہ چلے آئے تھے، پھر کچھ عرصہ دہلی میں قیام کر کے مستقل طور پر فتح پور سیکری میں رہنے لگے تھے۔

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ 897ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے اپنی مذہبی تعلیم مکمل کر کے 931ھ میں ”حرمین شریفین“ کی زیارت کی۔ کچھ دنوں تک مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے، پھر مختلف ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان تشریف لے آئے اور فتح پور سیکری میں گوشہ نشیں ہو کر عبادت و ریاضت کرنے لگے۔

اس وقت مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر بے اولاد تھا۔ مختلف شادیاں کرنے کے باوجود اس کے یہاں تخت کا وارث پیدا نہیں ہوا تھا۔ پھر جیسے جیسے دن گزرنے لگے، اکبر کی پریشانیاں بڑھتی چلی گئیں۔ اسی دوران کسی صاحب نے مشورہ دیا کہ وہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے لئے دعا کرائے۔

اکبر بڑی نیاز مندی کے ساتھ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا اور نہایت عاجزانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”شیخ! اگر آپ نے میرے لئے دعا نہیں کی تو ہندوستان کا تاج و تخت ویران ہو جائے گا۔“

حضرت سلیم چشتیؒ بہت دیر تک مراقبے کی حالت میں بیٹھے رہے اور پھر انتہائی جذب کے عالم میں فرمایا۔ ”خدا تجھے تین بیٹے دے گا۔ مگر ان میں سے ایک ہی زندہ رہے گا اور ہم اسے اپنا نام بخش دیں گے۔“

پھر جب پہلے بچے کی پیدائش کا وقت قریب آیا تو اکبر نے اپنی بیگم کو حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی زوجہ محترمہ کے پاس بھیج دیا۔ وہیں مغل شہزادے کی پیدائش عمل میں آئی۔ حضرت شیخ نے اُس کا نام سلیم رکھا اور اکبر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”یہ بچہ صاحبِ اقتدار ہوگا اور ہندوستان کے وسیع ترین علاقے پر حکومت کرے گا۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اکبر کے دو بیٹے مراد اور دانیال لڑکپن ہی میں انتقال کر گئے۔ صرف سلیم زندہ رہا۔ اب وہی سلیم، تاج و تخت کا مالک تھا اور حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔

ہر سال 29 رمضان کو سرکاری سطح پر حضرت سلیم چشتیؒ کا عرس منایا جاتا تھا۔ عرس کی تقریبات سات دن تک جاری رہتی تھیں۔ عید کے دوسرے دن شہنشاہ جہانگیر اپنے امراء اور وزراء کے ہمراہ حضرت شیخ کے مزار پر چادر لے کر حاضر ہوتا۔ پھر بہت دیر تک سلیم چشتی کے قدموں کی جانب ہاتھ باندھے کھڑا رہتا۔ اس کے بعد فتح پور سیکری کے فقیروں اور محتاجوں میں لاکھوں روپے تقسیم کرتا۔

عید کے تیسرے دن تمام شہزادے اور شاہی محل کی خواتین، مزارِ مبارک پر حاضری دیتیں۔

اس سال بھی حسبِ معمول شہزادہ خسرو، شہزادہ پرویز، شہزادہ شہریار اور شہزادہ خرم، حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لئے شاہی محل سے روانہ ہوئے تھے۔ تینوں شہزادے ہمیشہ ایک ہی دعا کرتے تھے کہ خدا انہیں شہنشاہ کی نظروں میں سرخرو کرے اور پھر شہنشاہ کے بعد

انہیں تاج وتخت کا وارث بنا دے۔

مگر شہزادہ خرم اپنے تینوں بھائیوں سے مختلف دعا کرتا تھا۔

''اے قادرِ مطلق! زمین و آسمان بھی تیرے اور ملک و مال بھی تیرے.....تُو جسے چاہے، عزت وسربلندی بخش دے اور جسے چاہے ذلیل ورُسوا کر دے۔ تجھے تیرے فیصلوں سے روکنے والا کوئی نہیں۔ تیرا یہ بندۂ عاجز خرم تجھ سے صرف تیرے رحم کی بھیک مانگتا ہے۔ اسے اسلام پر قائم رکھ اور عزت کی زندگی عطا کر۔''

اس سال چاروں شہزادے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دینے کے لئے فتح پور سیکری پہنچے تو ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔

مبارک شاہ قلندر، فقیروں کی قطار میں کھڑا ہوا پوری طاقت کے ساتھ نعرہ زنی کر رہا تھا۔

''لوگو!.....غور سے سنو! آج میں ہندوستان کی حکومت فروخت کر رہا ہوں۔ جسے تخت و تاج کی ضرورت ہو، وہ مجھ سے خرید لے۔''

زائرین نے قلندر کے اس اعلان کو بڑی حیرت کے ساتھ سنا۔ جو لوگ مبارک شاہ سے واقف تھے، انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ شخص کبھی کسی سے بات نہیں کرتا۔ اور جو لوگ قلندر کی حیثیت سے بے خبر تھے، ان کی نظروں میں وہ ایک پاگل انسان تھا، جو بوسیدہ حالت میں ہوتے ہوئے ہندوستان کے تخت وتاج کو بیچنے کا اعلان کر رہا تھا۔

شہزادہ خسرو سب سے آگے تھا۔ جب وہ مبارک شاہ کے قریب سے گزرا تو قلندر نے انتہائی بارُعب لہجے میں اس سے کہا۔

''تُو ہندوستان کی حکومت خریدے گا؟''

شہزادہ خسرو ایک فقیر کے اس طرزِ تخاطب پر غصے سے پاگل ہو گیا۔ ''کیا تُو اندھا ہو گیا ہے کہ ولی عہدِ سلطنت کو نہیں پہچانتا؟ میں ہی تخت وتاج کا حقیقی وارث ہوں اور تُو مجھ ہی سے اس قسم کی گفتگو کر رہا ہے۔ بے ادب! اپنے غلیظ جسم کی طرف دیکھ! جسے ایک وقت کی روٹی میسر نہیں، وہ حکومت واقتدار کی بولیاں لگا رہا ہے۔'' یہ کہہ کر شہزادہ خسرو نے مبارک شاہ قلندر کے منہ پر ایک زوردار ٹھوکر ماری۔ نحیف ونزار جسم رکھنے والا مبارک شاہ اس ضربِ شدید کو برداشت نہ کر سکا اور ایک طرف زمین پر گر گیا۔ پھر وہ سنبھلا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ قلندر کے چہرے سے خون بہہ رہا ہے۔

''یہ تجھے وقت بتائے گا کہ اندھا کون ہے۔'' مبارک شاہ قلندر نے پُر جلال لہجے میں کہا۔ ''تاج وتخت نہیں خریدے گا تو ذلت ورسوائی کی موت خریدے گا۔''

قلندر کا لہجہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ شہزادہ خسرو کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ مزید کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔

پھر شہزادہ پرویز، مبارک شاہ کے قریب سے گزرا۔ قلندر نے اس سے بھی وہی الفاظ

دہرائے۔ ''ہندوستان کے تاج وتخت خریدے گا؟''

''کیوں اپنی زندگی سے خوف ناک کھیل، کھیل رہا ہے دیوانے؟ کیا تجھے اب بھی ہوش نہیں آیا؟'' یہ کہہ کر شہزادہ پرویز آگے بڑھ گیا۔

مبارک شاہ نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ ''ہاں! میں دیوانہ ہوں۔''

پھر شہزادہ شہریار نے بھی قلندر کے ساتھ وہی تحقیر آمیز سلوک کیا۔

آخر میں شہزادہ خرم آگے بڑھا اور اپنے رومال سے مبارک شاہ کے چہرے کا خون صاف کرنے لگا۔ قلندر کے ہونٹوں پر اچانک مسکراہٹ اُبھر آئی۔ پھر عجیب لہجے میں بولا۔

''میں تو ان بدنصیبوں سے اتمام حجت کے لئے کہہ رہا تھا۔ ورنہ ان کی قسمت میں ذلت کے اندھیروں کے سوا کچھ نہیں۔''

''انہیں معاف کر دیں قلندر! کہ وہ آپ کو پہچانتے نہیں۔'' شہزادہ خرم نے اپنے بھائیوں کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''میں کون ہوتا ہوں معاف کرنے والا۔'' مبارک شاہ نے بے نیازی کے انداز میں کہا۔ ''جب آسمان پر ان کے لئے معافی نہیں لکھی گئی تو زمین والے کیا کر سکتے ہیں؟ سب کے سب مجبور ہیں۔''

شہزادہ خرم، مبارک شاہ کے چہرے کا خون صاف کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزار کی طرف جانے کے لئے آگے بڑھتا، قلندر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تُو بھی ہندوستان کا تاج وتخت نہیں خریدے گا؟''

''کیوں نہیں خریدوں گا؟'' شہزادہ خرم ٹھہر گیا اور بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''قلندر! تم اس کی کیا قیمت لو گے؟''

''ایک ہزار اشرفیاں۔'' مبارک شاہ نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہت سستا بیچ رہا ہوں۔ اتنے میں تو دیہاتوں کی جاگیر بھی نہیں ملتی۔''

''اس وقت تو میرے پاس اشرفیاں نہیں ہیں۔'' شہزادہ خرم نے کہا۔ ''میں تو حضرت شیخ کے مزار پر حاضری دینے کے لئے آیا تھا۔ یہ سعادت حاصل کرنے کے بعد ہی اشرفیوں کا انتظام ہو سکے گا۔''

''کوئی بات نہیں شہزادے! کوئی بات نہیں۔'' مبارک شاہ قلندر نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''بس، سودا طے ہو چکا۔ تمہیں میرے پاس اشرفیاں لانے کی ضرورت نہیں۔ میری طرف سے وہ ساری دولت آگرے کی بیوہ عورتوں میں تقسیم کر دینا۔ میں نے خدا کے حکم سے ہندوستان کے تاج وتخت تمہارے نام کر دیئے۔''

یہ کہہ کر قلندر کھڑا ہوا اور شہزادہ خرم سے لپٹ گیا۔ مبارک شاہ کے جسم کے گرد وغبار سے شہزادے کی قبا میلی ہو گئی مگر خرم نے کوئی کراہت محسوس نہیں کی۔ پھر قلندر نے اپنے خاک آلود

ہاتھ شہزادے کے چہرے پر پھیرے، اس کے بعد ایک جگر شگاف نعرہ بلند کیا۔

"سدا رہے نام اللہ کا....."

ارسلان بیگ، گیانی آتمارام کی ہدایت کے مطابق سائے کی طرح شہزادہ خرم کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے مبارک شاہ قلندر کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ سنا تھا اور اپنی آنکھوں سے شہزادہ خسرو کا طرزِ عمل بھی دیکھا تھا۔ ارسلان بیگ نے مبارک شاہ کو اس کے ظاہری حلیے سے ایک پاگل سمجھ لیا تھا اور دل ہی دل میں شہزادہ خرم کی حماقتوں پر خوش ہو رہا تھا۔

جب خرم، حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزارِ مبارک کی طرف جانے لگا تو ارسلان بیگ نے تیزی سے آگے بڑھ کر شہزادے کو مبارک باد پیش کی۔

"صاحبِ عالم کو ہندوستان کے تخت و تاج مبارک ہوں۔"

خرم نے اپنے بائیں جانب مڑ کر دیکھا۔ ارسلان بیگ دونوں ہاتھ باندھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ شہزادے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خرم کو پہلے ہی اس سے نفرت تھی۔ پھر جب اس نے ارجمند بانو کے سامنے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تو یہ نفرت کچھ اور شدید ہو گئی۔

"صاحبِ عالم! تاجِ شاہی پہننے کے بعد اپنے اس پرانے نمک خوار کو فراموش نہ کر دیجئے گا۔" ارسلان بیگ بظاہر خرم کی خوشامد کر رہا تھا۔ مگر اُس کی باتوں میں گہرا طنز پوشیدہ تھا۔

ارسلان بیگ کے خیال میں جہانگیر کا سب سے بڑا لڑکا خسرو، تاج و تخت کا وارث تھا۔ اگر اتفاق سے وہ اس منصب تک نہ پہنچتا تو پھر حکومت کا دوسرا حق دار، شہزادہ پرویز تھا۔ پھر یہ خرم کہاں سے آ گیا؟ یہ سوچ سوچ کر ارسلان بیگ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ شہزادہ خرم کے قریب ہونا چاہتا تھا کہ گیانی آتمارام نے اسے یہی ہدایت کی تھی۔

خرم نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور وہ مزارِ مبارک کے احاطے میں داخل ہونے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"کیا صاحبِ عالم اس غلام سے خفا ہیں؟" ارسلان بیگ نے اپنے لہجے کو زیادہ خوشامدانہ بنا لیا تھا۔

"میں ان فضول باتوں کو پسند نہیں کرتا۔" مجبوراً خرم کو جواب دینا پڑا۔

"میں تو حضور کو ہندوستان کے تاج و تخت کا مالک بننے پر مبارکباد پیش کر رہا ہوں۔"

ارسلان بیگ اسی بے حسی کے ساتھ بول رہا تھا۔ اس پر شہزادہ خرم کی تنبیہہ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

شہزادہ خرم نے اپنے آپ پر جبر کیا اور خاموشی کے ساتھ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سیڑھیاں ختم ہوئیں اور دائیں جانب حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا مزارِ مبارک نظر آنے لگا۔ جوشِ عقیدت سے خرم کا سر جھک گیا اور وہ آہستہ آہستہ اس دروازے کی طرف بڑھا، جہاں سے قبر کا وہ حصہ دکھائی

دیتا تھا، جدھر حضرت شیخ کے قدم مبارک تھے۔

شہزادہ خرم بہت دیر تک آنکھیں بند کئے اور دونوں ہاتھ پھیلائے زیرِ لب دعا مانگتا رہا۔ ارسلان بیگ بھی شہزادے کے پیچھے کھڑا تھا مگر وہ خرم کی دعا کے الفاظ نہ سن سکا۔ کیونکہ شہزادے کے ہونٹوں کو صرف جنبش ہو رہی تھی اور یہ جنبش اس قدر خفیف تھی کہ برابر کھڑا ہونے والا شخص بھی خرم کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔

پھر جب فاتحہ خوانی کے بعد چاروں شہزادے واپس جانے لگے تو مبارک شاہ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"اے آگرے والو!.....اے دہلی والو!.....اے لاہور والو!.....اور اے ہندوستان کے دُور دراز گوشوں میں رہنے والو! غور سے سن لو کہ قلندر نے خدا کے حکم سے تاج و تخت، شہزادہ خرم کے حوالے کر دیئے۔ اب جو بدنصیب بھی میرے شہزادے کے راستے میں آئے گا، اسے ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیا جائے گا۔"

شہزادہ خسرو، پرویز اور شہریار، مبارک شاہ کی چیخیں سن کر ہنسنے لگے۔

جب خرم دوبارہ قلندر کے پاس سے گزرا تو چند لمحوں کے لئے ٹھہر کر کہنے لگا۔ "مبارک شاہ! آپ نے یہ کیا کیا؟"

"شہزادے! یہ اعلان بہت ضروری تھا۔" قلندر نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "تجھے کیا پتہ کہ تیرے خلاف کیا کیا سازشیں کی جا رہی ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ تیرے لئے دعائیں کرنے والے بھی تو بے شمار ہیں۔"

قلندر بڑے عجیب لہجے میں بول رہا تھا۔

"یہاں بہت خون بہے گا، بڑے انقلابات آئیں گے، زمین زیر و زبر ہو جائے گی۔ مگر تُو ہراساں نہ ہونا..... تیرا مبارک شاہ ابھی زندہ ہے..... خدا، قلندر کو اس وقت تک دنیا سے نہیں اُٹھائے گا، جب تک تُو تاجِ زرنگار نہیں پہن لے گا۔"

بڑی عجیب باتیں تھیں۔ شہزادہ خرم اپنے خیالات میں گم آہستہ آہستہ شاہی رتھ کی طرف بڑھا اور اپنے تینوں بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں شہزادہ خسرو، پرویز اور شہریار تینوں اس کا اور مبارک شاہ کا مذاق اُڑاتے رہے۔ اگرچہ شہریار اس سے چند ماہ چھوٹا تھا، لیکن وہ بھی اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ مل کر تخت و تاج کے حوالے سے خرم پر طنز کر رہا تھا۔ خرم نے اپنے بھائیوں کی آزار پہنچانے والی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کے تصورات کے پردے پر صرف مبارک شاہ قلندر کا چہرہ نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

❀.....❀.....❀

اسی رات بارہ دری میں ارجمند اور خرم کی ملاقات ہوئی۔

دلکش چاندنی رات تھی اور ہوائیں بھی سرشار کر دینے والی تھیں۔ مگر شہزادہ خرم آج غیر معمولی طور پر خاموش نظر آ رہا تھا۔ ارجمند اُس کے بہت قریب تھی، لیکن آج رات اس قربت نے بھی فاصلوں کا لباس پہن لیا تھا۔

''صاحبِ عالم! آپ کی یہ خاموشی؟'' ارجمند بانو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تمہاری قربت میں خاموش رہنے کو دل تو نہیں چاہتا..... مگر.....'' خرم نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ ارجمند کو کسی ذہنی آزار میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''آپ کی طبیعت ناساز ہے یا اس نامراد ارسلان بیگ نے میرے بارے میں کچھ کہہ دیا؟'' اچانک ارجمند کے لہجے سے تشویش ظاہر ہونے لگی تھی۔

اب خرم، ارجمند سے دل کی بات چھپا نہیں سکتا تھا۔ مجبوراً اُسے مبارک شاہ قلندر کا واقعہ سنانا پڑا۔ ''میں نے اس شخص کو پہلے کبھی بولتے نہیں دیکھا..... مگر آج دوپہر اس نے زبان کھولی تو پھر خاموش ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس نے شہزادہ خسرو، پرویز اور شہریار کے سامنے ہندوستان کا تخت میرے حوالے کر دیا ہے..... اور اس کے بدلے میں ایک ہزار اشرفیاں طلب کی ہیں۔''

ارجمند بانو چونک اُٹھی۔ ''کیا قلندر آپ سے ایک ہزار اشرفیاں چاہتا ہے؟'' ارجمند نے بڑی حیرت کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں۔ مبارک شاہ نے کہا کہ میں وہ اشرفیاں آگرے کی بیوہ عورتوں میں تقسیم کر دوں۔'' خرم نے قلندر کے مطالبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر ارجمند نے ایک طویل سانس لی اور پھر انتہائی اثر انگیز لہجے میں کہنے لگی۔ ''قلندر اپنی ذات کے لئے ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ مجھے بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔''

پھر ارجمند نے پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ سناتے ہوئے کہا۔

''مبارک شاہ نے مجھے بھی سب کے سامنے ملکۂ عالیہ کہہ کر پکارا تھا۔ اور جب میں نے اسے چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی دی تھی تو اس نے سارے روپے میرے اوپر سے صدقہ کر کے فقیروں کے سامنے پھینک دیئے تھے۔''

خرم نے بڑے تعجب سے یہ واقعہ سنا اور پھر کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بڑی عجیب بات ہے کہ وہ تمہیں ملکۂ عالیہ کہہ کر پکارتا ہے اور مجھے شاہِ ہندوستان کا لقب دیتا ہے۔ جبکہ میرے دونوں بھائی خسرو اور پرویز بڑے ہونے کے سبب حکومت کے زیادہ مستحق ہیں۔ پھر قلندر نے یہ کیوں کہا؟ میں نے تو صرف اس کے چہرے کا خون صاف کیا تھا..... پھر اس نے اس قدر ہنگامہ برپا کیوں کیا؟..... تینوں بھائی راستے بھر میرا مذاق اُڑاتے رہے۔ ارجمند! کیا تم جانتی ہو کہ قلندر کون ہے اور اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں نے ماہ رخ کی زبانی سنا ہے کہ قلندر کسی سے بات نہیں کرتا۔'' ارجمند نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''ماہ رخ کئی بار اپنی درخواست لے کر قلندر کے پاس جا چکی ہے، مگر ہر

بار اسے دیکھ کر مبارک شاہ نے منہ پھیر لیا ہے۔ میں تو بس اسی قدر جانتی ہوں کہ قلندر، دولت کا بھوکا نہیں ہے اور دولت ہی اس دنیا میں سب سے بڑا فتنہ ہے۔ جو انسان اس فتنے سے محفوظ رہا، وہی طب ہے، وہی ولی ہے اور وہی قلندر ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' خرم نے ارجمند کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کل ہی ایک ہزار اشرفیاں آگرے کی بیواؤں میں تقسیم کرا دوں گا۔ مگر مجھے قلندر کی اس بات نے پریشان کر دیا ہے کہ حصولِ تخت و تاج کے لئے بڑا خون بہے گا۔''

ارجمند بانو خاموشی سے سنتی رہی۔

''میں اس تخت پر بیٹھنا نہیں چاہتا، جس کے پائے انسانی خون میں ڈوبے ہوں۔'' چند لمحے خاموش رہ کر خرم نے دوبارہ کہا۔ ''کل میں قلندر سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ مجھے ایسے تاج و تخت درکار نہیں ہیں۔ وہ میرے لئے بس اتنی دعا کر دے کہ میں ارجمند کو حاصل کر سکوں اور اسے اپنے ساتھ لے کر کشت و خون کے اس دریا کے پار اُتر جاؤں..... اور پھر اقتدار کے ہنگاموں کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھوں۔''

خرم کی خواہش پر ارجمند شرما گئی اور پھر لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''صاحبِ عالم! میں کیسی خوش نصیب ہوں کہ میری قربت کے لئے آپ تخت و تاج کو بھی ٹھکرا دینا چاہتے ہیں۔ مگر اس حقیقت کو کس طرح فراموش کیا جا سکتا ہے کہ ہماری قربت بھی مرضیٔ شاہ کی پابند ہے۔ آپ کوئی مزدور نہیں کہ اپنی مرضی سے کام چھوڑ کر چلے جائیں اور فاقہ کشی کی زندگی قبول کر لیں۔ آپ بہرحال، ظلِ الٰہی کے فرزند ہیں اور ان کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ آپ کو بہرصورت سیاست میں حصہ لینا پڑے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ میری خاطر اپنے سارے حقوق سے دستبردار ہو جائیں۔ آپ کسی بھی محاذ پر رہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر خدانخواستہ منزلِ فراق بھی آ گئی تو آپ قدم قدم پر مجھے اپنے ہمراہ پائیں گے۔ میں قلندر کی طرح آپ کے سر پر تاجِ زرنگار دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ میرے خیال کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ سب کچھ فراموش کر ڈالیں۔ آپ شہنشاہ کے فرزند ہیں اور بادشاہی آپ کا حق ہے۔ میرا کیا ہے، میں تو ایک سپاہی کی بیٹی ہوں..... کسی نہ کسی طرح زندگی گزر ہی جائے گی۔''

''ارجمند! ہم تمہاری محبت پر ناز کرتے ہیں۔'' خرم کے لہجے سے ناقابلِ بیان خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''مگر خدا کے لئے تاج و تخت کو اپنی زندگی کی ضرورت نہ بنا لینا۔''

''آپ میری ضرورت ہیں، تاج و تخت نہیں۔'' ارجمند نے اس قدر آہستہ لہجے میں کہا کہ اس کی آواز پر سرگوشی کا گمان ہو رہا تھا۔

❀.....❀.....❀

دوسرے دن شہزادہ خرم نے مبارک شاہ قلندر کے حکم کے مطابق ایک ہزار اشرفیاں بیوہ

عورتوں میں تقسیم کرا دیں اور پھر قلندر سے دوبارہ جا کر ملا۔ مبارک شاہ سب سے الگ تھلگ بیٹھا، حضرت سلیم چشتی کے مزار کے گنبد کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ شہزادہ خرم نے اسے آواز دی تو وہ چونک اُٹھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''آؤ شاہ جہاں! میرے پاس آؤ۔''

''میں خرم ہوں، شاہ جہاں نہیں۔'' شہزادے نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ شاہ جہاں کا لفظ سن کر خرم کو گمان گزرا کہ قلندر کل کی بات بھول گیا ہے اور وہ اسے پہچانے بغیر شاہ جہاں کہہ کر پکار رہا ہے۔

''تجھے کیا معلوم کہ تُو کون ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ تُو شاہ جہاں ہے۔'' قلندر نے پُرجلال لہجے میں کہا۔ ''کیا تُو ہمیں بدحواس انسان سمجھتا ہے؟..... تُو نے سودے کی رقم ادا کر دی؟''

اب خرم کو یقین آ گیا کہ مبارک شاہ اپنے ہوش میں ہے اور اس نے کوئی بات خود فراموشی کے عالم میں نہیں کہی ہے۔

''ہاں! میں نے وعدے کے مطابق ایک ہزار اشرفیاں بیوہ عورتوں میں تقسیم کرا دیں۔ مگر میں آپ سے ایک بات کہنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔'' شہزادہ خرم، قلندر کے روبرو بہت آہستہ بول رہا تھا۔

''ہاں ہاں، کہو شاہ جہاں!'' قلندر کے ہونٹوں پر وہی ایک پُراسراری مسکراہٹ نمایاں تھی۔

شاہ جہاں کے لفظ پر خرم ایک بار پھر چونکا مگر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں انسانی خون میں ڈوبا ہوا تاج پہننا نہیں چاہتا۔''

''تُو کون ہوتا ہے انکار کرنے والا؟'' اچانک قلندر کو جلال آ گیا۔ ''آسمانوں پر یہی فیصلہ ہوا تھا۔ زمین کے سینے پر رینگنے والے حقیر کیڑے اس فیصلے سے کس طرح منحرف ہو سکتے ہیں؟ کس میں اتنی طاقت ہے کہ اس فیصلے کو بدل ڈالے؟ تجھے ہر حال میں وہ تاج پہننا پڑے گا۔ انسانی خون کیا ہے؟ ایسا فاسد خون تو بہتا ہی رہتا ہے۔ بس اب جا! ہمارا وقت برباد نہ کر۔''

شہزادہ خرم واپس جانے کے لئے مڑا۔ یکایک اس نے قلندر کا وہی جگر شگاف نعرہ سنا۔

''سدا رہے نام اللہ کا۔''

❀.....❀.....❀

ارسلان بیگ مسلسل خرم کی جاسوسی کر رہا تھا۔ اس نے پورا واقعہ انتہائی رنگ آمیزی کے ساتھ جہانگیر کے گوش گزار کر دیا۔

''خداوند! وہ بھیک مانگنے والا فقیر آپ کے تخت و تاج کا سودا کر رہا ہے۔ اور شہزادہ خرم تو سادہ دل ہیں کہ وہ اس عیار بھکاری کے جال میں آ گئے۔''

''یہ کیسی سادگی ہے کہ خرم نے ایک ہزار اشرفیاں بیوہ عورتوں میں تقسیم کرا دیں؟'' جہانگیر

نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ بھکاری مبارک شاہ، مغل سلطنت کا دشمن ہے۔'' ارسلان بیگ نے اپنی روایتی چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ بیٹے کو باپ کے خلاف بغاوت پر اُکسا رہا ہے۔''

جہانگیر بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا مگر چہرے پر اُبھرتے ڈوبتے رنگوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ہندوستان کا حکمران کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔

''ہمیں خرم نے بہت مایوس کیا۔'' بالآخر جہانگیر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''اگر اس فریب کار قلندر نے آج شاہی کی پیشکش کی تھی تو خرم کو انکار کر دینا چاہئے تھا۔ ابھی تو ہم زندہ ہیں۔ پھر کیا وہ مبارک شاہ سے ہماری موت خرید رہا تھا؟ خرم کو اسی وقت تاج و تخت حاصل ہو سکتا ہے، جب ہم اس دنیا میں موجود نہ ہوں۔ پھر یہ کیسی سودے بازی تھی؟ کیا خرم اس بھکاری سے ہماری موت کی تجارت کر رہا تھا؟''

ارسلان بیگ بہت خوش تھا کہ اس نے باپ کے سینے میں بیٹے کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ ''نہیں خداوند! شہزادہ خرم کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ وہ بالکل معصوم ہیں۔''

''شہزادہ خسرو سے ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح اُس بھکاری کے منہ پر ٹھوکر مار دے گا۔'' جہانگیر کا لہجہ غضب ناک تھا۔ ''جو کام خسرو نے کیا، وہ خرم کو کرنا چاہئے تھا۔ مگر تخت و تاج کی ہوس ایک لعنت ہے جو بیٹے کو بھی باپ سے دُور کر دیتی ہے۔ اگر خرم معصوم تھا تو اس نے کس لئے مبارک شاہ کے چہرے کا خون صاف کیا اور پھر کیوں ایک ہزار اشرفیاں تقسیم کیں؟''

''خداوند اپنے رازوں کو خود بہتر جانتے ہیں۔'' ارسلان بیگ بڑی ہوشیاری سے شکوک و شبہات کی اس آگ کو ہوا دے رہا تھا، جو بہت دیر سے جہانگیر کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔

''ہاں! ہم ان رازوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔'' جہانگیر نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور اس کے ساتھ ہی ارسلان بیگ کو خلوت سے نکل جانے کا حکم دیا۔

ارسلان بیگ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ خلوت گاہِ شاہی سے نکل کر رات کے اندھیرے میں گیانی آتمارام کے پاس پہنچا۔

گیانی نے فوراً ہی ارسلان بیگ کو اندر بلا لیا اور بڑے پُرجوش لہجے میں پوچھنے لگا۔

''دیوتاؤں کے پجاری! تُو کیا خبر لایا ہے؟''

ارسلان نے آگے بڑھ کر گیانی کے چرن چھوئے اور اپنی کارگزاری بیان کرتے ہوئے بولا۔

''آگرے کے ایک بھکاری، مبارک شاہ نے ایک ہزار اشرفیوں کے بدلے ہندوستان کے تخت و تاج شہزادہ خرم کے ہاتھوں فروخت کر دیئے۔''

مبارک شاہ کا نام سن کر گیانی آتمارام کانپ اُٹھا۔ مگر رات کے اندھیرے کے سبب اس کے چہرے پر لرزنے والی خوف و دہشت کی پرچھائیاں ارسلان بیگ کو نظر نہ آ سکیں۔ ''کیا مبارک شاہ نے وہ اشرفیاں حاصل کر لیں؟'' گیانی نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

جب ارسلان بیگ نے گیانی کو بتایا کہ وہ ساری اشرفیاں بیوہ عورتوں میں تقسیم کر دی گئیں تو آتمارام ایک بار پھر لرز اُٹھا۔

''یہ بہت خوف ناک بات ہے ارسلان بیگ!'' گیانی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر مبارک شاہ وہ اشرفیاں قبول کر لیتا تو پھر آسانی کے ساتھ اُسے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔''

آتمارام کی سراسیمگی پر ارسلان بیگ چونک اُٹھا۔ ''مہاراج! آپ اُس بھکاری سے اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟''

''وہ بھکاری نہیں، ایک طاقتور مسلمان ہے۔'' گیانی نے اپنی لرزتی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے ہمیں مبارک شاہ کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔ اگر وہ زندہ رہا تو ایک دن شہزادہ خرم یقیناً تاجِ شاہی پہن لے گا۔''

''کیا مبارک شاہ اتنا طاقتور انسان ہے؟'' گیانی کی زبان سے نیا انکشاف سن کر ارسلان بیگ بھی پریشان نظر آنے لگا۔

''اب اتنا طاقتور بھی نہیں کہ آتمارام اس پر قابو نہ پا سکے۔'' گیانی نے اپنے خوف و ہراس کو چھپا کر بلند آواز میں کہا۔ ''تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مبارک شاہ کو راستے سے ہٹانا میرا کام ہے۔ تُو بس اتنا کر دے کہ جہانگیر، خرم سے بدگمان ہو جائے۔''

''باپ اور بیٹے کے درمیان بدگمانیاں تو پیدا ہو چکی ہیں۔'' ارسلان بیگ نے اپنی کارکردگی کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی گیانی نے ایک زوردار نعرہ بلند کیا۔ ''جے شیو شنکر..... جے درگا ماتا.....''

ارسلان بیگ نے بھی گیانی کی تقلید کرتے ہوئے یہی الفاظ دہرائے۔ مگر حقیقتاً وہ ہندو نہ تھا..... اور نہ مسلمان..... وہ صرف اپنی غرض کا بندہ تھا اور منافقت اُس کا مذہب تھا۔

❀.....❀.....❀

پھر یہ بدگمانی اس قدر بڑھی کہ اس واقعے کی گونج نے جہانگیر کو رات بھر سونے نہ دیا۔ مطربہ انجمن آراء نے اس اضطراب کا سبب پوچھا تو جہانگیر اس مجبور عورت پر برس پڑا۔

''ہماری حکومت اور اقتدار کے سودے ہو رہے ہیں۔'' جہانگیر نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ''آگرے کا ایک بھکاری، مبارک شاہ سلطنتِ مغلیہ کو فروخت کر رہا ہے۔ اور ہمارا ہی بیٹا خرم ایک ہزار اشرفیوں کے عوض ہندوستان کے تخت و تاج خرید رہا ہے۔''

انجمن حیرت سے جہانگیر کی باتیں سن رہی تھی۔ جب وہ خاموش ہوا تو درباری مطربہ نے بڑے ادب سے کہا۔ ''آپ شہزادہ خرم سے بدگمان نہ ہوں کہ وہ تو آپ کے محبوب فرزند ہیں۔''

''اور یہی محبوبیت ہمیں فریب دے رہی ہے انجمن!'' جہانگیر کے لہجے کی تلخی میں ذرا بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ''اسی اعتبار کے پردے میں لوگ بے اعتباری کے کھیل، کھیل رہے ہیں۔ ہم اس بھکاری مبارک شاہ کو تو دیکھ لیں گے مگر شہزادہ خرم نے ہمیں بہت مایوس کیا ہے۔''

''عالم پناہ! کوئی جذباتی فیصلہ نہ کریں۔'' انجمن آراء نے ڈرتے ڈرتے شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''آپ تنہائی میں شہزادہ خرم سے اس واقعہ کی تفصیل دریافت کریں۔ لوگوں کا کیا ہے، وہ تو..... بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے۔''

انجمن آراء کی گفتگو سے جہانگیر کا غصہ کچھ کم ہوا اور پھر وہ رات کے پچھلے پہر درباری مطربہ سے ''بھیرویں راگ'' سنتے سنتے سو گیا۔

انجمن آراء مطمئن ہو گئی۔ مگر اُس کا یہ اطمینان بہت عارضی تھا۔ جہانگیر تھوڑی دیر بعد ہی چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا۔

''کیا ہوا ظلِ الٰہی؟'' انجمن آراء بدحواس ہو گئی۔

جہانگیر دہشت زدہ نظروں سے اپنی خواب گاہ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''کون عالم پناہ؟'' انجمن آراء نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہی، آگرے کا بھکاری، مبارک شاہ۔'' جہانگیر کی آواز سے لرزش نمایاں تھی۔

''وہ یہاں کہاں ظلِ الٰہی؟'' انجمن آراء بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ ''وہ تو آگرے کی گلیوں میں کہیں بھیک مانگ رہا ہوگا۔''

''ہم نے ابھی خواب میں دیکھا ہے کہ ایک شکستہ حال شخص نے ہمارا سر کاٹ کر شہزادہ خرم کو پیش کر دیا ہے۔'' جہانگیر نے اپنا خواب بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم مبارک شاہ کو نہیں پہچانتے، مگر ایسا لگتا ہے کہ ہمارا قاتل وہی ہے۔''

''نہیں ظلِ الٰہی! یہ محض پریشان خیالات ہیں، جو خواب کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔'' انجمن آراء نے جہانگیر کے اندیشوں کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک گداگر کی کیا طاقت کہ عالم پناہ کے جسم کو چھو بھی سکے۔''

''نہیں انجمن! تُو ایسے لوگوں کو نہیں جانتی۔'' جہانگیر نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''ہم نے بے شمار جادوگر دیکھے ہیں۔ مبارک شاہ بھی ایسا ہی ایک ساحر ہے، جو ہمارے خوابوں میں دخل اندازی کر رہا ہے۔''

''اگر ظلِ الٰہی کے بقول وہ ایک ساحر ہے تو اسے ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔'' انجمن آراء نے شہنشاہ کا خوف زائل کرنے کے لئے تجویز پیش کی۔

''ہاں! ہم ایسا ہی کریں گے۔'' یکایک جہانگیر کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا۔ ''اس سے پہلے کہ مبارک شاہ کی شعبدہ بازیاں کوئی گُل کھلائیں، ہم اس کی زندگی کا چراغ ہی گُل کر دیں گے۔''

جہانگیر نے ایک خوف ناک فیصلہ کیا مگر خواب کی دہشت کے باعث وہ رات کے باقی حصے میں سو نہیں سکا۔

❀.....❀.....❀

دوسرے دن جہانگیر نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے دربار جانا ملتوی کر دیا اور چاروں

شہزادوں کو اپنی خلوت گاہ میں طلب کر لیا۔ چاروں شہزادے اس اچانک طلبی پر کچھ پریشان سے نظر آ رہے تھے۔

جہانگیر نے خسرو، پرویز، خرم اور شہریار کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ چاروں شہزادے خوف سے لرزنے لگے۔ پھر جہانگیر، خسرو سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''یہ مبارک شاہ قلندر کون ہے، جو ایک ہزار اشرفیوں کے عوض ہندوستان کی حکومت فروخت کر رہا ہے؟''

''وہ ایک پاگل شخص ہے عالم پناہ!'' خسرو نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس بدبخت کو اس کی دیوانگی کی سزا بھی دی تھی مگر خرم کے سلوک نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا۔''

''مابدولت تیرے اس عمل سے پوری طرح باخبر ہیں۔'' جہانگیر نے اپنے بڑے بیٹے کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ ''خسرو! تُو نے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ لائق و سعادت مند بیٹے ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

پھر جہانگیر نے اپنے دوسرے بیٹوں پرویز اور شہرشار کی طرف دیکھا۔

''ہم نے بھی اس دیوانے کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کیا۔ مگر خرم، اقتدار کی ہوس میں اپنے رومال سے مبارک شاہ کے چہرے کا خون صاف کر رہا تھا۔'' تینوں بھائیوں نے مل کر شہنشاہ کے سامنے خرم کو مجرم بنا دیا۔

اب جہانگیر کی نگاہ کا مرکز صرف خرم تھا۔

''اور تُو نے ایک ہزار اشرفیاں دے کر باپ کی موت کا سودا کر لیا۔ خرم! تجھ پر آفرین ہے۔'' شہنشاہ کا ایک ایک لفظ نفرت و حقارت کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

''معاذ اللہ!'' جوشِ جذبات سے خرم کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''ایک ہندوستان کیا، اگر ساری دنیا کی حکومت بھی میرے قدموں میں ڈھیر کر دی جائے تو میں اسے آپ کی زندگی پر ترجیح نہ دوں۔''

''تیرے قول و فعل میں بڑا تضاد ہے خرم!'' جہانگیر کے لہجے کی آگ کچھ اور بھڑک اٹھی تھی۔ ''کسی بیٹے کو اقتدار اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب اس کا باپ دنیا سے اُٹھ جائے۔ وہ بھکاری مبارک شاہ تیرے شفیق و مہربان باپ کے مرنے کی دعائیں کر رہا تھا اور تُو جواب میں اشرفیوں سے اس کی جھولی بھر رہا تھا۔ تُو نے خسرو کی طرح اس کے ناپاک چہرے پر ٹھوکر کیوں نہیں ماری؟ ہم تو اس وقت خوش ہوتے، جب تُو مبارک شاہ کی غلیظ زبان کاٹ کر ہمارے حضور پیش کر دیتا۔''

خرم کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عام سا واقعہ اس کے اور باپ کے درمیان ایک ہولناک بدگمانی کا سبب بن جائے گا۔ خرم اپنی قوتِ ارادی کا سہارا لے کر سنبھلا اور اس نے ایک مضبوط دلیل پیش کی۔

''ظلِ الٰہی کے بقول وہ ایک پاگل شخص ہے اور میرے عزیز بھائی بھی مبارک شاہ کو دیوانہ

کہتے ہیں تو پھر ایک مخبوط الحواس انسان کی باتوں پر گرفت نہیں کی جانی چاہئے۔ وہ اپنے ہوش میں کب تھا کہ میں اس کی زبان کاٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال دیتا۔''

خرم کی دلیل سن کر جہانگیر حیران رہ گیا۔ خسرو، پرویز اور شہریار اپنی اس کارکردگی پر بے حد خوش نظر آ رہے تھے کہ انہوں نے بھائی کو ''محبوبیت'' کے درجے سے گرا کر معتوب بنا دیا تھا۔

''پھر تُو نے اسے اشرفیاں کیوں پیش کیں؟'' جہانگیر نے خرم کا جرم ثابت کرنے کے لئے جوابی دلیل کا سہارا لیا۔

''ظلِ الٰہی! مبارک شاہ ان اشرفیوں کا کیا کرتا؟ اس کے پھٹے ہوئے دامن میں تو چاندی کا ایک سکہ بھی نہیں سما سکتا تھا۔'' خرم بڑے اثر انگیز لہجے میں بول رہا تھا۔ ''میں نے وہ ساری اشرفیاں آگرے کی بیوہ عورتوں میں تقسیم کرا دی ہیں۔ اگر عالم پناہ کو مجھ پر شک ہے تو میں ایک ایک عورت کا نام و نشان بتا سکتا ہوں۔ میں نے ذاتی اقتدار کے لئے نہیں، عالم پناہ کے جاہ و جلال میں اضافے کے لئے وہ اشرفیاں خیرات کی تھیں کہ بیوہ عورتوں کی دعاؤں سے مغل سلطنت کو مزید عروج اور استحکام حاصل ہو۔ آپ ایک ایک بیوہ عورت کو سرِ دربار طلب فرمائیں اور اس سے دریافت کریں کہ خرم نے کیا کیا ہے؟ اگر آپ کے ناپسندیدہ فرزند نے اپنے اقتدار کے لئے ان بیوہ عورتوں سے دعا کرائی ہو تو مبارک شاہ کے بجائے خرم کی زبان کاٹ دیں۔''

عجیب و غریب بیان تھا، جسے سن کر خسرو، پرویز اور شہریار کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور خود جہانگیر بھی حیرت کا ایک مجسمہ بن کر رہ گیا۔ ''میں نے ان اشرفیوں کے ذریعے عالم پناہ کی جان کا صدقہ دیا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو ظلِ الٰہی میرے لئے سخت سے سخت سزا تجویز فرما دیں۔''

جہانگیر بہت دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا، پھر اس کے ذہن نے ایک اور بہانہ تراش لیا۔

''ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ تیرا بیان سچ ہے تو پھر تُو نے اس بھکاری کے چہرے کا خون کیوں صاف کیا تھا؟ ایک ایسے شخص کے لئے یہ سزا ضروری تھی، جو سرِ راہ ہمارا اقتدار فروخت کر رہا ہو۔''

''مبارک شاہ ایک کمزور اور ناتواں انسان ہے ظلِ الٰہی!'' خرم نے شاہ کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے بھائیوں سے شدید محبت کرتا ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ میرا بھائی خسرو ایک مجبور انسان پر اس طرح تشدد کرے اور اس کی بددعاؤں کے نتیجے میں وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے۔ خسرو، پرویز اور شہریار میں سے کسی کو بھی یہ راز نہیں معلوم کہ میں نے ان کے ذلت آمیز سلوک پر مبارک شاہ سے معافی مانگی تھی۔ عالم پناہ! اہلِ اقتدار کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کمزور انسانوں پر اپنی طاقت آزماتے پھریں۔ ظلِ الٰہی نہیں جانتے کہ مبارک شاہ کس قدر لاغر و نحیف شخص ہے، وہ غرور و تکبر میں ڈوبی ہوئی ٹھوکر کا مستحق نہیں۔ اسے تو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ دن رات اپنے کمزور ہاتھوں کو پھیلائے رہے اور اپنے شہنشاہ کی بلند اقبالی کے

لئے دعائیں کرتا رہے۔"

"ہم اُس کی دعاؤں کے محتاج نہیں۔" اچانک جہانگیر کو رات کا وہ خواب یاد آ گیا تھا، جس میں ایک شکستہ حال شخص، جہانگیر کا سر کاٹ کر خرم کو پیش کر رہا تھا۔ "تُو نہیں جانتا خرم! کہ مبارک شاہ کون ہے۔ عنقریب ہم تجھ پر اس کی حقیقت ظاہر کر دیں گے۔ مبارک شاہ ہمارے قہر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

خرم نے بڑے عاجزانہ لہجے میں مبارک شاہ کی جاں بخشی کی درخواست کی مگر جہانگیر نے خرم کی التجا کا غلط مفہوم لیا۔

"تیری یہ درخواست ثابت کر رہی ہے کہ تُو اس بھکاری کا طرف دار ہے۔ اگر تجھے اقتدار کی خواہش نہ ہوتی تو اس طرح ایک فقیر کی وکالت نہیں کرتا۔ خرم! تُو نے ہمیں بہت مایوس کیا۔ اب اسی میں بہتری ہے کہ تُو ہماری نظروں سے دُور ہو جا۔"

خرم، مجرموں کی طرح سر جھکائے بارگاہِ شاہی سے نکل گیا۔ خسرو، پرویز اور شہریار اپنی اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔

پھر کچھ دیر بعد ہی جہانگیر نے اپنا آمرانہ حکم جاری کر دیا۔ "آگرے کے ایک بھکاری، مبارک شاہ کو گرفتار کر کے کل دربار میں ہمارے روبرو پیش کیا جائے۔"

قلندر کا گرفتار کرنا ہی کیا؟ چار مسلح سپاہی گئے اور مبارک شاہ کو زنجیریں پہنا دی گئیں اور زنداں کے اندھیروں میں ڈال دیا گیا۔

۞.....۞.....۞۞

ارجمند بانو نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح مبارک شاہ کی گرفتاری کی خبر سنی اور اسے یوں محسوس ہوا، جیسے خود اس کے کسی قریبی عزیز کو زنجیریں پہنا دی گئی ہیں۔ وہ مبارک شاہ پر نازل ہونے والے عتاب کی وجہ جاننے کے لئے بے قرار تھی۔ پھر جیسے ہی ارجمند کو رات کے وقت خرم سے ملاقات کا موقع ملا۔ اس نے شہزادے سے پہلا سوال یہی کیا۔

"قلندر جیسے بے ضرر انسان کو کس لئے گرفتار کیا گیا ہے؟"

شہزادہ خرم بہت اُداس تھا۔ اس نے بڑے افسردہ لہجے میں ارجمند بانو کو پورا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ "قلندر کو زنداں میں ڈال دیا گیا ہے اور میں بارگاہِ شاہی میں معتوب ٹھہرا ہوں۔ شہنشاہ نے خسرو کے جارحانہ اقدام کی بہت تعریف کی ہے اور مجھے اشرفیاں تقسیم کرنے کے صلے میں مجرم قرار دیا گیا ہے۔ عالم پناہ کا ارشاد ہے کہ میں اقتدار کا لالچی ہوں اور ان کی موت کی دعائیں کر رہا ہوں۔"

خرم کی زبانی یہ انکشاف سن کر ارجمند کے ہوش اُڑ گئے۔ پھر اُس نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "شہنشاہ تک قلندر کے الفاظ کس نے پہنچائے ہیں؟"

"خسرو نے یا پھر پرویز اور شہریار نے۔" خرم بہت دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ "ظلِ الٰہی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان کی نظروں سے دور رہوں۔ یہ کیسے فیصلے ہیں ارجمند؟ سلطنت کے بد خواہ اچانک محبوب بن گئے اور محبوب، معتوب قرار پائے۔" خرم کے ایک ایک لفظ سے اس کے دل کا خون رِس رہا تھا۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ قصرِ شاہی کی جھوٹی آرائشوں کو آگ لگا کر کسی ویرانے میں چلا جاؤں۔"

یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ ایسی اذیت ناک ساعتوں میں ارجمند اپنے آپ کو شہزادے سے دُور نہ رکھ سکی اور تمام فاصلے ختم ہو گئے۔ ارجمند نے شکستہ دل خرم کو اپنے ریشمی آنچل میں چھپا لیا۔

"عالم پناہ نے میری محبت و وفاداری کا کیسا عجیب صلہ دیا ہے ارجمند!" خرم کی آواز سے رقت جھلک رہی تھی۔ "ظلِ الٰہی نے غدار خسرو کے کہنے پر مجھے بارگاہِ شاہی سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔" یہ کہتے کہتے خرم رونے لگا۔ "آج مجھے شاہ بابا (اکبرِ اعظم) بہت یاد آ رہے ہیں۔ اگر شاہ بابا ہوتے تو میرے چہرے پر رنج والم کا ہلکا سا سایہ دیکھ کر بے قرار ہو جاتے۔"

خرم کے آنسوؤں سے ارجمند کا آنچل بھیگنے لگا تھا۔ "کیا شاہ بابا کے علاوہ تمہیں اُداس دیکھ کے بے چین ہو جانے والا کوئی دوسرا نہیں ہے؟" ارجمند نے لرزتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"ہاں! ایک اور ذات بھی ہے۔" خرم نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"کون ہے وہ؟" ارجمند نے پوچھا۔

"اس وقت میں اس کے پاس موجود ہوں۔" خرم نے کہا۔ "اگر اس کی قربت حاصل نہ ہوتی تو شاید میرا دم گھٹ جاتا۔ مجھے یہاں سے دُور لے چلو، ارجمند! میں اس دنیا میں رہنا نہیں چاہتا۔ ہر لمحے اہلِ وفا کا اعتبار قتل ہوتا ہے۔ اور بے وفا، عالمِ سرمستی میں رقص کرتے ہیں۔"

"کیا میری محبت کو آزمانا چاہتے ہو خرم؟" آج پہلی بار ارجمند نے اپنے محبوب کو اس کا نام لے کر پکارا تھا۔

خرم کو محسوس ہوا جیسے تپتے ہوئے صحرا میں موجِ نسیم نے اس کا بدن چھو لیا ہو اور پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں اس کے جلتے ہوئے سر پر سایہ فگن ہو گئی ہوں۔

"نہیں ارجمند! تمہاری محبت ہر آزمائش سے بالاتر ہے۔" خرم نے ارجمند کی حنائی اُنگلیوں کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اگر میرا امتحان مقصود ہے تو میں تمہاری ایک جنبشِ لب پر قصرِ شاہی کی بڑی سے بڑی نعمت ٹھکرا سکتی ہوں۔ لیکن میری التجا ہے کہ مجھے ایسا حکم کبھی نہ دیجئے گا۔" ارجمند کا لہجہ بڑا عاجزانہ تھا۔

"کیوں؟" خرم کا دل ٹھہرنے لگا تھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ اہلِ دنیا میری جانب اُنگلیاں اُٹھائیں اور چیخ چیخ کر کہیں کہ وہ جا رہی ہے ارجمند، جس کی محبت نے خرم جیسے جوانمرد فاتح کو ایک شکست خوردہ عاشق بنا دیا۔'' ارجمند کے لہجے میں دل کی خلش بھی تھی اور بلند حوصلوں کی آگ بھی۔ ''اب میں ایک ہی دعا کرتی ہوں صاحبِ عالم کہ خدا آپ کو ہر محاذ پر سربلند رکھے۔ اگر مجھ سے جدائی کی شرط پر بھی آپ کو اقتدار حاصل ہو سکتا ہے تو آپ میری یادوں کو فراموش کر دیں۔ مگر سازشوں کی یلغار سے گھبرا کر اپنی منزل کو ترک نہ کریں۔''

''نہیں ارجمند! یہ ناممکن ہے۔'' شہزادہ خرم کا لہجہ بدل گیا۔ ''جس محفل میں ارجمند موجود نہ ہو، ہم اسے قبرستان سمجھتے ہیں۔''

''اگر مجھ سے محبت ہے تو میرا حریری آنچل چھوڑ دیجئے صاحبِ عالم!'' ارجمند اپنی ضد پر قائم تھی۔ ''ان ہاتھوں میں صرف تلوار ہی زیب دیتی ہے۔ وہ تلوار، جو مظلوموں کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے ظالموں کی شہ رگ کاٹ دے۔''

ارجمند کی باتوں نے خرم کو بڑا سہارا دیا اور وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔

۞.....۞.....۞

دوسرے دن مبارک شاہ قلندر کو دربار میں پیش کیا گیا۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک لاغر و نحیف انسان کو دیکھ کر اہلِ دربار حیران رہ گئے۔ قلندر بڑی بے نیازی کے ساتھ دربار میں داخل ہوا تھا۔ سپاہیوں نے اسے جہانگیر کے سامنے سجدہ کرنے کے لئے کہا تو مبارک شاہ برہم ہو گیا۔

''میں تو ایک خدا کو سجدہ کر چکا۔ پھر یہ درمیان میں کون ہے؟'' مبارک شاہ نے جہانگیر کے جاہ و جلال کو یکسر جھٹلا دیا تھا۔

''یہ دربارِ جہانگیر ہے۔'' شہنشاہ کی قہرناک آواز گونجی۔ ''یہاں کوئی شخص سجدہ کئے بغیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔''

''میں تیری تراشی ہوئی رسموں کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہوں۔'' مبارک شاہ کا لہجہ نہایت گستاخانہ تھا۔

''اسے سجدے میں جھکا دو۔'' جہانگیر نے حکم دیا۔ ''جب تک یہ سجدے کے لئے آمادہ نہ ہو جائے، اس پر تشدد کرتے رہو۔''

اس حکم کے ساتھ ہی مبارک شاہ کے جسم پر تازیانے برسنے لگے۔ کمزور جسم چند لمحوں میں لہولہان ہو گیا مگر مبارک شاہ کی نہ کوئی چیخ بلند ہوئی اور نہ اس کا سر جھکا۔ یہاں تک کہ دربارِ شاہی، قلندر کے خون سے سرخ ہونے لگا۔

''اسے جبراً سجدے میں جھکا دو۔'' جہانگیر نے دوسرا حکم دیا۔

شاہ کے ہونٹوں کی جنبش کے ساتھ ہی چند سپاہیوں نے مبارک شاہ کی خون آلود پیشانی کو دربار کے فرش پر جھکا دیا۔

قلندر پھر کھڑا ہو گیا۔ ''میرا خدا خوب دیکھ رہا ہے کہ یہ سجدہ نہیں ہے۔'' مبارک شاہ کے اس ایک جملے نے جہانگیر کے اقتدار کی نفی کر دی تھی۔

''تُو نے ہماری سلطنت فروخت کر دی؟'' جہانگیر کو اپنا وہ خواب یاد آ گیا تھا، جس میں ایک بدحال شخص اُس کا سر کاٹ کر شہزادہ خرم کو پیش کر رہا تھا۔

''میں کون ہوتا ہوں کوئی چیز فروخت کرنے والا۔'' مبارک شاہ نے اپنے زخمی جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کے دونوں ہاتھ خون سے رنگین ہو گئے تھے۔ ''زمین کا مالک خدا ہے۔ وہ جسے چاہے، اس کی ملکیت بخش دے۔'' پھر قلندر نے اپنے خون آلود ہاتھوں کو بہت غور سے دیکھا۔ ''خدا کی قسم! اگر تجھے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے نسبت نہ ہوتی تو اس موجِ خوں میں تیرے محلات کو غرق کر دیتا۔''

''اسے ہمارے سامنے سے لے جاؤ۔'' جہانگیر نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''اور اس وقت تک زندان میں رکھو، جب تک یہ ہمیں اپنی مرضی سے سجدہ نہ کرے۔''

مبارک شاہ جاتے جاتے اچانک مڑا اور ہندوستانی فرمانروا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''جہانگیر! تُو میرے سجدے کی تمنا لئے ہوئے قبر میں پہنچ جائے گا۔ تیری پوری فوج میں بھی اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مجھے زنجیر پہنا سکے۔ میں تو اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں، صرف تجھے متنبہ کرنے کے لئے کہ گناہوں سے باز آ جا اور اپنے دربار سے سجدے کی رسم اٹھا دے ورنہ تیرا انجام بڑا عبرت ناک ہو گا۔''

''پہلے اپنی حالت پر نظر ڈال۔ پھر میرے انجام کے بارے میں سوچنا۔'' جہانگیر کے ایک ایک لفظ سے انتہائی غرور و تکبر کا اظہار ہو رہا تھا۔

۞.....۞.....۞

شہزادہ خسرو اور اس کے ہم نوا بہت خوش تھے کہ شہزادہ خرم، شہنشاہ کی نظروں سے گر چکا تھا اور یہ کام آگرے کے ایک بھکاری، مبارک شاہ نے انجام دیا تھا۔ پھر وہ بھکاری بھی زنداں کی تاریکیوں میں پہنچ گیا تھا اور خسرو دوبارہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ جہانگیر نے اس کے ماضی کو نظرانداز کر دیا ہے اور اب وہ مکمل طور پر آزاد ہے۔ بالآخر اسی سوچ نے خسرو کو نئی سازش کا منصوبہ ترتیب دینے پر اُکسایا۔

شہزادہ خسرو فطرتاً ایک خودغرض اور کینہ پرور انسان تھا۔ خسرو، راجہ اودے سنگھ کی لڑکی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور راجہ مان سنگھ اُس کا ماموں تھا۔ خسرو، شہزادہ خرم سے تین سال بڑا تھا۔ شہنشاہ اکبر اور جہانگیر دونوں شہزادہ خرم سے بے حد محبت کرتے تھے، اس لئے خسرو، خرم سے

بہت زیادہ حسد رکھتا تھا۔ خسرو کی کمینگی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے باپ جہانگیر کی شان میں بھی گستاخیاں کرتا رہتا تھا۔ جہانگیر نے ہمیشہ یہ سمجھ کر اس کی حرکتوں کو نظرانداز کیا کہ خسرو ابھی بچہ ہے۔ مگر وہ بچہ پیدائش سے ہی عیار اور نافرمان تھا۔ جب بھی اسے موقع ملتا، وہ اکبر سے جہانگیر کی شکایت کرتا اور دادا کو باپ کے خلاف مسلسل بھڑکاتا رہا۔ خسرو کی ماں اسے اس قسم کی حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتی تھی، مگر اس نے اپنی ماں کی باتوں پر بھی کوئی دھیان نہیں دیا۔ آخر بیٹے کی ان ہی دل آزاریوں نے خسرو کی ماں کو جنون کے مرض میں مبتلا کر دیا اور پھر ایک دن اس حساس عورت نے دیوانگی کی حالت میں افیم کھا کر خودکشی کر لی۔

حالانکہ خسرو ایک اعتبار سے اپنی ماں کا قاتل تھا، مگر اُسے ماں کی موت کا ذرا بھی غم نہیں ہوا اور وہ اسی طرح اکبر کو اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بھڑکاتا رہا۔ یہاں تک کہ اکبر بیمار ہو گیا۔ خسرو کا ماموں، راجہ مان سنگھ اور عزیز کوکا، جہانگیر کو تخت نشینی سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ ان دونوں کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح خسرو، تاجِ شاہی پہن لے۔ مگر شہنشاہ اکبر نے اپنی موت سے چند روز قبل جہانگیر کو تخت نشیں کر دیا اور خسرو کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔

پھر بھی جہانگیر ایک باپ تھا۔ بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر اس نے خسرو کو دربار میں بلایا، بڑی شفقت سے پیش آیا اور خسرو کو اپنی مرضی کا محل تعمیر کرنے کے لئے خطیر رقم دی تاکہ اس طرح اس کے غم کا ازالہ ہو سکے۔ مگر وہ اب بھی بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ خسرو کم ظرف تھا، اس لئے باپ کی نوازشات کو غلط رنگ دیا اور درپردہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے سازشیں کرنے لگا۔ خسرو نے اپنی حکومت قائم ہو جانے کے بعد بہت سے نااہل لوگوں کو مراعات دینے کا اعلان کیا تھا۔ نتیجتاً حریص لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کے گرد جمع ہو گئی تھی۔

پھر دن رات کے اندھیرے میں خسرو چند سپاہیوں کے ہمراہ قلعہ کے امر سنگھ دروازے کی طرف بڑھا۔ محافظوں نے اس بے وقت روانگی کا سبب پوچھا تو خسرو نے بڑی دردناک آواز میں کہا۔

''مجھے آج شاہ بابا (اکبرِاعظم) کی بہت یاد آ رہی ہے۔ میں اُن کے مقبرے پر حاضری دینے جا رہا ہوں تاکہ میرے بے قرار دل کو کچھ سکون حاصل ہو سکے۔''

قلعے کے محافظ، شہزادہ کی کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ خسرو تیزی سے باہر آیا۔ قلعے سے کچھ فاصلے پر تقریباً چار سو مسلح سپاہی، خسرو کا انتظار کر رہے تھے۔ شہزادہ کے آتے ہی یہ سب کے سب ایک طرف روانہ ہو گئے۔

❁.....❁.....❁

دوسرے دن صبح اچانک جہانگیر نے شہزادہ خسرو کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ شہنشاہ اس سے مبارک شاہ قلندر کے بارے میں مزید کچھ باتیں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ دراصل جہانگیر کے

دل پر اس وقت قلندر کی ہیبت طاری ہو گئی تھی، جب اس نے شدید زخمی ہو جانے کے باوجود شہنشاہ کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ یہ بڑی خوف ناک علامت تھی۔ پورے ہندوستان میں صرف دو آدمی ایسے تھے، جنہوں نے بادشاہ کے آگے سجدہ ریز ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانیؒ) تھے جو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں زنداں کے حوالے کر دیئے گئے تھے مگر جہانگیر نے انہیں کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ دوسرا شخص مبارک شاہ قلندر تھا، جس نے سجدے کی رسم سے کھلی ہوئی بغاوت کر دی تھی۔ شاید جہانگیر، قلندر کو بھی جسمانی سزا نہ دیتا۔ لیکن قلندر کے اس اعلان نے شہنشاہ کو غضب ناک بنا دیا تھا۔

''میں نے خدا کے حکم سے ہندوستان کے تخت و تاج شہزادہ خرم کے ہاتھوں فروخت کر دیئے۔''

اس اعلان کی گونج نے جہانگیر کو دو راتوں سے سونے نہیں دیا تھا۔ اس وقت بھی اس کی سماعت میں قلندر کے الفاظ گونج رہے تھے اور اسی گونج سے گھبرا کر اس نے شہزادہ خسرو کو مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے طلب کیا تھا۔ اس طلبی کے جواب میں قلعہ کے محافظوں نے صاف صاف بتا دیا کہ شہزادے رات کے پچھلے پہر عرش آشیانی شہنشاہ اکبر کے مزار پر حاضری دینے گئے ہیں۔ جہانگیر مطمئن ہو کر خسرو کا انتظار کرنے لگا۔

مگر جب شہنشاہ کی وحشت بڑھی تو اس نے ارسلان بیگ کو تنہائی میں طلب کر کے پوچھا۔

''اس بھکاری، مبارک شاہ نے اور کیا کیا تھا؟''

ارسلان بیگ نے انتہائی لفاظی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''وہ شہزادہ خسرو کو اندھا کہہ کر پکار رہا تھا اور باقی دونوں شہزادوں کے حق میں بھی دردناک موت کی دعا کر رہا تھا۔''

''اس گداگر کی یہ جرأت کہ وہ ہمارے دل کے ٹکڑوں کی تباہی کے لئے بددعائیں کرے۔'' جہانگیر کا لہجہ نفرت و قہر کی آگ میں جل رہا تھا۔ ہم اس زبان ہی کو کاٹ کر پھینک دیں گے، جس سے بددعائیں برستی ہیں اور گستاخی و نافرمانی کے کلمات ادا ہوتے ہیں۔''

''بس وہ شہزادہ خرم پر مہربان نظر آتا ہے۔'' ارسلان بیگ نے اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے شہزادہ خرم کے خلاف مزید زہرافشانی کی۔ ''وہ بار بار شہزادۂ عالم کے سر پر اپنے غلیظ ہاتھ پھیر رہا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، تاجِ شاہی تیرا انتظار کر رہا ہے۔ اُٹھ اور آگے بڑھ کر اسے حاصل کر لے، عنقریب.....'' ارسلان بیگ نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

''عنقریب سے تیرا کیا مفہوم ہے؟'' جہانگیر نے چونک کر کہا۔

''خداوند! اس گناہ گار میں آگے بیان کرنے کی ہمت نہیں ہے۔'' ارسلان بیگ کی آواز لرز رہی تھی۔

''ہم نے تیری جان بخش دی۔'' جہانگیر گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ''وہ تو اس بھکاری کے الفاظ

ہیں۔ تجھ پر کوئی عذاب نازل نہیں ہوگا۔"

ارسلان بیگ نے ڈرتے ڈرتے مبارک شاہ قلندر پر تہمت لگائی۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ عنقریب شہنشاہ جہانگیر دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔" ارسلان بیگ نے ایک خوف ناک جھوٹ بولا۔

اپنی موت کا ذکر سن کر چند لمحوں کے لئے جہانگیر کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ "وہ ہماری موت کی دعائیں کر کے شہزادہ خرم کو تاج پہنانا چاہتا ہے۔" جہانگیر کا لہجہ ایک بار پھر غضب ناک ہو گیا تھا۔ "مگر اُس کی یہ حسرت پوری نہیں ہو گی۔ یہ منظر دیکھنے کے لئے ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" یہ کہہ کر جہانگیر نے اپنے محافظوں کو طلب کیا اور انہیں حکم دیتے ہوئے کہا۔ "داروغۂ زنداں سے کہو کہ اس بھکاری کو ہمارے روبرو پیش کرے۔"

"مجرم کو سرِ دربار پیش کیا جائے یا خلوت گاہِ شاہی میں؟" محافظوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم اس سے تنہائی میں ملیں گے۔" جہانگیر پہلے مبارک شاہ قلندر کو دربار میں طلب کرنا چاہتا تھا مگر پھر یہ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا کہ قلندر سینکڑوں اُمراء کی موجودگی میں ہذیان بکے گا اور اُس کی اس حرکت سے وقارِ شاہی کو ٹھیس پہنچے گی۔ مجبوراً جہانگیر نے قلندر کو تنہائی میں طلب کیا۔ اس دوران ارسلان بیگ کو خلوت گاہ سے رخصت کر دیا گیا اور جہانگیر بے چینی کے ساتھ اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

جس قید خانے میں مبارک شاہ قلندر کو رکھا گیا تھا، وہ آگرے کے قلعے کے اندر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ قید خانہ، قلعے کے ایک گوشے میں تھا، جہاں زیرِ زمین بہت سی تنگ کوٹھریاں بنائی گئی تھیں۔ ان کوٹھریوں میں خصوصاً ان مجرموں کو رکھا جاتا تھا، جن کے جرائم سنگین نوعیت کے ہوتے تھے۔ ہر تہہ خانے کے باہر ہی دروازے پر بیک وقت کئی مسلح سپاہی پہرہ دیتے تھے اور یہ ساری تدابیر محض اس لئے تھیں کہ مجرموں پر ہر وقت کڑی نظر رکھی جا سکے۔ مبارک شاہ قلندر کو بھی اسی تہہ خانے کی ایک کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد داروغۂ زنداں بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا آیا اور جہانگیر کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگا۔

"عالم پناہ! وہ بھکاری اپنی کوٹھری میں موجود نہیں ہے۔"

جہانگیر یہ خبر سن کر حیران رہ گیا۔ "پھر وہ کہاں گیا؟" جہانگیر کی آواز میں غصہ بھی شامل تھا اور دہشت بھی۔

"اُس کے پیروں کی زنجیریں فرش پر پڑی ہیں اور کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔" داروغۂ زنداں بدستور جہانگیر کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا۔

"کیا تُو نے دروازے میں قفل نہیں لگایا تھا؟" جہانگیر نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

"ظلِ الٰہی! کھلا ہوا قفل بھی زمین پر پڑا ہے۔" داروغۂ زنداں نے کانپتی ہوئی آواز میں صورتِ حال کی وضاحت کی۔

جہانگیر کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا اور پھر داروغۂ زنداں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "کیا کل رات اس بھکاری سے ملنے کوئی آیا تھا؟"

"صاحبِ عالم! شہزادہ خرم تشریف لائے تھے۔" داروغۂ زنداں نے جواباً عرض کیا۔ "پھر وہ مبارک شاہ کے زخموں پر مرہم رکھ کر چلے گئے تھے اور میں نے خود اپنے ہاتھوں سے دروازے میں قفل لگایا تھا۔"

"تُو نے خرم کو اس بھکاری کے پاس کیوں جانے دیا؟" جہانگیر کا لہجہ ایک بار پھر غضب ناک ہو گیا تھا۔

"وہ صاحبِ عالم ہیں۔ آپ کے حکم کے بغیر اُنہیں کیسے روکا جا سکتا تھا؟" داروغۂ زنداں نے توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

جہانگیر خاموش ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر یکایک تیز آواز میں بولا۔ "ہم خود اپنی آنکھوں سے اس کوٹھری کو دیکھیں گے، جس سے وہ بھکاری فرار ہوا ہے۔"

داروغۂ زنداں کے جسم پر مسلسل لرزہ طاری تھا اور وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔

پھر جب شہنشاہ جہانگیر، تہہ خانے کی سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچا تو مبارک شاہ قلندر وہاں موجود تھا۔ اسی طرح زنجیریں پہنے اور سر جھکائے بیٹھا تھا۔

جہانگیر نے قہر آلود نظروں سے داروغۂ زنداں کی طرف دیکھا۔

"ظلِ الٰہی کے جاہ و جلال کی قسم! یہ شخص ابھی کچھ دیر پہلے یہاں موجود نہیں تھا۔" شدید وحشت کے سبب داروغۂ زنداں کی زبان کے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ "قید خانے کا ایک ایک محافظ میرے اس بیان کی صداقت پر گواہی دے سکتا ہے۔"

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ تمام محافظوں نے لڑکھڑاتی ہوئی آوازوں میں داروغۂ زنداں کے بیان کی تصدیق کی۔

مختلف آوازوں کا شور سن کر مبارک شاہ نے سر اُٹھایا۔ اُس کا پورا جسم سفید کپڑے کی پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ جہانگیر سمجھ گیا کہ یہ شہزادہ خرم کی چارہ سازی کا نتیجہ ہے۔

جہانگیر کے حکم پر کوٹھری کا دروازہ کھول دیا گیا اور شہنشاہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا قلندر کے پاس پہنچ گیا۔ مبارک شاہ غیر متوقع طور پر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قلندر کے اس عمل پر جہانگیر کو بڑا تعجب ہوا تھا۔

شہنشاہ کو حیرت زدہ دیکھ کر مبارک شاہ نے کہا۔ "آخر تُو ہمارا امیر ہے اور امیر کا اس قدر احترام جائز ہے کہ ایک مسلمان اسے دیکھ کر کھڑا ہو جائے۔"

قلندر کے اس طرزِ عمل سے جہانگیر کا غصہ سرد ہو گیا تھا۔

''مبارک شاہ! اگر تُو ہمیں دربار کے بجائے اس کوٹھری میں سجدہ کر لے تو ہم تجھ پر اتنے مہربان ہو جائیں گے کہ تُو ہماری نوازشوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

قلندر بڑے استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔ ''جہانگیر! ہم یہاں سے چلے گئے تھے، مگر اس خیال سے واپس آ گئے کہ ہمارے اس اقدام سے بے گناہ محافظ مارے جائیں گے۔''

جہانگیر پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

''تیری یہ کاغذ کی بنائی ہوئی دیواریں ہمارا راستہ نہیں روک سکتیں۔'' مبارک شاہ نے زنداں کی سنگی دیواروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ زنجیریں.....؟'' قلندر نے اپنے پیروں کو جنبش دی تو لوہے کی زنجیریں بج اُٹھیں اور کوٹھری میں عجیب سی آوازیں گونجنے لگیں۔ ''یہ کچے دھاگوں سے بنی ہوئی زنجیریں ہمارے قدموں کو کیسے جکڑ سکتی ہیں؟'' قلندر کے لہجے میں بڑا جلال تھا۔ ''ہم نے یہ بات طے کر لی تھی کہ آج ایک موجِ خوں تیرے محلات کے اوپر سے گزار دیں گے۔ مگر اپنے محبوب، خرم سے مجبور ہو گئے۔ کل رات وہ آیا تھا اور اس نے ہمارے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے التجا کی تھی کہ اس کے باپ کو معاف کر دیا جائے۔ ہم اُس کی بات ٹال نہیں سکتے تھے۔ آخر وہ ہمارا محبوب ہے۔ بس اب یہاں سے جا کہ تیرا وجود ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔'' یہ کہہ کر قلندر نے منہ پھیر لیا۔

جہانگیر پتھر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک ساکت کھڑا رہا اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے قلندر کی پشت کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ واپس جانے کے لئے مڑا۔ یکایک مبارک شاہ کی آواز دوبارہ گونجنے لگی۔

''ہمارے محبوب کی دل آزاری نہ کرنا کہ خرم صرف ہمارا ہی نہیں، ہندوستان کے تمام اولیاء کا محبوب ہے۔''

جہانگیر تھکے تھکے قدموں سے واپس چلا گیا۔ آج اسے آگرے کے ایک بھکاری نے بڑی عبرت ناک شکست دی تھی۔ جہانگیر، قلندر کو جھکانے کے لئے اس پر مزید تشدد کرنا چاہتا تھا، مگر آج کے واقعہ نے اسے مبارک شاہ کی طرف سے بہت زیادہ خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا تھا۔ جہانگیر ایک مادہ پرست حکمراں تھا، اس لئے مبارک شاہ کی روحانی قوتوں کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ قید خانے سے غائب ہونے کے واقعے کی اس نے یہی توجیہہ کی کہ مبارک شاہ بھی ہندوستان کے دوسرے شعبدہ بازوں کی طرح ایک جادوگر ہے۔ اور اب وہ اس جادوگر کا علاج کرنا چاہتا تھا۔

۞.....۞.....۞

قید خانے سے نکل کر جہانگیر براہِ راست دربار پہنچا تھا اور تخت پر بیٹھتے ہی اس نے دو احکام جاری کئے تھے۔ ایک یہ کہ جیسے ہی خسرو، شاہی محل میں داخل ہو، اسے دربار میں بھیج دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ گیانی آتمارام، درباری اوقات کے بعد شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا مگر شہزادہ خسرو ابھی تک شاہی محل کی طرف واپس نہیں لوٹا تھا۔ جہانگیر نے یہ خبر سنتے ہی اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ شہزادہ خسرو کو تلاش کریں۔ کہیں اُسے کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔

حکمِ شاہی پاتے ہی کئی تیز رفتار شہ سوار، اکبرِ اعظم کے مقبرے کی طرف روانہ ہو گئے اور پھر کوئی ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد انہوں نے جہانگیر کو اطلاع دی کہ شہزادہ خسرو، عرش آشیانی کے مزار پر موجود نہیں ہیں۔ (مرنے کے بعد شہنشاہ اکبر کو عرش آشیانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا)

یہ سن کر جہانگیر کو تشویش ہوئی اور اس نے دوسرا حکم جاری کر دیا کہ سپاہیوں کا ایک دستہ آگرے کے اطراف میں پھیل جائے اور گوشے گوشے میں شہزادہ خسرو کو تلاش کیا جائے۔

دربار کے برخاست ہونے تک شہزادہ خسرو کی کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ اب جہانگیر کی ذہنی پریشانی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ وہ دربار سے اُٹھ کر سیدھا اپنی خلوت گاہ پہنچا، جہاں درباری مطربہ اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

''انجمن! ہمارے سکونِ قلب کا انتظام کر۔ اس وقت ہم شدید اضطراب کا شکار ہیں۔'' جہانگیر نے مطربہ کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

انجمن آراء نے فوراً ہی شاہ کی خدمت میں ایک لبریز جامِ سرخ پیش کیا۔ مشروب سے ہونٹ اور حلق تر کرنے کے بعد جہانگیر نے کہا۔

''انجمن! شہزادہ خسرو رات سے غائب ہے۔ وہ عرش آشیانی کے مزار پر حاضری دینے گیا تھا، مگر ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔''

''عالم پناہ اپنے ذہن کو ہر فکر سے آزاد رکھیں۔'' انجمن آراء نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''شہزادہ عالم، شکار کے بہت شوقین ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ جنگلی جانوروں کے تعاقب میں کچھ دُور نکل گئے ہوں۔''

جہانگیر کو انجمن کی باتوں سے کسی قدر سکون ہوا۔ اسی دوران محافظِ خاص نے اطلاع دی کہ گیانی آتمارام شرفِ باریابی چاہتا ہے۔

یہ سن کر انجمن اُٹھنے لگی تو جہانگیر نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔

''تُو ہماری خلوتوں کی رازدار ہے۔ پھر کہاں جا رہی ہے؟ بیٹھ جا کہ تیری صورت دیکھ کر اور باتیں سن کر ہمارا دل بہل جاتا ہے۔''

انجمن آرا کو محسوس ہوا کہ جیسے کوئی زہریلا تیر اس کے دل میں پیوست ہو گیا ہو۔ وہ دل بہلانے کا ایک کھلونا تھی، مگر آج تک شاہ نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ خود اس کے سینے میں بھی دل ہے یا نہیں؟

ابھی انجمن اپنی حسرتوں کا خاموش ماتم کر ہی رہی تھی کہ گیانی آتمارام، جہانگیر کی مخصوص خلوت گاہ میں داخل ہوا اور ''اے پربھو (مالک) اے پربھو!'' کہتا ہوا سجدے میں گر گیا۔

"گیانی! ہم نے تیرا سجدہ قبول کیا۔" جہانگیر کی پُرجلال آواز اُبھری۔

آتمارام دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور سوالیہ نظروں سے فرمانروائے ہند کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہم نے تجھے اس لئے طلب کیا ہے کہ ہماری مملکت میں ایک اور جادوگر پیدا ہو گیا ہے۔" جہانگیر نے مبارک شاہ کی طرف غائبانہ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تُو اپنے گیان سے اُس کی تمام ساحرانہ قوتیں سلب کر لے اور پھر اسے دربار میں لا کر سب کے سامنے ہمارے قدموں میں جھکا دے۔ وہ شدید زخمی ہو جانے کے باوجود ہمیں سجدہ کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ اور اُس کی شعبدہ بازی کا یہ حال ہے کہ قید میں رہ کر بھی وہ محافظوں کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔"

گیانی کے چہرے پر اچانک غرور و تکبر کا گہرا رنگ جھلکنے لگا۔

"سمراٹ کے حکم کی دیر ہے۔ آتمارام کے ہوتے ہوئے ہندوستان میں کوئی دوسرا جادوگر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مہاراج اپنی خواہش کا اظہار کریں کہ مبارک شاہ کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں یا اس کی بے سہارا لاش؟" گیانی بڑے خوف ناک دعوے کر رہا تھا۔

"ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں سرِ دربار سجدہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔" جہانگیر ایک عجیب سی اذیت میں مبتلا تھا۔ "اس نے اُمراء کے سامنے سجدے سے انکار کر کے ہماری توہین کی ہے۔ ہم اس جرم میں اُسے قتل بھی کر سکتے تھے، مگر اُس کی موت سے ہمیں سکونِ قلب حاصل نہیں ہو گا۔ ہم ہر حال میں اس کا جھکا ہوا سر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ایسا ہی ہو گا پربھو!..... ایسا ہی ہو گا۔" گیانی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر قید خانے کی طرف جا اور اسے لا کر ہمارے سامنے جھکا دے۔" جہانگیر نے آتما رام کو حکم دیا۔

آتمارام ایک محافظ کے ساتھ تیز رفتاری سے زنداں کی جانب بڑھا۔ وہ زیرِ لب اپنے کسی منتر کا وِرد کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی آتمارام، قلندر کی کوٹھری کے قریب پہنچا، اُس کے منہ سے دردناک چیخیں نکلنے لگیں۔ "ارے..... یہ کیسی آگ ہے؟..... میرا پورا بدن پھنکا جا رہا ہے۔ میں جل کر راکھ ہو جاؤں گا۔"

اگرچہ مبارک شاہ قلندر سے آتمارام کا سامنا نہیں ہوا تھا، لیکن پھر بھی وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ "اے بھگوان! اپنے اس پجاری کو بچا لے..... یہ کیسی آگ ہے؟"

داروغۂ زنداں بار بار کہہ رہا تھا، آگرے کا وہ بھکاری اس کوٹھری کے اندر موجود ہے۔ مگر آتمارام آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ لرزتے ہوئے جسم اور چہرے کی اُڑی ہوئی رنگت کے ساتھ دوبارہ جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"پربھو! اس کوٹھری میں کوئی جادوگر نہیں۔ وہاں تو صرف آگ ہے۔"

جہانگیر نے داروغۂ زنداں کی طرف دیکھا۔

"ظلِ الٰہی! مبارک شاہ وہاں موجود ہے۔" داروغۂ زنداں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم میں سے کسی شخص نے وہاں کوئی شعلہ بھڑکتے ہوئے نہیں دیکھا اور کسی آگ کی تپش محسوس نہیں کی۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ گیانی آتمارام کس آگ سے خوف زدہ ہیں؟ یہ تو قلندر کی کوٹھری کے قریب پہنچے بھی نہیں تھے کہ انہوں نے "آگ، آگ" کہہ کر چیخنا شروع کر دیا تھا۔"

"گیانی! وہ تیرے دعوے کہاں گئے؟" اس صورتِ حال سے خود جہانگیر بھی پریشان نظر آ رہا تھا مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "تُو اس بھکاری کا سامنا کئے بغیر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ لعنت ہے تیرے ایسے گیان پر، جو ضرورت کے وقت ہمارے کسی کام نہیں آیا۔" یکایک جہانگیر کے لہجے سے نفرت و قہر کی آگ برسنے لگی۔ "اگر تُو سچا گیانی ہے تو یہاں بیٹھے بیٹھے اس آگ کو بجھا سکتا ہے۔"

"نہیں سمراٹ! وہ مجھ سے بڑا جادوگر ہے۔" آتمارام نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنے گیان کی پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے اس آگ کو بجھانے کی کوشش کی تھی، مگر اس کی تپش لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میں مہاراج کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دیتا ہوں کہ وہ بھکاری، سلطنتِ مغلیہ کے لئے بڑا خطرہ ہے۔ اگر قبل از وقت اس سے نجات حاصل نہیں کی گئی تو ہندوستان میں بھی کوئی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔"

"تیرے خیال میں ہمیں اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے؟" جہانگیر کے لہجے سے تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔

"اُسے بے دریغ قتل کرا دیا جائے۔" آتمارام نے اپنی شکست کو چھپانے کے لئے ایک گمراہ کن مشورہ دیا۔ "اس کے قتل کا کھلا ہوا جواز موجود ہے کہ وہ سمراٹ کو سجدہ نہیں کرتا۔"

"جب تُو اُس کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو گیا تو ہمیں ایک کمزور انسان کے قتل پر اُکساتا ہے۔" جہانگیر نے قہر آمیز لہجے میں کہا۔ "دُور ہو جا ہماری نظروں سے کہ ہمیں تیری شکل سے نفرت ہے۔ افسوس! ہم نے تیری شعبدہ بازیوں سے متاثر ہو کر تجھ پر اپنی نوازشات کی بے جا بارش کی۔ اس سے پہلے کہ تجھ پر ہمارا غضب نازل ہو جائے، آگرہ چھوڑ کر ہندوستان کے کسی ویران گوشے میں چلا جا۔ تیرے بقول اگر وہ بھکاری تجھ سے بڑا جادوگر ہے تو پھر اسی کو ہماری توجہ کا مستحق ہونا چاہئے۔ ہم باکمال لوگوں کی قدر کرتے ہیں اور تجھ جیسے ناکارہ انسانوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔"

جہانگیر کو اس قدر غضب ناک دیکھ کر گیانی آتمارام، شہنشاہ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

"پربھو! مجھے اپنے رحم و کرم کے سائے میں پڑا رہنے دیجئے۔ اگر میں یہاں سے چلا گیا تو لوگ مہابلی (اکبرِ اعظم) پر اعتراض کریں گے کہ ان کے نوازے ہوئے گیانی کو ذلت کے ساتھ

شہر سے نکال دیا گیا۔'' آتمارام نے بڑی عیاری کے ساتھ شہنشاہ اکبر کا نام لے کر اپنے آپ کو غضب شاہی سے بچانے کی کوشش کی۔ آتمارام خوب جانتا تھا کہ آگرے سے نکال دیئے جانے کے بعد اس کی زندگی تباہ ہو کر رہ جاتی اور پھر یہ سارے عیش و آرام ختم ہو جاتے۔ اور وہ ہندوستان کے لوگوں کی نظروں میں ایک لعنت زدہ انسان بن کر رہ جاتا۔

جہانگیر اپنے باپ کے حوالے کو مسترد نہ کر سکا اور اس نے یہ کہہ کر گیانی کو اپنی خلوت گاہ سے نکال دیا۔ ''اگر مہابلی (اکبرِ اعظم) کا نام درمیان میں نہ ہوتا تو ہم تجھے طوق رُسوائی پہنا کر دربدر پھراتے۔''

گیانی کے چلے جانے کے بعد جہانگیر نے داروغۂ زنداں کو حکم دیا۔

''مبارک شاہ سے کہو کہ وہ صرف ایک بار ہمیں تنہائی میں سجدہ کر لے، پھر ہم اسے نہ صرف آزاد کر دیں گے بلکہ گراں بہا انعام سے بھی سرفراز کریں گے۔''

داروغۂ زنداں نے واپس آ کر قلندر سے کہا۔

''عالم پناہ کی خواہش ہے کہ تم خاموشی کے ساتھ شہنشاہ کو صرف سجدہ کر لو۔'' اب داروغۂ زنداں بھی مبارک شاہ سے خوف زدہ نظر آنے لگا تھا اور اس کا گستاخانہ طرزِ کلام اچانک تبدیل ہو کر ادب کے دائرے میں آ گیا تھا۔

''عالم پناہ؟'' قلندر مسکرایا۔ ''تیرے بادشاہ کو خود تو پناہ حاصل نہیں، پھر وہ عالم کو کیا پناہ دے گا؟'' اگرچہ مبارک شاہ عام سے لہجے میں بول رہا تھا، لیکن اس کے لفظوں میں بڑا اجلال تھا۔

''تُو سجدے کی بات کرتا ہے، میں تو تیرے بادشاہ کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اگر مجھے اختیار ہوتا تو میں اس ملک کو چھوڑ کر کہیں دُور چلا گیا ہوتا..... لیکن کیا کروں کہ میرے پیروں میں فرائض کی زنجیر پڑی ہوئی ہے۔''

داروغۂ زنداں نے قلندر کا جواب شہنشاہ کو منتقل کر دیا، جسے سن کر جہانگیر کا چہرہ اُتر گیا۔

''اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔'' جہانگیر نے نیا حکم جاری کر دیا۔

''ظلِ الٰہی! مبارک شاہ نے تین دن سے غذا کا ایک لقمہ بھی نہیں کھایا ہے۔'' داروغۂ زنداں نے نیا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''پھر وہ کیا چاہتا ہے؟'' جہانگیر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مبارک شاہ کہتا ہے کہ اگر شہزادہ خرم کھانا پیش کریں گے تو وہ اسے قبول کر لے گا۔'' داروغۂ زنداں نے وضاحت کی۔

جہانگیر ایک تو شہزادہ خسرو کی غیر حاضری کی وجہ سے پریشان تھا، دوسرے مبارک شاہ قلندر نے اسے شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اسے خیال آیا کہ وہ مبارک شاہ کو قتل کرا کے اس سے نجات حاصل کر لے۔ مگر پھر فوراً ہی اس کے ذہن میں گیانی آتمارام کی ناکامی کا منظر اُبھر آیا۔ قلندر کو قتل کرانا بھی ایک مسئلہ بن کر رہ گیا تھا۔ مبارک شاہ کی تحقیر آمیز

گفتگو اور سرِ دربار سجدہ نہ کرنے سے شاہی وقار بری طرح مجروح ہوا تھا اور اب ایک نیا مسئلہ درپیش تھا کہ قلندر کئی دن سے بھوکا تھا۔

مجبوراً جہانگیر نے شہزادہ خرم کو خلوت گاہ میں طلب کر کے کہا۔ ''فرزند! ہمیں بہت دکھ ہے کہ تم نے ایک معتوب بھکاری کے زخموں پر اپنے ہاتھوں سے مرہم رکھا۔''

''ظلِ الٰہی! اگر مبارک شاہ، بھکاری ہوتا تو اب تک بھوکا نہ رہتا اور آپ کو سجدہ کر کے سونے چاندی کی روٹیاں کھا رہا ہوتا۔'' شہزادہ خرم نے باپ کے سامنے مبارک شاہ کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ بھکاری نہیں تو پھر کون ہے؟'' جہانگیر نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

''وہ قلندر ہے۔ اور ایک قلندر، خدا کے سوا کسی انسان کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا۔'' شہزادہ خرم نے بڑے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں نے اس کے زخموں پر مرہم اس لئے رکھا کہ وہ آپ کے حق میں دعائے خیر کرے۔ مبارک شاہ ایک جاں سوختہ شخص ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کی زبان سے ہماری سلطنت یا ہمارے خاندان کے لئے کوئی کلمۂ بد نہ نکل جائے۔ اگر وہ بھکاری ہوتا تو گیانی آتمارام جیسا شعبدہ باز اُس سے پناہ نہ مانگتا۔''

جہانگیر کو اب مبارک شاہ کی روحانی شخصیت کا ادراک ہو چلا تھا۔ پھر بھی اس نے خرم سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

''اہلِ دربار ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے کہ ہم ایک معمولی انسان سے شکست کھا گئے۔'' ابھی تک جہانگیر کا نفس اُسے فریب دے رہا تھا۔

''کوئی کچھ نہیں سوچے گا۔'' خرم نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ایک قلندر کے سجدہ نہ کرنے سے آپ کی ذات پر کیا اثر پڑے گا؟ پورا ہندوستان تو آپ کے آستانۂ جلال پر خم نظر آتا ہے۔''

جہانگیر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر بہت تھکے لہجے میں بولا۔ ''تو پھر جاؤ اور اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا دو۔''

خرم بہت خوش تھا۔ ایک طرف اسے شہنشاہ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت مل گئی تھی اور دوسرے قلندر، شاہی عتاب سے محفوظ ہو گیا تھا۔ خرم نے اپنے ہاتھ سے مبارک شاہ کو کھانا کھلایا۔ شہزادے کی اس مہمان نوازی پر قلندر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر مبارک شاہ نے کوٹھری کی چھت کی طرف دیکھا اور بڑے رقت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

''اے زمین و آسمان کے مالک! شہزادے کو دشمنوں کی سازشوں اور زمانے کے حادثوں سے محفوظ رکھ کہ اس کفرستان میں یہی ہماری آخری اُمید ہے۔''

.....

جہانگیر، خسرو کی طرف سے بہت پریشان تھا۔ شاہی جاسوس اور ہرکارے دُور دراز کے

علاقوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ مگر ابھی تک شہزادہ خسرو کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

تقریباً ایک ہفتے کے بعد جہانگیر کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ خسرو نے بغاوت کر دی ہے۔

خسرو رات کے پچھلے پہر قلعے سے نکلنے کے بعد سیدھا متھرا کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت اُس کے ساتھ تقریباً چار سو سپاہی تھے۔ جب خسرو، متھرا پہنچا تو حسین بیگ بدخشانی بھی اپنے تین ہزار شہسوار لے کر شہزادے سے آملا۔ اب خسرو کی اتنی طاقت ہو گئی تھی کہ وہ قرب و جوار کے علاقوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر سکے۔

خسرو نے حسین بیگ بدخشانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مکمل فتح حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے پاس فوجی طاقت کے ساتھ مالی وسائل بھی ہوں۔''

حسین بیگ بدخشانی نے جواباً کہا۔

''فی الحال یہی ممکن ہے کہ ہم مقامی لوگوں سے ان کی دولت چھین لیں اور خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دیں۔''

خسرو نے حسین بیگ کی تجویز سے اتفاق کیا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ خسرو کے سپاہیوں کا پہلا نشانہ تاجر تھے۔ ایک ایک سوداگر کو نہ صرف لوٹا گیا بلکہ اسے قتل بھی کر دیا گیا۔ راہ گیر اور مسافر بھی باغیوں کے ظلم و تشدد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ کسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ان کی کھڑی فصلیں تباہ کر دی گئیں۔ مظلوم رعایا چیخ چیخ کر فریاد کر رہی تھی۔

''ہم سے ہمارا مال و اسباب چھین لو، مگر ہماری جانیں بخش دو۔''

خسرو نے ان کی ایک نہیں سنی۔ یا تو فریادیوں کو بے دریغ قتل کر دیا گیا یا پھر ان کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ ہر طرف ایک کہرام برپا تھا اور باغیوں کا یہ قافلہ تمام انسانی قدروں کو پامال کرتا ہوا لاہور کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اتفاق سے ان ہی دنوں لاہور کا دیوان عبدالرحیم، خزانہ لے کر دارالحکومت آگرہ کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں اس کی ملاقات خسرو سے ہو گئی۔

خسرو نے اسے بڑی حریصانہ پیش کش کی۔

''اگر تُو نے شہنشاہ جہانگیر سے وفاداری کا اظہار کیا تو ساری زندگی ایک دیوان کی حیثیت سے بسر کرے گا۔ اور اگر تُو نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم تجھے وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ بخش دیں گے۔''

ایک تو باغی فوجوں کا خوف، دوسرے وزیراعظم بننے کا خواب، غرض ان دونوں چیزوں نے مل کر عبدالرحیم کو گمراہ کر دیا۔

''میں شہزادہ عالم کے ساتھ ہوں۔'' عبدالرحیم بھی جہانگیر سے عہد توڑ کر باغیوں میں شامل ہو گیا اور تمام شاہی خزانہ خسرو کے حوالے کر دیا۔

خسرو، عبدالرحیم کے اس عمل سے بہت خوش ہوا اور اس نے فوراً اپنے لشکر کے سامنے

''ہماری حکومت میں دیوان عبدالرحیم، وزیراعظم ہو گا اور آج سے ہم اسے ''ملک انور بیگ'' کا خطاب عطا کرتے ہیں۔''

اسی دوران لاہور کا صوبیدار دلاور خان بھی دربارِ شاہی میں حاضری دینے کے لئے آگرے کی طرف روانہ ہوا تھا مگر جیسے ہی اسے راستے میں شہزادہ خسرو کی بغاوت کی خبر ملی تو وہ پیچھے کی طرف لوٹ پڑا اور قلعے کی حفاظت کے انتظامات کرنے لگا۔

اسی زمانے میں ایک اور غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ سکھوں کے روحانی پیشوا اور پانچویں گرو، ارجن سنگھ نے بھی شہزادہ خسرو کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اور کئی ہزار سکھ سپاہی اس کے ہمراہ کر دیئے۔ اگرچہ گرو ارجن سنگھ کو شہنشاہ اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں بہت نوازا تھا، لیکن جب مغل حکومت پر وقت پڑا تو ارجن سنگھ، باغیوں سے جا ملا۔ سکھوں کی حمایت اور عبدالرحیم کی غداری کے باعث اب خسرو کی فوج کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ شاہی خزانے کی منتقلی، تاجروں کے مال کی لوٹ مار اور ارجن سنگھ کی مالی مدد نے خسرو کے مادی وسائل کو کسی حد تک مستحکم کر دیا تھا اور وہ عاقبت نااندیش شہزادہ فضا میں شمشیر لہرا لہرا کر کہا کرتا تھا۔

''اب مجھے تختِ شاہی تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

❀.....❀.....❀

جب شہنشاہ جہانگیر کو ان تخریب کاریوں کی خبر ملی تو اس نے خود شہزادہ خسرو کے تعاقب میں جانے کا فیصلہ کیا۔ بعض وزراء نے شہنشاہ کے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

''اس وقت دارالحکومت میں عالم پناہ کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ باغیوں کی سرکوبی کے لئے سلطنت کے دوسرے وفاداروں کو بھی بھیجا جا سکتا ہے۔''

''جب اپنا ہی بیٹا باغی ہو گیا تو ہم کس پر اعتبار کریں؟'' جہانگیر کا لہجہ بہت اُداس تھا۔ ''اس سے پہلے کہ یہ فتنہ مزید سر اُٹھائے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں بغاوت کی خبریں پہنچیں، ہم بذاتِ خود اس شورش کو کچل دینا چاہتے ہیں۔''

اس کے بعد جہانگیر نے اپنے ایک وفادار خادم، دوست محمد کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

''میں دارالحکومت کی نگرانی تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ میرے پیچھے اسی طرح خدمات انجام دینا کہ اہلِ وفا کا اعتبار باقی رہ جائے۔''

دوست محمد نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ غلام، ظلِ الٰہی کو مایوس نہیں کرے گا۔''

اس کے بعد جہانگیر نے شہزادہ خرم کو تنہائی میں طلب کیا۔ ''فرزند! تم اپنے بھائی کی حرکات دیکھ رہے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے جہانگیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''کیا عجیب وقت ہے خرم! کہ باپ کو بیٹے کے مقابل صف آراء ہونا پڑ رہا ہے۔''

بڑی جذباتی فضا تھی۔ باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خرم کی پلکیں بھی بھیگنے لگیں۔ ''نہیں

عالم پناہ! اس وقت تو بیٹا، باپ کے مقابل ہے۔ آپ اقتدارِ اعلیٰ کے محافظ ہیں اور اس وقت آپ کی ہر کارروائی حق بجانب ہے۔"

"بیٹے! ہم تم سے شرمندہ ہیں۔" شدتِ جذبات سے جہانگیر کی آواز لرز رہی تھی۔ "اُس نامراد خسرو نے ہمیں تمہاری طرف سے بھی بدگمان کر دیا تھا۔"

باپ کی محبت نے خرم کو بے قرار کر دیا اور وہ جہانگیر کے قدموں سے لپٹ گیا۔

"ظلِ الٰہی میری طرف سے فکرمند نہ ہوں۔ اگر مجھے کڑی سے کڑی سزا بھی دی جاتی تو میرا سر اسی طرح شہنشاہ کے حضور خم رہتا۔ خرم کا کیا ہے، وہ تو آپ کا نقشِ کفِ پا ہے۔ اگر مٹ بھی گیا تو کیا؟ بس عالم پناہ کا اقبال بلند رہے۔"

جہانگیر نے بے اختیار ہو کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور خرم کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہاری سعادت مندی پر ناز کرتے ہیں فرزند! خدا تمہیں زمانے کی گرم ہواؤں سے محفوظ رکھے۔"

اس کے بعد جہانگیر نے خرم کو کچھ ہدایات دیں کہ اس کی عدم موجودگی میں حکومت کا انتظام کس طرح جاری رکھا جائے گا۔

۞.....۞.....۞

جب شہنشاہ جہانگیر، سیاست کی بساط پر اپنے وفادار مہروں کو پوری طرح جما چکا تو اس نے انجمن آراء کے ذریعے مہرالنساء سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

مہرالنساء خود بھی شہنشاہ سے ملنے کے لئے بے قرار تھی۔ مگر اُس کی ذہانت کا تقاضا یہی تھا کہ ابھی جہانگیر مزید اضطراب میں مبتلا ہو جائے اور پھر یہ اضطراب، وحشت میں بدل جائے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید مہرالنساء ملاقات سے گریز اختیار کرتی۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ شہنشاہ، خسرو کی بغاوت کچلنے کے لئے دارالحکومت سے باہر جا رہا ہے۔ اس لئے اس نے انجمن آراء سے وعدہ کر لیا کہ وہ نصف شب کے بعد شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گی۔

پھر جب سارا محل نیند کے جزیرے میں ڈوب گیا، اس وقت مہرالنساء دبے قدموں چلتی ہوئی جہانگیر کی خواب گاہ تک پہنچی۔ انجمن آراء اس عورت کی منتظر تھی، جس کے لئے ہندوستان کا فرمانروا برسوں سے تڑپ رہا تھا۔ مہرالنساء کو جہانگیر کی خواب گاہ میں پہنچانے کے بعد انجمن آراء دوسرے کمرے میں واپس آ گئی اور دیوار سے سر ٹیک کر رونے لگی۔

مہرالنساء کو اپنے سامنے پا کر جہانگیر کھڑا ہو گیا۔ "مہرو! کہیں تم ہمارے حکم سے مجبور ہو کر تو نہیں آئی ہو؟" جہانگیر نے مہرالنساء سے پوچھا۔ "پورے ہندوستان میں بس تم ہی ایک ایسی ہستی ہو، جسے ہم حکم نہیں دے سکتے۔"

مہرالنساء کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی، پھر بہت آہستہ لہجے میں بولی۔ "نہیں عالم پناہ! یہ

کنیز خود بھی شہنشاہ کے دیدار کے لئے مضطرب تھی۔"

مہرالنساء نے پہلی بار جہانگیر کی محبت کا اقرار کیا تھا۔ اس ایک لفظ میں ایسا جادو تھا کہ جہانگیر وارفتہ ہو گیا۔

"تم نے آج ہمیں سرفراز کر دیا مہرو!" جہانگیر کی آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ "تم اس شخص کی محرومیوں کا کیا اندازہ کر سکتی ہو کہ جس کا بیٹا شمشیر بکف کھڑا ہے کہ کب باپ کی آنکھ جھپکے اور وہ اس کا سر کاٹ دے۔ ہم اپنی بدنصیبیوں کا کس طرح ماتم کریں کہ نہ بیٹا ہمارا ہے اور نہ تم ہماری ہو۔ ہم نے تمہیں صرف اس لئے بلایا تھا کہ آخری بار تمہارا روشن چہرہ دیکھ لیں۔ کل کون جانے کہ وہ آنکھیں ہی بجھ جائیں جن میں تمہارے سوا کوئی دوسرا عکس نظر نہیں آتا۔"

شہنشاہ کی زبان سے اس قدر مایوس کن باتیں سن کر مہرالنساء بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور پھر یک بیک وہ تمام فاصلے ختم ہو گئے، جنہیں مٹانے کے لئے جہانگیر کئی سال سے کوششیں کر رہا تھا۔

"ہم تمہارے آنچل کے سائے میں رخصت ہونا چاہتے ہیں مہرو!" جہانگیر بہت جذباتی ہو گیا تھا۔

پھر شہنشاہ کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ مہرالنساء نے اپنا حریری آنچل، جہانگیر کے چہرے پر ڈال دیا اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ لرزتی آواز میں کہا۔

"خدا عالم پناہ کو اس معرکے میں سربلند رکھے۔ اور اگر آسمان سے کوئی آفت ٹوٹے تو وہ اس کنیز پر نازل ہو جائے۔" مہرالنساء فارسی زبان کی ایک اچھی شاعرہ بھی تھی، اس کے طرزِ گفتار نے جہانگیر پر سحر سا طاری کر دیا تھا۔

"اب ہم محاذِ جنگ پر تنہا نہیں ہوں گے مہرو! تمہاری یادیں ہمارے ساتھ ہوں گی۔" شہنشاہ ایک سحر زدہ انسان کے لہجے میں بول رہا تھا۔

"کنیز کے دل کی دھڑکنیں بھی عالم پناہ کے دوش بدوش ہوں گی۔" یہ کہہ کر مہرالنساء نے رخصت کی اجازت طلب کی اور وہ فاتحِ ہندوستان کو مغلوب کر کے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

۞.....۞.....۞

دوسرے دن جہانگیر نے اپنے ایک معتمد سپاہی، شیخ فرید بخاری کو مرتضیٰ خان کا خطاب دے کر ہراول کے طور پر لاہور کی طرف روانہ کر دیا۔ مرتضیٰ خان کے ہمراہ بہترین سپاہیوں کا ایک دستہ تھا۔ یہ سپاہی فنونِ جنگ کے ماہر بھی تھے اور شجاع بھی۔ اس فوجی دستے کو رخصت کرتے وقت جہانگیر نے سپاہیوں سے مختصر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر تم میں سے کسی نے پشت پر زخم کھایا اور آبرومندانہ موت کے بجائے ذلت کی زندگی کو ترجیح دی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اور اگر تمہارے سینوں پر تلوار کے زخم آئے تو میں

تمہاری نسلوں کو اس طرح سرفراز کردوں گا کہ تم ان نوازشات کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

تمام سپاہیوں نے اپنی شمشیریں بے نیام کرلیں اور انہیں زمین کی طرف جھکا کر شہنشاہ کو سلامی پیش کی۔ پھر یکایک آگرے کی فضا گھوڑوں کی ٹاپوں کے شور سے گونجنے لگی اور شاہراہوں سے غبار اُٹھنے لگا۔

مرتضیٰ خان کو روانہ کرنے کے بعد جہانگیر نے مہرالنساء کے باپ اعتمادالدولہ (مرزا غیاث بیگ) کو اپنے ہمراہ لے جانے کے لئے طلب کیا۔ اس وقت صوبہ پنجاب، مرزا غیاث بیگ کی عمل داری میں تھا۔ آگرہ چھوڑنے سے پہلے جہانگیر نے خفیہ طور پر دوست محمد کو بلایا اور انتہائی رازداری کے لہجے میں کہا۔

"میری روانگی سے پہلے مرزا حکیم کے بیٹوں کو گرفتار کر کے اُنہیں اپنی سخت نگرانی میں رکھو۔ جب ہمارا حقیقی بیٹا بغاوت کرسکتا ہے تو پھر چچازاد بھائیوں اور بھتیجوں پر کس طرح اعتبار کیا جاسکتا ہے؟"

دوست محمد نے حکمِ شاہی پر فوراً عمل کیا اور جہانگیر کے بہت سے قریبی عزیز دار گرفتار کر لئے گئے۔

اس کے بعد جہانگیر ایک اور طاقتور فوجی دستہ لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ شہزادہ خرم، آگرے کی سرحد تک باپ کو رخصت کرنے کے لئے آیا۔ جہانگیر نے سواری سے اُتر کر بیٹے کو گلے لگایا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"خرم! اپنے مبارک شاہ سے کہنا کہ وہ ہماری کامیابیوں کے لئے دعا کرے۔"

❀.....❀.....❀

اُس رات ارجمند اور خرم کی طویل ملاقات ہوئی مگر اس ملاقات میں خوشیوں کے بجائے تلخیاں اور اُداسیاں شامل تھیں۔

"ارجمند! آج میں خوش بھی ہوں اور بہت غمگین بھی۔" خرم نے کہا۔

"صاحبِ عالم! ایک وقت میں یہ دو متضاد کیفیات کیوں؟" ارجمند نے حیران ہو کر پوچھا۔

"خوش اس لئے ہوں کہ ظلِ الٰہی کا دل میری طرف سے صاف ہوگیا۔" خرم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور اس سے بھی بڑی خوشی یہ ہے کہ عالم پناہ، مبارک شاہ قلندر کے معاملے میں بڑی حد تک نرم پڑ گئے ہیں۔ تم نہیں جانتیں کہ میرے یہ دن کیسی خوف ناک اذیت میں گزرے ہیں۔ ایک طرف باپ کا جابرانہ قہر تھا اور دوسری طرف ایک مظلوم کی بے کسی تھی۔ مجھے شہنشاہ سے بھی محبت ہے کہ وہ میرے باپ ہیں۔ اور میں قلندر سے بھی عقیدت رکھتا ہوں کہ وہ کافرانہ رسموں کے خلاف اکیلا جنگ لڑ رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ قلندر کو قتل کر دیا جاتا تو کون جانے کہ مغل سلطنت کا کیا حشر ہوتا؟ میں اپنے اللہ کا شکرگزار ہوں کہ اس نے یہ سنگین گھڑیاں بہ

عافیت گزار دیں۔"

"مبارک شاہ کی آنکھوں سے تو مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔" ارجمند نے اپنا واقعہ دہراتے ہوئے کہا۔ "بس ایک بار ہی ان آنکھوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جلال کا جو رنگ، مبارک شاہ کی آنکھوں میں جھلکتا ہے، وہ تو کسی شہنشاہ کی آنکھوں میں بھی نظر نہیں آتا۔"

"قلندر کے جلال کا اندازہ ہم کیا کر سکتے ہیں کہ اس کے تصور ہی سے گیانی آتمارام کا جسم جل اُٹھا تھا۔" خرم نے ایک اور واقعے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "قلندر کی ذات، مغل سلطنت کے لئے بہت بابرکت ثابت ہوسکتی ہے، اگر شہنشاہ اپنے دربار سے سجدے کی رسم ختم کر دیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کریں گے کہ اقتدار کا نشہ، انسان کو خدائی دعوے تک پہنچا دیتا ہے۔" خرم کا لہجہ بہت اُداس تھا۔ "اور یہ اقتدار ہی کی لعنت ہے کہ میرا بھائی خسرو اپنے باپ کے سامنے شمشیر بکف کھڑا ہے۔ اس جنگ کا کیا نتیجہ نکلے گا ارجمند؟..... دونوں طرف سے اپنا ہی خون بہے گا۔ خسرو فاتح ہوا تو ہمیں عالم پناہ کا ماتم کرنا پڑے گا۔ اور اگر ظلِ الٰہی فتح سے ہمکنار ہوئے تو ہمیں خسرو کی لاش پر نوحہ خوانی کرنا ہوگی۔ دونوں زاویوں سے ہمارا ہی زیاں ہے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ میں اپنے حق کے لئے دشمنوں سے جنگ کروں۔ غیروں کا کیا ذکر کہ یہاں تو اپنے ہی دشمن ہیں۔ اپنوں کی گردنوں پر خنجر آزمائی کروں؟ اپنوں کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں؟ اقتدار تو اسی طرح حاصل ہوتا ہے۔"

شہزادہ خرم بہت شکستہ نظر آنے لگا تھا۔ ارجمند نے ایک بار پھر اسے اپنی محبت کا واسطہ دیتے ہوئے کہا۔

"خرم! میری خاطر اُٹھو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم تخت و تاج کے لئے نہیں، ظلم کے خلاف جنگ کرو گے۔ قلندر کتنا لاغر و نحیف ہے کہ تازیانوں کی بارش بھی اسے جھکنے پر مجبور نہ کر سکی۔ آخر قلندر یہاں کیوں آیا ہے؟ اور وہ تمہیں اپنا محبوب کیوں کہتا ہے؟ یقیناً اس میں کوئی راز ہے۔ وہ تمہارے سر پر تاجِ زرنگار دیکھنا چاہتا ہے اور تم محلاتِ شاہی سے نکل کر ویرانوں میں چلے جانا چاہتے ہو؟..... تم قلندر کے زخموں سے سبق حاصل کرو۔ وہ تمہیں روشنی دکھانے کے لئے زنداں کے اندھیروں تک آپہنچا ہے۔"

خرم بڑی حیرت سے ارجمند کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک کم سن لڑکی بھی اس قدر ہوش مندانہ باتیں کرسکتی ہے۔

"تم اس خوب صورت رات کو جنگ و جدل اور تاج و تخت کا ذکر کر کے تباہ نہ کرو۔ میں ذہنی طور پر بہت پریشان ہوں ارجمند! تم مجھے کوئی نغمۂ بہار سناؤ۔ نسیم صبا کا کوئی گیت گاؤ، آبشاروں کا کوئی راگ چھیڑو۔ سیاست کے خونریز موسم کی گرم ہوائیں میرے جسم کو جلائے دے رہی ہیں۔"

ارجمند بانو کو فوراً ہی احساس ہوگیا کہ واقعتاً اس وقت خرم کو کسی نغمۂ بہار کی ضرورت ہے۔

پھر اُس کے ہونٹوں سے شہد برسنے لگا۔ رات آہستہ آہستہ بھیگ رہی تھی، چاند اپنا سفر طے کر رہا تھا اور ہارسنگھار کا درخت دو محبت کرنے والوں پر اپنے پھول نچھاور کر رہا تھا۔

❀.....❀.....❀

جہانگیر بہت تیز رفتاری کے ساتھ دہلی پہنچا۔ پھر سب سے پہلے اپنے دادا شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں کے مقبرے پر حاضر ہوا۔ اس کے بعد اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دی۔ جہانگیر بہت دیر تک شہنشاہِ معرفت کے دربار میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ ہندوستان کا فرمانروا جو بظاہر بڑی طاقتوں کا مالک تھا، یہاں ایک مجبور اور کمزور انسان کی مانند نظر آ رہا تھا۔ جہانگیر آہستہ آہستہ حضرت نظام الدین اولیاء کے قدموں کی طرف جھکا اور پھر اس نے سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ کی قبر کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''اے خدا! مجھے حضرت نظام الدینؒ کے طفیل دشمنوں پر غلبہ عطا کر!''

اس دعا کے بعد جہانگیر نے ضرورت مندوں اور محتاجوں میں ہزاروں روپے تقسیم کئے اور لاہور کی طرف بڑھا۔

جہانگیر سے پہلے مرتضیٰ خان، لاہور کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ خسرو شدید خطرات کے درمیان گھر چکا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح لاہور کے قلعے میں داخل ہو جائے۔ مگر دلاور خان نے قلعے میں داخل ہو کر دروازے بند کر لئے تھے اور تمام بُرجوں، دیواروں اور فصیلوں کو مستحکم کرنے لگا۔ اسی دوران خسرو نے لاہور پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا اور اپنے سپاہیوں کے سامنے اعلان کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم قلعے کے اندر داخل ہو گئے تو سات دن تک تمہیں لوٹ مار کی مکمل اجازت ہوگی۔ جو سامان، جس کے ہاتھ لگے گا، وہ اس کی ملکیت سمجھا جائے گا۔''

اس لالچ نے باغیوں کو اندھا کر دیا اور وہ اپنے انجام سے بے پروا ہو کر قلعے پر حملے کرنے لگے۔ اس جنونی کوشش میں باغیوں کو ایک کامیابی بھی حاصل ہو گئی۔ خسرو کے سپاہیوں نے قلعے کے ایک دروازے کو آگ لگا دی۔ اب انہیں فتح کی منزل قریب تر نظر آ رہی تھی۔ مگر اس وقت باغیوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے جلے ہوئے دروازے کے مقابل ایک اونچی دیوار کھڑی پائی۔ دلاور خان نے محاصرے کے دوران ہی اس قسم کے انتظامات کر لئے تھے۔ اب خسرو قلعے کے اندر داخل ہونے سے مایوس ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس نے نو دن تک محاصرہ جاری رکھا۔ مگر جب خسرو کو اطلاع ملی کہ شہنشاہ خود اس کے تعاقب میں لاہور کی طرف آ رہے ہیں تو اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور کسی دوسرے محفوظ مقام کی طرف روانہ ہونے کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس دوران جہانگیر نے خسرو کے پاس اپنے ایک قاصد کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر وہ

بغاوت سے ہاتھ اٹھا لے اور اپنے قصور کی معافی مانگ لے تو شہنشاہ اس کے ساتھ محبت اور نرمی سے پیش آئیں گے۔ مگر خسرو مکمل طور پر گردشِ وقت کا شکار ہو چکا تھا۔ اس نے جہانگیر کی پیش کش کو حکومت کی کمزوری سمجھتے ہوئے قاصد سے صاف صاف کہہ دیا۔

''میں تاج و تخت کے سوا کسی دوسری پیش کش کو قبول نہیں کر سکتا۔''

جہانگیر نے بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر اسے یہ پیغام بھیجا تھا۔ لیکن خسرو کے برے دن آ چکے تھے، اس لئے اس کے دماغ پر حماقت اور دیوانگی کے گہرے پردے پڑ گئے تھے۔ مجبوراً جہانگیر نے حکم دیا کہ خسرو کے ساتھ جارحانہ جنگ کی جائے اور اس سے کسی بھی موقع پر نرمی کا سلوک نہ کیا جائے۔ آخر ''بھیروال'' کے مقام پر دونوں فوجوں میں تصادم ہو گیا۔ یہ جنگ بہت مختصر تھی۔ باغی فوجوں کو شکست ہوئی اور خسرو میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔

اب جہانگیر کو یہ فکر لاحق تھی کہ خسرو کہیں بنگال میں اپنے ماموں، راجہ مان سنگھ اور شمال مغربی سرحدوں کے علاقے میں ازبکوں اور ایرانیوں سے نہ مل جائے۔ اس نازک موقع پر خسرو کے ساتھیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ کچھ سردار اسے بہار کی طرف لوٹ جانے کا مشورہ دے رہے تھے، مگر حسین بیگ بدخشانی، مشرقی علاقوں میں جانے کا مخالف تھا۔ وہ خسرو کو مسلسل کابل جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ اُس نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''اگر شہزادہ عالم میری بات مان لیں تو میں قلعہ روہتاس کا سارا سامانِ جنگ اور خزانہ، حضور کی نذر کر دوں گا۔''

خسرو خزانے کے لالچ میں حسین بیگ کی تائید کرنے لگا۔ یہ بات ایک گروہ کو بہت گراں گزری۔ دراصل وہی اس فتنے کی جڑ تھے۔ جہانگیر کے تعاقب کی خبر کو بہانہ بنا کر وہ خسرو سے الگ ہو گئے۔ ان کے ساتھ چھوڑ جانے سے خسرو کے لشکر میں شدید انتشار پھیل گیا۔ وہ گھبرا کر دریائے چناب کی طرف بڑھا مگر وہاں پہلے ہی شاہی احکام پہنچ چکے تھے۔ اس علاقے کے تمام حاکموں اور زمینداروں نے ملاحوں سے سختی کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ خسرو کو دریا کے پار پہنچانے میں کوئی مدد نہ کریں۔ نتیجتاً تمام ملاح اپنی کشتیاں چھپا کر بھاگ گئے۔ خسرو اور اس کے ساتھیوں نے بڑی مشکل سے ایک کشتی حاصل کی اور اس کے ملاحوں کو موت کی دھمکیاں دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان لوگوں کو دریا کے دوسرے کنارے پر لے جائیں۔ ملاحوں نے مجبوراً اپنی کشتی دریا میں اُتار دی۔ اس کشتی میں خسرو اور اس کے خاص خاص ساتھی سوار تھے۔ کچھ دیر بعد ملاحوں نے بڑی ہوشیاری سے کشتی کو ریت کے ایک ٹیلے پر لے جا کر چڑھا دیا اور خود پانی میں کود کر فرار ہو گئے۔

اب خسرو اور اس کے ساتھی، ریت کے ٹاپو پر حیران و پریشان کھڑے اپنی بدنصیبی کا ماتم کر رہے تھے کہ اتنے میں میر ابوالقاسم اور بلال خان خواجہ سرا اپنے سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ گئے اور خسرو کے ساتھ حسین بیگ بدخشانی اور عبدالرحیم کو گرفتار کر لیا۔

پھر جب یہ باغی، جہانگیر کے سامنے لائے گئے تو اس نے شدید قہر و غضب کے عالم میں حکم دیتے ہوئے کہا۔

''عبدالرحیم کو گدھے کی کھال میں اور حسین بیگ بدخشانی کو بیل کی کھال میں سی دیا جائے اور پھر ان دونوں کو ان کے ساتھیوں کے ہمراہ گدھوں پر اُلٹا سوار کرا کے پورے شہر میں پھرایا جائے۔''

حسین بیگ بدخشانی، بیل کی کھال میں چار گھڑی زندہ رہا۔ جب کھال خشک ہونا شروع ہوئی تو حسین بیگ کی پسلیاں تک ٹوٹ گئیں اور وہ دم گھٹنے کی وجہ سے مر گیا۔ یہی حال لاہور کے دیوان عبدالرحیم کا تھا۔ وہ حسین بیگ بدخشانی کے مقابلے میں کچھ زیادہ سخت جان تھا۔ مگر جب گدھے کی کھال سوکھ کر سکڑنا شروع ہوئی تو عبدالرحیم کی پسلیاں بھی جواب دینے لگیں۔ جب تک وہ زندہ رہا، لوگوں سے کھانے کی بھیک مانگتا رہا۔ کسی شخص نے اُسے کھانے کے لئے ٹکڑیاں دے دیں۔ عبدالرحیم کسی بھوکے گداگر کی طرح ٹکڑیاں کھاتا رہا۔ پھر اچانک اُس کا دم گھٹنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے عبدالرحیم کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں اور وہ انتہائی بے کسی کی موت مر گیا۔

جب یہ دونوں غدار اپنے انجام کو پہنچ گئے تو جہانگیر نے دوسرا حکم جاری کیا۔

''مرزا کامران کے باغ سے لے کر قلعہ لاہور کے دروازے تک راستے کے دونوں طرف پھانسیاں نصب کر دی جائیں اور پھر تمام باغیوں کو ان پر لٹکا دیا جائے۔''

بڑا عبرت ناک منظر تھا سینکڑوں باغیوں کے مُردہ جسم پھانسیوں پر جھول رہے تھے۔ ان کی زبانیں اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں اور چہرے بگڑ کر انتہائی بھیانک ہو گئے تھے۔

اس کے بعد جہانگیر کا تیسرا حکم جاری ہوا۔ ''شہزادہ خسرو کو ہاتھی پر بٹھا کر پھانسیوں کے درمیان سے گزارا جائے۔''

شہزادہ خسرو، زنجیروں میں جکڑا ہاتھی پر بیٹھا تھا اور شرم و ندامت سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

جہانگیر کے حکم پر نقیب آوازیں لگا رہے تھے۔ ''باادب، باملاحظہ، ہوشیار! بادشاہ سلامت کی سواری آ رہی ہے۔''

ذلت و رسوائی کے احساس سے خسرو کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ پھر جب ہاتھی، باغیوں کی لٹکتی ہوئی لاشوں کے درمیان سے گزرا تو نقیبوں نے زوردار آوازوں کے ساتھ پکارنا شروع کر دیا۔

''یہ امیر اور وزیر، شہنشاہ کو سلامی پیش کر رہے ہیں۔''

❀.....❀.....❀

باغیوں کے گروہ سے پانچ آدمی ایسے بھی گرفتار کئے گئے تھے، جنہیں شہزادہ خسرو کا ذاتی

ملازم سمجھا جاتا تھا۔ جہانگیر نے پانچوں مجرموں کو اپنے حضور طلب کیا۔ ان میں سے تین افراد منحرف ہو گئے۔ تینوں نے برملا کہا کہ وہ شہزادہ خسرو کے ملازم نہیں ہیں۔ انہیں صرف دشمنی کی بنا پر اس بغاوت میں ملوث کیا گیا ہے۔ جہانگیر نے ان کے بارے میں تفتیش کا حکم جاری کیا اور باقی دو افراد کو ہاتھی کے پیروں سے کچلنے کی سزا دے دی۔

غرض تمام باغیوں کو دردناک سزائیں دینے کے بعد جہانگیر، شہزادہ خسرو کی طرف متوجہ ہوا۔ جب اُسے دربارِ شاہی میں طلب کیا گیا تو وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شہزادہ خسرو زار و قطار رو رہا تھا اور اس کے جسم پر شدید لرزش طاری تھی۔ اہلِ دربار بھی اس لرزہ خیز منظر سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ انہیں اپنی سانسیں رُکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''میں ظلِ الٰہی کے رحم کو آواز دیتا ہوں کہ میرا مقدمہ خلوت گاہِ شاہی میں پیش کیا جائے۔'' خسرو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھ سے اہلِ دربار کے سامنے یہ ذلت و رُسوائی برداشت نہیں ہوتی۔''

خسرو کی درخواست سن کر جہانگیر غضب ناک ہو گیا۔ ''کیا تُو نے اپنے باپ کے خلاف تنہائی میں بغاوت کی تھی؟ اگر تُو ایسا کرتا تو ہمیں اپنے انصاف کی قسم ہے کہ ہم تیرا معاملہ بھی تنہائی میں طے کرتے۔''

خسرو کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بدستور لرزتے جسم کے ساتھ آنسو بہاتا رہا۔

''کیا ہم نے تجھے سمجھانے اور بغاوت سے روکنے کے لئے تیرے پاس اپنا قاصد نہیں بھیجا تھا؟'' جہانگیر نے مجرم بیٹے سے ایک اور سوال کیا۔ ''کیا تُو ہمیں مجبور سمجھ رہا تھا کہ ہم تیری طاقت سے خوف زدہ ہو گئے ہیں؟''

شہزادہ خسرو خاموش کھڑا رہا۔

''یہ ہمارا انصاف اور رحم ہی تھا کہ ہم آخری دم تک تجھے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کرتے رہے۔'' جہانگیر کا لہجہ مزید قہرناک ہو گیا تھا۔ ''یہ ہماری بھول تھی خسرو! کہ ہم تجھے اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ ایک انسان بھی سمجھ رہے تھے۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ ہم ایک پتھر سے مسلسل سر ٹکرا رہے تھے۔''

پورے دربار پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

''تُو ہمارے اعتبار ہی کا نہیں، اپنی مہربان ماں کا بھی قاتل ہے۔'' جہانگیر نے ماضی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''تُو نے ہمیں عرش آشیانی اکبرِ اعظم کے حضور ذلیل کرنے کی بارہا کوشش کی۔ تیرا صرف ایک یہی جرم کافی تھا کہ ہم تجھے ہمیشہ کے لئے زنداں کے حوالے کر کے تجھ پر ہر آسائش و نعمت کو حرام قرار دے دیتے۔ مگر ہم نے اس سے گریز کیا اور تیری باغیانہ حرکتوں کو لڑکپن کی بھول سمجھا۔ کیا یہ ہمارا رحم نہیں تھا؟ ہم نے تیری دلجوئی کے لئے تجھ پر انعام و اکرام کی

بارش کی، لیکن تیری احسان فراموشی نے ثابت کر دیا کہ انسانی فطرت تبدیل نہیں ہو سکتی۔"

درباریوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے جہانگیر اپنے بیٹے خسرو کے جرائم کی فہرست پڑھ کر سنا رہا ہے۔

"اور وہ وقت یاد کر، جب تیری ماں شاہ بیگم تجھے زبانی نصیحت بھی کرتی تھی اور طویل خطوط لکھ کر بھی سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔" (خسرو کی ماں نسلاً ایک راجپوت عورت تھی مگر خسرو کی پیدائش کے بعد جہانگیر نے اُسے شاہ بیگم کا خطاب دے دیا تھا)

شاہ بیگم کا نام لیتے ہی جہانگیر پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ "بدنصیب! تُو جانتا ہے کہ تیری ماں، شاہ بیگم کون تھی؟ میں اپنی زبان سے اس خاتون کی کیا تعریف کروں؟..... وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرنے والی عورت تھی۔ اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ میرے ایک بال پر اپنے ہزار بیٹے قربان کر سکتی ہے۔ بے شک! وہ اپنے دعوے میں سچی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ شاہ بیگم نے کس کس طرح تیری اصلاح کی کوشش کی۔ مگر وہ معصوم عورت اس راز سے بے خبر تھی کہ اس کا بیٹا ناقابلِ اصلاح ہے۔ پھر اسی غیرت و شرم نے اُسے خودکشی پر اُکسایا۔ یہاں تک کہ اس حیادار خاتون نے زیادہ مقدار میں افیم کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔"

شاہ بیگم کی موت کا ذکر کرتے کرتے جہانگیر کے چہرے پر رنج و الم کے گہرے سائے نمایاں ہو گئے تھے۔

"ماں کو موت کی نیند سلا دینے کے بعد تُو باپ کو بھی قتل کر دینا چاہتا تھا۔ آخر تیری فطرت کا خمیر کس مٹی سے بنا ہے؟ اور تُو کس منحوس گھڑی کے درمیان اس دنیا میں آیا تھا؟"

شہزادہ خسرو اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا، مگر ایک بار باپ کی محبت نے پھر جوش مارا اور خسرو کو سزائے موت دینے کے بجائے حکومت کا ایک ناپسندیدہ قیدی بنا دیا گیا، جو ہر وقت زنجیروں میں جکڑا رہتا تھا اور جس کی سخت نگرانی کی جاتی تھی۔

۞.....۞.....۞

خسرو کی بغاوت کچلنے کے بعد جہانگیر لاہور میں ٹھہر گیا۔ بعض مشیر مسلسل پیغام بھیج رہے تھے کہ شہنشاہ دارالحکومت آگرہ واپس تشریف لے آئیں کہ اس وقت گجرات، دکن اور بنگال کی فضا بہت زیادہ ناسازگار تھی۔ جہانگیر نے مشیروں کے اس پیغام کو نظرانداز کر دیا کیونکہ شاہِ ایران کا رویہ خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس کشیدہ فضا کو ہموار کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ایرانی سرحد کی مستقل نگرانی کی جائے۔ مجبوراً جہانگیر کو لاہور میں طویل قیام کرنا پڑا۔ اس نے فوراً ہی شہزادہ خرم کو خط لکھا۔

"فرزند! ہم فوری طور پر دارالحکومت تشریف نہیں لا سکتے۔ اس لئے تم ہماری والدہ محترمہ، مریم زمانی بیگم اور دوسری بیگمات کو لے کر لاہور حاضر ہو جاؤ۔ ہم تمہارا روشن چہرہ دیکھنے کے

لئے بہت بے قرار ہیں۔"

خرم یہ خط پا کر بہت مسرور نظر آ رہا تھا کہ اس سے باپ کی بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر جب اس نے ارجمند سے اپنی روانگی کا ذکر کیا تو وہ اُداس نظر آنے لگی۔

"تمہاری یہ آزردگی بے سبب ہے ارجمند!" خرم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" ارجمند نے مختصر سا سوال کیا۔

"اس لئے کہ تم میرے ہاتھوں میں ہر وقت تلوار دیکھنا چاہتی ہو اور تمہاری خواہش ہے کہ میں محاذِ جنگ پر مسلسل اپنے دشمنوں سے لڑتا رہوں۔" خرم نے جواباً کہا۔ "تم میری اس روانگی کو بھی ایک جنگی سفر سمجھ لو کہ جیسے میں لاہور کی جانب نہیں، کسی میدانِ کارزار کی طرف جا رہا ہوں۔"

"بے شک! میں تمہیں شمشیر بکف دیکھنا چاہتی ہوں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہاری جدائی برداشت کر لوں۔" ارجمند بانو نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میری تو یہ خواہش ہے کہ میں بھی تمہارے دوش بہ دوش جنگ کروں۔ اگر کسی دشمن کی شمشیر تمہاری طرف لپکے تو میں اپنے جسم پر زخم کھاؤں۔ میرے لئے وہ لمحہ سب سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے، جب تم میری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہو۔ پھر میں اس طویل زمانۂ فراق کو کس طرح برداشت کروں گی؟ مجھے بھی اپنے ہمراہ لاہور لے چلو خرم!" ارجمند اس قدر جذباتی ہو گئی تھی کہ اسے اپنی زبان پر قابو نہیں رہا تھا۔

"اگر تم اس سفر میں میرے ہمراہ چلی گئیں تو لوگ کیا سوچیں گے؟" شہزادے نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں کیا کروں خرم؟" ارجمند کی آواز کانپ رہی تھی۔ "میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔"

"تمہارے دل کی مجبوریاں تو میرے پیروں کی زنجیر بن جائیں گی۔" خرم نے ارجمند کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں نے کل رات پھر وہی بھیانک خواب دیکھا تھا کہ ایک عورت میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو گئی ہے۔" ارجمند نے روتے ہوئے کہا۔

"خواب تو صرف خواب ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔" خرم نے پُرجوش لہجے میں کہا تاکہ ارجمند کی وحشت اور بے چینی ختم ہو جائے۔

"یہ تمہاری محبت کی انتہا ہے کہ تم اپنے سائے کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی ہو۔ جس عورت کا دنیا میں کوئی وجود نہیں، اسے تمہارے اندیشوں نے مجسم بنا دیا ہے اور اب وہی نامعلوم عورت تمہیں خوابوں میں ڈراتی رہتی ہے۔"

خرم کی تسلی آمیز گفتگو سے ارجمند کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے تھے۔ "اس سفر میں تمہارے ساتھ اور کون کون جا رہا ہے؟" اچانک ارجمند نے ایک نیا سوال کر دیا۔

"دادی صاحبہ مریم زمانی بیگم، سلطانہ سلیمہ بیگم اور دوسری بیگمات۔" خرم نے جواب دیا۔

مگر وہ ارجمند کے سوال کا مقصد نہیں سمجھا تھا۔

''سلطانہ سلیمہ بیگم کے ساتھ پھوپھی حضور بھی جائیں گی؟'' ارجمند کا اشارہ مہرالنساء کی طرف تھا۔

اب خرم سمجھ گیا تھا کہ ارجمند بانو نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔

''دادی محترم جائیں گی تو مہرالنساء بیگم کا جانا بھی لازمی ہے۔'' خرم نے جواباً کہا۔

کچھ دیر کے لئے ارجمند بانو اپنی پھوپھی کی طرف سے حسد کا شکار ہوگئی۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''پھوپھی حضور کے ساتھ ماہ رخ کو بھی لاہور لیتے جائیں۔'' ارجمند، ماہ رخ کو اس لئے لاہور بھیجنا چاہتی تھی کہ وہ مہرالنساء بیگم کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکے۔ خرم سے بات کرتے وقت ارجمند کو ماہ رخ کے وہ الفاظ یاد آرہے تھے۔

''اگر مہرالنساء بیگم، شاہی حرم میں داخل ہوگئیں تو پھر تمہاری اور خرم کی شادی کو کوئی نہیں روک سکتا۔''

اس لئے ارجمند دن رات دعائیں کرتی رہتی تھی کہ جلد از جلد شہنشاہ جہانگیر اور مہرالنساء بیگم کی شادی ہو جائے اور پھر وہ خود بھی اپنے محبوب کے حریم دل سے گزر کر اس کے حرم میں داخل ہو جائے۔

''اگر ماہ رخ بھی لاہور چلی گئی تو تم یہاں اکیلی رہ جاؤ گی۔'' خرم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میری خواہش تو یہی ہے کہ مہرالنساء بیگم، ماہ رخ کو آگرے میں چھوڑ جائیں تاکہ تمہیں تنہائی کا احساس زیادہ پریشان نہ کرے۔''

''تم میرا خیال چھوڑ دو خرم! ماہ رخ کو ہر حالت میں لاہور جانا ہے۔'' یہ کہہ کر ارجمند نے شرمائے ہوئے لہجے میں ساری بات خرم کو بتا دی۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہاری وہ کنیز حالات پر بہت گہری نظر رکھتی ہے۔'' خرم نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''کنیز نہیں۔ میری بہن، میری ہمدرد، میری غم گسار۔'' ارجمند نے نئے انداز سے ماہ رخ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے اس طرزِ گفتگو سے بہت خوش ہوا ارجمند!'' خرم کے لہجے سے اپنی محبوب کے لئے محبت کا ایک خاص رنگ جھلک رہا تھا۔ ''تمہارا ذہن بھی روشن ہے اور دل بھی آئینے کی طرح شفاف ہے۔ خدا نے کسی کو غلام یا کنیز بنا کر پیدا نہیں کیا۔ یہ تفریق تو انسانوں نے قائم کی ہے۔ اور اگر اللہ نے ہمیں طاقت و اقتدار بخشا تو ہم اس تفریق کو مٹا ڈالیں گے۔''

''انشاء اللہ، ایسا ہی ہوگا۔ یہ کنیز تو اس دن کے انتظار میں جی رہی ہے۔'' ارجمند نے شاد لہجے میں کہا۔

''ایک طرف ماہ رخ کو اپنی بہن کہتی ہو اور دوسری طرف خود کو کنیز بنا کر پیش کر رہی ہو۔'' خرم نے احتجاج کیا۔

''صاحب عالم! یہ تو محبت کا ایک انداز ہے۔'' اچانک ارجمند کے ذہن پر چھائی ہوئی تلخیاں ڈھل گئی تھیں اور اس کا لہجہ ایک نئے کیف و سرور میں ڈوب گیا تھا۔ ''عشق میں کسی کا غلام ہو جانا ایک افتخار ہے، ایک اعزاز ہے۔''

''یقیناً عشق کی غلامی ایک عجیب غلامی ہے۔'' اب شہزادہ خرم کی آواز بھی شدتِ جذبات سے لرزنے لگی تھی۔ ''اس غلامی میں نہ کوئی طوق ہوتا ہے اور نہ کوئی زنجیر۔ پھر بھی انسان غلامی کے دائرے سے نکل نہیں سکتا۔''

''میں اس غلامی پر نازاں ہوں خرم!'' ارجمند آہستہ آہستہ جھکی اور اس نے خرم کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ''کاش ایسا ہو کہ اسی غلامی کی حالت میں مجھے موت آجائے۔''

''تو پھر یہ دعا بھی کرو کہ ہم دونوں ایک ساتھ مر جائیں۔'' شہزادہ خرم نے اپنا ہاتھ ارجمند کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ ''تمہارے بغیر تو زندگی ایک تہمت بن کر رہ جائے گی۔''

''نہیں صاحبِ عالم! خدا آپ کو عمرِ دراز عطا کرے۔ اس کنیز کا کیا ہے، رہی، رہی نہ رہی۔ آپ تو ہندوستان کی تقدیر ہیں۔ مظلوم، غم زدہ اور ٹھکرائے ہوئے انسانوں کی تقدیر۔''

رات اس قدر دبے قدموں سے گزر رہی تھی کہ دونوں کو احساس نہ ہوا اور پھر جب صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے تو ارجمند گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں گے۔ یہ میرا حکم ہے۔'' ارجمند نے بڑے ناز کے ساتھ کہا۔ ''اور دشمنوں کو ایسا کوئی موقع فراہم نہیں کریں گے کہ وہ آپ کے خلاف ظلِ الٰہی کے کان بھر سکیں۔''

''اور تم بھی اُداسی کو اپنے قریب نہ آنے دو گی۔'' خرم نے ارجمند کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''آگرہ اور لاہور کے درمیان خواہ کتنا ہی فاصلہ ہو، مگر ہم دونوں اسی طرح ایک دوسرے کے قریب رہیں گے۔''

پھر دونوں طرف سے کئی عہد و پیمان کئے گئے اور شہزادہ خرم، ارجمند بانو کو رخصت کر کے اپنی خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔

۞.....۞.....۞

دوسرے دن لاہور روانگی سے پہلے خرم، مبارک شاہ کی کوٹھری میں پہنچا۔ قلندر فرش پر لیٹا ہوا، نیم تاریک کوٹھری کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز بھی اُس کی محویت میں خلل نہ ڈال رہی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قلندر کو دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی کبھی کوئی فکر لاحق نہ ہوئی۔ کون آیا اور کون گیا، اسے اس کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی۔ خرم آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور مبارک شاہ کے قدموں کی طرف جا کر کھڑا ہوگیا۔ پھر بہت دھیمے لہجے میں بولا۔

"بابا! یہ میں ہوں، آپ کا خادم خرم۔" شہزادے کے ایک ایک لفظ سے مبارک شاہ کے لئے عقیدت جھلک رہی تھی۔

قلندر، خرم کی آواز سنتے ہی فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "خادم نہیں۔ میرا شہنشاہ، میرا شاہ جہاں۔" مبارک شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ خرم گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ قلندر نے تین بار اس کے سر اور جسم پر اپنے ہاتھ پھیرے اور پھر انہیں جھٹکتے ہوئے کہا۔ "خدا کے حکم سے تمام آفتیں اور بلائیں دور۔"

"بابا! شہنشاہ نے مجھے لاہور طلب کیا ہے۔" خرم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ!..... شوق سے جاؤ۔ سارا ہندوستان تمہارا ہے۔" قلندر اپنے مخصوص انداز میں مسکرانے لگا۔

"رخصت ہونے سے پہلے مجھے آپ کے کھانے کی فکر ستا رہی ہے۔" خرم نے بے چین ہو کر کہا۔

"میرے کھانے کی فکر نہ کرو شہزادے! مبارک شاہ کا کھانا ہی کیا؟" قلندر نے بے نیازانہ کہا۔

"اس لئے کہ آپ میرے سوا کسی دوسرے کا لایا ہوا کھانا پسند نہیں کرتے۔" شہزادہ بہت فکرمند نظر آ رہا تھا۔

"تمہاری غیر حاضری میں ہم کسی کے بھی ہاتھ سے کھانا کھا لیں گے۔ مجبوری میں سب جائز ہے۔" قلندر ہنسنے لگا۔ "اتنی معمولی سی بات کے لئے پریشان ہوتے ہو۔"

"میں نے یہ ذمہ داری اپنے ایک دوست، سکندر مرزا کے سپرد کر دی ہے۔ اگر آپ اسے قبول فرما لیں۔" خرم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میری غیر حاضری میں وہی میری نمائندگی کرے گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" قلندر اچانک بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ "تم ایک فقیر کا اتنا خیال رکھتے ہو۔ خدا تمہارا خیال رکھے گا۔ بس اسی طرح عاجزی کا مظاہرہ کرتے رہنا، بیڑا پار ہو جائے گا۔ جاؤ! ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ تم نے ہماری خاطر بادشاہ کی ناراضگی خریدی ہے، عنقریب تمہیں اللہ اس کا اجر دے گا۔ ہم بھکاریوں کے پاس دعا کے سوا اور ہے بھی کیا شہزادے؟..... آخر تمہیں کیا نذر کریں؟"

"بس مجھے اپنی دعاؤں میں شامل رکھئے۔" خرم نے بڑے انکسار کے ساتھ درخواست کرتے ہوئے کہا۔

"دعاؤں میں تو بہت پہلے سے شامل ہو۔" مبارک شاہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ "اور ایک میں کیا، تم نہ جانے کس کس کی دعاؤں میں شامل ہو۔"

پھر خرم نے اجازت چاہی تو قلندر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے شہزادے کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ! خدا تمہیں ہر لحاظ سے سرخرو رکھے گا۔"

۞.....۞.....۞

لاہور روانگی سے پہلے مہرالنساء بیگم نے ماہ رخ سے کہا۔

"وہاں تمہاری ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس لئے تم کچھ دن ارجمند کے پاس گزار سکتی ہو۔"

ماہ رخ نے لاہور چلنے کے لئے بہت اصرار کیا، مگر مہرالنساء اس پر آمادہ نہیں ہوئی۔ پھر جب ارجمند بانو کو یہ خبر پہنچی تو وہ بہت پریشان نظر آنے لگی۔ "میں تو چاہتی تھی کہ لاہور جانے کے بعد تم پھوپھی حضور پر بھی نظر رکھ سکو گی اور شہزادہ خرم بھی تمہارے ہوتے ہوئے تنہائی محسوس نہیں کریں گے۔"

"میں نے بہت کوشش کی مگر مہرالنساء بیگم کسی طرح بھی مجھے اپنے ہمراہ لے چلنے کے لئے تیار نہیں۔" ماہ رخ نے وضاحت کی۔ "مجھے کسی قدر اندازہ ہے کہ لاہور کا یہ سفر، شہنشاہ اور مہرالنساء کے لئے بہت اہم ثابت ہو گا اور اب انہیں میری ضرورت بھی تو نہیں رہی۔ دونوں منزل کے بہت قریب کھڑے ہیں۔ بس تمہاری پھوپھی حضور کی طرف سے تاخیر ہو رہی ہے۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین عورت ہیں۔ انہوں نے شہنشاہ کی کمزوری کو سمجھ لیا ہے اور وہ اسی کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

"کیسا فائدہ؟" ارجمند بانو نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

"مہرالنساء بیگم، شہنشاہ کی آتش کو بھڑکا کر زیادہ سے زیادہ تحفظات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔" ماہ رخ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے شہنشاہ کی بے قراریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مہرالنساء بیگم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گی۔"

ابھی دونوں میں یہ گفتگو جاری تھی کہ شہزادہ خرم کی ایک کنیز دوڑتی ہوئی آئی اور ماہ رخ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"آپ کو صاحبِ عالم یاد فرما رہے ہیں۔"

ماہ رخ نے ایک نظر ارجمند کی طرف دیکھا اور فوراً ہی شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔ وہاں خرم کا دوست سکندر مرزا موجود تھا۔ ماہ رخ اسے دیکھ کر دروازے ہی میں ٹھہر گئی۔

"اندر آ جاؤ ماہ رخ! یہ میرے عزیز ہیں، سکندر مرزا۔"

ماہ رخ کمرے میں داخل ہوئی اور خرم کو سلام کر کے شہزادے کے حکم کا انتظار کرنے لگی۔

"ماہ رخ! آج ہم ایک طویل سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ظلِ الٰہی کب تک لاہور میں قیام فرمائیں گے۔" خرم نے ماہ رخ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس دوران تم

سکندر مرزا کو تمام اہلِ خانہ کی خیر و عافیت سے باخبر رکھنا۔ یہ ہر ہفتے ہمیں لاہور جانے والی ڈاک کے ذریعے مطلع کرتے رہیں گے۔"

ماہ رخ نے جھجکتے ہوئے، سکندر مرزا کی طرف دیکھا۔ وہ ایک معصوم چہرے والا خوبصورت نوجوان تھا۔

"سکندر! یہ ارجمند بانو کی عزیزہ ماہ رخ ہیں.....اور ایک اعتبار سے میری محسن بھی ہیں۔" خرم نے سکندر مرزا سے ماہ رخ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "اور ماہ رخ! سکندر میرے عزیز بھی ہیں، دوست بھی اور رازدار بھی۔ تم ان کے ساتھ تکلف سے کام نہ لینا۔ یہاں جیسے بھی حالات ہوں، بے خوف و خطر بیان کر دینا۔ اگر تم نے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تو مجھے شدید اذیت پہنچے گی۔"

"صاحبِ عالم! آپ مطمئن رہیں۔ یہ کنیز کسی مقام پر بھی آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔"

"بس اب جاؤ ماہ رخ! خدا تم سب لوگوں کو اپنی امان میں رکھے۔"

۞.....۞.....۞

شہزادہ خرم، مہرالنساء اور دوسری بیگمات کے لاہور روانہ ہوتے ہی ارسلان بیگ کو زیادہ آزادیاں حاصل ہو گئیں۔ وہ اسی روز آتمارام کی کٹیا میں پہنچا اور گیانی کے پاؤں چھو کر اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد بڑے اُداس لہجے میں بولا۔

"مہاراج! مجھے بڑا دکھ ہے کہ شہنشاہ نے آپ جیسے گیانی کا اس قدر اپمان کیا۔"

"یہ سب کچھ اس بھکاری کی وجہ سے ہوا، جو قید خانے میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔" آتمارام نے نفرت آمیز لہجے میں مبارک شاہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی اس ذلت کو کبھی فراموش نہیں کروں گا ارسلان! شہنشاہ سے بھی انتقام لینا ہے اور اس بھکاری سے بھی۔"

"آخر وہ بھکاری کون ہے جس نے بادشاہ کو سجدہ کرنا گوارا نہیں کیا اور قیدِ تنہائی قبول کر لی۔" ارسلان بیگ اس وقت بھی خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

"وہ آگرے کا ایک شعبدہ باز ہے، جس کی نہ بیوی ہے نہ بچے.....ایک تنہا انسان اگر قید خانے چلا گیا تو کون سا کمال ہو گیا؟ اگر مجھ پر میری قوم کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو میں بھی سمراٹ کے سامنے سجدے سے انکار کر دیتا اور کڑی سے کڑی سزا بھگتنے کو تیار ہو جاتا۔" گیانی آتمارام بڑے جھوٹ اور عیاری سے کام لے رہا تھا۔ "میں مصلحتاً خاموش ہوں۔ ابھی دیوتاؤں کی مرضی نہیں ہے۔ مگر وہ دن ضرور آئے گا، جب شہنشاہ جہانگیر کو اس کے کیے کی بھیانک سزا ملے گی۔"

"سزا کا آغاز ہو گیا ہے گیانی!" ارسلان نے آتمارام کی باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"کیسی سزا؟" گیانی نے چونک کر کہا۔

"اس سے بڑی سزا اور کیا ہو گی کہ بیٹے نے باپ کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔" ارسلان بیگ نے شہزادہ خسرو کے بارے میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے ہی ایک عمل کا نتیجہ ہے۔" گیانی نے ایک بار اور جھوٹ کا سہارا لیا۔ "وہ دن دُور نہیں جب یہ تمام باپ بیٹے آپس میں لڑ کر ہلاک و برباد ہو جائیں گے اور ایک بار پھر ہندوستان میں رام راج کا دور دورہ ہو گا.....مگر ہمارے راستے میں شہزادہ خرم حائل ہے..... جب تک اسے موت نہیں آئے گی، ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔"

"خرم کی زندگی اور موت کا راز میں جانتا ہوں۔" ارسلان بیگ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "اگر ارجمند اور اس کا رشتہ ٹوٹ جائے تو خرم جیتے جی مر جائے گا۔"

گیانی کچھ سوچنے لگا۔ "میں نے اب تک ہزاروں شوہروں اور بیویوں کے درمیان جدائی کی دیوار کھڑی کی ہے۔ پھر خرم اور ارجمند میرے حربے سے کس طرح بچ سکتے ہیں؟" آتمارام نے دعویٰ کرتے ہوئے کہا۔

گیانی آتمارام دیگر شعبدہ بازیوں کے علاوہ ایک اور خوفناک عمل بھی جانتا تھا، جس کے ذریعے وہ محبت کرنے والے شوہر اور بیوی کے درمیان پھوٹ ڈال دیتا تھا۔ اسی وجہ سے اُس کی شیطانی طاقتوں کی بہت شہرت تھی۔

"پھر تم نے اب تک ایسا کیوں نہیں کیا، گیانی؟" ارسلان بیگ نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "میری تو خواہش ہے کہ یہ دونوں جدا ہو جائیں اور ارجمند اتنی رُسوا ہو کہ آگرے کا بچہ بچہ اس کی ذلتوں کے افسانے سنے۔" شکست کے احساس نے ارسلان بیگ کو انتہائی پستیوں میں گرا دیا تھا۔

"وہ رُسوا بھی ہو گی اور مر بھی جائے گی۔" گیانی کے چہرے پر اس کی نفسانی خباثت اُبھر آئی تھی۔ "مگر تجھے ایک کام کرنا ہو گا۔"

"گیانی! آپ حکم دیں۔ میں اس کام کے لئے ہر منزل سے گزر جانے کو تیار ہوں۔" ارسلان بیگ اپنی نفرتوں کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"شہزادہ خرم کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس بھکاری، مبارک شاہ کو قتل کر دے۔" آتمارام نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو زیرِ زمین ایک کوٹھری میں قید ہے، جہاں قدم قدم پر سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔" ارسلان نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"تجھے وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔" گیانی نے نیا راستہ بتاتے ہوئے کہا۔ "زہر کی چند بوندیں اُس کے کھانے میں ملا دے۔" یہ کہہ کر آتمارام اُٹھا اور اپنے صندوق سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال لایا، جس کے اندر زرد رنگ کا کوئی محلول بھرا ہوا تھا۔ "یہ دنیا کا خوفناک ترین زہر ہے۔ بھکاری مبارک شاہ کے لئے اس کا ایک قطرہ کافی ہو گا۔"

ارسلان بیگ نے گیانی سے وہ شیشی لے لی اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ''یہ بہت مشکل کام ہے گیانی! مبارک شاہ قلندر کی سخت نگرانی ہو رہی ہے۔''

''سپاہیوں اور کھانا تیار کرنے والوں کو رشوت دیدے۔'' آتما رام نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ان کے منہ سونے سے بھر دے۔ پھر کس میں اتنی ہمت ہے کہ انکار کر سکے۔''

''میرے پاس اتنا سونا کہاں گیانی؟'' ارسلان بیگ نے مایوس لہجے میں کہا۔

''سونا میں تجھے فراہم کروں گا۔ بس تُو مبارک شاہ کو کسی طرح ہلاک کر دے۔'' یہ کہہ کر آتما رام اُٹھا اور اس نے سامنے رکھی ہوئی کرشن بھگوان کی مورتی کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں زمین پر ایک خلا سا نمودار ہوا۔ ارسلان بیگ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ خلا بڑھتے بڑھتے ایک دروازے کے برابر ہو گیا۔ ''میرے پیچھے پیچھے چلا آ۔'' آتما رام نے ارسلان بیگ سے مخاطب ہو کر کہا۔

ارسلان، خلا سے گزر کر نیچے پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں دُور تک پختہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک مختصر سی جھونپڑی کے نیچے ایک نئی دنیا آباد ہو گی۔ پھر گیانی نے ارسلان کو تمام کمرے کھول کر دکھائے۔ ہر کمرہ سونے کی چھوٹی بڑی اینٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ارسلان بیگ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بے اختیار چیخنے لگا۔

''اتنا سونا تو کسی بادشاہ کے پاس بھی نہیں ہو گا۔''

''ایک بادشاہ کا کیا ذکر ہے؟ تمام بادشاہ مل کر بھی اتنا سونا پیش نہیں کر سکیں گے۔'' آتما رام نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''میں سونے سے بھرا ہوا ایک کمرہ تیرے نام کر سکتا ہوں، اگر تُو مبارک شاہ کو ہلاک کر دے۔'' یہ کہہ کر آتما رام نے سونے کی تین چار اینٹیں اُٹھائیں اور ارسلان کی طرف بڑھا دیں۔ ''اس سونے سے ان لوگوں کو خرید لے اور پھر مبارک شاہ کا کام تمام کر دے۔''

ارسلان نے کسی بھوکے انسان کی طرح وہ سونے کی اینٹیں لے لیں اور انہیں ایک رومال میں چھپا لیا۔ وہ فطرتاً ایک لالچی انسان تھا۔ سونے کا سمندر دیکھ کر پاگل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد گیانی آتما رام اسی طرح اپنی جھونپڑی میں واپس آ گیا۔ کرشن کی مورتی کو ایک خاص زاویئے سے حرکت دی اور زمین میں پیدا ہونے والا خلاء ہموار ہو گیا۔

''اور ارجمند کا کیا ہو گا؟'' ارسلان نے مبارک شاہ کو کسی نہ کسی طرح موت کے گھاٹ اُتار دینے کا وعدہ کرتے ہوئے کہا۔

''تُو مجھے ارجمند اور شہزادہ خرم کی تصاویر فراہم کر دے۔ پھر میں ان دونوں کو اس طرح جدا کر دوں گا کہ وہ دونوں زندگی بھر آپس میں نہیں مل سکیں گے۔'' آتما رام نے کہا۔

''تصاویر تو نہیں مل سکتیں۔'' ارسلان نے مایوس ہو کر کہا۔ ''ہاں، یہ ممکن ہے کہ میں خود اُلٹی سیدھی لکیروں کے ذریعے ان کی تصویریں بنا سکوں۔'' ارسلان بیگ کو ایک زمانے میں مصوری کا بھی شوق رہا تھا۔ اس نے اپنے لڑکپن میں ایک ایرانی مصور سے یہ فن سیکھنے کی کوشش کی تھی

مگر پھر یہ شوق ادھورا رہ گیا تھا۔

''خواہ اُلٹی ہوں یا سیدھی، مجھے ہر حال میں ان دونوں کی تصویریں چاہئیں۔'' آتما رام نے کہا۔ ''تصویروں کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔''

ارسلان نے گیانی سے مبارک شاہ کو قتل کرنے کا وعدہ کیا اور جھونپڑی سے نکل کر شاہی محل چلا آیا۔ اب وہ قلندر کو ہلاک کرنے کے لئے مختلف منصوبوں پر سوچ رہا تھا۔

❀.....❀.....❀

جب شاہی بیگمات اور دوسری خواص کا قافلہ شہزادہ خرم کی نگرانی میں لاہور پہنچا تو جہانگیر نے شاہی محل سے نکل کر کئی میل کے فاصلے پر اپنی والدہ مریم زمانی بیگم کا استقبال کیا۔ شہزادہ پرویز ان لوگوں سے پہلے ہی دربار میں حاضر ہو چکا تھا۔ جہانگیر اپنے اہالیانِ خاندان کو ایک جگہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ خصوصاً جب اس نے مہرالنساء بیگم کو دیکھا تو ایک عجیب سے سرور کا احساس کیا۔

پھر اسی رات جہانگیر، مہرالنساء سے تنہائی میں ملا۔ ''مہرو! تم دیکھ رہی ہو، اس زمانے کی بے وفائیاں؟'' جہانگیر کے لہجے میں دل کا درد شامل تھا۔ ''ہمارے بیٹے کو ہمارا ہی سر چاہئے۔ اور یہ نمک حرام سپاہی، جنہیں ہم نے اپنا خون پلا کر پرورش کیا ہے، وہ ہمارے ہی جسم پر اپنی شمشیریں آزمانا چاہتے ہیں۔''

''کنیز کو ظلِ الٰہی کے کرب کا احساس ہے۔'' مہرالنساء نے اثر انگیز لہجے میں کہا۔

''تمہیں احساس ہی تو نہیں مہرو!'' جہانگیر نے شکایت کی۔ ''اگر احساس ہوتا تو خود بے قرار ہو کر لاہور چلی آتیں۔''

''آپ نے یاد فرمایا تو بلا تاخیر حاضر ہو گئی۔'' مہرالنساء نے ناز و ادا کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارا سینہ، آتشِ فراق سے پھنکا جا رہا تھا اور تم ہمارے حکم کا انتظار کر رہی تھیں۔'' جہانگیر کی شکایتوں کا سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ''آخر یہ کیسا احساس ہے؟ جب ہم جل کر خاک ہو جائیں گے، اس وقت تمہیں ہماری محبت اور وفا کا احساس ہو گا..... پھر تو بہت دیر ہو چکی ہو گی مہرالنساء بیگم!''

بڑے جذباتی لمحے تھے۔ مہرالنساء نے گھبرا کر جہانگیر کے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

''مجھ جیسی ہزاروں مہرالنساء، شاہ کے سکون پر قربان۔''

''یہ سب جھوٹی تسلیاں ہیں مہرو!'' جہانگیر کے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ ابھی تک سرد نہیں ہوئی تھی۔ ''تم ہمیشہ الفاظ سے بہلا کر چلی جاتی ہو..... محبت ہو یا جنگ، ہم ہر میدان میں عمل کے قائل ہیں۔''

''یہ عمل ہی تو ہے عالم پناہ! کہ مہرالنساء آپ کے اتنے قریب ہے۔ ایک مجبور اور بیوہ عورت

اس سے زیادہ کیا کر سکتی ہے؟'' مہرالنساء نے ایک بار پھر اپنی بے چارگی کا ماتم شروع کر دیا۔

''بھول جاؤ اس تلخ حقیقت کو کہ تم ایک بیوہ ہو۔'' جہانگیر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''بس اتنا یاد رکھو کہ تم ہماری محبوب ہو اور ہم ہندوستان کی تقدیر کے مالک ہیں۔''

''مگر دنیا تو یہی کہے گی کہ ایک بیوہ عورت نے اپنے آپ کو حکومت و اقتدار کے بازار میں فروخت کر دیا۔'' مہرالنساء بڑی ذہانت کے ساتھ اس جذباتی صورتِ حال کا سامنا کر رہی تھی۔

''کون سی دنیا؟'' جہانگیر اچانک برہم ہو گیا۔ ''وہ دنیا جو دن رات ہمیں سجدے کرتی ہے..... اُس کی کیا طاقت ہے کہ وہ تمہاری ذات پر انگشت نمائی کر سکے یا تمہارے بارے میں اپنے ہونٹوں کو جنبش دے سکے۔''

''عالم پناہ کس کس کی زبان اور کس کس کے ہاتھ کو روکیں گے؟'' مہرالنساء کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

''اگر سارا ہندوستان بھی اس میں شریک ہوا تو ہم ایک ایک ہاتھ اور ایک ایک زبان کاٹ کر پھینک دیں گے۔'' جہانگیر بری طرح مشتعل ہو گیا تھا۔

اور مہرالنساء یہی چاہتی تھی۔ پھر اچانک اس ذہین عورت نے نیا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہندوستان میں ایک سے ایک حسین دوشیزہ موجود ہے، جو عالم پناہ کی ایک جنبشِ لب پر حرمِ شاہی میں داخل ہو سکتی ہے۔''

''مگر ہندوستان میں کوئی دوسری مہرالنساء موجود نہیں۔'' جہانگیر نے اپنے جذبات کی پُرزور وکالت کرتے ہوئے کہا۔

''ظلِ الٰہی! میں ایک کنیز ہوں اور کنیز ہی رہوں گی۔'' مہرالنساء نے ایک اور چال چلی۔

''کیا یہ کافی نہیں کہ میں جہاں پناہ کے قدموں میں بیٹھے بیٹھے ساری عمر گزار دوں؟''

''تم کنیز نہیں، ہندوستان کی ملکۂ عالیہ ہو۔'' جہانگیر وارفتگی کے عالم میں بول رہا تھا۔ ''دنیا ہمیں حکمران سمجھتی ہے، مگر کوئی نہیں جانتا کہ ہم مہرالنساء کے سامنے ایک محکوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''اس سے زیادہ ایک کنیز کی عزت افزائی ممکن نہیں عالم پناہ!'' ملکۂ عالیہ بننے کے تصور سے مہرالنساء پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

''ہماری ذات تمہارے بغیر نامکمل ہے مہرو!'' جہانگیر مسلسل حُسن کے حضور میں اپنی درخواست پیش کر رہا تھا۔

''تکمیلِ ذات کا وقت بھی آ جائے گا، ظلِ الٰہی!'' مہرالنساء نے دبے لفظوں میں اقرار کر لیا تھا۔

جہانگیر اپنی محبوب کی زبان سے حرفِ اقرار سن کر خوشی سے جھوم اُٹھا۔ ''وہ وقت کب آئے گا مہرو؟'' شہنشاہ نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''پہلے آپ ملکی حالات پر قابو پا لیں۔'' مہرالنساء بڑی ہوشیاری سے یہ بازی کھیل رہی تھی۔

''ایسے سنگین لمحات میں حُسن و عشق کے قصے مناسب نہیں۔ اس کنیز کی تو خواہش ہے کہ آپ ساری دنیا تسخیر کر لیں۔ پھر جب کوئی سیاسی مسئلہ باقی نہ رہے تو پھر.....'' مہرالنساء نے قصداً اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''جب تم ہمارے دوش بدوش چلو گی تو ہم ایک دن دنیا کو بھی تسخیر کر لیں گے۔'' جہانگیر کا اضطراب ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔

''یہ کنیز، شہنشاہ کی خدمت سے گریز نہیں کرے گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں.....'' بات پھر نامکمل رہ گئی اور مہرالنساء نے شرما کر سر جھکا لیا۔

۞.....۞.....۞

اس دوران سکندر مرزا، ماہ رخ سے مل کر ارجمند بانو کی خیریت دریافت کرتا رہا اور پھر سرکاری ڈاک کے ذریعے شہزادہ خرم کو تمام حالات سے مطلع کرتا رہا۔ شروع میں تو سکندر مرزا نے ماہ رخ کی دلکش شخصیت کا کوئی خاص تاثر نہیں لیا، مگر پھر ایک دن اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ غیر شعوری طور پر ماہ رخ کی جانب کھنچتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ماہ رخ کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ سکندر مرزا کی نگاہوں کا زاویہ بدلتا جا رہا ہے۔

پھر ایک دن سکندر مرزا نے اس کے خاندانی حالات دریافت کئے تو ماہ رخ نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ ایک مرحوم سپاہی کی بیٹی ہے اور اس کی پرورش وزیراعظم آصف خان نے کی ہے۔ ارجمند بانو سے اس کا کوئی خاندانی رشتہ نہیں اور وہ ایک کنیز سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ آخر میں ماہ رخ نے یہاں تک کہہ دیا۔

''آپ میرے خاندانی حالات معلوم کرنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھیں۔''

ماہ رخ کا جارحانہ جواب سن کر سکندر مرزا کو شدید مایوسی ہوئی تھی مگر وہ پھر بھی ماہ رخ کو فراموش نہیں کر سکا تھا۔ ایک کنیز کی محبت آہستہ آہستہ اس کے دل میں اُترتی جا رہی تھی۔

ادھر سکندر مرزا ایک نئے انقلاب سے دوچار تھا اور اِدھر ارسلان بیگ نے قیدیوں کے لئے کھانا پکانے والے رحیم بخش سے مل کر مبارک شاہ کے کھانے میں زہر ملوا دیا تھا۔ پہلے تو ارسلان بیگ کی باتیں سن کر رحیم بخش ڈر گیا تھا، مگر جب اس نے اپنی نظروں کے سامنے سونے کی چار بڑی بڑی اینٹیں دیکھیں تو وہ پگھلنے لگا۔ دولت کی ہوس اسے مسلسل جرم کرنے پر اُکسا رہی تھی۔

پھر بھی اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر یہ راز کھل گیا تو میرا کیا حشر ہو گا؟ شہنشاہ مجھے اور میرے خاندان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

ارسلان نے اپنی فطری عیاری سے کام لیتے ہوئے رحیم بخش کو باتوں میں اُلجھا لیا۔ ''تُو جانتا ہے کہ مبارک شاہ ایک نفرت زدہ مجرم ہے۔ اس نے شہنشاہ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

مطبخ کے نگراں رحیم بخش نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

''اگر مبارک شاہ اس زہر سے ہلاک ہو گیا اور اس کے قتل کی تحقیقات شروع ہوئیں تو تجھ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔'' ارسلان بیگ نے رحیم بخش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تُو صاف صاف کہہ دینا کہ میں نے شہنشاہ کے نافرمان مجرم کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ پھر تیرا یہ جرم ایک کارنامہ بن جائے گا اور شہنشاہ تجھے سزا دینے کے بجائے ایک بڑے انعام سے نوازیں گے۔''

رحیم بخش، ارسلان بیگ کی پُرفریب باتوں میں آ گیا اور پھر اس نے مبارک شاہ کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ ارسلان بیگ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اس نے سونے کی چار اینٹیں رحیم بخش کو دے دیں اور مبارک شاہ کی موت کی خبر سننے کا انتظار کرنے لگا۔

سکندر مرزا وقتِ مقررہ پر آیا اور اپنی نگرانی میں کھانا لے کر مبارک شاہ کے پاس پہنچا۔

''یہ کھانا کسی پاگل کتے کے آگے ڈال دے۔ پھر تجھے اندازہ ہو گا کہ اس میں کتنا خوف ناک زہر ملا ہوا ہے۔'' مبارک شاہ نے کھانے کو دیکھتے ہی کہا۔

یہ خوف ناک انکشاف سن کر سکندر مرزا لرز گیا۔ ''میں بے قصور ہوں قلندر!'' سکندر مرزا کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں۔ مگر دوسرے تو بے قصور نہیں ہیں۔'' مبارک شاہ نے جواباً کہا اور کوٹھری کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے نعرہ زنی کی۔ ''اے خدا!''

پھر جب داروغہ کی نگرانی میں کھانا ایک کتے کو کھلایا گیا تو وہ چند لمحوں میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ سکندر مرزا دوبارہ قلندر کے پاس گیا اور بہت دیر تک اپنی غفلت و کوتاہی کی معافی مانگتا رہا۔ مبارک شاہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تُو کیوں پریشان ہوتا ہے؟..... جس نے گناہ کیا ہے، وہی اس کی سزا بھی کاٹے گا۔ جب تک مبارک شاہ کی زندگی ہے، اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ مگر کتے کی موت کا غم ضرور ہے کہ ایک معصوم جانور، انسانی ہوس کا نشانہ بن گیا۔''

داروغۂ زنداں نے اس واقعے کی تفتیش کرنا چاہی لیکن سکندر مرزا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب شہزادۂ عالم آگرہ تشریف لائیں گے تو اس مسئلے کو دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ فی الوقت کسی سے باز پرس نہ کی جائے۔

پھر اسی دن سرکاری ڈاک کے ذریعے سکندر مرزا نے خرم کو ایک طویل خط لکھا جس میں قلندر کو زہر دینے کا واقعہ بھی تفصیل سے تحریر کیا گیا تھا۔

۞.....۞.....۞

ارسلان بیگ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے آتمارام کو پورا واقعہ سنایا تو گیانی ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ ''مبارک شاہ بڑا جادوگر ہے۔ بہت بڑا۔ تیرے اندازے سے بھی بڑا۔''

''پھر کیا ہو گا مہاراج؟'' ارسلان بیگ نے دہشت زدہ انداز میں سوال کیا۔

''شہنشاہ کی آمد سے پہلے اس باورچی کو قتل کر دے۔ ورنہ راز کھل جائے گا اور تیرے لئے ایک مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔'' آتمارام نے ارسلان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

مزید سونے کے لالچ میں رحیم بخش، آتمارام کی جھونپڑی میں چلا گیا اور پھر ارسلان بیگ نے گیانی کے خدمت گار، دھرم پال کے ساتھ مل کر رحیم بخش کو زدوکوب کیا اور جب وہ بے ہوش ہو گیا تو اسے دریائے جمنا کے حوالے کر دیا گیا۔ پھر پانی کی تیز لہریں اس کے جسم کو بہا کر دُور لے گئیں۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ارسلان بیگ نے پوچھا۔ ''مہاتما! اب میرے لئے کیا حکم ہے؟''

''اب تو شہزادہ خرم اور ارجمند کے ساتھ ساتھ مبارک شاہ کی تصویر بھی بنائے گا۔'' آتمارام نے کہا۔ ''اس جادوگر پر قابو پانے کا اب یہی ایک طریقہ ہے۔''

''مہاراج! آپ تصویروں کا کیا کریں گے؟'' ارسلان نے پُرتجسس لہجے میں سوال کیا۔

''تُو اپنا کام جاری رکھ۔ ہمارے معاملات میں دخل اندازی نہ کر۔'' آتمارام نے سخت لہجے میں کہا۔

ارسلان بیگ، گیانی کی جھونپڑی سے نکل کر شاہی محل چلا آیا اور اپنی یادداشت کے سہارے خرم، ارجمند اور مبارک شاہ کی تصویریں بنانے لگا۔

تین دن بعد جب وہ تصویریں لے کر گیانی کے پاس پہنچا تو آتمارام نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے شہزادہ خرم کو دیکھا ہے۔ یہ تصویر اس کی شکل و صورت سے نہیں ملتی۔ بس دُھندلی سی مشابہت نظر آتی ہے۔''

''میں نے مہاراج کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں مصور نہیں ہوں۔'' ارسلان بیگ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ان تصویروں کے بنانے میں اپنے تین دن برباد کئے اور تین راتیں کالی کی ہیں۔''

''خیر، میں ان ہی تصویروں سے اپنا کام نکال لوں گا۔'' آتمارام نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر اپنے خدمت گار، دھرم پال کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''گوپی چند بت تراش کو میرے پاس بلا کر لے آؤ۔''

دھرم پال چلا گیا اور پھر کوئی دو گھنٹے بعد وہ ایک ادھیڑ عمر شخص کو لے کر جھونپڑی میں داخل ہوا۔ آنے والا گوپی چند بت تراش تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر آتمارام کے قدم چھوئے اور بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں بولا۔ ''مہاراج نے مجھے کس لئے یاد کیا ہے؟''

آتمارام نے ارسلان کی بنائی ہوئی تصویریں گوپی چند کے سامنے رکھ دیں۔ ''تجھے ان تصویروں کو قد آدم مجسموں میں ڈھالنا ہے۔ ایسے مجسمے کہ منہ سے بولتے نظر آئیں۔''

گوپی چند بت تراش ان تصویروں کو غور سے دیکھتا رہا، پھر منہ بنا کر بولا۔ ''یہ تصویریں تو بہت ناقص ہیں۔''

''ہم نے تجھے اسی لئے بلایا ہے تُو کہ اُن میں جان ڈال دے اور ان کے بگڑے ہوئے نقش و نگار کو اپنے باکمال ہاتھوں سے سنوار دے۔'' آتمارام نے گوپی چند کے فن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر تجھے یہ مجسمے اسی جھونپڑی میں تراشنے ہوں گے۔''

گوپی چند نے اقرار میں اپنے سر کو جنبش دی اور دوسرے دن سے کام شروع کرنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

بت تراش کے جاتے ہی آتمارام نے انتہائی پُرجوش لہجے میں ارسلان بیگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تُو اپنی آنکھوں سے ان تینوں کی رسوائی کے عبرت ناک مناظر دیکھنا۔ شہنشاہ نے گیانی کو ذلیل کر کے اچھا نہیں کیا۔''

''مگر اس میں شہنشاہ کی تصویر تو شامل نہیں ہے۔'' ارسلان بیگ نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ وہ تو خود ہی گمراہ ہے۔ نہ ہندو ہے، نہ مسلمان۔'' گیانی نے جہانگیر کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے ہمیں مبارک شاہ اور شہزادہ خرم کو دیکھنا ہے کہ یہی دونوں ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔''

''اور ارجمند بانو؟'' ارسلان نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہ بے چاری لڑکی ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ مگر اسے تو اس لئے سزا دی جا رہی ہے کہ اس کی تکلیف سے خرم کو اذیت پہنچے گی اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے گا۔''

گیانی کی اس وضاحت کے بعد ارسلان بیگ اپنے خیالوں کی دنیا میں ارجمند اور خرم کو بچھڑتے اور پھر دیواروں سے سر ٹکراتے دیکھتا رہا۔

❀.....❀.....❀

سکندر مرزا کے خط نے شہزادہ خرم کو بدحواس کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر مبارک شاہ کو کس نے زہر دینے کی کوشش کی۔ پھر اچانک اس کا خیال شہنشاہ جہانگیر کی طرف چلا گیا۔ کیا عالم پناہ نے روانگی کے وقت در پردہ کسی کو حکم دیا تھا کہ وہ مبارک شاہ کو زہر دیدے؟..... اس طرح شہنشاہ کا دامن قلندر کے خون سے پاک رہے گا۔

یہ بڑا تکلیف دہ خیال تھا۔ مگر خرم نے فوراً ہی اس خیال کی تردید کر دی۔ ''مبارک شاہ، ظلِ الٰہی کی قید میں ہے۔ اسے عالم پناہ کی موجودگی میں زہر دیا جائے یا غیر موجودگی میں۔ الزام تو بہرحال شہنشاہ پر ہی آئے گا۔'' خرم نے سوچا۔ ''پھر وہ کون شخص ہے جو مبارک شاہ کی زندگی کا دشمن ہے؟'' شہزادہ خرم بہت دیر تک خیالوں کی دنیا میں بھٹکتا رہا مگر وہ زہر دینے والے شخص کا سراغ نہ لگا سکا۔ سکندر مرزا نے لکھا تھا۔ ''آپ کے آنے کے بعد اس واقعہ کی تفتیش کی جائے

گی۔ فی الوقت میں مبارک شاہ کو اپنے گھر کا کھانا کھلاتا ہوں۔''

شہزادہ خرم، سکندر مرزا کا خط پڑھ کر بظاہر مطمئن ہو گیا تھا مگر دلی طور پر اس کی شدید خواہش تھی کہ شہنشاہ اسے آگرہ جانے کی اجازت دے دیں۔ ارجمند کو دیکھے ہوئے ابھی صرف تین ماہ گزرے تھے لیکن خرم کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے تین صدیاں بیت گئی ہوں۔

❀.....❀.....❀

گوپی چند بت تراش نے بڑی محنت سے ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کے مجسمے بنا دیئے تھے۔ مگر جب اس نے مبارک شاہ کی تصویر کو مجسمے میں ڈھالنے کی کوشش کی تو اس پر ایک عجیب سی دہشت طاری ہو گئی۔ گوپی چند نے گھبرا کر آتمارام سے پوچھا۔

''یہ کون شخص ہے؟''

''یہ آگرے کا ایک بھکاری ہے۔'' آتمارام نے کہا۔

''مجھے اس بھکاری کے چہرے سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' گوپی چند نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے آج تک ایسا کوئی بھکاری نہیں دیکھا، جس کی تصویر میں بھی جلال کی آگ نمایاں ہو۔''

''یہ تیرا وہم ہے گوپی!'' آتمارام نے بت تراش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تُو اس شخص کو نہیں جانتا، یہ ہندوؤں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ تجھے ہر حال میں اس کا مجسمہ بنانا ہوگا۔ دیوتا تیری مدد کریں گے۔ یہ ہندو دھرم کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔''

''گیانی! آپ اس مجسمے کا کیا کریں گے؟'' گوپی چند نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''میں اس بھکاری کے مجسمے پر جادو کر دوں گا۔ پھر مبارک شاہ مر جائے گا یا ہمیشہ کے لئے اس کی روحانی طاقتیں ختم ہو جائیں گی۔'' آتمارام نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''گوپی چند! ہمت کر، میں تیرے گھر کو سونے سے بھر دوں گا اور اگر تُو نے ایسا نہیں کیا تو دیوتا تجھے شراپ (بد دُعا) دیں گے اور تیری ساری کلا، نشٹ ہو جائے گی۔''

گوپی چند شدید اذیت میں مبتلا تھا۔ آخر اُس نے آتمارام کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر مبارک شاہ قلندر کا مجسمہ تراشنا شروع کر دیا۔ اس دوران گوپی چند پر غیر معمولی دہشت طاری رہی اور پھر جیسے ہی اس نے مبارک شاہ کا چہرہ بنانا چاہا، اس کے ہاتھوں سے سنگ تراشی کے اوزار چھوٹ کر زمین پر گر پڑے اور گوپی چند چیخنے لگا۔

''یہ میرے ہاتھوں کی طاقت کس نے چھین لی؟..... یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟..... میں اپنے ہاتھوں کو حرکت بھی نہیں دے سکتا۔''

گوپی چند بت تراش کی چیخیں سن کر آتمارام اور ارسلان بیگ سمجھے کہ وہ نفسیاتی طور پر مبارک شاہ سے متاثر ہو چکا ہے، اس لئے اپنے ہاتھوں کی طاقت چھن جانے کا ماتم کر رہا ہے۔

پھر جب دیر تک اس کی چیخیں بند نہیں ہوئیں تو آتمارام اپنی جگہ سے اُٹھا اور گوپی چند کے قریب جا کر بولا۔

"یہ تُو نے کیسا شور مچا رکھا ہے؟" گیانی کا لہجہ بہت تند و تیز تھا۔

"مہاراج! میں سچ کہتا ہوں کہ میرے ہاتھوں کی طاقت ختم ہو گئی۔" گوپی چند اچانک رونے لگا۔ "میں انہیں جنبش بھی نہیں دے سکتا۔"

اب آتمارام کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے گوپی چند کے دونوں ہاتھوں کو چھو کر دیکھا۔ واقعتاً وہ پتھر کی طرح سخت ہو گئے تھے۔

"مجھے میرے ہاتھ لوٹا دو گیانی!" گوپی چند نے کسی بھکاری کی طرح گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "یہی ہاتھ میری سمپتی (دولت) ہیں۔ اگر یہ مجھ سے چھن گئے تو میرے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔" گوپی چند کے بہتے ہوئے آنسو اُس کے سینے کو بھگونے لگے تھے۔

آتمارام نے کبھی زیرِ لب اور کبھی اونچی آواز سے بے شمار منتر پڑھ ڈالے مگر گوپی چند کے ہاتھ ویسے ہی پتھر بنے رہے۔

"یہ سب آکاش کی کرنی ہے گوپی چند! میں تجھے تیرے ہاتھوں کی شکتی نہیں لوٹا سکتا۔" آتما رام نے صاف صاف کہہ دیا۔

"کاش! تم نے میری بات مان لی ہوتی گیانی!" گوپی چند کے آنسو کچھ اور تیزی سے بہنے لگے۔ "میں تو مبارک شاہ کی تصویر دیکھ کر ہی لرز گیا تھا، مگر تمہاری ضد نے مجھے مجسمہ بنانے پر مجبور کر دیا اور پھر اس کے نتیجے میں میرے دونوں ہاتھ ضائع ہو گئے۔ اب میں کیا کروں گیانی؟ مجھے راستہ دکھاؤ۔ پورے پریوار کا بوجھ میرے کاندھوں پر ہے اور یہ کاندھے شاید ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئے ہیں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں گوپی چند؟" آتمارام نے بڑی عیاری سے اپنا دامن بچاتے ہوئے کہا۔

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ میں تیرا منہ سونے سے بھر دوں گا۔" گوپی چند نے آتمارام کو اس کی باتیں یاد دلائیں۔

آتمارام کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر وہ اپنے زیرِ زمین کمرے میں پہنچا اور سونے کی تین بڑی بڑی اینٹیں لا کر گوپی چند کے سامنے ڈال دیں۔ "میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ اس سونے کو بیچ کر بیوی بچوں کا پیٹ پال اور اپنا علاج بھی کرنا۔ یہ اتنا سونا ہے کہ تیرا پریوار کوئی کمائی کئے بغیر زندگی کے باقی دن کاٹ سکتا ہے۔"

سونے کی اینٹیں دیکھ کر گوپی چند کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے۔ "گیانی! تمہارا بہت بہت شکریہ کہ اس آڑے وقت میں تم نے مجھے نراش نہیں کیا۔" یہ کہہ کر گوپی چند، سونا اُٹھانے کے لئے جھکا مگر اپنے ہاتھوں کو مفلوج پا کر دوبارہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "مجھے یاد نہیں رہا تھا گیانی! کہ میں دوسروں کا محتاج ہو چکا ہوں۔ اب تم ہی اس سونے کو اُٹھا کر میری جیبوں میں

ڈال دو۔"

گوپی چند کا مایوس لہجہ اور بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر گیانی آتمارام بھی ایک لمحے کے لئے لرز گیا تھا مگر اس نے دوسرے ہی لمحے اپنے آپ پر قابو پایا اور سونے کی اینٹیں اٹھا کر گوپی چند کی دونوں جیبوں میں ڈال دیں۔

گوپی چند نے جھونپڑی سے رخصت ہوتے ہوئے آتمارام سے کہا۔ "گیانی! میرے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرنا۔ شاید اسے مجھ پاپی پر ترس آ جائے۔"

آتمارام نے بت تراش کو جھوٹی تسلیاں دے کر رخصت کر دیا۔ پھر جیسے ہی گوپی چند جھونپڑی سے نکل کر باہر گیا، ارسلان بیگ نے انتہائی خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"مہاراج! بھکاری مبارک شاہ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ہم نے اسے زہر دینے کی کوشش کی مگر وہ صاف بچ گیا۔ اس کی جاگتی آنکھوں نے وقت سے پہلے ہی زہر آلود غذا کو پہچان لیا۔ اب اس کی طرف سے ایک اور مصیبت نازل ہوئی کہ گوپی چند کے دونوں ہاتھ مفلوج ہو گئے۔ یہ بڑی خوف ناک تنبیہہ ہے گیانی!"

"تُو اس بھکاری سے ڈرتا ہے۔" آتمارام نے ارسلان کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ "زہر آلود غذا کا پہچان لینا کوئی تا بڑا کمال نہیں۔ آخر وہ بھی ایک جادوگر ہے۔ دراصل میں اس کی طاقت کو آزمانا چاہتا تھا۔" آتمارام نے اپنی شکست کو چھپانے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا۔ "اور گوپی چند کا مفلوج ہو جانا محض ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ اس کا مبارک شاہ کی روحانی طاقت سے کوئی تعلق نہیں۔"

"پھر بھی گیانی! میری رائے یہی ہے کہ مبارک شاہ کو نہ چھیڑا جائے۔" ارسلان بدستور خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

"جو ہمارا سب سے خوف ناک دشمن ہے، اسی کو چھوڑ دوں؟" گیانی آتمارام نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "مبارک شاہ کو اس وقت نظر انداز کیا جا سکتا تھا، جب وہ شہزادہ خرم کا ساتھ نہ دیتا۔ میرا گیان بتاتا ہے کہ شہزادہ خرم ہمارے لئے بہت خطرناک ثابت ہو گا۔ اگر وہ تختِ شاہی تک پہنچ گیا تو ہمارے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ شاہی محل میں اذان کے بجائے ناقوس کی آواز گونجے۔ مسجدوں کی جگہ مندر تعمیر کئے جائیں۔ شہزادہ خرم اگرچہ ایک ہندو عورت کی اولاد ہے، لیکن بچپن ہی میں شہنشاہ نے اسے اس کی آغوش سے دور کر دیا تھا۔ پھر سلطان سلیمہ بیگم کی تربیت نے خرم کو بدل ڈالا۔ نہ وہ شراب پیتا ہے اور نہ محل کی کنیزوں سے دل بہلاتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کم بخت مبارک شاہ نے شہزادے کو کچھ اور بھڑکا دیا ہے۔" آتمارام اپنی ناکامیوں کو یاد کر کے مبارک شاہ کے خلاف زہر اُگل رہا تھا۔

"جب تک مبارک شاہ زندہ ہے، ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"پھر اس سے نجات حاصل کرنے کی کیا صورت ہو گی؟" ارسلان بیگ وحشت زدہ نظر آ

رہا تھا۔

''میں اسی مجسمے کے ذریعے اسے شکست دینے کی کوشش کروں گا۔'' آتمارام نے گوپی چند کے بنائے ہوئے نامکمل مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر مجسمہ تو نامکمل ہے۔'' ارسلان بیگ نے ابھی تک گیانی کی باتوں کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا تھا۔ ''یہ مبارک شاہ کا چہرہ ہی معلوم نہیں ہوتا۔''

''میں اسے کسی دوسرے بت تراش سے مکمل کراؤں گا۔'' آتمارام نے کہا۔

پھر گیانی نے اپنے خدمت گار، دھرم پال کو حکم دیا کہ وہ بیک وقت کئی سنگ تراش لے کر آئے تاکہ یہ مجسمہ مکمل ہو سکے۔ دھرم پال نے فوراً اپنے گرو کے حکم پر عمل کیا اور آگرے کے گوشے گوشے سے ڈھونڈ کر آٹھ سنگ تراش لے آیا۔ تمام سنگ تراشوں نے گوپی چند کے بنائے ہوئے مجسمے کی بہت تعریف کی۔ اس لئے کہ وہ آگرے کا سب سے بڑا مجسمہ ساز تھا۔ آتمارام نے صورتِ حال کو چھپاتے ہوئے گوپی چند کی اچانک بیماری کا ذکر کیا اور ان سنگ تراشوں سے کہا کہ اگر وہ اس مجسمے کا چہرہ مکمل کر دیں گے تو انہیں منہ مانگی رقم دی جائے گی۔

سنگ تراش اس بھاری پیش کش سے متاثر ہو کر لالچ میں آ گئے اور بڑے بڑے دعوے کرنے لگے۔ مگر جب انہیں مبارک شاہ کی تصویر دکھائی گئی تو وہ سب کے سب خوف زدہ رہ گئے۔

''ہم اس چہرے کو بنانے سے قاصر ہیں۔''

آتمارام، سنگ تراشوں پر برس پڑا۔ ''آخر اس چہرے میں ایسی کون سی بات ہے کہ تم اسے پتھر پر نقش نہیں کر سکتے؟''

''اس چہرے کو دیکھ کر ہمیں اس قدر خوف محسوس ہوتا ہے، جیسے ہمارا دم گھٹ جائے گا۔''

پھر بھی ایک سنگ تراش نے ہمت کی اور مبارک شاہ کا چہرہ تراشنے کے لئے مجسمے کی طرف بڑھا مگر جیسے ہی اس نے اپنے اوزار اُٹھائے اور مجسمے کے سر پر پہلی ضرب لگائی، اس کے ہاتھ بھی گوپی چند کی طرح مفلوج ہو گئے۔ سنگ تراش، رانومل چند لمحوں تک اپنے شل ہو جانے والے ہاتھوں کو دیکھتا رہا، پھر وہ گوپی چند کی طرح چیخنے لگا۔

''بھگوان کے لئے میرے ہاتھ مجھے لوٹا دو۔''

باقی سنگ تراش خود ہی دہشت زدہ ہو کر جھونپڑی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بس ایک رانومل رہ گیا تھا، جسے بعد میں دھرم پال نے دھکے دے کر نکال دیا۔

اب گیانی آتمارام بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ ارسلان بیگ کی حالت کسی ڈرے سہمے بچے کی مانند تھی۔

''گیانی! میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ مبارک شاہ سے بدلہ لینے کا خیال ترک کر دو۔ ہماری نظروں کے سامنے اب تک گوپی چند اور رانومل مفلوج ہو چکے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جو بھی اس مجسمے کو چھوئے گا، وہ پتھر کا ہو جائے گا۔''

گیانی آتمارام بہت دیر تک آنکھیں بند کئے اپنے خیالات میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے دھرم پال کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''قریب کے دیہات سے چند مزدور پکڑ لاؤ اور اس مجسمے کو اُٹھا کر دریائے جمنا میں ڈال دو۔''

دھرم پال نے ایسا ہی کیا۔ جس وقت وہ مزدور مجسمے کو اُٹھا رہے تھے ارسلان بیگ اور آتما رام کا خیال تھا کہ وہ سب کے سب بھی مفلوج ہو جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ تمام مزدور محفوظ رہے اور انہوں نے مجسمے کو دریا میں پھینک دیا۔

''ان مزدوروں کو تو کوئی بھی ضرر نہیں پہنچا۔'' آتمارام نے ارسلان سے کہا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں مہاراج؟'' ارسلان کے چہرے پر اب بھی خوف و دہشت کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ ''یہ سب ایسے گیان کی باتیں ہیں، جسے میں نہیں جانتا۔''

آتمارام مسکرانے لگا۔ ''میں نے مبارک شاہ کی جادوگری سے خوف زدہ ہو کر مجسمے کو دریا میں نہیں پھنکوایا ہے۔'' گیانی نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''یہ تو میرے آئندہ عمل کا ایک حصہ ہے۔ اب میں اسے دریا میں غرق کر کے ماروں گا۔''

''مگر وہ تو شاہی قید خانے میں ہے۔'' ارسلان بیگ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''مورکھ! دریا میں غرق کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے مبارک شاہ کی شخصیت کو پانی کی تہہ میں ڈال کر اسے کیچڑ کے حوالے کر دیا۔'' آتمارام کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ ''اب اس کی روحانی طاقت آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔ پھر ایک دن وہ عام گداگر کی طرح آگرے کی گلیوں میں بھیک مانگتا نظر آئے گا۔ اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک مجسمے کو دریا سے نکال کر میرے منتر کا توڑ نہیں کر دیا جاتا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں مبارک شاہ کی ساحرانہ طاقتوں سے نجات مل گئی۔'' اچانک ارسلان بیگ کے چہرے پر زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

''یقیناً۔'' آتمارام نے دعویٰ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب وہ شہزادہ خرم کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔''

''مجھے افسوس ہے کہ کوئی بھی سنگ تراش، مبارک شاہ کا مجسمہ مکمل نہ کر سکا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر وہ میری گرفت سے بچ نہیں سکتا تھا۔ میں اسے تڑپا تڑپا کر ہلاک کر ڈالتا۔ یہاں تک کہ اس کا جسم کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا۔'' آتمارام نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔

''مبارک شاہ کا بے اثر ہو جانا بھی ہمارے لئے کافی ہے۔'' ارسلان بیگ نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر گیانی! آج مجھے اتنا ضرور بتا دو کہ تمہیں خرم سے اتنی نفرت کیوں ہے؟ کیا تم صرف میری خاطر شہزادے کو برباد کرنا چاہتے ہو؟''

''خرم کی بربادی سے تیرا بھی بھلا ہو جائے گا۔'' آتمارام نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ایک میں ہی نہیں، ہندوستان کے سارے گیانی، پنڈت اور جوتشی اس راز سے باخبر ہیں کہ خرم کی حکومت، اکبر اور جہانگیر کی سلطنت سے مختلف ہو گی۔ وہ اپنے مذہب کے لئے بڑے کارنامے انجام دے

گا اور اس کے یہی کارنامے ہمارے لئے موت کا پیغام ثابت ہوں گے۔ بس یہی وجہ ہے کہ گیانیوں کی پوری جماعت شہزادہ خرم سے نفرت کرتی ہے۔ اگر وہ اپنے باپ اور دادا کے نقش قدم پر چلنے کے لئے آمادہ ہو جائے تو ہم آج ہی اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیں۔ مگر وہ ایسا نہیں کرے گا۔ مجبوراً ہمیں باپ اور بیٹوں کو آپس میں لڑانا ہوگا۔"

"یہ لوگ کس طرح لڑیں گے؟ اتنے قریبی رشتے ایک دوسرے سے جنگ نہیں کر سکتے۔" ارسلان بیگ نے اپنی دلی مسرت کو چھپاتے ہوئے مصنوعی حیرت کے لہجے میں کہا۔

"جیسے خسرو اور جہانگیر لڑ رہے ہیں۔" آتمارام نے ایک مضبوط دلیل دیتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارے عمل ہی کا نتیجہ ہے کہ خسرو، باغیوں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ اب ان دونوں باپ بیٹے کے دلوں سے نفرت کے غبار کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں دھو سکتی۔"

ارسلان بیگ نے گیانی کی عظمت کا نعرہ بلند کیا اور شاہی محل جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تُو مبارک شاہ پر نظر رکھنا۔ آج کے بعد سے وہ آہستہ آہستہ بیمار ہونے لگے گا۔" آتمارام نے ارسلان بیگ سے کہا اور زیر لب کسی منتر کا جاپ کرنے لگا۔

❀.....❀.....❀

گوپی چند پت تراش بڑے کرب میں مبتلا تھا۔ جب اس نے اپنے بیوی بچوں اور بوڑھے ماں باپ کو اس ناگہانی حادثے کی خبر دی تو وہ سب رونے لگے۔ گوپی چند نے اُنہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں بڑے سے بڑے وید کا علاج کراؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں بعد میرے ہاتھوں کی طاقت لوٹ آئے گی۔"

"مگر اتنے قیمتی علاج کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟" گوپی چند کی بیوی کے آنسو جاری تھے۔

"تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" گوپی چند نے اپنے بد حال خاندان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "بھگوان گیانی آتمارام کا بھلا کرے کہ انہوں نے تین مجسمے بنانے کے عوض مجھے اتنا سونا دے دیا ہے کہ برسوں تک ہمیں کسی دُشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

"کہاں ہے وہ سونا؟" گوپی چند کی بیوی نے گھبرا کر پوچھا۔

"میری جیبوں میں موجود ہے۔ اپنے ہاتھ سے نکال لو۔" گوپی چند نے بڑے اُداس لہجے میں کہا۔ اب وہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے بھی دوسروں کا محتاج ہو گیا تھا۔

پھر جب گوپی چند کی بیوی نے شوہر کی جیب سے سونے کی اینٹیں نکالیں تو حیران رہ گئی۔

"یہ تو پتھر ہیں۔"

گوپی چند نے ان پتھروں کو دیکھا تو شدتِ کرب سے چیخ اُٹھا۔ "گیانی آتمارام! تُو نے ایک مجبور انسان کے ساتھ اس قدر سنگین مذاق کیا۔"

پھر وہ ان پتھروں کو لے کر گیانی کے پاس پہنچا۔ "میرے ہاتھ چھین کر اس کے بدلے میں مجھے پتھر دے دیئے۔" گوپی چند بری طرح چیخ رہا تھا۔

"تُو پاگل ہو گیا ہے۔" آتمارام نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "تُو پاپی ہے، اس لئے سونا بھی تیرے ہاتھوں میں پہنچ کر پتھر بن جاتا ہے۔ غور سے دیکھ! یہ پتھر ہیں یا سونے کی اینٹیں؟"

گوپی چند نے گھبرا کر پتھروں کی طرف دیکھا۔ یکایک وہ چاروں پتھر، سونے کی اینٹوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ "گیانی! میں تجھ سے اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے تجھ جیسے مہا پرش پر شک کیا۔ ان اینٹوں کو دوبارہ میری جیب میں ڈال دے تاکہ میں اپنے علاج کے ساتھ ساتھ بیوی بچوں کی پرورش کر سکوں۔"

گیانی نے اپنے خدمت گار، دھرم پال کو حکم دیا۔ سونے کی اینٹیں دوبارہ گوپی چند کی جیبوں میں ڈال دی گئیں۔ وہ خوشی خوشی گھر پہنچا۔ مگر جب اس کی بیوی نے وہ سونے کی اینٹیں نکالیں تو ایک بار پھر اس کے ہاتھوں میں پتھر آ گئے۔ گوپی چند یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر وہ تیسری مرتبہ آتمارام کے پاس پہنچا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "گیانی! یہ کیسا کھیل ہے کہ تیرا دیا ہوا سونا میرے گھر پہنچتے ہی پتھروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"

"تُو بڑا ابھاگی (بدقسمت) ہے، گوپی چند!" گیانی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "اب تیرا کوئی علاج ممکن نہیں۔ تُو اتنا بڑا پاپی ہے کہ تیرے ناپاک ہاتھ، سونے کو بھی پتھر بنا دیتے ہیں۔"

گوپی چند اپنی بدنصیبی کا ماتم کرتا ہوا گھر چلا آیا۔ اب اُسے کون سمجھاتا کہ گیانی آتمارام ایک شعبدہ باز ہے۔ وہ نظر بندی کے ذریعے کچھ دیر کے لئے پتھروں کو سونا بنا دیتا تھا اور پھر جیسے ہی گوپی چند اُس کی نظروں سے دُور ہوتا تھا، پتھر اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو جاتے تھے۔

اس حادثے کے بعد گوپی چند کے مالی حالات بہت خراب ہو گئے۔ پہلے سے بنائے ہوئے رام، سیتا، راون اور ہنومان کے مجسمے دیوالی اور دسہرے کے تہواروں پر فروخت ہوتے رہے اور اس کے گھر والے بمشکل روکھی سوکھی روٹی کھا کر گزر کرتے رہے۔ کچھ بڑے ویدوں نے گوپی چند کی غریبی پر ترس کھا کر اس کا علاج بھی کیا، مگر وہ بری طرح ناکام ہو گئے۔ آخر انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ گوپی چند کا مرض لاعلاج ہے۔ گوپی چند ویدوں اور حکیموں سے مایوس ہو کر سادھو سنتوں کے پاس پہنچا، مگر ان کے یہاں بھی اس کے لئے کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ گوپی چند بہت پریشان تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور اسی طرح مفلوج رہا تو اس کے خاندان پر فاقہ کشی کی نوبت آ جائے گی۔ آخر ایک جوگی، دیانند نے اس کی روداد سن کر کہا۔

"تُو جس شخص کا مجسمہ بناتے وقت حادثے کا شکار ہوا تھا، وہی شخص تجھے اس مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے۔"

گوپی چند کی تاریک زندگی میں اُمید کی ایک ہلکی سی کرن نمودار ہوئی تھی، مگر اب ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا کہ وہ بھکاری مبارک شاہ کو کہاں ڈھونڈے؟ گوپی چند، مبارک شاہ کو بھکاری ہی سمجھتا تھا، اس لئے کہ آتمارام نے اُسے بھکاری کہہ کر پکارا تھا۔ پھر اسی ایک لفظ کے سہارے اس نے بھکاریوں کی تمام بستیاں دیکھ ڈالیں لیکن مبارک شاہ کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

پھر اسی جستجو میں گوپی چند ایک روز حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار تک پہنچ گیا۔ کسی نے اسے بتایا تھا کہ وہاں بھی کچھ فقیر دن رات ڈیرہ جمائے پڑے رہتے ہیں۔ گوپی چند کو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مبارک شاہ اس وقت شہنشاہ جہانگیر کی قید میں ہے۔ گوپی چند ایک بار پھر مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ اسے قلعے کے پہرے داروں نے بتایا کہ آج کل شہنشاہ، لاہور میں مقیم ہیں اور ابھی ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ گوپی چند نے فریادی لہجے میں کہا کہ وہ چند لمحوں کے لئے مبارک شاہ سے ملنا چاہتا ہے۔ مگر سپاہیوں نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا کہ مبارک شاہ ایک خاص قیدی ہے۔ شہنشاہ کی اجازت کے بغیر اس سے کوئی نہیں مل سکتا۔

گوپی چند اپنے مفلوج ہاتھوں کے ساتھ واپس چلا آیا۔ اب اُسے شہنشاہ جہانگیر کی آمد کا انتظار تھا کہ کب ہندوستان کا فرمانروا آگرہ پہنچے اور وہ زنجیرِ عدل کھینچ کر شہنشاہ سے انصاف مانگے۔

۞.....۞.....۞

ارسلان بیگ بڑی حیرت سے آتمارام کے عمل کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی کیل تھی، جسے وہ شہزادہ خرم کے مجسمے کے سر میں بار بار ٹھونک رہا تھا۔ پھر وہ یہی عمل ارجمند کے مجسمے پر دہراتا تھا۔

''مہاراج! آپ کے اس عمل سے ان دونوں کو کیا نقصان پہنچے گا؟'' ارسلان بیگ نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آہستہ آہستہ ان دونوں مجسموں کے سروں میں سوراخ ہو جائیں گے۔'' گیانی آتمارام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر جیسے ہی یہ سوراخ نمایاں ہوں گے، شہزادہ خرم اور ارجمند بیمار پڑ جائیں گے۔ اس کے بعد میں ان دونوں کے دل میں سوراخ کروں گا۔ یہ سوراخ انہیں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا کر دیں گے اور ان کی محبت، شدید نفرت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس طرح تیرا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور ہندو دھرم کو بھی مستقبل کے خطرات سے نجات مل جائے گی۔''

''کیا شہزادہ خرم مر جائے گا؟'' ارسلان نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

''یہ بیماری بڑھتے بڑھتے ارجمند اور خرم کی موت پر اختتام پذیر ہو گی۔'' آتمارام نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں صرف شہزادے کی موت چاہتا ہوں۔'' ارسلان بیگ نے گھبرا کر کہا۔ ''ارجمند کو زندہ

چھوڑ دینا گیانی! ابھی تو اُسے سرِ بازار رُسوا ہونا ہے۔''

''تُو بہت خود غرض ہے ارسلان!'' گیانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خیر! میں تیری خاطر ارجمند کو ہلاکت کی منزل تک نہیں پہنچاؤں گا۔ مگر تجھے ہر قدم پر باخبر رہنا ہو گا۔ اب تیرا یہی ایک کام ہے کہ تُو مجھے شہزادہ خرم اور ارجمند کے بارے میں مسلسل اطلاعات دیتا رہے کہ وہ بیماری کی کس منزل سے گزر رہے ہیں۔''

''شہزادہ خرم اس وقت لاہور میں ہے اور ارجمند میری پہنچ سے دور۔'' ارسلان بیگ نے اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی، میں کسی کنیز کے ذریعے کوشش کروں گا کہ وہ ارجمند پر نظر رکھ سکے۔''

۞.....۞.....۞

جہانگیر نے تقریباً گیارہ ماہ تک لاہور میں قیام کیا۔ اس دوران شہنشاہ نے سرحدی انتظامات کئے اور باقی وقت سیر و تفریح میں گزارا۔ مہرالنساء کی شاعری سے لطف اندوز ہوا اور مغرور حُسن کو اس حد تک بدل جانے پر مجبور کر دیا کہ اب مہرالنساء بھی جہانگیر کے بغیر اپنی زندگی کو نامکمل اور ویران سمجھنے لگی تھی۔ اس کی سماعتوں میں ہر وقت ''ملکہ عالیہ'' کے الفاظ گونجتے رہتے تھے اور وہ بیداری کے عالم میں بھی ایک ہی خواب دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی..... دربارِ شاہی میں نایاب ہیروں سے مرصع تخت بچھا ہے اور وہ تاجِ زرنگار پہنے ہوئے شہنشاہ کے پہلو میں جلوہ افروز ہے۔ امراء اور وزراء قطار در قطار دربار میں داخل ہو رہے ہیں۔ کسی امیر کی پیشانی زمین کو چھو رہی ہے اور کوئی وزیر باری کا منتظر ہے۔ عجیب سرور انگیز منظر ہے کہ سارا ہندوستان اسے سجدہ کر رہا ہے۔

پھر یہ خوابوں کا طلسم ٹوٹتا تو مہرالنساء تنہا رہ جاتی۔ ایک بیوہ اور مجبور عورت کی طرح تنہا۔ قیامِ لاہور کے دوران اس نے کئی بار سوچا کہ وہ شہنشاہ کی آغوشِ محبت میں سمٹ جائے اور اس تاجِ زرنگار کو پہن لے، جو برسوں سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

مہرالنساء جذبات کے دھارے میں بہتے بہتے اچانک سنبھل جاتی۔ پھر اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگتی۔ ''مہرالنساء! ابھی تجھے اور شہنشاہ کی محبت کو آزمانا ہے۔ اگر جہانگیر کا عشق سچا ہے تو وہ خود یہ تخت و تاج تیرے قدموں پر رکھ دے گا۔ اور اگر یہ ہوس ہے تو ہوس کا طوفان چند دنوں میں گزر جائے گا۔ اپنے آپ کو جذبات کے سیلاب سے محفوظ رکھ۔ ورنہ شاہی حرم کا ایک معمولی کھلونا بن کر رہ جائے گی۔''

اسی ذہانت اور احتیاط نے مہرالنساء کو ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔ اگرچہ شہنشاہ جہانگیر ایک وفا پرست اور اپنے الفاظ کی آبرو رکھنے والا حکمران تھا، لیکن مہرالنساء اسے مسلسل آزما رہی تھی۔ شیر افگن کی بیوہ کا کھیل بڑا عجیب تھا۔ جب وہ یہ دیکھتی کہ شہنشاہ اس کی طرف سے غافل ہو رہا

ہے تو شوخ لباس پہن کر سامنے آجاتی اور شہنشاہ کی آتشِ شوق کو بھڑکا کر دوبارہ اپنی بدنصیبیوں کا ماتم کرنے لگتی۔ لاہور میں بھی مہرالنساء کا یہی حال تھا۔ کبھی جہانگیر سمجھتا کہ وہ بہت قریب آگئی ہے۔ اور کبھی شہنشاہ محسوس کرتا کہ اس کے اور مہرالنساء کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلے حائل ہو گئے ہیں۔

ادھر لاہور میں سیاست اور عشق کا کھیل جاری تھا اور آگرہ میں گیانی آتما رام، ارجمند کی زندگی کے ساتھ ایک خوف ناک کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ روزانہ صبح سورج نکلنے سے پہلے اور پھر شام کا اندھیرا پھیل جانے کے بعد ارجمند اور خرم کے مجسموں پر آہنی ضربیں لگاتا۔ گیانی نے دو معصوم محبت کرنے والوں کو بدترین جادو کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ آتما رام کا آزمودہ ایک شیطانی عمل تھا۔ وہ شوہر اور بیوی میں نفاق ڈالنے کے لئے پہلے مٹی کے پُتلے بناتا تھا اور پھر ان میں جگہ جگہ سُوئیاں چبھو دیتا تھا۔ پھر اسی جادو کے زیرِ اثر دونوں میں جدائی ہو جاتی تھی۔ یہ وہی جادو تھا، جس کا مظاہرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں سامری بھی کیا کرتا تھا (اور آج بھی ہندوستان کے گوشے گوشے میں اس قسم کے جادوگر پائے جاتے ہیں) اس جادوئی عمل کا دوسرا پہلو طویل بیماری یا ہلاکت کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ جس شخص پر اس قسم کا جادو کیا جاتا تھا، وہ اچانک بیمار پڑ جاتا اور کوئی بھی وید یا حکیم اس مرض کو سمجھنے سے قاصر رہتا۔ یہاں تک کہ وہ بیمار انسان روز بہ روز نامعلوم کمزوری کی طرف بڑھتا رہتا اور پھر ایک دن اسی ناتوانی کے عالم میں دنیا سے گزر جاتا۔

شہزادہ خرم تو مبارک شاہ قلندر کی دعاؤں کے زیرِ اثر تھا، اس لئے اس پر آتما رام کا جادو اثر نہ کر سکا۔ لیکن ارجمند اچانک بہت زیادہ اُداس نظر آنے لگی۔ شروع میں ماہ رخ نے یہی سمجھا کہ اس کی آقازادی، شہزادہ خرم کی جدائی کے سبب اُداس ہے۔ مگر جب ارجمند مسلسل خاموش رہنے لگی تو اسے تشویش لاحق ہوئی۔

''بی بی! تمہیں یہ چپ کیسی لگ گئی ہے؟'' آخر ایک دن ماہ رخ نے ارجمند سے پوچھا۔

''بس کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔'' ارجمند نے انتہائی شکستہ لہجے میں کہا۔

''کیا شہزادہ خرم کی یاد میں ساری دنیا کو فراموش کر بیٹھی ہو؟'' ارجمند شکایت کے ساتھ شرارت بھی کر رہی تھی۔

خرم کا نام سن کر ارجمند کے چہرے پر حیا کی ہلکی سی سرخی اُبھری اور پھر وہ دوسرے ہی لمحے بجھی بجھی نظر آنے لگی۔ ''خدا ہی جانتا ہے ماہ رخ! کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔''

اور پھر ایک دن ارجمند بستر پر دراز ہو گئی۔ وزیرِ اعظم آصف خان نے کئی شاہی طبیبوں سے رجوع کیا مگر ان میں سے کوئی بھی ارجمند کی بیماری کو نہ سمجھ سکا۔

ایک حکیم نے واضح الفاظ میں آصف خان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''شادی بھی بعض بیماریوں کا علاج ہوتی ہے۔ میرے خیال میں وزیرزادی تنہائی کا شکار ہیں۔''

''جب تک شہنشاہ کو سیاسی امور سے فرصت نہ ہو، اس وقت تک شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔'' آصف خان نے اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کی اس مجبوری کو سمجھتا ہوں۔'' شاہی حکیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ارجمند کے لئے سکون آور دوائیں تجویز کر کے چلا گیا۔

ارجمند بانو کو ان دواؤں سے بھی کچھ سکون حاصل نہ ہو سکا۔ اُس کی بے چینی روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی ارجمند کے چہرے کا رنگ سرخ ہوتا، کبھی انتہائی زرد اور کبھی ہلکا نیلا۔

اسی پریشانی کے عالم میں ایک دن سکندر مرزا نے ماہ رخ کو طلب کرتے ہوئے ارجمند کی بیماری سے متعلق پوچھا۔

ارجمند نے تفصیل بتائی تو سکندر مرزا بھی پریشان نظر آنے لگا۔ ''اب میں صاحبِ عالم کو کس طرح لکھوں کہ ارجمند اس قدر بیمار ہیں۔'' سکندر مرزا نے ماہ رخ سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان حالات میں تو یہ بات مناسب نہیں ہوگی۔'' ماہ رخ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال بہتر یہی ہوگا کہ آپ اپنے خطوط میں ارجمند بی بی کی بیماری کو نظرانداز کر دیں۔''

''صاحبِ عالم نے رخصت ہوتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھوں گا۔'' سکندر مرزا نے اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں یہ لکھ دوں کہ ارجمند بالکل ٹھیک ہیں اور شہزادہ خرم کو کسی دوسرے ذریعے سے اس بیماری کی اطلاع مل جائے تو پھر میری کیا حیثیت رہ جائے گی؟''

''آپ اپنا دامن بچاتے ہوئے شہزادۂ عالم کو قائل کر سکتے ہیں۔'' ماہ رخ نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''وہ کس طرح؟'' سکندر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''آپ کہہ سکتے ہیں کہ طویل فاصلوں اور دیگر مجبوریوں کے پیشِ نظر بیماری کی اطلاع دینا مناسب نہیں سمجھا گیا۔'' ماہ رخ نے دلیل پیش کی۔ ''اس طرح شہزادہ عالم کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔'' ماہ رخ کی دلیل میں بہت وزن تھا۔

سکندر مرزا نے دوسری تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں یہ لکھ دوں کہ صاحبِ عالم کی عدم موجودگی کے باعث ارجمند بہت پریشان رہنے لگی ہے تو شاید اس طرح میں اپنے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں گا اور کسی حد تک حقیقتِ حال بھی ظاہر ہو جائے گی۔ خدا ارجمند بانو کو صحت دے۔ اگر خدانخواستہ ان کی بیماری کے دوران شہزادہ خرم بھی تشریف لے آئے تو ان کا ذہن کسی اچانک صدمے سے دوچار نہیں ہوگا۔''

ماہ رخ نے بھی سکندر مرزا کی رائے سے اتفاق کیا اور پھر جب وہ رخصت ہونے لگی تو سکندر مرزا نے اسے روک کر پوچھا۔ ''تم کیسی ہو ماہ رخ؟''

ماہ رخ نے گھبرا کر عجیب سی نظروں سے سکندر مرزا کی طرف دیکھا۔ ''مجھے کیا ہو گیا ہے؟''

ماہ رخ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا اور تیزی سے آصف خان کے مکان کی طرف چلی گئی۔

❀.....❀.....❀

ارجمند بانو کی بیماری کسی عام لڑکی کی بیماری نہیں تھی۔ چند روز بعد ہی شاہی محلات کی فضا میں اس واقعے کی گونج سنائی دینے لگی اور پھر اُڑتے اُڑتے یہ خبر، ارسلان بیگ کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ وہ بہت خوش تھا اور اس نے اسی سرشاری کے عالم میں آتمارام کو یہ اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''مہاراج! میں آپ کی تانترک شکتیوں (جادوئی قوتوں) کا قائل ہو گیا۔ ارجمند بیمار پڑ گئی اور شاہی حکیم اس کا علاج کرنے سے قاصر نظر آ رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ارجمند کو کیا بیماری لاحق ہے۔''

گیانی آتمارام بہت مکروہ انداز میں قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''اور کوئی سمجھ بھی نہیں سکتا۔ یا آکاش پر دیوتا جانتے ہیں یا دھرتی پر گیانی آتمارام۔''

''اسے اتنا بیمار کر دے گیانی! کہ وہ مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے۔'' ارسلان بیگ نے آتمارام کے پیروں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''دھیرج رکھ! ایسا ہی ہوگا۔'' آتمارام نے پُرغرور لہجے میں کہا۔ ''اور شہزادہ خرم کی کیا خبر ہے؟ وہ بھی اب تک بیمار پڑ چکا ہوگا۔''

''نہیں گیانی!'' ارسلان نے بے دلی کے ساتھ کہا۔ ''شہزادے پر تیرے جادو کا ابھی کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔''

''تُو یہ دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے؟'' آتمارام کے چہرے پر ناگواری کا رنگ نمایاں تھا۔

''اگر شہزادے کی طبیعت ذرا بھی ناساز ہوتی تو پورا محل اس خبر کے شور سے گونج رہا ہوتا۔'' ارسلان بیگ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

گیانی آتمارام اچانک پریشان نظر آنے لگا۔ اسے اپنی ناکامی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس نے گھبرا کر مبارک شاہ کے بارے میں سوال کیا۔ ''اور اس بھکاری کا کیا حال ہے؟''

''وہاں میرا گزر ممکن نہیں۔'' ارسلان بیگ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''شہنشاہ نے مبارک شاہ کو ایک مخصوص قید خانے میں رکھا ہے۔''

''دیر تو ہو سکتی ہے، مگر یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص میرے جادو سے محفوظ رہ سکے۔'' آتمارام نے ایک بار پھر دعویٰ کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مبارک شاہ کے سلسلے میں اس کا دعویٰ کھوکھلا بھی ہے اور بے حقیقت بھی۔

❀.....❀.....❀

اب ایران کا خطرہ ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے گیارہ مہینے لاہور میں قیام کرنے کے بعد شہنشاہ جہانگیر کابل کی سیر کے لئے روانہ ہوا۔ یہ سفر تقریباً دس ہفتے جاری رہا۔ اس دوران جہانگیر

نے قدم قدم پر سونے اور چاندی کی بارش کی۔ محتاجوں اور غریبوں کو اس قدر نوازا گیا کہ ''شہنشاہ زندہ باد'' کے نعروں سے فضائیں مسلسل گونجتی رہیں۔

باغی شہزادہ خسرو بھی شاہی جلوس کے ساتھ کابل روانہ ہوا تھا۔ بغاوت کو ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد شہنشاہ کا خیال تھا کہ خسرو راہِ راست پر آ گیا ہوگا۔ اس لئے شہزادے کی نگرانی کسی حد تک کم کر دی گئی تھی اور اب وہ پہلے جیسی سختیاں باقی نہیں تھیں۔

شہنشاہ جہانگیر جون کے مہینے میں کابل پہنچا۔ شہزادہ خرم کو وہاں کی عمارتیں پسند نہیں آئیں۔ اس نے فوراً ہی عمارتوں میں مناسب ترمیمات کے احکام جاری کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی ایک نئے باغ کی بنیاد بھی رکھی، جس کا نام ''جہاں آرا'' تجویز کیا گیا۔ (بعض تاریخوں میں اس کا نام شہر آرا باغ بھی تحریر کیا گیا ہے) شہزادہ خرم نے مختصر سے وقت میں نئی عمارتیں تعمیر کروائیں اور باغ کو نئے انداز سے آراستہ کیا۔ اس کے بعد شہزادے نے جہانگیر کو باغ کی سیر کی دعوت دی۔

اس موقع پر شہنشاہ نے باغی خسرو کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ جب خسرو، باپ کے سامنے آیا تو اس کے پیروں کی زنجیریں بج رہی تھیں۔ جہانگیر یہ منظر دیکھ کر اُداس ہو گیا۔ اس نے خسرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر ہم صرف شہنشاہ ہوتے تو اب تک تجھے قتل کرا چکے ہوتے۔ مگر کیا کریں کہ ہم ایک شفیق و مہربان باپ بھی ہیں۔ اور یہ باپ اپنے دل سے مجبور ہے۔ ہماری محبت یہ گوارا نہیں کرتی کہ ہم اس خوشی کے موقع پر باغ کی سیر کو جائیں اور تُو زنجیروں سے جکڑا ہوا ایک گوشۂ تنہائی میں پڑا رہے۔''

اس کے ساتھ ہی جہانگیر نے شہزادہ خسرو کے پیروں کی بیڑیاں کھولنے کا حکم دیا اور پھر باغی و نافرمان بیٹے کو اپنے ہمراہ لے کر باغ میں داخل ہوا۔

''خرم! تم اچھے منتظم بھی ہو اور باپ کے مزاج آشنا بھی۔'' جہانگیر نے باغ کی دلکشی دیکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

پھر اسی باغ میں شہزادہ خرم کی ''سالگرہ'' منائی گئی۔ درباری نجومیوں کا کہنا تھا کہ اس وقت شہزادہ خرم، ستاروں کی نحوست کا شکار ہیں۔

''پھر اس نحوست کو دُور کرنے کا کیا طریقہ ہے؟'' جہانگیر نے نجومیوں سے پوچھا۔

''شمسی کے بجائے شہزادہ عالم کی ''قمری سالگرہ'' منائی جائے۔'' نجومیوں نے ستاروں کی نحوست کا علاج کرتے ہوئے کہا۔

مغل حکمرانوں کو علم نجوم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ شہنشاہ ظہیرالدین بابر تو بذاتِ خود ایک بڑا ماہرِ نجوم تھا۔ اکبر اور جہانگیر کا بھی یہ حال تھا کہ وہ قدم قدم پر نجومیوں سے مشورے کرتے تھے۔ ستاروں سے دلچسپی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مغلوں کے مورثِ اعلیٰ صدیوں

تک ''آفتاب پرستی'' کی لعنت میں مبتلا رہے تھے۔ پھر سورج کی پرستش تو ختم ہوگئی، لیکن ان کی زندگی میں ستاروں کی اہمیت برقرار رہی۔ دوسرے یہ کہ پورا ہندوستان توہم پرستی کا شکار تھا اور ستاروں کی گردش میں اپنی تقدیریں تلاش کرتا تھا۔ اس لئے جہانگیر بھی نجومیوں کی قید سے آزاد نہیں ہوسکا تھا۔ نتیجتاً اُس نے ستاروں کی نحوست دُور کرنے کی غرض سے شہزادہ خرم کی ''قمری سالگرہ'' منائی۔

اس موقع پر شہزادہ خرم کو سونے، چاندی اور دوسری قیمتی دھاتوں میں تولا گیا۔ اور پھر یہ ساری چیزیں غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کردی گئیں۔

⊛.....⊛.....⊛

ابھی شاہی جلوس، دارالحکومت آگرہ کی طرف روانہ ہونے ہی والا تھا کہ ایک اور سنگین واقعہ پیش آگیا۔

شہنشاہ جہانگیر کا خیال تھا کہ شہزادہ خسرو اس ایک سال کے دوران اپنے ماضی کی رسوائیوں کا خیال کر کے تمام گناہوں سے تائب ہو چکا ہوگا۔ اس لئے خسرو کی نگرانی کسی حد تک کم کردی گئی تھی۔ مگر بدنہاد خسرو نے باپ کی شفقت سے ایک بار پھر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور کابل کے قیام کے دوران ہی کچھ نوجوانوں کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ اس وقت خسرو، اعتبار خان کی قید میں تھا۔ جب شہنشاہ جہانگیر لاہور سے کابل جا رہا تھا، اس وقت شہزادہ خسرو، امیرالامراء شریف خان کی نگرانی میں تھا۔ اتفاق سے شریف خان بیمار ہوگیا۔ اب اس میں کابل جانے کی طاقت نہیں تھی۔ مجبوراً خسرو کو اعتبار خان کے حوالے کیا گیا۔ اعتبار خان دراصل ایک خواجہ سرا تھا مگر انتہائی وفادار شخص تھا۔ اس کا شمار جہانگیر کے چند معتمد ملازموں میں ہوتا تھا۔ اسی لئے خسرو جیسے باغی کو اعتبار خان کے سپرد کیا گیا تھا۔

جہانگیر صورتِ حال سے مطمئن تھا کہ اس کے خلاف ایک اور سازش کی گئی۔ شہنشاہ نے مہرالنساء کا دل جیتنے کے لئے اس کے پورے خاندان کو اس طرح نوازا تھا کہ عنایات و نوازشات کی یہ بارش دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اسی خاندان کے افراد میں ایک نوجوان، نورالدین تھا۔ رشتے کے اعتبار سے یہ شخص وزیراعظم آصف خان اور مہرالنساء کا چچا زاد بھائی تھا۔ نورالدین کو شہزادہ خسرو سے بہت محبت تھی۔ جہانگیر نے یہ سوچ کر کہ مہرالنساء کے خاندان کا کوئی فرد، شہنشاہ کے خلاف باغیانہ روش اختیار نہیں کرسکتا، نورالدین کو خسرو کے پاس جانے کی اجازت دے دی تھی۔

نورالدین ہر ملاقات میں شہزادہ خسرو سے کہا کرتا تھا۔ ''میں بہت جلد پیروں کی بیڑیاں کاٹ کر آپ کو اس تاریک زنداں سے نکال لے جاؤں گا۔ پھر آپ کے سر پر تاجِ شاہی جگمگائے گا اور ہندوستان کا تخت آپ کے قدموں کے نیچے ہوگا۔''

''یہ ناممکن ہے نورالدین!'' شہزادہ خسرو اُداس لہجے میں کہتا۔

مگر نورالدین، خسرو کے عشق میں مبتلا تھا۔ وہ اسے بار بار تسلیاں دیتا۔ ''شہزادہ عالم! آپ اتنے مایوس نہ ہوں۔ جب تک میری جان میں جان ہے، میں اس وقت تک آپ کے اقتدار کے لئے کوشش کرتا رہوں گا۔'' یہ نورالدین کی جنونی محبت بول رہی تھی۔ وہ خسرو کے عشق میں اپنے انجام سے بھی بے پروا ہو چکا تھا۔

نورالدین نے سب سے پہلے گنیش سنگھ کو اعتماد میں لیا۔ گنیش سنگھ، اعتبار خان کا گماشتہ تھا۔ اعتبار خان اس پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ گنیش سنگھ کے زیراثر تین سو کے قریب ایسے سپاہی تھے، جو شہنشاہ جہانگیر کی حفاظت پر متعین کئے گئے تھے۔ گنیش سنگھ کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا، جنہوں نے دل سے مسلمانوں کے اقتدار کو قبول نہیں کیا تھا۔ نورالدین، گنیش سنگھ کی اس کمزوری سے واقف ہو چکا تھا۔ اس لئے ایک دن اس نے تنہائی میں گنیش سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تُو قوم کا راجپوت ہے مگر پھر بھی ایک خواجہ سرا (مخنث) کی ملازمت کر رہا ہے۔ آخر تیری مردانگی کو کیا ہوگیا ہے؟'' نورالدین نے بڑی عیاری سے گنیش سنگھ کے جذبات پر ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ''وہ تیری غیرتِ قومی کہاں گئی؟ لوگ تجھ پر طعنہ زنی کرتے ہیں کہ ایک خواجہ سرا کے آگے سر جھکائے کھڑا رہتا ہے۔''

نورالدین کی باتیں سن کر گنیش سنگھ کا خون جلنے لگا۔ ''مجھے بھی ان باتوں کا علم ہے۔ مگر کیا کروں، شاہی ملازمت سے مجبور ہوں۔''

''تجھے اس سے بہتر ملازمت بھی مل سکتی ہے۔'' نورالدین نے گنیش سنگھ کے گرد اپنی فریب کاریوں کا جال بچھاتے ہوئے کہا۔

گنیش سنگھ سوالیہ نظروں سے نورالدین کی طرف دیکھنے لگا۔

''کب تک نامرادوں کی طرح زندگی بسر کرے گا؟'' نورالدین نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میرا ساتھ دے اور ہندوستان کی وزارت حاصل کرلے۔''

''میں آپ کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھا۔'' گنیش سنگھ بدستور حیران و پریشان نظر آرہا تھا۔

''میں حکومت کا ایک خفیہ باغی ہوں۔ تُو بھی میری طرح باغی ہو جا۔'' نورالدین نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''شہنشاہ کا سر کاٹ دے اور اپنے جسم پر وزارت کی قبا سجا سکے۔''

بالآخر گنیش سنگھ، نورالدین کے فریب میں آگیا۔ ایک اہم عہدے پر قابو پانے کے بعد نورالدین نے خسرو کے فدائیوں کی ایک جماعت بنانا شروع کردی۔ خسرو کا جو بھی ہم نوا ملتا، وہ اس کا نام لکھ کر گنیش سنگھ کو دے دیتا۔ اس طرح پانچ چھ مہینے میں چار سو آدمیوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی، جس نے بڑے عہد و پیمان کئے اور قسمیں کھا کر کہا کہ وہ موقع ملتے ہی شہنشاہ جہانگیر کو

قتل کر دیں گے۔"

اس وقت شہنشاہ کا قیام "سرخاب محل" میں تھا۔ نورالدین اور دوسرے غداروں نے اس طرح منصوبہ ترتیب دیا تھا کہ وہ لوگ جہانگیر کو اس وقت ہلاک کریں گے، جب شہنشاہ شکار میں مصروف ہوگا۔ پھر جہانگیر کو قتل کرتے ہی خسرو کو قید سے نکال لیں گے اور اس کی تاج پوشی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ بظاہر یہ ایک بہترین منصوبہ تھا کیونکہ شکار کے وقت شہنشاہ اپنے گرد و پیش سے غافل ہوتا تھا اور اسی غفلت کے عالم میں اسے آسانی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا۔

سازش کرنے والوں نے اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مگر ابھی جہانگیر کی زندگی کے کچھ سال باقی تھے، اس لئے یہ سازش وقت سے پہلے بے نقاب ہوگئی۔ فتنہ گروں کی اس جماعت کے ایک نمائندے نے احساسِ گناہ سے پشیمان ہو کر شہزادہ خرم کے دیوان، خواجہ واعظ کے سامنے یہ راز فاش کر دیا۔

"ضمیر کی خلش مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتی۔" اس شخص نے خواجہ واعظ کے سامنے روتے ہوئے کہا۔ "خدا میرے اس گناہ کو معاف کرے۔"

خواجہ واعظ اسے تسلیاں دیتا رہا۔ "تجھے اپنی اس حرکت پر شدید ندامت ہے، اس لئے خداوند ذوالجلال بھی تیرا گناہ معاف کر دے گا۔"

اس کے بعد خواجہ واعظ اس شخص کو شہزادہ خرم کے پاس لے گیا۔ خرم نے بڑی رازداری کے ساتھ شہنشاہ جہانگیر کو باغیوں کے اس منصوبے سے آگاہ کیا۔ جہانگیر یہ خبر سن کر حیران رہ گیا۔ چند لمحوں تک اسے یقین ہی نہیں آیا کہ شہزادہ خسرو اس قدر مہربانیوں کے باوجود دوبارہ بھی بغاوت کر سکتا ہے۔ مگر جہانگیر فوراً ہی خوش گمانی کی دنیا سے نکل آیا۔ اب وہ اپنے چہرے سے مجسم قہر نظر آ رہا تھا۔

"ان سب لوگوں کو گرفتار کر کے عبرت ناک انجام تک پہنچا دو۔" جہانگیر نے شہزادہ خرم کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "ان کے سر کاٹ کر نیزوں پر بلند کرو اور کابل کے گلی کوچوں میں پھراؤ۔ اور ہماری رعایا کو بتاؤ کہ یہ ان باغیوں کی سزا ہے جو نمک حرام بھی تھے اور احسان فراموش بھی۔"

پھر جیسے ہی شہزادہ خرم اُلٹے قدموں واپس ہونے لگا تو جہانگیر نے اُسے ٹھہر جانے کا حکم دیا اور کچھ سوچنے لگا۔ "فی الوقت بغاوت کے سرغنوں کو گرفتار کر لو۔ ہم اس وقت حالتِ سفر میں ہیں۔ اتنی بڑی جماعت کو قتل کرانے سے کہیں لشکر میں فساد برپا نہ ہو جائے۔ اس لئے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ باغیوں کی قیادت کرنے والوں کو زنجیریں پہنا دو اور باقی لوگوں کو آزاد چھوڑ دو۔ انہیں کسی مناسب وقت پر دیکھا جائے گا۔"

کچھ دیر بعد تقریباً دس باغیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان مجرموں میں نورالدین کے علاوہ مرزا غیاث بیگ اور اعتماد الدولہ کا بیٹا شریف بھی تھا۔ جب ان غداروں کو شہنشاہ کے سامنے لایا گیا تو

جہانگیر غضب ناک ہو گیا اور شریف سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"تُو اس شخص کا بیٹا ہے جس پر ہم نے اعتبار کیا مگر افسوس تیری بدبختی نے تجھے احسان فراموشوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔"

اس کے بعد جہانگیر نے دو باغیوں فتح اللہ اور قاسم علی کو قیدِ سخت میں ڈال دیا اور باقی افراد کو قتل کا حکم دے دیا۔ موت کی سزا پانے والوں میں اعتبار خان کا ہندو گماشتہ، گنیش سنگھ بھی شامل تھا۔

جب مہرالنساء کو اس حادثے کی خبر ہوئی کہ قتل کرائے جانے والے مجرموں میں اس کا بھائی شریف بھی ہے تو وہ بے تابانہ شہنشاہ کی خلوت میں پہنچی اور جہانگیر سے رحم کی درخواست کرنے لگی۔

"عالم پناہ! آپ کو معلوم ہے کہ شریف میرا حقیقی بھائی ہے۔" مہرالنساء نے بڑے ناز اور غرور کے ساتھ کہا۔ اُسے یقین تھا کہ بادشاہ اس محبوبانہ لہجے کی حرارت سے پگھل جائے گا۔

"ہمیں کچھ یاد نہیں۔" جہانگیر کی آواز سے نفرت و قہر کی بارش ہو رہی تھی۔ "ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ایک لعنت زدہ انسان ہے اور اس نے نمک حرامی کی انتہا کر دی ہے۔"

"ظلِ الٰہی! ان دونوں مجرموں شریف اور نورالدین کو صرف میری خاطر معاف کر دیں۔"

شہنشاہ کو اس عالم غضب میں دیکھ کر مہرالنساء کے غرور کا بت ٹوٹ گیا تھا اور اب وہ ایک عام فریادی کے لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"مہرو! اگر ہماری جگہ تم ہوتیں تو باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتیں؟" جہانگیر نے مجرموں کو معاف کرنے کے بجائے مہرالنساء سے ایک عجیب سوال کر دیا تھا۔

مہرالنساء نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔ اس کے پاس جہانگیر کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"تمہارے دونوں بھائی ہمارا سر کاٹ کر خسرو کو پیش کر دینا چاہتے تھے۔" جہانگیر کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔ "تم ان دونوں کے سر بچانا چاہتی ہو مگر تمہیں ہمارے سر سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

مہرالنساء کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"ہم نے صرف تمہاری خاطر غیاث بیگ کو وزارتِ خزانہ بخشی اور آصف خان کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب عطا کیا۔ پھر بھی تمہیں ہم سے شکایت ہے۔" جہانگیر کا لہجہ بہت شکستہ تھا۔ "جاؤ! ہمیں تنہا چھوڑ دو۔ یہی تنہائی ہمارا مقدر ہے۔"

مہرالنساء تھکے تھکے قدموں سے واپس جانے لگی مگر اچانک اس نے مڑ کر شہنشاہ سے کہا۔

"عالم پناہ نے خسرو کو معاف کر دیا کہ آخر وہ شہنشاہ کا بیٹا ہے۔" مہرالنساء نے خسرو کے حوالے سے جہانگیر پر طنز کر کے اپنے بھائیوں کو بچانے کی آخری کوشش کی۔

"مہرو! یہ تم ہی ہو کہ شہنشاہ سے اس لہجے میں گفتگو کر سکتی ہوں۔" جہانگیر نے مہرالنساء کی گستاخی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے خسرو کو معاف نہیں کیا ہے۔ تمہیں کیا خبر کہ کیسی

دردناک سزا اس کا انتظار کر رہی ہے۔ تمہارے بھائیوں کی لاشیں چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو جائیں گی مگر بدنصیب خسرو کو بڑا طویل عذاب برداشت کرنا ہے۔"

پھر جہانگیر کے حکم پر مہرالنساء کے بھائی شریف اور نورالدین کو قتل کر دیا گیا۔ قتل ہونے والوں میں گنیش سنگھ کے علاوہ تین دوسرے مجرم بھی شامل تھے۔

اس لرزہ خیز واقعے کے بعد شہنشاہ کا جلوس، دارالحکومت آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

❀.....❀.....❀

شہنشاہ جہانگیر کو شکار کا بہت شوق تھا۔ اس حیثیت سے جہانگیر کو ایک منفرد حکمراں قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ماہر نشانہ باز اور بہترین شکاری تھا۔ کابل سے روانگی کے بعد وہ مختلف مقامات پر ٹھہرا اور شکار سے لطف اندوز ہوا۔ راولپنڈی پہنچنے کے بعد شہنشاہ کے لئے خاص طور پر شکار کا اہتمام کیا گیا۔ جہانگیر نے شکار کے دوران ایک سرخ ہرن کو دیکھا، جو بہت فاصلے پر دوڑ رہا تھا۔ شہنشاہ ہرن کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ اس نے فاصلے کا اندازہ کئے بغیر نشانہ لیا، کمان کھینچی اور تیر چھوڑا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ فاصلہ زیادہ ہونے اور ہرن کے دوڑنے کے سبب نشانہ خطا ہو جائے گا۔ مگر اس وقت مصاحبوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے ہرن کو زمین پر گرتے دیکھا۔ یہ شکار میں مہارت کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ جہانگیر اپنی اس کامیابی پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

شکار کے بعد کسی شخص نے مقامی سردار شمس خان گکھڑ کا ذکر کیا، جو بوڑھا ہو جانے کے باوجود نوجوانوں سے زیادہ شکار کا شوق رکھتا تھا۔ بتانے والے نے یہ بھی بتا دیا کہ شمس خان ایک درویش صفت انسان ہے۔ جہانگیر کو اس بوڑھے شکاری سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور وہ خود چل کر اس کے مکان پر پہنچا۔ شمس خان نے بادشاہ کی اس طرح تواضع کی کہ جہانگیر اُس کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ رخصت ہوتے وقت شہنشاہ نے شمس خان اور اس کی بیوی بچوں کو چار ہزار روپے بطور انعام دیئے اور پانچ گاؤں عنایت کرتے ہوئے کہا۔

"ہم خود بھی شکاری ہیں اور اسی حوالے سے تیری مہارت کی قدر کرتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری سلطنت میں ایسے جوانمرد بھی موجود ہیں۔"

الغرض جہانگیر اسی طرح مناظرِ قدرت اور سیر و شکار سے لطف اندوز ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔ اس تاریخی شہر میں چند دن گزار کے جہانگیر آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی شاہی جلوس نے کچھ فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ جہانگیر کو دو آدم خور شیروں کی خبر ملی۔ بتانے والوں نے بتایا کہ یہ دونوں شیر آدمی کا گوشت کھانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے پانی پت اور کرنال کے درمیان کا راستہ بہت مخدوش ہو گیا ہے۔ شیروں کے خوف سے مقامی باشندے دہشت زدہ رہتے ہیں اور مسافروں نے اس راہ سے گزرنا چھوڑ دیا ہے۔ رعایا کی اس پریشانی کا حال سن کر جہانگیر نے

بھی اپنا راستہ بدل دیا اور شیروں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

"اس پورے علاقے کو ہاتھیوں کے گھیرے میں لے لیا جائے۔" جہانگیر نے نیا حکم جاری کیا۔

چاروں طرف ہاتھیوں کی چنگھاڑ سن کر دونوں شیر گھبرا گئے اور وہ اپنے ٹھکانوں سے نکل کر بھاگے۔ ہاتھیوں کا محاصرہ مسلسل تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ مجبوراً شیروں نے بھاگنے کے لئے وہی راستہ اختیار کیا، جس پر جہانگیر آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر جب وہ دونوں درندے شہنشاہ کے مقابل آئے تو موت کے دراز ہاتھوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ جہانگیر نے یکے بعد دیگرے دونوں شیروں کا نشانہ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بندوق کی گولیاں ان کے جسموں میں پیوست ہو گئیں۔ ایک شیر تو اسی مقام پر ڈھیر ہو گیا مگر دوسرا کچھ زیادہ جاندار تھا۔ وہ چند قدم آگے جا کر اس طرح گرا کہ دوبارہ نہ اُٹھ سکا۔

مقامی باشندے شیروں کے مارے جانے کی خبر سن کر جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مصیبت سے نجات پانے پر ان لوگوں نے شہنشاہ کی درازیٔ عمر اور بلند اقبالی کے لئے دعائیں کیں۔ جواباً جہانگیر نے پانی پت اور کرنال کے غریب لوگوں میں چاندی کے سکے تقسیم کئے اور دہلی روانہ ہو گیا۔

جنوری 1608ء کے آخر میں شہنشاہ آگرہ پہنچا۔ یکم فروری کو جشنِ نوروز تھا۔ (جب سورج "برج حمل" میں تحویل کرتا ہے اس وقت جشنِ نوروز منایا جاتا ہے۔ پارسی قوم میں آج بھی اس کا رواج موجود ہے۔ نجومیوں کے مطابق یہ وقت بہت مبارک ہوتا ہے۔) اور اسی مبارک وقت میں جہانگیر تختِ شاہی پر بیٹھا۔ ابھی جشنِ نوروز جاری تھا کہ جہانگیر نے قاسم خان عرب کی لڑکی صالحہ بانو سے شادی کر لی اور اس طرح جشنِ نوروز کے ساتھ "جشنِ شادی" بھی منایا گیا۔

یہ خبر مہرالنساء کے لئے بڑی پریشان کن تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شہنشاہ اچانک کسی دوسری عورت کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ پھر جب مہرالنساء کو یہ معلوم ہوا کہ شہنشاہ نے اپنی نئی دُلہن صالحہ بانو کو "بادشاہ محل" کا خطاب دیا ہے تو وہ کچھ اور پریشان نظر آنے لگی۔ وقت کی گردش اس کے اندازوں سے بھی زیادہ تیز تھی۔ اب مہرالنساء کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خاموشی سے اس وقت کا انتظار کرے، جب بادشاہ کے دل میں دوبارہ محبت کی آگ بھڑکنے لگے۔

❀.....❀.....❀

دارالحکومت پہنچنے کی سب سے زیادہ خوشی شہزادہ خرم کو تھی۔ وہ آگرہ سے تقریباً دو سال دور رہا تھا اور یہ دو سال اسے ارجمند کی جدائی کے سبب دو صدیوں کے برابر محسوس ہوئے تھے۔

قلعہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی نظریں ماہ رخ کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر ابھی وہاں ماہ رخ کا گزر ممکن نہیں تھا۔ تمام امراء اور سردار، شہنشاہ اور شہزادہ خرم کو نذریں پیش کرتے رہے۔ پھر جب استقبالیہ رسموں کا سلسلہ ختم ہوا تو شہزادہ خرم اپنے دوست سکندر مرزا سے تنہائی میں ملا۔

''ارجمند بانو کیسی ہیں؟'' خرم نے جھجکتے ہوئے کہا۔

سکندر مرزا بہت اُداس نظر آ رہا تھا۔

''تم خاموش کیوں ہو سکندر؟'' شہزادہ خرم کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

''ارجمند بانو شدید بیمار ہیں۔'' سکندر مرزا نے رُک رُک کر کہا۔

''یہ بات تم نے اپنے خط میں کیوں تحریر نہیں کی؟'' شہزادہ خرم یکایک برہم نظر آنے لگا۔

''سکندر مرزا! ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم اس قدر غیر ذمے داری کا مظاہرہ کرو گے۔''

''یہ غیر ذمے داری نہیں صاحبِ عالم!'' سکندر مرزا نے انتہائی ادب اور تحمل کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی پریشانی کے احساس نے میرے قلم کو یہ خبر تحریر کرنے سے باز رکھا۔ اگر میں آپ کو ارجمند بانو کی بیماری سے آگاہ کر دیتا تو آپ کا قیام کابل اور لاہور میں ایک مستقل دردِ سر بن کر رہ جاتا۔ آپ ظلِ الٰہی کے حکم کے بغیر آگرہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس صورت میں آپ کے پاس خاموشی کے ساتھ چلتے رہنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ ایک مزاج آشنا کی حیثیت سے اگر اس سلسلے میں مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہے تو میں یقیناً مجرم ہوں۔''

شہزادہ خرم شرمسار نظر آنے لگا۔ ''معاف کر دینا سکندر مرزا! کہ ہمیں اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا۔ اپنی مجبوریاں کس سے بیان کریں کہ ہم ارجمند بانو کی عیادت اور مزاج پرسی کو بھی نہیں جا سکے۔''

''شہزادۂ عالم! صبر و ضبط سے کام لیں۔'' سکندر مرزا نے خرم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آخر ارجمند کو ایسا کون سا مرض لاحق ہے کہ شاہی طبیب بھی اس کا علاج نہیں کر سکتے؟'' شہزادہ خرم وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

''بیماری ہی تو سمجھ میں نہیں آتی۔'' سکندر مرزا نے مختصراً وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر مرض کی تشخیص ہو جائے تو پھر علاج بھی ممکن ہے۔''

''سارے طبیب مل کر بھی کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتے۔'' شہزادہ خرم تلخ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''پھر کس لئے ان لوگوں کو شاہی انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔''

''شہزادہ عالم! آپ شاہی طبیبوں پر برہم نہ ہوں کہ وہ اپنی سی کوششیں کر چکے۔'' سکندر مرزا نے الفاظ کے ذریعے خرم کے اشتعال کو کم کرنا چاہا۔ ''صحت و شفا صرف خدا کے اختیار میں ہے۔''

شہزادہ خرم ایک بار پھر اپنی بدحواسیوں پر نادم نظر آنے لگا۔

ادھر جشنِ نوروز کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور ادھر شہزادہ خرم شدید اذیت میں مبتلا تھا۔ پھر اس نے ماہ رخ کو تنہائی میں طلب کر کے ارجمند بانوں کی بیماری کے متعلق دریافت کیا۔ ماہ رخ کوئی جواب دینے کی بجائے رونے لگی۔

''ہمارے صبر کو زیادہ نہ آزماؤ ماہ رخ! کہ ہم تمہارے تصور سے بھی زیادہ پریشان ہیں۔'' خرم نے اپنے دل کی حالت بیان کرتے ہوئے کہا۔

''میں کیا عرض کروں صاحبِ عالم! کہ ارجمند بی بی کو کیا ہو گیا ہے۔'' ماہ رخ کے آنسوؤں کی روانی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ''دعائیں ناکام، مسیحا عاجز، غم گسار حیران، کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

شہزادہ خرم بہت دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اس کا روشن چہرہ بجھ کر رہ گیا تھا۔ پھر اس نے ارجمند کے نام ایک خط لکھا۔

''جانِ خرم! تمہاری بیماری کا حال سنا۔ اس خبر سے ہمارے دل پر کیا گزری، اس کا خود ہمیں بھی اندازہ نہیں۔ قلعے میں جشنِ نوروز کی تیاریاں ہو رہی ہیں مگر ہم اپنا جشنِ شکست منا رہے ہیں کہ تمہاری شرکت کے بغیر ہر جشنِ نشاط، جشنِ ماتم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہماری محرومی یہ ہے کہ ہم کھل کر رو بھی نہیں سکتے..... اور دل کا درد بیان کرنے کے لئے چیخ بھی نہیں سکتے کہ تمہاری رسوائی کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ بس خدا ہی جانتا ہے کہ یہ دن کیسے گزر رہے ہیں۔ ارجمند! ایک نظر ہماری مجبوریوں کی طرف دیکھو۔ ہم تمہاری عیادت کے لئے آنا چاہتے تھے، مگر آ نہیں سکتے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنے شب و روز کا ایک ایک لمحہ تمہاری تیمارداری میں گزاریں۔ لیکن وقت نے ہمارے ارادوں کو زنجیریں پہنا رکھی ہیں اور ہم اپنے آپ میں ان زنجیروں کو توڑنے کی طاقت نہیں پاتے۔ ہمارے چاروں طرف مجبوریوں کا ایک آہنی حصار ہے۔ اس حصار میں قید ہوتے ہوئے اب ہم ایک ہی دعا کرتے ہیں کہ تمہاری ساری بیماریاں ہمارے سر آ جائیں۔ کاش! ایسا ہی ہو جائے۔''

ماہ رخ کو یہ خط دیتے ہوئے خرم کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

پھر جب ارجمند نے بستر پر لیٹے لیٹے شہزادہ خرم کا خط پڑھا تو چند لمحوں کے لئے اس کے زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی نمایاں ہوئی اور پھر آخری عبارت تک پہنچتے پہنچتے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ ارجمند بانو اتنا روئی کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ ماہ رخ اسے بہت دیر تک تسلیاں دیتی رہی۔

''تم نہیں جانتیں ماہ رخ! کہ صاحبِ عالم نے اس خط میں کیا تحریر کیا ہے۔'' ارجمند نے شہزادہ خرم کا خط ماہ رخ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے ایک نظر دیکھ لو، پھر تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں کیوں رو رہی ہوں۔''

ماہ رخ نے شہزادہ خرم کا خط پڑھا۔ ایک ایک لفظ خلوص و وفا کی زندہ تصویر تھا۔ ماہ رخ کو شہزادہ پرویز کی یاد آنے لگی۔ وہ بھی ابتدا میں ایسے ہی دعوے کیا کرتا تھا۔ مگر جب اس کے ذوقِ ہوس کی تکمیل ہو گئی تو اس نے ماہ رخ کو فراموش کر دیا۔ دونوں بھائیوں میں کس قدر فرق تھا؟ ایک آج تک محل کی کنیزوں سے دل بہلا رہا تھا اور دوسرا ارجمند بانو کی بیماری اپنے سر لے لینا چاہتا تھا۔ ماہ رخ کے دل میں آگ لگی۔ پورے وجود میں چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ پھر ناکام حسرتوں کا یہ دھواں آنکھوں سے آنسو بن کر برسنے لگا۔ شہزادہ خرم کے آخری الفاظ نے ماہ رخ کو بھی ''ساون بھادوں'' کی طرح رُلا دیا۔

''اس تحریر کا ایک ایک حرف سچائی کا آئینہ دار ہے۔'' ماہ رخ نے خط پڑھنے کے بعد ارجمند بانو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے شہزادہ عالم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اتنے ہی پریشان نظر آ رہے تھے۔''

''تم نے انہیں سمجھایا نہیں ماہ رخ؟'' ارجمند کے ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے اور آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ''تم نے صاحبِ عالم سے کہہ دیا ہوتا کہ ارجمند صحت یاب ہو رہی ہے، بس تھوڑی سی کمزوری باقی ہے۔ اس کے بعد وہ خود ہی حاضرِ خدمت ہو جائے گی۔''

''میں نے اور سکندر مرزا نے صاحبِ عالم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔'' ماہ رخ نے ساری صورتِ حال بیان کرتے ہوئے کہا۔

ارجمند کچھ سوچنے لگی۔ پھر بڑے کرب کے عالم میں بولی۔

''میں بدنصیب انہیں خط بھی نہیں لکھ سکتی۔ شاید اس طرح صاحبِ عالم کی پریشانیوں میں کچھ کمی واقع ہو جاتی۔''

ماہ رخ اس سوال کا کیا جواب دیتی۔ وہ خاموشی سے اپنی آقا زادی کے چہرے کو دیکھتی رہی، جس پر مایوسیوں کے گہرے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔

''ماہ رخ! یہ خط تم بھی لکھ سکتی ہو۔'' اچانک ارجمند بانو کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی نمودار ہوئی۔ ''الفاظ میرے ہوں گے اور تحریر تمہاری ہو گی۔''

❀.....❀.....❀

شہزادہ خرم نے ماہ رخ کی موجودگی میں ارجمند بانو کا خط پڑھنا شروع کیا۔ اس وفا شعار خاتون نے اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''صاحبِ عالم!..... آپ اس کنیز سے کئے ہوئے وعدے پر قائم نہیں رہے۔ میری معمولی سی بیماری کی خبر سنی اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ میں تیزی سے صحت یاب ہو رہی ہوں۔ مگر طبیبوں نے ابھی چلنے پھرنے سے منع کر دیا ہے۔ بہت جلد خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوں گی۔ لیکن آپ پر یہ انداز زیب نہیں دیتا کہ ایک کنیز کے لئے اپنی ذات کو قربان کر ڈالیں۔ جس کی

ذات سے ہندوستان کے کروڑوں عوام کی تقدیریں وابستہ ہوں، اسے کسی ایک ہستی کے لئے اتنا پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ اگر آپ کو ارجمند کی موت کی اطلاع بھی مل جائے تو اتنا دل شکستہ نہ ہونا کہ محبت اور وفا ایک تماشا بن کر رہ جائیں۔ آپ کے سامنے زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے اور اس مقصد پر ارجمند جیسی ہزاروں عورتیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ اس خاکی جسم کا کیا ہے؟ آج نہیں تو کل مٹی میں مل جائے گا۔ مگر شکست و ناکامی کے غبار کو آپ کے روشن و تابناک چہرے تک نہیں پہنچنا چاہئے۔ یہی میرا خواب ہے اور یہی میری آرزو ہے۔''

ارجمند کے خط نے شہزادہ خرم کو رُلا دیا۔ وہ بار بار خط کو پڑھتا رہا اور اس کے آنسو کاغذ میں جذب ہو کر الفاظ کو دھندلا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پورا خط آنسوؤں سے بھیگ گیا اور کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر مٹ گئی۔

''ہم نے اس تحریر کو مٹا دیا، ماہ رخ!'' خرم نے کاغذ زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ ماہ رخ نے غور سے دیکھا۔ کوئی لفظ بھی اپنی اصل صورت پر قائم نہیں رہا تھا۔ روشنائی جگہ جگہ سے پھیل گئی تھی، جس کے سبب کوئی شخص بھی اس تحریر کو پڑھ نہیں سکتا تھا۔

''اس تحریر کو مٹ جانا ہی چاہئے تھا۔'' شہزادہ خرم نے مختصر سے سکوت کے بعد دوبارہ کہا۔ ''سکندر مرزا کہتا ہے کہ تمام شاہی طبیب مرض کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ارجمند بانو لکھتی ہیں کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی ہیں۔ ہماری تسلی کی خاطر ایک سنگین جھوٹ بولا جا رہا تھا، اس لئے ہم نے اس تحریر کو مٹا دیا۔''

خرم کی دردناک گفتگو سن کر ماہ رخ بھی رونے لگی۔

''وہ ہم پر سے ہزاروں ارجمند بانو کو قربان کر دینا چاہتی ہیں۔ جبکہ پوری دنیا میں ان جیسی کوئی دوسری عورت موجود نہیں ہے۔'' خرم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ ہمیں ایک فاتح کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن ہم کسی ایسی فتح کو قبول نہیں کریں گے، جس میں ارجمند بانو کے چہرے کا عکس شامل نہ ہو۔ اگر وہ دنیا سے اُٹھ گئیں تو پھر ہم بھی زندہ رہنے کا کوئی شوق نہیں رکھتے۔ اس کے بعد ہم خدا سے دعا کریں گے کہ وہ ہمیں بھی خاک میں ملا دے۔''

''صاحبِ عالم!'' ماہ رخ لرز کر رہ گئی۔ ''اگر آپ میری آقا زادی کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کی اس خواہش کا احترام کیجئے۔ واقعتاً وہ صحت یاب ہو رہی ہیں۔'' ماہ رخ نے ارجمند بانو کی ہدایت کے مطابق کھلا ہوا جھوٹ بولا۔

شہزادہ خرم نے چونک کر ماہ رخ کی طرف دیکھا اور پھر اس کاغذ کو غور سے دیکھنے لگا، جس کی عبارت آنسوؤں کے اثر سے مٹ چکی تھی۔

''کیا یہ خط ارجمند بانو نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا؟'' شہزادہ خرم نے ایک عجیب سا سوال کیا۔

ماہ رخ ایک لمحے کے لئے گھبرا سی گئی مگر اس نے فوراً ہی اپنی بدحواسی پر قابو پا لیا۔ ''صاحبِ عالم کو اس تحریر پر شک نہیں ہونا چاہئے۔''

''ہم تحریر پر شکایتیں کر رہے ہیں ماہ رخ!'' خرم نے تیز لہجے میں کہا۔ ''بے شک! تمام الفاظ ارجمند بانو کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ یہ تحریر ان کے سوا کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ مگر کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت دیکھ کر ہمیں شک ہوتا ہے۔''

''کیا شک صاحبِ عالم؟'' اب ماہ رخ سنبھل چکی تھی۔

''یہی کہ الفاظ ارجمند بانو کے ہیں مگر تحریر کسی اور کی۔'' خرم نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ماہ رخ! کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو کہ یہ خط، ارجمند بانو نے خود تحریر کیا تھا؟''

ماہ رخ کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی اور پھر اس نے پورا واقعہ تفصیل سے بیان کر دیا۔

''جو لڑکی اپنے ہاتھ سے چند سطریں تحریر نہیں کر سکتی، اس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی ہے؟'' خرم نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا۔ ''آخر تم نے مجھ سے ایسا مذاق کیوں کیا، ماہ رخ؟''

''آقا زادی کا یہی حکم ہے۔'' ماہ رخ نے اپنے جھوٹ کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

پھر شہزادہ خرم نے ارجمند کی بیماری کی تفصیلات معلوم کیں۔ جواب میں ماہ رخ نے بتایا کہ انہیں بظاہر کوئی مرض نہیں ہے۔ بس ایک نامعلوم سی کمزوری ہے، جو روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ ارجمند بانو کو اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ان کا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ شروع میں وہ اُداس اور خاموش رہا کرتی تھیں، پھر آہستہ آہستہ انہیں نقاہت محسوس ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ بستر پر دراز ہو گئیں۔

شہزادہ خرم اُداس چہرے کے ساتھ بہت غور سے ماہ رخ کی باتیں سنتا رہا۔

''اب یہ عالم ہے کہ وہ سہارے کے بغیر اُٹھ کر بھی نہیں بیٹھ سکتیں۔'' ماہ رخ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تقریباً روزانہ ہی انہیں ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں۔''

''کیسے خواب؟'' شہزادہ خرم نے گھبرا کر پوچھا۔

''کوئی سیاہ پوش شخص، ارجمند بانو کی طرف خنجر لے کر بڑھتا ہے پھر خوف سے ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔''

ارجمند کے مرض کی تفصیلات سن کر شہزادہ خرم نے ماہ رخ کو رخصت کر دیا۔ پھر جب ماہ رخ جانے لگی تو خرم نے اسے زبانی پیغام دیتے ہوئے کہا۔

''ہم شاہی تقریبات میں مجبوراً شریک ہو رہے ہیں۔ اگر ہمیں اختیار حاصل ہوتا تو ہم ایسی تمام تقریبات کو اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دیتے، جب تک ارجمند بانو مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتیں۔''

ماہ رخ جانے کے لئے مڑی تو شہزادہ خرم نے اسے روک کر کہا۔

''ارجمند بانو سے یہ بھی کہہ دینا کہ اگر انہوں نے اسی طرح بیماری کو گلے لگائے رکھا تو ایک دن ہم بھی بیمار ہو جائیں گے۔'' خرم نے یہ نفسیاتی حربہ اس لئے استعمال کیا تھا کہ ارجمند کے جسم میں بیماری کے خلاف لڑنے کی نئی طاقت پیدا ہو جائے۔

ماہ رخ کے جانے کے بعد شہزادہ خرم نے تمام بڑے بڑے شاہی طبیبوں سے مشورہ کیا۔ اس وقت وزیرِ اعظم آصف خان بھی موجود تھا۔

''ہماری عقل حیران ہے صاحبِ عالم! کہ ساری دوائیں اُلٹا اثر کر رہی ہیں۔''

''پھر بھی، آپ لوگ خصوصی توجہ کے ساتھ علاج کرتے رہیں۔'' شہزادہ خرم نے شاہی طبیبوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

تمام حکیموں نے شہزادے کی خاطر اثبات میں اپنی گردنوں کو جنبش دی اور نئے سرے سے علاج شروع کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر وہ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ سارے نسخے آزمائے جا چکے ہیں اور اب ارجمند بانو کا علاج ممکن نہیں۔

طبیبوں کے جاتے ہی شہزادہ خرم نے آصف خان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ہم ایک باپ کے درد کو سمجھتے ہیں۔ مگر آپ خدا کی ذات سے مایوس نہ ہوں۔ وہی مسیحائے حقیقی ہے۔ اس کے یہاں کوئی مرض لاعلاج نہیں ہوتا۔'' بظاہر شہزادہ خرم، آصف خان کی تسکینِ قلب کے لئے اُمید افزا باتیں کر رہا تھا مگر خود اس کے لہجے کی شکستگی بھی پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔

''ہاں صاحبِ عالم!'' آصف خان کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے مگر وہ ایک سپاہی تھا، اس لئے اپنے آنسوؤں کو پلکوں سے نیچے گرنے نہیں دیا۔ ''اب خدا کی ذات ہی آخری سہارا ہے۔ ورنہ ساری انسانی کوششیں تو ناکام ہو چکیں۔''

اس دوران جہانگیر بھی ایک بار اپنی ہونے والی بہو کو دیکھنے کے لئے آصف خان کے گھر جا چکا تھا۔ اسے بھی ارجمند کی عجیب و غریب بیماری پر افسوس تھا۔ جہانگیر نے کئی شاہی طبیبوں کو طلب کیا اور ارجمند کے علاج کے سلسلے میں نئے احکامات جاری کئے۔

شہزادہ خرم، ارجمند بانو کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے بے قرار تھا، مگر وقت نے اس کے چاروں طرف رسموں کی اونچی دیوار کھڑی کر دی تھی اور خرم اس دیوار کو مسمار کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ مجبوراً وہ ماہ رخ کے ذریعے ارجمند بانو تک اپنے جذبات کی پیغام رسانی کرتا رہا۔

۞.....۞.....۞

ارجمند بسترِ علالت پر دراز تھی اور جشنِ نوروز اپنی تمام تر ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ جاری تھا۔ شہزادہ خرم بھی اس جشن میں شریک ہوا تھا مگر بے دلی کے ساتھ۔ جہانگیر اس موقع پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ایک تو صالحہ بانو سے شادی کی مسرت، دوسرے بغاوت کو کامیابی کے ساتھ

کچل دینے کی خوشی۔ یہ جشنِ نوروز، شہنشاہ کے لئے کیف و نشاط کا پیغام لے کر آیا تھا۔ جہانگیر نے رقص و سرود کی کئی محفلیں منعقد کیں اور بہترین فنکاروں کے فن سے لطف اندوز ہوا۔

مہرالنساء اس پورے جشن کے دوران بہت اُداس اور بجھی بجھی نظر آ رہی تھی۔ جہانگیر کی نئی شادی نے اسے مایوسیوں کے اندھیرے میں غرق کر دیا تھا۔ جشن میں شریک ہونے والی تمام خواتین نے انتہائی زرق برق لباس پہنے تھے مگر مہرالنساء کے جسم پر وہی سفید قبا تھی، جیسے وہ ابھی تک شیر افگن کی موت کا ماتم کر رہی ہو۔ اگرچہ اس نے کئی مواقع پر جہانگیر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے رنگین اور شوخ لباس پہنے تھے، لیکن جشنِ نوروز اور جشنِ شادی میں مہرالنساء نے جان بوجھ کر سادہ لباس استعمال کیا تھا۔ کابل سے واپسی کے بعد وہ جہانگیر کے نئے پیغام کا انتظار کر رہی تھی۔ مہرالنساء کا خیال تھا کہ شہنشاہ اس کے عشق میں دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اور یہی دیوانگی، ہندوستان کے حکمران کو اس کے قدموں پر جھکا دے گی۔ مگر اس وقت مہرالنساء کے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے، جب شہنشاہ نے اچانک شادی کر لی اور جشنِ نوروز میں شرکت کے لئے اسے کوئی پیغام یا دعوت نامہ نہیں بھیجا۔

بظاہر یہ ایک بڑا حادثہ تھا، جس نے مہرالنساء کے خوابوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ جہانگیر کی خلوت میں چلی جائے اور شہنشاہ سے چیخ چیخ کر کہے۔

"عالم پناہ کو میری محبت کا دعویٰ ہے اور دوسری عورتیں حرم میں داخل ہو رہی ہیں۔"

مگر مہرالنساء نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے فوراً ہی اپنے بکھرے ہوئے اعصاب پر قابو پا لیا۔ ظاہر میں وہ بہت زیادہ شکستہ نظر آ رہی تھی لیکن مہرالنساء کے اندر کی عورت ابھی تک پوری توانائیوں کے ساتھ زندہ تھی۔

"مہرالنساء! اپنے ہوش و حواس قائم رکھ!" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "اگر تُو بغیر بلائے ایک بار بھی شہنشاہ کے خلوت کدے میں چلی گئی تو حُسن کا سارا بھرم کھل جائے گا اور تُو انتہائی پستیوں میں گر جائے گی۔"

پھر مہرالنساء نے اپنا اور صالحہ بانو کا مقابلہ کرتے ہوئے سوچا۔ بے شک صالحہ بانو ایک نوخیز لڑکی تھی مگر وہ مہرالنساء سے زیادہ کشش انگیز نہیں تھی۔ مہرالنساء نے ایک بار آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے خدوخال کا جائزہ لیا۔ اس کے نقش و نگار پینتیس سال کی عمر میں بھی توبہ شکن تھے۔

"شہنشاہ کو ایک دن میرے حریمِ ناز میں جھکنا ہی پڑے گا۔ مہرالنساء نے آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر غرور کا عجیب سا رنگ اُبھر آیا۔

❁.....❁.....❁

جشنِ نوروز اور جشنِ شادی کے سبب دارالحکومت آگرہ میں ایک مسرت خیز ہنگامہ برپا

تھا۔ تمام غریب اور نادار انسان خوش نظر آ رہے تھے کہ شہنشاہ نے ان کی خالی جھولیاں بھرنے کا حکم دیا تھا۔ مگر ایک گوپی چند بت تراش تھا کہ جس کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ گوپی چند بت تراش کو اپنے مفلوج ہاتھوں کی فکر تھی۔ اور ایک سنیاسی کے بقول ان ہاتھوں کا علاج صرف مبارک شاہ قلندر ہی کر سکتا تھا۔ اور مبارک شاہ، جہانگیر کی قید میں تھا۔ گوپی چند، مبارک شاہ تک پہنچنے کے لئے سخت بے قرار تھا..... مگر یہ ملاقات کس طرح ممکن ہے؟ جبکہ مبارک شاہ، جہانگیر کے ایک قیدی کی حیثیت سے اپنی زندگی گزار رہا ہے؟..... گوپی چند نے سوچا اور اُداس ہو گیا۔

پھر ایک دن گوپی چند کی بیوی نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "شہنشاہ نے جمنا کے کنارے زنجیرِ عدل نصب کرا دی ہے۔ یہ ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو کسی کے ظلم و ستم کا شکار ہوتے ہیں اور جنہیں انصاف حاصل نہیں ہوتا۔ تم پر بھی گیانی آتمارام نے قہر توڑا ہے۔ تم بھی پوری طاقت سے زنجیرِ عدل کھینچو اور شہنشاہ کو بتاؤ کہ گیانی آتمارام نے تمہیں کس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"مگر گیانی آتمارام تو میرا علاج نہیں کر سکتا۔ میں آخر بادشاہ کے پاس کیا فریاد لے کر جاؤں گا؟ آتمارام تو خود مجبور ہے۔" گوپی چند بت تراش نے مایوس لہجے میں کہا۔

"جب تم بادشاہ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرو گے تو مبارک شاہ کا ذکر بھی آ جائے گا۔ اور اسی موقع پر تمہارے ساتھ انصاف ہو جائے گا۔" بیوی نے گوپی چند کو مزید تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"جب بادشاہ تمہاری گریہ وزاری دیکھے گا تو یقیناً مبارک شاہ کو اپنے حضور طلب کر لے گا۔ اور پھر تم مبارک شاہ سے اپنی حالت زار بیان کر دینا۔ میرا دل کہتا ہے کہ مبارک شاہ جیسا شخص تمہارے علاج کی طرف سے غفلت نہیں برتے گا۔ وہ ایک فقیر انسان ہے اور فقیر کسی کو دُکھ نہیں پہنچاتے۔"

بیوی کا مشورہ بہت مناسب تھا۔ مگر گوپی چند حالات کے اس پہلو پر سوچ رہا تھا کہ کہیں گیانی آتمارام اس سے خفا نہ ہو جائے اور پھر غصے میں آ کر وہ اس کے خاندان کو تباہ نہ کر ڈالے۔ دراصل گوپی، آتمارام کی روحانی قوتوں سے خوف زدہ تھا، جو شخص ایک پل میں پتھر کو سونا اور سونے کو پتھر بنا سکتا ہے تو پھر وہ کوئی بھی ہنگامہ کھڑا کر سکتا ہے۔ پھر جب گوپی چند نے اپنے ان خدشات کا ذکر بیوی سے کیا تو وہ بھڑک اُٹھی۔

"اگر گیانی آتمارام ایسی روحانی قوتوں کا مالک ہوتا تو اب تک تمہارے مفلوج ہاتھوں کا علاج کر چکا ہوتا۔ وہ تو خود مبارک شاہ کے تصور سے ڈرا سہما رہتا ہے۔ اور اگر آتمارام خفا بھی ہو گیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ تمہاری موجودہ حالت تو پہلے ہی کسی عذاب سے کم نہیں۔ اب بھیک مانگنے کی نوبت آ چکی ہے۔ ایک بھکاری کو زندگی بسر کرنے سے تو بہتر ہے کہ تمام گھر والوں کو عزت کی موت آ جائے۔" گوپی چند کی بیوی غربت و افلاس سے تنگ آ چکی تھی، اس لئے وہ شوہر کو انتہائی اقدام کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

گوپی چند سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی بیوی سے زنجیرِ عدل کھینچنے کا وعدہ تو کر لیا مگر ابھی وہ شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ گوپی چند میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آتمارام کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت کر سکے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ تنہائی میں مبارک شاہ سے مل کر اپنا مسئلہ بیان کرے گا۔ مگر جب اسے معلوم ہوا کہ مبارک شاہ، جہانگیر کی قید میں ہے تو وہ پریشان نظر آنے لگا۔ شاہی قید خانے تک پہنچنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اگر وہ بیوی کا مشورہ مانتے ہوئے انصاف کی زنجیر کھینچتا ہے تو پھر ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ بادشاہ یقیناً آتمارام کو بھی دربار میں طلب کرے گا۔ اور گوپی چند کو یہ بات معلوم تھی کہ بادشاہ سے لے کر آگرہ کے ایک عام باشندے تک ہر شخص آتمارام کو ایک باکمال سنیاسی کی حیثیت سے جانتا ہے۔ پھر اس حالت میں اس کی بات کون سنے گا؟ اور وہ ایک تماشا بن کر رہ جائے گا۔ بدقسمتی سے گوپی چند کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ گیانی آتمارام ایک بار مبارک شاہ کے معاملے میں بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ اور اسی شکست کے بعد شہنشاہ نے اسے آگرہ کی حدود سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ چونکہ جہانگیر نے یہ فیصلہ تنہائی میں کیا اور آتمارام نے فوراً ہی شہنشاہ کے پاؤں پکڑ کر رحم کی بھیک مانگی تھی۔ اس لئے یہ خبر آگرہ کے گلی کوچوں میں عام نہیں ہو سکی تھی۔ اور گوپی چند بت تراش اس واقعہ سے بے خبر تھا۔ اگر اسے اس بات کی ذرا بھی ہوا لگ جاتی کہ شہنشاہ، آتمارام سے سخت ناراض ہے تو وہ آدھی رات کو انصاف کی زنجیر کھینچ لیتا۔ اور یہاں تک کھینچتا رہتا کہ پورا محل گھنٹیوں کے شور سے گونج اُٹھتا۔

اسی بے خبری نے گوپی چند کو شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ کبھی وہ اپنے مفلوج ہاتھوں کی طرف دیکھ کر اس قدر جذباتی ہو جاتا کہ دریائے جمنا کے کنارے نصب شدہ زنجیرِ عدل کے قریب پہنچ جاتا۔ اس سے پہلے کہ وہ زنجیر کھینچے، کوئی اس کے کانوں میں کہنے لگتا۔

"گوپی چند! یہ کیا کر رہا ہے؟ تُو آتما کو نہیں جانتا کہ وہ کئی طاقتوں کا مالک ہے۔ اگر تیرا مقدمہ جہانگیر کی عدالت میں پہنچ گیا تو قیامت برپا ہو جائے گی۔ آتمارام اپنی ذلت کو برداشت نہیں کر سکے گا اور پھر تیرے بیوی بچے بھی اس کے قہر و غضب کا نشانہ بن جائیں گے۔" یہی وہ آواز تھی جو گوپی چند کے ارادوں کو شکست دے دیتی اور وہ زنجیرِ عدل کے قریب پہنچ کر ناکام و نامراد لوٹ آتا۔

۞.....۞.....۞

جشنِ نوروز گزر گیا مگر شاہی طبیبوں کی سخت نگہداشت کے باوجود ارجمند بانو کی بیماری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ کمزوری کا وہی عالم تھا اور چہرے کی زردی روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران ایک دن شہزادہ خرم، مبارک شاہ قلندر کے لئے کھانا لے کر گیا۔ قلندر نے خرم کو دیکھ کر منہ پھیر لیا اور تیز لہجے میں کہا۔

"لے جا اپنا کھانا۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

شہزادہ خرم کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ رُک رُک کر کہنے لگا۔ "بابا! کیا مجھ سے کوئی کوتاہی، کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہے؟"

"بہت بڑی کوتاہی..... بہت بڑی گستاخی۔" مبارک شاہ نے پُرجلال لہجے میں کہا۔

"تو پھر مجھے معاف کر دیجئے۔ میں تو آپ کے بچوں کی مانند ہوں۔" شہزادہ خرم کے لہجے میں بڑی عاجزی تھی۔

"اگر بچوں کی طرح ہوتا تو اپنے باپ سے دل کا حال نہ چھپاتا۔" مبارک شاہ نے بدستور منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

شہزادہ خرم کو چہرے سے پریشان دیکھ کر قلندر کئی بار پوچھ چکا تھا کہ آخر وہ اتنا اُداس کیوں نظر آتا تھا؟ خرم نے بھی کئی بار چاہا کہ وہ مبارک شاہ کے سامنے اپنے دل کا درد بیان کر دے مگر ہر مرتبہ شرم کی وجہ سے اس کے ہونٹ جنبش نہ کر سکے۔ وہ اپنی زبان سے قلندر کے سامنے ارجمند بانو کا نام لینا نہیں چاہتا تھا۔

"میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا، جب تک تُو مجھے اپنی اُداسی کا سبب نہیں بتائے گا۔" مبارک شاہ کی آواز میں بڑا جلال تھا۔ "تُو نے آئینے میں چہرہ نہیں دیکھا؟ اگر تُو میرا بچہ ہے تو اپنے باپ کو اس غم کے بارے میں بتا دے جو تجھے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔"

"بابا!" شہزادہ خرم، گھٹنوں کے بل قلندر کے سامنے بیٹھ گیا۔ "مجھے ایسی آزمائش میں نہ ڈالیے۔" اس کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی۔

"اور تیرا باپ جس کرب میں مبتلا ہے، تجھے اس کا کچھ اندازہ ہے۔" مبارک شاہ نے خرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارجمند بہت بیمار ہے بابا!" آخر شہزادہ خرم کی پلکوں پر ٹھہرے ہوئے آنسو اس کے رخساروں تک پہنچ گئے۔ "شاہی طبیب عاجز آ گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ارجمند کو کیا بیماری لاحق ہے۔"

مبارک شاہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شہزادہ خرم کو محسوس ہوا جیسے قلندر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مبارک شاہ کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر یکایک قلندر نے آنکھیں کھول دیں۔

"طبیب کیا بتائیں گے کہ اس بچی کو کیا بیماری ہے؟" مبارک شاہ غضب ناک لہجے میں بول رہا تھا۔ "شیطان کے پجاریوں نے اس معصوم لڑکی کو بھی نہیں چھوڑا۔ مگر انہیں یہ نہیں معلوم کہ مبارک شاہ ابھی زندہ ہے۔ اس کی زندگی میں اس کے دونوں بچوں پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ انشاء اللہ بہت جلد خرم اور ارجمند کے دشمن رسوا ہوں گے۔ آتمارام! اگر تُو اپنے عقیدے کے مطابق سو بار بھی مر کر جنم لے لے تو میرے بچوں پر قابو نہیں پا سکے گا۔"

آتمارام کا نام سن کر شہزادہ خرم حیران ہو گیا۔ "بابا! ارجمند کی بیماری کا آتمارام سے کیا تعلق

ہے؟'' خرم نے مبارک شاہ سے سوال کیا۔

''بہت گہرا تعلق ہے۔'' قلندر کا لہجہ بدستور شرر بار تھا۔ ''وہ خبیث روحوں کا ماننے والا آتما رام تجھے اور ارجمند کو اپنے جادو سے شکار کرنا چاہتا ہے۔''

یہ خبر شہزادہ خرم کے لئے بڑی حیران کن تھی۔ ''جادو؟'' شہزادہ خرم نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''آخر میں نے اس شعبدہ باز کا کیا بگاڑا ہے..... اور اس جادوگر کو ارجمند بانو سے کیا پرخاش ہے؟''

''آتما رام اس شیطان کے پیچھے چلنے والا ہے۔ جو مخلوقِ خدا کو سیدھے راستے پر گامزن نہیں دیکھ سکتا۔'' مبارک شاہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ تجھے بھی تیرے باپ کی طرح دیکھنا چاہتا ہے۔'' قلندر کا لہجہ اس شمشیر کی مانند تھا جو بے نیام ہو چکی تھی۔ ''وہ تیرے دل و دماغ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے کہ تُو بھی جہانگیر کی طرح لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ کرنے پر مجبور کر دے اور پھر کرسی پر بیٹھ کر خدا بن کر بیٹھ جائے۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان اسلامی آداب کو فراموش کر دیں۔''

مبارک شاہ کی باتیں سن کر خرم شدید حیرت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''اور معصوم ارجمند کو اس لئے ہلاک کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ اس کی موت کے بعد تُو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔'' مبارک شاہ نے نیا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ خدا اپنے نام لیواؤں کو زمین پر تنہا نہیں چھوڑتا۔'' یہ کہہ کر مبارک شاہ نے جو کی روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھانا شروع کر دیا۔ قلندر کی غذا بھی بڑی عجیب غذا تھی۔ وہ ایک وقت میں جو کی ایک روٹی، نمک کے پانی کے ساتھ کھایا کرتا تھا۔

آج خلافِ معمول مبارک شاہ نے اپنی روٹی میں سے ایک ٹکڑا باقی چھوڑ دیا تھا۔ شہزادہ خرم، قلندر کے اس عمل کو حیرت سے دیکھتا رہا۔

''اب خدا نے چاہا تو ارجمند صحت یاب ہو جائے گی۔'' اچانک مبارک شاہ نے خرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اس ٹکڑے میں سے تھوڑا سا تُو بھی چکھ لے شاہ جہاں! اور باقی ارجمند کو کھلا دے۔''

آج دوسری بار خرم نے قلندر کی زبان سے ''شاہ جہاں'' کا لفظ سنا تھا۔

''بابا! آپ مجھے شاہ جہاں کیوں کہتے ہیں؟'' خرم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ راز کی باتیں ہیں۔'' مبارک شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ابھی یہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی مگر تُو بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ شاہ جہاں کون ہے۔ فی الوقت تُو میرے سامنے روٹی کا آدھا ٹکڑا کھا لے۔''

خرم نے قلندر کے حکم پر عمل کیا اور روٹی کا آدھا ٹکڑا کھا لیا۔

''باقی ارجمند تک پہنچا دے۔'' مبارک شاہ نے کہا۔

''اور بابا.....؟'' خرم، قلندر سے مزید کچھ باتیں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ مگر مبارک شاہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''بس اب جا۔'' یہ کہہ کر قلندر زمین پر لیٹ گیا۔ اور زنداں کے اس تاریک کمرے کی چھت کو دیکھنے لگا۔

۞.....۞.....۞

شہزادہ خرم نے مہ رخ کے ذریعے قلندر کے آگے سے بچی ہوئی روٹی کا وہ ٹکڑا، ارجمند تک پہنچا دیا۔ پھر جیسے ہی ارجمند نے جو کی روٹی کا وہ بے مزا ٹکڑا کھایا، اسے اپنی جسمانی حالت میں عجیب سا تغیر محسوس ہونے لگا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس طرح صحت یاب پانے لگی کہ جیسے وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی تھی۔

وزیرِ اعظم آصف خان کے گھر میں جشن کا سا سماں تھا۔ غریبوں اور محتاجوں میں خیرات تقسیم کی جا رہی تھی۔ اور تمام امراء کی بیگمات اس صحت یابی پر ارجمند بانو کو مبارک باد دینے آ رہی تھیں۔

پھر جب تمام لوگ رخصت ہو گئے تو ارجمند نے ماہ رخ سے پوچھا۔ ''یہ سب کیا تھا؟ جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایسی تاثیر؟'' یہ کہتے وقت ارجمند بانو ایک مجسم سوال بن کر رہ گئی تھی۔

''بی بی! میں کچھ نہیں جانتی۔'' ماہ رخ نے بے چارگی کے ساتھ کہا۔ ''مجھے تو صاحبِ عالم نے یہ روٹی کا ٹکڑا دیا تھا اور کہا تھا کہ ارجمند بانو کو دے دیں۔ یہی ان کی بیماری کی دوا ہے۔''

''میں حیران ہوں ماہ رخ! کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟'' ارجمند بانو اس بچے کی طرح پریشان نظر آ رہی تھی، جو لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا ہو۔ ''جس مرض کو دُور کرنے کے لئے بڑے بڑے شاہی طبیبوں کی دوائیں بے اثر ثابت ہو جائیں، وہ ایک روٹی کے ٹکڑے سے کس طرح ختم ہو گیا؟ وہ کوئی کیمیا تاثیر روٹی تھی یا کوئی جادوئی نسخہ؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اب آپ خود صاحبِ عالم سے ملیں گی تو دریافت کر لیجئے گا۔'' ماہ رخ نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

خرم کا نام سن کر ارجمند بانو کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی اور اس نے سر جھکا لیا۔

ماہ رخ تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ارجمند کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ پھر وہ تھوڑا سا جھکی اور آقا زادی کے ماتھے کو بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

''خدا آپ کو ہر بری نظر سے محفوظ رکھے۔ یہ شگفتہ مسکراہٹ دیکھنے کے لئے میری آنکھیں دو سال سے ترس رہی تھیں۔''

ارجمند نے بے اختیار ماہ رخ کو گلے سے لگا لیا۔ پھر وہ دونوں بہت دیر تک روتی رہیں۔ مگر یہ خوشی کے آنسو تھے۔

۞.....۞.....۞

ایک بار پھر وہی کیف و نشاط کا موسم لوٹ آیا تھا۔ صحت یاب ہوتے ہی ارجمند بانو، شہزادہ

خرم سے ملی۔ یہ ملاقات بڑی والہانہ تھی۔ ارجمند بانو، شہزادہ خرم کے کاندھے پر سر رکھے مسلسل رو رہی تھی۔

خرم کا بھی یہی حال تھا۔ شہزادے نے اس نشاط انگیز قربت کو آنسوؤں کی تپش سے دُور رکھنا چاہا۔ ''آج تمہارا جشنِ صحت ہے ارجمند! اس خوشی کے موقع پر گزری ہوئی ساعتوں کا ماتم نہیں کرتے۔''

ارجمند بانو نے سر اٹھا کر شہزادہ خرم کی طرف دیکھا۔ ''میں نے تو آپ کو اپنی قسم دی تھی کہ میری خاطر پریشان نہ ہوں۔ پھر آپ نے اپنی ذات پر تمام خوشیاں کیوں حرام کر رکھی تھیں؟''

''ہاں ارجمند! ہم نے تمہاری دی ہوئی قسم توڑ ڈالی۔'' خرم کی آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔

''بے شک! ہم سے یہ گناہ سرزد ہوا مگر ہم اپنے دل سے مجبور تھے۔ آج اندازہ ہوا کہ ہم تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہماری خوشی، ہمارا تخت و تاج، ہماری شہنشاہیت صرف تم ہو۔'' خرم نے شدید اضطراری کیفیت سے دوچار ہو کر ارجمند بانو کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تم سے بچھڑ کر ہم کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں۔''

ارجمند، خرم کے اتنے قریب آ گئی کہ اس کی زلفوں کی خوشبو سے شہزادے کا دماغ مہک اُٹھا۔

''آج مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین آ گیا، صاحبِ عالم!'' ارجمند کی آواز کانپ رہی تھی۔

''بے شمار کنیزوں کے ہجوم میں بھی آپ نے صرف مجھے یاد رکھا۔ مجھ سے زیادہ خوش بخت کون ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں..... کوئی بھی نہیں۔'' ارجمند پر سرشاری کی عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

پھر جب یہ جذباتی لمحات گزر گئے تو خرم نے ارجمند کو بتا دیا کہ وہ روٹی کا ٹکڑا مبارک شاہ قلندر نے دیا تھا، جس کے اثر سے آتمارام کیا کیا ہوا جادو زائل ہو گیا۔

جادو کا ذکر سن کر ارجمند چونک اُٹھی۔ ''ہاں صاحبِ عالم! وہ جادو ہی ہو سکتا ہے۔ خدا، مبارک شاہ کا بھلا کرے کہ انہوں نے مجھے ایک طویل اذیت سے نجات دلائی۔ مگر میں نے اس شخص کا کیا بگاڑا تھا؟'' ارجمند کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔

جواب میں خرم نے قلندر کی باتیں دہراتے ہوئے کہا۔ ''آتمارام تمہیں مجھ سے جدا کرنا چاہتا تھا۔''

ارجمند بانو لرز اُٹھی۔ ''آتمارام دوبارہ بھی یہ حرکت کر سکتا ہے۔'' ارجمند کے لہجے میں انتہائی خوف پوشیدہ تھا۔

''نہیں! اب وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔'' شہزادہ خرم نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ ''بابا مبارک شاہ نے اس کا مستقل انتظام کر دیا ہے۔''

۞.....۞.....۞

جشنِ نوروز اور نئی شادی کے ہنگامے گزر چکے تھے۔ اب شاہی محلات کی فضا پر گہرا

سکوت طاری تھا۔ جہانگیر ان مسرت انگیز ہنگاموں میں کچھ دنوں کے لئے شہزادہ خسرو اور اس کی بغاوت کو بھول گیا تھا۔ مگر جیسے ہی کیف و نشاط کا یہ شور ختم ہوا، اسے خسرو کی باغیانہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جہانگیر کئی راتوں سے بے چین تھا اور نصف شب کے بعد تک شراب پیتا رہتا تھا۔ ایک باپ کی حیثیت سے وہ خسرو کی بغاوت کو فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ مگر ایک شہنشاہ کی حیثیت سے جہانگیر، خسرو کو بدترین سزا دینا چاہتا تھا۔ کئی دن تک ایک باپ اور ایک حکمران کے درمیان شدید کشمکش جاری رہی۔ آخر ایک روز جہانگیر کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے اپنے سپہ سالار مہابت خان کو خلوت میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

''ہم خسرو کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔''

''ظلِ الٰہی! پریشانیوں کا دور تو گزر چکا۔'' مہابت خان نے نصف قد تک خم ہوتے ہوئے کہا۔ ''بغاوت کچل دی گئی اور باغیوں کو سزا دی جا چکی۔'' مہابت خان اپنے فرمانروا کو خوش کرنے کے لئے حکمت عملی سے کام لے رہا تھا۔ دراصل وہ شہزادہ خسرو کو مزید شاہی عتاب سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ مہابت خان درپردہ خسرو کی حمایت کر رہا تھا بلکہ وہ جہانگیر اور خسرو کے رشتے کی نزاکت کو سمجھتا تھا۔ اس لئے گزشتہ بغاوت کو ایک معمولی طوفان کہہ کر اس طرف سے شہنشاہ کی توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔

''مگر باغیوں کا سرغنہ ابھی زندہ ہے مہابت خان!'' جہانگیر نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

''شہزادے نوعمر اور نادان ہیں۔ بہت جلد دشمنوں کے ورغلانے میں آ جاتے ہیں۔'' مہابت خان نے ایک بار پھر شہنشاہ کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''تم اسے ہم سے زیادہ نہیں جانتے مہابت خان!'' جہانگیر بھڑک اٹھا۔ ''خسرو ہمارا بیٹا ہے۔ ہم اس وقت سے اس کی فتنہ انگیزیوں کو برداشت کر رہے ہیں، جب خسرو کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔''

مہابت خان بے دست و پا نظر آنے لگا اور اس نے گھبرا کر سر جھکا دیا۔

''ہم نے یہ فیصلہ کرنے میں کئی ماہ گزارے ہیں۔'' جہانگیر کا لہجہ بدستور قہرناک تھا۔ ''ہم ساری ساری رات جاگے ہیں اور پھر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ.....'' اچانک جہانگیر نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

''کیا فیصلہ ظلِ الٰہی؟'' مہابت خان جیسے آہنی اعصاب رکھنے والے سپہ سالار کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''یہی کہ اب شہزادہ خسرو کو اس کے انجام تک پہنچا دو۔'' جہانگیر نے شاہانہ رعب و جلال کے ساتھ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

سپہ سالار مہابت خان لرز اٹھا اور بہت دیر تک سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

''کیا تجھے ہمارے حکم کی تعمیل پر کوئی اعتراض ہے؟'' جہانگیر نے قہرناک لہجے میں کہا۔

''نہیں ظلِ الٰہی!'' مہابت خان نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ ''میرے تو ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی ایسا کوئی خیال موجود نہیں۔ میں تو خواب کے عالم میں بھی نافرمانی کا تصور نہیں کر سکتا۔''

''پھر تیرے چہرے کا رنگ فق کیوں ہے؟'' جہانگیر نے اپنے سپہ سالار سے پوچھا۔ ''اور تیرے بدن پر لرزہ کیوں طاری ہے؟''

''ایک میں ہی کیا، سارا ہندوستان شہنشاہ کے قہر سے پناہ مانگتا ہے۔'' مہابت خان نے بہت آہستہ لہجے میں کہا۔ ''عالم پناہ کا فیصلہ برحق ہے مگر پھر بھی شہزادہ خسرو کوئی عام مجرم نہیں۔'' یہ کہتے کہتے ایک بار پھر مہابت خان کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ ''اس غلام کی حقیر رائے میں کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ شہزادۂ عالم پر قید و بند کی سختیاں بڑھا دی جائیں اور دوسری سزا موقوف کر دی جائے۔'' مہابت خان، شہزادہ خسرو کی وکالت نہیں کر رہا تھا۔ دراصل وہ شہنشاہ کو اس جابرانہ فیصلے سے روکنا چاہتا تھا۔ اگر ایک بار یہ مثال قائم ہو جاتی تو پھر دوسرے لوگ بھی جہانگیر کے غضب سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔

''خسرو ہمارا بیٹا ہے یا تیرا؟'' جہانگیر کے سوال میں بڑی جارحیت تھی۔

مہابت خان نے گھبرا کر دوبارہ سر جھکا لیا۔

''دل تو ہمارا زخمی ہوگا۔ پھر تجھے اس خلش کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟'' جہانگیر کی زبان سے برسنے والی قہر کی آگ بھڑکتی جا رہی تھی۔ ''کیا ہم سمجھ لیں کہ تیری وفاداریاں مشکوک ہو چکی ہیں؟''

''نہیں عالم پناہ!'' مہابت خان نے مزید جھکتے ہوئے کہا۔ ''اگر حکم ہو تو یہ غلام اپنا سر کاٹ کر شاہِ والا کے قدموں پر رکھ دے۔'' مہابت خان سنبھل چکا تھا اور اب وہ مزاجِ شاہی کے مطابق گفتگو کر رہا تھا۔

''پھر تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تُو ہمارے حکم پر پورا پورا عمل کر۔'' جہانگیر نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ ''آگے بڑھ اور لوگوں پر ثابت کر دے کہ جلالت مآب کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے۔ اگر اس ہندوستان میں کوئی روشن حقیقت ہے تو وہ جہانگیر کا انصاف ہے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔''

سپہ سالار مہابت خان نے شہنشاہ کی خلوت سے رخصت ہوتے وقت جہانگیر کو سجدہ کیا اور اُلٹے قدموں واپس چلا گیا۔

۞.....۞.....۞

وہ بڑا لرزہ خیز منظر تھا، جب شہزادہ خسرو کو زنجیروں میں جکڑ کر سرِ دربار لایا گیا۔ خسرو کے

جسم پر شدید لرزہ طاری تھا اور آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

عام درباریوں کا خیال تھا کہ بیٹے کو اس حالت میں دیکھ کر شہنشاہ کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان اُٹھے گا اور پھر خسرو کے آنسو جہانگیر کی آتشِ غضب کو بجھا دیں گے۔ مگر اس بار ساری قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔

جہانگیر نے قہر آلود نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ''خسرو! ہم سمجھتے تھے کہ تدبیر کے ذریعے تقدیر کے لکھے کو مٹایا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک ایک تدبیر رائیگاں گئی۔'' جہانگیر کے لہجے میں قہر کی آگ بھی شامل تھی اور اس کے الفاظ سے ناکام حسرتوں کا خون بھی ٹپک رہا تھا۔

شہزادہ خسرو نے ایک بار پھر باپ سے اس کے رحم و کرم کی بھیک مانگی مگر آج کے دن جہانگیر نے اپنی سماعتوں پر کڑے پہرے بٹھا دیئے تھے۔ اب وہ بیٹے کی کوئی چیخ، کوئی فریاد سننا نہیں چاہتا تھا۔

''ہم نے چاہا کہ لوگ ہمارے سامنے تیری اطاعت شعاری کی مثالیں پیش کریں۔ مگر تُو نافرمانی کی انتہائی حدوں سے گزر گیا۔'' پورا دربار، جہانگیر کی بارُعب آواز سے گونج رہا تھا۔ ''اور ہم نے یہ بھی چاہا کہ تُو ہر معرکہ میں سرخرو اور سربلند رہے۔ مگر ذلت آمیز شکست تیرا مقدر تھی اور تُو نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ سیاہ کر لیا۔'' یہ کہتے وقت جہانگیر کے لہجے کا جلال کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ''اور ہم نے یہ بھی چاہا کہ تختِ شاہی تیرا مسکن ہو اور تُو اپنے سر پر فتح و نصرت کا تاج سجائے۔ مگر تیری قسمت میں تو زنداں کا ایک تاریک گوشہ لکھ دیا گیا تھا۔ آج تیرے سر پر رسوائیوں کی خاک ہے اور بدن پر آہنی زنجیروں کے سڑتے ہوئے زخم۔'' یہ کہہ کر جہانگیر چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ شدتِ غضب سے سرخ ہو رہا تھا۔ ''بدنصیب خسرو! ایک نظر اہلِ دربار کی طرف دیکھ۔ کچھ دن پہلے تیری آمد پر ان کی آنکھوں میں عقیدت و احترام کی تصویریں جگمگانے لگتی تھیں۔ مگر آج تیرا انجام دیکھ کر ان کی آنکھیں ویران ہیں۔ یہ سب کے سب اپنے قریب موت کے مہیب سایوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ وقت اس قدر بے وفا بھی ہوتا ہے۔ کہاں ہیں وہ تیرے ساتھی جو تجھے اس تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ انہیں آواز دے خسرو!..... مگر وہ تجھے کوئی جواب نہیں دے سکیں گے۔ ان کے جسموں کو زیرِ قبر حشرات الارض چاٹ رہے ہوں گے۔ اور جو تیرے ہم نوا زندہ ہیں، انہیں بھی پکار کر دیکھ۔ مگر آج وہ بھی تیری آواز سن کر اپنی زبانوں پر قفل لگا لیں گے۔ انہیں تیری بے دست و پا اور مجبور زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ ہمارے خون آشام خنجر کو اپنی شہ رگ کے قریب محسوس کر رہے ہیں۔ آج ان کے ہونٹوں کو ہلکی سی جنبش بھی نہیں ہو سکتی۔ ہم جانتے ہیں کہ تیرے کچھ ہم نوا اس وقت بھی دربار میں موجود ہیں، غداری اور نمک حرامی کی غلیظ قبا میں لپٹے ہوئے۔ مگر آج وہ کچھ نہیں بول سکتے کہ ہمارے جلال و جبروت سے ان کی سانسیں رکی جا رہی

ہیں۔ ہم نے انہیں ان کی لعنت زدہ زندگی کے ساتھ کھلا چھوڑ دیا ہے تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے تیرا حشر دیکھ سکیں۔"

یہ کہہ کر جہانگیر نے اپنے سپہ سالار کو آواز دی۔

"مہابت خان! آگے بڑھ اور ان آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے بجھا دے، جن میں احسان فراموشی کے سوا کوئی دوسرا عکس موجود نہیں۔" جہانگیر نے شاہی افواج کے امیر کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "جو آنکھیں ہماری موت کے خواب دیکھا کرتی تھیں، ان سے روشنی کی ہر کرن چھین لے۔"

جہانگیر کے اس حکم کے ساتھ ہی ایک طویل قامت جلاد اپنے ہاتھ میں لوہے کی تپتی ہوئی سرخ سلاخ لے کر داخل ہوا۔

"مہابت خان! یہ آگ اس شخص کی آنکھوں میں بھر دے، جس نے انسانیت کے مقدس ترین رشتے کو سینکڑوں بار پامال کیا ہے۔"

مہابت خان نے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور جلاد سے تپتی ہوئی سلاخ لے کر آگے بڑھا۔ اہلِ دربار دھڑکتے دلوں اور رکی ہوئی سانسوں کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ مہابت خان کے ہاتھوں میں شدید لرزش تھی، جیسے وہ رعشہ کا مریض ہو۔

یکایک جہانگیر کی آواز گونجی۔ "مہابت خان! اگر تیرے ہاتھ کانپ رہے ہیں تو اس سلاخ کو اپنی آنکھوں میں پھیر لے۔"

مہابت خان نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ اس دوران کئی طاقتور ہاتھوں نے شہزادہ خسرو کے جسم کو جکڑ لیا تھا۔

مہابت خان اپنے قدموں کو جماتا ہوا آگے بڑھا اور خسرو کے قریب پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے ہاتھ کانپے مگر وہ حکمِ شاہی سے مجبور تھا۔

دوسرے ہی لمحے مہابت خان کا ہاتھ بلند ہوا اور اس نے جلتی ہوئی لوہے کی سلاخ شہزادہ خسرو کی ایک آنکھ میں پھیر دی۔ پورا دربار ایک دلدوز چیخ سے گونج اٹھا۔

"بابا! میں آپ کا محبوب بیٹا خسرو ہوں۔ مجھ پر رحم کیجئے۔"

"مر گیا ہمارا محبوب فرزند خسرو۔ آج ہم اس کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔" جہانگیر نے چیخ کر کہا۔ "مہابت خان! کیا تجھے ہمارے نئے حکم کا انتظار ہے؟"

مہابت خان کے ہاتھوں کو دوبارہ جنبش ہوئی اور لوہے کی سرخ تپتی ہوئی سلاخ شہزادہ خسرو کی دوسری آنکھ میں بھی اُتر گئی۔

"بابا! آپ کا پیارا بیٹا خسرو ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا..... اب اسے کچھ نظر نہیں آتا۔"

خسرو کی چیخیں اس قدر دردناک تھیں کہ جہانگیر بے قرار ہو کر تخت پر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس بدنصیب کو ہمارے سامنے سے لے جاؤ اور زنداں کے اندھیروں میں غرق کر دو۔"

جہانگیر وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ "اس کی یہ مصیبت ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔"

شہنشاہ کو اس عالم میں دیکھ کر تمام درباری کھڑے ہو گئے تھے اور ان کے جسموں پر شدید لرزہ طاری تھا۔

شہزادہ خسرو کی دونوں آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا اور چار طاقتور جلاد اسے کھینچ کر زنداں کی طرف لئے جا رہے تھے۔ خسرو بار بار چیخ رہا تھا۔

"بابا! مجھے کچھ نظر نہیں آتا..... میری آنکھوں میں یہ کیسی آگ لگی ہے؟..... کوئی اس آگ کو نہیں بجھاتا۔ خدا کے لئے، آپ ہی میری ان جلتی ہوئی آنکھوں پر مرہم رکھ دیجئے۔"

اس وقت پورا دربار ایک زندہ قبرستان نظر آ رہا تھا۔

۞.....۞.....۞

اُس رات جہانگیر نے درباری مطربہ، انجمن آراء کے ذریعے مہرالنساء کو خلوت میں طلب کیا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب مہرالنساء شہنشاہ کے خلوت کدے میں داخل ہوئی تو اس کے دلکش چہرے پر خوف و ہراس کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ ورنہ اب تک مہرالنساء کا یہ انداز رہا تھا کہ وہ ایک خاص غرور و ناز کے ساتھ جہانگیر کے سامنے آتی تھی۔

"ظلِ الٰہی نے اس کنیز کو کس لئے طلب فرمایا ہے؟" مہرالنساء نے خواب گاہِ شاہی میں داخل ہوتے ہی بڑے ادب سے پوچھا۔

اس وقت جہانگیر شراب پی رہا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مہرالنساء کی طرف دیکھا اور جام کا آخری گھونٹ لیا۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا مگر اس دوران اس کی نظریں مہرالنساء کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مہرالنساء شرما کر فرش کی طرف دیکھنے لگی مگر اس وقت وہ شرم سے زیادہ گھبراہٹ کا شکار تھی۔

"ہم نے تمہیں اس لئے طلب کیا ہے مہرو! کہ تم اپنی آنکھوں سے ہمارے انصاف کا مشاہدہ کر سکو۔" جہانگیر ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

مہرالنساء نے گھبرا کر شہنشاہ کی طرف دیکھا۔

"وہ بغاوت جس نے کابل اور لاہور کے درمیان سر اُٹھایا تھا، آج کچل دی گئی۔" جہانگیر کے لہجے میں بڑا جلال تھا۔ "تمہیں اپنے دونوں بھائیوں کی موت کا بہت غم تھا، مگر آج ہمارے غم کا اندازہ کرو کہ ہمارا محبوب بیٹا ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا۔" یہ کہتے کہتے جہانگیر کی آواز سے دل کا درد جھلکنے لگا تھا۔ "تمہارے بھائی تلوار کے ایک وار سے قتل کر دیئے گئے۔ وہ چند لمحوں کی تکلیف تھی، جس کے بعد ان کی روحوں کو سکون حاصل ہو گیا۔ مگر ہمارے بیٹے خسرو کی طرف دیکھو۔ اس کی نظروں کے سامنے پوری دنیا اندھیر ہے۔ اب وہ دنیا کے کسی منظر سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس کی مجبوریوں کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی کے سہارے کے بغیر چند قدم چلنے سے بھی

قاصر ہے۔ ہم نے اسے بڑی دردناک سزا دی ہے۔"

مہرالنساء، جہانگیر کے حضور گھٹنوں کے بل جھک گئی۔

"عالم پناہ! یہ کنیز آپ کے کرب کو سمجھتی ہے۔" مہرالنساء کی آواز لرز رہی تھی۔

"کاش! ایسا ہوتا کہ تم ہماری اذیتوں کو سمجھ سکتیں۔" جہانگیر کے لہجے سے انتہائی شکستگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس دنیا میں ہمارا کوئی نہیں۔ ہم ہندوستان کی تقدیر کے مالک ہیں مگر ایک بھکاری سے بھی زیادہ محروم۔ وہ بھی روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے کھا کر چین کی نیند سو جاتا ہے، مگر ہم ساری رات جاگ کر اپنی تنہائیوں کا ماتم کرتے ہیں۔ بیگمات کو شاہی تقریبات کی ہنگامہ خیزیوں سے فرصت نہیں۔ اولاد، اقتدار کا خواب دیکھ رہی ہے اور دن رات باپ کا سر کاٹنے کے لئے منصوبہ سازی کرتی رہتی ہے۔ وزیر امیر اس لئے خوشامد میں مصروف ہیں کہ انہیں بڑی بڑی جاگیریں درکار ہیں۔ وہ جاگیروں کے حصول کے لئے ہمیں سجدے کرتے ہیں مگر وہ خود بھی جھوٹے ہیں اور ان کے سجدے بھی۔ یہ سب غرض کے بندے ہیں۔ انہیں ہماری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر ذرا بھی دلچسپی ہوتی تو خسرو ہمارے خلاف بغاوت نہ کرتا۔" یہ کہہ کر جہانگیر چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر یکایک چیخ کر بولا۔ "مہرو! تم جانتی ہو کہ خسرو سے ہمیں کتنی محبت ہے؟"

مہرالنساء لرز کر رہ گئی۔

"خسرو برسوں یہاں سر رکھ کر سویا کرتا تھا۔" جہانگیر نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے دل کے قریب رہنے والا اس قدر سرکش بھی ہو سکتا ہے۔ خدا کی پناہ! ایک بیٹے نے باپ کے دل کے ٹکڑے کر دیئے۔ پھر تم کس منہ سے کہتی ہو کہ تمہیں ہمارے درد کا احساس ہے؟ تم بھی جھوٹ بولتی ہو مہرو!" جہانگیر بری طرح مشتعل نظر آ رہا تھا۔

مہرالنساء بدحواس ہو گئی۔ اور پھر وہ اسی وحشت میں جہانگیر کے قدموں کے قریب پہنچ گئی۔

"جہاں پناہ! یہ کنیز جھوٹی نہیں، مجبور ہے۔" مہرالنساء نے جہانگیر کے پیروں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"کیا مجبوریاں ہیں تمہاری؟" جہانگیر نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ دنیا مجھے ایک حریص عورت کے نام سے یاد کرے گی۔" مہرالنساء کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "لوگ کہیں گے کہ میں نے اقتدار کے خواب دیکھے اور ایک شہنشاہ سے اپنی بیوگی کا سودا کر لیا۔" مہرالنساء نے جہانگیر کو جذباتی پا کر ایک بار پھر گریز کی راہ اختیار کی۔ وہ شہنشاہ کی ناآسودہ خواہشوں کو مزید اضطراب میں مبتلا کر دینا چاہتی تھی۔

مہرالنساء ایک ذہین اور معاملہ فہم عورت تھی۔ اس نے مختلف ملاقاتوں میں جہانگیر کے چہرے پر لکھی ہوئی جذباتی تحریر کو پڑھ لیا تھا اور وہ سمجھ چکی تھی کہ ہندوستان کا حکمران، دل کے ہاتھوں مجبور ہو چکا ہے اور وہ اس کی زلف کا ایسا اسیر ہے جسے عمر بھر رہائی نہیں مل سکتی۔ اگرچہ جہانگیر ایک آمر تھا اور اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک لفظ انسانی تقدیر بدل سکتا تھا لیکن

مہرالنساء جانتی تھی کہ اس نے شہنشاہ کے گرد اپنی دلکش شخصیت کا جو حصار کھینچ دیا ہے، اسے بے شمار ازواج رکھنے والا فرمانروا بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ مہرالنساء، جہانگیر کی اس کمزوری سے واقف ہو چکی تھی کہ جہانگیر بنیادی طور پر ایک جمال پرست حکمران ہے اور فنونِ لطیفہ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ رکھتا ہے۔ وہ خود تو شاعر نہیں مگر شاعری اس کی روح کی غذا ہے۔ وہ ذاتی حیثیت میں ایک بڑا ادیب ہے۔ اس لئے اپنی بیگمات میں بھی یہی صفت تلاش کرتا رہتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے جہانگیر کی کوئی بیوی بھی ان لطیف احساسات و جذبات کی مالک نہیں تھی۔ نتیجتاً اس نے اپنی زندگی کے اس خلاء کو بھرنے کے لئے مختلف شادیاں کیں مگر وہ ایسی عورت کو پانے میں ناکام رہا جو خوبصورت بھی ہو اور فنونِ لطیفہ کا اعلیٰ ترین ذوق بھی رکھتی ہو۔ بس یہی وہ مجبوری تھی کہ جہانگیر بار بار مہرالنساء کی طرف دیکھتا تھا۔

اگر جہانگیر چاہتا تو مہرالنساء سے جبراً بھی شادی کر سکتا تھا لیکن اس طرح ایک شہنشاہ کو ایک خوب صورت عورت کے جسم پر تو قبضہ حاصل ہو جاتا لیکن وہ اس کا دل فتح نہیں کر سکتا تھا۔ اور جہانگیر، مہرالنساء کا دل فتح کرنا چاہتا تھا۔ اس فتح کے انتظار میں روز و شب کا قافلہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس دوران مہرالنساء کئی بار اس کے قریب آئی اور جہانگیر کو یقین سا ہو گیا کہ اس نے مہرالنساء کے دل کو فتح کر لیا ہے۔ مگر وہ آگے بڑھ کر اچانک پیچھے لوٹ جاتی اور جہانگیر حیران رہ جاتا۔ کبھی وہ اس سلسلے میں کوئی سوال کرتا تو مہرالنساء اپنی بیوگی اور مجبوریوں کا ماتم کرنے لگتی۔

آج کی رات بھی مہرالنساء کی شاطرانہ چالوں کا وہی انداز تھا۔ وہ جہانگیر کے قدموں سے لپٹی ہوئی بیٹھی تھی، مگر پھر بھی دونوں کے درمیان وہی پرانا فاصلہ حائل تھا۔

"تم بھی جاؤ مہرو!" یکایک جہانگیر نے کہا۔ "کروڑوں انسانوں پر حکومت کرنے کے باوجود ہم تنہا ہیں۔ اور ایک دن تنہائی کی اسی حالت میں دنیا سے گزر جائیں گے۔"

مہرالنساء نے بے قرار ہو کر جہانگیر کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ "عالم پناہ! آپ تنہا کب ہیں؟ یہ کنیز جو آپ کے قریب ہے۔"

"اس قربت میں بھی بڑے فاصلے ہیں مہرو!" جہانگیر کا لہجہ کرب ناک تھا۔ "قربت کا احساس تو ہمیں اس دن ہو گا، جب تم ہمارے دل کے شبستان میں عروسی قبا پہن کر داخل ہو گی۔"

"ظلِ الٰہی! میرے جسم پر دلہنوں کا جوڑا کیسا عجیب معلوم ہو گا۔" مہرالنساء بھی جذباتی ہو گئی تھی۔ "دنیا والے کہیں گے کہ میں نے حرص و ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دولت و اقتدار کا کفن پہن لیا ہے۔"

"تمہیں اہلِ دنیا کا اس قدر خیال ہے اور ہمارے جذبوں کی ذرا بھی پروا نہیں۔" جہانگیر ایک بار پھر برہم نظر آنے لگا۔

"اگر جہاں پناہ کے جذبات کا لحاظ نہ ہوتا تو رات کے اندھیروں میں دنیا والوں کی نظروں

سے چھپ کر یہاں کیوں آتی؟" مہرالنساء نے ایک اور چال چلی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ الفاظ شہنشاہ کے جذبات کو پگھلا دیں گے۔ مگر اچانک بازی بدل گئی۔

"تم اپنے ماتم کدے میں واپس جاؤ۔" جہانگیر غضب ناک نظر آنے لگا۔ "اور اس وقت تک اہلِ دنیا سے ڈرتی رہو، جب تک خاک میں نہ مل جاؤ۔ اب ہم تمہیں کبھی نہیں بلائیں گے مگر پھر بھی تمہارا انتظار کریں گے۔ تمہیں آنا ہو تو بے اجازت چلی آنا۔ مگر تمہارے جسم پر بیوگی کا کفن نہیں ہونا چاہئے۔ اب ہم سے یہ سفید لباس برداشت نہیں ہوتا۔"

مہرالنساء ایک شکست خوردہ عورت کی طرح آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شاہی خلوت کدے سے باہر نکل گئی۔ اس دوران کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جہانگیر اپنے ہاتھوں سے صراحی اُٹھا کر جام لبریز کر رہا تھا۔

مہرالنساء کے جاتے ہی شاہی خلوت کدے میں وہی وحشت خیز سناٹا باقی رہ گیا۔ جہانگیر مسلسل شراب پی رہا تھا، مگر شہزادہ خسرو کی دردناک آوازیں ابھی تک اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"بابا! آپ کا محبوب بیٹا خسرو اندھا ہو گیا۔"

پھر ان آوازوں کا شور اس قدر بڑھا کہ جہانگیر بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ درباری مطربہ انجمن آراء بھی شدید اذیت میں مبتلا تھی۔ اس سے شہنشاہ کی یہ بے قراریاں دیکھی نہیں جاتی تھیں۔

اچانک جہانگیر اپنے عشرت کدے کے وسط میں ٹھہر گیا۔ انجمن آراء دونوں ہاتھ باندھے ہوئے اُس کے قریب کھڑی تھی۔

"انجمن! ہم سے خسرو کی چیخیں نہیں سنی جاتیں۔ وہ ہمیں بار بار پکار رہا ہے۔"

"یہ کنیز کسی حد تک ظلِ الٰہی کے غم کو سمجھتی ہے۔" انجمن بھی ایک باپ کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگی۔

"تُو شاہی طبیبوں کو ہمارا پیغام پہنچا دے کہ وہ اسی وقت حاضر ہو جائیں۔" جہانگیر نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "ہم خسرو کو دیکھنے کے لئے جائیں گے۔ وہ اپنے بابا کو مسلسل آوازیں دے رہا ہے۔"

انجمن آراء نے شاہی محافظوں کو جہانگیر کا حکم منتقل کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے قلعے میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد تمام شاہی طبیب جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ چند حکیم تو جو قلعے میں رہتے تھے، وہ اسی وقت حاضر ہو گئے تھے اور باقی طبیبوں کو بارگاہِ شاہی میں پہنچنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا، اس لئے وہ دیر سے پہنچے تھے۔

"بے شک! تم سب کے سب اپنے فن کے ماہر ہو۔ مگر آج ہمیں تمہاری عقل و دانائی کی شدید ضرورت ہے۔" جہانگیر نے اُداس لہجے میں کہا۔

"اگر ہماری جانیں بھی شاہ کی خدمت میں خرچ ہو جائیں تو یہ ایک حقیر ترین خدمت ہو گی۔" تمام طبیبوں نے جھکے ہوئے سروں کے ساتھ کہا۔

"خسرو کی کھوئی ہوئی آنکھوں کا علاج کر دو۔" جہانگیر نے طبیبوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اگر شہزادے کی بینائی بحال ہو گئی تو ہم تم پر اس قدر مہربان ہو جائیں گے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہم آج تک شاہِ والا کے کرم کے سہارے ہی زندہ ہیں۔" تمام طبیبوں نے بیک زبان کہا۔ "کسی طرح شہزادۂ عالم کی آنکھوں میں روشنی واپس آ جائے، بس یہی ہمارا سب سے بڑا انعام ہو گا۔"

"کیا یہ ممکن ہے؟" جہانگیر نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"عالم پناہ! یہ محض ایک انسانی تدبیر ہو گی۔ اور کسی تدبیر کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تقدیر کو شکست دے دے گی۔"

"صاحبانِ فن! کوشش کرو اور ایسی کوشش کرو کہ ہمیں قرار آ جائے۔" جہانگیر بہت شکستہ نظر آ رہا تھا۔

اور پھر شہنشاہ، طبیبوں کی جماعت کے ساتھ رات کے اندھیرے میں زنداں تک پہنچا۔ شہزادہ خسرو نیم بے ہوشی کی حالت میں قید خانے کے فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ جہانگیر، بیٹے کو اس حالت میں دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔

"خسرو!" ایک ناراض باپ نے اپنے مجبور بیٹے کو پکارا۔

خسرو سیدھا ہوا تو زنجیریں بج اُٹھیں۔ "کون ہے؟" خسرو کی آواز سے شدید نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔

"ظلِ الٰہی تشریف لائے ہیں۔" ایک محافظ نے آگے بڑھ کر کہا۔

خسرو بڑی مشکل سے اُٹھ کر بیٹھا اور انتہائی کرب ناک لہجے میں کہنے لگا۔ "بابا! اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ بس چاروں طرف ایک لامحدود اندھیرا ہے۔ میں تو پہچان بھی نہیں سکتا کہ عالم پناہ کس حالت میں، کہاں کھڑے ہیں؟"

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے خسرو!" جہانگیر نے آگے بڑھ کر بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہندوستان کے سارے نامور طبیب تمہارے علاج کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمہاری آنکھوں کی روشنی بحال ہو جائے گی۔"

"بابا! یہ چراغ تو بجھ گئے۔ اب انہیں کوئی نہیں جلا سکتا۔" خسرو مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ "یہ سب آپ کو جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں۔"

جہانگیر نے خسرو کی بات کا جواب دینے کی بجائے طبیبوں کو اشارہ کیا۔

ایک ایرانی طبیب، نعمان شیرازی آگے بڑھا۔ پہلے اس نے شہزادے کے رخساروں پر

جمے ہوئے خون کو صاف کیا اور پھر بے نور آنکھوں پر ایک نیلے رنگ کا مرہم رکھ دیا۔

جہانگیر نے شمع کی روشنی میں دیکھا کہ خسرو کا چہرہ آہستہ آہستہ پُرسکون ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد شہنشاہ نے شہزادے سے پوچھا۔ ''خسرو! اب تم کیا محسوس کر رہے ہو؟''

''بابا! وہ سوزش تو ختم ہو گئی ہے مگر اندھیرا ابھی تک باقی ہے۔'' خسرو کے لہجے میں اب پہلے جیسی مایوسی نہیں تھی۔

''شہزادۂ عالم! یہ اندھیرا بھی بہت جلد ختم ہو جائے گا۔'' جہانگیر کے بجائے حکیم نعمان شیرازی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ نا اُمیدی کو قریب نہ آنے دیں۔ اپنے دل و دماغ میں ایک فانوس روشن رکھیں۔ پھر یہی فانوس ایک دن آپ کی آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے اندھیروں کو شکست دیدے گا۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔'' شہزادہ خسرو نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے روشنی کی ضرورت ہے۔''

بیٹے کی سنبھلتی ہوئی حالت دیکھ کر اب جہانگیر کی وحشت بھی ختم ہو گئی تھی۔

❁.....❁.....❁

شہزادہ خسرو کے اندھا ہو جانے کے بعد قصرِ شاہی کی رنگین فضاؤں پر بھی کچھ دن کے لئے سوگواری چھا گئی تھی۔ اسی سوگوار فضا میں ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی ملاقات ہوئی۔

''ارجمند! تم نے دیکھا کہ تختِ شاہی کے گرد کیسے کیسے زہریلے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔'' شہزادہ خرم نے ارجمند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم چاہتی ہو کہ میں ان ہی کانٹوں پر چل کر تخت و تاج تک پہنچنے کی کوشش کروں۔''

''آپ ان کانٹوں سے اپنے دامن کو محفوظ رکھیں گے۔'' ارجمند بانو نے جواباً کہا۔ ''آپ خسرو نہیں، خرم ہیں۔ اور مجھے فخر ہے کہ آپ اپنے سینے میں ایک حساس دل رکھتے ہیں۔ مگر اس قدر جذباتیت کا مظاہرہ بھی نہ کریں کہ دنیا ہی چھوڑ دیں۔ اس سلطنت پر آپ کا پورا حق ہے۔ کنیز یہ مشورہ نہیں دے گی کہ آپ اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں۔ وہ غربت کی گلیاں ہوں یا دولت کے کوچے، ہنگامے ہر جگہ سر اُبھارتے ہیں۔ انسان پر فرض ہے کہ وہ ان ہنگاموں کا مقابلہ کرے۔''

شہزادہ خرم بہت غور سے ارجمند کی باتیں سنتا رہا، پھر بڑے آہستہ لہجے میں بولا۔ ''کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اقتدار کی فتنہ انگیزیوں سے دُور رہ کر اپنی ایک علیحدہ دنیا آباد کر لیں؟''

''یہ اس وقت ممکن تھا، جب آپ ایک عام انسان ہوتے۔'' ارجمند بانو نے دلیل پیش کی۔ ''آپ شاہ زادے ہیں اور آپ کے بزرگوں نے یہ حکومت اس لئے قائم نہیں کی تھی کہ ان کے وارث آفات و مصائب کے تصور سے گھبرا کر گوشہ نشینی اختیار کر لیں۔''

''ارجمند! میں بزدل اور کم ہمت نہیں ہوں۔ مگر مجھ سے یہ خون ریزیاں نہیں دیکھی جاتیں۔

باپ، بیٹے کے مقابل صف آرا ہے اور بیٹا، باپ کے سامنے شمشیر بکف کھڑا ہے۔'' خرم کے لہجے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ ''ہر روز کوئی نہ کوئی شخص بغاوت کے جرم میں قتل کیا جاتا ہے۔ آخر یہ کیا ہنگامہ ہے؟''

''ہنگامے تو غریبوں کی دنیا میں بھی ہوتے ہیں۔ وہاں بھی انسان قتل کئے جاتے ہیں۔'' ارجمند بڑے عجیب لہجے میں گفتگو کر رہی تھی۔ ''ہنگامے تو انسانی زندگی کا مقدر ہیں۔ کوئی کہاں تک اپنے آپ کو بچائے گا؟ آپ تخت و تاج سے دست بردار ہوں گے تو کوئی دوسرا شخص آپ کی کمی کو پورا کر دے گا۔ اور اگر بدقسمتی سے وہ شخص کم ظرف ہوا تو خدا کی بستی کو نئے ہنگاموں سے بھر دے گا۔ پھر کیا آپ خاموش رہیں گے؟ میری نظر میں مجرم وہ ہے جو ہنگامے پیدا کرتا ہے۔ ہنگاموں کو رفع کرنے والا مجرم نہیں، مصلح ہے۔ اور آپ ایک مصلح کا کردار ادا کریں گے۔''

شہزادہ خرم اپنے بھائی خسرو کی بغاوت کے بعد کچھ دنوں کے لئے بہت زیادہ دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ اور یہی شکستگی اُسے بار بار اُکسا رہی تھی کہ وہ اقتدار کے ہنگاموں سے دُور چلا جائے۔ مگر ارجمند مسلسل اس کا دامن کھینچ رہی تھی۔

''کیا آپ موجودہ نظامِ حکومت سے مطمئن ہیں؟'' اچانک ارجمند بانو نے ایک نیا سوال کر دیا۔

''ہرگز نہیں۔'' خرم نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک لعنت زدہ نظام ہے، جس میں ایک انسان دوسرے انسان کو سجدہ کرتا ہے۔''

''پھر اس نظام کو کون بدلے گا؟'' ارجمند بانو نے پوچھا۔

''خدا ہی بہتر جانتا ہے۔'' شہزادہ خرم نے بہت مدھم لہجے میں جواب دیا۔

''یقیناً۔ مستقبل کی خبر صرف خدا کو ہے۔ مگر آپ یہ کہہ کر اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔'' ارجمند بڑے منطقی انداز میں خرم سے بحث کر رہی تھی۔ ''کیا اس نظام کو بدلنے کے لئے وہ مجبور و بے کس انسان آئیں گے، جنہیں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے؟..... نہیں صاحبِ عالم! وہ لوگ یہ جرأت نہیں کر سکتے۔'' ارجمند بانو نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ انقلاب کے وسائل رکھتے ہیں اور آپ ہی انقلاب لائیں گے۔ مبارک شاہ بھی آپ کی ذات میں پوشیدہ ایک بڑے انقلابی کو دیکھ رہے ہیں۔ قلندر نے ظلِ الٰہی کو سجدہ نہیں کیا اور زنجیریں پہن لیں۔ یہ ایک مثبت بغاوت ہے۔ مبارک شاہ غیر اسلامی نظام کے خلاف تنہا جنگ لڑ رہے ہیں۔ قلندر نے ہندوستان میں ایک نئے انقلاب کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اب وہ انتظار کر رہے ہیں کہ اس راستے پر کون کون آگے بڑھے گا؟ وہ آپ سے محض اس لئے محبت کرتے ہیں کہ قلندر کی طرح آپ کو بھی سجدے کی رسم سے نفرت ہے۔''

مبارک شاہ کے ذکر پر شہزادہ خرم کو سکندر مرزا کا وہ خط یاد آ گیا، جس میں اس نے قلندر کو زہر دینے کے واقعے کا ذکر کیا تھا۔ خرم نے کابل سے واپس آنے کے بعد اپنے طور پر تحقیق و

تفتیش کی تھی مگر اس سازش کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ جو شخص قیدیوں کے لئے کھانا پکایا کر تھا، وہ اپنے گھر سے فرار تھا۔ اب خرم کو یہ کون بتاتا کہ آتمارام کے آدمیوں نے اس شخص کو قتل کر کے دریائے جمنا کی تیز موجوں کے حوالے کر دیا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی خرم نے ارجمند بانو سے اس واقعے کا ذکر کیا۔ ارجمند بانو لرز کر رہ گئی۔ فوراً ہی اس کا خیال شہنشاہ جہانگیر کی طرف گیا مگر ارجمند بانو اپنے شک کا اظہار نہ کر سکی۔

''آپ نے مبارک شاہ سے دریافت کیا تھا؟'' ارجمند بانو نے پوچھا۔

''وہ اس واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔'' شہزادہ خرم نے کہا۔ ''ان کے نزدیک یہ ایک معمولی بات ہے۔ وہ مسلسل ہنستے رہے اور زہر دینے والے کو احمق و نادان کہتے رہے۔ میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بس اتنا بولے کہ وہ اس شخص کو جانتے ہیں جس کے اشارے پر انہیں زہر دیا گیا تھا۔ مگر نام نہیں بتایا۔''

''وہ اس شخص کا نام کس لئے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں؟'' ارجمند بانو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''میں نے بھی اسی بات پر زور دیا تھا۔ مگر قلندر یہی کہتے رہے کہ وقت آنے پر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

۞.....۞.....۞

ادھر بارہ دری کے ایک سنسان گوشے میں ارجمند بانو اور شہزادہ خرم، مبارک شاہ کا ذکر کر رہے تھے اور ادھر ارسلان بیگ، شہنشاہ جہانگیر کو قلندر کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔

''خداوند! یہ شخص مبارک شاہ، سلطنتِ مغلیہ کے لئے بہت منحوس ثابت ہوا ہے۔'' ارسلان بیگ نے خوشامد کا وہی بدترین انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کس طرح؟'' جہانگیر نے چونک کر پوچھا۔

''پہلے یہ کہ اس ذلیل گداگر کی وجہ سے شاہی وقار مجروح ہوا۔'' ارسلان بیگ نے بڑی عیاری کے ساتھ جہانگیر کے جذبات پر ضرب لگائی۔ ''اس کے سجدہ نہ کرنے سے لوگوں کے ذہنوں میں عجیب عجیب اندیشے پرورش پا رہے ہیں۔''

جہانگیر خاموشی سے ارسلان کی باتیں سنتا رہا۔

''دوسرے یہ کہ اسی نے اپنی کالی زبان سے شہزادہ خسرو کے اندھا ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔''

ارسلان بیگ کے اس انکشاف پر جہانگیر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کیا کہا تُو نے؟'' شہنشاہ کے لہجے سے شدید حیرت کا رنگ نمایاں تھا۔

''خداوند! میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' ارسلان بیگ کانپنے لگا۔ ''آپ شہزادہ پرویز، شہزادہ خرم اور شہزادہ شہریار سے میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''ہمیں تفصیل سے بتا کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا؟'' جہانگیر بدستور حیران نظر آ رہا تھا۔

ارسلان بیگ نے اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ جب چاروں شہزادے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزارِ مبارک پر چادر چڑھانے جا رہے تھے اور مبارک شاہ قلندر بار بار چیخ رہا تھا کہ ایک ہزار اشرفیوں کے عوض ہندوستان کی حکومت خرید لو۔

جہانگیر یہ واقعہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ مگر شہزادہ خسرو کی حرکت کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔ ''آخر مبارک شاہ نے خسرو کے اندھا ہونے کی پیش گوئی کیوں کی تھی؟''

''جب مبارک شاہ، ہندوستان کی حکومت کی بولی لگا رہا تھا، اس وقت شہزادہ خسرو نے قلندر کے منہ پر ایک زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے کہا تھا کہ تُو اندھا ہو گیا ہے۔ اور تخت کے وارث کی موجودگی میں شاہی اقتدار کو نیلام کر رہا ہے۔''

جہانگیر سناٹے میں آ گیا۔ ''پھر قلندر نے کیا کہا؟'' فرمانروائے ہند کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

''اس بدبخت بھکاری کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اسی زخمی حالت میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''تجھے وقت بتائے گا کہ اندھا کون ہے؟ تیری قسمت میں تخت و تاج نہیں، ذلت و رُسوائی کی موت لکھی گئی ہے۔''

مبارک شاہ کے الفاظ کی حرارت سے ایک لمحے کے لئے جہانگیر لرز کر رہ گیا مگر اس نے اپنے چہرے سے اس خوف و دہشت کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''شہزادہ خسرو نے بڑے ظرف کا ثبوت دیا۔'' ارسلان بیگ، جہانگیر کی کیفیت کا اندازہ کئے بغیر بولے جا رہا تھا۔ ''اگر شہزادۂ عالم چاہتے تو اس بھکاری کی زبان بھی کاٹ سکتے تھے۔ کاش! انہوں نے ایسا ہی کیا ہوتا۔ اگر اسی وقت وہ زبان کاٹ دی ہوتی تو سلطنتِ مغلیہ اس کے زہر سے محفوظ رہتی۔'' یہ کہہ کر اس بازی گر نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ ''یہ کیسے اذیت ناک لمحات ہیں کہ شہزادۂ عالم اپنی آنکھوں سے محروم ہو گئے۔ تخت کا وارث اور زنداں کے اس قدر گہرے اندھیروں میں؟..... یہ سب اُسی گداگر کی کالی زبان کے اثرات ہیں۔ خداوند! ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔'' ارسلان بیگ نے جہانگیر کے قدموں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی زبان کاٹ دیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی اور بری پیش گوئی کر دے۔'' جب سے ارسلان بیگ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ مبارک شاہ کے دیئے ہوئے روٹی کے ایک ٹکڑے کو کھا کر ارجمند بانو چند لمحوں میں صحت یاب ہو گئی تھی، اسی وقت سے وہ قلندر کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ اس میں خود تو اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مبارک شاہ کو کوئی ضرر پہنچا سکتا۔ اس لئے جہانگیر کو مسلسل ورغلا رہا تھا کہ کسی طرح شہنشاہ غصے سے مغلوب ہو جائے اور پھر طیش میں آ کر قلندر کا کام تمام کر ڈالے۔

جہانگیر بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر مختلف رنگ آ کر گزرتے رہے۔

ارسلان بیگ کو اپنی کامیابی کی منزل سامنے نظر آ رہی تھی۔ ''خداوند! اس بہروپئے کو جلد از

جلد فنا کر دیجئے کہ اس کا وجود سلطنتِ مغلیہ کے لئے ایک برا شگون ہے۔ جب تک وہ زندہ رہے گا، اسی طرح شاہی خاندان پر نحوست کے سائے منڈلاتے رہیں گے۔"

"ہاں.....!" جہانگیر نے بہت آہستہ لہجے میں کہا۔ "ہم بہت جلد مبارک شاہ سے نجات حاصل کرلیں گے۔"

ارسلان بیگ کو یقین ہو چکا تھا کہ جہانگیر کسی نہ کسی طرح مبارک شاہ کی زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔ اور پھر آتمارام کا جادو بہت تیزی سے اثر کر سکے گا۔ ارسلان بیگ اپنی کامیابی کے نشے میں جھومتا ہوا گیانی کے پاس پہنچا اور جب اسے یہ خوشخبری سنائی تو آتمارام اور اس کے چیلے خوشی سے رقص کرنے لگے۔

"مبارک شاہ کو درمیان سے ہٹ جانے دے۔" آتمارام نے ارسلان بیگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پھر دیکھنا کہ ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کا کیا حشر ہوگا۔"

۞.....۞.....۞

گوپی چند بت تراش اپنی زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ آج اس کے بیوی بچے دو وقت کے فاقے سے تھے۔ گوپی چند اپنے اہلِ خانہ کی یہ بے چارگی برداشت نہ کر سکا۔ وہ چپ چاپ گھر سے نکلا اور دریائے جمنا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب گوپی چند کے قدم اس طرف اُٹھ رہے تھے، جہاں انصاف کی زنجیر نصب کی گئی تھی۔ زنجیرِ عدل کے قریب پہنچ کر وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔

"گوپی چند! اگر تُو نے شہنشاہ کے سامنے فریاد کی تو آتمارام تجھے اور تیرے گھر والوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔" کسی نے اس کے کان میں کہا۔ یہ گوپی چند کے اپنے اندیشے تھے، جو بہت دنوں سے اسے پریشان کر رہے تھے۔

"اگر اُنہیں روٹی نہیں ملی تو میرے بیوی بچے ویسے بھی مر جائیں گے۔" گوپی چند نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ یہ خیال آتے ہی گوپی چند کے سارے بدن میں نفرت و انتقام کی ایک آگ سی بھر گئی۔ وہ بے قرار ہو کر بڑھا اور زنجیرِ عدل کھینچنے کی کوشش کی۔ مگر گوپی چند کے دونوں ہاتھ مفلوج ہو چکے تھے۔ وہ اپنی بے کسی پر رو پڑا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح لہرایا۔ گوپی چند کو اپنے ناکارہ جسم میں ایک نئی طاقت کا احساس ہونے لگا۔ وہ تیزی سے جھکا اور اس نے اپنے دانتوں سے زنجیرِ عدل کو پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن گوپی چند کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ فالج زدہ زندگی گزارنے سے تو بہتر تھا کہ وہ انصاف کی زنجیر کھینچتے کھینچتے مر جائے۔ گوپی چند آج یہ ارادہ کر کے آیا تھا۔ وہ اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر زنجیرِ عدل اتنی دیر تک کھینچتا رہا کہ پورا قصرِ شاہی گھنٹیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔

آج تک کسی فریادی نے اس انداز سے زنجیرِ عدل نہیں کھینچی تھی۔ جہانگیر بے قرار سا نظر آنے لگا اور اس نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

"اس مظلوم کو ہمارے حضور جلد پیش کرو۔ کون جانے اُس پر کیا قیامت ٹوٹی ہے۔"

سپاہی زنجیرِ عدل کے قریب پہنچے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک شخص ہاتھوں کے بجائے اپنے منہ سے یہ کام انجام دے رہا تھا۔ پھر جب گوپی چند کو جہانگیر کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ شدتِ جذبات سے روتے ہوئے شہنشاہ کے روبرو جھک گیا۔ اس نے اپنا سر، دربار کے فرش پر رکھ دیا اور بے اختیار چیخنے لگا۔

"سمراٹ! میرے ساتھ انصاف کیجئے۔" گوپی چند کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"اطمینان رکھ کہ تُو ہمارے حلقۂ کرم میں داخل ہو گیا ہے۔ اب تیرے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا۔" جہانگیر نے گوپی چند کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بے خوف و خطر اس شخص کا نام لے دے جس نے تجھ پر ظلم کیا ہے۔"

گوپی چند ایک بار پھر جھجکا۔ آتمارام کے تصور نے اس کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔

"فریادی! اپنے ہونٹوں کو جنبش دے۔" جہانگیر نے اسے حوصلہ بخشا۔ "اگر تیرے سلسلے میں کوئی شہزادہ یا کوئی وزیر مجرم پایا گیا تو ہم اسے بھی معاف نہیں کریں گے۔ یہ دربارِ جہانگیری ہے۔ یہاں ہر فریادی کی زبان و لب آزاد ہوتے ہیں۔ تُو بھی اپنے دل کی بات کہہ دے۔"

پھر گوپی چند نے اپنے غموں کی داستان سنائی تو پورے دربار پر سناٹا چھا گیا۔

اس سے پہلے کہ گوپی چند رحم کی درخواست کرتا، جہانگیر نے بلند آواز میں کہا۔ "تیرا مقدمہ عجیب و غریب نوعیت کا ہے۔ اس لئے ہم اس کا فیصلہ تنہائی میں کریں گے۔" دراصل جہانگیر، مبارک شاہ کا نام سن کر گھبرا گیا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ قلندر کی روحانی قوتوں کے افسانے بھرے دربار میں بیان کئے جائیں۔

۞.....۞.....۞

دربار کے برخاست ہونے تک گوپی چند کو قصرِ شاہی میں رکھا گیا۔ اور جب شہنشاہ امورِ سلطنت سے فراغت پا گیا تو گوپی چند کو جہانگیر کی خلوت میں پیش کیا گیا۔

"سمراٹ! میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے مبارک شاہ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ میں خود ان سے اپنے ہاتھوں کی بھیک مانگوں گا۔" گوپی چند بت تراش زار و قطار رو رہا تھا۔ "آتما رام نے میری دنیا خراب کر دی۔ میں ایک سال سے در در بھٹکتا پھر رہا ہوں مگر کوئی وید، کوئی سادھو سنت میرے مفلوج ہاتھوں کا علاج نہیں کر سکا۔ آگرہ کے جنگلات میں رہنے والے ایک مہاتما نے کہا ہے کہ میرا علاج وہی شخص کر سکتا ہے، جس کا بت تراشنے کی کوشش کی گئی تھی۔"

آتمارام کی ناکامی، شہزادہ خسرو کے اندھا ہونے کی پیش گوئی اور گوپی چند کے مفلوج ہو

جانے کا سانحہ، یہ سب ایسے واقعات تھے، جو مبارک شاہ کی روحانی طاقتوں کا اعلان کر رہے تھے۔ جہانگیر پر ایک دہشت سی طاری تھی۔ شہنشاہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کی پرچھائیاں اُبھر اُبھر کر ڈوب رہی تھیں۔

پھر یکایک جہانگیر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنے محافظ سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم مبارک شاہ قلندر سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

سپاہی بہت تیزی سے قید خانے تک پہنچے اور داروغۂ زنداں تک شاہی حکم پہنچایا۔ داروغۂ زنداں نے ڈرتے ڈرتے مبارک شاہ کے سامنے جہانگیر کی خواہش کا اظہار کیا۔

قلندر بھڑک اُٹھا۔ ''میں کسی شہنشاہ کو نہیں جانتا۔ اگر وہ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو خود اپنے قدموں سے چل کر یہاں تک چلا آئے۔ میں اس کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔ اور اگر تم لوگ مجھے زبردستی اُٹھا کر وہاں لے گئے تو میں اس سے بات نہیں کروں گا۔''

داروغۂ زنداں نے سپاہیوں کو جواب دینے کے بجائے خود شہنشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر قلندر کے الفاظ دہرا دیئے۔

''ہم جانتے تھے کہ وہ یہی جواب دے گا۔'' جہانگیر کے چہرے پر شکست کا واضح رنگ نمایاں تھا۔ پھر اسی وقت جہانگیر نے شہزادہ خرم کو طلب کیا اور گوپی چند کو لے کر قید خانے کی طرف بڑھا۔

مبارک شاہ نے جہانگیر کو داخل ہوتے دیکھا تو اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مسلمانوں کی طرح اپنے شہنشاہ کو سلام کیا۔

''تیری ادائیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں قلندر!'' جہانگیر کے ہونٹوں پر بجھی بجھی سی مسکراہٹ تھی۔ ''کبھی ہمیں نظر انداز کر دیتا ہے اور کبھی ہمارے احترام میں کھڑا ہو جاتا ہے۔''

''آپ ہمارے شہنشاہ ہیں اور ایک حاکم کا احترام مسلمان پر فرض ہے۔ مگر شریعت کی حدود میں رہ کر۔ میں آپ کو اپنا امیر سمجھتا ہوں، خدا نہیں۔'' مبارک شاہ نے اسی بے نیازی کے انداز میں کہا۔ ''میرے مذہب میں کسی انسان کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ بس اس کے سوا میرا اور آپ کا کوئی جھگڑا نہیں۔ میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی نسبت سے آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔''

''ہمیں افسوس ہے قلندر! کہ تجھے ہماری وجہ سے سخت اذیتیں پہنچیں۔'' جہانگیر کے لہجے سے ندامت کا رنگ جھلک رہا تھا۔

''شہنشاہ! وہ اذیتیں تو میرا مقدر ہیں۔'' قلندر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں آپ سے اس جارحیت کا کوئی گلہ نہیں کرتا۔''

جہانگیر کچھ اور شرمندہ نظر آنے لگا۔ پھر اس نے گوپی چند کو مخاطب کر کے کہا۔ ''قلندر سے اپنا حالِ دل بیان کر دے۔''

شہنشاہ کا حکم پاتے ہی گوپی چند بت تراش آگے بڑھا اور روتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں نے

گیانی آتما رام کے کہنے پر زیادہ معاوضے کی لالچ میں آپ کا بت تراشا تھا مگر جیسے ہی میں نے چہرہ بنانے کی کوشش کی، میرے دونوں ہاتھ مفلوج ہو گئے۔ گیانی نے اس کام کے بدلے میں مجھے سونے کی اینٹیں دی تھیں مگر گھر پہنچتے ہی وہ سونا، پتھر کے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ میں بیکاروں اور محتاجوں کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دو دن سے میرے بیوی بچوں نے سوکھی روٹی تک نہیں کھائی ہے۔ مبارک شاہ! میرے گناہ کو معاف کر دیجئے۔ آپ مہاتما ہیں اور میں ایک پاپی انسان۔ مجھے میرے ہاتھ لوٹا دیجئے۔''

گوپی چند کی الم ناک داستان سن کر قلندر کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ جہانگیر اور شہزادہ خرم بڑی حیرت سے مبارک شاہ کو دیکھ رہے تھے۔ یکایک قلندر نے آسمان کی طرف اپنے ہاتھ اٹھا دیئے اور بڑے اثر انگیز لہجے میں کہنے لگا۔

''اے سارے جہاں کے پالنے والے! گوپی چند کے گناہوں کو معاف کر دے۔ یہ تیرا بہت مجبور بندہ ہے۔ اسے اس کے ہاتھ لوٹا دے۔'' یہ کہہ کر مبارک شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ گوپی چند کے مفلوج ہاتھوں پر تین بار پھیرے۔

گوپی چند کے منہ سے بے اختیار خوشی کی ایک تیز چیخ نکل گئی۔ اس کے پتھر جیسے ہاتھ، انسانی ہاتھوں کی طرح حرکت کرنے لگے تھے۔ گوپی چند مضطرب ہو کر مبارک شاہ کے قدموں پر گر پڑا۔ قلندر نے فوراً اپنے پاؤں کھینچ لئے۔ ''انسان کو انسان سجدہ نہیں کر سکتا۔ بس اب جا اور خدا کی زمین پر چل پھر کر اپنی روزی تلاش کر۔''

گوپی چند کھڑا ہو گیا۔ ''مبارک شاہ! میرے دیوی دیوتاؤں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ وہ میرے کسی کام نہیں آئے۔ اب میں بھی انہیں چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔''

''چھوڑ دے۔'' قلندر نے پُرجلال لہجے میں کہا۔ ''فوراً چھوڑ دے کہ اسی میں تیری بھلائی ہے۔''

''پھر مجھے اپنے مذہب میں شامل کر لیجئے۔'' گوپی چند نے اپنی مذہبی رسم کے مطابق دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''مسلمان ہو جا۔ ایک خدا کی پرستش کر اور اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہ ٹھہرا۔'' مبارک شاہ نے کہا۔

گوپی چند نے قلندر کے ہاتھ پر کلمہ پڑھا اور اسی قید خانے میں مسلمان ہو گیا۔

''مگر میں آتما رام سے ڈرتا ہوں کہ وہ تبدیلیٔ مذہب کے بعد مجھے اور میرے گھر والوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''ایک خدا پر ایمان لانے کے بعد تجھے کسی سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔'' قلندر نے کہا۔ ''اب آتما رام تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

مسلمان ہونے کے بعد گوپی چند نے جہانگیر کے سامنے باقی دو مجسموں کا راز بھی فاش کر دیا۔

"وہ ارجمند اور شہزادہ خرم کے مجسموں پر جادو کر کے انہیں ہلاک کر دینا چاہتا ہے۔"

یہ سن کر جہانگیر سناٹے میں آ گیا اور اُس نے اسی وقت آتمارام کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔

سپاہیوں کے جاتے ہی جہانگیر، مبارک شاہ سے مخاطب ہوا۔ "قلندر! ہم نے سنا ہے کہ شہزادہ خسرو نے بھی تجھے بہت آزار پہنچایا ہے۔"

"وہ شہزادہ ہے، خدا کے بندوں کی تقدیروں کا مالک۔ جس کے ساتھ جیسا چاہے، سلوک کرے۔ اسے کون روکنے والا ہے؟" مبارک شاہ قلندر بڑے تلخ انداز میں مسکرایا۔ "شہنشاہ! یہاں خدا نے ہر انسان کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ ستم گروں کے لئے ظلم ڈھانے کا وقت مقرر ہے..... اور مجبوروں کے لئے ظلم برداشت کرنے کا۔ میں بھی اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں اور شہزادہ خسرو بھی اس وقت کا انتظار کرے۔ پھر ہم دونوں اپنے اعمال ناموں کے ساتھ خدا کے روبرو حاضر ہو جائیں گے۔"

قلندر کا طرزِ کلام دیکھ کر جہانگیر پر خوف طاری ہو گیا۔ "خسرو کو معاف کر دے مبارک شاہ! بغاوت کے جرم میں اس کی آنکھوں کی روشنی چھین لی گئی ہے۔"

"شہنشاہ! اسے اندھا ہی رہنے دیں۔" مبارک شاہ نے بے باکی کے ساتھ کہا۔ "آنکھوں کی روشنی واپس آئے گی تو وہ دوبارہ اپنے راستے سے بھٹک جائے گا اور تخت و تاج کی چمک اسے پھر اندھا بنا دے گی۔"

"قلندر! ہم شہنشاہ کے ساتھ ایک باپ بھی ہیں۔ ہم سے خسرو کی یہ بے چارگی نہیں دیکھی جاتی۔" جہانگیر کا لہجہ بڑا عاجزانہ تھا۔ "خدا کے لئے اسے معاف کر دے قلندر!"

"شہنشاہ! جب آپ خدا کو درمیان میں لے آئے تو میں نے خسرو کو معاف کر دیا۔" قلندر نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر یاد رکھنا، اُس کی آنکھوں کی روشنی حکومت کے کسی کام نہیں آئے گی۔ وہ ایک پیدائشی اندھا ہے۔ اس کے دل کی آنکھیں، روشنی سے محروم ہیں اور اس محرومی کو کوئی دُور نہیں کر سکتا۔"

"کچھ بھی ہو مبارک شاہ! مگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ کسی انسان کا محتاج نہ رہے۔" جہانگیر کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ "اس وقت ہمارا دل کٹ کر رہ جاتا ہے، جب ہم خسرو کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔"

"ٹھوکریں تو اُس کا مقدر ہیں شہنشاہ!" قلندر نے بے نیازانہ کہا۔ "اس نے اپنے لئے دعاؤں کے سارے راستے بند کر لئے ہیں..... پھر بھی، اُسے تھوڑی بہت روشنی مل جائے گی..... خسرو کو سنبھلنے کا ایک اور موقع فراہم کیا جائے گا۔ مگر وہ ازلی گمراہ ہے..... ہرگز سیدھے راستے پر نہیں آئے گا۔"

قلندر کے الفاظ سن کر جہانگیر کے چہرے پر خوشی کا ایک ہلکا سا عکس اُبھر آیا۔ "قلندر! ہمیں بھی اپنی خدمت کا ایک موقع فراہم کر۔" ہندوستان کے حکمراں کی ساری رعونت ختم ہو چکی تھی

اور اب وہ ایک عام انسان کے لہجے میں مبارک شاہ سے گفتگو کر رہا تھا۔

"تُو میری کیا خدمت کر سکتا ہے جہانگیر؟" اچانک قلندر کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"میں تجھے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی میں تول سکتا ہوں۔" جہانگیر نے اپنی بخشش وعطا کا زبانی مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"تیری دولت کے یہ انبار میرے کس کام کے ہیں؟" قلندر مسکرایا۔ "تجھے معلوم ہے کہ میں سونے کی روٹیاں نہیں کھاتا۔ جو کی ایک خشک روٹی اور نمک کا پانی میری غذا ہے۔ پھر مجھ غریب پر یہ احسان کیوں کرتا ہے؟..... شہنشاہ! میرے کمزور کاندھے تیرے اس احسان کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔"

قلندر کا انکار سن کر جہانگیر پریشان سا نظر آنے لگا۔

"قلندر! اگر تُو یہاں سے خالی ہاتھ چلا گیا تو یہ ہماری شہنشاہیت کی توہین ہو گی۔"

"خالی ہاتھ کہاں جا رہا ہوں؟" قلندر ایک بار پھر مسکرایا۔ "ایک سال تک تیری روٹیاں کھائی ہیں۔ کسی بھکاری پر حکومتِ وقت کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے ایک ناکارہ انسان کی اتنے طویل عرصے تک کفالت کی۔" مبارک شاہ بڑے شائستہ انداز میں جہانگیر کی عنایتوں کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

"ہم اپنے اس عمل پر بہت شرمندہ ہیں کہ تجھے ہماری وجہ سے قید و بند کی زندگی گزارنا پڑی۔" جہانگیر ایک مردِ قلندر کے سامنے بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ "پھر بھی ہماری شدید خواہش ہے کہ تُو کوئی شاہی سوغات قبول کر لے۔"

"تیری سوغات میں بہت پہلے قبول کر چکا ہوں۔" مبارک شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تیری سوغات کو میں نے اپنے جسم پر سجا لیا ہے..... یہ زخموں کے نشانات اس وقت تک برقرار رہیں گے، جب تک میرا فانی جسم خاک میں نہیں مل جائے گا۔"

جہانگیر، مبارک شاہ کی بے نیازی دیکھ کر اپنے آپ کو بہت حقیر سمجھ رہا تھا۔ "پھر بھی قلندر! ہماری خوشی کی خاطر کچھ نہ کچھ قبول کر لے۔"

مبارک شاہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا، پھر اس نے جہانگیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اگر تُو مجھے کچھ دینا ہی چاہتا ہے تو اپنے دربار سے سجدے کی رسم اُٹھا دے۔ میں اس رسم کو اپنے ساتھ لے جا کر دریائے جمنا میں غرق کر دوں گا۔"

چند لمحوں کے لئے جہانگیر کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قلندر اس سے یہ عجیب و غریب مطالبہ کرے گا۔

"نہیں قلندر! ہم تجھے اپنی یہ رسم نہیں دے سکتے..... پھر ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟ ہم بھی تیری طرح خالی ہاتھ ہو جائیں گے۔" جہانگیر کے گمراہ کن نظریات اسے شدت کے ساتھ ورغلا رہے تھے۔ "یہی ایک رسم تو ہے جو ہمارے نفس کو مطمئن کرتی ہے۔ اگر یہ رسم اُٹھ جائے تو

پھر ہمارا دربار ویران ہو جائے گا۔"

"نہیں شہنشاہ! تیرے دربار کی رونقوں میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔" مبارک شاہ نے بہت شیریں لہجے میں کہا۔ "خدائی کے انداز چھوڑ دے، پھر تیرے دربار کی رونق اور بڑھ جائے گی۔ تیرا دادا نصیرالدین ہمایوں بھی تو شہنشاہ تھا.....اور تیرا مورثِ اعلیٰ، ظہیرالدین بابر بھی تو ہندوستان کا حکمراں تھا.....ان دونوں نے تو خدا کے بندوں کو اپنے آگے سر جھکانے پر مجبور نہیں کیا۔ پھر اُن کی شہنشاہی میں کیا فرق آیا؟ وہ کامیاب و کامران اس طرح دنیا سے رخصت ہوئے کہ ان کا لباسِ حکمرانی، کسی خدائی دعوے سے داغدار نہیں تھا۔"

"میں خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا۔" جہانگیر نے قلندر کی بات کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ سجدے کی پابندی کیوں ہے؟" مبارک شاہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "تُو خدا کے بندوں کو آزاد چھوڑ دے۔ پھر بھی اگر کوئی تجھے سجدہ کرتا ہے تو وہ اپنے گناہوں کی فصل خود کاٹے گا۔"

"ہم یہ نہیں کر سکتے، قلندر!" جہانگیر گمراہی کے حصار سے باہر نکلنے پر آمادہ نہیں تھا۔ "یہ ہمارے عظیم باپ، حضرت عرش آشیانی (شہنشاہ اکبر) کی قائم کردہ رسم ہے۔ ہم اسے ترک نہیں کر سکتے۔"

"پھر میرا وقت برباد نہ کر۔" یہ کہتے ہوئے مبارک شاہ نے منہ پھیر لیا۔ "میں اپنے فریضے سے سبکدوش ہو گیا اور حجت پوری ہو چکی۔ اب بروزِ حشر تُو خدا کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تجھے ہدایت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔"

آخر جہانگیر ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔ قلندر نے اس کا کوئی عطیہ قبول نہیں کیا۔ بوسیدہ اور دریدہ لباس پہننے والے ایک مردِ آزاد نے تاجِ شاہی کی بخشی ہوئی تمام مراعات کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔

جہانگیر نے جاتے وقت داروغۂ زنداں کو حکم دیا تھا کہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی قلندر کو آزاد کر دیا جائے۔

شہزادہ خرم، مبارک شاہ کو رخصت کرنے کے لئے قلعہ کے صدر دروازے تک آیا۔ پھر اس نے خواہش ظاہر کی کہ قلندر کو ایک گھوڑے پر بٹھا کر حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار تک پہنچا دیا جائے۔ مگر مبارک شاہ نے یہ پیشکش بھی قبول نہیں کی اور وہ پیدل ہی فتح پور سیکری کی طرف روانہ ہو گیا۔ جانے سے پہلے مبارک شاہ نے خرم کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

"اے خدا! میرے شاہ جہاں کو زمین و آسمان کی ہر بلا سے محفوظ رکھ۔"

جواباً خرم نے قلندر سے پوچھا تھا۔ "بابا! اگر کبھی آپ کے دیکھنے کو دل چاہے تو کیا میں حاضرِ خدمت ہو سکتا ہوں؟"

"شہزادے! تم پر کوئی پابندی نہیں۔" مبارک شاہ نے انتہائی خوش دلی کے ساتھ کہا۔

"جب چاہو، چلے آنا۔ بابا پر تمہارے بہت حقوق ہیں۔"

۞.....۞.....۞

جہانگیر کا حکم پاتے ہی سپاہی، گیانی آتمارام کی جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ اس وقت آتمارام نشے کی حالت میں لیٹا ہوا تھا اور ایک خوب صورت ہندو عورت اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ یہ ایک بدنصیب عورت تھی، جس کا شوہر کسی طوائف کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ عورت کئی ماہ سے اس اُمید پر آتمارام کی خدمت کر رہی تھی کہ گیانی کی روحانی طاقتیں ایک دن اس کے روٹھے ہوئے شوہر کو گھر واپس لے آئیں گی۔

آتمارام اُسے روزانہ جھوٹے وعدوں سے بہلا دیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ مجبور عورت، گیانی کی ہوس کا نشانہ بن گئی۔ آتمارام کا برسوں سے یہی کاروبار تھا۔ وہ بظاہر ایک پارسا سنیاسی نظر آتا تھا، مگر درپردہ وہ ایک اوباش انسان تھا۔ شوہروں کی بے رخی کا شکار اور اولاد سے محروم عورتیں دن رات اس کی جھونپڑی کے چکر لگایا کرتی تھیں۔ وہ ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا تھا۔ بعض اوقات اُس کی پیش گوئی درست بھی ثابت ہو جاتی۔ اور اسی بنیاد پر ہندوستان کے گوشے گوشے میں اس کے کمالات کی دھوم مچ گئی تھی۔ دور دراز شہروں سے عورتوں اور مردوں کے قافلے اپنی اپنی مرادیں لے کر آتمارام کے پاس آیا کرتے تھے۔ دربارِ شاہی میں رسائی حاصل کرنے کی وجہ سے اُس کی شہرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

دراصل آتمارام ایک شعبدہ باز تھا۔ اور اس کی یہی شعبدہ بازیاں دیکھ کر ایک توہم پرست قوم کے بے شمار افراد نے اسے "مہاتما" بنا دیا تھا۔

اور آج دربارِ شاہی سے اسی گیانی کی گرفتاری کا حکم جاری ہوا تھا۔

جب دھرم پال نے آتمارام کو یہ خبر دی تو نشے میں غرق ہونے کے باوجود گیانی کے ہوش اُڑ گئے۔ اُس نے دھرم پال سے سرگوشیوں میں کچھ کہا اور دھرم پال نے بڑے عاجزانہ انداز میں شاہی سپاہیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اس وقت مہاراج اپنی کسی خاص تپسیا میں مشغول ہیں.....اور یہ تپسیا صبح سورج نکلنے تک جاری رہے گی.....سمراٹ (شہنشاہ) سے عرض کر دیجئے گا کہ مہاراج اپنی ریاضت ختم کرتے ہی دربار میں حاضر ہو جائیں گے۔"

سپاہیوں نے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور پھر ایک سپاہی واپس لال قلعہ چلا گیا۔ باقی سپاہی جھونپڑی کے گرد پہرہ دیتے رہے۔ آتمارام، نشے کی حالت میں بادشاہ کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح اس کی نام نہاد پارسائی پر حرف آتا۔ وہ صبح تک کی مہلت اس لئے حاصل کر رہا تھا کہ اتنے عرصہ میں نشہ اُتر جاتا اور پھر وہ ہوش و حواس کی حالت میں بادشاہ کے حضور پہنچنے کی کوشش کرتا۔

جہانگیر نے مذہبی رواداری سے کام لیتے ہوئے آتمارام کو رات بھر کے لئے اپنی عبادت جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ مگر ساتھ ہی تمام سپاہیوں کو یہ حکم دے دیا کہ وہ سختی کے ساتھ آتمارام کی نگرانی کرتے رہیں۔ کہیں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ رات کے اندھیرے میں فرار نہ ہو جائے۔

عارضی طور پر خطرہ ٹل گیا تھا مگر گرفتاری کے خوف سے آتمارام ساری رات نہ سو سکا۔ دھرم پال بار بار نکل کر دیکھتا تھا کہ شہنشاہ کے سپاہی بڑی مستعدی کے ساتھ جھونپڑی کے باہر پہرہ دے رہے ہیں۔

پھر صبح کے قریب آتمارام کا نشہ ٹوٹ گیا۔ وہ جھونپڑی سے باہر آیا اور سپاہیوں سے اجازت لے کر دریائے جمنا میں اشنان کرنے لگا۔ غسل کے بعد وہ تازہ دم ہو گیا تھا۔ مگر جہانگیر کی اچانک طلبی کے سبب اس کے دل و دماغ پر ایک نامعلوم سا خوف طاری تھا۔ آتمارام نے نہا کر نیا لباس بدلا اور سپاہیوں کے ساتھ دربار کی طرف روانہ ہو گیا۔

❀.....❀.....❀

عام درباریوں کا خیال تھا کہ اس بار آتمارام، شہنشاہ کے غضب سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ اس لئے ہر شخص آتمارام کا انجام دیکھنے کے لئے بے چین نظر آنے لگا تھا۔

گیانی نے دربار میں پہنچ کر حسبِ عادت جہانگیر کو ایک طویل سجدہ کیا اور پھر انتہائی خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگا۔

''پربھو (مالک)! میرے لئے کیا حکم ہے؟''

جہانگیر نے گوپی چند کی طرف اشارہ کیا۔ گوپی چند لرزتے قدموں سے آگے بڑھا۔

''گیانی آتمارام کے جرائم کی پوری روداد بیان کر!'' جہانگیر نے گوپی چند کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

گوپی چند نے مختصر الفاظ میں سارا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ گیانی نے مجھ سے مبارک شاہ قلندر، شہزادہ خرم اور ارجمند بانو کے مجسمے بنوائے تھے تاکہ وہ ان تینوں کو جادو کے ذریعے ہلاک کر سکے۔

''سمراٹ! یہ پاپی جھوٹ بولتا ہے۔'' آتمارام نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں نے صرف مبارک شاہ کا مجسمہ بنوایا تھا، جو اس کے ہاتھوں پر فالج گرنے کے سبب نامکمل رہ گیا۔''

گوپی چند، آتمارام کے جھوٹ پر حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گیانی، شہنشاہ کے روبرو اس دیدہ دلیری کے ساتھ جھوٹ بولے گا۔

''میں اس خدا کی قسم کھاتا ہوں، جو اپنی ذات میں تنہا ہے۔'' گوپی چند نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ ''گیانی آتمارام خود جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ تینوں مجسمے اس کی جھونپڑی کے اندر موجود

ہیں۔ شہنشاہ اپنے سپاہیوں کو بھیج کر میرے دعوے کی تصدیق کر سکتے ہیں۔'' گوپی چند کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔ پھر اچانک اس نے ارسلان بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ نوجوان بھی میری بات پر گواہی دے سکتا ہے۔''

ارسلان بیگ، تخت کے نیچے دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ گوپی چند کے اس اشارے پر وہ لرز کر رہ گیا۔ ارسلان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس طرح اس کا راز فاش ہو جائے گا۔

''ارسلان بیگ کا گیانی آتمارام سے کیا تعلق ہے؟'' جہانگیر نے سوال کیا۔

''یہ شخص اکثر گیانی کے پاس آتا رہتا تھا۔'' گوپی چند نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا۔ ''اور اسی شخص نے شہزادہ خرم، ارجمند بانو اور مبارک شاہ کی تصویریں بنا کر میرے حوالے کی تھیں۔ پھر میں نے ان ہی تصویروں کے مطابق مجسمے تیار کئے تھے۔ شہزادہ خرم اور ارجمند بانو کے مجسمے تیار کرنے کے بعد جب میں نے مبارک شاہ کا چہرہ تراشنا چاہا تو میرے دونوں ہاتھ مفلوج ہو گئے۔''

گوپی چند کے اس انکشاف پر تمام اہلِ دربار حیرت زدہ رہ گئے۔ خود جہانگیر بھی ایک لمحے کے لئے پریشان نظر آنے لگا تھا۔ ''یہ گوپی چند کیا کہہ رہا ہے ارسلان؟'' جہانگیر نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

''خداوند! یہ شخص کسی فریبِ نظر کا شکار ہے۔ میں نے اسے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' ارسلان کانپتی ہوئی آواز میں اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ ''میں کبھی کبھی گیانی کے پاس اس کے کمالات دیکھنے چلا جاتا تھا۔ مگر تصویروں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ شاہِ والا، آتمارام سے اس سلسلے میں دریافت کر سکتے ہیں۔'' ارسلان نے ہمت کر کے اتنا بڑا جھوٹ بول دیا تھا مگر اسے اپنی سانسیں رُکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اگر آتمارام، گوپی چند کے دعوے کی تصدیق کر دیتا تو پھر ارسلان بیگ، شاہی غضب سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے آتمارام کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا۔

آتمارام نے ایک لمحے میں ارسلان بیگ کی نگاہوں کی زبان سمجھ لی اور پُراعتماد لہجے میں کہنے لگا۔ ''سمراٹ! میں خود بھی اس نوجوان کو نہیں پہچانتا۔ دن میں سینکڑوں آدمی میرے کمالات دیکھنے یا اپنی ضرورتیں لے کر آتے رہتے ہیں۔ میں کس کس کا چہرہ یاد رکھ سکتا ہوں؟ جہاں تک میرے حافظے کا تعلق ہے تو اس میں اس نوجوان کا کوئی ہلکا سا عکس بھی موجود نہیں۔'' آتمارام نے اس عیاری کے ساتھ جھوٹ بولا تھا کہ اس پر کوئی شک بھی نہیں کر سکا۔

ارسلان بیگ نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ سانس جو اس کے لئے نئی زندگی کا پیغام تھی۔

''پھر کون جھوٹا ہے اور کون سچا ہے؟'' جہانگیر نے قہرناک لہجے میں کہا۔ ''وہ دنیا کا سب سے بڑا بدنصیب ہے، جو ہمارے حضور جھوٹ بولنے کی گستاخی کرے۔''

گوپی چند کو محسوس ہوا، جیسے قریب ہی اس کی موت منڈلا رہی ہو۔ وہ اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا اور گھبرا کر کہنے لگا۔

"سمراٹ! میں تو بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ تینوں مجسمے، آتمارام کی جھونپڑی میں موجود ہیں۔ اب ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں گیانی کے خطرناک ارادوں سے شہنشاہ کو باخبر کردوں۔"

جہانگیر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ وہ آتمارام کی جھونپڑی میں ان مجسموں کو تلاش کریں، جن کے متعلق گوپی چند نے دعویٰ کیا ہے۔

جہانگیر کے حکم پر آتمارام کی جھونپڑی کی تلاشی لی گئی، مگر وہاں کوئی مجسمہ موجود نہیں تھا۔ آتمارام بہت پہلے مبارک شاہ کے مجسمے کو دریا میں غرق کر چکا تھا۔ اور جب وہ شہنشاہ کے حکم پر سپاہیوں کے ہمراہ دربار کی طرف آرہا تھا تو اس نے دھرم پال سے کہہ دیا تھا کہ ارجمند اور خرم کے مجسموں کو ریزہ ریزہ کر کے بہت دُور دریا میں پھینک دیا جائے۔ پھر جب شہنشاہ کے سپاہی جھونپڑی میں پہنچے تو وہاں کوئی مجسمہ موجود نہیں تھا۔

جہانگیر یہ اطلاع پا کر مزید غضب ناک ہوگیا اور گوپی چند سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تُو نے جھوٹ بول کر ہمارا بہت قیمتی وقت برباد کیا۔ دُور ہو جا ہماری نظروں کے سامنے سے۔ بے شک! ہم آتمارام سے خفا ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری سماعت ان جھوٹے قصوں پر اعتبار کرلے گی۔ ہم دوست اور دشمن سب کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔"

بالآخر گوپی چند کو ذلیل و رسوا کر کے دربارِ شاہی سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد آتمارام نے اپنی خباثتوں میں نئے رنگ بھرنے کی کوشش کی۔

"سمراٹ! میں نے مبارک شاہ کا وہ مجسمہ اس لئے بنوایا تھا کہ میں اسے اپنے جادو کے ذریعے آپ کے سامنے جھکا سکوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس نے سجدے سے انکار کیا تھا اور ایک نمک خوار کی حیثیت سے میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ رعایا میں سے کوئی شخص شہنشاہ کے سامنے سر اُٹھا کر چل سکے۔ میں اسے ایک خاص طلسم کے ذریعے اس فعل پر مجبور کرنا چاہتا تھا کہ وہ آپ کے آگے سجدہ ریز ہو جائے۔ لیکن وہ مجسمہ مکمل نہ ہوسکا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اب تک مبارک شاہ آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا ہوتا۔" آتمارام نے انتہائی عیاری کے ساتھ جہانگیر کی سب سے زیادہ دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

شہنشاہ بے چین نظر آنے لگا۔

"گیانی! اگر ایسا ہو جائے تو ہم تجھے نئے اعزازات سے سرفراز کردیں گے۔" جہانگیر ایک بار پھر گمراہی کا شکار ہوگیا تھا۔ اگرچہ اس نے مبارک شاہ کی سزا ختم کر دی تھی لیکن درپردہ وہ شدید خواہش رکھتا تھا کہ عام رعایا کی طرح قلندر بھی اسے سجدہ کرتا رہے۔

"سمراٹ! آپ کا یہ داس (غلام) جب تک زندہ ہے، مبارک شاہ کے خلاف سرگرمِ عمل رہے گا۔" آتمارام نے خوشامد کا نیا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی بھی جتن کرنا پڑے مگر میں ایک دن مبارک شاہ کو آپ کے قدموں میں جھکا کر چھوڑوں گا۔"

کچھ دیر پہلے آتمارام ایک مجرم کی حیثیت سے دربار میں داخل ہوا تھا مگر اچانک وہ ایک محترم شخصیت بن گیا تھا۔ جہانگیر نے اسے بڑے انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے کہا۔

"ہم حکومت کے وفاداروں پر اسی طرح اپنے رحم و کرم کی بارش کرتے ہیں۔"

پھر جب آتمارام دربار سے رخصت ہونے لگا تو ارسلان بیگ بہت خوش تھا کہ آج آتمارام کی وجہ سے اسے نئی زندگی مل گئی تھی۔

❀.....❀.....❀

گوپی چند اور اُس کے گھر والے، مسلمان ہونے کے بعد نئی پریشانیوں میں گھر گئے تھے۔ ہندوؤں نے انتقامی کارروائیوں کے طور پر اس سے مجسمے خریدنا بند کر دیئے تھے۔ تقریباً ایک ماہ تک وہ اس صورتِ حال کا شکار رہا۔ آخر ایک دن مجبور ہو کر گوپی چند، مبارک شاہ قلندر کے پاس پہنچا اور زار و قطار رونے لگا۔

"قلندر! اب مجھ پر آگرے کی زمین تنگ ہو چکی ہے۔ مجھے میرے ہاتھ مل گئے، مگر روٹی نہیں ملتی۔"

"کیا تم اب بھی مجسمے بناتے ہو؟" مبارک شاہ نے نہایت شفیق لہجے میں پوچھا۔ "مجسمہ سازی اسلام میں حرام ہے۔"

"اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں قلندر!" گوپی چند کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ "مجھے مجسمہ سازی کے سوا کچھ اور آتا بھی تو نہیں۔"

"مایوس نہ ہو۔ خدا تیرے اسی فن کو نئی شکل دیدے گا۔" مبارک شاہ نے بڑی محبت سے گوپی چند کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ذرا صبر کر۔ تجھ پر خوش حالی کے نئے دروازے کھلنے والے ہیں۔"

"مجھ سے بیوی بچوں کے فاقے نہیں دیکھے جاتے قلندر!" تسلی کے چند الفاظ پا کر گوپی چند کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی۔

"ہمت سے کام لے۔ فاقہ کشی کے یہ دن بھی گزر جائیں گے۔" مبارک شاہ نے کہا۔ "تُو جس خدا پر ایمان لایا ہے وہ تیرے اندازوں سے بھی زیادہ دینے والا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تُو آزمائش کے چند عارضی لمحات سے گھبرا کر بت پرستوں کے مذہب کی طرف لوٹ جائے۔"

ابھی قلندر کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ ایک گھڑسوار آکر رُکا اور پھر بڑی عقیدت کے ساتھ نیچے اُتر کر مبارک شاہ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"اب کیا ہے؟" مبارک شاہ نے پُرجلال لہجے میں کہا۔ "کیوں مجھے بار بار تنگ کرتا ہے؟ تیرا کام ہو تو گیا۔"

"بابا! میں اسی کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔" شہسوار گھٹنوں کے بل قلندر کے روبرو جھک گیا۔ یہ شخص شاہی فوج میں ایک عام سپاہی تھا اور بہت دنوں سے اپنی ترقی کے لئے کوشش کر رہا

تھا مگر ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ مجبور ہو کر ایک روز قلندر کے پاس آیا اور بار بار کہا کہ جب تک آپ میرے حق میں دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھائیں گے، اس وقت تک گھر واپس نہیں جاؤں گا۔

آخر قلندر نے جھنجلا کر کہہ دیا۔ ''خدا کے حکم سے تیرا کام ہو جائے گا۔''

اور آج وہی سپاہی فوج میں ایک اعلیٰ منصب دار بن گیا تھا۔ اور قلندر کی بارگاہ میں اظہار تشکر کے لئے حاضر ہوا تھا۔

فوجی منصب دار نے پانچ اشرفیاں قلندر کے حضور پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''بابا! اسے قبول فرمالیجئے۔ یہ ایک حقیر سی نذر ہے۔''

''تُو خوب جانتا ہے کہ میں سونے چاندی کی روٹیاں نہیں کھاتا۔'' مبارک شاہ کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

''مجھے خبر ہے بابا! مگر میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔'' فوجی منصب دار گڑگڑانے لگا۔ ''اگر آپ اس حقیر سی نذر کو قبول کرلیں گے تو مجھ گناہ گار کو سکون حاصل ہو جائے گا۔ بس میرے سکون وقرار کے لئے ایسا کر لیجئے۔''

فوجی منصب دار کا لہجہ گداگرانہ تھا۔ قلندر انکار نہ کر سکا۔

''اگر تجھے اسی طرح سکون ملتا ہے تو پھر یہ اشرفیاں اس مظلوم انسان کو دے دے۔'' مبارک شاہ نے گوپی چند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے بت پرستوں نے بہت ستایا ہے۔''

فوجی منصب دار نے نیازمندانہ انداز میں وہ اشرفیاں گوپی چند کی طرف بڑھا دیں۔ گوپی چند جھجکا تو قلندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لے لے۔ خدا نے اپنے خزانۂ غیب سے تیرے لئے یہی انتظام کیا ہے۔''

اشرفیاں دے کر فوجی منصب دار واپس چلا گیا تو گوپی چند نے قلندر سے کہا۔ ''آتمارام نے مجھے اور میرے اہلِ خاندان کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی ہیں۔'' گوپی چند کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔ ''میں بہت کمزور انسان ہوں..... اور آتمارام کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔''

''تجھے قدرت کے ہاتھوں کا اندازہ نہیں کہ وہ کتنے دراز ہیں۔'' قلندر کے ہونٹوں پر ایک عجیب سا تبسم نمایاں ہو گیا تھا۔ ''اب تُو کمزور نہیں، بہت زیادہ طاقتور ہے۔ کمزور اس وقت تھا جب تُو بتوں کی پوجا کرتا تھا۔ اب آتمارام اور اس کے ناہنجار چیلے تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بس کچھ دنوں کا تماشا اور ہے۔ پھر آتمارام بھی اپنا حشر دیکھ لے گا۔''

گوپی چند، اشرفیاں لے کر چلا گیا۔ فاقہ زدہ گھر میں اچانک خوشحالی کی بہار لوٹ آئی تھی۔

دوسرے دن ایک وزیر نے گوپی چند کو طلب کیا اور کہا کہ تُو اپنے ہاتھوں سے ایسے طاق اور محرابیں تراش دے کہ آگرے کے لوگ دیکھتے رہ جائیں۔ یہ وزیر اپنا مکان تعمیر کرانا چاہتا تھا۔ گوپی چند نے فوراً اقرار کرلیا اور اس پر خوش قسمتی کے نئے دروازے کھل گئے۔

اس دوران آتمارام نے کئی شر پسند ہندوؤں کو گوپی چند کے مکان پر بھیجا کہ وہ اسے اور اس کے گھر والوں کو قتل کر دیں۔ آتمارام نے طویل تقریریں کر کے ان کے مذہبی جذبات کو اُبھارا تھا۔ مگر جب وہ شر پسند، گوپی چند کے مکان کے قریب پہنچے تو یکایک ان کی آنکھوں کی روشنی زائل ہو گئی اور انہیں ہر طرف گہرا اندھیرا نظر آنے لگا۔ ہندو شر پسند چیختے ہوئے واپس لوٹے تو آنکھوں کی روشنی بحال ہو گئی۔ پھر انہوں نے آتمارام سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ گوپی چند اور اس کے اہلِ خانہ کو قتل نہیں کر سکتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔ آتمارام نے انہیں بھی اپنی شعبدہ بازی کے ذریعے سونے کے انبار دکھائے مگر وہ لوگ دولت کے اس ڈھیر سے متاثر نہیں ہوئے۔

گوپی چند اب ایک خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ ہر جمعرات کو مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور دعائیں لے کر واپس چلا جاتا۔

۞.....۞.....۞

اسی سال کے آخر میں ایک اور ہنگامہ ہوا۔ جہانگیر نے ایک اور راجپوت زادی سے شادی کر لی۔ یہ راجہ مان سنگھ کے بیٹے جگت سنگھ کی لڑکی تھی۔ راجہ نے جہیز میں تین لاکھ روپے اور ساٹھ ہاتھی نذر کئے تھے۔ سلطنت کے امراء جانتے تھے کہ جہانگیر نے یہ شادی ایک خاص مقصد کے تحت کی ہے۔ اپنے باپ اکبر کی طرح جہانگیر بھی سیاسی مفادات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جگت سنگھ کی لڑکی سے شادی بھی ایک سیاسی چال تھی۔ اس رشتے کے بعد راجپوتوں کی ایک بڑی تعداد، شہنشاہ کے قریب آ گئی تھی اور مغل حکومت کو مزید استحکام حاصل ہو گیا تھا۔

اس شادی نے جہاں شہنشاہ کو عارضی مسرت کے چند لمحات بخشے تھے، وہاں مہرالنساء بیگم کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ جہانگیر پہلے ہی عہد کر چکا تھا کہ وہ دوبارہ مہرالنساء کو اپنی خلوت میں طلب نہیں کرے گا۔ پھر اس نے جگت سنگھ کی لڑکی سے شادی کر کے یہ ثابت کرنا چاہا کہ اب وہ مہرالنساء کی طرف سے غافل ہوتا جا رہا ہے۔ مہرالنساء کے لئے یہ بات بڑی تکلیف دہ اور پریشان کن تھی۔ ایک سال میں شہنشاہ کی دو شادیوں نے مہرالنساء کو یقین دلا دیا تھا کہ اب جہانگیر اس کے حلقۂ اثر سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔

مہرالنساء زیادہ دیر تک اس صورتِ حال کو برداشت نہ کر سکی۔ کئی دن تک وہ پیچ و تاب کھاتی رہی۔ کئی بار اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی سحر کار شخصیت کا جائزہ لیا اور کئی بار خود کلامی کے انداز میں اپنے آپ سے مخاطب ہوئی۔

''کیا شہنشاہ کی نظر میں میرا حُسن بے اثر ہو چکا ہے؟ اور کیا شہنشاہ نے مجھے ہمیشہ کے لئے نظر انداز کر دیا ہے؟''

''نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' مہرالنساء نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ ''میری شخصیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ وہی سرخ و سفید رنگ..... اور وہی جاذبِ نظر خدوخال ہیں۔''

''پھر ہندوستان کا شہنشاہ عورتوں کی زلفوں کے سائے میں کیوں پناہ ڈھونڈ رہا ہے؟ مہرالنساء نے اپنے آپ سے ایک اور سوال کیا۔

''شہنشاہ حُسن کی بارگاہ میں کتنی درخواستیں پیش کر چکا ہے۔'' مہرالنساء نے خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آخر وہ ایک مطلق العنان حکمراں ہے۔ کب تک اپنی شکست کا ماتم کرتا رہے گا؟''

''پھر اس عشق کا انجام کیا ہوگا؟'' مہرالنساء مسلسل اپنے آپ سے سوالات کر رہی تھی۔

''شہنشاہ کوئی دوسرا سہارا تلاش کر لے گا۔'' مہرالنساء نے اپنے چہرے کے دلفریب نقش نگار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ملک کے طول و عرض میں حُسن ہی حُسن بکھرا ہوا ہے۔ ہزاروں خوبصورت خواتین اپنی آنکھوں میں حکمرانی کے خواب سجائے ہوئے ملکۂ عالیہ بننے کا انتظار کر رہی ہیں۔ اگر تُو نے اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کی تو دوسری عورتیں تجھے پامال کر کے آگے بڑھ جائیں گی۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ شہنشاہ کی زندگی کا خلاء ایک نہ ایک دن بھر جائے گا اور تُو حسرت بھری نظروں سے اپنے ارمانوں کی سنسان رہ گزر کو دیکھتی رہ جائے گی۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔'' اچانک مہرالنساء کی سوچ کا انداز بدل گیا۔ ''وقت کی رفتار روکی نہیں جا سکتی۔ مہرالنساء بیگم! تجھے مجبوریوں کے خول سے نکل کر وقت کی رفتار کا ساتھ دینا ہوگا۔ ورنہ اسی طرح زندگی کے اُجاڑ راستوں پر بیٹھی ہوئی اپنی بیوگی کا ماتم کرتی رہے گی۔ اور ماتم کے اس شور کو کوئی سننے والا نہیں ہوگا۔ یہاں ہر طرف کیف و نشاط کے ہنگامے برپا ہیں۔ ان پُرشور ہنگاموں میں روتی اور سسکتی آوازوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔''

ان تلخ حقیقتوں نے مہرالنساء کے غرورِ حُسن پر شدید ضرب لگائی تھی۔ پھر اقتدار کی یہی ہوس ایک رات اسے کھینچ کر جہانگیر کے شبستان میں لے گئی۔

جب درباری مطربہ انجمن آراء نے شہنشاہ کو مہرالنساء کی آمد کی خبر دی تو ہندوستان کا حکمراں حیران رہ گیا۔ جہانگیر نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ وہ مہرالنساء کو ناکام واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دے۔ مگر پھر فوراً ہی خیال بدل دیا اور سر کے اشارے سے انجمن آراء کو حکم دیا کہ وہ مہرالنساء کو اندر آنے دے۔

مہرالنساء، خلوت گاہِ شاہی میں داخل ہوئی مگر آج وہ بہت بجھی بجھی نظر آ رہی تھی۔

''تم کیسی ہو مہرو؟'' جہانگیر نے بے نیازانہ انداز میں اپنے سنگ دل محبوب کی مزاج پرسی کی۔

''جہاں پناہ کے رحم و کرم سے زندہ ہوں۔'' مہرالنساء کے لہجے میں ہلکا سا طنز شامل تھا۔

''آج یہاں کیسے چلی آئیں؟..... مجبوریوں نے تمہارے قدم نہیں روکے؟'' جہانگیر کا لہجہ کچھ اور بے نیازانہ ہو گیا تھا۔

''ظلِ الٰہی کو نئی شادی پر مبارکباد دینے آئی ہوں۔'' مہرالنساء نے اپنے لہجے پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنے دل میں پوشیدہ تلخیوں کو چھپانے سے قاصر رہی۔

''ہم نے تمہاری مبارکباد قبول کی۔'' جہانگیر نے طے کر لیا تھا کہ آج وہ مہرالنساء پر اپنے

دلی جذبات ظاہر نہیں ہونے دے گا۔

جہانگیر کی مسلسل بے رخی نے مہرالنساء کو شدید احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ ذہنی انتشار میں مبتلا رہی۔ مہرالنساء کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی گفتگو کس طرح جاری رکھے؟ آخر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی اور انتہائی شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔

''یہ کنیز، عالم پناہ کے طرزِ عمل کو سمجھنے سے عاجز ہے۔''

''کیسا طرزِ عمل؟'' جہانگیر نے شراب کی صراحی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

مہرالنساء بہت تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے شہنشاہ کے ہاتھ سے ساغر لے لیا۔ پھر ساغر کو شراب سے لبریز کرتے ہوئے بولی۔

''جہاں پناہ کو اپنے الفاظ یاد نہیں رہے۔''

''ہمیں سب کچھ یاد ہے مہرو!'' جہانگیر نے اپنی محبوبہ دلنواز کے ہاتھ سے جامِ سرخ لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی زبان سے ادا ہونے والے ایک حرف کو بھی نہیں بھولتے۔ مگر زمانے کی عادت ہے کہ وہ اہلِ دل سے ہمیشہ بے وفائی کرتا ہے۔ اس کا مزاج نہیں کہ وہ دل کی زبان سمجھے۔ مجبوراً ہم نے بھی اپنا انداز بدل دیا ہے۔'' جہانگیر بالواسطہ مہرالنساء پر طنز کر رہا تھا۔ ''دنیا کو کیا معلوم کہ ایک شہنشاہ کتنے ہنگاموں کی زد پر ہوتا ہے اور کیسی کیسی شورشیں اس کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ دنیا بہت خود غرض ہے۔ وہ صرف اپنی ذات میں گم رہتی ہے۔ اس لئے ہم نے بھی دنیا کو ٹھکرا دیا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے، اسے ہونے دو۔ ہم نے بہت چاہا کہ محبت کے لفظوں سے ہندوستان کے در و دیوار گونج اُٹھیں مگر یہاں کے رہنے والوں نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم ان سے شمشیروں کی زبان میں گفتگو کریں۔ اور پھر لالہ و گل پر شبنم کی طرح برسنے کی بجائے انہیں ان کے ہی خون سے رنگین کر ڈالیں۔ دنیا یہی چاہتی ہے اور ہم ایسا ہی کریں گے۔''

''میں جہاں پناہ کے دل کا درد سمجھتی ہوں۔'' مہرالنساء، شہنشاہ کے قدموں کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم جھوٹ بولتی ہو مہرو!'' یکایک جہانگیر کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''میری خدمت گزاری اس بات کا ثبوت ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔'' مہرالنساء نے اپنے دامن پر لگے ہوئے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کی۔

''یہ خدمت تو انجمن آراء بھی انجام دیتی ہے۔'' جہانگیر کے چہرے پر جلالِ شاہی پوری شدت کے ساتھ روشن تھا۔ ''بے شمار مطرب، لاتعداد رقاصائیں آئیں اور جہانگیر کی خدمت انجام دے کر چلی گئیں مگر کسی نے ابوالمظفر نورالدین جہانگیر کو نہیں پہچانا۔ وہ ہمیں قہر و غضب کا مجسمہ سمجھتی رہیں۔ انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ ان کا شہنشاہ کیسا جمال پرست، کیسا انصاف پسند اور کیسا رحم دل انسان ہے۔ ہمارے بیٹے خسرو نے دو بار ہمارا سر کاٹنا چاہا مگر ہم نے اُس کا سر بخش دیا۔ بے شک! ہم نے اقتدار کے پجاری سے اس کی آنکھیں چھین لیں، مگر آج بھی ہم چین سے نہیں

سو سکتے۔ رات رات بھر بے وفا خسرو کی چیخیں ہمارا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ ہم اپنے دل سے مجبور ہیں اور سفاک بیٹے کی آنکھوں کا علاج کرا رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ آنکھوں کی روشنی پانے کے بعد ایک بار پھر ہمارے خلاف بغاوت کرے گا..... لیکن ہم سے اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔"

مہرالنساء، جہانگیر کی گفتگو سن کر سناٹے میں آ گئی تھی۔ اس نے پہلی بار شہنشاہ کو اس عالم میں دیکھا تھا۔ واقعتاً وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتا تھا مگر اس دل کی صدائیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔

اس سے پہلے کہ مہرالنساء لب کشا ہوتی، جہانگیر نے ناگوار لہجے میں کہا۔ "تم جاؤ مہرو! یہ خدمت کوئی اور بھی انجام دے لے گا۔"

مہرالنساء سکتے میں آ گئی تھی۔ وہ بہت دیر تک چپ چاپ کھڑی رہی اور پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس دوران اس نے کئی بار مڑ کر دیکھا مگر جہانگیر اپنے بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ اور اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا۔

❀.....❀.....❀

ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی ملاقاتیں جاری تھیں۔ ان دونوں کی نسبت کو دو سال گزر چکے تھے۔ ارجمند بانو روز اس خبر کی منتظر رہتی تھی کہ اچانک اس کی شادی کا اعلان کر دیا جائے گا..... مگر یہ آرزو اس کے سینے ہی میں سلگتی رہی۔ ارجمند ایک باحیا لڑکی تھی۔ وہ اپنی زبان سے کھل کر تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی مگر اس نے اشاروں میں کئی بار خرم کے سامنے اپنے جذباتی تقاضوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"عالم پناہ کو ہمارا کچھ خیال ہی نہیں ہے۔"

"ارجمند! اس سلسلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟" خرم نے اپنی بے چارگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "شہنشاہ کے معاملات میں کون دخل اندازی کر سکتا ہے؟"

ارجمند خاموش ہو گئی۔ وہ شہزادہ خرم کی مجبوریاں سمجھتی تھی۔

پھر ایک دن اس نے اس موضوع پر ماہ رخ سے بات کی تو وہ بھڑک اٹھی۔ "شہنشاہ کو اپنی شادیوں سے فرصت نہیں ہے۔ پھر انہیں کسی دوسرے کا خیال کس طرح آ سکتا ہے؟"

"آہستہ بولو ماہ رخ.....!" ارجمند بانو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہاں در و دیوار بھی کان رکھتے ہیں۔"

"بی بی! مجھے بہت وحشت ہو رہی ہے۔" ماہ رخ کا لہجہ اُداس تھا۔ "میں نے اس دوران کئی بار آپ کی پھوپھی مہرالنساء کو دیکھا ہے۔ وہ بھی آج کل بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی ہیں۔ ایک سال میں شہنشاہ کی دو شادیوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اُن کی توجہ مہرالنساء بیگم کی طرف سے ہٹ

گئی ہے اور یہ بڑی مایوس کن بات ہے۔"

ماہ رخ کی گفتگو سن کر ارجمند چونک اُٹھی۔ "آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"مجھے سارے معاملات اُلجھتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔" ماہ رخ کی آواز بجھی بجھی سی تھی۔ "مہرالنساء بیگم کا شہنشاہ سے دُور ہو جانا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ بہت دنوں سے انہوں نے مجھے طلب بھی نہیں کیا ہے اور عالم پناہ کے نام کوئی پیغام بھی نہیں بھیجا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کے تعلقات بہت زیادہ کشیدہ ہو گئے ہیں اور یہ کشیدگی آپ کے حق میں بہتر نہیں ہے۔"

"میرا ان دونوں کی کشیدگی سے کیا تعلق ہے؟" معصوم ارجمند حیران کن نظروں سے ماہ رخ کی طرف دیکھنے لگی۔

"بہت گہرا تعلق ہے۔" ماہ رخ نے کسی انتہائی تجربہ کار اور جہاندیدہ عورت کے انداز میں کہا۔ "شہنشاہ، مہرالنساء بیگم کو حاصل کرنے کے لئے کئی رشوتیں دے چکے ہیں۔ آپ کے دادا اور باپ کے عہدوں میں مسلسل ترقی اور شہزادہ خرم سے آپ کی نسبت..... یہ سب رشوتیں ہیں، جو مہرالنساء بیگم کے حوالے سے دی جا رہی ہیں۔ مگر شہنشاہ کو ابھی تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں شہنشاہ کی ناکامی کے تاریک سائے آپ کے روشن مستقبل کو متاثر نہ کر دیں۔"

"تمہارا مقصد ہے کہ شہنشاہ کی ناکامی سے میرے خوابوں کی تعبیر بھی بدل سکتی ہے؟" ارجمند نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ مگر آپ ایک شہنشاہ کی بے جا ضدوں کا شکار ہو سکتی ہیں۔" ماہ رخ نے صاف صاف کہا۔ "آپ کی نسبت کو دو سال ہو چکے ہیں، مگر شادی کے دُھندلے سے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ شہنشاہ کی طرف سے یہ خاموشی بڑی معنی خیز ہے۔"

ارجمند کے دل میں بھی بہت دنوں سے یہ وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ آج ماہ رخ کی باتوں نے اسے نئے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

❀.....❀.....❀

اور پھر ایک دن اس خبر نے ارجمند بانو کی دنیا زیر و زبر کر دی۔ سرکاری طور پر ایک ایرانی شہزادی اور شہزادہ خرم کی نسبت کا اعلان کر دیا گیا۔ ایرانی شہزادی مرزا مظفر حسین صفوی کی بیٹی تھی۔ اور مرزا مظفر حسین، شاہِ ایران اسماعیل صفوی کا پوتا تھا۔ اس طرح ایران کے شاہی خاندان سے رشتہ طے کر کے جہانگیر نے دونوں مملکتوں کے درمیان ایک نئے تعلق کی بنیاد ڈالی تھی۔ جہانگیر کا خیال تھا کہ مرزا مظفر حسین صفوی کی بیٹی سے شادی کر کے وہ شاہِ ایران کی قربت حاصل کر لے گا اور پھر قندھار سیاسی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہو جائے گا۔

شہزادہ خرم بھی اس خبر سے حیران و پریشان تھا۔ اس نے باپ کے سامنے دبے الفاظ میں

احتجاج کیا مگر جہانگیر نے بیٹے کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔

''خرم! ہمیشہ یاد رکھو کہ اربابِ اقتدار، جذبات سے مجبور ہو کر کوئی قدم نہیں اُٹھاتے۔''

ایک شہنشاہ نے شہزادے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم عظیم مغل سلطنت کے وارث ہو۔ اور سلطنت کا مفاد اسی میں ہے کہ تم ایرانی شہزادی سے خوش دلی کے ساتھ شادی کر لو۔ یہ ہمارا حکم بھی ہے اور مشورہ بھی۔'' جہانگیر کے لہجے میں جلال بھی تھا اور مصلحت آمیز نرمی بھی۔ وہ سخت زبان استعمال کر کے بیٹے کے جذبات کو مشتعل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ''ہر معاملے میں سیاسی مفادات پیشِ نظر رکھو۔ ایرانی شہزادی تمہارے حق میں زیادہ بہتر ثابت ہو گی۔ یہ ایک شاندار نسب نامہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس ارجمند محض ایک وزیرزادی ہے..... آصف خان کی بیٹی، جسے تمہارے باپ دادا کی نوازشوں نے اس درجے تک پہنچایا ہے۔''

''ظلِ الٰہی! میں نسب ناموں پر یقین نہیں رکھتا۔'' شہزادہ خرم کی آواز بہت مدھم تھی اور وہ شہنشاہ کے حضور سر جھکائے کھڑا تھا۔

''تمہیں ایسا کرنا ہو گا خرم!'' اچانک جہانگیر کا لہجہ بدل گیا۔ ''ہم تمہیں آدابِ شہنشاہی سکھا رہے ہیں اور تم نسب ناموں کو ٹھکرا رہے ہو۔ تمہیں سیاسی مفادات پر اپنے جذبوں کو قربان کرنا ہو گا۔ یہی ہمارا حکم ہے۔''

''عالم پناہ، شہزادہ پرویز کو بھی حکم دے سکتے ہیں۔'' شہزادہ خرم مجبور تھا مگر دبے الفاظ میں مسلسل احتجاج کر رہا تھا۔ ''شہزادہ شہریار بھی موجود ہے۔''

''مگر ہم نے اس کام کے لئے تمہارا انتخاب کیا ہے۔'' جہانگیر نے خرم کی دلیل مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ہم کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتے۔ اگر تم اقتدار سے وابستہ رہنا چاہتے ہو تو تمہیں ہمارا ہر حکم ماننا ہو گا۔''

شہزادہ خرم نے ایک شہنشاہ کے بگڑے ہوئے تیوروں کو پہچان لیا تھا۔ اس لئے خاموش سر جھکائے کھڑا رہا۔

''ہم تمہیں اس لئے پسند کرتے ہیں خرم! کہ تم ایک فرمانبردار بیٹے ہو۔'' جہانگیر نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''تمہارا سر ہمیشہ ہمارے حضور خم رہتا ہے۔ مگر آج تمہاری گردن میں یہ کجی کیوں ہے؟ کیا تم بھی خسرو کے راستے پر چلنا چاہتے ہو؟''

''نہیں ظلِ الٰہی!'' خرم نے گھبرا کر کہا۔ ''آپ کے ایک حکم پر ہزاروں خرم قربان۔'' بیٹے نے سعادت مندی کا حق ادا کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں خرم! اگر تم خسرو کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہو تو شوق سے باغی ہو جاؤ۔ ہم صبر کر لیں گے کہ ہمارا دوسرا بیٹا بھی مر گیا۔'' جہانگیر نے بڑی ہوشیاری سے انتہائی جذباتی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں شاہِ والا! خرم آپ کی نظروں میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔'' شہزادہ اس جذباتی وار کو

برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنا سر تسلیم مکمل طور پر شہنشاہ کے حضور خم کر دیا۔

۞.....۞.....۞

اس زمانے میں ایک فتنے نے سر اُبھارا۔ پٹنہ کے رہنے والے قطب نامی ایک فقیر نے دعویٰ کیا کہ وہ جہانگیر کا بیٹا، شہزادہ خسرو ہے۔ مقامی لوگوں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ فقیر کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے، جنہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اندھا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

قطب فقیر علی الاعلان کہتا تھا..... ''میں ایک سفاک اور ظالم شہنشاہ کی قید سے فرار ہو کر آیا ہوں۔ لوگو! میری مدد کرو۔''

شاہی جاسوسوں نے جہانگیر کو فوراً خبر دی کہ یہاں ایک فقیر نے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ وہ خود کو شہزادہ خسرو کہتا ہے اور اس فریب کاری کے پردے میں مقامی رعایا کو مسلسل ورغلا رہا ہے۔ اس کی گمراہ کن تشہیر سے ہزاروں شرپسند متاثر ہوئے ہیں۔ ان شرپسندوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ یہ سب کے سب اوباش اور فتنہ گر ہیں۔ نقلی خسرو اپنی آنکھوں کے زخم دکھا کر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر رہا ہے۔

شاہی جاسوسوں نے اپنے خطوط کے آخر میں اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اگر فوراً صورتِ حال پر قابو نہیں پایا گیا تو کسی بڑی بغاوت کا اندیشہ ہے۔

پٹنہ کے قطب نامی فقیر نے اپنی آنکھوں کے گرد ایسے مصنوعی نشانات بنائے تھے جیسے اسے اندھا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ وہ شرپسندوں کے ہجوم کو ساتھ لے کر بڑے اثر انگیز لہجے میں تقریر کرتا تھا۔

''لوگو! میری طرف دیکھو۔ میں شہزادہ خسرو ہوں۔ شہنشاہ جہانگیر کا محبوب فرزند۔ اس سفاک حکمراں نے اس جرم میں میری آنکھوں کی روشنی چھیننے کی کوشش کی تھی کہ میں امورِ سلطنت میں اس سے اختلاف رکھتا تھا۔ میں غریبوں اور محتاجوں کو آزادی دینا چاہتا تھا مگر شہنشاہ کی خواہش ہے کہ ہمیشہ تمہاری گردنوں میں حکومت کا طوقِ غلامی موجود رہے۔ بس اسی اختلاف نے مجھے یہ برے دن دکھائے۔ تم لوگ میرا ساتھ دو۔ میں شاہی خزانہ لوٹ کر تمہارے گھر دولت سے بھر دوں گا۔''

نقلی خسرو کی یہ تقریریں بڑی تاثیر رکھتی تھیں۔ اوباشوں اور فتنہ گروں کی ایک جماعت پہلے ہی اس کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ شعلہ بار تقریریں سن کر عام رعایا میں سے بھی کچھ معصوم اور بے خبر لوگ اس کے فریب میں آ گئے اور اس طرح ایک بڑا گروہ بغاوت کا پرچم لے کر آگے بڑھا۔

ان دنوں جاگیر کا حاکم افضل خان پٹنہ سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے اپنی عدم موجودگی میں بنارسی کو اپنا نائب بنا دیا تھا اور کچھ ذمے داریاں دیوان غیاث بیگ کو سونپ دی گئی تھیں۔ افضل

خان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نقلی خسرو، شر پسندوں کی جماعت لے کر آگے بڑھا۔ حملے کی خبر سن کر بنارسی اور غیاث بیگ دیوان قلعے سے باہر نکلے۔ پھر خونریز معرکہ شروع ہو گیا۔ مگر یہ جنگ بہت مختصر تھی۔ نقلی خسرو کے حامی جان پر کھیل کر لڑ رہے تھے، اس لئے شاہی فوجیں مسلسل پسپا ہو رہی تھیں۔ افضل خان کے نائب بنارسی اور غیاث بیگ دیوان نے انتہائی بزدلی کا ثبوت دیا۔ وہ دونوں میدانِ جنگ سے فرار ہو کر افضل خان کے پاس پہنچ گئے اور نقلی خسرو نے ایک بڑے قتل عام کے بعد پٹنہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔

افضل خان اس اچانک شکست پر بہت زیادہ دل برداشتہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بار بار غیاث بیگ اور بنارسی کو مخاطب کر کے کہتا تھا۔

''نامردو! تم نے تو میری دنیا خراب کر ڈالی۔ اب میں عالم پناہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

بنارسی اور غیاث بیگ دونوں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے اور لرزتی ہوئی زبانوں کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

''امیر! ہم کیا کرتے؟ باغیوں کا حملہ ہی اتنا شدید تھا کہ ہمارے پاؤں اُکھڑ گئے۔''

''تم نے میرے اعتبار کو قتل کر دیا۔'' افضل خان کسی زخمی شیر کی طرح غرا رہا تھا۔ ''شکست اور فتح تو نصیبوں کی بات ہے۔ مگر میں اس وقت خوش ہوتا، جب بتانے والے مجھے بتاتے کہ بنارسی اور غیاث بیگ میدان میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ان کی لاشوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں نے روند ڈالا لیکن انہوں نے آخری سانس تک پشت نہیں دکھائی۔ کاش ایسا ہو جاتا..... کاش! ایسا ہو جاتا۔'' افضل خان شدید غصے کی حالت میں اپنے دونوں ہاتھ مل رہا تھا۔

مگر وقت گزر چکا تھا۔ افضل خان نے بڑی مشکل سے اپنے اعصاب کو شکست و ریخت سے بچایا اور نقلی خسرو کا غلبہ ختم کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

افضل خان نے بڑی احتیاط کے ساتھ منصوبہ بندی کی۔ منتشر فوج کو جمع کیا اور تازہ دم لشکر کے ساتھ پٹنہ کے قلعے پر حملہ آور ہوا۔ نقلی خسرو کے ساتھی بڑی دلیری کے ساتھ لڑے۔ افضل خان کو شکست کا اندیشہ ہوا تو اس نے ہوشیاری کے ساتھ اپنی فوجیں پیچھے ہٹا لیں۔

پھر کچھ دن کا وقفہ دے کر افضل خان نے قلعے پر دوسرا حملہ کیا۔ اس دوران وہ نقلی خسرو کے کمزور پہلوؤں کا مکمل جائزہ لے چکا تھا۔ افضل خان نے ان ہی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور اپنے حریف پر کاری ضرب لگائی۔ اس بار نقلی خسرو کا لشکر افضل خان کے حملے کی تاب نہ لا سکا۔ شام کے قریب باغیوں کی جماعت میدان چھوڑ گئی۔ نقلی خسرو فرار ہونا چاہتا تھا مگر افضل خان نے اسے اتنی مہلت نہیں دی۔

تمام فتنہ پردازوں کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا اور افضل خان نے قطب فقیر (نقلی خسرو) کا سر کاٹ کر شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں بھیج دیا۔

جواب میں جہانگیر نے پٹنہ کے حاکم کے نام فرمانِ شاہی ارسال کرتے ہوئے کہا۔

''افضل خان! ہم تیری وفاداری اور شجاعت سے بہت خوش ہیں۔ اب تجھ پر لازم ہے کہ فوراً دارالحکومت کی طرف روانہ ہو جا تا کہ ہم تجھ پر اپنے انعام و اکرام کی بارش کر سکیں۔''

جہانگیر نے بنارسی اور غیاث بیگ کے بارے میں لکھا تھا۔

''ان دونوں کو عورتوں کا لباس پہنا کر ان کے سر اور داڑھی کے بال مونڈ دیئے جائیں۔ اور پھر انہیں گدھوں پر بٹھا کر پٹنہ سے آگرہ تک جلوس کی شکل میں لایا جائے۔''

جہانگیر نے بنارسی اور غیاث بیگ کے متعلق یہ بھی تحریر کیا تھا۔ ''جلوس کو شہری آبادیوں سے گزارا جائے اور راستے بھر شاہی نقیب چیخ چیخ کر صدائیں لگاتے رہیں کہ یہ ان لوگوں کی سزا ہے جو موت کے خوف سے میدانِ جنگ چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔''

غرض اسی حالت میں یہ جلوس طویل فاصلہ طے کر کے آگرہ پہنچا۔ بنارسی اور غیاث بیگ کی اس قدر رسوائی ہوئی کہ وہ دونوں موت کی دعا مانگتے تھے مگر موت ان سے بہت دور تھی۔

افضل خان کو شجاعت اور وفاداری کے صلے میں نئی ترقیوں سے سرفراز کیا گیا۔

۞.....۞.....۞

نقلی خسرو کا قصہ پاک ہوا تو شہزادے کی نسبت کے بارے میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔

اس نسبت سے مہرالنساء کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔ ارجمند بانو اُس کی حقیقی بھتیجی تھی۔ اس واقعے کی اطلاع پا کر مہرالنساء کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی کے بے رحم ہاتھ نے خود اس کے دل پر خنجر کھینچ دیا ہو۔ درد کی شدت سے بے قرار ہو کر مہرالنساء نے بارگاہِ شاہی میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔

جہانگیر جو کبھی مہرالنساء کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے قرار رہتا تھا، آج وہ ملاقات سے انکار کر رہا تھا۔

''انجمن! مہرالنساء سے کہہ دے کہ شاہِ والا، امورِ سلطنت میں مصروف ہیں۔ وہ کسی اور وقت آئے۔ آج ہمیں ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ہے۔''

درباری مطربہ، انجمن آراء سناٹے میں آ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شہنشاہ اس طرح انکار بھی کر سکتے ہیں۔ انجمن آراء نے شاہی حکم مہرالنساء تک پہنچا دیا۔

مہرالنساء کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔ حالات اس قدر خوف ناک رُخ بھی اختیار کر سکتے ہیں؟ مہرالنساء نے شاہی خلوت کدے کے دروازے پر کھڑے کھڑے سوچا۔

''حسن ملاقات کی خواہش کا اظہار کرے اور عشق انکار کرے۔ کیا یہ بھی ممکن ہے؟'' مہرالنساء کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔

''شاہِ والا سے عرض کرو کہ مہرالنساء ان کے قیمتی اوقات میں سے چند لمحات چاہتی ہے۔'' مہرالنساء نے انجمن آراء سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''بیگم صاحبہ! مجھے اس کام کی تکمیل سے معذور سمجھیں۔'' انجمن آراء نے بہت نرم لہجے میں

کہا۔ وہ مہرالنساء کے مقام کو پہچانتی تھی، اس لئے خوشامدانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ''آپ عالم پناہ کے مزاج سے واقف ہیں۔ میرے اندر یہ جرأت نہیں کہ میں مزاجِ شاہی میں مداخلت کرسکوں۔ آپ شاہِ والا کے حضور کل یا کسی اور وقت ملاقات کی درخواست پیش کریں۔''

مہرالنساء کچھ دیر تک شاہی عشرت کدے کے دروازے پر کسی پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ آج وہ ایک بہت مایوس اور شکستہ عورت تھی۔ شہنشاہ کے تغافل کی ایک ہی ضرب سے مہرالنساء کا غرورِ حُسن ریزہ ریزہ ہوگیا تھا۔

❀.....❀.....❀

دوسرے دن رات کے ابتدائی حصے میں ایک عورت کا سایہ، خلوت گاہِ شاہی کی طرف جا رہا تھا۔ ریشمی چادر میں لپٹی ہوئی یہ عورت مہرالنساء تھی۔ اس بار ملاقات کی درخواست پر جہانگیر کچھ دیر تک غور کرتا رہا۔ چند لمحوں کے لئے اس نے چاہا کہ وہ مہرالنساء کو کل کی طرح ناکام و نامراد واپس لوٹ جانے پر مجبور کردے۔ مگر پھر کچھ سوچ کر شہنشاہ نے انجمن آراء کو اشارہ کیا کہ وہ مہرالنساء کو اندر لے آئے۔

مہرالنساء، بارگاہِ شاہی میں داخل ہوئی تو جہانگیر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ وہ مہرالنساء نہیں تھی، جس کے چہرے سے شرارے پھوٹتے تھے اور جس کا تراشا ہوا مرمریں جسم آنچ دیتا تھا۔ یہ تو محرومیوں اور مجبوریوں کی ایک کاغذی تصویر تھی، جس نے مہرالنساء کا نام اختیار کرلیا تھا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے مہرو؟'' جہانگیر انتہائی کوشش کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔

''شاہِ والا! میری فکر چھوڑ دیجئے۔'' مہرالنساء نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''یہ کنیز صرف اس لئے حاضر ہوئی ہے کہ شہزادہ خرم اور ایرانی شہزادی کی نسبت کا پس منظر دریافت کرسکے..... اور عالم پناہ کو بتا سکے کہ اس شادی سے شہزادہ خرم کے دل و دماغ پر کیسے ہولناک اثرات مرتب ہوں گے۔''

''یہ نسبت ایک شاہی راز ہے اور ہم اپنا راز غیروں پر ظاہر نہیں کرتے۔'' جہانگیر نے بے نیازانہ لہجے میں کہا۔

''کیا میں غیر ہوں؟'' مہرالنساء نے گھبرا کر کہا۔

''یقیناً، غیر ہو۔'' جہانگیر نے بے ساختہ کہا۔

مہرالنساء جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر جہانگیر نے اسے خاموش کردیا۔

''ہم شہزادہ خرم کو یہ سبق دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسے اپنے سینے سے دل نکال کر پھینک دینا چاہئے۔ جو حکمراں دل کے اشاروں پر رقص کرتے ہیں، انہیں یہ بے وفا دنیا ایک لذیذ غذا سمجھ کر کھا جاتی ہے۔ تمہارے معاملے میں ہمیں جس قدر تجربات ہوئے ہیں، ہم انہیں اپنے بیٹے کو

منتقل کردینا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ دل کی آوازیں سننا بند کردے اور عقل کی روشنی میں اپنی منزل تلاش کرنے کی کوشش کرے۔''

''ارجمند بانو میری بیٹی کی طرح ہے۔'' مہرالنساء کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''شاہِ والا کے اس فیصلے سے میری بیٹی کی زندگی بھی تباہ ہوسکتی ہے۔''

''ہم کسی کی زندگی تباہ نہیں کرتے۔'' جہانگیر نے پُرجلال لہجے میں کہا۔ ''ارجمند کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا۔''

''شاہِ والا! جب تک وہ معصوم بچی جل کر خاک ہوجائے گی۔'' شدتِ غم سے مہرالنساء کی آواز لرز رہی تھی۔ ''پھر کیا عالم پناہ اس کے جلے ہوئے جسم اور ارمانوں کی راکھ کے ساتھ انصاف کریں گے؟''

''ہم بہتر جانتے ہیں کہ کس کام کے لئے کون سا وقت مناسب ہے۔'' جہانگیر کے لہجے میں وہی جارحیت اور بے نیازی تھی۔

''اگر جہاں پناہ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے تو میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔''

مہرالنساء نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ جہانگیر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے اس قسم کے اقدام کررہا ہے۔

''نہیں مہرو!'' جہانگیر کے لہجے میں وہی ناگواری پوشیدہ تھی۔ ''آج تمہیں ہماری خدمت کا خیال کیسے آگیا؟ تم صرف اپنی بیوگی کا ماتم کرو۔ پھر جب شورِ فغاں کے بعد تمہاری آواز ڈوبنے لگے اور سینہ کوبی کرتے کرتے تمہارے ہاتھ شل ہوجائیں تو پھر ہمارے دل کی طرف دیکھنا۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے۔''

بے رخی کی یہ ضرب بڑی کاری تھی۔ مہرالنساء ٹوٹ کر بکھر گئی۔

❀.....❀.....❀

ارجمند بانو کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس کی ماں کی آنکھوں میں کئی سوال لرز رہے تھے۔ مگر وزیراعظم آصف خان کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہ بس اتنا کہہ کر رہ گیا۔

''صبر کے ساتھ وقت کا انتظار کرو۔ شہنشاہ کے مزاج کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ پھر بھی ہمارے لئے یہ بات اطمینان بخش ہے کہ جہاں پناہ نے ارجمند اور شہزادہ خرم کی نسبت ختم نہیں کی ہے۔''

ارجمند کچھ دن کے لئے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ وہ دن بھر اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے ماہ رخ کو بھی اندر آنے سے منع کردیا تھا۔ ماہ رخ نے زیادہ ضد کی تو وہ اس پر سنگدل آقاؤں کی طرح برس پڑی۔

''ماہ رخ! تُو اپنی حیثیت پہچان۔'' ارجمند کا لہجہ تحقیر آمیز اور حاکمانہ تھا۔ ''تُو محض ایک ملازمہ ہے اور ملازمہ کے لئے یہ بات حرام ہے کہ وہ آقاؤں کے کام میں مداخلت کرے۔''

ماہ رخ، ارجمند بانو کے اس طرزِ عمل پر حیران رہ گئی۔ ارجمند نے آج تک اُسے ''تُو''

کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ پھر آقا زادی کی طبیعت میں اتنا بڑا انقلاب کیوں؟ ماہ رخ کئی دن تک اس پہلو پر غور کرتی رہی۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ایرانی شہزادی سے شہزادہ خرم کی نسبت نے ارجمند کے ہوش و حواس چھین لئے ہیں۔ ایک نوخیز اور معصوم لڑکی اس تکلیف دہ خبر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، انجام کار اس کے جذبات مشتعل ہو گئے اور اس نے مہ رخ جیسی وفادار خادمہ کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔

پھر جب اس جذباتی طوفان میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا تو ارجمند بانو نے ماہ رخ کو اپنے کمرے میں بلایا اور پھر اسے گلے لگا کر دیوانہ وار رونے لگی۔ اشکوں کی بارش اس قدر تیز تھی کہ دونوں کے دامن بھیگ گئے۔ ماہ رخ، ارجمند بانو کو بار بار تسلیاں دے رہی تھی مگر آنسوؤں کا سیلاب کسی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

''بی بی! ہمت سے کام لو۔ اس طرح تو روتے روتے ہلاک ہو جاؤ گی۔ ماہ رخ نے ارجمند کے بے قابو جذبات کے آگے الفاظ کا بند باندھنے کی کوشش کی۔

''اب میری ہلاکت میں کیا باقی رہ گیا ہے ماہ رخ؟'' ارجمند بانو نے آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان اپنی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... ابھی آپ زندہ ہیں۔'' ماہ رخ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کو زندہ رہنا ہوگا۔ اپنے لئے، شہزادہ خرم کے لئے۔''

''شہزادہ خرم؟'' ارجمند نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ تو مجھ سے بہت دور جا چکے۔ اب وہ کہاں اور میں کہاں؟ اب کچھ یادوں کے مزار باقی ہیں، جہاں ناکام حسرتیں دن رات نوحہ خوانی کرتی رہتی ہیں۔''

''شہزادہ خرم کہاں گئے ہیں؟ وہ تو آپ کے قریب موجود ہیں۔'' ماہ رخ نے حقائق بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''جب تک آپ کی اور شہزادہ خرم کی نسبت باقی ہے، اس وقت تک آپ کا رشتہ بھی زندہ ہے۔ ابھی یہ رشتہ ٹوٹا نہیں ہے بی بی! صبر اور حوصلے سے کام لیجئے۔''

''ہاں۔ بظاہر یہ رشتہ زندہ ہے۔ مگر حقیقت میں مر چکا ہے۔'' اچانک ارجمند کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے اور اس کے لہجے میں ہزاروں تلخیاں گھل گئیں۔ ''تم جس رشتے کی بات کر رہی ہو، اسے شہزادہ خرم نے توڑ دیا۔''

''آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' ماہ رخ نے چونک کر کہا۔ ''شہزادہ خرم یہ رشتہ کس طرح توڑ سکتے ہیں؟ اگر وہ ایسا کرتے تو اب تک سرکاری طور پر اس نسبت کے خاتمے کا اعلان ہو چکا ہوتا۔''

''ظاہری اعلان سے کچھ نہیں ہوتا ماہ رخ!'' ارجمند کے لہجے سے شدید اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''اگر اس میں شہزادہ خرم کی مرضی شامل نہ ہوتی تو پھر ایرانی شہزادی سے ان کی نسبت کس طرح طے ہو سکتی تھی؟''

''یہ کہنا قبل از وقت ہے بی بی!'' ماہ رخ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنی زبان کو

الزام تراشی سے محفوظ رکھیں۔ جب تک صاحبِ عالم خود وضاحت نہیں کر دیتے، اس وقت تک آپ خاموشی اختیار کریں۔''

''اب وضاحت کرنے کے لئے کیا باقی رہ گیا ہے ماہ رخ؟'' ارجمند بانو چاروں طرف سے مایوسیوں کے اندھیروں میں گھری ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے روشنی کے امکانات کو بھی مسترد کر دیا تھا۔ ''اگر وضاحت کی ذرا بھی گنجائش باقی ہوتی تو صاحبِ عالم یقیناً مجھ سے ملاقات کرتے اور اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی مسلسل خاموشی اس بات کی غماز ہے کہ وہ مجھے فراموش کر چکے ہیں۔ تم نے سچ کہا تھا ماہ رخ! کہ شاہوں کے مزاج کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ افسوس! میں نے جوشِ جذبات میں تمہاری کسی بات پر دھیان نہیں دیا۔'' ایک بار پھر ارجمند بانو مشتعل نظر آنے لگی تھی۔

''یہ بات میں نے عام حکمرانوں اور شہزادوں کے بارے میں کہی تھی۔'' ماہ رخ کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔ ''میں ذاتی طور پر شہزادہ خرم کو ان لوگوں کی قطار میں کھڑا نہیں کر سکتی۔ میں نے ان آنکھوں کو بہت غور سے دیکھا ہے۔ وہ آنکھیں کسی کو فریب نہیں دے سکتیں۔''

''میں فریب کی بات نہیں کرتی۔ مگر شہزادے نے مجھ سے یہ راز کیوں پوشیدہ رکھا؟ میرے اعتبار کو کیوں دھوکا دیا؟''

''کیا اس دوران صاحبِ عالم سے آپ کی ملاقات ہوئی؟'' ماہ رخ نے اچانک ایک نیا سوال کر ڈالا۔

''نہیں۔'' ارجمند نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''پھر آپ یہ دعویٰ کس طرح کر سکتی ہیں کہ شہزادے نے اپنی زندگی کا ایک خاص راز پوشیدہ رکھا؟'' ماہ رخ، ارجمند کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''اپنے ذہن کو بدگمانیوں سے محفوظ رکھیں۔ کبھی کبھی یہ شک انسانی زندگی میں زہر گھول دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صاحبِ عالم مجبور ہوں اور وہ آپ کے سامنے اپنی مجبوریاں بیان کرنے سے گریز اختیار کر رہے ہوں۔''

''اگر انہیں کوئی مجبوری لاحق ہے تو مجھ سے کیوں چھپاتے ہیں؟'' ایک بار پھر ارجمند کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ ''مجھے اپنے غموں میں شریک کیوں نہیں کرتے؟''

''وہ ایک خود دار مرد ہیں۔'' ماہ رخ، شہزادہ خرم کی وکالت کر رہی تھی۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے غموں کا اظہار نہ کر کے آپ کو پریشانی سے بچانا چاہتے ہوں۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، ماہ رخ!'' ارجمند کے آنسوؤں کی روانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ''میں تو بس اتنا سمجھتی ہوں کہ مجھے شکست ہو گئی۔ اور وقت نے ایرانی شہزادی کے سر پر فتح کا تاج سجا دیا۔''

''آپ کو شکست نہیں ہوئی ہے۔'' ماہ رخ نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''یہ تو ایک عارضی جدائی کا موسم ہے۔ ناخوشگوار گرم ہوا کے جھونکے ایک نہ ایک دن گزر جائیں گے۔ باد بہاری پر صرف

آپ کا حق ہے اور وہ موسم بہار آنے ہی والا ہے۔"

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو ماہ رخ!" ارجمند بانو نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی آرزوؤں کا مرثیہ پڑھ چکی۔ اب یہ تو صدائے بازگشت ہے، جو کچھ دیر بعد خلاء وسعتوں میں گم ہو جائے گی۔ میں ایک وزیر زادی ہوں، شہزادے خرم کے ملازم کی بیٹی..... او وہ شاہِ ایران کی پوتی ہے۔ شہزادوں کے لئے صرف شہزادیاں ہی پیدا کی جاتی ہیں۔ میرا وجو محض راستے کا ایک پتھر تھا، جسے ٹھوکر مار کر ہٹا دیا گیا۔"

"بی بی! خدا کے لئے اپنے آپ پر رحم کرو۔" ماہ رخ نے ارجمند کے سامنے دونوں ہاتھ جو دیئے۔ "آپ صاحبِ عالم کی نظروں میں ایرانی شہزادی سے زیادہ بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔"

"میں تمہاری بات کیسے مان لوں ماہ رخ؟" ارجمند کی مایوسی کا وہی عالم تھا۔

"کیا آپ اپنے دل سے شہزادہ خرم کی یادوں کے نقوش مٹا سکتی ہیں؟" ماہ رخ نے ارجمند سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔" ارجمند نے کہا۔ "میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔"

"اسی کا نام فتح ہے۔" ماہ رخ نے ارجمند کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "فتح اور شکست کا تعلق دلوں سے ہے۔ آپ کے دل پر شہزادہ خرم کا قبضہ ہے، اس لئے وہ فاتح ہیں۔"

"اگر صاحبِ عالم فاتح ٹھہرے تو پھر شکست خوردہ کون ہوا؟" ارجمند نے سوال کیا۔

"شکست میں نے کھائی ہے ماہ رخ!"

"نہیں آقا زادی! شکست آپ کا مقدر نہیں ہے۔" ماہ رخ نے دلیل پیش کی۔ "صاحبِ عالم کے دل پر آپ کا قبضہ ہے، اس لئے آپ بھی فاتح ہیں۔ ایرانی شہزادی کو یہ فتح حاصل نہیں ہو سکتی۔"

"تمہارا یہ دعویٰ قبل از وقت ہے ماہ رخ!" ارجمند بانو نے غیر مطمئن لہجے میں کہا۔

"بی بی! یہ کنیز، محلاتِ شاہی کی راز دار ہے۔" اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتے وقت ماہ رخ کو شہزادہ پرویز کی بے وفائی یاد آ گئی تھی۔ "ان گناہ گار آنکھوں نے بڑے عجیب عجیب مناظر دیکھے ہیں۔ اگر شہزادہ خرم بے وفا ہیں تو اس دنیا میں کوئی وفادار نہیں۔ مجھے ایک بار صاحبِ عالم سے ملاقات کر لینے دیجئے۔ پھر میں آپ کو صحیح صورتِ حال بتا سکوں گی۔ مگر میرا دل اب بھی یہی گواہی دیتا ہے کہ وہ ناقابلِ بیان مجبوریوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہیں۔ ورنہ آپ تک ضرور پہنچتے۔"

ماہ رخ کی پُر اُمید باتوں سے ارجمند کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی تھی۔

ماہ رخ نے شہزادہ خرم سے ملنے کی کوشش کی مگر اسے بتایا گیا کہ صاحبِ عالم امورِ سلطنت میں مصروف ہیں۔ ماہ رخ شدید حیرت میں مبتلا تھی۔ اتنا بڑا حادثہ پیش آنے کے بعد شہزادہ خرم کی یہ خاموشی بہت معنی خیز ہوتی جا رہی تھی۔ مگر ماہ رخ نے اپنے ذہن کو اندیشوں سے پاک رکھا

اور حُسنِ ظن کا سہارا لئے ہوئے شہزادہ خرم کو تلاش کرتی رہی۔

پھر جب کئی دن کی دوڑ دھوپ کے بعد بھی شہزادے سے نہ مل سکی تو اس نے خرم کے دوست، سکندر مرزا کے مکان کا رخ کیا۔ قلعے کے ایک گوشے میں سکندر مرزا کا مکان تھا۔ عام مکانوں کی طرح وہاں ظاہری دلکشی کا عکس تک نہیں تھا۔ ہر طرف سادگی ہی سادگی نظر آ رہی تھی۔ ماہ رخ کو سکندر مرزا کی اس سادگی نے بہت متاثر کیا۔ ماہ رخ اندر داخل ہوئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ پورا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔

"زہے نصیب! کہ آپ غریب خانے پر تشریف لائیں۔" سکندر مرزا نے بڑے پُر جوش انداز میں ماہ رخ کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

ماہ رخ، سکندر مرزا کے لہجے کی وارفتگی پر چونک اُٹھی۔ "معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے ملنے نہیں آئی ہوں۔" ماہ رخ کا لہجہ بڑا جارحانہ تھا۔

سکندر مرزا کے چہرے پر خوشی کے جو آثار نمایاں ہوئے تھے، وہ دوسرے ہی لمحے بجھ کر رہ گئے تھے۔ پھر بھی اس نے اپنے ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں ماہ رخ؟..... آیئے، اندر تشریف لایئے۔" سکندر مرزا انتہائی شائستگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"آپ کو میری خیر و عافیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔" ماہ رخ کے لہجے میں وہی اجنبیت تھی۔ "میں صرف یہ دریافت کرنے آئی ہوں کہ شہزادہ خرم کہاں ہیں؟"

سکندر مرزا کا چہرہ اُتر گیا۔ اسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ ماہ رخ اس کے ساتھ اس قدر جارحانہ سلوک کرے گی۔

"صاحبِ عالم تک میرا پیغام پہنچا دیجئے کہ آج رات میں بارہ دری میں ان کا انتظار کروں گی۔" ماہ رخ نے خشک لہجے میں کہا۔ "مجھے مجبوراً یہاں تک آنا پڑا۔ اگر شہزادہ خرم سے میری ملاقات ہو جاتی تو میں ادھر کا رخ کبھی نہیں کرتی۔" ماہ رخ کی گفتگو بڑی حوصلہ شکن تھی۔

سکندر مرزا نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ "میں سمجھتا ہوں۔" سکندر مرزا کا لہجہ بہت شکستہ تھا۔ "مطمئن رہئے۔ صاحبِ عالم تک آپ کا پیغام پہنچ جائے گا۔"

دراصل ماہ رخ کے لئے سکندر مرزا کے دل میں نرم گوشے پیدا ہو گئے تھے اور آج وہ اس خوب صورت لڑکی کو اپنے مکان پر دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ سکندر مرزا کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ ماہ رخ بھی اس کی طرف متوجہ ہو رہی ہے۔ مگر جب ماہ رخ نے شدید بیگانگی کے لہجے میں گفتگو کی تو سکندر مرزا کے سارے خواب بکھر گئے۔ اور اب وہ حقائق کی دنیا میں تنہا کھڑا تھا۔

۞.....۞.....۞

پھر اسی رات خرم، بارہ دری کے ایک سنسان گوشے میں ماہ رخ سے ملا۔ "ارجمند تو ٹھیک ہیں؟" خرم کے لہجے میں بڑی بے قراری تھی۔

''میں صاحبِ عالم کو کئی دن سے تلاش کر رہی ہوں۔'' ماہ رخ نے شکایت کی۔

''ہم بہت مصروف تھے ماہ رخ!'' خرم نے اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''اتنے مصروف کہ ارجمند بانو کی مزاج پرسی کا وقت بھی نہیں ملا۔'' بظاہر ماہ رخ کا لہجہ بہت نرم تھا مگر اس میں ہزار تلخیاں پوشیدہ تھیں۔

شہزادہ خرم کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر بہت آہستہ لہجے میں بولا۔ ''سچ تو یہ ہے ماہ رخ! کہ ہم ارجمند بانو کا سامنا نہیں کر سکتے۔'' خرم کی آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ ''بہت کوشش کی کہ انہیں سب کچھ بتا دیں مگر ہم اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتے۔''

''کیا یہ سب کچھ آپ کی مرضی سے ہوا ہے؟'' ماہ رخ نے سوال کیا۔

''خدا عالم الغیب ہے..... وہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوا ہے۔'' شہزادہ خرم بہت پریشان اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''پھر تو آپ پر لازم تھا کہ پہلی فرصت میں ارجمند بانو سے مل کر انہیں صحیح صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کرتے۔'' ماہ رخ نے ادب و احترام کے ساتھ کہا۔ ''آپ نہیں جانتے کہ آقا زادی کس عذاب ناک کیفیت سے گزر رہی ہیں۔''

''ہمیں اندازہ ہے ماہ رخ!'' خرم بے قرار نظر آنے لگا۔ ''ہم سے زیادہ ان کے دل کی حالت کون سمجھ سکتا ہے؟''

''پھر بھی آپ ان سے مسلسل دُور رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' ماہ رخ نے جرح کے انداز میں کہا۔ ''اگر یہ دُوریاں، یہ فاصلے اسی طرح بڑھتے رہے تو اس کا کیا انجام ہوگا؟''

''ہمیں اس کا احساس ہے ماہ رخ!'' شہزادہ خرم نے انتہائی مضطرب لہجے میں کہا۔ ''مگر گردشِ وقت کو کیا کہیں، جس نے ہمیں مجرم بنا دیا ہے۔''

''صاحبِ عالم! آپ مجرم نہیں ہیں۔'' ماہ رخ نے شہزادہ خرم کے اس احساس کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ ''میں ارجمند بانو کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی ہوں۔ اگر آپ نے مزید تاخیر کی تو ان کی غلط فہمیاں کچھ اور بڑھ جائیں گی۔ پھر شاید وقت بھی اس کا ازالہ نہ کر سکے۔ ابھی زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اگر آپ اسی طرح احساسِ جرم کو پرورش کرتے ہوئے آقا زادی سے دور رہے تو یہ زخم ایک مستقل ناسور بن جائے گا۔ خدا کے واسطے آپ ہمت کر کے آگے بڑھیے۔ ارجمند بانو کے سامنے اپنی مجبوریاں بیان کیجئے۔ انہیں یہی شکایت ہے کہ آپ تنہا رہ کر سارے غم برداشت کر رہے ہیں۔''

''کیا تم ہماری مجبوریاں بیان نہیں کر سکتیں ماہ رخ؟'' شہزادہ خرم نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

''آقا زادی میری زبان نہیں سمجھتیں۔ اور انہیں سمجھنا بھی نہیں چاہئے۔'' ماہ رخ نے ایک مضبوط دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے سوا دنیا کا کوئی بھی شخص ان کی غلط فہمیاں دور نہیں

کر سکتا۔ اگر آقائے محترم، آصف خان بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کریں گے تو وہ زیادہ سے زیادہ خاموشی اختیار کر سکتی ہیں مگر ان کے ذہن میں پیدا ہونے والے اندیشے دور نہیں ہو سکتے۔''

''ماہ رخ! ہم ارجمند کے سامنے جاتے ہوئے شدید ندامت محسوس کرتے ہیں۔'' ایک بار پھر شہزادہ خرم اپنے آپ کو مجبور سمجھنے لگا۔

''یہ احساسِ ندامت کا وقت نہیں صاحبِ عالم!'' ماہ رخ نے کہا۔ ''اس مسئلے کا فوری حل کیجئے ورنہ ارجمند بانو کی زندگی کسی بھی خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے۔''

❀.....❀.....❀

دوسری رات ارجمند بانو اور شہزادہ خرم تنہائی میں اس طرح ملے کہ بہت دیر تک دونوں طرف گہرا سکوت طاری رہا۔

''ارجمند! ہماری مجبوریاں ناقابلِ بیان ہیں۔'' آخر شہزادہ خرم کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

ارجمند بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک مخصوص فاصلے پر خاموش کھڑی رہی۔

''ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اپنی آرزوؤں کی لاش پر کس طرح ماتم کریں؟'' شہزادہ خرم نے انتہائی شکستہ لہجے میں کہا۔

''نصیبِ دشمناں! صاحبِ عالم کو ماتم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس مرحلے پر ارجمند خاموش نہ رہ سکی۔

''ماتم تو وہ کرتے ہیں جو زندگی کے راستے پر تنہا رہ جاتے ہیں۔''

''تم تنہا نہیں ہو ارجمند!'' یہ کہتے ہوئے شہزادہ خرم کچھ اور قریب آ گیا۔ ''اب تک ہمارے دل پر تمہاری ہی حکمرانی ہے۔ پھر تم کس طرح اپنے آپ کو تنہا کہتی ہو؟..... تنہا تو ہم ہیں کہ آج ہمارے دل کی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں۔''

''یہ کیسی حکمرانی ہے کہ صاحبِ عالم میری صورت دیکھنے کے روادار نہیں۔'' ارجمند نے انتہائی کرب ناک لہجے میں شکایت کی۔ ''اگر ماہ رخ میری وکالت نہ کرتی تو شاید آج بھی صاحبِ عالم تشریف نہ لاتے۔''

''شاید ماہ رخ نے تمہارے سامنے ہماری مجبوریاں بیان نہیں کیں۔'' شہزادہ خرم نے کہا۔ ''اور اس بے چاری کو ہماری مجبوریوں کی خبر بھی تو نہیں۔ پھر وہ کیا کہتی اور کیونکر کہتی؟''

''مجبوریاں اپنی جگہ ہیں صاحبِ عالم! مگر آپ نے اس کنیز کو اپنی مجبوریوں میں شریک تو کیا ہوتا۔'' ارجمند مسلسل شکایتیں کر رہی تھی۔ ''آپ نے اس کنیز کے ظرف کو آزما کر تو دیکھا ہوتا۔ میں پھولوں کی سیج پر بھی آپ کی غم گسار ہوں..... اور زندگی کے خارزاروں میں بھی آپ کی شریکِ سفر۔''

''یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا ارجمند! کہ ہم اپنے ہوش میں نہیں رہے۔'' شہزادہ خرم نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہیں اپنی زندگی کے اس خوف ناک راز کا شریک بنانا چاہتے

تھے۔ مگر ایک نامعلوم خوف نے ہماری زبان پر مہر لگا دی۔"

"کیا خوف، صاحب عالم؟" ارجمند نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہی کہ تم اس تلخ حقیقت کا سامنا نہیں کر سکو گی۔ اور پھر ہماری ذات مختلف الزامات کا نشانہ بن جائے گی۔" خرم کے لہجے سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔ "ہم جس فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، وہاں "دل" اور "جذبات" نام کی کسی شے کا وجود نہیں ہوتا۔ ہماری دنیا سیاسی تقاضوں کے سوا کچھ نہیں۔ یقیناً تم نے بھی ہمارے بارے میں یہی رائے قائم کی ہو گی۔"

ارجمند لرز کر رہ گئی۔ اس کے امتحان کا وقت قریب آ گیا تھا۔ "میں بھی انسان ہوں صاحبِ عالم! وسوسے مجھے بھی پریشان کر سکتے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی غلط فہمیاں سر اُبھار سکتی ہیں۔ اور میرا دل بھی اندیشوں کے ہجوم میں گھر سکتا ہے۔ اگر آپ فوری طور پر اس کنیز کو شریکِ راز بنا لیتے تو غموں کی یلغار اتنی شدید نہ ہوتی۔" یہ کہہ کر ارجمند بانو رونے لگی۔

"احساسِ ندامت نے ہمیں تم سے دور رکھا ارجمند!" شہزادہ خرم، ارجمند کے آنسو دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ "ماہ رخ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں تمہارے قریب آنے کی ہمت دلائی ورنہ ہم اپنی جگہ طے کر چکے تھے کہ تمہیں زندگی بھر اپنی صورت نہیں دکھائیں گے۔"

بڑا جذباتی منظر تھا۔ ارجمند نے بے چین ہو کر خرم کے شانے پر سر رکھ دیا۔ "آخر وہ کون سی مجبوری تھی صاحبِ عالم! کہ جس نے آپ کو اتنا خوف ناک فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

ارجمند کے آنسو اس قدر تیزی سے بہہ رہے تھے کہ شہزادہ خرم بھی ان کی حرارت کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ "ہم سیاست کے مقتل میں ذبح کر دیئے گئے ارجمند!" شہزادہ خرم نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "ظلِ الٰہی نے حکومتِ ایران سے قریبی تعلقات قائم کرنے کے لئے ایرانی شہزادی کو ہم سے وابستہ کر دیا۔ ہم اس لڑکی کو جانتے تک نہیں تھے مگر اسے ہمارا مقدر بنا دیا گیا۔" شہزادہ خرم اپنی مجبوریوں کی داستان سنا رہا تھا۔ "ہم نے اس شادی سے انکار کر دیا تھا ارجمند! مگر عالم پناہ نے ہمارے پیروں میں اپنی اطاعت کی زنجیر ڈال دی۔" یہ کہتے کہتے شہزادہ خرم کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے تھے۔ "اگر ہم ظلِ الٰہی کا حکم نہیں مانتے تو ہمیں بھی شہزادہ خسرو کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔ پھر بتاؤ! ہم کیا کرتے؟"

ارجمند نے سر اُٹھایا اور کچھ دیر تک خرم کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھتی رہی، پھر اس نے اپنے آنچل میں ان موتیوں کو جذب کر لیا، جو دنیا کے سب سے قیمتی نگینے تھے۔

"آپ نے فرزندی کا حق ادا کر دیا۔" اب ارجمند کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی کے بجائے طوفان کے تیز دھاروں کا بہاؤ تھا۔ "آپ کو ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ میں آپ پر ناز کرتی ہوں کہ آپ نے فرمانبرداری کے اصولوں کا خون نہیں ہونے دیا۔ ورنہ آپ میں اور شہزادہ خسرو میں کیا فرق باقی رہ جاتا۔"

"بے شک! ہم اس محاذ پر سربلند رہے مگر دل کے محاذ پر ہمیں شکست فاش ہوئی ہے

ارجمند!" خرم کے لہجے کا ارتعاش ابھی تک باقی تھا۔

"کیا آپ نے اس کنیز کو فراموش کر دیا؟" ارجمند نے سوال کیا۔

"فراموش تو جب کرتے، جب تمہارے علاوہ بھی اس دنیا میں کوئی چہرہ موجود ہوتا۔" خرم نے اپنے دونوں ہاتھ ارجمند کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "خدا گواہ ہے کہ ہمیں تمہارے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

"پھر کیسے شکست ہوئی صاحبِ عالم؟" ارجمند کا لہجہ یکایک جذبات سے سرشار ہو گیا تھا۔ "حکومت اور سیاست دونوں کو شکست ہو گئی۔ فاتح تو وہ ہے صاحبِ عالم! جو دلوں کو فتح کر لے۔ میں فاتح ہوں، آپ فاتح ہیں..... اور باقی سب شکست خوردہ ہیں۔ وہ ہندوستان کا فرمانروا ہو یا شاہِ ایران۔"

"ارجمند! اب مجھے کسی لشکر اور کسی فوج کی ضرورت نہیں۔ میں صرف تمہاری محبت کی طاقت پر سیاست کی یہ جنگ لڑوں گا۔ اور پھر ایک دن ہندوستان کے یہ تخت و تاج تمہارے قدموں کے نیچے ہوں گے۔"

"میرا تخت و تاج تو آپ کے ہونٹوں کی ایک مسکراہٹ ہے۔" ارجمند کی مخروطی انگلیوں نے خرم کے ہونٹوں کو چھوا اور چند لمحوں کے لئے پوری کائنات کیف و نشاط کے سیل رواں میں غرق ہو گئی۔

۞.....۞.....۞

ارجمند اور شہزادہ خرم کی غلط فہمیاں دُور ہو گئی تھیں مگر جہانگیر نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ وہ شاہِ ایران کے ساتھ خاندانی رشتہ قائم کر کے ایک سیاسی چال چل رہا تھا تاکہ قندھار کا علاقہ ایرانی حکمران کی یورشوں سے محفوظ رہ سکے۔ 7 ستمبر 1609ء کو ایرانی شہزادی اور خرم کی نسبت طے ہوئی تھی۔ تقریباً ایک سال بعد 29 اکتوبر 1610ء کو شادی کی تقریب منعقد ہوئی اور شہزادہ خرم کے جذبات کو سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیا گیا۔

اس موقع پر جہانگیر، شہزادہ خرم کے گھر گیا اور رات بھر جشنِ طرب جاری رہا۔ جہانگیر نے اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے اکثر امراء کو نئے اعزازات اور قیمتی خلعت عطا کئے۔

وہ دن وزیراعظم آصف خان اور مہرالنساء پر بہت گراں تھا مگر دونوں کو شادی کی تقریب میں شریک ہونا پڑا۔ دونوں کے ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ تھی اور وہ شہنشاہ کے سامنے مصنوعی مسرتوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مہرالنساء نے مجبوراً سرخ جوڑا پہنا تھا اور تنہائی ملتے ہی جہانگیر کو بیٹے کی شادی پر مبارکباد پیش کی تھی۔

"شاہِ والا کا اقبال بلند ہو۔ اور یہ شادی، شہزادہ خرم کے لئے نئی مسرتوں کا پیغام لے کر آئے۔"

جہانگیر نے مسکراتے ہوئے مہرالنساء کی مبارکباد قبول کر لی تھی مگر وہ صاف محسوس کر رہا تھا

کہ مہرالنساء کا چہرہ ویران ہے اور لہجے سے کھوکھلے پن کا اظہار ہو رہا ہے۔

یہی حال وزیراعظم آصف خان کا تھا۔ اس نے شادی کی خوشی میں شہنشاہ کو قیمتی نذر پیش کی تھی اور بظاہر اپنے پُرجوش ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا تھا۔ مگر دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ وقفے وقفے سے آصف خان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے اور وہ کچھ دیر کے لئے کسی گہرے خیال میں کھو جاتا ہے۔ ایک باپ کی حیثیت سے اسے اپنی بیٹی ارجمند بانو کی شادی کا انتظار تھا۔ مگر وقت نے اچانک کروٹ لی تھی اور آصف خان کو ارجمند کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔

آصف خان نے کئی بار شہزادہ خرم کی طرف دیکھا۔ ولی عہد سلطنت غیر معمولی طور پر خاموش اور سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اہلِ محفل نے خرم کی اس خاموشی کو شہزادگی کے وقار سے تعبیر کیا مگر آصف خان اس تلخی اور غم کو محسوس کر رہا تھا، جو شہزادے کے چہرے پر پس پردہ موجود تھا۔

ارجمند بانو کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ وہ ایک سال تک بڑی جرأت اور حوصلے کا مظاہرہ کرتی رہی مگر شادی کے دن آنسوؤں کا وہ سیلاب آ گیا، جس پر ارجمند نے کئی مضبوط بند باندھے تھے۔ وہ صبح سے مسلسل رو رہی تھی۔ ماہ رخ، ارجمند کو بار بار تسلیاں دے رہی تھی مگر اس طرح کہ خود اس کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔ ایک تو آقا زادی کا غم اور دوسرے اپنی یادوں کی خلش۔ شہزادہ پرویز نے اسے بھی اسی دن کے خواب دکھائے تھے۔ پھر جب وہ دونوں روتے روتے نڈھال ہو گئیں تو ماہ رخ نے ارجمند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بی بی! کب تک روتی رہو گی؟ حضرت شیخ کے مزار پر ہی چلئے کہ وہاں کچھ تو سکون ملے گا۔''

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار کا نام سن کر ارجمند چونک اُٹھی اور اس کے بہتے ہوئے آنسو اچانک تھم گئے۔ ''ہاں! میں وہاں ضرور جاؤں گی۔ مجھے مبارک شاہ قلندر سے ملنا ہے۔'' ارجمند بانو ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر نکلی اور اپنے ذاتی خدمت گار کو حکم دیا کہ رتھ تیار کرے۔

پھر ارجمند بانو نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار پر پہنچ کر فاتحہ پڑھی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو دوبارہ آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار جاری ہو گیا۔ ''اے خدا! تُو ہی میرے ساتھ انصاف کرنے والا ہے۔ شہزادہ خرم کو اپنی حفاظت میں رکھ اور مجھ ناتواں کو صبر و استقامت دے۔''

ارجمند بانو دعا مانگ کر واپس آئی تو مبارک شاہ قلندر اسی انداز میں سر رہ گزر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر جیسے ہی ارجمند، قلندر کے نزدیک پہنچی، وہ اضطراب کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔

''لوگو! ہٹ جاؤ..... ہندوستان کی ملکۂ عالیہ تشریف لا رہی ہیں۔'' اگرچہ ارجمند گہرے نقاب میں پوشیدہ تھی، لیکن قلندر کی عارفانہ نظروں نے اسے پردے کے باوجود پہچان لیا تھا۔

''بابا! آپ بھی میری بے بسی کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔'' قلندر کی زبان سے ملکۂ عالیہ کا لفظ سن کر ارجمند ایک بار پھر رونے لگی۔

''کیسی بے کسی؟ اور کیسا مذاق؟'' قلندر نے ارجمند کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں تو وہی کہتا ہوں جو میری آنکھیں دیکھتی ہیں۔''

ارجمند کے بجائے ماہ رخ نے کہا۔ ''بابا! کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ آج شہزادہ خرم کی شادی ہو رہی ہے۔''

''دیکھ رہا ہوں۔'' مبارک شاہ نے انتہائی شفقت سے ارجمند کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی کچھ بھی کر لے، مگر آسمانوں کے فیصلے تبدیل نہیں ہوتے۔''

''بابا! یہ کیسے فیصلے ہیں؟'' ارجمند سسکنے لگی۔

''خبردار! آئندہ اپنے ہونٹوں کو اس طرح جنبش نہ دینا۔'' قلندر نے تیز لہجے میں کہا۔ ''خدا کے شکرگزار بندے بنو اور اس وقت تک صبر کرو، جب تک آسمان کا فیصلہ زمین پر نازل نہ ہو جائے۔ دستِ قدرت جسے چاہے، تاجِ شاہانہ پہنا دیتا ہے۔ اسے کوئی نہیں اُتار سکتا۔ تُو ارجمند ہے اور آخری سانس تک ارجمند ہی رہے گی۔''

❀.....❀.....❀

شادی کے پندرہ دن بعد جہانگیر نے شیر کا شکار کھیلنے کی خواہش ظاہر کی۔ شہزادہ خرم سیر و تفریح سے دُور رہنا چاہتا تھا مگر شہنشاہ کے حکم پر اسے بھی شکاریوں کی جماعت میں شامل ہونا پڑا۔ اس وقت انوپ رائے، شکاریوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ شہنشاہ کے ہمراہ شہزادہ خرم، راجہ رام داس، حیات خان اور اعتماد رائے کے علاوہ چند میرِ شکار بھی تھے۔

اچانک انوپ رائے نے ایک درخت کے نیچے ایک مردہ بیل دیکھا، جسے شیر آدھا کھا چکا تھا۔ اس بات کی اطلاع فوراً شہنشاہ کو دی گئی۔ جہانگیر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پورے جوش و خروش کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا۔ شاہی گھوڑا، شیر کی بُو پا کر بھڑکنے لگا۔ جہانگیر گھوڑے سے اُترا اور شیر پر بندوق چلائی۔ شہنشاہ کا پہلا نشانہ خطا گیا مگر دوسرے نشانے سے شیر زخمی ہو کر بھاگا اور ایک میرِ شکار کو ہلاک کر کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ کمال قراول، شہنشاہ کے پیچھے کھڑا بندوق بھر رہا تھا کہ یکایک شیر جہانگیر پر حملہ کرنے کے لئے اُٹھا اور اس غیر متوقع حملے سے گھبرا کر شکاری بھاگے اور ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ دو تین افراد تو گھبراہٹ میں شہنشاہ کے اوپر سے گزر گئے۔ کمال قراول اور اعتماد رائے نے جہانگیر کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اس اثناء میں انوپ رائے، شیر کی زد میں آ گیا۔ شیر نے اس کے دونوں ہاتھ چبا ڈالے۔ اس سے پہلے کہ وہ جنگلی درندہ، انوپ رائے کو ہلاک کر ڈالتا، شہزادہ خرم نے بڑی تیزی سے شیر کی کمر پر تلوار کا وار کیا۔ وار اس قدر شدید تھا کہ خرم کی تلوار، شیر کی پسلیوں کو کاٹتی ہوئی شکم تک اُتر گئی۔ شیر نیم جاں ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی صالح مشعلچی کو ہلاک کرتا ہوا بھاگا اور چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے ایک جگہ جا کر گر پڑا۔ جہانگیر نے گھوڑے پر سوار ہو کر بندوق کی تیسری گولی داغ دی اور زخمی شیر نے

کچھ دیر تک سسکنے کے بعد دم توڑ دیا۔

بعد میں شہنشاہ نے اپنے ہمراہیوں سے پوچھا۔ ''وہ کون مردِ شجاع تھا، جس نے اپنی تلوار سے شیر کی پسلیاں کاٹ کر اسے نیم جاں بنا دیا تھا؟''

سب لوگ خاموش کھڑے تھے۔ آخر حیات خان نے زبان کھولی۔ ''وہ صاحبِ عالم کی شمشیرِ آب دار تھی، جس نے شیر کا کام تمام کر ڈالا اور جہاں پناہ اس درندے کے حملے سے محفوظ رہے۔''

''مگر فرزند! تم خاموش کیوں رہے؟'' جہانگیر نے خرم سے سوال کیا۔

''ظلِ الٰہی! یہ تو ایک ادنیٰ خدمت تھی۔'' خرم نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہا۔

''خرم! تم پر آفرین۔ ہزار بار آفرین۔'' جہانگیر، بیٹے کی اس شجاعت اور انکسار پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

پھر خرم کی جاں نثاری اور مردانگی سے متاثر ہو کر جہانگیر نے شہزادے کو دس ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا کیا۔

جب یہ خبر عام ہوئی تو وزیرِ اعظم آصف خان نے شہنشاہ اور شہزادے کے نام پر غریبوں میں خیرات تقسیم کی۔

ارجمند کو یہ خبر ملی تو وہ کچھ دیر تک سکتے کی حالت میں بیٹھی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ اپنے خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گئی۔ ''اے سارے جہانوں کے پالنے والے! صاحبِ عالم پر آنے والی ہر مصیبت کو اس کنیز کے مقدر میں لکھ دے۔''

بہت دیر تک گریہ وزاری کرنے کے بعد ارجمند نے ماہ رخ کو چاندی کے سینکڑوں روپے دے کر مبارک شاہ قلندر کے پاس بھیجا کہ وہ رقم اپنے ہاتھ سے غریبوں میں تقسیم کر دیں۔

مبارک شاہ نے روپے تقسیم کرنے کے بعد ماہ رخ سے کہا۔ ''ملکۂ ہند کو ہمارا سلام کہنا کہ ہم جیسے عاجز بندے بھی ان ہی کی مملکت میں رہتے ہیں۔''

قلندر کی زبان سے ملکۂ ہند کے الفاظ سن کر ایک بار ارجمند کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے اور ان آنسوؤں میں ایرانی شہزادی کی پرچھائیاں اُبھرنے لگیں، جو اس وقت شہزادہ خرم کے قریب تر تھی۔

۞.....۞.....۞

روز و شب کا قافلہ اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔

شہزادہ خرم کی شادی کو تقریباً سات ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران مہرالنساء کے دن شدید اضطراب کا شکار تھے اور راتیں بے خوابی کے عالم میں گزر رہی تھیں۔ شہنشاہ جہانگیر اس کی طرف سے غافل نہیں تھا مگر مسلسل بے نیازی اور بے رخی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

مہرالنساء اس سرد مہری کو برداشت نہ کر سکی اور اس کے اعصاب ٹوٹ گئے۔ آخر ایک روز اس نے اپنی زندگی کا سب سے زیادہ نازک فیصلہ کر لیا اور وہ نصف شب کے قریب تیز قدموں سے خلوت گاہِ شاہی کی طرف بڑھنے لگی۔ مہرالنساء کے چہرے کی سرخی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے حُسن کے سحر سے گزرتے ہوئے وقت کی رفتار کو روک دینا چاہتی تھی۔

مہرالنساء، خلوت گاہِ شاہی کے قریب پہنچی۔ درباری مطربہ انجمن آراء اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ انجمن آراء فطری طور پر مہرالنساء سے بہت حسد رکھتی تھی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ شہنشاہ جہانگیر، مہرالنساء سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ انجمن آراء خود بھی برسوں سے جہانگیر کی بیوی بننے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ مہرالنساء کے لئے اپنے محبوب کے اس التفات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ درباری مطربہ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ جہانگیر اسے نظر انداز کر کے کسی دوسری عورت کی محبت میں دیوانگی کی حد تک پہنچ جائے۔ مگر وہ چپ چاپ یہ تماشا دیکھنے پر مجبور تھی۔ شہنشاہوں کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے؟ اگر ایک بار بھی انجمن آراء کی زبان لڑکھڑا جاتی تو شاید اسے تمام عمر کے لئے قوتِ گویائی سے محروم ہو جانا پڑتا۔ نتیجتاً انجمن آراء اندر ہی اندر کسی شمع کی مانند پگھل رہی تھی۔

مہرالنساء کو دیکھ کر اُس کے جذبہ حسد نے ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ کروٹ لی اور انجمن آراء کے دل و دماغ میں دھواں سا بھر گیا۔ لیکن وہ اپنی نفرتوں کا اظہار کرنے کے لئے زبان کو جنبش نہ دے سکی۔ درباری مطربہ نے اپنے ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ سجائی اور شہنشاہ کی محبوبہ کی طرف دیکھنے لگی، جس نے غیر متوقع طور پر آج سرخ گہرے رنگ کا جوڑا پہنا تھا۔

''انجمن! کیا شاہِ والا جاگ رہے ہیں؟'' مہرالنساء کے لہجے میں بڑا غرور اور نازِ دلربائی تھا۔

''شاید۔'' انجمن آراء نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو پھر جہاں پناہ کو خبر دے کہ مہرالنساء، ملاقات کی درخواست لے کر آئی ہے۔'' اگرچہ مہرالنساء نے عاجزانہ الفاظ استعمال کئے تھے، لیکن اس کے چہرے پر ناز و غرور کی ایک عجیب سی قندیل روشن تھی۔

انجمن آراء کسی شکست خوردہ عورت کی طرح بارگاہِ شاہی میں داخل ہوئی۔ اس وقت جہانگیر بستر پر لیٹ کر کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ درباری مطربہ نے مہرالنساء کی آمد کی خبر دی تو شہنشاہ تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''انہیں فوراً اندر بھیج دو۔'' جہانگیر کے لہجے میں بڑا اشتیاق تھا۔

انجمن آراء تھکے قدموں سے باہر آئی۔ ''ظلِ الٰہی آپ کے منتظر ہیں۔'' درباری مطربہ نے بڑے ادب کے ساتھ کہا۔ مگر یہ کہتے کہتے اس کا دل خون ہو گیا تھا۔

آج مہرالنساء نے اپنی آرائش کا خاص اہتمام کیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سرخ جوڑے میں ملبوس تھی۔ جہانگیر اسے چند لمحوں تک دیکھتا ہی رہ گیا۔ مہرالنساء کا سراپا ایک دہکتا ہوا انگارہ محسوس ہو رہا تھا۔ شیر افگن کی بیوہ کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عورت اپنے بجھے ہوئے

ارمانوں کی راکھ ہے۔ مہرالنساء کے چہرے اور لباس پر جذبوں کی تیز آگ بھڑک رہی تھی۔

''مہرو! یہ سب کچھ کیا ہے؟'' جہانگیر نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''شاہِ والا! میں نے آپ کی خاطر اپنی بیوگی کا کفن جلا ڈالا۔'' یہ کہتے ہوئے مہرالنساء آگے بڑھی اور جہانگیر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ''آپ کی ضد تھی کہ میں اپنی حسرتوں کا ماتم ترک کر دوں۔''

''ہاں! ہم بھی یہی چاہتے تھے مہرو!'' جہانگیر کا لہجہ حیرت انگیز طور پر بہت سرد تھا۔ ''تم نالہ وفغاں اور ماتم کے لئے نہیں پیدا کی گئی تھیں۔ تم تو خود زندگی کا حسین ترین نغمہ ہو۔''

''میں نے جہاں پناہ کے لئے اپنی زندگی کا چلن بدل دیا۔'' مہرالنساء نے جہانگیر کے پیروں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

جہانگیر جو بستر پر نیم دراز تھا، یکایک سیدھا ہو گیا اور اس نے اپنے پاؤں کھینچ لئے۔ ''نہیں مہرو! تم اس شرط سے مستثنیٰ ہو۔ تم پر سجدہ لازم نہیں ہے۔'' جہانگیر حُسنِ مغرور کو اتنے قریب پا کر بہت زیادہ جذباتی ہو گیا۔ ''مگر مہرو! تم نے بہت دیر کر دی۔'' آخر جہانگیر کی زبان پر کئی شکوے مچل گئے۔

مہرالنساء، شہنشاہ کے اس طرزِ کلام پر چونک اُٹھی۔ ''جہاں پناہ! ابھی دیر کہاں ہوئی ہے؟'' ناگہاں مہرالنساء کے چہرے پر مایوسیاں جھلکنے لگی تھیں۔

''تم نے آنے میں بہت دیر کر دی مہرو!'' جہانگیر اپنے الفاظ دہرا رہا تھا۔ ''تمہیں کیا خبر کہ اس کشمکشِ انتظار نے ہمیں تھکا ڈالا ہے۔ ہمارے کیسے قیمتی سال تمہاری راہ تکتے ہوئے گزر گئے۔ وہ روز و شب، جن میں ہماری ناآسودہ حسرتوں کا خون ٹپکتا رہا، ان کا حساب ہم کس سے طلب کریں؟ کیسے کیسے شعلہ بار جذبے دھواں ہو گئے اور کیسی کیسی آتش ریز تمنائیں راکھ بن گئیں۔ ہائے، وہ ہمارے مضطرب دن..... اور وہ بے خواب راتیں..... ہم ان ساعتوں کو کس طرح آواز دیں؟ اور اب وہ لمحے کس طرح پلٹ کر آئیں گے؟''

مہرالنساء، جہانگیر کے کچھ اور قریب ہو گئی۔ ''شاہِ والا! آپ کی یہ کنیز گردشِ ایام کا رخ پیچھے کی طرف موڑ دے گی۔'' مہرالنساء کا لہجہ جذبات سے سرشار تھا۔ ''میں ایک ایک لمحے کا حساب دوں گی۔'' مہرالنساء، جہانگیر کے اتنے قریب تھی کہ زلفِ خم شدہ کی خوشبو سے جہانگیر کے دل و دماغ مہک اُٹھے تھے۔ ''شاہِ والا! یہ کنیز گزرے ہوئے ایک ایک لمحے کا قرض اتار دے گی اور آنے والی ایک ایک ساعت، وفا کی تاریخ میں زندۂ جاوید ہو جائے گی۔''

''خسرو کی مسلسل غداری کے بعد دنیا پر سے ہمارا اعتبار اُٹھ گیا ہے۔'' ان پُرکیف اور مسحور کُن ساعتوں میں بھی جہانگیر کا لہجہ کرب ناک تھا۔

''نہیں شاہِ والا! ساری دنیا غدار اور بے وفا نہیں ہے۔'' مہرالنساء، جہانگیر پر اپنی محبت لٹا رہی تھی تاکہ شہنشاہ کے دل و دماغ سے خلش اور تلخیوں کے اثرات زائل ہو جائیں۔

جہانگیر کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے مہرالنساء کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بہت مدھم لہجے میں بولا۔ ''شاید ایسا ہی ہو۔ مگر ہمارے تجربات نے ہمیں مایوسی کی آخری حدوں تک پہنچا دیا ہے۔''

''نہیں ظلِ الٰہی! ابھی آپ کے کچھ جانثار زندہ ہیں۔'' مہرالنساء بڑی وارفتگی کے عالم میں بول رہی تھی۔ ''پہلے جاں نثاروں کو قربان تو ہو جانے دیجئے، پھر مایوسی کی باتیں کیجئے گا۔''

جہانگیر کی اُداسیاں زائل ہو گئیں۔ اور پھر وہ بھی جذبات میں سرشار نظر آنے لگا۔ ''مہرو! تم نے ہماری خاطر اپنی مجبوریوں کا حصار توڑ دیا۔ ہم تمہارے بہت شکرگزار ہیں۔ اب تم آ گئی ہو تو شاید اہلِ وفا کا کھویا ہوا اعتبار لوٹ آئے۔''

''یقیناً ایسا ہی ہو گا شاہِ والا!'' مہرالنساء اپنی کامیابیوں کے تصور سے کسی پھولوں بھری شاخ کی طرح جھومنے لگی تھی۔

۞.....۞.....۞

وہ رات کیف و نشاط کی رات تھی۔ حُسن کی کامرانیوں کی رات..... عشق کی فتوحات کی رات..... مہرالنساء نے شہنشاہ کا مطالبہ تسلیم کر لیا تھا اور وہ جہانگیر سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ آج فرمانروائے ہند بہت خوش تھا کہ اس نے اپنی زندگی کی بساط پر عشق کی بازی بھی جیت لی تھی۔ خلوت گاہِ شاہی میں ہر طرف مسرتیں رقص کر رہی تھیں۔ خوشی کے ان لمحات میں نیا رنگ بھرنے کے لئے مہرالنساء نے ساقی گری کے فرائض انجام دیئے۔ اس سے پہلے بھی مہرالنساء، جہانگیر کو شراب پیش کر چکی تھی مگر آج جب اس نے جامِ سرخ لبریز کر کے جہانگیر کی طرف بڑھایا تو عشرت کدے کی پوری فضا ایک عجیب سے سرور میں ڈوب گئی۔

''اب ہمیں اس دنیا سے کچھ نہیں چاہئے۔'' جہانگیر نے مخمور نظروں سے مہرالنساء کی طرف دیکھا۔ ''ہم اپنی تقدیر پر نازاں ہیں مہرو! کہ تم جیسی خاتون ہمارے شبستانِ محبت میں جلوہ افروز ہیں۔''

''نہیں شاہِ والا! یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ ایک کنیز عام محفلوں سے گزر کر جہاں پناہ کے نہاں خانۂ دل تک پہنچی۔'' مہرالنساء کچھ اور بے تکلف ہو گئی تھی۔ ''اگر ظلِ الٰہی مجھ ستم رسیدہ پر نظرِ کرم نہ کرتے تو میں ساری عمر بیوگی کی قبا پہنے ہوئے ایک تاریک گوشے میں اپنی خوں شدہ حسرتوں کا ماتم کرتی رہتی۔ یہ تو شاہِ والا کی عنایتِ خاص ہے کہ ایک ذرّہ کو اُٹھا کر آفتاب بنا دیا۔ جس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے شمار لوگ ترستے رہتے ہیں، آج وہی محبوب میرے اتنے قریب ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا عالم پناہ!'' مہرو کچھ اور بے حجاب ہو گئی تھی۔

''یہ سود و زیاں کے حساب کا وقت نہیں مہرو!'' شدتِ جذبات سے جہانگیر کی آواز لڑکھڑا

رہی تھی۔ ''اپنے تکلیف دہ ماضی کو فراموش کر دو اور صرف حال پر نظر رکھو۔ وہ حال، جس کا دام فتوحات سے بھرا ہوا ہے۔ تم نے اس شخص کو فتح کر لیا، جسے آج تک کوئی شکست نہیں دے سکا یہ تمہارا حُسنِ جہاں سوز ہے مہرو! جو تسخیر کی بے پناہ قوت رکھتا ہے۔ ہم اپنا سب کچھ ہار گئے اب نہ ہوش و خرد ہمارے ہیں اور نہ یہ دلِ وحشی۔ سب کچھ تمہاری نذر کر دیا۔ ہمارے جذبات کی سوغات کو اپنے آنچل میں سمیٹ لو کہ یہ وقت کبھی کبھی آتا ہے۔ ہم مے خانۂ ہند کے مالک ہوتے ہوئے بھی بہت پیاسے ہیں۔ تمہارے اندازوں سے بھی زیادہ پیاسے۔ یہاں جو بھی آ ہے، اس کی آنکھوں میں دولت و اقتدار کے خواب روشن ہوتے ہیں۔ ہماری طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ کاش یوں ہوتا کہ کوئی ماہ وش صرف نورالدین جہانگیر سے محبت کرتا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں تاج و تخت کی ہوس کے شعلے نہ بھڑکتے۔ وہ آنکھیں بس ہمارے لیے وقف ہو کر رہ جاتیں۔ مہرو! تم بھی ان حسین آنکھوں کو دولت و اقتدار کے خوابوں سے بچائے رکھنا۔ ہم نے ان آنکھوں پر بہت اعتبار کیا ہے۔''

آج جہانگیر نے اپنی شخصیت کے سارے لبادے اُتار پھینکے تھے اور اب وہ ایک عام انسان نظر آ رہا تھا۔ بے لوث اور بے غرض، محبت کو ترسا ہوا انسان۔

مہرالنساء نے بہت غور سے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ شہنشاہ کی آنکھوں میں نشے کی دھند کے ساتھ محرومیوں کا گہرا عکس بھی موجود تھا۔

''اس کنیز کو تاج کی کوئی خواہش نہیں۔'' مہرالنساء نے اپنے پُرفریب اندازِ گفتگو سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تو صرف جہاں پناہ کی خدمت کے لئے حرمِ شاہی میں داخل ہونا چاہتی ہوں۔''

''ہم جانتے ہیں مہرو! کہ تمہاری زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف سچ ہے۔'' جہانگیر نے مہرالنساء کے دعوے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ جہانگیر جانتا تھا کہ اگر مہرالنساء کو تخت و تاج کی ہوس ہوتی تو وہ پہلے دن ہی اس کے قدموں میں خم ہو چکی ہوتی۔

''مگر عالم پناہ! مجھے اپنی بیٹی، لاڈلی بیگم کی فکر ستا رہی ہے۔'' مہرالنساء نے بڑی ہوشیاری سے نیا موضوع چھیڑ دیا تھا۔ ''وہ بے سہارا بچی کہاں جائے گی؟ بس میں یہی سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں کہ دنیا والے مجھے کیا کہیں گے؟''

''کیا کہیں گے دنیا والے؟'' جہانگیر نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''یہی کہ کیسی خود غرض ماں ہے۔'' مہرالنساء کی آواز سے گہری اُداسی جھلک رہی تھی۔ ''جوان لڑکی گھر میں بیٹھی رہے اور ماں دوسری شادی کر لے۔ یہ کیسی شرم ناک بات ہوگی، شاہِ والا!..... یہی سوچ کر میں اکثر لرز جاتی ہوں۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے بھیانک اور سیاہ دن ہوگا، جب سارے زمانے کی اُنگلیاں میری طرف اُٹھیں گی اور لوگ کہیں گے کہ وہ جا رہی ہے، خود غرض ماں جس نے جوان بیٹی کو فراموش کر کے اپنے سہاگ کی سیج سجا لی۔''

مہرالنساء کی گفتگو سن کر جہانگیر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بہت دیر تک غور و فکر کرنے

کے بعد ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ ہم لاڈلی بیگم کو تنہا چھوڑ دیں گے یا کسی معمولی آدمی سے اس کی شادی ہو جائے گی؟''

''مجھے شاہِ والا کی اعلیٰ ظرفی سے یہی اُمید ہے کہ وہ میری بیٹی کو اس بے رحم دنیا میں بے سہارا نہیں چھوڑیں گے۔'' مہرالنساء آج کی رات اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کے مستقبل کا بھی فیصلہ کر دینا چاہتی تھی۔

''تمہاری بیٹی کو ہم کسی بھی شہزادے سے منسوب کر سکتے ہیں۔'' آخر جہانگیر نے مہرالنساء کے دل کی بات کہہ دی۔

''شاہِ والا کا اقبال بلند ہو۔'' مہرالنساء فرطِ محبت سے بے اختیار ہو گئی تھی۔ ''آج مجھے یقین آ گیا کہ عالم پناہ میرے جذبات کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔''

''جذبات کا خیال نہیں مہرو! یہ تو بہت معمولی الفاظ ہیں۔'' جہانگیر نے سرشار لہجے میں کہا۔ ''ہم تو تمہاری ایک مسکراہٹ پر حکومتِ ہند کو قربان کر سکتے ہیں۔''

''آج یہ سرفرازی ہندوستان میں کس عورت کو حاصل ہے؟'' مہرالنساء، شہنشاہ کی آغوش میں سمٹ گئی۔

''ہم تمہیں اپنی محبت سے فتح کرنا چاہتے تھے مہرو!'' جہانگیر کیف و نشاط کی عجیب منزلوں سے گزر رہا تھا۔ ''اگر ہم طاقت کا مظاہرہ کرتے تو بہت پہلے تمہیں حرمِ شاہی میں داخل کیا جا چکا ہوتا۔ لیکن یہ ہماری شکست ہوتی۔ محبت کے محاذ پر شمشیر و سناں کام نہیں آتے۔ یہ تو صرف جذبات کی جنگ ہوتی ہے۔ اگر جذبے سچے ہوں تو فتح انسان کے قدم چومتی ہے۔''

''آپ نے مہرالنساء کو فتح کر لیا جہاں پناہ!'' مہرالنساء پر سرخوشی طاری تھی اور وہ خیالوں کی دنیا میں اپنے سر پر جگمگاتا ہوا تاج دیکھ رہی تھی اور تاحدِ نظر اس کے احترام میں بے شمار انسان سر جھکائے کھڑے تھے۔

❀.....❀.....❀

جہانگیر اور مہرالنساء کی شادی نے آگرہ کے باشندوں کو حیران کر دیا۔ بے خبر عوام سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شہنشاہ ایک عام سی عورت سے شادی کر لے گا۔ لیکن رازدار حلقے جانتے تھے کہ مہرالنساء کوئی عام عورت نہیں۔ وہ شاہی بیگمات میں سب سے زیادہ خوبصورت اور ذہین تھی۔ پھر یہ کہ شہنشاہ اپنی نوجوانی کے عشق کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ یہ جہانگیر کی بڑی فتح تھی، جو اس نے انتہائی صبر و تحمل اور طویل انتظار کے بعد حاصل کی تھی۔

درباری حلقے جو مہرالنساء کو شکست خوردہ سمجھ رہے تھے، انہیں اندازہ نہیں تھا کہ مہرالنساء نے اس محاذ پر کیسی شاندار فتح حاصل کی ہے۔ بمن آرا کا شوہر شیر افگن زندہ ہوتا تو وہ زیادہ سے زیادہ کسی صوبے کے حاکم کی بیوی کہ ب بیوہ کی خوش نصیبی کا یہ عالم تھا کہ مہرالنساء،

ہندوستان کے بے شمار انسانوں کی تقدیر بننے والی تھی۔ کہاں وہ بے کسی کی حالت کہ اس کے ہونٹوں پر آہ و فغاں کے سوا کچھ نہیں تھا اور کہاں یہ صورت کہ اس کی ایک مسکراہٹ پر جہانگیر حکومتِ ہند بھی قربان کر سکتا تھا۔

شہنشاہ نے اس موقع پر بے شمار قیدی رہا کئے تھے اور غریب بستیوں پر چاندی کے سکوں کی بارش کر دی تھی۔ امراء نے اپنے حکمراں کو قیمتی نذریں پیش کی تھیں اور جواب میں شہنشاہ نے انہیں بڑے اعزازات سے نوازا تھا۔

پھر جب مہرالنساء مرصع سرخ جوڑے میں ملبوس، شاہی کنیزوں کے ساتھ جہانگیر کے خلوت کدے میں داخل ہوئی تو پورا محل روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور در و دیوار پر کیف و نور کی برسات ہو رہی تھی۔ آج تک آگرہ کا قلعہ اس انداز میں نہیں سجایا گیا تھا۔ ایک ایک گوشے کی آرائش سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے جہانگیر نے عظیم الشان فتح حاصل کی ہو۔ ایسی فتح جو آج تک کسی مغل بادشاہ کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ یہ جہانگیر کے جذبات کی وارفتگی تھی، جس نے مہرالنساء سے شادی کرنے کے بعد اس تقریب کو یادگار بنا دیا تھا۔

جب شاہی کنیزیں، مہرالنساء کو جہانگیر کی خلوت گاہ میں چھوڑ کر واپس جانے لگیں تو شہنشاہ نے کنیزوں سے پوچھا۔

''انجمن آراء کہاں ہیں؟''

کنیزوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو جہانگیر کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے۔

''انجمن آراء اب تک ہماری بارگاہ میں حاضر نہیں ہوئی اور نہ اس نے کوئی نذر پیش کی۔ آج کی رات ہماری زندگی کی سب سے حسین رات ہے۔ آج رات اسے نغمۂ بہار چھیڑنا ہوگا۔ تلاش کرو کہ انجمن آراء کہاں ہے؟''

کنیزیں فوراً سر جھکائے ہوئے باہر نکل گئیں اور انجمن آراء کو تلاش کرنے لگیں۔ مگر درباری مطربہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ پھر جب انجمن آراء کو اس کے مخصوص کمرے میں تلاش کیا گیا تو شاہی کنیزوں کی چیخیں نکل گئیں۔ درباری مطربہ اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کے منہ سے بہنے والا خون گردن اور سینے پر جم کر رہ گیا تو انجمن آراء کی آنکھیں اس طرح کھلی ہوئی تھیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ چہرے پر شدید اذیت و کرب کی علامتیں نمایاں تھیں، جیسے اسے بہت تکلیف کے عالم میں موت آئی ہو۔

کنیزوں نے شہنشاہ کو درباری مطربہ، انجمن آراء کی موت کی خبر دی تو جہانگیر سناٹے میں آ گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟..... انجمن آراء کس نے ہماری خلوت میں نغمہ سرائی کی تھی۔ اُسے کوئی مرض نہیں تھا۔'' کنیزوں سے پوچھ رہا تھا۔

''شاہِ والا! انجمن آراء کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔'' کنیزوں نے جہانگیر کو بتایا۔ ''ایسا لگتا ہے، جیسے اسے زہر دیا گیا ہے۔''

زہر کے نام پر جہانگیر چونک اُٹھا۔

''کیا قلعے کے رہنے والوں میں سے کوئی شخص یہ جرأت کر سکتا ہے کہ وہ انجمن آراء کو زہر دیدے؟'' شہنشاہ نے قہرناک لہجے میں کہا۔ ''کیا اس کے قاتل کو یہ نہیں معلوم کہ انجمن آراء کون ہے؟''

شاہی کنیزیں سر جھکائے کھڑی رہیں۔

''ہم خود انجمن آراء کی لاش دیکھیں گے اور پھر اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے۔'' جہانگیر یہ کہہ کر آگے بڑھا۔

''جہاں پناہ! آج کی رات کسی کا جنازہ دیکھنا کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔'' مہرالنساء نے شہنشاہ کو روکتے ہوئے کہا۔

''نہیں مہرو! ہم انجمن آراء کو دیکھنے ضرور جائیں گے۔'' جہانگیر نے اُداس لہجے میں کہا۔

''بے شک! آج کی رات یہ اچھی خبر نہیں ہے مگر ہم انجمن آراء کو اس طرح بے آسرا نہیں چھوڑ سکتے۔ اس نے کئی سال اپنے شہنشاہ کی خدمت انجام دی ہے۔ جب ہمیں چاروں طرف سے اُداسیاں گھیر لیتی تھیں، اس وقت انجمن آراء ہی اپنے جانفزا نغموں سے ہمارا دل بہلایا کرتی تھی۔ آج ہماری دنیا کی سب سے دلکش آواز کا خاتمہ ہو گیا۔ ساز ٹوٹ گیا اور نغمے بکھر گئے۔ ہمیں نغموں کی موت کا بہت غم ہے۔''

مہرالنساء کا شاداب چہرہ بجھ کر رہ گیا۔ وہ شہنشاہ کے حضور اپنے جذبوں کا اظہار تو نہ کر سکی لیکن اس کے دل میں انجمن آراء کے لئے نفرتوں کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ ''بدنصیب کی موت نے کیسی خوبصورت رات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔'' مہرالنساء دل ہی دل میں اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ اور جہانگیر عشرت کدے سے نکل کر انجمن آراء کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

یہ کمرہ جہانگیر کے عشرت کدے ہی کا ایک حصہ تھا۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے جہانگیر، انجمن آراء کے کمرے میں پہنچا۔ درباری مطربہ کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بستر پر دراز تھی۔ جہانگیر آگے بڑھا اور انجمن آراء کے قریب پہنچ کر اس کی بے جان آنکھوں کو دیکھنے لگا، جن میں اب بھی کسی کے انتظار کی دُھندلی شمع جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے جہانگیر کے چہرے پر بھی اُداسی کا گہرا رنگ جھلکنے لگا۔ موت کے بے رحم اور دراز ہاتھوں نے اس وقت انجمن آراء کے نازک بدن کو چھو لیا تھا، جب وہ بھرپور جوانی کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ درباری مطربہ کی موت بڑی لرزہ خیز موت تھی۔ جہانگیر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مردہ دلوں کو زندگی بخشنے والی آواز اس طرح اچانک خاموش ہو جائے گی۔

جہانگیر کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا انجمن آراء کے چہرے کو دیکھتا رہا، جس پر اذیت و کرب

کے سائے جم کر رہ گئے تھے۔ جہانگیر نے اس خون کو بھی دیکھا، جو ایک لکیر بناتا ہوا گردن سے گزر کر انجمن آراء کے سینے پر پھیل گیا تھا

پھر یکایک جہانگیر کی نظر اس کاغذ پر پڑی، جو درباری مطربہ کے ہاتھ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ شہنشاہ آہستہ آہستہ جھکا اور اس نے انجمن آراء کے ہاتھ کو ہٹا کر کاغذ اٹھا لیا اور اسے پڑھنے لگا۔

یہ انجمن آراء کی تحریر تھی۔ اس نے جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''شاہِ والا! اپنی موت کی ذمے دار میں خود ہوں۔ کسی دوسرے شخص پر یہ الزام عائد نہ کیا جائے کہ اس نے مجھے زہر دے کر ہلاک کیا ہے۔ یہ زہر خود میں نے اپنے ہاتھوں سے پیا ہے۔ جہاں پناہ نے میری نغمہ سرائی سے متاثر ہو کر مجھے ایک قیمتی الماس (ہیرا) بخشا تھا۔ وہ پتھر بظاہر بہت خوب صورت اور آب دار تھا، مگر اس کے اندر ایک ایسا زہر بھی پوشیدہ تھا، جو دل و جگر کے ٹکڑے کر سکتا تھا۔ ساز چھیڑنے والی اُنگلیاں اب اس ہیرے کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھیں مجبوراً میں نے اسے اپنے شکم میں اُتار لیا۔ کچھ دیر بعد ساز ٹوٹ جائیں گے اور نغمے فنا ہو جائیں گے۔''

جہانگیر کے چہرے پر مختلف رنگ اُبھر کر ڈوبتے رہے۔ انجمن آراء نے آخر میں اپنی موت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''ظلِ الٰہی! اب میں زیادہ دن تک اپنے خوابوں کی تعبیر کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ملکہ ہند بننے کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ مگر ایک عورت کی حیثیت سے یہ میرا حق تھا کہ قانونی طور پر میرے لئے بھی شاہی حرم سرا کے دروازے کھول دیئے جاتے۔ مگر جہاں پناہ نے ایسا نہیں کیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے کئی کنیزیں حرم سرا میں داخل ہوئیں اور انہیں شاہِ والا کی بیویاں بننے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ اس بے راہ زندگی کو عزت و آبرو کی منزل مل جاتی۔ لیکن راستے کے غبار میں گم ہو جانا میرا مقدر تھا۔ اگرچہ شاہِ والا کے خوف سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ میری طرف اُنگلی اُٹھا سکتا۔ میں نے قلعے کے مکینوں اور معزز درباریوں کی آنکھوں میں نفرت و حقارت کے بہت گہرے رنگ دیکھے تھے۔ وہ آنکھیں خاموشی کی زبان میں بھی چیختی نظر آتی تھیں کہ انجمن آراء، فرمانروائے ہند کی ایک داشتہ ہے۔ میں نے شاہِ والا کی ایک جنبشِ لب پر اپنا فن قربان کر دیا۔ لیکن میرے نغمے ایک طوائف کے نغمے ٹھہرے۔ میرے ساز ایک طوائف کے ساز تھے۔ اور میری ریاضت ایک جسم بیچنے والی عورت کی ریاضت تھی۔ میں ظلِ الٰہی کو کس طرح بتاؤں کہ میری ذات پر تہمتوں کی کیسی یلغار تھی۔ میں نے ان تہمتوں کو اس طرح برداشت کیا کہ ہر صبح اور ہر شام میرا دل خون ہوتا رہتا تھا۔ میری جگہ اگر کوئی پتھر بھی ہوتا تو چیخ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ میں گوشت و پوست کی ایک معمولی عورت تھی۔ میری طرف حقارتوں اور نفرتوں کے اتنے پتھر آئے کہ پورا جسم ریزہ ریزہ ہو گیا۔ میں جسم و جاں کے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو کس طرح سمیٹتی؟ میں نے اشاروں میں کئی بار شاہِ والا کو سمجھانے کی

کوشش کی کہ اس کنیز کی ہمت جواب دیتی جا رہی ہے۔ مگر ظلِ الٰہی کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ اقتدار کے ہنگاموں کے شور میں ایک مجبور عورت کی فریاد سنتے۔ میں جانتی ہوں کہ دنیا میں شاہِ والا کے انصاف کے بہت چرچے ہیں، مگر اپنی بدنصیبی کو کیا کروں کہ مجھے انصاف نہیں مل سکا۔ میرے مرنے کے بعد یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر میرا مقدمہ ہی غلط تھا۔ مگر جہاں پناہ کی حرم سرا گواہ ہے کہ وہاں میری طرح کئی کنیزیں موجود ہیں۔ اگر وہ شاہِ والا کی شریکِ حیات بن سکتی ہیں تو پھر مجھے بھی یہ حق حاصل تھا کہ میں عزت و آبرو کی زندگی کا مطالبہ کر سکوں۔ اور میں نے کئی بار یہ مطالبہ کیا بھی۔ مگر ظلِ الٰہی کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ ایوانِ شاہی میں میرے شکستہ نغموں کی آواز سنی جاتی۔ مجبوراً میں نے خودکشی کر لی اور اس آواز کا گلا گھونٹ دیا، جسے سن کر شاہِ والا کے بقول مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ میرے بعد ساز خاموش نہیں ہوں گے، کوئی اور مطربہ جانفزا نغمے بکھیرے گی۔ مگر عالم پناہ! میری التجا ہے کہ اسے اتنی قربت کا شرف نہ بخشا جائے کہ وہ بھی ایک دن میری طرح خودکشی کرنے پر مجبور ہو جائے۔ میں اس راز سے بھی واقف ہوں کہ سیاست کے کھیل میں افراد کی موت اور زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مگر سازوں کا ٹوٹ کر بکھر جانا اور نغموں کا اس طرح فنا ہو جانا بڑا اذیت ناک تماشا ہوتا ہے۔ خدا کے لئے اس تماشے کو مزید جاری نہ رکھئے گا۔ اگر دلکش آوازیں اسی طرح قتل ہوتی رہیں تو پھر دنیا میں کیا باقی بچے گا؟ موت کے ہرکاروں کے قدموں کی چاپ، گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور، توپوں کی سماعت شکن گرج اور شمشیروں کی لرزہ خیز جھنکار..... جب قتل و غارت کا طوفان تھمے گا..... اور جنگ کی تباہ کاریوں کا سلسلہ ختم ہو گا تو آپ کو نغمہ و ساز کے نمائندے بہت یاد آئیں گے۔ عالم پناہ کی وسیع و عریض سلطنت میں ساز و آواز کے سفیر کتنے ہیں؟ محض چند، انگلیوں پر شمار کئے جانے والے۔ اگر ہو سکے تو ان کی حفاظت کیجئے گا۔''

اپنے خط کے آخر میں انجمن آراء نے جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''میں شاہِ والا پر اپنا خون معاف کرتی ہوں۔ بروزِ حشر خدا کے سامنے کوئی دعویٰ نہیں کروں گی۔ اور کر بھی کس طرح سکتی ہوں کہ بظاہر جہاں پناہ کے دامن پر میرے خون کی ایک بھی چھینٹ نہیں۔''

انجمن آراء کے خط کی اختتامی سطریں کچھ اس طرح تھیں۔

''میں نے ظلِ الٰہی سے وعدہ کیا تھا کہ مہرالنساء بیگم کی شادی کے موقع پر نغمۂ بہار چھیڑوں گی، جسے سن کر پوری کائنات جھوم اُٹھے گی۔ مگر افسوس! یہ وعدہ وفا نہ ہو سکا۔ جہاں پناہ سے میری آخری درخواست ہے کہ میری اس بے چارگی کو نافرمانی تصور نہ کیا جائے۔ شاہِ ذی وقار! میں بہت مجبور تھی کہ خوشی کی اس عظیم الشان تقریب میں کوئی نذرانہ پیش نہ کر سکی۔ بس یہی حقیر سی نذر ہے کہ اپنی جان سے گزر گئی۔ اگرچہ میری لاش، بارگاہِ شاہی میں پیش کئے جانے کے قابل نہیں ہے لیکن کنیز کے پاس اس کے سوا اور تھا بھی کیا؟ ایک تحفۂ جاں تھا، سو پیش کر دیا۔ شبِ وصال میں

موت کا نغمہ چھیڑنے والی مطربہ کی اس گستاخی کو معاف کر دیا جائے کہ یہی میری آخری التجا ہے۔
شاہِ والا کے قدموں کی خاک..... انجمن آراء۔

خط پڑھ کر چند لمحوں کے لئے جہانگیر کے چہرے پر اُداسیوں کا غبار چھا گیا۔ اس نے جھک کر انجمن آراء کی کھلی ہوئی آنکھوں کو دیکھا، جن میں انتظار کی اذیت اور کرب کے سائے جم کر رہ گئے تھے۔ اچانک جہانگیر کو یوں محسوس ہوا، جیسے انجمن آراء کے ہونٹ کانپنے لگے ہوں اور فضاؤں میں ایک دردناک نغمے کی گونج سنائی دینے لگی ہو۔

جہانگیر سیدھا ہوا اور اس نے تھکی ہوئی آواز میں شاہی کنیزوں کو حکم دیا۔

''انجمن آراء کے دفن کی تیاریاں کی جائیں۔ کل صبح مابدولت، بہ نفسِ نفیس اس کے جنازے میں شریک ہوں گے۔''

❀.....❀.....❀

مہرالنساء بڑی بے چینی کے عالم میں جہانگیر کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر جب ہندوستان کا حکمران اپنے عشرت کدے میں داخل ہوا تو مہرالنساء نے جہانگیر کی طرف بہت غور سے دیکھا تاجدارِ ہند کا چہرہ اُداس تھا۔ یکایک مہرالنساء کی نظر جہانگیر کے ہاتھ پر پڑی۔

''یہ کیا ہے ظلِ الٰہی؟'' مہرالنساء نے پوچھا۔

''انجمن آراء کی فریاد۔'' جہانگیر نے درباری مطربہ کا لکھا ہوا خط، مہرالنساء کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مہرالنساء نے شہنشاہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اسے پڑھنے لگی۔ جیسے جیسے انجمن آراء کی تحریر کردہ عبارت ختم ہوتی گئی، مہرالنساء کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ اور آخری سطریں پڑھنے کے بعد اس کے جذبات بے قابو ہو گئے۔

''وہ اپنے صحیح انجام کو پہنچ گئی۔'' مہرالنساء نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ایک کنیز اور شہنشاہ کی قربت کے خواب دیکھے؟..... ایسے بدنصیبوں کا یہی حشر ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی آنکھیں پھوڑ لیتے ہیں۔ انجمن آراء نے بھی ایسا ہی کیا اور حرام موت مر گئی۔''

مہرالنساء کے جذبات مشتعل ہو گئے تھے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے انجمن آراء کے خط کو شمع کے سامنے کر دیا۔ ایک شعلہ سا بھڑکا اور کاغذ کے جلنے سے چند لمحوں کے لئے عشرت کدے کی فضا میں ناگوار سی بُو پھیل گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انجمن کا خط راکھ ہو کر بکھر گیا۔

جہانگیر خاموشی سے اپنی محبوب بیوی کی اس حرکت کو دیکھتا رہا۔ پھر مہرالنساء کی طرف بڑھا اور پھر اس بت طناز کے قریب پہنچ کر بولا۔

''مہرو! حرف تو جل گئے مگر انجمن آراء کی لکھی ہوئی عبارت ہمارے دل پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔''

مہرالنساء گھبرا کر بولی۔ ''کیا میں بھی نہیں عالم پناہ؟'' مہرالنساء نے ایک خاص ادائے محبوبانہ کے ساتھ کہا۔

''تمہارا مقام اور ہے مہرو!..... جاہل عورتوں کی طرح اپنا مقابلہ ایک کنیز سے نہ کرو۔'' جہانگیر کے لہجے میں ہلکی سی تلخی شامل تھی۔

''ظلِ الٰہی! میں شکوہ کیوں نہ کروں کہ اس بدنصیب کنیز نے میری زندگی کی سب سے خوب صورت رات کو تباہ کر دیا۔'' مہرالنساء کا چہرہ آتشِ غضب کے بھڑکنے سے کچھ اور سرخ ہو گیا تھا۔

''تم اپنی ایک رات کی تباہی کا ماتم کر رہی ہو مہرو!'' جہانگیر نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''ذرا اس عورت کی بدنصیبیوں پر غور کرو، جس نے اپنی زندگی برباد کر ڈالی۔''

مہرالنساء اپنے فطری حسد کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے سوا دنیا کی کوئی دوسری عورت بھی شاہِ والا کو اس انداز سے پسند کرے۔'' مہرالنساء اپنی محبت کی نمائش سے شہنشاہ کو متاثر کرنا چاہتی تھی۔ مگر جہانگیر کو درباری مطربہ، انجمن آراء کی موت کا بہت غم تھا۔

''تمہارا یہ جذبہ قابلِ ستائش ہے۔ مگر تم دوسروں کے جذبات پر اپنی مرضی کے پہرے نہیں بٹھا سکتیں۔'' شہنشاہ نے کسی قدر ناگوار لہجے میں کہا۔ ''ہماری ذات سارے ہندوستان کے لئے ایک محبوب کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی طرح انجمن آراء کو بھی پورا حق تھا کہ وہ ہمیں اپنے جذبات کی تمام تر شدت کے ساتھ چاہے۔ بے شک! اس نے اپنی چاہت کا حق ادا کر دیا۔ مگر افسوس! ہم اس کی محبت کو بروقت نہ سمجھ سکے۔ کاش! وہ ہمیں واضح الفاظ میں پکارتی تو ہم یقیناً اس کی آخری خواہش بھی پوری کر دیتے۔''

مہرالنساء، جہانگیر کے لہجے کی شدت کو محسوس کر کے خاموش ہو گئی۔

''اس نے مرنے کے بعد ہمارے انصاف کو آواز دی ہے۔'' جہانگیر کا لہجہ بدستور اُداس تھا۔ ''اگرچہ بہت دیر ہو گئی لیکن ہم پھر بھی انجمن آراء کے ساتھ انصاف کریں گے۔ اس نے ہماری خاطر جان دی ہے اور ہم ایسے جاں نثاروں کو فراموش نہیں کرتے۔ اس نے برسوں اپنی نغمہ سرائی سے ہمارا دل بہلایا ہے۔ آج کی رات بڑی شدت کے ساتھ ہم انجمن آراء کی کمی محسوس کر رہے ہیں۔ اور کون جانے، یہ کمی کب تک محسوس ہوتی رہے گی۔ بے شک، انجمن آراء ایک بے مثال فنکارہ تھی۔ ہندوستان میں شاید ہی اس کے درجے کی کوئی دوسری مغنیہ موجود ہو۔ وہ آواز کی جادوگر تھی۔ اس کی موسیقی کا طلسم بہت دنوں تک ہمیں ایک محرومی کا احساس دلاتا رہے گا۔''

انجمن آراء کی موت نے کچھ دیر کے لئے شاہی عشرت کدے کی فضاؤں کو سوگوار بنا دیا تھا۔ لیکن مہرالنساء جیسی حسین عورت کی موجودگی میں اُداسیوں کے یہ اندھیرے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس نے فوراً ہی اپنی محبوبانہ اداؤں کے چراغ روشن کر دیئے اور ہر

طرف کیف و مستی کی بارش ہونے لگی۔

❀.....❀.....❀

اگلے دن شاہانہ اعزاز کے ساتھ انجمن آراء کا جنازہ اُٹھا۔ جہانگیر اس وقت تک جنازے کے ساتھ ساتھ رہا، جب تک انجمن آراء کی لاش کو قبر میں نہ اُتار دیا گیا۔ انجمن آراء کا جسم شہنشاہ اکبر کے مقبرے کے ایک گوشے میں بطورِ امانت زمین کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس موقع پر جہانگیر نے شاہی فرمان جاری کرتے ہوئے کہا تھا۔

''جب ہم اس دنیا سے اُٹھ جائیں تو انجمن آراء کا جسم بھی یہاں سے منتقل کر کے ہمارے قدموں میں دفن کر دیا جائے تاکہ درباری مطربہ کی بے چین روح کو سکون حاصل ہو سکے۔ اور دنیا والے اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ شہنشاہ کے جاں نثار مرنے کے بعد بھی اس کے قریب رہتے ہیں۔''

یہ ایک بڑا شاہی اعزاز تھا، جو پہلی بار ایک عام عورت کو حاصل ہوا تھا۔

مہرالنساء، انجمن آراء کی موت پر بہت خوش تھی کہ اس کی ایک رقیب، نامرادی کی حالت میں دنیا سے اُٹھ گئی۔ اگرچہ جہانگیر کی دوسری بیگمات بھی مہرالنساء کے لئے رقیب کا درجہ رکھتی تھیں، لیکن وہ ان سے خوف زدہ نہیں تھی۔ مہرالنساء اچھی طرح جانتی تھی کہ شہنشاہ فطری طور پر فنونِ لطیفہ کا عاشق ہے۔ مگر اس کی کوئی بھی بیوی اس معیار پر پورا نہیں اُترتی۔ جہانگیر کی اسی محرومی نے اسے مہرالنساء کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کے برعکس انجمن آراء حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مطربہ بھی تھی۔ اگر وہ زندہ رہتی تو کسی وقت بھی مہرالنساء کے لئے خطرہ بن سکتی تھی۔ اور آج وہی خطرہ خود بخود دُور ہو گیا تھا۔ ایک عورت ہونے کی حیثیت سے یہ سارے اندیشے خود مہرالنساء کے ذہن کی پیداوار تھے۔ جہانگیر انجمن آراء کو اس کے فن کی وجہ سے بہت زیادہ چاہتا تھا، لیکن اس چاہت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں تھا کہ وہ ایک مطربہ کو ہندوستان کی ملکہ کے درجے پر فائز کر دے۔ خود انجمن آراء نے بھی ملکہ ہند بننے کے خواب نہیں دیکھے تھے۔

صحیح معنوں میں اگر انجمن آراء کی موت کا غم کسی کو تھا تو وہ ماہ رخ تھی۔ انجمن آراء اور ماہ رخ کی زندگی میں بڑی یکسانیت تھی۔ انجمن آراء نے شہنشاہ جہانگیر کو چاہا اور دردناک موت اس کا مقدر بن گئی۔ ماہ رخ نے شہزادہ پرویز سے محبت کی اور اپنی زندگی کو اسی دنیا میں جہنم بنا لیا۔

❀.....❀.....❀

انجمن آراء کی موت کے غم کے ساتھ ماہ رخ خوشگوار لذتوں سے بھی سرشار تھی۔ شہنشاہ جہانگیر اور مہرالنساء بیگم کی شادی نے اس کی آقا زادی ارجمند بانو کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ اب ماہ رُخ کو اُمید ہو چلی تھی کہ شہزادہ خرم اور ارجمند بانو شرعی اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔

''بی بی! اب اپنی ان اُداسیوں کو کسی ویران کھنڈر میں دفن کر دو۔'' ایک دن ماہ رخ نے

ارجمند بانو کو مغموم دیکھ کر کہا۔

''ماہ رخ! میں کیا کروں؟..... مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں ہے۔'' ارجمند بانو نے انتہائی دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''آپ کے راستے کا سب سے بھاری پتھر دُور ہو چکا ہے۔'' ماہ رخ نے کہا۔

ارجمند بانو نے ماہ رخ کی طرف چونک کر دیکھا۔

''اب آپ کی راہ میں کوئی کانٹا موجود نہیں ہے۔'' ماہ رخ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ''مہرالنساء بیگم ہی آپ کے راستے کا سب سے زہریلا کانٹا تھیں، جسے قدرت کے ہاتھوں نے اس طرح ہٹا دیا ہے کہ منزل صاف نظر آ رہی ہے۔''

ارجمند بانو ابھی تک ماہ رخ کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت کی لرزتی ہوئی پرچھائیاں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں۔

''شہنشاہ نے مہرالنساء بیگم کو رام کرنے کے لئے خوف ناک چلیں چلی تھیں۔'' ماہ رخ اس طرح بول رہی تھی جیسے وہ شہنشاہ کی رازدار ہو۔ ''شہنشاہ اس لئے مسلسل شادیاں کر رہے تھے کہ مہرالنساء بیگم کا غرور ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اسی طرح آپ بھی ایک حادثے کا شکار ہوئیں۔ شہنشاہ جہانگیر نے ایک طرف شاہِ ایران کو خوش کرنے کے لئے مرزا مظفر صفوی کی صاحب زادی سے شہزادہ خرم کی شادی کی اور دوسری طرف مہرالنساء بیگم کو یہ تاثر دیا کہ وہ ان کی بھتیجی، ارجمند بانو کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ بالآخر شہنشاہ اپنی چالوں میں کامیاب ہوئے اور مہرالنساء بیگم تمام تر غرور و ناز کے ساتھ شہنشاہ کے سامنے خم ہو گئیں۔ اب شہنشاہ، مہرالنساء بیگم کو خوش کرنے کے لئے آپ کی طرف متوجہ ہوں گے۔''

''ماہ رخ! کون جانے کہ کل کیا ہو گا۔'' ارجمند بانو نے اُداس لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو دُور تک اندھیرا نظر آ رہا ہے۔''

''نہیں بی بی! ایسی کم ہمتی کی باتیں نہیں کرتے۔'' ماہ رخ نے ارجمند بانو کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''روشنی کا سفر شروع ہو چکا ہے۔ نئے اُجالے کی کرنوں کو آپ تک پہنچنے کے لئے کچھ وقت درکار ہو گا۔ اس وقت کا پوری گرم جوشی کے ساتھ انتظار کیجئے کہ اب وہ آپ سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

ماہ رخ کی حوصلہ افزا گفتگو سن کر ارجمند بانو مسکرانے لگی۔ ''خدا تمہاری زندگی بھی خوشیوں سے بھر دے ماہ رخ! کہ تم نے مایوسیوں کے اس اندھیرے میں میرا بہت ساتھ دیا ہے۔''

''یہ تو میرا فرض تھا، آقا زادی! کہ آپ کے کسی کام آ سکوں۔'' ماہ رخ کے لہجے میں جذبات کی حرارت شامل تھی۔ ''یہ تو ایک ادنیٰ ترین خدمت تھی۔ مجھے تو اس دن خوشی ہو گی، جب میں آپ کی خوشی کے لئے قربان ہو جاؤں۔''

❀.....❀.....❀

اور پھر ماہ رخ کے تمام اندازے درست ثابت ہوئے۔ شادی کے ایک ماہ بعد جہانگیر نے مہرالنساء کو ''نورمحل'' کا خطاب دے دیا۔ یہ ایک منفرد خطاب تھا۔ جہانگیر نے آج تک اپنی کسی بیگم کو اس انداز کے خطاب سے نہیں نوازا تھا۔ مہرالنساء کے روشن چہرے کی وجہ سے اس کے لئے یہ خطاب بہت زیادہ مناسب نظر آتا تھا۔

اور اسی موقع پر جہانگیر نے ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی شادی کی تاریخ کا بھی اعلان کر دیا۔

اس شاہی اعلان نے وزیراعظم آصف خان کے گھر کو مسرتوں سے بھر دیا۔ اس رات آصف خان نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''اس طرح چراغاں کر دو کہ گھر کا ایک ایک گوشہ جگمگا اُٹھے۔ اور یہ چراغاں، شادی کے بعد تک جاری رہے کہ خداوند ذوالجلال نے اس گھر کو اپنی بے پناہ رحمتوں سے نوازا ہے۔''

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آصف خان کا پورا گھر روشن ہو گیا۔ درباری امراء اپنے وزیراعظم کو مبارک دینے کے لئے آنے لگے۔

جب ارجمند بانو نے یہ خبر سنی تو کچھ دیر کے لئے اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور پھر وہ ماہ رخ سے لپٹ کر رونے لگی۔

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خدا میرے خالی دامن کو اس طرح بھر دے گا۔'' جوشِ جذبات میں ارجمند بانو کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

ماہ رخ کی آنکھوں سے بھی خوشی کے آنسوؤں کا آبشار جاری تھا۔ تمام قافلے آہستہ آہستہ اپنی منزل تک پہنچتے جا رہے تھے۔ بس ایک ماہ رخ کی ناکام حسرتوں کا کارواں تھا، جس کے نصیب میں کوئی منزل نہیں تھی۔ مگر ماہ رخ نے خوشی کے اس موقع پر کسی سے محرومیوں کی شکایت نہیں کی۔ وہ ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی شادی کی اطلاع پا کر اس طرح خوش تھی، جیسے خود اس کی اور شہزادہ پرویز کی شادی ہو رہی ہو۔

پھر جب مسرتوں کے آنسوؤں کا سیلاب تھم گیا تو ارجمند بانو کو مبارک شاہ قلندر کی یاد آئی۔

''آؤ ماہ رخ! حضرت شیخ کے مزار پر حاضری دیں اور قلندر بابا کو نذر پیش کریں کہ ان کی دعاؤں کے صدقے میں ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔'' ارجمند بانو نے کہا اور پھر وہ ماہ رخ کو لے کر شیخ چشتی کے مزار پر پہنچی۔

ارجمند بانو بہت دیر تک مزار کے باہر کھڑی دعا مانگتی رہی۔ اکثر لوگ جوشِ عقیدت میں مزار کے اندر بھی چلے جاتے تھے لیکن ارجمند بانو ہمیشہ باہر سے دعا مانگ کر لوٹ آتی تھی۔ ایک بار ماہ رخ نے اس سے اندر جانے کے لئے کہا تو ارجمند نے جواب دیا۔

''تم جانتی ہو ماہ رخ! کہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کون ہیں؟..... وہ معرفت کے شہنشاہ ہیں۔ ایسے شہنشاہ کہ جن کے حضور شہنشاہ جلال الدین اکبر بھی برہنہ پا، گھٹنوں کے بل چل کے آتے تھے۔ اس حقیر خادمہ کے لئے یہی اعزاز کافی ہے کہ وہ شہنشاہ کی مملکت میں رہتی ہے اور شہنشاہ

اس کی حاضری قبول کر لیتے ہیں۔''

آج بھی ارجمند بانو اسی عقیدت کے ساتھ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار پر حاضر ہوئی تھی۔ دعا کے دوران ایک لمحے کے لئے بھی اس کے آنسو نہیں تھمے تھے۔

پھر ارجمند بانو دعا مانگ کر مزار کے احاطے سے باہر آئی اور غریبوں میں چاندی کے سکے تقسیم کئے۔ اس کے بعد اُس کی بے چین نظروں نے مبارک شاہ کو تلاش کیا مگر آج وہاں قلندر موجود نہیں تھا۔ ارجمند بانو پریشان نظر آنے لگی۔ ''قلندر بابا کہاں ہیں ماہ رخ؟..... کہیں اُن کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟''

ماہ رخ کیا جواب دیتی؟ اُس نے قطار میں بیٹھے ہوئے ایک فقیر سے پوچھا۔ ''بابا مبارک شاہ کہاں ہیں؟''

''ہمیں کیا پتہ کہ وہ دیوانہ کہاں ہے؟'' بیک وقت کئی فقیروں نے بلند آواز میں کہا۔ ''دن رات کھڑے کھڑے مزار کو تکتا رہتا ہے اور کبھی جی میں آتا ہے تو اپنی جھونپڑی کی طرف چلا جاتا ہے۔'' فقیروں کے لہجے میں مبارک شاہ کے لئے بڑی حقارت تھی۔ ''کیسی عجیب بات ہے کہ جو بھی آتا ہے، اسی پاگل کو پوچھتا ہے۔ آخر اس دیوانے میں کیا رکھا ہے؟''

ماہ رخ گداگروں کی اس بے ادبی کا جواب دینا چاہتی تھی، مگر صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خاموش رہی۔ پھر وہ ارجمند بانو اور آصف خان کے خدمت گاروں کے ساتھ اس جھونپڑی کی طرف بڑھ گئی، جس میں مبارک شاہ قلندر رہتا تھا۔

''وزیراعظم آصف خان کی صاحب زادی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' ایک خدمت گار نے جھونپڑی کے اندر داخل ہو کر کہا۔

مبارک شاہ اپنے مصلے پر آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھا تھا۔ اجنبی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور اشارے سے کہا کہ ارجمند بانو کو اندر بھیج دو۔

پھر جیسے ہی ارجمند بانو جھونپڑی میں داخل ہوئی، مبارک شاہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بڑے والہانہ انداز میں بولا۔

''ملکۂ عالیہ اور ایک فقیر کی جھونپڑی میں؟ کیسی خوشی کی ساعت ہے۔ مگر ایک مفلس انسان، ہندوستان کی ملکہ کو کیا نذر پیش کرے؟''

''بابا! آپ نے اس کنیز کو اپنے حضور آنے کی اجازت دے دی، بس یہی کافی ہے۔'' شدت جذبات سے ارجمند بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''بیٹھ جاؤ، ملکۂ عالیہ!'' قلندر نے ایک خاک آلود چٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ارجمند بانو نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں کیا کہ قلندر کی چٹائی، غبار سے بھری ہوئی ہے۔ وہ اپنے بہترین لباس کے ساتھ خاک سے اٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئی۔

''یہ تختِ ہندوستان ہے۔'' قلندر نے پُرجلال لہجے میں کہا۔ ''بحکم خدا، اب تجھے دنیا کی

کوئی طاقت تاج وتخت سے محروم نہیں کرسکتی۔"

ماہ رخ بڑی حیرت سے مبارک شاہ کی گفتگو سنتی رہی۔

"بس، اب اپنے گھر جاؤ۔ تمہیں بار بار یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" قلندر نے ارجمند بانو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جب خداوند ذوالجلال اپنے خزانۂ غیب سے تمہیں اقتدار بخش دے تو مخلوقِ خدا کا خیال رکھنا۔ اور عیش ونشاط کے ہنگاموں میں قبر کو نہ بھول جانا کہ قبر بہت تاریک اور خوفناک جگہ ہے۔"

قلندر کی باتوں نے ارجمند بانو اور ماہ رخ پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ ارجمند بانو چٹائی سے اس حالت میں اُٹھی کہ اُس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

"تُو میری بیٹی کی طرح ہے۔ پھر باپ سے اتنا کیوں ڈرتی ہے؟" مبارک شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارجمند بانو آگے بڑھی اور قلندر کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ مبارک شاہ نے فوراً ہی ارجمند کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اللہ تجھے اور شہزادہ خرم کو تمام آفات ومصائب سے دُور رکھے۔"

"بابا! یہ آپ کی بیٹی کی خواہش ہے کہ ان سکوں کو اپنے ہاتھ سے غریبوں میں تقسیم کر دیں۔" ارجمند نے چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی، قلندر کی خدمت میں پیش کی۔

مبارک شاہ اس تھیلی کو ارجمند بانو کے گرد اس طرح گردش دیتا رہا، جیسے صدقہ اُتار رہا ہو۔ پھر قلندر اپنی جھونپڑی سے باہر آیا اور چاندی کے تمام سکے یہ کہہ کر فقیروں کی طرف پھینک دیئے کہ اپنے دامن بھر لو کہ یہ ملکۂ عالیہ کی بخشش وعطا ہے۔"

۞.....۞.....۞

ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی شادی میں صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔

ارسلان بیگ پر ناقابلِ بیان وحشت طاری تھی۔ اس دوران وہ کئی بار گیانی آتمارام کے پاس جا چکا تھا۔

"گیانی! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ تیرے وہ منتر کیا ہوئے، جو ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کو ہمیشہ کے لئے جدا کر رہے تھے۔" ارسلان بیگ کے لہجے میں ہزاروں تلخیاں پوشیدہ تھیں۔

"میں نے اپنا کام مکمل کر دیا تھا۔ مگر اس بھکاری مبارک شاہ کا کیا کروں، جو مجھ سے بڑا جادوگر ہے۔" آتمارام نے انتہائی بے بسی کے عالم میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "اگر اس بھکاری کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو پھر دنیا میں میرے منتروں کا کوئی توڑ نہیں ہے۔" آتمارام بڑی عیاری کے ساتھ بہانے تراش رہا تھا۔

"بھکاری مبارک شاہ سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے؟" ارسلان بیگ شدید جھنجلاہٹ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

"کسی طرح اس بھکاری کو قتل کرا دے۔ پھر نئی فتوحات تیرے قدم چومیں گی۔" آتمارام، ارسلان بیگ کے جذبات سے کھیل رہا تھا۔

ارسلان بیگ نے ایک بار مبارک شاہ کو زہر دلوانے کی کوشش کی تھی، مگر ناکام رہا تھا۔ آج آتمارام کی زبان سے مبارک شاہ کے قتل کی بات سن کر وہ چونک اُٹھا۔

"یہ کیسے ہوگا؟..... اس کی آنکھوں نے تو روٹیوں میں چھپا ہوا زہر بھی دیکھ لیا تھا۔ پھر کون اسے قتل کرے گا؟"

"اگر وہ بھکاری قتل نہیں ہوسکتا تو پھر ارجمند بھی تیرا مقدر نہیں بن سکتی۔" آتمارام نے بڑی بے نیازی کے ساتھ کہا۔

ارسلان بیگ کے سینے میں نفرت وانتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور یہی آگ اُسے مبارک شاہ کے قتل پر اُکسانے لگی۔ آخر ارسلان بیگ نے تین آدمیوں کو بڑی رقم دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ رات کے اندھیرے میں قلندر کو ہلاک کر دیں گے۔ مگر جب وہ تینوں درندے بے نیام تلواریں لے کر قتل کی نیت سے مبارک شاہ کی جھونپڑی میں داخل ہوئے تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

چراغ کی مدھم روشنی میں قلندر نے تین سائے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھے تو گرج دار آواز میں کہا۔ "کون ہے؟"

مبارک شاہ کے لہجے میں اس قدر جلال تھا کہ ان تینوں کے ہاتھوں سے تلواریں چھوٹ گئیں اور وہ قلندر کے قدموں میں گر کر اپنے جرم کی معافی مانگنے لگے۔

قلندر کے دریافت کرنے پر تینوں نے اعتراف کر لیا کہ انہیں ارسلان بیگ نے اقدامِ قتل کے لئے ورغلایا تھا۔

مبارک شاہ مسکرانے لگا۔ "میں تم لوگوں کو معاف کرتا ہوں۔ مگر اُس مردود سے کہہ دینا کہ میرے قتل کے لئے تازہ دم فوج روانہ کر کہ یہ تھکے ہوئے بازو کسی کام نہیں آئیں گے۔"

ارسلان بیگ اپنی دوسری شکست پر پاگل ہوگیا۔

"ارجمند! میں تجھے چین سے جینے نہیں دوں گا۔" یہ کہہ کر ارسلان بیگ شدید وحشت کے عالم میں قصرِ شاہی کی طرف بڑھا۔ اب وہ اپنے ناپاک منصوبے کے ساتھ شہزادہ خرم سے ملنے کے لئے جا رہا تھا۔

۞.....۞.....۞

جب خدمت گاروں نے خرم کو ارسلان بیگ کے آنے کی اطلاع دی تو شہزادے کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے اور اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ ارسلان بیگ سے ملنا نہیں چاہتا۔ ارسلان بیگ کے سینے میں ارجمند کے خلاف نفرت وانتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ اس آگ

کو مزید ہوا دینے کے لئے ہر حال میں خرم سے ملنا چاہتا تھا۔

''صاحبِ عالم سے عرض کرنا کہ ان کے لئے ایک ضروری خبر ہے۔'' ارسلان بیگ نے خدمت گاروں سے کہا۔

ضروری خبر کے الفاظ سن کر شہزادہ خرم، ارسلان بیگ سے ملنے کے لئے مجبور ہو گیا۔

''کہو! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' شہزادہ خرم نے اپنی روایتی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ اگرچہ خرم، ارسلان بیگ کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا لیکن وہ اپنی وضعداری کے سبب اس منافق شخص کو برداشت کر رہا تھا۔ ''آخر وہ کون سی ضروری خبر ہے، جو تم مجھے سنانا چاہتے ہو؟''

ارسلان بیگ چند لمحوں تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور انتہائی سرد لہجے میں کہنے لگا۔

''صاحبِ عالم! جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، وہ بہت تلخ اور ناگوار ہے۔ شاید آپ اسے برداشت نہ کر سکیں۔ مگر پھر بھی وہ خبر آپ کے لئے بہت مفید ہے کہ اس طرح مستقبل کی پریشانیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔''

''جلدی کہو! میرا وقت برباد نہ کرو۔'' شہزادہ خرم کے لہجے سے ہلکی سی تلخی جھلکنے لگی تھی۔

''آپ..... وزیراعظم آصف خان کی..... صاحب زادی، ارجمند بانو..... سے شادی کا ارادہ ترک کر دیں۔'' ارسلان بیگ نے رک رک کر کہا۔ اس کی نظریں شہزادہ خرم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''کیوں؟'' ارجمند کا نام سن کر شہزادہ خرم چونک اُٹھا۔

''وہ لڑکی آپ کے قابل نہیں ہے۔'' ارسلان بیگ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ تم کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت کر سکو؟'' شہزادہ خرم کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہو گئے تھے مگر پھر بھی اس کی زبان سے شائستگی ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ شہزادہ خرم کی خاص عادت تھی کہ وہ کسی نیچ انسان کو بھی ''تُو'' کہہ کر مخاطب نہیں کرتا تھا۔

''میں صاحبِ عالم کا پرانا نمک خوار ہوں۔'' ارسلان بیگ نے اپنی منافقت کی بھرپور نمائش کی۔ ''اور اس نمک کا حق ادا کرتے ہوئے یہ بھیانک راز فاش کر رہا ہوں کہ ارجمند کا کردار مشکوک ہے۔ وہ ایک بے اعتبار لڑکی ہے، جو کسی طرح بھی شہزادۂ عالم کے لائق نہیں۔''

ارسلان بیگ کی باتیں سن کر شہزادہ خرم سناٹے میں آ گیا۔ اسے اچانک یوں محسوس ہوا، جیسے کسی نے اس کے دماغ پر آہنی ضرب لگائی ہو۔ چند لمحوں کے لئے شہزادہ خرم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

''ہم اس تہمت طرازی پر تیری زبان بھی کاٹ سکتے ہیں۔'' انتہائی متحمل مزاج ہوتے

ہوئے بھی شہزادہ خرم کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

''صاحبِ عالم! مجھے اپنی زبان سے محروم ہو جانا گوارا ہے۔ مگر آپ کی رسوائی منظور نہیں۔'' ارسلان بیگ، شہزادہ خرم کے سامنے مسلسل بے حیائی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ''اگر آپ میرا سر بھی قلم کر دیں تو میں یہی کہتا رہوں گا کہ ارجمند جیسی بے وفا لڑکی، آپ کی شریکِ حیات بننے کے قابل نہیں۔ کئی سال تک اس کے اور میرے درمیان جذباتی رشتے قائم رہے ہیں۔ پھر آپ سے نسبت طے ہو جانے کے بعد وہ راستہ بھول گئی۔ اس لئے کہ میں ایک معمولی انسان تھا۔ اگر میں آپ کی طرح صاحبِ اقتدار ہوتا تو وہ انکار کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔''

شہزادہ خرم کے دل و دماغ میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس نے غضب ناک لہجے میں ارسلان بیگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تُو اپنے دعوے میں سچا ہے تو نسبت کے وقت تُو نے یہ راز فاش کیوں نہیں کیا تھا؟ آج چار سال کے بعد تجھے ارجمند کی بے وفائی کیوں یاد آ رہی ہے؟'' شہزادہ خرم نے بڑی مشکل سے اپنے مشتعل جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''صاحبِ عالم کو یاد نہیں رہا۔ میں نے ایک دن مینا بازار میں آپ کو ارجمند اور اپنے رشتے کے متعلق تفصیل سے بتایا تھا۔'' ارسلان بیگ نے بہت پرانے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''اس غلط فہمی کو اسی وقت دُور کر دیا گیا تھا۔'' شہزادہ خرم کا لہجہ بدستور قہرناک تھا۔ ''پھر تُو نے اس قدر طویل عرصے تک اپنی زبان کیوں بند رکھی؟''

''میں سمجھتا تھا کہ صاحبِ عالم خود ہی اس معاملے کی گہرائی تک پہنچ جائیں گے۔'' ارسلان بیگ نے بے شرمی کا ایک اور مظاہرہ کیا۔ ''اب جب کہ شادی کا وقت قریب آ گیا ہے تو میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ ہندوستان کا ہونے والا شہنشاہ تمام عمر اپنے اس فعل پر شرمندہ رہے۔''

''ہمیں ارجمند کے سلسلے میں کبھی کوئی ندامت محسوس نہیں ہو گی۔'' شہزادہ خرم نے بلند آواز میں کہا۔ ''ہمیں ارجمند کی رفاقت پر ناز ہے۔ اور جو ہاتھ بھی اس رفاقت کو توڑنے کے لئے اُٹھے گا، ہم وہ ہاتھ کاٹ کر پھینک دیں گے۔''

شہزادہ خرم کا لہجہ اس قدر پُرجلال تھا کہ ارسلان بیگ لرز کر رہ گیا۔ اسے یقین تھا کہ شہزادہ خرم، ارجمند کی بے وفائی کا ذکر سن کر بھڑک اُٹھے گا اور اس رشتے کو ہمیشہ کے لئے منقطع کر دے گا۔ مگر صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ شہزادہ خرم، ارجمند بانو کے خلاف ایک حرف بھی سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔

''صاحبِ عالم اب آپ کی مرضی۔ اس گناہ گار نے تو نمک خواری کا حق ادا کر دیا۔'' یہ کہہ کر ارسلان بیگ لرزتے جسم کے ساتھ واپس جانے کے لئے مڑا۔

''ٹھہرو!'' شہزادہ خرم کی بارُعب آواز اُبھری۔ ''ہم نے ابھی اس معاملے کو ختم نہیں کیا ہے۔''

ارسلان بیگ کے چہرے پر خوف و دہشت کی پرچھائیاں اُبھر آئیں اور اس کی آنکھوں کی

پتلیاں کانپنے لگیں۔

''ہم ایک دن تجھے اس الزام تراشی کی سزا ضرور دیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم شادی سے پہلے تیری اس غلیظ زبان کو کاٹ دیں یا پھر تیرے پورے جسم کو تیرے ہی خون سے نہلا دیں۔ ہم اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے، جو دکھ تو نے ہمیں پہنچایا ہے۔'' شہزادہ خرم کا چہرہ غصے کی آگ سے جل اُٹھا تھا۔ ''بہتر ہے کہ تُو اپنی منحوس صورت، ہندوستان کے کسی ویران گوشے میں گم کر دے اور دربارِ شاہی چھوڑ کر کسی سنسان جنگل میں چلا جا۔ ورنہ تیرا انجام بڑا عبرت ناک ہوگا۔ بس تجھے اتنی ہی رعایت دی جاسکتی ہے۔''

ارسلان بیگ کا ناپاک منصوبہ اُلٹ گیا تھا۔ مجبوراً وہ کانپتے قدموں کے ساتھ واپس چلا گیا۔

❀.....❀.....❀

ارسلان بیگ کے جاتے ہی شہزادہ خرم نے اپنے دوست، سکندر مرزا کو تنہائی میں طلب کیا اور پورا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ''ہم آج ہی ارسلان کو اس کے گناہ کی دردناک سزا دینا چاہتے ہیں۔''

یہ واقعہ سن کر سکندر مرزا کے چہرے پر غصے اور رنج و الم کے گہرے سائے لرزنے لگے تھے۔ لیکن پھر بھی اس نے صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑا۔

''صاحبِ عالم! میں کسی حد تک آپ کی دلی کیفیت سے باخبر ہوں مگر میں اس کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ آپ ایک بدکار اور کمینے انسان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیں۔ ایک تو یہ کہ وہ شہنشاہ کا مصاحب ہے۔ اگر آپ اس پر جبر کریں گے تو وہ ظلِ الٰہی کے سامنے پہنچ کر فریاد کرے گا۔ نتیجتاً شہنشاہ آپ کو بھی اپنے حضور میں طلب کر سکتے ہیں۔ پھر کیا آپ اپنی زبان پر ارجمند بانو کا نام لائیں گے؟ ارسلان بیگ یہی تو چاہتا ہے کہ کسی طرح ارجمند بانو رُسوا ہو جائیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس بدنہاد کی شرارت سے متاثر ہو کر آپ ارجمند بانو کی ذات پر شک کرنے لگیں۔'' سکندر مرزا نہایت ہوشیاری سے خرم کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ ناممکن ہے سکندر مرزا!'' شہزادہ خرم کا لہجہ بہت زیادہ پُرجوش تھا۔ ''اگر ساری دنیا مل کر بھی ارجمند بانو کے خلاف گواہی دینے لگے تو ہم اس شہادت کو تسلیم نہیں کریں گے۔''

''ارجمند بانو کی طرف سے آپ کا دل صاف ہے تو پھر ارسلان بیگ کی باتوں پر خاک ڈال دیجئے۔'' سکندر مرزا نے کہا۔ ''آپ اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے فی الوقت معاف کر دیجئے۔ اگر اس نے ارجمند بانو کے خلاف اپنے غلیظ ہونٹوں کو جنبش دی تو اس کا تدارک کیا جائے گا۔ میرے خیال میں وہ فطرتاً ایک بزدل انسان ہے۔ آپ کی سخت تنبیہہ کے بعد مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گا۔ لیکن پھر بھی اگر وہ اپنی مذموم حرکتوں سے باز نہیں آیا تو اس کی زبان کاٹی جاسکتی ہے۔''

سکندر مرزا کا دانشمندانہ مشورہ کارگر ثابت ہوا اور شہزادہ خرم کے مشتعل جذبات آہستہ آہستہ اعتدال پر آ گئے۔

❀.....❀.....❀

پھر وہ دن بھی آ پہنچا، جس کا انتظار کرتے کرتے ارجمند بانو تھک چکی تھی۔ اپریل 1612ء میں شہزادہ خرم سے ارجمند کی شادی ہوگئی۔ جہانگیر نے بیٹے کی شادی کے موقع پر انتہائی مسرت اور جوش کا مظاہرہ کیا تھا۔ دارالحکومت آگرہ کے ایک ایک گوشے کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ تمام مقامی باشندوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ شہزادہ خرم کے جشنِ شادی میں شرکت کریں۔ پورے شہر میں شاہی جلوس نے گشت کیا اور رات کو اس طرح آتش بازی کا مظاہرہ کیا گیا کہ سیاہ رات پر دن کا گمان ہونے لگا۔

جب ارجمند بانو حجلۂ عروسی میں داخل ہوئی تو شہزادہ خرم بڑی بے چینی کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ ارجمند بانو کو محسوس ہوا جیسے آج ساری کائنات اس کی خوشی میں شریک ہے اور زمین آسمان رقص کر رہے ہیں۔

''ارجمند! ایسا لگتا ہے، جیسے آج کہکشاں تمہاری شکل میں زمین پر اُتر آئی ہو۔'' شہزادہ خرم نے اپنی شریکِ حیات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ارجمند بانو اس طرح شرمائی کہ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ بن گئی۔

''صاحبِ عالم کا حُسنِ نظر ہے۔'' ارجمند کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی۔

''نہیں ارجمند! آج روئے زمین پر تم سے زیادہ حسین کوئی دوسری عورت موجود نہیں۔'' شہزادہ خرم مسحور نظر آ رہا تھا۔

ارجمند نے جھکی ہوئی پلکوں کو اٹھایا اور ایک نظر اپنے محبوب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ شہزادہ خرم کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک حرف میں جذبات کی سچائیوں کا عکس روشن تھا۔ ارجمند بانو نے دوسرے ہی لمحے نظریں جھکا لیں۔

''یہ کنیز اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہے۔'' ارجمند کی آواز بہت مدھم تھی۔

''کنیز نہیں۔ خرم کے دل کی تاجدار..... جذبوں کی حکمراں..... بے قرار تمناؤں کی ملکہ۔'' شہزادہ خرم کے لہجے میں گہرے نشے کی سی کیفیت شامل تھی۔

''کنیز اس نوازش و کرم پر اپنے تاجدار کی مشکور ہے۔'' ارجمند بانو کی آواز پر موسیقی کے آبشار کا گمان ہو رہا تھا۔

شہزادہ خرم نے ایک قیمتی مرصع ہار، ارجمند بانو کو پہناتے ہوئے کہا۔ ''یہ بارگاہِ حُسن میں ہماری طرف سے ایک حقیر تحفہ ہے۔''

جواب میں ارجمند بانو نے حافظ شیرازی کے دیوان کا ایک نمونہ پیش کیا۔

"یہ کیا ہے ارجمند؟" شہزادہ خرم نے چونک کر کہا۔

"کنیز کی طرف سے اپنے صاحب کی خدمت میں ایک تحفہ۔" ارجمند کا لہجہ جذبات سے سرشار تھا۔

"ہم بہت خوش ہوئے ارجمند!" خرم نے دیوانِ حافظ کے ابتدائی اوراق پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک انتہائی نادر قلمی نسخہ تھا۔ یقیناً تم اعلیٰ ترین ذوق کی مالک ہو۔"

"صاحبِ عالم! اسے درمیان سے کھول کر دیکھیں۔" ارجمند نے کہا۔

جب شہزادہ خرم نے دیوانِ حافظ کو درمیان سے کھولا تو وہ حیران رہ گیا۔ کتاب کے بیچ میں ایک گلاب کا پھول موجود تھا، جس کی پتیاں مرجھا کر خشک ہو چکی تھیں۔

شہزادہ خرم سوالیہ نظروں سے ارجمند بانو کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ گلاب کا وہ پھول ہے، جو صاحبِ عالم نے پہلی ملاقات میں اس کنیز کو پیش کیا تھا۔" ارجمند نے شرما کر سر جھکا لیا۔

شہزادہ خرم چند لمحوں تک گہرے سکوت کے عالم میں کھڑا رہا، پھر خواب ناک سے لہجے میں کہنے لگا۔ "ارجمند! تمہیں ہماری ایک معمولی نشانی سے بھی اتنی دلچسپی ہے؟"

"معمولی نہیں صاحبِ عالم!" ارجمند نے جواباً کہا۔ "آپ نے یہ پھول دیتے وقت اس بات کی وضاحت کی تھی کہ آپ کو گلاب کے پھول بہت پسند ہیں۔ اسی روز سے میں نے آپ کی پسند کو اپنی پسند بنا لیا ہے۔ یہ گلاب کا پھول میری محبت کی پہلی یادگار ہے۔ میں نے اس ملاقات کے ایک ایک لمحے کو اپنی یادوں کے دریچوں میں محفوظ کر لیا ہے۔"

"ہم تمہارے اس بے مثال تحفے کو اپنے دل و جان کے قریب رکھیں گے۔" شہزادہ خرم نے گلاب کی بکھری ہوئی پتیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحبِ عالم! یہ کتاب مجھے واپس کر دیجئے۔" ارجمند کے لہجے میں التجا شامل تھی۔

"کیوں؟" شہزادہ خرم نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ گلاب کا پھول میری زندگی ہے۔" ارجمند کی آنکھیں بند تھیں، جیسے وہ کوئی دلکش خواب دیکھ رہی ہو۔ "میں خود اسے اپنی رگ جاں کے نزدیک رکھنا چاہتی ہوں۔ اور یہی میری وصیت ہے کہ اگر میں دنیا سے گزر جاؤں تو اس پھول کو میرے کفن پر سجا دینا۔"

شہزادہ خرم نے بے قرار ہو کر ارجمند کے احمریں ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"ابھی تو ہم ملے بھی نہیں..... اور تم بچھڑ جانے کی بات کرتی ہو..... یہ کیسی بدشگونی کے الفاظ ہیں ارجمند؟" خرم کے لہجے میں بڑی خلش تھی، بڑی شکایت تھی۔

"صاحبِ عالم! روح کے فاصلے تو پہلے دن ہی سے ختم ہو چکے تھے۔" ارجمند نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے محبوب کے چہرے کو دیکھا، جہاں معصوم محبت کی بے شمار قندیلیں روشن تھیں۔ "جسموں کو تو بالآخر ایک دن بچھڑ جانا ہے۔"

"ابھی نہیں ارجمند!" شدتِ جذبات سے خرم کی آواز لرزنے لگی۔ "ابھی تو تمہیں اپنے خواب کی تعبیر دیکھنا ہے۔"

"مجھے میرے خواب کی تعبیر مل گئی صاحبِ عالم!" ارجمند، شہزادہ خرم کی آغوش میں سمٹ گئی۔ "بس یہیں زمانے کی رفتار تھم جائے۔ اس سے پہلے کہ وقت کی گردش میرے اور آپ کے درمیان کوئی آہنی دیوار کھڑی کر دے، مجھے اس عالم میں موت آ جائے اور میں اپنے صاحب کے عزت و جلال پر قربان ہو جاؤں۔"

ارجمند کے یہ الفاظ شب عروسی کا بہترین تحفہ تھے، جنہیں خرم نے دل و جان سے قبول کر لیا۔ اور پھر فضائیں کیف و نشاط سے معمور ہو گئیں۔ دو محبت کرنے والے، نغمہ بار اور خوشبو ریز ہواؤں کے دوش پر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

❀.....❀.....❀

ارسلان بیگ کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے خوش تھا کہ اس نے ارجمند بانو کی طرف سے شہزادہ خرم کے دل میں شکوک و شبہات کا زہریلا بیج بو دیا ہے۔ اگر اس بیج نے زمین پکڑ لی تو کسی دن بھی وسوسوں کا درخت پھوٹ سکتا ہے۔ اور پھر اسی درخت کی زہریلی چھاؤں، شہزادہ خرم کا سکون غارت کر سکتی ہے۔ اس اطمینان کے باوجود ارسلان بیگ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

اگر خرم نے اس کے خلاف انتقامی کارروائی کی تو پھر شہزادے کی خون آشام تلوار سے اس کی گردن کس طرح بچے گی؟ ارسلان بیگ نے سوچا۔ اور پھر اس پر ناقابل بیان دہشت طاری ہو گئی۔ ارسلان کو ہر طرف اپنی موت رقص کرتی نظر آ رہی تھی۔ اس تکلیف دہ صورتِ حال سے نجات پانے کے لئے ارسلان بیگ بہت دیر تک شراب پیتا رہا۔ پھر جب اعصاب کو کچھ سکون ہوا تو وہ لڑکھڑاتے قدموں سے رات کے اندھیرے میں گیانی آتمارام کی جھونپڑی تک پہنچا۔ گیانی کے محافظ دھرم پال نے فوراً آتمارام کو ارسلان کی آمد کی خبر دی۔ آتمارام نے اسے اندر بلا لیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

"یہ تُو نے کیا حالت بنا رکھی ہے ارسلان؟"

"گیانی! کیا تُو نہیں جانتا کہ آج ارجمند اور شہزادہ خرم کی شبِ وصال ہے؟" شدتِ جذبات اور شراب کے اثر سے ارسلان بیگ کی آواز کانپ رہی تھی اور اس کے چہرے پر محرومیوں کے گہرے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ "کیا تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں ارجمند بانو سے کتنی محبت کرتا ہوں؟"

"میں سب کچھ جانتا ہوں۔" گیانی آتمارام نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اب اس کی گھبراہٹ دور ہو چکی تھی۔

"پھر میرے دل کا حال کیوں پوچھتا ہے؟" اچانک ارسلان بیگ کا لہجہ غضب ناک ہو گیا

تھا۔ ''آج کی رات میری محبت کا خون ہو گیا اور ارجمند، شہزادہ خرم کی سیج پر چلی گئی۔ تُو نے سے وعدہ کیا تھا کہ ارجمند کو میرے قدموں میں لا کر ڈال دے گا..... مگر وہ تو اس وقت شہزادہ کی آغوش میں ہو گی۔ تیرے گیان اور تیرے منتروں کو کیا ہو گیا، آتما رام؟'' ارسلان شر جھنجلاہٹ کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ''اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ تُو بھی جھوٹا ہے اور تیرے منتر جھوٹے ہیں۔''

ارسلان نے آج براہِ راست آتما رام کو گالی دی تھی۔ گیانی بھی آگ کے کسی شعلے طرح بھڑک اُٹھا۔ ''آخر تُو کیا کہنا چاہتا ہے؟'' آتما رام نے انتہائی درشت لہجے میں ارسلا مخاطب کیا۔

''میں نے تیرے پیچھے اپنا وقت بھی برباد کیا اور دولت بھی۔'' ارسلان بیگ ہذیانی اند میں چیخ رہا تھا۔ ''میں زیادہ دیر تک اپنی خون شدہ حسرتوں کا ماتم نہیں کر سکتا۔ ارجمند میری سے بہت دُور جا چکی۔ جب تیرا گیان اسے واپس نہیں لا سکتا تو پھر تجھے اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔''

''کیا تُو اس ملک کا حکمران ہے، جو مجھ سے زندہ رہنے کا حق چھین لینا چاہتا ہے؟'' جو آتما رام نے بھی چیخ کر کہا۔

''میں حکمران تو نہیں، مگر تجھے موت کے دروازے تک پہنچا سکتا ہوں۔'' ارسلان بیگ آواز بدستور بلند تھی۔ ''میں جہانگیر سے کہہ دوں گا کہ تُو شہزادہ خرم کو اپنے جادو کے ذریعے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔'' ارسلان بیگ، شراب کے نشے میں بے سروپا باتیں کر رہا تھا۔

گیانی آتما رام چونک اُٹھا۔ اُسے ارسلان کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ ''تُو اطمینان سے بیٹھ۔ میں اپنے گیان کی طاقتوں سے ارجمند کو تیرے پاس آنے پر مجبور کر دوں گا۔'' آتما رام بڑی ہوشیاری سے ارسلان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نہیں گیانی! اب میں تیرے فریب میں نہیں آؤں گا۔'' یہ کہہ کر ارسلان جھومتا ہوا اُٹھا۔ ''میں اسی وقت انصاف کی زنجیر کھینچوں گا اور شہنشاہ کے سامنے تیرے سارے راز بے نقاب کر دوں گا۔''

آتما رام نے دھرم پال کو اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے گیانی کے کئی مسلح چیلے نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی شمشیریں بے نیام کر لیں۔

''تُو یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکتا۔'' گیانی کے محافظِ خاص، دھرم پال نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''اگر تُو نے اپنے قدموں کو جنبش دی تو تیرا جسم کئی ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور پھر یہ ٹکڑے، جمنا کے تیز پانی میں بہا دیئے جائیں گے۔''

ارسلان بیگ خوف سے کانپنے لگا۔ اُس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

''میں شہنشاہ کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔'' ارسلان چمکتی ہوئی تلواریں دیکھ کر چیخنے لگا۔

''اسے زیرِ زمین کمرے میں اس وقت تک کے لئے بند رکھو جب تک اس کا نشہ مکمل طور پر نہ اُتر جائے۔'' آتما رام نے اپنے محافظ دھرم پال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔''

گرو کا اشارہ پاتے ہی مسلح چیلے آگے بڑھے اور ارسلان بیگ کو کھینچتے ہوئے زیرِ زمین کمرے کی طرف لے جانے لگے۔

''مجھے معاف کر دے آتما رام!..... میں شہنشاہ سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' ارسلان بیگ بھکاریوں کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔ مگر گیانی کے چیلے اسے کھینچتے ہوئے لے گئے اور زمین دوز کمرے میں بند کر دیا۔

❀.....❀.....❀

صبح جب ارسلان کا نشہ اُتر گیا تو دھرم پال اُسے لے کر گیانی کے سامنے پہنچا۔

''آؤ ارسلان! آؤ۔'' آتما رام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا تیرا نشہ اُتر گیا؟''

''میں یہاں کیسے پہنچا گیانی؟'' ارسلان بیگ حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ میں تو کل رات اپنے گھر میں تھا۔ پھر یہاں کس طرح آ گیا؟''

گیانی نے اسے پورا واقعہ سناتے ہوئے تنبیہہ آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر شہنشاہ کے سامنے تیری زبان کو جنبش ہوئی تو پھر سمجھ لے کہ تیری زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔''

''نہیں گیانی! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' ارسلان بیگ حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔

''کل رات تُو نشے کی حالت میں تھا اور بار بار مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔'' آتما رام نے سخت لہجے میں کہا۔ ''انسان نشے کی حالت میں اپنے دل کی باتیں بیان کر دیتا ہے۔ اب میں اس راز سے واقف ہو چکا ہوں کہ تیرے دل میں میرے لئے نفرت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ موجود نہیں..... مگر اچھی طرح سمجھ لے کہ اگر تُو نے شہنشاہ کے سامنے میرا کوئی راز فاش کرنے کی کوشش کی تو میں بھی بھرے دربار میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ ارسلان بیگ کا نام اختیار کرنے والا کوئی مسلمان نہیں بلکہ اسلام کا لباس پہنے ہوئے ایک ہندو ہے، جو ایران سے صرف اس لئے یہاں آیا ہے کہ وہ اپنی ماں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا انتقام لے اور سازشوں کے ذریعے مغل حکومت کا شیرازہ منتشر کر دے۔''

ارسلان بیگ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آتما رام نے اسے سختی سے روکتے ہوئے کہا۔

''پہلے میری پوری بات سن لے۔ اگر تُو شہنشاہ کے سامنے میرے جادو کے قصے بیان کرے گا تو میں بھی صاف صاف کہہ دوں گا کہ اس شخص نے مجھے بھاری رشوت دے کر ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کے خلاف ورغلایا تھا۔ اور اسی نے دونوں کی تصویریں بنا کر گوپی چند کو مجسمے بنانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ تینوں مجسمے آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ اگر شہنشاہ نے ثبوت طلب کیا تو میں تمام مجسمے پیش کر دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد میری زندگی کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

مگر پھر تجھے بھی موت کے بے رحم ہاتھ نہیں چھوڑیں گے۔"

ارسلان بیگ کانپ کر رہ گیا۔

"غور سے سن لے کہ اگر زندگی چاہتا ہے تو میرے ساتھ ساتھ چل۔" آتما رام نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس سفر میں ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں۔ اگر کسی نے بھی ساتھ چھوڑا اور راستہ بدلنے کی کوشش کی تو وہ موت کا نوالہ بن جائے گا۔ اس لئے ہوش کی باتیں کر اور صبر سے کام لے۔"

ارسلان بیگ کے ہوش و حواس درست ہو چکے تھے۔ اس نے گیانی کے سامنے اعتراف کر لیا کہ وہ کل رات شراب کے نشے میں اپنے آپ کو بھول چکا تھا اور ارجمند کی شادی نے اس کی قوتِ برداشت چھین لی تھی۔

اس اعتراف کے بعد ارسلان بیگ نے آتما رام کو وہ واقعہ بھی بتا دیا، جب اس نے شہزادہ خرم کے سامنے ارجمند بانو کے کردار پر تہمت لگائی تھی۔ "اب میرا کیا ہوگا، گیانی؟ شہزادہ خرم مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" ایک بار پھر ارسلان بیگ کو اپنے قریب موت رقص کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ "مجھے کوئی ایسی ترکیب بتا دے آتما رام! کہ میں خرم کی شمشیرِ خوں آشام سے محفوظ رہ سکوں۔"

گیانی بہت دیر تک اپنے خیالات میں گم بیٹھا رہا۔ اس کا شیطانی دماغ بہت تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ آخر طویل خاموشی کے بعد آتما رام کے غلیظ ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"تُو بڑی حماقت کر بیٹھا ہے ارسلان! اب تیری نجات کا ایک ہی راستہ ہے کہ کسی طرح ملکہ نورمحل (مہرالنساء) کے غلاموں کی صف میں شامل ہو جا..... شہنشاہ، نورمحل کے عشق میں اس حد تک ڈوب چکے ہیں کہ اب ان کا اُبھرنا، ناممکن ہے۔ سمراٹ کا یہ عشق لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہی جائے گا۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ ملکہ نورمحل ہی ہندوستان پر حکومت کرے گی..... اور تیری زندگی کا انحصار بھی اسی بات پر ہے کہ تُو جلد از جلد نورمحل کی پناہ حاصل کر لے۔ پھر شہزادہ خرم تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"مگر میں ملکہ نورمحل تک کس طرح پہنچوں گا؟" ارسلان بیگ اب بھی پریشان نظر آ رہا تھا۔

"ملکہ نورمحل بھی ایران سے تعلق رکھتی ہے..... اور تُو بھی ایرانی ہے۔" آتما رام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب اس بات کا کسے ہوش ہے کہ تیری ماں ایک ہندو عورت تھی۔"

"میں تیرا مطلب نہیں سمجھا، گیانی؟" ارسلان بیگ نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"مطلب صاف ہے بالکل۔" آتما رام کے ہونٹوں پر ایک خبیث مسکراہٹ اُبھر آئی۔ "زبان اور قوم کے رشتے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ تُو ملکہ نورمحل کی تعریف کر۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد متاثر ہو جائے گی۔ جس طرح تُو شہنشاہ کو خداوند کہہ کر سجدہ کرتا ہے، اسی طرح ملکہ نورمحل کے آگے جھک جا اور اسے احساس دلا دے کہ تُو بھی ایک ایرانی ہے۔ قومیت اور زبان کا

یہ رشتہ اسے بہت جلد تیری طرف متوجہ کر دے گا۔ پھر نہ تجھے شہزادہ خرم پریشان کر سکتا ہے اور نہ ارجمند بانو۔"

یکایک ارسلان بیگ کے وحشت زدہ چہرے پر خوشی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ مگر یہ خوشی بہت عارضی تھی۔ اچانک اس کے تصور میں مبارک شاہ قلندر کا چہرہ اُبھر آیا۔

"اور اس بھکاری کا کیا ہوگا گیانی؟" ارسلان بیگ کی آواز شدتِ خوف سے لرز رہی تھی۔ "میں نے جن آدمیوں کو اس کے قتل کے لئے بھیجا تھا، وہ ناکام لوٹ آئے۔ ان نمک حراموں نے مبارک شاہ کے پیروں میں گر کر معافی مانگ لی تھی۔"

یہ انکشاف سن کر گیانی آتما رام کے جسم پر بھی لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ "اس جادوگر کو بھول جا ارسلان! وہ بھکاری ہم سے زیادہ طاقتور ہے۔ ہمیں ایسے لوگوں سے اُلجھنا نہیں چاہئے۔" آتما رام نے بھی قلندر کی روحانی طاقتوں کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا تھا۔

❀.....❀.....❀

گیانی کی ہدایت کے مطابق ارسلان بیگ، ملکہ نورمحل (مہرالنساء) کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک دن اس نے شہنشاہ جہانگیر کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہوئے کہا۔

"خداوند میں نے ملکہ نورمحل کی شان میں ایک قصیدہ تحریر کیا ہے۔ اپنے اس بندے کو اجازت دیجئے کہ یہ قصیدہ، ملکہ عالیہ کے روبرو پڑھ سکے۔"

جہانگیر، ارسلان کی اس خواہش سے بہت متاثر ہوا۔ شہنشاہ، ملکہ نورمحل کے حُسن کا اسیر تھا، اس لئے ارسلان بیگ کو اجازت دے دی گئی۔

پھر ایک دن خلوت میں جہاں ملکہ نورمحل اور جہانگیر کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا، ارسلان بیگ کو طلب کیا گیا۔ وہ باقاعدہ شاعر تو نہیں تھا، مگر اسے فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ اساتذہ کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ ان ہی یادداشتوں کے سہارے ارسلان نے ایک قصیدہ تحریر کیا تھا، جس میں شاعری کم، شہنشاہ اور ملکہ کی تعریف زیادہ تھی۔ ارسلان نے جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ خداوند کی مہربانیاں ہیں کہ مجھ جیسے ناکارہ کو ملک ہندوستان میں پناہ ملی..... اور میں بار بار شاہانہ عنایات سے نوازا گیا۔

یہ اس سرزمین کی خوش نصیبی تھی کہ تختِ شاہی پر نورالدین جہانگیر جیسا باجبروت، سخی اور عادل حکمراں جلوہ افروز ہوا۔

ابھی ایک نور کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ دوسرا نور "ملکہ نورمحل" کی شکل میں ظاہر ہوا۔

پھر ہندوستان کا ایک ایک گوشہ نور سے بھر گیا اور ساری تاریکیاں دُور ہو گئیں۔"

ارسلان بیگ نے نورالدین جہانگیر اور ملکہ نورمحل کی رعایت سے نور کے لفظ کو اس طرح استعمال کیا تھا کہ شہنشاہ اور ملکہ دونوں بہت خوش ہوئے اور ارسلان کو بیش قیمت انعامات سے

نوازا گیا۔

ملکہ نورمحل، ارسلان بیگ کے لکھے ہوئے قصیدے سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ اس نے جہانگیر کے مصاحب کو مصاحبِ خاص کا درجہ دے دیا۔ شہنشاہ بھی پہلے سے زیادہ مہربان نظر آنے لگا۔ جہانگیر نے ارسلان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تیری یہ خوبی آج ہی ہم پر ظاہر ہوئی ہے۔ اب تجھے لازم ہے کہ تُو مغلوں کی شاندار فتوحات کو اشعار میں نظم کر۔ اور ملکہ نورمحل کی شان میں نئے قصیدے لکھ، کہ ہم تجھ پر مزید انعامات کی بارش کر سکیں۔'' یہ کہہ کر جہانگیر نے ملکہ نورمحل (مہرالنساء) کی طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر دوبارہ ارسلان بیگ سے مخاطب ہوا۔ ''اب ہندوستان میں ملکہ نورمحل ہی سب کچھ ہیں۔ اگر وہ کسی سے راضی ہیں تو ہم بھی راضی ہیں۔ اور اگر وہ کسی سے خفا ہیں تو پھر اس بدنصیب شخص کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس پر ہندوستان کی زمین تنگ ہو چکی ہے۔'' جہانگیر، نورمحل کو خوش کرنے کے لئے خود بھی ملکہ کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگا۔

ارسلان بیگ، مغل حکمرانوں کی فتوحات کا حال تو کیا قلم بند کرتا مگر اسے ملکہ نورمحل کی قربت حاصل ہو گئی تھی۔ ارسلان بیگ کی عیار نظروں نے ایک ہی ملاقات کے دوران اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ ملکہ نورمحل ذہین ہونے کے باوجود ایک خوشامد پسند عورت ہے۔ ارسلان نے نورمحل کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ملکہ ہند کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔

اب نورمحل اسے خلوت میں بھی طلب کرنے لگی تھی اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ ملکہ ہند، ارسلان سے حکومت کے بارے میں بھی مشورے لیتی۔ وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ نورمحل کے ذہن میں یہ بات اُتارنے کی کوشش کرتا کہ ایرانی ثقافت، مغلوں اور ہندوؤں کی ثقافت سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور اسی ثقافت کو ملک کے طول و عرض میں رائج ہونا چاہئے۔

ملکہ نورمحل بڑے غور سے ارسلان بیگ کی باتیں سنتی اور اس کے گلرنگ چہرے پر عجیب سی مسرتیں رقص کرنے لگتیں۔

''آپ پہلی اور آخری ملکہ ہیں، جو ہندوستان میں ایرانی تہذیب و ثقافت کو فروغ دے سکتی ہیں۔'' ارسلان بیگ انتہائی پُر جوش لہجے میں کہتا۔ ''ایران عظیم ہے اور آپ اس کی عظمتوں کی پاسبان ہیں۔''

''میں بہرحال ایک عورت ہوں، جسے خود مختاری حاصل نہیں۔'' نورمحل بھی ارسلان کی باتوں سے متاثر ہو کر اپنے دل کی بات کہہ دیتی۔

''آپ کی یہ سوچ درست نہیں ملکۂ عالیہ!'' ارسلان، نورمحل کو حوصلہ دینے کی کوشش کرتا۔ ''آپ خود مختاری سے بھی زیادہ اختیار رکھتی ہیں۔ خداوندِ ہندوستان آپ کے زیرِ اثر ہیں۔ اب آپ کو مزید کسی اختیار کی ضرورت نہیں۔ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک حرف حکم آخر کا درجہ رکھتا ہے۔'' ارسلان بیگ، ملکہ نورمحل پر خوشامد اور تعریف کے وہ حربے آزما رہا تھا، جو کبھی

رائیگاں نہیں جاتے۔ اپنی تعریف سن کر بڑے بڑے بت پگھل جاتے ہیں۔ ارسلان نے بھی وہی آگ روشن کر رکھی تھی، جس کی حرارت سے ملکہ نورمحل بھی پگھلتی جا رہی تھی۔ ''ابھی تک خداوند، ہندو تہذیب کے زیرِ اثر ہیں۔ انہیں اہلِ ہنود کے دائرے سے نکال کر ایرانی ثقافت کے حصار تک لے جائیے۔ آپ یہ کام بہت آسانی سے کر سکتی ہیں۔ اگر خداوند نے ایرانی رسم و رواج کو قبول کر لیا تو اپنے آبائی وطن کے لئے آپ کی یہ عظیم الشان خدمت ہو گی، جسے تاریخ کے اوراق سے کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔''

ارسلان نے بڑی آسانی سے نورمحل کو شیشے میں اتار لیا تھا۔

ایک دن ملکۂ ہند نے اس سے کہا۔

''ارسلان! تُو مختلف کتابوں کا مطالعہ کر۔ تاکہ مجھے ایران ثقافت کو عظیم تر ثابت کرنے میں آسانی ہو۔ میں شہنشاہ کو آہستہ آہستہ اس طرف رجوع کروں گی۔ اس سلسلے میں تُو ہی میرا وکیل ہو گا۔ اور ایک وکیل کو اس قدر لائق ہونا چاہئے کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی عدالت میں ناقابلِ تنسیخ دلائل کے ساتھ اپنا مقدمہ پیش کر سکے۔''

ارسلان بیگ اپنی جگہ سے اٹھا اور ملکہ نورمحل کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ ''ملکۂ عالیہ میرا پہلا سجدہ قبول کریں۔ کل تک میں خداوند کا بندہ تھا، مگر اب صرف آپ کی بندگی کا طوق میری گردن میں ہے۔''

ارسلان بیگ نے بے ضمیری کی انتہا کر دی تھی۔ وہ بیک وقت مبارک شاہ قلندر، شہزادہ خرم، ارجمند بانو اور ہندوستان کے بے شمار مسلمانوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

جب ملکہ نورمحل نے ارسلان کو اس طرح اپنے سامنے سجدہ ریز پایا تو اس کے غرورِ حُسن نے نئے انداز سے کروٹ لی۔ اب وہ محض ایک ایرانی عورت تھی اور ہندوستان کے گوشے گوشے پر اپنی ملکی ثقافت کا غلبہ چاہتی تھی۔

پھر ایک دن نورمحل کے حکم پر ارسلان بیگ کو شاہی ''دارالمطالعہ'' کا نگراں بنا دیا گیا۔ سلطنت کے دوسرے امیروں نے اس تبدیلی کو عام سی تبدیلی سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملکہ نورمحل کے اس حکم کے پیچھے کیسی خوف ناک سازش پرورش پا رہی ہے۔

اب ارسلان بیگ دن رات کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہتا۔ بظاہر اس کی دنیا بدل گئی تھی مگر درپردہ وہ ایک ایسا منصوبہ تشکیل دے رہا تھا کہ اس کے انجام پا جانے کی صورت میں ہندوستان کے مسلمان منتشر ہو کر رہ جاتے اور پھر ایک طویل خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

۞.....۞.....۞

ارجمند بانو اور شہزادہ خرم کی زندگی نئی مسرتوں سے ہم کنار ہو چکی تھی۔ سرکاری امور کی انجام دہی کے بعد شہزادہ خرم اپنا بیشتر وقت ارجمند بانو کے ساتھ گزارتا۔ ایرانی شہزادی پہلے بھی اس کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکی تھی، ارجمند سے شادی کے بعد وہ مزید دُور ہوتی چلی گئی۔

اگرچہ شہزادہ خرم نے اسے بارہا سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ایک بدمزاج عورت تھی۔ نسلی اور خاندانی برتری میں ہر وقت مبتلا رہنے والی ایک مغرور عورت۔ وہ اکثر شہزادہ خرم سے جھگڑا کرتی اور طعنہ زنی سے کام لیتی۔ شہزادہ خرم ایک حلیم الطبع انسان تھا۔ وہ اپنی پہلی بیوی کے طعنوں کو ہنس کر برداشت کر لیتا۔ مگر جب ایرانی شہزادی بدتمیزی سے پیش آتی اور ارجمند بانو کی خاندانی حیثیت پر اعتراض کرتی تو شہزادہ خرم بھڑک اُٹھتا۔

''ارجمند کسی پست خاندان کی لڑکی نہیں۔ وہ بھی امیرزادی ہے۔''

شہزادہ خرم اپنی دوسری بیوی کا دفاع کرتا تو ایرانی شہزادی مزید چراغ پا ہو جاتی۔ ''میرے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ میرا تعلق شاہوں کے خاندان سے ہے اور ارجمند کے بزرگ، شاہی خاندان کے ملازم تھے۔ اس لئے تمہیں دونوں کے درمیان واضح فرق رکھنا ہوگا۔''

شہزادہ خرم نے بہت چاہا کہ اس کے ازدواجی تعلقات بگڑنے سے بچ جائیں لیکن جب ایرانی شہزادی نے اپنا رویہ تبدیل نہیں کیا تو شہزادہ خرم بھی خاموش نہ رہ سکا۔

''اگر ارجمند کسی نیچ خاندان کی لڑکی ہوتی، تب بھی اسے اوّلیت کا درجہ حاصل ہوتا۔ اس لئے کہ وہ میری پہلی محبت ہے۔'' شدید غصے میں ہونے کے باوجود خرم کا لہجہ بہت شائستہ ہو گیا۔

''جو ارجمند سے محبت کرے گا، میں اس سے محبت کروں گا۔ اور جسے ارجمند سے نفرت ہوگی، وہ میری نظروں سے بھی گر جائے گا۔''

ایرانی شہزادی ایک تنگ دل عورت تھی۔ وہ ارجمند بانو کی حیثیت کو تسلیم نہیں کر سکی اور شہزادہ خرم سے دُور ہوتی چلی گئی۔

ارجمند بانو نے اس موقع پر بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا اور اپنے شوہر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آخر وہ آپ کی بیوی ہیں۔ ان کی کوتاہیوں کو نظرانداز کر دیجئے۔ یہ اس کی فطرت ہے کہ ایک عورت دوسری عورت کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔''

''اور تم بھی تو ایک عورت ہو۔ پھر تم اس سے حسد کیوں نہیں کرتیں؟'' شہزادہ خرم نے ارجمند سے پوچھا۔

''صاحبِ عالم! میری بات چھوڑ دیجئے۔'' ارجمند بے اختیار ہو کر خرم کے شانے پر سر رکھ دیتی۔ ''میں صرف آپ سے ہی نہیں، آپ کے تمام حوالوں سے بھی محبت کرتی ہوں۔ ایرانی شہزادی آپ کی شریک حیات ہیں۔ اس لئے مجھے ان سے بھی محبت ہے۔''

ارجمند کا جواب سن کر شہزادہ خرم کے چہرے پر عجیب سی سرشاری کا رنگ اُبھر آتا اور وہ انتہائی وارفتگی کے عالم میں بول اُٹھتا۔ ''مجھے تم پر فخر ہے ارجمند! تمہارے بغیر میری زندگی کس قدر نامکمل تھی، آج اس کا احساس ہو رہا ہے۔''

ارجمند یہ سن کر شرما جاتی۔ اور اس کا چہرہ شفق رنگ ہو جاتا۔

۞.....۞.....۞

شادی کے تقریباً ایک سال بعد شہزادہ خرم نے اپنے دوست سکندر مرزا کو تنہائی میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سکندر! ہمارا خیال ہے کہ اب تم بھی شادی کر لو۔ کب تک یہ خشک اور تنہا زندگی بسر کرو گے؟''

سکندر مرزا نے اپنے گرد بکھری ہوئی کتابوں پر نظر ڈالی اور چند لمحوں کے لئے تصورات کی دنیا میں کھو گیا۔ سکندر مرزا اس دنیا میں ایک تنہا انسان تھا۔ اس کے ماں باپ، بچپن میں انتقال کر چکے تھے۔ وہ اسی مکتب میں پڑھتا تھا، جس میں شہزادہ خرم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ خرم کو سکندر مرزا سے بہت محبت تھی۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد خرم اسے محل میں لے آیا اور سکندر مرزا کی تربیت اس طرح ہونے لگی، جیسے وہ خود بھی شہزادہ ہو۔

جہانگیر نے بیٹے کی سفارش پر سکندر مرزا کے لئے بہترین اتالیق مقرر کئے تھے۔ اگرچہ سکندر مرزا کی شاہی خاندان سے دُور کی رشتے داری بھی تھی، لیکن وہ شہزادہ خرم کو محض اپنا دوست سمجھتا تھا۔ سکندر مرزا نے چھوٹی سی عمر میں سیاست اور مذہب پر گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اگر کبھی خرم کسی معاملے میں اُلجھ جاتا تو سکندر مرزا اسے بڑی آسانی سے حل کر دیتا۔ اس طرح سکندر مرزا، شہزادہ خرم کا دوست بھی تھا اور مشیر بھی۔

آج جب شہزادہ خرم نے اس کی تنہائی کا ذکر کیا تو سکندر مرزا کچھ دیر کے لئے اپنے خیالات میں کھو کر رہ گیا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر شاہراہِ حیات پر نظر ڈالی۔ زندگی کی رہ گزر دُور تک خالی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو سکندر مرزا؟'' شہزادہ خرم نے اپنے دوست کو دوبارہ مخاطب کیا۔

سکندر مرزا چونک کر شہزادہ خرم کی طرف دیکھنے لگا۔

''صاحبِ عالم! مجھے خود بھی اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ مگر اپنی قسمت کو کیا کروں کہ اب تک کوئی شریکِ سفر ہی نہیں ملا۔ بے چین روحوں کی اس دنیا میں ایک لڑکی پسند آئی تھی، مگر وہ میری طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتی۔''

شہزادہ خرم نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''کون ہے وہ لڑکی؟..... سکندر! اُس کا نام تو لو۔ ہم ایک دن اسے مجبور کر دیں گے کہ وہ تمہاری طرف متوجہ ہو جائے۔''

''صاحبِ عالم کا اقتدار اپنی جگہ، مگر دلوں کی سلطنت کو جبر سے تسخیر نہیں کیا جاتا۔'' سکندر مرزا کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ ''بظاہر وہ ایک معمولی سی لڑکی ہے، جو صاحبِ عالم کی نافرمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مگر دلوں کی دنیا کے آداب نرالے ہوتے ہیں۔ دلوں کو اقتدار کی طاقت سے فتح نہیں کیا جا سکتا۔''

پھر جب سکندر مرزا نے ارجمند بانو کی کنیز ماہ رخ کا نام لیا تو شہزادہ خرم کو سکتہ سا ہو گیا۔

''سکندر مرزا! وہ لڑکی تمہارے قابل نہیں ہے۔'' کچھ دیر بعد شہزادہ خرم کے ہونٹوں کو

جنبش ہوئی۔

"نہیں صاحبِ عالم!" سکندر مرزا نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "حالات تو یہ بتاتے ہیں کہ میں خود اس لڑکی کے قابل نہیں ہوں۔"

"مجھے تمہاری پسند اور انتخاب پر شدید حیرت ہے سکندر!" خرم کے لہجے میں ناخوشگواری کا رنگ شامل تھا۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ قسمت میرے ساتھ اُلٹی چالیں چلتی ہے۔" سکندر مرزا کی مسکراہٹ کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔ مگر اس سے شکست کی جھلک نمایاں تھی۔ "میں جانتا ہوں کہ ماہ رخ ایک عام سی کنیز ہے۔ مگر دل کو کیا کروں کہ وہ اسی کی طلب رکھتا ہے۔"

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" شہزادہ خرم نے پوچھا۔

"صاحبِ عالم خوب جانتے ہیں کہ میں اپنے فیصلے تبدیل نہیں کرتا۔" سکندر مرزا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو میں ارجمند بانو سے ماہ رخ کے سلسلے میں بات کروں گا۔" خرم نے سکندر مرزا کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ مگر اسے دل سے یہ رشتہ پسند نہیں تھا۔

❀.....❀.....❀

اور جب ارجمند بانو نے اس ذیل میں ماہ رخ سے بات کی تو وہ وفادار کنیز حیران رہ گئی۔

"بی بی! میں یہ کیسی عجیب بات سن رہی ہوں؟ کہاں ایک شاہی خاندان کا فرد اور کہاں یہ غلاموں کی اولاد؟..... دونوں میں کوئی جوڑ، کوئی نسبت ہی نہیں۔"

ارجمند بانو نے ماہ رخ کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "سکندر مرزا تمہیں دل سے پسند کرتے ہیں۔"

"مگر میں تو انہیں پسند نہیں کرتی۔" ماہ رخ کے لہجے میں تلخی شامل تھی۔

"اگر میں کہوں کہ تم سکندر مرزا سے شادی کر لو۔" ارجمند بانو نے درمیان میں اپنا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

"میں پھر بھی انکار کر دوں گی۔" ماہ رخ نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "اگر آقا زادی مجھ سے جان دینے کے لئے کہیں تو میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کروں گی۔ اور ساری دنیا دیکھ لے گی کہ ماہ رخ، ارجمند بانو کے حکم پر ہنستے ہنستے قربان ہو گئی۔"

ماہ رخ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ارجمند بانو سناٹے میں آ گئی۔

"بی بی! آپ اس معاملے میں مداخلت نہ کریں۔" ماہ رخ نے کہا۔ "میں خود سکندر مرزا سے بات کروں گی کہ آخر انہیں ایک کنیز کے ساتھ یہ سنگین مذاق کرنے کی اجازت کس نے دی ہے؟"

❀.....❀.....❀

اور پھر ایک دن تنہائی میں ماہ رخ، سکندر مرزا سے ملی۔

"اگرچہ یہ مشرقی روایت کے خلاف ہے کہ لڑکیاں غیر مردوں سے خود اس موضوع پر گفتگو کریں۔ لیکن آپ کی اس حرکت نے مجھے شدید آزار پہنچایا ہے اور میں یہ پوچھنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ شاہی خاندان کے افراد کو اس قسم کا مذاق کرنے کے علاوہ دنیا میں کوئی دوسرا کام نہیں ہے؟"

سکندر مرزا نے بڑے تحمل کے ساتھ ماہ رخ کی تلخ گفتگو سنی اور پھر بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔ "میں نے شہزادہ خرم کے سامنے تم سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ نہیں کہا تھا کہ میں تمہیں اپنے عشرت کدے کا کھلونا بنانا چاہتا ہوں۔" سکندر مرزا کا طرزِ کلام اتنا عجیب تھا کہ ماہ رخ کچھ دیر کے لئے پتھر کا ایک مجسمہ بن کر رہ گئی۔ وہ حیرت و سکوت کے عالم میں مسلسل سکندر مرزا کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی، جہاں سچے جذبوں کا عجیب سا اُجالا اور پُرخلوص تمناؤں کی عجیب سی روشنی تھی۔ پھر یکایک ماہ رخ کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو غلط سمجھا تھا۔" شدتِ جذبات سے ماہ رخ کی آواز لرز رہی تھی۔ "میں آپ کا بہت احترام کرتی ہوں۔ مگر زندگی کے سفر میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ آپ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور مجھ پر کیا گزری ہے۔"

"میں تمہیں تمہاری زندگی کے تمام تر حادثات کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔" سکندر مرزا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"مگر میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔" ماہ رخ اتنی دیر میں سنبھل چکی تھی۔ اس نے اونچی آواز میں کہا اور جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

"مذہب کے مطالعے نے مجھے سکھایا ہے کہ انسان اپنے کردار سے بلند اور پست ہو جاتا ہے۔ میں شاہ اور مزدور میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔" سکندر مرزا نے کسی تکلف اور بناوٹ کے بغیر اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"میرا کردار اس لائق نہیں کہ وہ آپ کے نظریات کی تائید کر سکے۔" یہ کہہ کر ماہ رخ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"پھر بھی ہم تمہارا انتظار کریں گے ماہ رخ!" یہ کہہ کر سکندر مرزا بھی کھڑا ہو گیا۔

"اپنی زندگی کو روگ نہ لگائیں۔ میں تو موت کی منزل کی مسافر ہوں۔" ماہ رخ چلی گئی اور دیر تک کمرے کی فضا میں اس کے الفاظ کی گونج سنائی دیتی رہی۔

❀.....❀.....❀

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔

میواڑ کے راجپوت اب تک مغل سلطنت کے لئے ایک دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ راجپوتانہ کی تمام حکومتوں میں میواڑ ایک ایسی حکومت تھی، جس نے اب تک مغلوں کی بے پناہ قوت کا مقابلہ کیا تھا۔ اگرچہ اکبر اعظم نے راجپوتوں کے اقتدار پر کئی شدید ضربیں لگائی تھیں، لیکن یہ بہادر قوم اب بھی آزادی کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔

جہانگیر نے برسرِ اقتدار آتے ہی میواڑ کی طرف کئی لشکر روانہ کئے مگر انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ مہابت خان، عبداللہ خان، فیروز جنگ اور راجہ باسو جیسے سپہ سالار بھی راجپوتوں کے اُٹھے ہوئے سروں کو جھکا نہیں سکے۔ مجبوراً خانِ اعظم کو کا، کو امیرِ لشکر بنایا گیا لیکن اس معرکے میں وہ بھی سرخرو نہ ہو سکا۔

آخر ایک دن شہنشاہ جہانگیر نے شہزادہ خرم کو طلب کر کے کہا۔

''فرزند! راجپوتوں کی ٹیڑھی گردنیں ہمارے اقتدار کی بساط پر ایک بدنما داغ ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ تم ان گردنوں کے خم دُور کر دو اور میواڑ کے حکمران کو اس کے تخت سے کھینچ کر جھکے ہوئے سر کے ساتھ دربارِ شاہی تک پہنچا دو۔''

شہزادہ خرم اس رات ایک لمحے کے لئے بھی نہ سو سکا۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا امتحان تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں اپنے محل سے نکلا اور حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار کی طرف بڑھنے لگا، جہاں مبارک شاہ قلندر ایک شکستہ جھونپڑی میں خاموش پڑا رہتا تھا۔

جب خرم، مبارک شاہ کی جھونپڑی میں داخل ہوا تو قلندر دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو بہہ رہے تھے۔

''اے خدا! اب تیرا یہ گناہ گار بندہ بہت تھک چکا ہے..... انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئی ہیں..... مگر وہ آنے والا ابھی تک نہیں آیا۔ چھوٹے چھوٹے لوگ اپنے گھروں میں خدا بن بیٹھے ہیں..... اور دربار میں پہنچ کر ایک مٹی کے کھلونے کو مسلسل سجدے کر رہے ہیں۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جاتا۔ میں نے جہانگیر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر دولت و اقتدار نے اسے اندھا بنا دیا ہے۔ شاہی محلات میں ہر طرف اس نے اپنے بت نصب کرا دیئے ہیں..... اور یہ

نفس کے پجاری اُسے خدا کا درجہ دے رہے ہیں۔ میری آنکھوں کی روشنی زائل کر دے کہ میں شرک اور بت پرستی کے یہ مناظر نہ دیکھ سکوں۔ یا مجھے اپنے پاس واپس بلا لے۔ اب میں اس دنیا میں زیادہ دیر رہنا نہیں چاہتا۔''

قلندر کی دعاؤں نے فریاد کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ مبارک شاہ کے لہجے میں اس قدر گداز تھا کہ شہزادہ خرم کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس کی آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

پھر جب قلندر کا شور و فغاں تھم گیا تو شہزادہ خرم نے مبارک شاہ کو آواز دی۔

''کون ہے؟'' قلندر نے کہا۔ مگر اُس کی آنکھیں بند تھیں۔

''میں ہوں۔ آپ کا خادم، شہزادہ خرم۔''

خرم کا نام سن کر مبارک شاہ نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''آؤ شاہ جہاں!..... میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

خرم نے نیازمندانہ طور پر سر جھکا دیا اور بہت آہستہ لہجے میں بولا۔ ''بابا! روز و شب کے ہنگاموں سے فرصت نہیں ملی۔''

''ایسے ہنگامے تھے کہ بابا کو بھی بھول گیا۔'' قلندر نے شکایتاً کہا۔ مگر اُس کے ایک ایک لفظ سے شدید محبت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''شادی کا ایسا جشن منایا کہ آگرے کی ایک ایک گلی جگمگا اُٹھی۔ مگر بابا کو پوچھا تک نہیں۔''

فرطِ ندامت سے خرم کا سر کچھ اور جھک گیا۔

''ہم فقیروں کو کسی کی شادی سے کیا تعلق..... مگر تیری شادی میں شریک ہونے کی خواہش رکھتے تھے۔'' مبارک شاہ نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''سوچا تھا کہ اپنے شاہ جہاں کو نذر پیش کریں گے۔ مگر تیری طرف سے تو کوئی دعوت نامہ ہی نہیں آیا۔ بن بلائے کیسے چلے آتے؟ بس اسی جھونپڑی میں پڑے پڑے اپنی نارسائی کا ماتم کرتے رہے۔''

''بابا! میں اپنی ندامت کا اظہار کس طرح کروں؟ میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔'' شہزادہ خرم نے رک رک کر کہا۔

''اور ملکۂ عالیہ کو بھی ہمارا خیال نہیں آیا۔'' مبارک شاہ نے ارجمند بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شہزادہ خرم لاجواب ہو کر رہ گیا۔

جب خاموشی طویل ہو گئی تو مبارک شاہ نے شہزادہ خرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھ جاؤ شاہ جہاں!'' مبارک نے اسی چٹائی کی طرف اشارہ کیا، جس پر ایک بار ارجمند بانو بھی بیٹھ چکی تھی۔ ''یہ تختِ ہندوستان ہے۔''

شہزادہ خرم ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر خاک آلود چٹائی پر بیٹھ گیا۔

''رات کے پچھلے پہر تم اس فقیر کے پاس کیوں آئے ہو؟'' مبارک شاہ نے نہایت شفقت

آمیز لہجے میں کہا۔ ''آخر ایسا کون سا ضروری کام ہے؟''

''بابا! عالم پناہ نے مجھے میواڑ کی جنگی مہم کے لئے منتخب کیا ہے۔'' شہزادہ خرم بہت آہستہ بول رہا تھا۔

''عالم پناہ تو صرف خدا کی ذات ہے۔'' مبارک شاہ کے لہجے میں بڑا جلال تھا۔ ''تم ایک انسان کو عالم پناہ کہتے ہو؟''

شہزادہ خرم، قلندر کے اس سوال کا کیا جواب دیتا؟ بس اتنا کہہ کر رہ گیا۔ ''میں جانتا ہوں۔ مگر آدابِ شاہی کی خلاف ورزی کس طرح کروں؟''

''فانی اور بے دست و پا انسانوں نے اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لئے کیسے کیسے لقب تراشے ہیں۔'' قلندر کے الفاظ میں جلال کی وہی آگ روشن تھی۔ ''اگر خدا تمہیں اقتدار دیدے تو تم ایسا ہرگز نہ کرنا۔''

شہزادہ خرم نے شرمساری کے ساتھ سر جھکا لیا۔

''شہنشاہ کیا چاہتا ہے؟'' جہانگیر کا نام آتے ہی قلندر کے لہجے کی تپش کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''یہی کہ میں اس جنگی مہم کی قیادت کروں اور راجپوتوں کو مغل سلطنت کے آگے جھکنے پر مجبور کر دوں۔'' خرم نے شہنشاہ کے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں پناہ میری جنگی صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔'' شہزادہ خرم کی زبان ایک بار پھر لڑکھڑا گئی تھی۔

''پھر اس فقیر کے پاس کیوں آئے ہو؟' مبارک شاہ نے بے نیازی کے انداز میں کہا۔ ''اپنی فوجیں لے جاؤ اور میواڑ پر حملہ کر دو..... تلواروں سے تلواریں ٹکرائیں گی، سر جسموں سے جدا ہوں گے، خون بہے گا اور پھر جو ہونا ہے، ہو جائے گا۔ تمہارا باپ ہمیں بھکاری کہتا ہے۔ اور وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ بے شک! ہم کسی کے در کے بھکاری ہیں..... اور ایک بھکاری تمہیں کیا دے سکتا ہے؟''

''میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔'' شہزادہ خرم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تمہارے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟'' مبارک شاہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم ہمارا حلیہ نہیں دیکھتے..... نہ تن پر لباس ہے اور نہ پیٹ کے لئے روٹی۔ بس سر چھپانے کو ایک جھونپڑی ہے، جو کسی بندۂ خدا نے ترس کھا کر بنا دی تھی..... تمہیں کیا ہو گیا ہے شاہ جہاں! بھکاریوں کے پاس مانگنے آئے ہو؟'' مبارک شاہ آج بالکل بدلی ہوئی شکل میں نظر آ رہا تھا۔

شہزادہ خرم بہت دیر تک خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا، پھر یکایک پُر جوش لہجے میں کہنے لگا۔ ''کبھی مجھے شاہ جہاں کہہ کر پکارتے ہیں..... کبھی میرے ہاتھوں ہندوستان کے تخت و تاج فروخت کر دیتے ہیں..... پھر کبھی اپنے آپ کو بھکاری کہتے ہیں۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے بابا؟''

''یہ سب میری دیوانگی کی حرکتیں ہیں شاہ جہاں!..... انہیں فراموش کر دے۔'' مبارک شاہ نے بیزاری کے لہجے میں کہا۔ ''میں واقعتاً بھکاری ہوں۔ میرے پاس تجھے دینے کے لئے کچھ

بھی نہیں ہے۔ اگر میری دعاؤں میں اتنی ہی تاثیر ہوتی کہ میدانِ جنگ کا نقشہ بدل جاتا تو پھر میں اپنے لئے دعا کیوں نہیں کرتا؟ اگر میری زبان سے ادا ہونے والے الفاظ میں ایسا ہی اثر ہوتا تو سب سے پہلے میں اپنی غربت دور کرنے کے لئے دعا مانگتا۔'' قلندر مسلسل اپنی ذات کی نفی کر رہا تھا۔

''میں اس راز سے باخبر ہوں کہ شہنشاہ نے آپ کو سیم و زر کے انبار کی پیشکش کی تھی..... اگر آپ دولت کے اس ذخیرے کو قبول کر لیتے تو یہ افلاس کبھی کا دُور ہو چکا ہوتا۔'' شہزادہ خرم نے ایک مضبوط دلیل دیتے ہوئے کہا۔ ''شہنشاہِ وقت کو سجدے سے انکار کرنے والا کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کے مقام سے تو واقف نہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ میرے لئے آپ کی ذات بہت محترم ہے۔ آپ معرفت کے شہنشاہ ہیں یا ایک عام بھکاری، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو آپ کا ہو چکا۔ اب اس دروازے سے اُٹھ کر کہیں اور نہیں جاؤں گا۔''

شہزادہ خرم کے لہجے میں اس قدر بے ساختگی اور اپنائیت تھی کہ مبارک شاہ بے قرار ہو گیا تھا اور اس نے اپنے مصلے سے اُٹھ کر خرم کو گلے سے لگا لیا۔ پھر شہزادے کی پیشانی پر طویل بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا تھا کہ میرا شاہ جہاں یہی جواب دے گا۔'' قلندر کی آواز میں بڑا سوز تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ''تجھے کیا خبر شاہ جہاں! کہ تیرے لئے کیا کیا دعائیں کرتا ہوں۔ مگر میں تم سے اس لئے ناراض تھا کہ تم نے مجھے شادی کے موقع پر کیوں یاد نہیں کیا؟ پھر اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ مبارک شاہ! تُو ایک بھکاری ہے، شاہوں کی تقریب میں تیرا گزر کیا معنی؟''

شہزادہ خرم نے بے قرار ہو کر قلندر کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا مگر مبارک شاہ نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھ کھینچ لئے۔ ''نہیں شاہ جہاں!..... اپنی محبت کو بت پرستی کا رنگ نہ دے۔''

''یہ بت پرستی نہیں بابا!..... عقیدت ہے۔'' شہزادہ خرم نے اپنے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بت پرستی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''پہلے لوگ ایک انسان کے ہاتھ چومتے ہیں اور پھر ایک دن اسی کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیتے ہیں۔'' مبارک شاہ نے بلند آواز میں کہا۔ ''شیطان کے بہکانے کے انداز بڑے پُر فریب ہوتے ہیں۔ اگر محبت و عقیدت اعتدال میں نہ رہے تو بت پرستی ہو جاتی ہے۔''

شہزادہ خرم سنبھل گیا۔ مبارک شاہ کے اس کردار نے خرم کو اور بھی متاثر کیا تھا۔

''بابا! میرا خدا گواہ ہے کہ مصروفیات کے ہنگامے میں مجھے یاد نہیں رہا۔'' خرم، مبارک شاہ کو اپنی شادی کی تقریب میں نہ بلانے کا عذر پیش کر رہا تھا۔ ''آپ تو وہ ہیں کہ میں آپ کی شرکت پر ناز کرتا۔ مگر اپنی بدنصیبی کو کیا کروں کہ اس سعادت سے محروم رہا۔''

''نہیں شاہ جہاں!..... گزری باتوں کا ملال نہ کر۔ ہم نے تو بس یوں ہی شکایت کر دی

تھی۔" مبارک شاہ نے خرم کی کوتاہی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر دعوت نامہ مل جاتا تو کچھ دیر کے لئے خوش ہو جاتے کہ اس دنیا میں ہمارا بھی کوئی ہے۔"

"بابا! اس غلطی کا ازالہ تو ممکن نہیں، مگر میں کل صبح شاہی سواری بھیج کر آپ سے درخواست کروں گا کہ میرے مکان پر تشریف لائیں۔ یہ تقریب صرف آپ کے اعزاز میں کافی ہو گی۔" شہزادہ خرم نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"بس..... بس....." مبارک شاہ نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "تُو نے دعوت نامہ دے دیا اور ہم نے قبول کر لیا۔ ہم سے اتنا ربط وضبط نہ بڑھا کہ شہنشاہ کو گراں گزرے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے باپ اور بیٹے کے درمیان بدگمانیاں پیدا ہوں۔"

"تو پھر میں ارجمند بانو کو لے کر خود حاضر ہوں گا۔"

"ہاں۔ ملکۂ عالیہ کو دیکھے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔" قلندر کی آواز سے حسرت ٹپک رہی تھی۔

"بابا! آپ اسے ملکۂ عالیہ کیوں کہتے ہیں؟ وہ تو آپ کی کنیز ہے..... محض ایک ادنیٰ کنیز۔" شہزادہ خرم کے لہجے میں بناوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے بول رہا تھا۔

"ملکہ کو ملکہ ہی کہا جاتا ہے۔" مبارک شاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ارجمند بانو کنیز تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر اس کے اور میرے درمیان کوئی دوسرا رشتہ قائم ہو سکتا ہے تو پھر وہ میری بیٹی ہے۔ اور ایک باپ نے بہت دن سے اپنی بیٹی کو نہیں دیکھا ہے۔"

پھر شہزادہ خرم نے کوئی بات نہیں کی اور خاموشی سے رات کے اندھیرے میں اپنے محل کی طرف لوٹ گیا۔

❀.....❀.....❀

دوسرے دن سہ پہر کے وقت شہزادہ خرم اپنی بیوی ارجمند بانو اور چند مخصوص خادموں کے ساتھ مبارک شاہ قلندر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ شاہی ملازمین اپنے ہاتھوں میں خوان اُٹھائے ہوئے تھے اور خوانوں میں سونے چاندی کے سکے بھرے ہوئے تھے۔

جب ارجمند بانو، قلندر کی جھونپڑی میں داخل ہوئی تو مبارک شاہ آنکھیں بند کئے کسی خیال میں غرق تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر قلندر نے آنکھیں کھول دیں اور ارجمند کو سامنے پا کر کھڑا ہو گیا۔

"میری ملکۂ عالیہ آ گئی۔"

ارجمند کے پیچھے پیچھے شہزادہ خرم بھی جھونپڑی میں داخل ہوا تھا۔

"بابا! آپ ہر بار مجھے ملکۂ عالیہ کہہ کر پکارتے ہیں اور میں شرمندہ ہو جاتی ہیں۔" ارجمند سر جھکائے ہوئے مبارک شاہ کے سامنے کھڑی تھی۔

"پھر کیا کہوں؟" قلندر، ارجمند کی سادگی پر مسکرانے لگا۔

"ایک بار تو بیٹی کہہ کر آواز دیں۔" جوشِ جذبات میں ارجمند کی آواز کانپنے لگی تھی۔ "کیا میں یہ حسرت لئے ہوئے دنیا سے چلی جاؤں گی؟"

"نہیں۔ میری بیٹی اس وقت تک دنیا سے نہیں جائے گی، جب تک ہندوستان کا تخت اس کے قدموں کے نیچے نہیں آ جائے گا۔" مبارک شاہ نے ارجمند کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تُو میری بیٹی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ملکۂ عالیہ بھی ہے۔" یہ کہہ کر مبارک شاہ اس شکستہ صندوق کی طرف بڑھا، جو ایک گوشے میں رکھا ہوا تھا۔

اس صندوق میں قلندر کے چند کپڑے تھے۔ مبارک شاہ نے صندوق کھولا اور کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر وہ پلٹ کر آیا تو اس کے ایک ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔

شہزادہ خرم اور ارجمند بانو بڑی حیرت سے مبارک شاہ کے پُراسرار عمل کو دیکھ رہے تھے۔

پھر مبارک شاہ نے اپنی بند مٹھی کھولی۔ قلندر کی ہتھیلی پر چاندی کے دو روپیہ صاف نظر آ رہے تھے۔

"یہ روپے میں نے تم دونوں کی شادی کے موقع پر تحفہ دینے کے لئے رکھے تھے۔" اتنا کہہ کر مبارک شاہ نے ایک روپیہ ارجمند بانو کی طرف بڑھایا۔ "ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق ہی تحفہ دے سکتا ہے۔" قلندر نے ارجمند بانو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! مبارک شاہ کی حیثیت بس اتنی ہی تھی۔ اسے قبول کر لو۔"

اس محبت پر ارجمند کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے اور اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ قلندر کے ہاتھ سے چاندی کا روپیہ لے لیا۔

"بابا! یہ کم حیثیت روپیہ نہیں، ارجمند کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔"

اس کے بعد قلندر نے دوسرا روپیہ شہزادہ خرم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بابا کی طرف سے یہ اپنے شاہ جہاں کے لئے ہے۔"

خرم قدرے جھکا اور اس نے ادب واحترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلندر کے ہاتھوں سے روپیہ لے لیا۔

"بے شک! یہ تحفہ تم دونوں کے شایانِ شان نہیں..... مگر ایک فقیر اس سے زیادہ دے بھی نہیں سکتا۔" مبارک شاہ، خرم سے مخاطب تھا۔ "یہی میرا سرمایہ تھا جو میں نے تمہاری نذر کر دیا۔ کئی دن تک مزدوری کرنے کے بعد یہی دو روپے جمع ہو سکے تھے۔"

شہزادہ خرم اور ارجمند پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ "بابا! یہ ایک روپیہ، ہندوستان کے سارے خزانے پر بھاری ہے۔ اس سے آپ کی محنت اور پسینے کی مہک آتی ہے۔ یہ خوشبو، لعل و جواہر میں کہاں؟"

"میں نے اپنے دونوں بچوں کو انسانی خون میں ڈوبا ہوا تحفہ نہیں دیا ہے۔" مبارک شاہ کی

بے خواب آنکھوں میں غیرت کی آگ روشن تھی۔ ”میں نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ دوسروں کی نذر قبول کروں اور خیرات میں حاصل کیا ہوا وہ روپیہ تمہارے دامن میں ڈال دوں۔“

شہزادہ خرم اور ارجمند بانو دونوں دم بخود کھڑے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مبارک شاہ اپنی روزی کے معاملے میں اتنا محتاط اور حساس ہوگا۔

”بابا! مجھے بہت رنج ہے کہ آپ نے میری خاطر اس قدر مشقت اٹھائی۔“ ارجمند نے اپنی شادی کے اس تحفہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کم قیمت ہوتے ہوئے بھی سب تحفوں پر گراں تھا۔

”کوئی مشقت نہیں اٹھائی۔“ مبارک شاہ نے کہا۔ ”مجھ سے بھی زیادہ محنت کرنے والے تمہاری سلطنت میں گم نام زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی محنتوں کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی رعایا کی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم غفلت کی نیند سوتے رہو اور تمہارے ہاتھوں بندگانِ خدا کے حقوق کا خون ہو جائے۔ میری مشقت کا ذکر چھوڑ کر ان لوگوں کی محرومیوں کا احساس کرو، جنہیں شدید محنت کے بعد بھی ایک روپیہ حاصل نہیں ہوتا۔“

یہ ایک بڑی تنبیہہ تھی، بڑا سبق تھا جسے ارجمند بانو اور شہزادہ خرم نے بغور سنا مگر زبان سے کچھ نہیں بولے۔

”بس اب تم لوگ جاؤ اور ایک ناکارہ شخص کی صحبت میں اپنا قیمتی وقت برباد نہ کرو۔“ مبارک شاہ نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ابھی بہت کام کرنے ہیں۔ اور تمہاری ذمہ داریاں مجھ سے کہیں زیادہ ہیں۔“

”بابا! ہم لوگ آپ کی نذر کے لئے.....“ شہزادہ خرم نے ڈرتے ڈرتے کہا اور اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کہاں ہے وہ نذر؟“ مبارک شاہ نے چونک کر کہا۔

”شاہی خدمت گار، دروازے پر آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔“ خرم نے جواباً کہا۔

”انہیں اندر بلاؤ۔“ مبارک شاہ نے بے نیازی کے انداز میں کہا۔

شاہی خدمت گار سونے اور چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے خوان اُٹھائے اندر آئے۔ مبارک شاہ نے ایک ایک خوان کو کھول کر دیکھا۔ روپہلی اور نقرئی سکے جگمگا رہے تھے۔

”شاہ جہاں! تُو نے کبھی غور سے ان سکوں کو دیکھا؟“ یکایک مبارک شاہ پلٹ کر شہزادہ خرم سے مخاطب ہوا۔

خرم کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ قلندر کے اس سوال کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا۔

”میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ان سکوں سے انسانی خون رس رہا ہے۔“ مبارک شاہ کے چہرے پر اچانک اذیت و کرب کی ایک لہر اُبھر آئی تھی۔ ”میں اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں کہ ان

سے گاڑھا گاڑھا، گرم گرم انسانی خون ٹپک رہا ہے۔“

اب خرم، مبارک شاہ کی باتوں کا مطلب سمجھ گیا تھا اور احساسِ ندامت سے اس کی گردن جھک گئی تھی۔

”اپنے بابا کو نذر کرنے کے لئے انسانی خون لایا ہے؟“ مبارک شاہ نے بڑے کرب ناک لہجے میں شہزادہ خرم سے سوال کیا۔

شرمندگی کے بوجھ سے خرم کا سر اور جھک گیا تھا۔

”مجھے جو بھی کچھ میسر ہے، وہی تو نذر کروں گا۔“ خرم کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ”آپ جیسا چاندی کا وہ روپیہ کہاں سے لاؤں؟“

”شاہ جہاں! آج تو میں تیری نذر قبول کئے لیتا ہوں مگر آئندہ اس حالت میں میرے پاس نہ آنا کہ تیرے خدمت گار، انسانی خون سے بھرے ہوئے طشت اپنے سروں پر اٹھائے ہوں۔“ قلندر کے لہجے میں ناگواری کا رنگ شامل تھا۔ ”مجھے تیرا خالی ہاتھ آنا اچھا لگتا ہے۔“

یہ کہہ کر مبارک شاہ نے ان تمام خوانوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور شاہی خدمت گاروں سے کہا کہ وہ تمام سکے ان غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیں، جو میرے شہنشاہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی مملکت میں رہتے ہیں۔

مبارک شاہ کا اشارہ ان محتاجوں کی طرف تھا، جو ساری دنیا سے مایوس ہو کر حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزارِ مبارک کے قریب سوالیوں کی طرح راستے میں پڑے رہتے تھے۔ قلندر کا حکم پاتے ہی تمام سیم و زر، ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

پھر جب شہزادہ خرم اور ارجمند بانو رخصت ہونے لگے تو مبارک شاہ نے خرم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا کی۔

”اے لازوال قوتوں والے! اپنے اس بندے خرم پر کرم فرما۔ اس کے راستے کی رکاوٹوں کو دُور کر دے۔ اور اسے دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ رکھ۔ تیرے سوا اس کا کوئی مشکل کشا اور کوئی دستگیر نہیں۔“

دعا کے بعد قلندر نے شہزادہ خرم کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”جب تیرا گزر اجمیر کی طرف ہو تو پہلے سلطان الہندؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضری دینا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا خدا اس دربار کی برکتوں سے تیری ساری مشکلیں آسان کر دے گا۔“

(سلطان الہند، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا لقب ہے۔ آپ کا روضۂ مبارک اجمیر شریف میں ہے۔ جہاں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر بھی پیادہ پا اس طرح جاتا تھا کہ اس کے پیروں میں جوتے تک نہ ہوتے تھے۔ مبارک شاہ قلندر نے شہزادہ خرم کو سلطان الہندؒ کے اسی دربارِ سعادت میں حاضر ہونے کی ہدایت کی تھی۔)

۞.....۞.....۞

ارسلان بیگ جب سے ملکہ نورمحل کی مصاحبت کے حلقے میں شامل ہوا تھا، اس کے کچھ اختیارات بھی بڑھا دیئے گئے تھے۔ اب ارسلان بیگ کو دو ہی کام تھے۔ ایک یہ کہ روز و شب کتابوں کا مطالعہ کرنا اور دوسرے شہزادہ خرم کی جاسوسی کرانا۔ جب اس کے مخبروں نے خبر دی کہ ارجمند بانو اور شہزادہ خرم، مبارک شاہ سے ملنے کے لئے اس کی جھونپڑی تک گئے تھے تو ارسلان بیگ کے سینے میں نفرت و انتقام کی آگ بھڑکنے لگی۔ وہ بیک وقت ارجمند بانو، شہزادہ خرم اور مبارک شاہ قلندر سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ ارسلان بیگ نے بڑی ہوشیاری سے اس ملاقات کا حال ملکہ نورمحل کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسی منافقت ہے کہ شہنشاہ ایک بھکاری کو لعنت زدہ قرار دیتے ہیں اور پھر وہی بھکاری، بیٹے کی نظر میں محترم قرار پاتا ہے۔''

ملکہ نورمحل پہلے بھی مبارک شاہ کا ذکر سن چکی تھی، مگر جب اسے یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس نے چونک کر ارسلان بیگ کی طرف دیکھا۔

''ملکۂ عالیہ! یہ بھکاری بھی ہمارے راستے کی بڑی رکاوٹ ہے۔'' ارسلان بیگ نے نہایت عیاری کے ساتھ قلندر کی کردار کشی شروع کر دی۔ ''وہ بھکاری ایک بڑا شعبدہ باز ہے اور اس کی ان ہی شعبدہ بازیوں سے متاثر ہو کر شہزادۂ عالم، وقارِ شاہی کو مجروح کر رہے ہیں۔ انہیں لازم تھا کہ جسے خداوند نے ٹھکرا دیا، وہ بھی اس کے منہ پر تھوک دیتے۔''

ملکہ نورمحل خاموشی سے مبارک شاہ کے بارے میں سنتی رہی اور پھر اس نے اسی رات کو جہانگیر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

''خرم دونوں اعتبار سے میرے لئے ایک بیٹے کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر مجھے اس کی یہ ادا پسند نہیں آئی کہ وہ ایک ایسے انسان سے ربط و ضبط رکھے، جسے شہنشاہ نے ناپسندیدہ قرار دے دیا ہو۔'' ملکہ نورمحل بھی بڑی ہوشیاری سے شوہر کی مزید ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ''اگر اس شعبدہ باز کے اختیار میں دنیا کی ساری نعمتیں ہوں، تب بھی میں اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھوں کہ وہ میرے محبوب کی نظروں میں ایک لعنت زدہ انسان ہے۔''

نورمحل کے اس طرزِ گفتگو نے جہانگیر کو مسحور کر دیا۔

''ہم تمہارے جذبات کی سچائی سے واقف ہیں نورمحل!'' جہانگیر نے ملکۂ ہند کی مشک بار زلفوں میں سر چھپاتے ہوئے کہا۔ ''خرم ابھی نادان ہے، اس لئے وہ ایک ناکارہ انسان کی صحبت میں اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔'' بظاہر جہانگیر نے اس بات کو ٹال دیا تھا، مگر اس کے دل پر گہری چوٹ لگی تھی۔ قلندر کا ذکر آتے ہی شہنشاہ کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر اُبھر آیا تھا، جب قلندر نے جہانگیر کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ شہنشاہ کی بڑی ناکامی تھی۔ وہ اس کو قتل کرا دینا چاہتا تھا مگر ہر بار اس پر عجیب سی وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور پھر جب مبارک شاہ کی پیش گوئی کے مطابق شہزادہ خسرو کو اندھا کر دیا گیا تو شہنشاہ مزید خوف میں مبتلا ہو گیا۔ مجبور ہو کر اس

نے قلندر کو رہا کر دیا۔ مگر اب بھی جہانگیر کے دل میں یہ خلش باقی تھی کہ وہ ایک بھکاری کو اپنے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور نہیں کر سکا تھا۔ اب ملکہ نورمحل نے مبارک شاہ کا ذکر کیا تو جہانگیر کی شکست و ناکامی کا زخم دوبارہ خون دینے لگا۔

''ہم نے اسے محض ایک مجبور انسان سمجھ کر معاف کر دیا ہے۔'' جہانگیر نے اپنی ناکامی پر جھوٹ کا بردہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''مگر یہ کم ظرف، ظلِ الٰہی کی اس عنایت و نوازش کا مفہوم نہیں سمجھے گا۔'' ملکہ نورمحل نے اپنے خاص ناز و ادا کا مظاہرہ کیا اور جہانگیر کو مبارک شاہ کے خلاف ورغلانے کی کوشش کی۔

''آخر تم کیا چاہتی ہو، نورمحل؟'' جہانگیر نے چونک کر پوچھا۔

''ایسے نافرمان بھکاری کا دارالحکومت کی حدود میں رہنا مناسب نہیں۔'' ملکہ نورمحل بڑے پیچ و خم کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی۔ ''جب تک وہ یہاں موجود رہے گا، لوگ اسے دیکھ کر سوچتے رہیں گے کہ ایک نافرمان کو بھی معاف کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح جب تک مبارک شاہ، آگرے میں موجود ہے، اس وقت تک وقارِ شاہی بھی مسلسل مجروح ہوتا رہے گا۔ جہاں پناہ اگر اپنی رحمدلانہ فطرت سے مجبور ہو کر اسے قتل نہیں کرا سکتے تو پھر شہر بدر کرا دیجئے تاکہ نافرمانی کی یہ علامت، رعایا کی نظروں سے پوشیدہ ہو جائے۔''

جہانگیر اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لئے فوراً ہی قلندر کی شہر بدری پر آمادہ ہو گیا۔

''تمہاری تجویز عین مزاجِ شاہی کے مطابق ہے۔'' جہانگیر نے نورمحل کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم کل ہی اس بھکاری کو آگرے کی حدود سے بہت دُور نکل جانے کا حکم جاری کر دیں گے۔''

ملکہ نورمحل، شدتِ جذبات سے وارفتہ ہو گئی۔ اب اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ شہنشاہ دوسرے معاملات میں بھی آہستہ آہستہ اُس کے زیر اثر آتا جا رہا ہے۔

❀.....❀.....❀

پھر اسی رات جہانگیر نے خواب میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کو دیکھا۔ آپ شدید غیظ و غضب کے عالم میں شہنشاہ کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔

''تجھے کیا ہو گیا ہے سلیم؟ ہم سے نسبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور ہمارے چاہنے والوں کو آزار بھی پہنچاتا ہے۔ کیا ہم نے اسی دن کے لئے دعائیں کی تھیں کہ تُو دنیا میں آئے اور خدا کے بندوں کو ناحق پریشان کرے؟..... خبردار! مبارک شاہ کو آئندہ ہاتھ بھی نہ لگانا۔ تُو بہت پہلے جل کر خاک ہو گیا ہوتا، مگر خدا کو یہی منظور تھا کہ مبارک شاہ آزمائش کے اس مرحلے سے گزرے اور ساری دنیا اس کی ایمانی طاقت کا مشاہدہ کر لے۔ تُو مبارک شاہ کو نہیں جانتا کہ وہ ہمارا محبوب ہے۔ اگر اسے آگرے کی گلیوں سے نکالا گیا تو تیرے محلات بھی ویرانے میں تبدیل ہو

جائیں گے۔ اور یہ بھی یاد رکھ! کہ اب اگر مبارک شاہ کے جسم پر کوئی زخم آیا تو ہندوستان کے کوچے کوچے میں ایک خونیں سیلاب اُبھرے گا اور قصرِ شاہی کی اونچی اونچی دیواریں اس سیلاب میں غرق ہو جائیں گی۔"

یہ بڑا دہشت ناک خواب تھا۔ جہانگیر کی آنکھ کھلی تو اس کا پورا جسم پسینے میں ڈوب چکا تھا اور دل و دماغ پر وحشت سی طاری تھی۔ آج اُسے اندازہ ہوا تھا کہ مبارک شاہ کون ہے؟

دوسرے دن ملکہ نورمحل نے باتوں ہی باتوں میں مبارک شاہ کی شہر بدری کا ذکر کیا تو جہانگیر نے اپنی محبوب ملکہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جانِ آرزو! تم مبارک شاہ کی بات نہ کرو۔ اسے آگرے کی حدود سے دُور نہیں کیا جا سکتا۔" یہ کہہ کر جہانگیر نے اپنا خواب بیان کر دیا۔

"یہ محض آپ کے خیالاتِ پریشان ہیں جو خواب کی شکل میں ڈھل گئے تھے۔" نورمحل نے ایک بار پھر بڑی ذہانت کے ساتھ جہانگیر کو مبارک شاہ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔

"ہمارے خیالات پریشان ہی سہی، مگر جس خواب کو حضرت شیخ سے نسبت ہو، ہم اس کے ایک ایک زاویے کو درست سمجھتے ہیں۔" جہانگیر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "مبارک شاہ کچھ بھی سہی، لیکن اب ہمیں اس کا وجود برداشت کرنا ہی ہوگا۔"

ملکہ نورمحل کے عیار بدن نے ایک اور کروٹ لی۔ "کیا آپ ایک قبر کو اتنی اہمیت دیتے ہیں؟"

"قبر کی بات نہیں نورمحل!" جہانگیر نے ملکہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہم حضرت شیخ کی دعاؤں سے پیدا ہوئے تھے، اس لئے ان کے ہر حوالے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اگر شیخ ہمیں خواب میں بھی حکم دیں تو ہم ہندوستان کا تخت و تاج چھوڑ سکتے ہیں۔"

نورمحل نے جہانگیر کی باتوں سے اندازہ کر لیا کہ وہ شیخ سلیم چشتیؒ کی محبت سے سرشار ہے، اس لئے اس نے بڑی خوب صورتی سے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

"حضرت شیخ کا معاملہ دیگر ہے۔ لیکن میں اس شخص کو برداشت نہیں کر سکتی، جو شہنشاہ کی نافرمانی کا مرتکب ہوا ہے۔ میرے مذہب میں یہ گناہ ناقابلِ معافی ہے۔" نورمحل بڑے زور و شور سے اپنی محبت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"ہم تمہارے جذبات کی بہت قدر کرتے ہیں نورمحل! تمہیں ایسا ہی سوچنا چاہئے۔" جہانگیر، نورمحل کے الفاظ کے جال میں گرفتار ہو چکا تھا۔ "بے شک! تم نے محبت کے مذہب کو زندہ کر دیا۔ مگر پھر بھی تمہیں ہماری خاطر مبارک شاہ کو برداشت کرنا پڑے گا۔"

ملکہ نورمحل نے مجبوراً خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن مبارک شاہ کی طرف سے اس کے دل میں گرہ پڑ گئی۔

۞.....۞.....۞

پھر میواڑ کی تسخیر کے لئے جہانگیر خود اجمیر روانہ ہوا۔ شہزادہ خرم بھی اس کے ہمراہ تھا۔

جب آگرے سے روانگی کا وقت آیا تو ارجمند بانو نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی اس سفر میں شوہر کے ساتھ جائے گی۔ شہزادہ خرم نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر ارجمند بانو یہی کہتی رہی۔

"میں صاحبِ عالم کو کسی بھی حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ارجمند! یہ ایک نازک اور سنگین سفر ہے۔" شہزادہ خرم نے آخری دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ہم کسی پُرفضا مقام کی تفریح کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ میواڑ کے سرکش راجپوتوں سے معرکہ آرائی کا مرحلہ ہے۔ میدانِ جنگ میں اس طرح تمہارا جانا مناسب نہیں۔"

"مجھے یہ پورا حق ہے کہ میں عرصۂ کارگزار میں آپ کے دوش بدوش رہوں۔" ارجمند نے خرم کی دلیل کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

"تم سے تمہارا یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔ مگر میری خواہش ہے کہ تم کشت و خون کی اس ہولناک فضا سے دور رہو۔" شہزادہ خرم ہر قیمت پر چاہتا تھا کہ ارجمند بانو اپنا ارادہ بدل ڈالے۔ مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مجبوراً ارجمند کو بھی شریکِ سفر ہونا پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شہزادہ خرم کو ارجمند بانو کی شدید جذباتی محبت کا اندازہ ہوا تھا۔ ورنہ شاہی محلات کی فضا یہ تھی کہ بیگمات کو اپنے شوہروں کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور شوہر اپنی بیویوں کی موجودگی کو فراموش کر دیتے تھے۔

شہزادہ خرم نے باپ کے سامنے ارجمند بانو کی ضد کا تذکرہ کیا تو شہنشاہ نے یہ کہہ کر اجازت دے دی۔ "اسے بھی اپنے ہمراہ لے چلو۔ کچھ دن کے لئے آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی اور اس تبدیلی کا ارجمند کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔"

شہنشاہ کی اجازت کے بعد شہزادہ خرم مطمئن ہو گیا۔ مگر پھر بھی اسے سفر کی سختیوں کا احساس تھا اور وہ ارجمند کو راستے کی تکلیفوں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

اجمیر پہنچنے کے بعد جہانگیر، سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوا۔ دوسرے دن شہزادہ خرم، ارجمند کو لے کر اس درویش کے دربار میں حاضر ہوا، جہاں بڑے بڑے باجبروت شہنشاہ سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔

شہزادہ خرم، سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے حضور پہنچا تو اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اس موقع پر اسے مبارک شاہ قلندر بہت شدت کے ساتھ یاد آیا۔ خرم سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضرت خواجہؒ کے روضۂ مبارک سے اس قدر جلال و جبروت ظاہر ہوگا۔ مغل شہزادہ بہت دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے گریہ وزاری کے ساتھ اپنی فتح کے لئے دعا مانگی..... اور دوسرے دن بارہ ہزار فوج لے کر خان اعظم "عزیز کوکہ" کی جنگی مہم کو تقویت دینے کے لئے روانہ ہو گیا۔

۞.....۞.....۞

محاذِ جنگ پر پہنچنے کے چند دن بعد ہی شہزادہ خرم کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بوڑھے سپہ سالار، خانِ اعظم کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکے گا۔ خرم کو عزیز کوکہ کی تاخیری کارروائیوں سے بہت شکایت تھی۔ بالآخر ایک دن شہزادے کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے خانِ اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کی یہ سست روی جاری رہی تو دس سال میں بھی میواڑ کی تسخیر ممکن نہیں۔''

''شہزادے! تمہارے جوان خون میں بہت گرمی ہے۔ اور خون کی گرمی کے سہارے کوئی جنگ نہیں لڑی جا سکتی۔ میری چالوں کو غور سے دیکھو اور انتظار کرو کہ ان کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔''

شہزادہ خرم خاموش ہو گیا۔ مگر چند دن کے بعد بھی خانِ اعظم نے اپنے لشکروں کو کوئی جنبش نہیں دی۔ شہزادہ خرم نے اس پر مزید سوالوں کی بارش کر دی مگر خانِ اعظم یہی کہتا رہا۔ ''تمہیں بڑے سکون کے ساتھ میرے منصوبوں کا جائزہ لینا ہوگا۔''

خان اعظم کے جواب نے خرم کو مزید برہم کر دیا۔ شہزادے نے فوراً ایک قاصد بھیج کر جہانگیر کو خانِ اعظم کی روش سے باخبر کیا۔ شہنشاہ نے فوراً ابراہیم حسین کو روانہ کیا تاکہ وہ خانِ اعظم کو وقت کی نزاکت اور وفا شعاری کی ضرورت کا احساس دلا سکے۔ مگر یہ سفارت بھی ناکام ثابت ہوئی۔ خانِ اعظم نے اپنا راستہ نہیں بدلا۔ اب خرم کے لئے عزیز کوکہ کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر خانِ اعظم کو نظر بند کر دیا اور اپنی اس کارروائی کی اطلاع جہانگیر کو پہنچا دی۔ شہنشاہ نے فوری طور پر مہابت خان کو بھیجا تاکہ وہ خانِ اعظم کو ایک قیدی کی حیثیت سے اجمیر لے آئے۔

خانِ اعظم سے نجات حاصل کرنے کے بعد اب شہزادہ خرم، محاذِ جنگ پر تنہا کھڑا تھا لیکن اسے ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ خرم چاہتا تھا کہ وہ اپنے طور پر نئی جنگی حکمت عملی ترتیب دے اور اس کی منصوبہ بندی میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو سکے۔

اس جنگی مہم کو سر کرنے کے لئے شہزادہ خرم نے اپنی ذات کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت نئے نئے زاویوں سے دشمن پر حملہ کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ سب سے پہلے خرم نے اپنے ساتھیوں کا اعتماد حاصل کیا۔ تمام فوجیوں نے تلواروں پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائیں کہ معرکہ آرائی کے وقت آسمان کی آنکھ ان کی پشت نہیں دیکھے گی۔ سپاہیوں کے جوشِ جذبات کا یہ حال تھا کہ راجہ سورج سنگھ نے ایک ہاتھ میں تلوار لی اور دوسرے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل۔ پھر اس نے شہزادہ خرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''صاحبِ عالم! ہماری اُمنگیں اس جلتی ہوئی مشعل کی طرح ہیں۔ ممکن ہے کہ تیز ہوا کے جھونکوں میں ہم خود بھی بجھ جائیں۔ مگر اس سے پہلے دشمن کے ایک ایک ٹھکانے کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔''

راجہ سورج سنگھ کے چچا نے اسے منع بھی کیا مگر وہ پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا۔ شہزادہ خرم نے جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کر دی تھیں اور رسد کے عام راستے بند کر دیئے تھے۔ اس حکمت عملی نے دشمن کو ایک مخصوص دائرے میں محصور کر دیا تھا۔

جنگ آہستہ آہستہ طول کھینچتی چلی گئی۔ میواڑ کی خودمختاری کے دن پورے ہو چکے تھے۔ سامانِ رسد ختم ہو جانے کے باعث ہر طرف بھوک کے عفریت منہ کھولے کھڑے تھے، جو بڑا سنگین مرحلہ تھا۔ اب راجپوتوں کے سامنے دو محاذ تھے۔ ایک طاقتور دشمن..... دوسرا بھوک۔ راجپوتوں کو یقین تھا کہ ناہموار پہاڑی علاقے، مغل فوجوں کو آگے بڑھنے سے روک دیں گے۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ مختلف مقامات پر ناکہ بندی کے بعد ان کے شکم روٹی کے ایک ٹکڑے کو ترسیں گے۔ اس صورتِ حال نے راجپوت سپاہیوں میں شدید خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔

جب شہزادہ خرم، راجپوتوں کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا تھا، اسی زمانے میں اسے خوشخبری ملی۔ شاہی قاصد نے خرم کو خبر دی کہ اس کے یہاں ایک خوب صورت لڑکی پیدا ہوئی ہے..... اور ظلِ الٰہی نے اس کا نام ''جہاں آرا'' تجویز کیا ہے۔ یہ خبر سن کر شہزادہ کچھ دیر کے لئے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا، جہاں ایک معصوم بچی اپنے باپ کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اور باپ خونخوار ارادوں کے ساتھ دشمن کی کمیں گاہوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جب شہزادی ''جہاں آرا'' کی پیدائش کی خبر لشکر میں عام ہوئی تو تمام فوجی سرداروں نے خرم کو بیٹی کی پیدائش پر مبارک باد دی۔

راجہ سورج سنگھ نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

''صاحبِ عالم! یہ آپ کے جاں نثار سپاہی اس وقت اپنے گھر والوں سے بہت دُور ہیں۔ پھر اس مبارک خبر کو سننے کے بعد ہم لوگ کیا نذر پیش کریں؟ ہمارے پاس بے نیام شمشیروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بس یہی دعا کر سکتے ہیں کہ شہزادی جہاں آرا کی اس دنیا میں آمد مبارک ثابت ہو۔''

''بس تمہارے یہی جذبات میرے لئے سب سے بڑی نذر ہیں۔'' شہزادہ خرم نے اپنے جاں نثار سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جن کے چہرے راجستھان کی گرمی سے جھلس کر تانبے کی طرح سرخ ہو گئے تھے۔

راجہ سورج سنگھ اور دوسرے فوجی سرداروں نے شہزادہ خرم سے یہ بھی کہا۔ ''اگر صاحبِ عالم، شہزادی جہاں آرا کو دیکھنے کے لئے اجمیر واپس جانا چاہیں تو تمام فوجیوں کو دلی مسرت ہوگی۔''

''نہیں سورج سنگھ! ہم اپنے جہاں نثاروں کو محاذِ جنگ پر تنہا چھوڑ کر اجمیر واپس نہیں جا سکتے۔'' شہزادہ خرم نے بڑے بے نیازانہ انداز میں کہا۔ ''بے شک! ایک باپ کا دل اپنی معصوم بچی کو دیکھنے کے لئے بے چین ہے..... مگر میواڑ کی مہم کو اس کے اختتام تک پہنچائے بغیر ہم چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ اس وقت ہم باپ نہیں، صرف ایک سپاہی ہیں جس کی نظروں کے سامنے محاذِ

جنگ کے سوا کوئی دوسری شے موجود ہی نہیں۔"

شہزادہ خرم کا جواب سن کر راجہ سورج سنگھ اور دوسرے فوجی سرداروں نے سرِ اطاعت خم کر دیا اور بڑی جی داری کے ساتھ دُشوار گزر راستوں پر آگے بڑھتے رہے۔

تقریباً ایک ماہ بعد راجپوتوں کے پاس سامانِ رسد بالکل ختم ہو گیا اور وہ بھوکے مرنے لگے۔ یہ بڑی خوف ناک صورتِ حال تھی۔ چتوڑ کے حکمراں، رانا امر سنگھ کی راتوں کی نیندیں اُڑ گئیں۔ بہادر اور غیور راجپوت اب بھی جان کی بازی لگانے اور آخری سانس تک لڑنے کا عہد کر رہے تھے۔ رانا امر سنگھ جانتا تھا کہ اس کے چند سرفروش اپنے دعوے میں سچے ثابت ہو سکتے ہیں مگر اس طرح چتوڑ کی خود مختاری کو بچایا نہیں جا سکتا۔ جن راجپوت سپاہیوں کو مغل تلواریں قتل نہیں کر سکتیں، انہیں ایک دن بھوک مار ڈالے گی۔ یہاں تک کہ چتوڑ کا ایک ایک گوشہ، لاشوں سے بھر جائے گا۔

آخر امر سنگھ نے مجبور ہو کر شہزادہ خرم سے صلح کی بات شروع کر دی۔ ان مذاکرات کی کامیابی کے نتیجے میں ایک دن رانا امر سنگھ خود شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے با آواز بلند کہا۔

"آج کے بعد سے میں چتوڑ کے قلعے کو مستحکم نہیں کروں گا اور تمام عمر مغل شہنشاہ کا وفادار رہوں گا۔ مگر میری ایک درخواست ہے کہ مجھے دربار کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ میرے بجائے میرا بیٹا کرن سنگھ، دربارِ جہانگیری میں حاضر ہو گا اور میری نمائندگی کرے گا۔"

شہزادہ خرم نے اس صلح نامے کو توثیق کے لئے خدمتِ شاہی میں روانہ کیا۔ جہانگیر نے ناقابلِ بیان مسرت کے عالم میں یہ خبر سنی اور صلح نامے کی توثیق کرتے ہوئے کاغذ پر اپنی ہتھیلی کا نشان ثبت کر دیا۔

جب صلح نامے کی نقل لے کر رانا امر سنگھ واپس جا رہا تھا تو اس کی گردن جھکی ہوئی تھی مگر اس نے اپنی ذہانت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے چتوڑ کو مکمل تباہی سے بچا لیا تھا۔

رانا امر سنگھ کے جانے کے بعد اس کا بیٹا کرن سنگھ، شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خرم نے کرن سنگھ کے ساتھ برابری کا سلوک کیا اور طویل ملاقات میں ایک لمحے کے لئے بھی رانا کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک شکست خوردہ انسان ہے۔ شہزادہ خرم نے کرن سنگھ کو ایک خلعتِ خاص عطا کیا، جو قیمتی جواہرات سے مرصع تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تلوار، ایک خنجر، طلائی زین سے آراستہ ایک عربی النسل گھوڑا اور ایک خاص ہاتھی بھی عنایت کیا۔ شہزادہ خرم کی یہ نوازشات دیکھ کر رانا کرن سنگھ بہت جذباتی نظر آنے لگا۔ پھر اُس نے انتہائی پُرجوش لہجے میں کہا۔

"شہزادے! آپ ایک اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ آپ نے جس طرح میرے ساتھ فراخ دلانہ سلوک کیا ہے، میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ آپ اگر چاہتے تو اپنے دربار میں ایک مفتوح

انسان کو ذلیل بھی کر سکتے تھے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک شکست خوردہ شخص ہوں مگر پھر بھی راجپوت زادہ ہوں۔ اور آج ایک راجپوت زادہ آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔" یہ کہہ کر رانا کرن سنگھ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ جواب میں شہزادہ خرم نے بھی یہی عمل کیا۔ پھر جب دونوں ہاتھ ملے تو شہزادہ خرم نے محسوس کیا کہ رانا کرن سنگھ کے ہاتھ میں سردی کے بجائے جذبات کی گرمی شامل ہے۔

علاء الدین خلجی کے بعد شہزادہ خرم دوسرا سپہ سالار تھا، جس کے آہنی ہاتھ نے چتوڑ کے سر سے خود مختاری و آزادی کا تاج اُتار لیا تھا۔ جب اس فتح کی خبر جہانگیر کے کانوں تک پہنچی تو اس نے بے اختیار ہو کر کہا تھا۔

"خرم نے میرے پریشان خواب کو ایک زندہ تعبیر بخشی ہے۔ وہ اس سخت آزمائش میں پورا اُترا۔ یقیناً خرم عظیم مغلوں کا عظیم وارث ہے۔"

شہنشاہ کے ان الفاظ کی بازگشت بہت دُور تک سنی گئی۔ اس موقع پر ملکہ نور محل بھی بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ آخر شہزادہ خرم اُس کی حقیقی بھانجی ارجمند بانو کا شوہر تھا۔ اسی رشتے سے ملکہ نور محل، خرم کی کامیابی کو اپنے خاندان کی کامیابی سمجھ رہی تھی۔

اور ارجمند بانو کی خوشی کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی معصوم بچی جہاں آرا کے شاداب چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری بیٹی! تُو اپنے باپ کے لئے نئی مسرتوں اور نئی کامرانیوں کا پیغام لے کر آئی ہے۔"

پھر جب شہزادہ خرم فاتحانہ انداز میں اپنے باپ سے ملنے کے لئے اجمیر کی طرف بڑھا تو جہانگیر نے تمام درباری امراء کو حکم دیا کہ وہ کئی منزل دُور نکل کر شہزادہ خرم کا استقبال کریں اور شہزادے کو قیمتی تحائف نذر کریں۔ خرم نے اپنے اس یادگار استقبال کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ وہ ایک سنگین آزمائش سے گزر کر منزلِ مراد تک پہنچا تھا۔

جب شہزادہ خرم، محل کے قریب پہنچا تو شدتِ جذبات میں جہانگیر بھی دروازے سے باہر نکل آیا اور بیٹے کو سامنے پا کر بے اختیار اُس سے لپٹ گیا۔ کئی بار اس نے شہزادے کے ماتھے اور رخساروں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"عظیم مغلوں کا عظیم وارث..... میرا لائق ترین فرزند، خرم شہزادہ۔"

۞.....۞.....۞

طویل جدائی کے بعد شہزادہ خرم، ارجمند بانو اور اپنی بیٹی جہاں آرا کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ پھر جب اس نے ارجمند بانو کو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ سرخ و شاداب رخساروں پر افسردگی اور زردی نمایاں تھی۔ شہزادہ خرم نے مضطرب ہو کر کہا۔ "یہ کیا ہے ارجمند؟"

"زمانۂ فراق کی پرچھائیاں ہیں، صاحبِ عالم!" ارجمند بانو نے شرماتے ہوئے کہا۔

"اب آپ تشریف لے آئے ہیں تو رنج و ملال کے سارے عکس خود بخود مٹ جائیں گے۔"

کہہ کر ارجمند بانو نے شہزادہ خرم کے شانے پر سر رکھ دیا۔ اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یک بیک جلتی ہوئی دھوپ سے کسی لالہ زار کے نرم و لطیف سائے میں آ گئی ہے۔

پھر جب بہت دیر اسی عالم میں گزر گئی تو یکایک ارجمند بانو نے چونک کر کہا۔ "صاحب عالم! جہاں آرا آپ کی منتظر ہے۔"

اور پھر جب شہزادہ خرم نے اپنی معصوم بچی کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ "یہ تو تم ہو ارجمند!" جہاں آرا اور ارجمند بانو کے چہروں میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔ شہزادہ خرم بہت دیر تک جہاں آرا کو پیار کرتا رہا جس نے اس کی زندگی کو نئی خوشیوں سے ہمکنار کر دیا تھا۔

۞.....۞.....۞

پھر اجمیر کے طویل قیام کے دوران شہزادہ خرم کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلا بیٹا 20 مارچ 1615ء کو اس دنیا میں آیا جس کا نام داراشکوہ رکھا گیا۔ اور 23 جون 1616 کو دوسرے بیٹے، شاہ شجاع نے آنکھیں کھولیں۔ اسی سال اجمیر میں خرم کی چوبیسویں سالگرہ منائی گئی۔ مغل شہزادے کو سونے اور چاندی میں تولا گیا۔

اسی سال یہ ناگوار واقعہ پیش آیا کہ جشنِ سالگرہ کے موقع پر جہانگیر نے یہ کہہ کر خرم کو شراب پلائی۔ "بیٹے! اب تُو کئی بچوں کا باپ ہو گیا ہے، اس لئے تجھ پر لازم ہے کہ شراب سے اپنے ہونٹوں کو تر کرے۔"

شہزادہ خرم شدید اذیت میں مبتلا تھا مگر باپ کے حکم کو نہ ٹال سکا اور اس نے مجبوراً شراب پی۔ پھر اسی رات خرم نے مبارک شاہ کو خواب میں دیکھا۔ قلندر بہت اُداس نظر آ رہا تھا۔

"شہزادے! تجھے اس لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے کہ تُو شراب خانے تعمیر کرے۔ اُٹھ اور سارے جام و مینا توڑ دے۔"

خواب دیکھنے کے بعد نصف شب کے قریب خرم کی آنکھ کھل گئی۔ مغل شہزادہ برسوں سے پنج وقتہ نماز کا عادی تھا۔ شاہی محل کی رنگینیوں کے باوجود شاذ و نادر ہی خرم کی کوئی نماز قضا ہوتی تھی۔ اس رات شہزادے نے تہجد کی نماز پڑھی اور صبح تک اپنے اس مجبورانہ گناہ پر خدا کے حضور توبہ کرتا رہا۔ اگرچہ جہانگیر نے اسے شراب نوشی کی اجازت دے دی تھی، لیکن خرم نے دوبارہ ساغر و مینا کو ہاتھ نہیں لگایا۔

اسی زمانے میں دکن کے سیاسی حالات بگڑتے جا رہے تھے۔ جہانگیر نے میواڑ کی فتح سے متاثر ہو کر خرم کو دکن کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ باغیوں کے اُٹھے ہوئے سروں کو کچل دے۔ اس سفر میں بھی ارجمند بانو اپنے شوہر کے ہمراہ تھی۔ ناسازگار فضا کی وجہ سے خرم نے ارجمند بانو کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی مگر حسبِ عادت اُس نے ایک ہی جواب دیا۔

"اگر خدانخواستہ آفات و مصائب ہی ہمارا مقدر ہیں تو ہم انہیں برابر سے تقسیم کر لیں گے۔"

۞.....۞.....۞

6 اکتوبر 1616ء کو شہزادہ خرم نے ایک بار پھر سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دی۔ بہت دیر تک بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دعائیں کرتا رہا۔

"اے خدائے بزرگ و برتر! اپنے اس حقیر بندے خرم کو اپنی لازوال رحمتوں کے سائے سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہ کر۔ اس خرابے میں تیرے سوا میرا مشکل کشا کون ہے؟ میں تو تیرے کرم ہی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہوں۔ اگر تیری رحمت دستگیری نہ کرتی تو میرا سارا وقار، میواڑ کی سنگلاخ پہاڑیوں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ یہ تیری ذاتِ بے نیاز ہی تھی، جس نے خرم کو سارے زمانے کے سامنے سرخرو کیا۔ میں کیا اور میری حقیقت کیا؟ اے صاحبِ عزت و جلال! میں ایک آزمائش کے بعد دوسرے امتحان میں مبتلا کر دیا گیا ہوں۔ فتنہ گروں نے سرزمینِ دکن پر وہ شورش برپا کر رکھی ہے کہ جسے دباتے دباتے مغل سلطنت کے بازو شل ہو چکے ہیں۔ میرا بڑا بھائی شہزادہ پرویز اس محاذ سے ناکام و نامراد لوٹا۔ بڑے بڑے ہوش مند سپہ سالاروں کو یہاں پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اب شہنشاہ مجھے اس مہم پر روانہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں میواڑ کی طرح دکن کی شورشوں کو بھی کچل ڈالوں گا۔ تُو علیم و خبیر ہے اور خوب جانتا ہے کہ تیرا ناتواں بندہ خرم، تیرے کرم کے بغیر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ اے بے اندازہ قدرت والے! میرے لرزتے قدموں کو استقامت بخش دے اور حضرت خواجہؒ کی روحانی عظمتوں کے طفیل مجھے اس مشکل معرکے میں بھی سربلندی عطا کر دے۔"

دعا مانگنے کے بعد شہزادہ خرم کو عجیب سے سکون کا احساس ہوا اور یوں نظر آنے لگا جیسے ارضِ دکن میں بھی فتح و نصرت اس کے قدم چومنے کے لئے بے قرار ہو۔ یہ خواجہ غریب نوازؒ کے دربارِ روحانی کی برکتیں تھیں کہ شہزادہ خرم کے حوصلوں کو نئی توانائی حاصل ہو گئی تھی۔

جب شہزادہ خرم، اجمیر کی حدود سے باہر نکلا تو میواڑ کا راجہ، رانا امر سنگھ اس کے استقبال کے لئے آیا اور دریائے نربدا تک ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر امر سنگھ نے پندرہ سو راجپوت سپاہیوں کا ایک دستہ شہزادے کی خدمت میں پیش کیا۔ اس دستے کی سالاری رانا امر سنگھ کا بیٹا، کرن سنگھ کر رہا تھا۔

"شہزادے! یہ میرا بیٹا کرن سنگھ، میدانِ جنگ میں آپ کے دوش بہ دوش لڑ کر اپنی وفاداری کا ثبوت دے گا۔ پھر آپ کو یقین آ جائے گا کہ راجپوت اپنے قول سے کبھی نہیں پھرتے۔"

شہزادہ خرم نے رانا امر سنگھ کی تواضع کا شکریہ ادا کیا اور دریا پار کر گیا۔

سرحد پر دکن کے امراء عبدالرحیم خان خاناں، مہابت خان اور خان جہاں لودھی نے شہزادے کا استقبال کیا۔ عام سپاہیوں کا خیال تھا کہ خرم یہاں کچھ دن قیام کرے گا۔ مگر مغل شہزادہ دوسرے دن ہی برہان پور کی طرف بڑھ گیا۔ پھر تقریباً پانچ ماہ بعد خرم برہان پور پہنچا۔

شہزادے کے آتے ہی دکن کی سیاسی فضا یک بیک بدل گئی۔ تمام فتنہ گروں نے خرم کے سامنے اپنے اٹھے ہوئے سر جھکا دیئے۔ مفسدوں کے سردار عادل شاہ اور ملک عنبر حبشی نے محسوس کیا کہ ان کے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی جا رہی ہے، اس لئے دونوں نے خرم کی اطاعت ہی میں اپنی نجات سمجھی۔ عادل شاہ نے پندرہ لاکھ روپے مالیت کے تحفے نذر کئے۔

ملک عنبر نے شہزادہ خرم کو بالا گھاٹ کا علاقہ واپس کیا اور احمد نگر کے ساتھ دوسرے قلعے بھی سپرد کر دینے پر رضامند ہو گیا۔ شہزادہ خرم نے یہ فتح، انسانی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل کی تھی۔ وہ میواڑ کے محاذ پر ایک بہادر اور دانش مند سپہ سالار ثابت ہوا تھا اور دکن میں اس نے سیاسی پیش بینی کا ایک زندہ ثبوت فراہم کیا تھا۔

یہاں شہزادہ خرم نے اپنے اثرات میں اضافہ کرنے کے لئے شاہ نواز خان کی بیٹی سے تیسری شادی کی۔ شادی سے قبل خرم نے ارجمند سے کہا تھا۔

''میں ذوقِ ہوس کی تسکین کے لئے شادی نہیں کر رہا ہوں۔ عبدالرحیم خان خاناں چاہتا ہے کہ میں اس کی پوتی سے شادی کر لوں۔ اس طرح ارضِ دکن میں میری ذات کو نیا سیاسی استحکام حاصل ہو جائے گا۔''

''میں صاحبِ عالم کے ارادوں کے بیچ کبھی دیوار نہیں بنوں گی۔'' ارجمند بانو نے نہایت خوش دلی کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس شادی سے آپ کو سیاسی مفادات حاصل ہو سکتے ہیں تو ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کیجئے۔ میں ہر حال میں صاحبِ عالم کا اقبال بلند دیکھنا چاہتی ہوں۔ کاش! میری زندگی میں وہ دن آ جائے، جب آپ تختِ ہندوستان پر جلوہ افروز ہوں۔ پھر یہ آنکھیں بھی بجھ جائیں تو مجھے کوئی غم نہیں ہوگا۔''

شہزادہ خرم اپنی شریکِ حیات کی اس فراخ دلی سے بہت متاثر ہوا۔ ''نہیں ارجمند! اس طرح نہ کہو کہ تمہارے بغیر ہمیں سارے ہندوستان کا اقتدار بھی قبول نہیں۔''

ارجمند بانو کی رضامندی کے بعد شہزادہ خرم نے شاہنواز خان کی بیٹی سے شادی کی۔ عادل شاہ اور ملک عنبر حبشی بھی اس تقریب میں شریک ہوئے اور کھلے دل کے ساتھ مغل شہزادے کو مبارکباد پیش کی۔

اس دوران جہانگیر مالوہ کے دارالحکومت مانڈو پہنچ گیا تھا۔ خونریزی کے بغیر اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے بعد شہزادہ خرم بھی باپ سے ملنے کے لئے مانڈو کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنے پیچھے اس نے عبدالرحیم خان خاناں اور شاہنواز خان کو دکن کے امور کا نگراں بنایا۔

جہانگیر کے لئے مسرت کے لمحات یادگار بن کر رہ گئے تھے، جب اس نے سنا کہ شہزادہ خرم، ارضِ دکن کے فاتح کی حیثیت سے مانڈو کی طرف آ رہا ہے۔

شہزادہ خرم 12 اکتوبر 1617ء کو مانڈو پہنچا۔ اس سے ڈیڑھ ماہ پہلے 24 اگست کو خرم کے یہاں دوسری لڑکی روشن آراء بیگم پیدا ہوئی۔ اب وہ دو لڑکیوں اور دو لڑکوں کا باپ تھا۔

شہزادہ خرم، مانڈو کے قریب پہنچا تو جہانگیر نے جوشِ جذبات میں اپنے درباری امراء کو حکم دیا کہ وہ کئی منزل آگے بڑھ کر شہزادہ کا خیر مقدم کریں۔ خرم اپنے ساتھ زر و جواہر کا اتنا بڑا انبار لایا تھا کہ آج تک کسی حکومت کو اتنے نذرانے نہیں ملے تھے۔ گھوڑے اور ہاتھی بھی بے شمار تھے۔

اس موقع پر جہانگیر نے مغل شہزادے کے استقبال کے لئے دربارِ عام منعقد کیا تھا۔ خرم نے شہنشاہ کے حضور زمیں بوسی (سجدے) کی رسم ادا کی۔ جہانگیر نے فوراً اُسے ''جھروکے'' میں طلب کیا۔

(جھروکہ اس جگہ کو کہتے تھے، جہاں بیٹھ کر بادشاہ، رعایا کو اپنے دیدار سے فیض یاب کرتا تھا۔ حکمراں کے اس عمل کو ''درشن'' کہا جاتا تھا۔ یہ ایک خالص ہندوانہ رسم تھی، جسے جلال الدین اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں خاص مقاصد کے لئے ایجاد کیا تھا۔)

جہانگیر، بیٹے کو دیکھ کر اس قدر بے قرار ہوا کہ جوشِ جذبات میں اپنی نشست سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بہت دیر تک خرم کو سینے سے لگائے رہا۔ کئی بار اس نے مغل شہزادے کی پیشانی کو بوسے بھی دیئے اور پھر انتہائی وارفتگی کے عالم میں با آواز بلند کہا۔

''شہزادہ خرم..... فاتح میواڑ، فاتح دکن..... عظیم مغلوں کا عظیم وارث۔''

پھر اس تقریب میں جہانگیر نے شہزادہ خرم کو تین بڑے اعزاز بخشے۔ تیس ہزار ذات اور بیس ہزار سوار کا منصب، جو بہت بڑا منصب تھا۔ اس کے ساتھ ہی جہانگیر نے شہزادہ خرم کو ''شاہ جہاں'' کا خطاب دیا۔ شہزادہ ہوتے ہوئے بھی ''شاہ'' کا لقب ایک بے مثال اعزاز تھا۔

جب خرم نے اپنے باپ کی زبان سے ''شاہ جہاں'' کا لفظ سنا تو اس کی سماعتوں میں ایک عجیب سا شور تھا۔ اور ذہن میں مبارک شاہ قلندر کا چہرہ اُبھر آیا۔ قلندر کئی سال پہلے سے خرم کو ''شاہ جہاں'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ خرم کے بار بار پوچھنے پر بھی مبارک شاہ نے اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کی تھی۔ مگر آج شہزادے کو اندازہ ہوا کہ قلندر کی آنکھیں مستقبل کے پردے پر کیا کچھ دیکھ رہی تھیں۔

اس اعزاز کے علاوہ جہانگیر نے خرم کو اپنے تخت کے برابر بیٹھنے کے لئے نشست دی تھی۔

اب سیاست کے اُفق پر شہزادہ خرم کے خدوخال واضح نظر آنے لگے تھے۔ اور اہلِ دربار سمجھ چکے تھے کہ جہانگیر کا جانشین، خرم کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ملکہ نور محل بھی خرم کے مسلسل کارناموں پر بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس جشنِ فتح کے سلسلے میں نور محل نے بھی شہزادہ خرم کی شاندار دعوت کی۔ خرم نے بھی دل کی گہرائیوں سے نور محل کی محبتوں کا شکریہ ادا کیا۔ سوتیلی سہی، لیکن نور محل اس کی ماں تھی۔ اور پھر ارجمند بانو کے رشتے سے وہ اس کی پھوپھی بھی تھی۔ خرم نے ان دونوں رشتوں کے احترام کو محسوس کیا اور پھر بھرے دربار میں با آواز بلند کہا۔

''مادرِ گرامی! میں اس قدر دانی پر آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ بے شک! آپ کا دل ایک

ماں کا دل ہے اور آنکھ اس وسیع النظر حکمراں کی آنکھ ہے، جس کے سامنے سیاست کے تمام گوشے روشن رہتے ہیں۔"

"نہیں خرم! یہ اعزاز تم پر کوئی احسان نہیں۔" ملکہ نورمحل نے بڑے باوقار لہجے میں کہا۔ "تم اس کے مستحق تھے۔ ایک شہنشاہِ عادل کے دربار سے تمہیں ایسی ہی نوازشات کی توقع رکھنی چاہئے۔"

ملکہ نورمحل نے بڑی ذہانت کے ساتھ خرم اور جہانگیر دونوں کو مطمئن کر دیا۔ ملکہ ہند کی اس مختصر سی تقریر سے شہنشاہ جہانگیر بہت متاثر ہوا تھا۔

پھر جب یہ تقریب اختتام کو پہنچی اور تنہائی میسر آئی تو جہانگیر نے نورمحل کو مخاطب کر کے کہا۔

"پہلے تمہارے توبہ شکن نقش و نگار ہماری آنکھوں کی زینت بنے اور ہم نے تمہارے سوا ہر شے کو دیکھنا بند کر دیا۔ پھر ہمارے دل پر اس طرح قابض ہو گئیں کہ تمہاری اجازت کے بغیر ہمارا دل بھی دھڑک نہیں سکتا۔ اور اب تم ہمارے دماغ پر بھی حکومت کرنے لگی ہو۔"

"یہ عالم پناہ کی عالی ظرفی ہے کہ ایک کنیز کی معمولی خدمات کو اس قدر شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔" نورمحل نے آگے بڑھ کر شہنشاہ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

جہانگیر نے گھبرا کر اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔ "نہیں نورمحل! تم سجدے کی پابند نہیں ہو۔ یہ رسم تو دنیا والوں کے لئے بنائی گئی ہے۔"

"اگر شہنشاہ کی مملکت میں سجدے کی رسم رائج نہ ہوتی، تب بھی یہ کنیز اسی طرح قدموں میں جھکی رہتی۔" ملکہ نورمحل آہستہ آہستہ جہانگیر کے جذبات کو مشتعل کر رہی تھی۔ "میں نے جبر کی حالت میں نہیں، اپنی خوشی سے آپ کو سجدہ کیا ہے۔ یہ آپ کا حق ہے کہ نورمحل کے دل و دماغ اور جسم پر حکومت کریں۔ اور یہ میرا فرض ہے کہ میں ساری عمر اسی بندگی کے عالم میں گزار دوں۔"

جہانگیر شدتِ جذبات سے وارفتہ ہو چکا تھا۔ "اس فتح کی خوشی میں ہم نے تمہارے لئے بھی نیا خطاب تجویز کیا ہے۔"

"وہ کیا؟" نورمحل اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور بے اختیار ہو کر پوچھنے لگی۔

"اس کا اعلان ہم دارالحکومت آگرہ پہنچنے کے بعد کریں گے۔" جہانگیر نے کہا اور اپنی محبوبہ کی زلفوں کی مہک میں کھو گیا اور نورمحل نئے خواب دیکھنے لگی۔

❀.....❀.....❀

پھر جب شاہی قافلہ، آگرہ پہنچا تو عوام نے اپنے گھروں سے نکل کر شہنشاہ جہانگیر اور شہزادہ خرم کا پُرجوش استقبال کیا۔ اس موقع پر جہانگیر نے اپنی رعایا میں بے شمار دولت تقسیم کی۔ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار پر عام لنگر خانہ قائم کیا، جس سے چالیس دن تک آگرہ کے محتاج و مسکین دونوں وقت کھانا حاصل کرتے رہے۔

شہزادہ خرم، ارجمند بانو کے ہمراہ اپنے بچوں کو لے کر مبارک شاہ قلندر کی خدمت میں

حاضر ہوا۔

"آؤ شاہ جہاں!" مبارک شاہ نے والہانہ انداز میں شہزادے کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"بابا! اب اندازہ ہوا کہ آپ مجھے شاہ جہاں کہہ کر کیوں مخاطب کرتے تھے۔"

"اپنے آپ کو ان باتوں میں نہ اُلجھاؤ کہ تمہیں کون کیا کہہ کر پکارتا ہے۔" قلندر نے بے نیازانہ کہا۔ "بس اس بات پر نظر رکھو کہ تمہارے اعمال کیا ہیں اور ایک دن تمہیں اپنے خدا کے سامنے ہر چیز کا جواب دہ ہونا ہے۔ اللہ نے انسان کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ اپنی پیاس حلال پانی سے بجھائے یا کسی غلیظ شے سے۔" قلندر نے درپردہ اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا، جب شاہ جہاں نے جہانگیر کے حکم سے شراب پی تھی۔

خرم چند لمحوں کے لئے لرز اُٹھا۔ "بابا! خدا بہتر جانتا ہے کہ میں اس وقت بہت مجبور تھا۔ میں نے جو کچھ کیا، حالتِ جبر میں کیا۔"

"برے کاموں میں کسی کی اطاعت نہ کرو۔ چاہے وہ تمہارے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں۔" مبارک شاہ کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا اور اس سے جلالِ روحانی ظاہر ہونے لگا تھا۔ "خدا نے جسے حرام قرار دے دیا، اسے ساری دنیا مل کر بھی حلال نہیں بنا سکتی۔ تیرے باپ کی شراب نوشی ہی نے اس کے دل و دماغ کو تباہ کر دیا ہے۔ اگر وہ اس سے تائب ہو جاتا تو شاید اس کی روح میں روشنی کی کوئی کرن پھوٹتی۔ مگر اب تو وہاں گہری تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہدایت کہاں سے ملے اور روشنی کہاں سے آئے؟ یہ شراب ہی کی غلاظت و کثافت ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنے آگے سر جھکانے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر تُو نے پھر کبھی شراب کو ہاتھ لگایا تو ایک دن تجھ سے بھی تیرے حواس چھین لئے جائیں گے۔ خدا کبھی اپنے بندوں پر مصائب کا طوفان بھیج کر انہیں آزماتا ہے اور کبھی اپنی نعمتوں کی بارش کر کے۔ تجھے اس کا شکر گزار بندہ ہونا چاہئے کہ ابھی تُو نے کسی آفت کا منہ نہیں دیکھا ہے۔"

شاہ جہاں نے ندامت کے ساتھ سر جھکا دیا۔

"بیٹی! میں تجھ سے بہت خوش ہوں کہ تُو نے اپنے شوہر سے رفاقت کا حق ادا کر دیا۔" یکایک مبارک شاہ قلندر، ارجمند بانو سے مخاطب ہوا۔ "ہو سکتا ہے کہ آزمائش کے اور بھی کڑے زمانے آ جائیں مگر شاہ جہاں کو تنہا نہ چھوڑنا۔"

"بابا! میں اس سفر میں آپ کی دعاؤں کی محتاج ہوں۔" ارجمند بانو نے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"تم دونوں کبھی میری دعاؤں کے حلقے سے دور نہیں رہے۔" اچانک قلندر کی آواز سے گہرا درد جھلکنے لگا تھا۔ "میرا اس دنیا میں تم لوگوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں تو روزانہ ہی اپنے خدا سے یہ کہتا ہوں کہ اگر زندگی کا تبادلہ ممکن ہے تو پھر میری عمر بھی تمہیں لگ جائے۔ میں تو ایک ناکارہ انسان ہوں۔ اپنی ساری زندگی غفلت میں گزار دی۔ مجھے جس کام کے لئے دنیا میں بھیجا

گیا تھا، میں اسے تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ میرا پورا وجود ناکامی و شرمساری کی ایک علامت ہے۔ زمین کا بوجھ بن کر رہ گیا ہوں۔ کبھی کبھی اپنی نامراد زندگی کا خیال آتا ہے تو لرز کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے بہت مہلت دی گئی مگر افسوس! میں کچھ نہیں کر سکا۔ لوگوں کو سیدھے راستے پر بلاتے بلاتے تھک گیا مگر کوئی ادھر نہیں آتا۔'' آج قلندر پہلی بار شاہ جہاں اور ارجمند بانو کے سامنے اپنے دل کا درد بیان کر رہا تھا۔ ''انسانوں کے قافلے کے قافلے یہاں سے گزرتے ہیں، لیکن سب کے سب دنیا کے نشے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کسی نے مجھ سے نہیں کہا کہ میں اس کی آخرت کے لئے دعا کروں۔ جو بھی آتا ہے، دنیا مانگتا ہے۔ کوئی کسی خوب صورت عورت کے عشق میں مبتلا ہے اور اس کا حصول چاہتا ہے۔ کوئی اولاد کی تمنا کرتا ہے۔ کسی کو اونچے عہدے کی خواہش ہے۔ کوئی سیم و زر کی طلب رکھتا ہے۔ مگر کسی کو خوفِ خدا نہیں۔ لوگوں کے ایمان اتنے ارزاں ہو چکے ہیں کہ وہ اسے ہر قیمت پر فروخت کرنا چاہتے ہیں لیکن کوئی خریدنے والا نہیں۔ یہ بدنصیب مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ان کے ایمان کی دولت بک جانے کے لئے دعا کروں۔ کیسے ظالم لوگ ہیں کہ مجھے آزار پہنچانے کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے۔''

فضا بڑی سوگوار ہو گئی تھی۔ مبارک شاہ کے اندر کے زخموں سے خون رس رہا تھا۔

''میں ساری دنیا سے مایوس ہو چکا ہوں۔ پھر بھی کبھی کبھی تجھ سے اُمید بند جاتی ہے کہ شاید خدا میرے ہاتھوں سے دربارِ شاہی کی اس لعنت کو مٹا دے۔ تجھے کیا خبر شاہ جہاں! کہ اس کافرانہ رسم کے کیسے برے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔'' یکا یک قلندر نے ایک آہِ سرد کھینچی۔ ''لوگوں نے سچ بولنا چھوڑ دیا ہے اور جائز و ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں سمجھاتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھود رہے ہیں۔ انہیں ہر حال میں دنیا چاہئے۔ ایسی دنیا، جسے وہ یہیں چھوڑ کر دو گز زمین میں سما جائیں گے۔''

بہت دیر بعد قلندر خاموش ہوا۔ اب اس کے دل کا غبار دُھل چکا تھا۔ ''میں بھی کیسا دیوانہ ہوں کہ تم دونوں کا وقت برباد کرنے بیٹھ گیا۔''

''بابا! یہ بچے بھی آپ کی ایک نظرِ کرم کے منتظر ہیں۔'' ارجمند بانو نے بہت ادب سے کہا۔

مبارک شاہ نے مسکراتے ہوئے ان معصوم بچوں کی طرف دیکھا، جو حیران و پریشان نظر آ رہے تھے۔ ''خدا انہیں اپنی امان میں رکھے۔'' قلندر کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ وہ بہت غور سے شہزادی جہاں آرا، روشن آرا، شہزادہ داراشکوہ اور شجاع کو دیکھ رہا تھا۔ پھر طویل سکوت کے بعد قلندر کے ہونٹوں کو جنبش آئی۔ ''وہ ابھی تک نہیں آیا، جس کا انتظار ہو رہا ہے۔''

''کون بابا؟'' شاہ جہاں نے بہت آہستہ لہجے میں کہا۔

''وہی، جس کا برسوں سے انتظار ہو رہا ہے۔'' قلندر کی آواز میں عجیب سی خلش تھی۔ ''مجھ سے تو یہی کہا گیا ہے کہ وہ آئے گا۔ میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اسے آنا ہی چاہئے۔''

ارجمند بانو اور شہزادہ خرم، قلندر کی پُراسرار گفتگو کو نہ سمجھ سکے۔ مگر انہیں اتنا اندازہ ضرور ہو گیا

تھا کہ مبارک شاہ کسی بچے کا انتظار کر رہا ہے۔

پھر قلندر کی جھونپڑی سے محل پہنچنے کے بعد شاہ جہاں اور ارجمند بانو میں بہت دیر تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔

''بابا ہمارے بچوں کا چہرہ دیکھنے کے بعد ہی اپنی زبان سے یہ جملہ ادا کرتے تھے کہ آنے والا ابھی تک نہیں آیا۔ آخر وہ کس کا انتظار کر رہے ہیں؟''

''قلندر کی باتیں قلندر ہی جانے۔'' شاہ جہاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''خدا نے بابا کو روشن ضمیر بنایا ہے۔ وہ بہت پہلے مجھے شاہ جہاں کہہ کر پکارا کرتے تھے اور میں ان کے اس طرزِ تخاطب پر حیران رہ جاتا تھا۔ اب کئی سال بعد یہ راز فاش ہوا ہے کہ انہیں بہت پہلے میرے شاہ جہاں بننے کا علم ہو گیا تھا۔ آج ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں کسی بچے کی آمد کا انتظار ہے۔ بظاہر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ بچہ ہمارے یہاں آئے گا۔''

شاہ جہاں کی باتیں سن کر ارجمند ایک عجیب سے خواب میں کھو کر رہ گئی۔ وہ کیسا عجیب بچہ ہوگا، جس کی آمد کا مبارک شاہ کو انتظار ہے؟

❀.....❀.....❀

دوسرے دن ایوانِ شاہی میں جہانگیر کے الفاظ کی گونج سنائی دی۔ نئے حکم کے مطابق ملکہ نور محل کو ''نور جہاں'' کا خطاب دے دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ نیا فرمان بھی جاری ہوا تھا کہ آئندہ سکّوں پر نور جہاں کا نام بھی کندہ کیا جائے اور اسی نام کو شاہی مہروں میں شامل کر دیا جائے۔ یہ نور جہاں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی طرف کھلا ہوا اشارہ تھا۔ درباری امراء سوچتے ہی رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شیر افگن کی بیوہ مختصر سے عرصے میں اس قدر عروج حاصل کر لے گی۔

شہزادہ خرم نے بھی یہ خبر بڑی حیرت سے سنی تھی۔ اگرچہ جہانگیر کی سترہ اٹھارہ بیویاں تھیں لیکن آج تک کسی نے سیاسی امور میں اس قدر دلچسپی نہیں لی تھی۔ اور نہ خود شہنشاہ نے اپنی کسی بیگم کو اتنی اہمیت دی تھی کہ وہ سیاسی اُفق پر نمودار ہو سکے۔ خرم نے اس کو محض شہنشاہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت کا نتیجہ سمجھا۔ اس نے کبھی اپنی سوتیلی ماں کی طرف سے بدگمانی نہیں کی تھی۔ اور پھر یہ کہ نور جہاں، ارجمند بانو کی حقیقی پھوپھی بھی تھی۔ ان دونوں رشتوں کی نزاکتوں کے پیشِ نظر شاہ جہاں نے ملکہ نور جہاں کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر کسی قسم کے شک کا اظہار نہیں کیا۔

نور جہاں کے نئے خطاب اور نئے شاہی فرمان کے جاری ہونے سے ارسلان بیگ بہت خوش تھا۔ ایک دن اس نے نور جہاں کو تنہائی میں مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

''اب ملکہ عالیہ اس منصب تک پہنچ گئی ہیں، جہاں شہنشاہ محض ایک مجبور انسان نظر آتا ہے۔''

''تیرا اندازہ صحیح ہے ارسلان! اب ظلِ الٰہی سوچتے ہیں تو میرے ذہن سے اور بولتے ہیں

تو میری زبان سے۔'' نور جہاں کے چہرے پر نخوت وغرور کا عجیب سا رنگ نمایاں تھا۔

''تو کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے؟'' ارسلان بیگ نے بڑی عیاری کے ساتھ اپنے منصوبے کی طرف اشارہ کیا۔

''کیسا وقت؟'' نور جہاں، ارسلان کی گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکی تھی۔

''یہی کہ ہندوستان میں ہر طرف ایرانی ثقافت کا دور دورہ ہو۔'' ارسلان بیگ نے واضح الفاظ میں اپنا مقصد بیان کیا۔

''کسی کے تسلیم کرنے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے ارسلان! ایران ہر حال میں عظیم ہے۔ وحشی مغلوں اور غیر مہذب ہندوستانیوں کو ایران کی عظیم تہذیب سے کیا نسبت ہے؟ ایک دن انہیں ارضِ فارس کی زندہ ثقافت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔''

''کیا آپ نے اس سلسلے میں خداوند سے کبھی کوئی بات کی؟'' ارسلان بہت خوش تھا مگر پھر بھی کسی حد تک مضطرب نظر آ رہا تھا۔

''نہیں۔'' نور جہاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میرے سامنے کچھ اور مقاصد ہیں۔ ان کی تکمیل سے پہلے میں شہنشاہ کو اس کی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔''

''خداوند ابھی تک ہندو تہذیب کے زیر اثر ہیں۔'' ارسلان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ان کی کئی بیویاں راجپوت ہیں اور وہ اب تک ''جھروکے'' اور ''درشن'' کی رسموں پر عمل کرتے ہیں۔ خاکم بدہن، اگر خداوند کی آنکھیں بند ہو گئیں تو پھر یہ سنہری موقع ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بھکاری مبارک شاہ نے شاہ جہاں کے دل و دماغ پر مکمل تسلط حاصل کر لیا ہے۔ وہ سجدے کی رسم سے باغی ہے اور شاہ جہاں کو مسلسل اُکسا رہا ہے۔ اگر شاہ جہاں برسرِ اقتدار آ گیا تو ہمارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔'' ارسلان بیگ نے پہلی بار پورے زور و شور کے ساتھ شہزادے کے خلاف ایک فتنہ انگیز تقریر کی۔ ''شاہ جہاں کی مسلسل فتوحات ہر اس شخص کے لئے کھلا خطرہ ہیں، جو ہندوستان میں اقتدار کے خواب دیکھ رہا ہے۔ آپ خداوند سے زیادہ شاہ جہاں پر نظر رکھیں۔ مبارک شاہ اسے آپ کے خلاف بھی بھڑکا سکتا ہے۔'' ارسلان بیگ نے بڑی عیاری سے نور جہاں کے ذہن میں نئے وسوسے اور اندیشے پیدا کر دیئے تھے۔

۞.....۞.....۞

ارسلان کے جانے کے بعد نور جہاں کے تصور میں مبارک شاہ قلندر کا چہرہ اُبھر آیا۔ دھوپ کی تمازت سے تپتا ہوا، تانبے کی طرح سرخ چہرہ، لمبی داڑھی، دراز بال، جھکی ہوئی نظریں، پیوند لگا معمولی مگر صاف لباس، خود مزدوری کر کے صبح و شام ایک روٹی کھانے والا مبارک شاہ۔ نور جہاں ایک بار بطورِ خاص قلندر کو دیکھنے کے لئے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار پر گئی تھی۔ پھر اس نے مبارک شاہ کو اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ حضرت شیخ کے مزار کے گنبد کو مسلسل دیکھے جا

رہا تھا۔ نہ اس کے جسم کو کوئی جنبش ہوتی تھی اور نہ وہ کسی سے بات کرتا تھا۔

نور جہاں اس راز سے باخبر تھی کہ انتہائی تشدد کے باوجود مبارک شاہ نے جہانگیر کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ اور وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھی کہ جہانگیر نے اس کے اصرار کے باوجود قلندر کو شہر بدر نہیں کیا تھا۔ اب نور جہاں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ خود بھی مبارک شاہ کے عقیدت مندوں میں شامل ہو جائے۔ اسی منصوبے کے تحت نور جہاں ایک دن خود قلندر کی جھونپڑی میں داخل ہوئی۔

نور جہاں کو اپنے سامنے پا کر مبارک شاہ برہم ہو گیا۔

''یہاں کیوں آئی ہے؟..... تجھے اس جھونپڑی کا راستہ کس نے بتایا ہے؟'' قلندر کے چہرے پر نفرت کا گہرا عکس تھا اور اس کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

نور جہاں چند لمحوں کے لئے بدحواس ہو گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ راستے کا ایک فقیر، ملکہ ہند کے ساتھ اس قدر گستاخانہ سلوک کرے گا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بارعب لہجے میں بولنے کی کوشش کرنے لگی۔

''مبارک شاہ! یہ میں ہوں، ملکہ نور جہاں۔''

''میں کسی ملکہ اور شہنشاہ کو نہیں جانتا۔'' قلندر کے لہجے میں وہی برہمی تھی۔ ''اس جھونپڑی کی صاف زمین کو اپنے وجود کی کثافتوں سے آلودہ نہ کر۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس جگہ کو چھوڑ دے اور آئندہ مجھے اپنی ناپسندیدہ صورت نہ دکھانا۔''

قلندر کا یہ سلوک دیکھ کر نور جہاں کے دل و دماغ میں آگ سی لگ گئی تھی مگر اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی۔

''مبارک شاہ! میں تیرے حلقۂ عقیدت میں شامل ہونے آئی ہوں۔''

مبارک شاہ مسکرایا مگر اس کی مسکراہٹ میں بھی شدید تلخی اور نفرت پوشیدہ تھی۔

''اگر مجھ سے عقیدت ہے تو تاج و تخت چھوڑ دے اور اپنے شوہر کو مجبور کر دے کہ وہ دربار سے رسم سجدہ اُٹھا لے۔''

قلندر کی گرمیٔ گفتار سے نور جہاں گھبرا گئی مگر وہ ایک ذہین عورت تھی۔ اس نے فوراً ہی سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''مبارک شاہ! میں تو ایک عورت ہوں۔ شہنشاہ کی مرضی میں کس طرح دخل اندازی کر سکتی ہوں؟''

''جب ایک عام سی عورت ملکہ ہند کے درجے تک پہنچ سکتی ہے تو پھر اسے اپنے اختیارات سے کام بھی لینا چاہئے۔'' قلندر نے نور جہاں کی بات کو یکسر جھٹلا دیا تھا۔

''میں صرف تیری دعاؤں کی طلب گار ہوں، مبارک شاہ!'' نور جہاں نے عیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے، تُو نے شہزادہ خرم کے ہاتھوں ایک ہزار اشرفیوں کے بدلے ہندوستان کے تاج و تخت فروخت کر دیئے ہیں۔ اب میں ان ہی چیزوں کا تجھ سے دوبارہ سودا کرنے آئی

ہوں۔ مجھ سے ایک لاکھ اشرفیاں لے لے اور ہندوستان کا تاج وتخت میرے نام کر دے۔"

"آخر تیرے دل کی خواہش، زبان پر آ ہی گئی۔" قلندر خلافِ عادت بہت زور سے ہنسا۔

"یہ ہے تیری عقیدت؟"

نور جہاں اپنی اس تحقیر کو برداشت نہ کر سکی اور غضب ناک لہجے میں کہنے لگی۔ "مبارک شاہ! تُو میری زمین پر رہتا ہے۔ تجھے میری بات ماننی ہی پڑے گی۔"

"میں خدا کی زمین پر رہتا ہوں۔ جس دن وہ چاہے گا، اُٹھ جاؤں گا۔" مبارک شاہ کا جلال دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ "حریص عورت! تُو نے اپنے ماضی سے سبق نہیں لیا۔ جیسے ہی وہ دکھ کے دن گزرے، تُو نے پھر ناشکری کی باتیں شروع کر دیں۔ کل تک تُو ایک گوشے میں پنی محرومیوں پر آنسو بہاتی تھی۔ آج اقتدار ملا تو خدائی کے دعوے کرنے لگی۔ اس زمین کو اپنی ملکیت ظاہر کر رہی ہے، جس پر ایک دن تیری قبر بننے والی ہے۔"

نور جہاں نے پہلی بار قلندر کا یہ روپ دیکھا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر دوبارہ محل کی طرف لوٹ گئی۔

پھر اس نے بڑی رازداری کے ساتھ اپنے کئی آدمی اس کام پر متعین کئے کہ وہ قلندر کو اس کی جگہ سے اُٹھا کر دریائے جمنا کی تیز لہروں کے حوالے کر دیں۔

اس ذلت آمیز سلوک کے بعد نور جہاں سے مبارک شاہ کا وجود برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

جب نور جہاں کے خاص کارندے، قلندر کو غرقِ دریا کرنے آ رہے تھے تو ملکۂ ہند نے انتہائی درشت لہجے میں کہا تھا۔

"اگر یہ راز کسی پر ظاہر ہوا تو تم سب لوگ اسی وقت زندگی سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔"

نور جہاں کے محافظ دستے کے چاروں سپاہیوں نے بیک زبان کہا۔ "ہم نے کبھی اپنے فرض سے غداری نہیں کی۔ شہنشاہ ہماری خدمات سے خوب واقف ہیں۔"

"میں تمہاری وفاداریوں کا امتحان چاہتی ہوں۔" نور جہاں غضب ناک نظر آ رہی تھی۔

"آج کی رات قلندر کی موت یا پھر تمہاری زندگی کا خاتمہ۔ اگر مبارک شاہ کو دریا برد نہ کر سکو تو میرے سامنے نہ آنا۔ خود ہی کسی گوشۂ تنہائی میں اپنی شہ رگیں کاٹ دینا۔ مجھے شکست خوردہ اور ناکام انسانوں سے نفرت ہے۔"

چاروں سپاہی چند قدم پیچھے ہٹے اور تلواروں کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔

اب وہ فتح پور سیکری کی طرف بڑھ رہے تھے، جہاں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار کے قریب مبارک شاہ قلندر رہا کرتا تھا۔ طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد نور جہاں کے کارندے، مبارک شاہ کی جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ اس وقت قلندر تھک کر چٹائی پر لیٹ گیا تھا۔ بے نیام شمشیریں لے کر سپاہی آگے بڑھے۔ انسانی قدموں کی چاپ سن کر قلندر نے آنکھیں کھول دیں اور تیز آواز میں کہا۔

"کون ہے؟"

"تیری موت۔" نور جہاں کے بھیجے ہوئے سپاہیوں کی گرج دار آوازیں گونجیں۔

"اگر میری موت ہے تو پھر آ کیوں نہیں جاتی؟" قلندر نے اسی طرح اطمینان سے لیٹے لیٹے کہا۔ "میں تو برسوں سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔"

مبارک شاہ کے لہجے میں اس قدر جلال تھا کہ سپاہی لرزنے لگے۔

"بے شک! تم نے بہت سی جنگیں لڑی ہیں اور سینکڑوں انسانوں کو قتل کیا ہے، مگر پھر بھی اس راز سے واقف نہیں کہ کسی کی موت قبل از وقت نہیں آتی۔" یہ کہتے ہوئے مبارک شاہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یقیناً ایک دن مجھے بھی موت آئے گی۔ مگر اس طرح نہیں کہ ایک مغرور اور گمراہ عورت کے بھیجے ہوئے زرخرید غلام میرے جسم پر قابو حاصل کر لیں۔ کیا تم میری ظاہری حالت دیکھ کر سمجھتے ہو کہ مجھے یہاں تنہا چھوڑ دیا گیا ہے؟ یاد رکھو کہ میری حفاظت کرنے والا بڑی قوتیں رکھتا ہے۔ وہی اس کائنات کا مالک ہے کہ اسی کی ذات تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔ اپنے معبود کی قسم! اگر آج نور جہاں اپنا سارا لشکر بھی میرے قتل کے لئے روانہ کر دیتی تو اسے کامیابی حاصل نہ ہوتی۔"

چراغ کی ہلکی روشنی میں سپاہیوں نے مبارک شاہ کی طرف دیکھا۔ قلندر کی آنکھوں سے آگ سی نکل رہی تھی اور یہ آگ اُس کے روحانی جلال کی آگ تھی۔

"ہم کیا کریں قلندر؟..... ہم کیا کریں؟" چاروں سپاہی بیک زبان چیخے اور انہوں نے اپنی تلواریں مبارک شاہ کے قدموں میں ڈال دیں۔ "ہم ناکامی کی حالت میں واپس نہیں جا سکتے۔" سپاہیوں نے پورا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ "ناکامی ہماری موت ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم پر ملکۂ عالیہ کا قہر ٹوٹے، آپ خود ہی ہمارے جسموں سے ہماری گردنیں الگ کر دیں۔" یہ کہہ کر چاروں سپاہی، مبارک شاہ کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ "ہم بہت بڑے مجرم ہیں قلندر!..... آپ سے معافی بھی نہیں مانگ سکتے۔"

قلندر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر ان سپاہیوں سے بہت نرم لہجے میں کہنے لگا۔

"میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ تمہارے دل اتنے سیاہ بھی نہیں ہوئے ہیں کہ وہاں سے روشنی کی کرن کا گزر ہی نہ ہو سکے۔"

اور ملکۂ عالیہ؟" سپاہیوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمارے معصوم بچے بھی ہیں، جو بے گناہ مارے جائیں گے۔"

"تم فوراً شاہ جہاں کے پاس چلے جاؤ اور اسے اپنی خدمات پیش کر دو۔" مبارک شاہ نے سپاہیوں کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔ "شاہ جہاں کے دوش بدوش رہ کر دشمنوں سے جنگ کرو۔ نور جہاں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ وہ تو ایک بہت کمزور عورت ہے۔ شاہ جہاں سے کہہ دینا کہ تمہیں بابا نے بھیجا ہے اور اسے یہ واقعہ بھی سنا دینا تا کہ وہ پوری طرح مطمئن ہو جائے۔"

سپاہی رخصت ہونے لگے تو مبارک شاہ نے آگے بڑھ کر ان چاروں کے سروں پر ہاتھ رکھ دیا۔

❀.....❀.....❀

شاہ جہاں نے بڑی اذیت و کرب کے ساتھ یہ واقعہ سنا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملکہ نور جہاں کو مبارک شاہ قلندر سے اس قدر پرخاش ہو گی۔ شاہ جہاں بہت دیر تک اس واقعہ کا پس منظر تلاش کرتا رہا، مگر وہ اس راز کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔ آخر اس نے چاروں سپاہیوں کو اپنے فوجی دستے میں شامل کر لیا۔

نور جہاں بڑی بے چینی سے قلندر کی موت کی خبر سننے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر جب صبح تک وہ سپاہی اس کے پاس نہیں پہنچے تو ملکہ ہند بڑی تشویش میں مبتلا ہوئی۔ ابھی نور جہاں کا انتظار جاری تھا کہ شاہ جہاں ان سپاہیوں کو لے کر ملکہ ہند کے پاس پہنچا۔

چند لمحوں میں نور جہاں کے چہرے پر حیرت و پریشانی کے کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

''ملکۂ عالیہ! مجھے ایک خاص مہم کے لئے آپ کے یہ چاروں سپاہی درکار ہیں۔'' شاہ جہاں نے اپنی سنگدل پھوپھی کے حضور میں درخواست پیش کرتے ہوئے کہا۔

''شاہ جہاں! تم انہیں چھوڑ کر کسی سپاہی کا انتخاب کر سکتے ہو۔'' نور جہاں نے اپنی وحشت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''پوری شاہی فوج پڑی ہے۔''

''نہیں ملکۂ عالیہ! ان سپاہیوں میں کچھ خاص خوبیاں ہیں۔'' شاہ جہاں نے بہانہ سازی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں انہیں پہاڑی جنگ کی مخصوص تربیت دینا چاہتا ہوں۔''

نور جہاں نے بہت کوشش کی مگر شاہ جہاں اپنی بات پر بضد رہا۔ ''میں ان کے بدلے میں آپ کو اپنے لشکر کے دس جانباز دے سکتا ہوں۔''

یکایک نور جہاں مسکرانے لگی۔ اس نے اپنی عیاریوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''شہزادے! اگر تم چاہو تو یونہی سہی۔ ویسے یہ چاروں، محل میں پہرہ دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔'' نور جہاں نے آخری حربہ استعمال کیا تھا۔

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' شاہ جہاں، ملکہ کی چالوں کو خوب سمجھ رہا تھا۔

بالآخر نور جہاں رضامند ہو گئی۔ مگر پھر بھی ایک دن موقع پا کر اس نے ان چاروں کو تنہائی میں طلب کر لیا۔ ''یہ سب کچھ کیسے ہوا؟'' نور جہاں بہت برہم نظر آ رہی تھی۔

''ہمارا منصوبہ تھا کہ ہم آدھی رات کے بعد مبارک شاہ پر حملہ کریں گے۔ مگر اس سے پہلے ہی جب ہم آپ کی بارگاہ سے نکل کر محل کی طرف جا رہے تھے تو شہزادہ خرم، بارہ دری میں حوض کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ تم لوگ میرے لشکر میں شامل ہو جاؤ۔'' سپاہیوں نے کھلا جھوٹ بولا۔ ''ہم نے دامن بچانے کی بہت کوشش کی مگر صاحبِ عالم نے ہماری ایک بھی نہیں سنی۔ مجبوراً ہمیں کہنا پڑا کہ آپ ملکۂ عالیہ سے اجازت حاصل کر لیجئے۔''

''میں نے مجبوراً تمہیں شہزادے کے حوالے کر دیا ہے۔ مگر اپنا عہد یاد رکھنا۔'' نور جہاں نے سپاہیوں کو سخت تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جب بھی موقع ملے، مبارک شاہ کی زندگی کا قصہ اس طرح پاک کر دینا کہ اس کی موت پر قتل کا گمان نہ ہو۔ بے شک! تم شاہ جہاں کی بات مانو مگر اس کے حکم پر میرے حکم کو غالب رہنا چاہئے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ایک بڑا انعام تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ سونے چاندی کے ڈھیر اور اعلیٰ عہدے۔''

سپاہیوں نے منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ ''ہم ملکۂ عالیہ کی عنایاتِ شاہانہ کو کس طرح فراموش کر سکتے ہیں؟''

❀.....❀.....❀

ابھی شاہ جہاں چین کی چند سانسیں بھی نہیں لینے پایا تھا کہ ایک اور دشوار ترین مہم اس کے سر آ گئی تھی۔ جہانگیر، شاہ جہاں کی بلند اقبالی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ قلعہ کانگڑہ کی خوف ناک مہم تھی۔ کانگڑہ، لاہور کے شمال کی جانب ایک قدیم قلعہ ہے اور پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ یہ قلعہ کب تعمیر ہوا، اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

پنجاب کے زمینداروں کا یہ عقیدہ تھا کہ قلعہ کانگڑہ آج تک غیروں کے قبضہ میں نہیں گیا۔ اس قلعے کی مضبوطی اور سنگینی کا یہ حال تھا کہ اسے کوئی بھی حملہ آور تسخیر نہیں کر سکا تھا۔ محمود غزنوی سے لے کر فیروز شاہ تغلق تک کئی مسلم حکمرانوں نے قلعے کی تسخیر کے منصوبے بنائے تھے مگر وہ اپنی کوششوں میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق نے طویل عرصے تک کانگڑہ کا محاصرہ جاری رکھا تھا۔ اسی دوران یہاں کا راجہ، سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور فیروز شاہ تغلق کو اپنے ہمراہ لے جا کر اس پُراسرار قلعے کی سیر کرائی تھی۔ سلطان نے اسے غنیمت سمجھا اور محاصرہ اُٹھا لیا۔ جہانگیر بھی کانگڑہ کے ناقابلِ تسخیر ہونے سے واقف تھا مگر پھر بھی اُس کی دلی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح اس قلعے پر غلبہ حاصل کر لے اور اپنے پیشرو حکمرانوں پر سبقت لے جائے۔

اسی زمانے میں کانگڑہ کے سورج مل نے پہاڑی علاقے کے زمینداروں سے مل کر پنجاب کے پرگنوں پر دست درازی شروع کر دی تھی۔ بڑھتی ہوئی شورش دیکھ کر ایک دن جہانگیر نے شاہ جہاں کو طلب کیا اور اپنی دیرینہ خواہش بیان کی۔

''فرزند! مجھے تمہاری ذہانت اور اعلیٰ ہمتی سے اُمید ہے کہ تم سورج مل کو نیچا دکھا کر اپنے باپ کے ایک پرانے خواب کی نئی تعبیر پیش کرو گے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم کانگڑہ کی سیر کو اس طرح جائیں کہ اس کا ایک ایک مکین ہمارے سامنے سر جھکائے ہوئے کھڑا ہو اور قلعے کے گوشے گوشے میں مغل سلطنت کی ہیبت و عظمت کے ترانے گائے جا رہے ہوں۔''

شاہ جہاں، باپ کے حکم سے مجبور تھا۔ اس نے جہانگیر کے سامنے سر جھکا دیا۔ شہنشاہ جوشِ

محبت میں آگے بڑھا اور اس نے شاہ جہاں کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں تمہاری اطاعت و فرمانبرداری اور بلند حوصلگی سے یہی توقع تھی۔ اور ہم نے اسی دن کے لئے تمہاری جوانی کی دعائیں مانگی تھیں۔''

کانگڑہ روانہ ہونے سے پہلے شاہ جہاں ایک بار پھر قلندر کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''بابا! شاید میری قسمت میں سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں۔'' شاہ جہاں کسی قدر اُداس نظر آ رہا تھا۔

مبارک شاہ قلندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شہزادے! ابھی سے تھک گئے؟..... ابھی تو بہت راستہ باقی ہے۔ پھر کہیں منزل کے آثار نظر آئیں گے۔''

''شہنشاہ ہمیشہ میرے ساتھ ہی یہ سلوک کرتے ہیں کہ مجھے موت کے منہ میں جھونک دیتے ہیں۔'' شاہ جہاں کے ہونٹوں پر حرفِ شکایت آ گیا۔

''اور تم زندہ بچ کر نکل آتے ہو۔'' قلندر نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''یاد رکھو! اسی کا نام زندگی ہے کہ بار بار موت سے ٹکراتے رہو۔ باقی شہزادگان نکمے اور ناکارہ ہیں۔ اس لئے انہیں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ قدرت نے تمہیں بڑا بنایا ہے، اس لئے بڑی مہمات تمہارے سپرد کی جاتی ہیں۔ اگر راستے کے ان پتھروں کو دُور نہیں کرو گے تو شاہ جہاں کیسے کہلاؤ گے؟''

''بابا! وہ بڑی دُشوار گزار گھاٹی ہے۔ آج تک وہاں سے کوئی حملہ آور سرخرو ہو کر نہیں لوٹا۔ میں اپنی ناکامی سے ڈرتا ہوں۔'' شاہ جہاں کانگڑہ کے بارے میں بہت سی کہانیاں سن چکا تھا، اس لئے پس و پیش سے کام لے رہا تھا۔

''جو بات ابھی ظاہر نہیں ہوئی ہے، اس کے متعلق وقت سے پہلے ایسی مایوس کن باتیں کرنا دانشمندی کے خلاف ہے۔'' مبارک شاہ نے سمجھایا۔ ''حضرت شیخ کے مزار پر حاضر ہو کر اپنی کامیابیوں کے لئے دعا کر اور محتاجوں میں صدقہ و خیرات تقسیم کر دے۔ پھر دیکھ، پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟''

شاہ جہاں نے ایسا ہی کیا۔ بہت دیر تک حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے قدموں میں کھڑے ہو کر دعا کرتا رہا اور پھر مزار کے گرد و نواح میں رہنے والے غریبوں میں چاندی کے سکے تقسیم کئے۔ آخر میں مبارک شاہ قلندر نے شاہ جہاں کو گلے سے لگایا اور اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔ اب مغل شہزادہ اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کر رہا تھا۔

❀.....❀.....❀

شاہ جہاں آگرے سے چل کر احمد آباد (گجرات) پہنچا۔ اس سفر میں شہنشاہ جہانگیر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس مہم میں شاہ جہاں نے راجہ بکرماجیت کو اپنا سپہ سالار مقرر کرتے ہوئے اسے حکم دیا کہ وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھ کر سورج مل پر حملہ کرے اور خود ایک لشکرِ جرار لے کر بکرماجیت کے پیچھے روانہ ہوا۔

بکرماجیت کے حملے کی خبر سن کر راجہ سورج مل، کانگڑہ سے نکل کر ''مود'' کے قلعے میں چلا گیا۔ بکرماجیت کا تعاقب جاری رہا اور اس نے آگے بڑھ کر ''قلعہ مود'' کو فتح کر لیا۔

اس موقع پر سات سو باغی ہلاک اور سینکڑوں گرفتار ہوئے۔ سورج مل نے یہاں سے بھی فرار کی راہ اختیار کی اور ''اسرال'' کے قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا۔ راجہ بکرماجیت، سورج مل کو سنبھلنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسی طرح برق رفتاری کے ساتھ تعاقب کرتا رہا۔ بکرماجیت نے تین دن کے محاصرے کے بعد اسرال کے قلعے پر بھی بھرپور حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اس فوجی تصادم میں ایک ہزار سے زیادہ باغی قتل ہوئے اور بے شمار قیدی بنائے گئے۔

سورج مل نے یہاں سے بھی فرار ہو کر راجہ چمپا کے قلعے میں پناہ لی۔ راجہ بکرماجیت نے اپنی حکمتِ عملی میں تبدیلی کی اور ابراہیم مہمند کو فوج کے ایک حصے کا سالار بنا کر ''بلاور'' کے راستے سے ''جمروہی'' میں داخل ہونے کا حکم دیا اور خود مزید فتوحات حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ راجہ بکرماجیت نے جلد ہی نور پور اور دوسرے پانچ قلعوں کو فتح کر لیا۔ پھر ''کوٹلہ'' کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ قلعہ تین طرف سے گہرے پانی میں گھرا ہوا تھا۔ مگر بکرماجیت نے اس قلعے پر بھی تسلط حاصل کر لیا۔ ابھی وہ ''قلعہ چمپا'' کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اسے سورج مل کے انتقال کی خبر ملی۔

اسی دوران شاہ جہاں نے اپنے تیسرے بیٹے، اورنگ زیب کی ولادت کی خبر سنی۔ اورنگ زیب ''ودھات'' کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ جہانگیر نے شاہی نجومیوں کو طلب کر کے شہزادے کا زائچہ بنوایا۔ کاغذ پر لکیریں کھینچتے کھینچتے اچانک شاہی نجومی رک گیا۔

جہانگیر نے گھبرا کر نجومی سے پوچھا۔ ''کیا شہزادے کا زائچہ کمزور ہے؟''

''نہیں ظلِ الٰہی!'' نجومی نے جواب دیا۔ ''دراصل میں ستاروں کی رفتار اور زاویے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ میں نے آج تک کسی بچے کا اتنا طاقتور زائچہ نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ شہزادہ صرف فتوحات کے لئے پیدا ہوا ہے۔''

جہانگیر اس انکشاف کے بعد بہت خوش نظر آ رہا تھا

اورنگ زیب کی پیدائش کے دوسرے دن جہانگیر کو راجہ بکرماجیت کی طرف سے فتح نامہ موصول ہوا جس میں راجہ سورج مل کی موت اور اب تک کی تمام فتوحات کی تفصیل موجود تھی۔ اس کے ساتھ ہی بکرماجیت نے لکھا تھا۔

''برسات کی وجہ سے مزید پیش قدمی تقریباً ناممکن ہو گئی ہے۔ بارشوں کا موسم گزرتے ہی شہنشاہ کے جاں نثار آگے بڑھیں گے اور اس وقت تک بڑھتے رہیں گے، جب تک کانگڑہ کے قلعے پر شاہی پرچم نہیں لہرا جاتا۔''

راجہ بکرماجیت کا خط پڑھ کر جہانگیر نے اپنے نوزائیدہ پوتے اورنگ زیب کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"بے شک! تیری پیدائش تیرے باپ اور دادا کے لئے بہت مبارک ثابت ہوئی ہے۔"

❀.....❀.....❀

نور پور میں برسات کا موسم گزار کر راجہ بکرماجیت، قلعے کی تسخیر کے لئے آگے بڑھا اور اس نے جاتے ہی کانگڑہ کا محاصرہ کرلیا۔

چند دن کے محاصرے کے بعد راجہ بکرماجیت نے پہلی جارحانہ کارروائی کی۔ اس نے جنوبی مورچے سے سرنگ لگوا کر "سنگھ بُرج" کو اُڑا دیا۔ اگرچہ یہ حکمتِ عملی دشمن کے لئے تیار کی گئی تھی لیکن اس سے شاہی فوجوں کو نقصان پہنچا۔

سنگھ بُرج اُڑا دیا گیا مگر چھوٹے دروازے کی سرنگ اور ایک دوسری سرنگ کے پھٹ جانے سے بکرماجیت کے بہت سے سپاہی ہلاک ہو گئے۔ مجبوراً اس نے اپنا منصوبہ بدل دیا اور خود جنگ میں شریک ہوا۔

کانگڑہ کے سپاہی قلعہ بند ہو گئے تھے۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے راجہ بکرماجیت نے قلعے کی بیس گز چوڑی خندق کو مٹی اور پتھروں سے بھروا کر چوبی دمدمہ تیار کیا اور خندق میں توپچی بٹھا دیئے۔ اس کے بعد شاہی توپیں مسلسل آگ اُگلنے لگیں۔

اس گولہ باری کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ قلعے میں آنے جانے کا راستہ بند ہو گیا۔ پھر وہ نازک وقت بھی آیا کہ جب قلعہ نشینوں کے پاس رسد کا سامان ختم ہو گیا۔ مجبوراً کانگڑہ کے راجہ نے صلح کی بات شروع کی اور بکرماجیت سے امان چاہی۔

راجہ بکرماجیت نے فوری طور پر اپنے برق رفتار کارندوں کے ذریعہ شاہجہاں سے رابطہ قائم کیا۔ شاہجہاں نے جہانگیر کی خدمت میں یہ عریضہ ارسال کیا۔

"اگر حکمِ شاہی ہو تو کانگڑہ کے سپاہیوں کو امان دے دی جائے ورنہ بصورت دیگر یہاں تک جنگ کی جائے کہ وہ لوگ مکمل طور پر تباہ ہو جائیں۔"

جہانگیر نے جواباً اپنے حکم نامے میں تحریر کیا۔

"اگر وہ لوگ امان کے طالب ہیں تو انہیں معاف کر دیا جائے۔ ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہم اپنی ضد کی خاطر ہزاروں انسانی جانوں کو ہلاکت میں ڈال دیں۔ ہماری تو بس اتنی خواہش ہے کہ اہلِ کانگڑہ، مغل سلطنت کے مطیع و فرمانبردار ہو جائیں۔"

حکمِ شاہی پاتے ہی راجہ بکرماجیت نے کانگڑہ کے فرمانروا سے صلح کی بات شروع کر دی۔ اس وقت کانگڑہ پر تلوک چند کا بارہ سالہ بیٹا، ہری سنگھ حکمراں تھا۔ وہ اپنے تمام منصب داروں اور راجپوتوں کے ساتھ قلعے سے باہر نکل آیا اور اپنی بہن کی شادی راجہ بکرماجیت سے کر دی۔ اس کے بعد قلعے کی کنجیاں، بکرماجیت کے حوالے کر دی گئیں۔

شاہی فوجیں بڑے جاہ و جلال کے ساتھ قلعے کے اندر داخل ہوئیں اور راجہ بکرماجیت نے

شہنشاہ جہانگیر کے نام نیا فتح نامہ ارسال کیا۔

"ظلِ الٰہی کی بلند اقبالی نے کانگڑہ کی ان چوٹیوں کو بھی سر جھکانے کے لئے مجبور کر دیا، جو اپنی بلندیوں پر ہمیشہ نازاں رہتی تھیں۔"

جہانگیر نے ناقابلِ بیان مسرت کے ساتھ یہ خبر سنی، پھر شہنشاہ، کانگڑہ کی سیر کے لئے روانہ ہو گیا۔

اس قلعے کے اندر 33 برج اور سات دروازے ہیں۔ اس کے علاوہ دو خوب صورت حوض ہیں، جن کی وجہ سے مناظر کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جہانگیر نے قلعے کی سیر کے بعد اس بت خانے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، جس کا تعلق درگا ماتا سے ہے اور جو "بھون" کے نام سے ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔ یہاں ایک کالا پتھر بھی نصب ہے، جس کی پرستش کی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی گمراہی کا تو کوئی ذکر ہی نہیں، بعض جاہل مسلمان بھی اس پتھر سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور دور دراز سے چڑھاوے لے کر آتے تھے۔

لوگوں کی گمراہی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس بت خانے کے پاس پہاڑ کے دامن میں گندھک کی ایک کان تھی، جس کی حرارت کے اثر سے دن رات شعلے نکلتے رہتے تھے۔ گمراہ لوگ ان شعلوں کو جوالا مکھی کہہ کر بت کی کرامت قرار دیتے تھے۔

جہانگیر نے قلعے کے اندر جمعہ کی نماز ادا کی اور بازور و شور خطبہ پڑھا گیا۔ نماز کے بعد شہنشاہ نے طویل سجدے کئے اور باآواز بلند یہ دعا مانگی۔

"اے خدا! مجھے یہ تاریخی فتح صرف تیرے فضل و کرم کے سبب حاصل ہوئی ہے۔ جس محاذ سے بڑے بڑے فرمانروا ناکام و نامراد لوٹ گئے، تُو نے مجھے اس محاذ پر سربلند رکھا۔"

اور واقعتاً یہ ایک مثالی فتح تھی۔ کانگڑہ کا قلعہ، جسے سلطان محمود غزنوی اور سلطان فیروز شاہ تغلق جیسے طاقتور حکمراں تسخیر نہ کر سکے، اسے شہنشاہ جہانگیر نے بہت آسانی سے فتح کر لیا تھا۔ اپنی اس فتح کو یادگار بنانے کے لئے جہانگیر نے راجہ بکرماجیت کو حکم دیا کہ کانگڑہ کے قلعے میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی جائے۔ اس کے بعد شہنشاہ نے اس مسجد کے لئے بہترین خطیب مقرر کئے۔ ان خطیبوں کا تقرر اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ بے خبر مسلمانوں کو مذہب کی تعلیم دیں اور بت پرستی سے روکیں۔ مسلمانوں کے لئے عام حکم تھا کہ وہ دُرگا کے بت کے قریب نہ جائیں۔ اس کے برعکس ہندوؤں کو اجازت تھی کہ وہ جس طرح چاہیں، اپنی مذہبی رسوم ادا کریں۔

❀.....❀.....❀

کانگڑہ کی فتح نے شاہ جہاں کی مسلسل فتوحات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔

اب عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ شاہ جہاں کے ہاتھوں میں آ کر لوہا بھی موم ہو جاتا ہے اور شاہ جہاں جس محاذ کی طرف بڑھتا ہے، فتح و نصرت اس کے قدم چومتی ہے۔

کانگڑہ کی فتح کے موقع پر جہانگیر نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ "شاہ جہاں! تُو میرا

صحیح جانشین اور مغل سلطنت کا جائز حق دار ہے۔" ۞

نور جہاں نے جہانگیر کی ہر کارروائی سے باخبر رہنے کے لئے اپنے جاسوس مقرر کر دیئے تھے۔ جب جاسوسوں نے نور جہاں کو جہانگیر کے ان جذبات سے آگاہ کیا تو وہ پریشان نظر آنے لگی۔ شاہ جہاں کے بڑھتے ہوئے اثرات، نور جہاں کے اقتدار کے لئے ایک سنگین خطرے کی نشاندہی کر رہے تھے۔

ارسلان بیگ نے بھی ایک تنہائی کی ملاقات میں نور جہاں سے یہی کہا تھا۔

"ملکۂ عالیہ! ایسا لگتا ہے کہ شہنشاہ مکمل طور پر شاہ جہاں کے زیر اثر آ چکے ہیں۔ اگر آپ نے اس فتنے کو قبل از وقت نہیں روکا تو بھری دنیا میں تنہا رہ جائیں گی۔ شہنشاہ کو سارے ہندوستان کی عمر لگ جائے مگر موت کا ایک دن مقرر ہے۔ اگر یہ الم ناک واقعہ پیش آ گیا تو آپ کا کون پرسانِ حال ہوگا؟"

اور یہ حقیقت بھی تھی کہ جہانگیر کی بے پناہ محبت نے نور جہاں کو یہ عروج بخش دیا تھا۔ ورنہ وہ ایک عورت کی حیثیت سے ہندوستان کے تخت پر قابض نہیں رہ سکتی تھی۔ اس صورتِ حال نے نور جہاں کو ایک نئے کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر وہ اپنی موجودہ حیثیت پر قناعت کر لیتی تو اُس کی پُرسکون زندگی کسی غم سے دوچار نہ ہوتی۔ مگر نور جہاں دوسرے حریص انسانوں کی طرح مستقل اقتدار میں رہنا چاہتی تھی۔ ملکۂ ہند کی خواہش تھی کہ اس کے اشارے پر بساطِ سیاست بچھائی جائے اور اسی کے حکم پر اُلٹ دی جائے۔ آرزوؤں کا یہ فریب بڑا عجیب تھا۔

نور جہاں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے دامنِ سکون میں آگ لگا لی تھی اور اب وہ بساطِ سیاست پر ایک مضبوط مہرہ چاہتی تھی، جو ہر حال میں اس کی حمایت کرے۔

اور اس خواہش کی تکمیل اس طرح ممکن تھی کہ وہ اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی کسی شہزادے سے کر دے۔ اس سلسلے میں نور جہاں کی نظر سب سے پہلے شہزادہ خسرو پر گئی۔ اگرچہ خسرو، غداری کے جرم میں شاہ کا معتوب تھا، لیکن پھر بھی بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے جہانگیر اب بھی اسے محبوب رکھتا تھا۔ یہ خسرو کی محبت ہی تھی کہ اندھا ہو جانے کے بعد جہانگیر نے ہندوستان کے نامور طبیبوں سے اس کا علاج کرایا تھا۔ پھر چھ ماہ کی طویل نگہداشت اور علاج کے بعد شہزادہ خسرو کی ایک آنکھ کی بینائی بحال ہو گئی تھی۔ دوسری آنکھ کی روشنی میں کچھ سقم موجود تھا اور وہ کسی قدر چھوٹی بھی ہو گئی تھی۔ یہ حیرت انگیز کارنامہ ایک ایرانی معالج نے انجام دیا تھا۔ اس موقع پر جہانگیر کی خوشی ناقابلِ بیان تھی۔ شہنشاہ نے بے شمار انعامات کے ساتھ ایرانی طبیب کو "مسیح الزماں" کا خطاب بھی دیا تھا۔

جب شہنشاہ، کانگڑہ کی مہم سے فارغ ہو کر آگرہ آیا تو ایک دن نور جہاں نے جہانگیر سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"ظلِ الٰہی! اب لاڈلی بیگم کی عمر زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔"

"پھر تم نے اس کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا؟" جہانگیر نے انتہائی مسرور لہجے میں پوچھا۔

"اس کا فیصلہ تو عالم پناہ کریں گے۔" نور جہاں کا انداز خوشامدانہ تھا۔

"ہمیں اپنا وعدہ یاد ہے۔" جہانگیر نے کہا۔ "اگر تم چاہو تو شہزادہ شہریار سے لاڈلی بیگم کی شادی کر سکتی ہو۔"

نور جہاں خاموش ہو گئی۔ شہزادہ شہریار ایک معمولی کنیز کا لڑکا تھا، اس لئے سیاسی طور پر اسے زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی۔ نور جہاں جانتی تھی کہ شہریار کو سلطنت کے دوسرے امراء تسلیم نہیں کریں گے۔ مجبوراً اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

"شہریار کے علاوہ تمام شہزادے شادی شدہ ہیں۔" جہانگیر نے نور جہاں کو خاموش پا کر کہا۔

"اگر جہاں پناہ مناسب سمجھیں تو شہزادہ خسرو کو اس کام پر آمادہ کریں۔" آخر نور جہاں نے اپنی دلی خواہش کا اظہار کر دیا۔ "اس طرح شہزادہ خسرو ظلِ الٰہی کے مزید قریب آ جائے گا اور پھر بہت سی بغاوتوں کا بھی خاتمہ ہو سکتا ہے۔"

شہزادہ خسرو کا نام سن کر جہانگیر نے ایک آہِ سرد کھینچی۔

"بے شک! وہ بڑا نافرمان ہے مگر اپنے دل کو کیا کریں کہ ہمیں آج بھی اس سے محبت ہے۔ اگر ملکۂ عالیہ اس رشتے کو پسند کرتی ہیں تو ہمیں دلی مسرت حاصل ہوگی۔"

مگر جب خسرو سے اس رشتے کے بارے میں بات کی گئی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ خسرو میں لاکھ خرابیاں سہی مگر وہ اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ بے کردار ہونے کے باوجود اس نے دوسری شادی نہیں کی اور نہ کبھی شاہی کنیزوں میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

خسرو سے مایوس ہونے کے بعد نور جہاں نے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے شہزادہ پرویز کی مرضی معلوم کی مگر وہاں بھی کھلا انکار تھا۔

ایک بار نور جہاں کے دل میں آئی کہ وہ شاہ جہاں سے رابطہ قائم کرے لیکن اس راستے میں بے شمار دشواریاں حائل تھیں۔ ایک یہ کہ شاہ جہاں اس کی حقیقی بھانجی، ارجمند بانو کا شوہر تھا۔ اگر نور جہاں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کی کوشش کرتی تو پورے خاندان میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور لوگ نور جہاں کی ذات کو لعنت و ملامت کا ہدف بناتے۔ دوسرے یہ کہ نور جہاں کو دلی طور پر شاہ جہاں سے نفرت تھی۔ اور اس نفرت کی وجہ شاہ جہاں کا باغیانہ سلوک تھا۔ وہ سوتیلی ماں اور ارجمند کی پھوپھی ہونے کی حیثیت سے نور جہاں کا احترام کرتا تھا مگر اُسے امورِ سلطنت میں ایک عورت کی مداخلت سخت ناپسند تھی۔ اس سلسلے میں وہ جہانگیر سے بھی ناراض رہتا تھا، جس کی جذباتی محبت نے نور جہاں کو بے شمار انسانوں کی تقدیروں پر مسلط کر دیا تھا۔ نور جہاں کو بہر حال ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ مجبوراً اُس نے لاڈلی بیگم کی شادی شہزادہ شہریار سے کر دی۔

۞.....۞.....۞

اس شادی کے موقع پر ایک بڑا جشن منایا گیا۔ دربارِ جہانگیری سے اعلان جاری ہوا کہ آگرے کے تمام مسکین و محتاج لوگ شاہی طعام خانے سے کھانا کھائیں گے۔ اس دعوتِ عام میں مبارک شاہ بھی شریک ہوا تھا۔ قلندر کی موجودگی نے تمام لوگوں کو حیران کر دیا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لئے آیا ہے۔ آگرے کے تمام باشندے جانتے تھے کہ مبارک شاہ نہ کوئی نذر قبول کرتا ہے اور نہ کسی کی دعوت میں کھانا کھاتا ہے۔ پھر وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ ہر شخص کے ہونٹوں پر یہی ایک سوال تھا۔

قلندر بے نیازانہ آگے بڑھتا رہا۔ اسی دوران کسی شخص نے جہانگیر سے کہہ دیا کہ مبارک شاہ بھی اس تقریب میں آیا ہوا ہے۔ شہنشاہ نے حیرت و سکوت کے عالم میں یہ خبر سنی اور پھر آہستہ آہستہ اس طرف بڑھنے لگا، جدھر مبارک شاہ قلندر کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ قلندر نے اسلامی روایت کے مطابق جہانگیر کو سلام کیا۔ شہنشاہ نے بھی جواباً اس مردِ آزاد کی مزاج پرسی کی۔

''کیسے ہو مبارک شاہ؟'' جہانگیر کا لہجہ بہت نرم تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' قلندر کے لہجے میں وہی بے نیازی تھی۔

''یہاں کیسے آنا ہوا؟'' جہانگیر نے دوسرا سوال کیا۔ ''ویسے مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہاں آ کر اس تقریب کی رونق بڑھا دی۔''

''مجھے دنیا کی کسی تقریب سے کوئی غرض نہیں۔'' یکایک قلندر کے لہجے کی تلخی لوٹ آئی تھی۔ ''میں تو اپنے ایک مہمان سے ملنے یہاں آیا ہوں۔''

''کون ہے وہ مہمان؟'' جہانگیر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''شاہ جہاں کا نوزائیدہ بچہ۔ میں صرف اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' قلندر کی بے قرار نظریں اِدھر اُدھر شاہ جہاں کو تلاش کر رہی تھیں۔

جہانگیر، قلندر کی بات سن کر چونک اُٹھا۔ شاہی نجومی نے بھی اورنگ زیب کے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ وہ ایک کامران و فاتح بچہ ہوگا۔ اور اب قلندر بھی اسی بچے کو دیکھنے کے لئے اپنی عادت کے خلاف شاہی محل چلا آیا تھا۔

جہانگیر نے فوراً اپنے خدام کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ شہزادہ شاہ جہاں کو یہاں بھیج دیں۔

شاہ جہاں، باپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مبارک شاہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''آپ اور یہاں؟'' شاہ جہاں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میرے پاس وقت بہت کم ہے شاہ جہاں!'' قلندر نے اسی بے نیازی کے ساتھ کہا۔ ''میں چھوٹے شہزادے کو دیکھنے آیا ہوں۔''

''میں خود اسے آپ کے پاس لے کر حاضر ہو جاتا۔'' شاہ جہاں نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ نے یہ زحمت کیوں کی؟''

''آخر وہ شہزادہ ہے۔ اس کا احترام ہم پر فرض ہے۔'' قلندر پُرجوش ہونے کے ساتھ مضطرب بھی نظر آ رہا تھا۔

شاہ جہاں تیزی سے واپس گیا اور اورنگ زیب کو لے کر واپس آ گیا۔ اس وقت اورنگ زیب کی عمر چھ سات ماہ تھی۔

قلندر، اورنگ زیب کو دیکھ کر مسکرایا اور پھر اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ جہانگیر، مبارک شاہ کی حرکات و سکنات کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''شہزادے! تم آ گئے۔'' یکایک قلندر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''کشمکشِ انتظار نے اس بوڑھے کو تھکا ڈالا تھا۔'' مبارک شاہ، اورنگ زیب سے مخاطب ہو کر گفتگو کر رہا تھا۔ ''میں تو مایوس ہو گیا تھا کہ اب اس بیمار قوم کے لئے کوئی مسیحا نہیں آئے گا۔ مگر خداوند ذوالجلال نے اپنے گناہ گار بندوں کو مایوس نہیں کیا۔ اب تم آ گئے ہو تو میں سکون سے قبر میں چلا جاؤں گا۔ کاش! ایسا ہو کہ میری عمر کے بچے ہوئے سال بھی خدا تمہارے نام کر دے۔''

یہ کہہ کر مبارک شاہ نے شہزادہ اورنگ زیب کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور بہت دیر تک انہیں بوسے دیتا رہا۔ اورنگ زیب گھبرا کر کبھی باپ کی طرف دیکھتا اور کبھی اس اجنبی بوڑھے کو دیکھنے لگتا جو اسے والہانہ انداز میں پیار کر رہا تھا۔

''شاہ جہاں! تم نے میرے شہزادے کا نام کیا رکھا ہے؟'' قلندر، شاہ جہاں سے مخاطب ہوا۔

''اورنگ زیب۔'' شاہ جہاں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

''خدا نے چاہا تو اورنگ زیب ہی ہوگا۔ تختِ شاہی کی رونق..... ایسی رونق کہ جس کے آگے تمام جاہ و جلال بجھ کر رہ جائیں گے۔'' مبارک شاہ کا لہجہ مجذوبانہ تھا۔ وہ بار بار کھلے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''اے خدا! اگر اس معصوم مسیحا پر کوئی بلا نازل ہونے والی ہو تو مبارک شاہ کے جسم کو اس کا ہدف بنا دے۔ تیرے یہاں جس قدر بھی آفات ہیں، وہ سب کی سب، مبارک شاہ پر نازل کر دے مگر شہزادے کو ہر مصیبت اور ہر گزند سے محفوظ رکھ کہ یہی اہلِ دل کا آخری سرمایہ ہے۔ اور یہی اہلِ درد کی آخری پناہ گاہ ہے۔''

اتنا کہہ کر مبارک شاہ نے اپنے بوسیدہ پیرہن کی جیب سے چاندی کے دو سکے نکالے اور انہیں اورنگ زیب کی طرف بڑھا دیا۔

''اپنے شہنشاہ کی خدمت میں ایک حقیر سا نذرانہ۔'' حیرت انگیز طور پر قلندر کا انداز، اورنگ زیب کے سامنے بہت مؤدبانہ تھا۔

اورنگ زیب نے مبارک شاہ کے دونوں روپے لے لئے اور ان پر اپنے نرم و نازک ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔

جہانگیر اور شاہ جہاں نے دیکھا کہ قلندر اس طرح اورنگ زیب کے سامنے کھڑا ہے، جیسے وہ شہزادے کو سلامی پیش کر رہا ہے۔

پھر مبارک شاہ نے شاہ جہاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شاہ جہاں! تُو بہت خوش نصیب ہے کہ تیرے یہاں بیمار ہندوستان کا مسیحا پیدا ہوا ہے کیسا بھی ناسازگار موسم آجائے، مگر شہزادے کا دل نہ توڑنا۔ یہ عیار دنیا تجھے بہت فریب دے گی مگر تجھے ہر حال میں اس شہزادے سے محبت لازم ہے۔''

یہ کہہ کر قلندر واپس چلا گیا اور جہانگیر بڑی عجیب نظروں سے مبارک شاہ کو جاتے ہو دیکھتا رہا۔

قلندر کے جانے کے بعد جہانگیر نے شاہ جہاں کو شاہی نجومی کی پیش گوئی سے باخبر کیا۔

''اب مجھے یقین آگیا ہے کہ یہ بچہ ہمارے خاندان میں ایک غیر معمولی حیثیت کا حامل ہ گا۔ یہ اس وقت دنیا میں آیا تھا، جب شاہی فوجیں کانگڑہ کے ناقابلِ تسخیر محاذ پر اُلجھی ہوئی تھیں پھر ہمیں ایک ناقابلِ یقین فتح حاصل ہوئی۔''

جہانگیر کے اس انکشاف کو شاہ جہاں نے بڑی حیرت سے سنا اور مبارک شاہ قلندر کے طر عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ دونوں باتیں ایک خاص امر کی طرف نشاندہی کر رہی تھیں۔ مگ شاہ جہاں اور ارجمند بانو کو فطری طور پر شہزادہ داراشکوہ اور شہزادہ شجاع سے بہت زیادہ محبت تھی۔

۞.....۞.....۞

اس دوران سکندر مرزا اور ماہ رخ بارہا سامنے آئے تھے مگر دونوں نے کسی سے گفتگو نہیں کی تھی۔ شاہ جہاں نے بہت چاہا کہ اس کا دوست کسی دوسری جگہ شادی کر لے، مگر سکندر مرز نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

''میں اپنی زندگی کے لئے ماہ رخ کا انتخاب کر چکا ہوں۔ اگر وہ راضی نہیں ہے تو میں بھ اپنے فیصلے سے مجبور ہوں۔''

دوسری طرف ارجمند بانو نے ماہ رخ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ تنہا زندگی کب تک بسر کرو گی؟ سکندر مرزا ایک انتہائی شریف النفس اور لائق انسا ہے۔ اس کا کردار بھی روشن ہے اور مستقبل بھی۔''

''یہ سچ ہے مگر میں خود کو سکندر مرزا کے لائق نہیں سمجھتی۔'' ماہ رخ نے اپنا وہی جواب دہرا تھا۔

''تمہارے انکار کی وجہ سے ایک باصلاحیت انسان تباہ ہو رہا ہے۔'' ارجمند بانو نے ن دلیل دے کر ماہ رخ کو متاثر کرنا چاہا۔

''میں ان کی تباہی کی ذمے دار نہیں ہوں۔'' ماہ رخ نے صاف صاف کہا۔ ''میں انہیں بہت پہلے اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔''

ارجمند بانو مایوس ہوگئی کہ یہ دونوں پتھر پگھلنے والے نہیں تھے۔

اس گفتگو کے بعد ایک دن ماہ رخ، سکندر مرزا سے ملی اور شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔

''آپ اس کنیز کو کب تک آزار پہنچاتے رہیں گے؟ آخر میں نے آپ کا کیا جرم کیا ہے؟''

''میں نے کسی کو کوئی آزار نہیں پہنچایا ہے۔'' سکندر مرزا نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ کہا۔

''صاحبِ عالم نے اس مسئلے پر مجھ سے دوبارہ گفتگو کی تھی۔ میں نے انہیں اپنے گزشتہ فیصلے سے آگاہ کر دیا کہ ماہ رخ کے سوا دنیا کی کسی عورت سے شادی نہیں ہو سکتی۔''

''آخر آپ کو میری ذات میں ایسی کون سی خوبی نظر آتی ہے؟'' ماہ رخ نے لاجواب ہو کر کہا۔

''میں کسی خوبی کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔'' سکندر مرزا نے ماہ رخ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''بس دل کہتا ہے کہ میری منزل یہی ہے۔''

''آپ کا دل کسی فریب کا شکار ہے۔'' ماہ رخ نے سکندر مرزا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی منزل ایک کنیز نہیں، کسی اعلیٰ خاندان کی کوئی صاحبِ کمال دوشیزہ ہے۔ میں تو صرف ایک ملازمہ ہوں جو دوسروں کی خدمت کے لئے پیدا ہوئی ہے۔''

''میں انسانوں کی قائم کردہ اس تفریق کو نہیں مانتا۔'' سکندر مرزا نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

''اپنے اصول، اپنی ذات تک محدود رکھئے۔ دوسروں کو اس میں کیوں ملوث کرتے ہیں؟'' یکایک ماہ رخ کی آواز بلند ہوگئی تھی۔

سکندر مرزا نے چونک کر دیکھا۔ ماہ رخ کے چہرے پر تلخی کا رنگ نمایاں ہو گیا تھا۔

''میں کسی کو ملوث نہیں کر رہا ہوں۔'' ماہ رخ کا ناخوشگوار عمل دیکھ کر سکندر مرزا کے لہجے سے شکستگی جھلکنے لگی تھی۔ ''میں تو چپ چاپ ایک گوشے میں پڑا ہوا ایک لمحے کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''کیسا لمحہ؟'' ماہ رخ کی آواز سے بدستور تلخی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''وہ لمحہ کہ جب کوئی میرے شبستانِ محبت میں داخل ہو اور مجھ سے پوچھے۔ سکندر مرزا! تُو کیسا ہے؟''

''وہ لمحہ آپ کی زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔'' یہ کہہ کر ماہ رخ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں پھر بھی انتظار کروں گا۔'' سکندر مرزا نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔ ''مگر ماہ رخ! تم شدت سے انکار کی روش پر کیوں قائم ہو؟ کم سے کم مجھے اس کی وجہ تو بتا دو۔''

ماہ رخ چند لمحوں تک کھڑی ناپسندیدہ نظروں سے سکندر مرزا کو دیکھتی رہی اور پھر شرر بار لہجے میں بولی۔ ''اس لئے کہ مجھے تم سے شدید نفرت ہے۔''

سکندر مرزا کو محسوس ہوا، جیسے اس کے دل و دماغ منجمد ہو کر رہ گئے ہوں۔

ماہ رخ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔

۞.....۞.....۞

یکایک حالات نے نئی کروٹ لی۔ کثرتِ شراب نوشی کے سبب جہانگیر کی طبیعت خراب

رہنے لگی۔ شاہی طبیبوں نے مشورہ دیا کہ شہنشاہ مکمل طور پر شراب ترک کر دیں ورنہ ان کی زندگی کو کسی وقت سنگین خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

جہانگیر نے طبیبوں کی ہدایت کے باعث دو چار دن تک ساغر و مینا کو چھوا تک نہیں۔ مگر یہ توبہ صرف توڑے جانے کے لئے تھی۔ نور جہاں نے بہت کوشش کی کہ اس کا شوہر، مے کشی سے باز آ جائے مگر جہانگیر اپنے ارادے پر قائم نہ رہ سکا۔ بچپن کی عادت تھی، آخر کس طرح چھوٹتی؟..... تین چار دن میں ہی جہانگیر برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ اور پھر اس نے یہ کہہ کر جامِ لبریز اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"ملکۂ عالیہ! اگر ہم نہیں پئیں گے تو بھی مر جائیں گے۔ اس لئے ہمیں محرموں اور پیاسوں کی موت گوارا نہیں۔"

نور جہاں، شہنشاہ کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی اور اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ شاہی طبیبوں نے دبے لفظوں میں ملکہ ہند سے کہہ دیا تھا۔

"شہنشاہ کا پورا جسم کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اگر شراب کی دیمک کو نہ روکا گیا تو وہ دل و جگر کو چاٹ جائے گی۔"

نور جہاں کے اختیار میں نہیں تھا کہ وہ شہنشاہ کو شراب نوشی سے روک سکے۔ انجام کار اسے سیاست کی بساط کی طرف دیکھنا پڑا، جہاں اس کے مخالفین روز بروز طاقت پکڑتے جا رہے تھے۔

نور جہاں کا سب سے بڑا مخالف، شاہ جہاں تھا۔ اگر کسی وقت جہانگیر کی آنکھیں بند ہو جاتیں تو نور جہاں، اقتدار سے یکسر محروم ہو جاتی۔ اسی حرص و ہوس نے نور جہاں کو ایک نیا کھیل کھیلنے پر مجبور کیا۔ اب وہ تخت کے جائز وارث، شاہ جہاں کے خلاف پوری طاقت اور ہوشیاری کے ساتھ منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ اس کا داماد، شہزادہ شہریار ایک ناکارہ شخص تھا اور اپنی اس نااہلی کے سبب وہ نور جہاں کے اشاروں پر رقص کر سکتا تھا۔ نور جہاں کو ایک ایسے ہی کٹھ پتلی شخص کی ضرورت تھی، جو موقع بے موقع نور جہاں کی جنبشِ چشم پر دیوانہ وار ناچ سکے۔

جہانگیر اپنی گرتی ہوئی صحت کے پیشِ نظر کشمیر میں مقیم تھا کہ ملک کے جنوبی علاقے ایک بار پھر سازشوں کا مرکز بن گئے۔ ملک عنبر اپنے عہد سے پھر گیا اور اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔

احمد نگر میں مغل گورنر کا محاصرہ کر لیا گیا اور بعض مغل سپہ سالار ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے جہانگیر نے دوبارہ شاہ جہاں کو دکن کی طرف روانہ کیا۔ لیکن فوری طور پر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ شاہ جہاں بھی ان حالات سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے دکن کی بغاوتوں کو کچلنے کے لئے شہنشاہ کے سامنے پہلی شرط یہ رکھی کہ شہزادہ خسرو کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ شاہ جہاں ابھی تک خسرو سے خائف تھا۔ جہانگیر نے فوری طور پر اس کا یہ مطالبہ مان لیا اور شہزادہ خسرو کو شاہ جہاں کے حوالے کر دیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی شاہ جہاں، ملک عنبر حبشی کے تعاقب میں روانہ ہوا اور ایک بھرپور ضرب لگا کر ملک عنبر کے مرہٹہ ساتھیوں کو منتشر کر دیا۔ پھر دوسرے مرحلے میں شاہ جہاں نے برہان پور کی افواج کو بھی پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ملک عنبر خطرات میں گھر چکا تھا۔ اس نے مصالحت کے لئے شاہ جہاں کے سامنے کچھ شرائط پیش کیں۔ شاہ جہاں نے اس موقع کو غنیمت جانا کیونکہ اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ خوراک نہ ملنے کے باعث تباہ حالی کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ باغیوں نے مغل مقبوضات دوبارہ شاہ جہاں کو واپس کر دیئے۔ جہانگیر اس فتح سے بہت خوش تھا لیکن اُس کی صحت روز بہ روز گرتی جا رہی تھی۔

❀.....❀.....❀

جہانگیر تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے کانگڑہ جانا چاہتا تھا کہ اچانک اُسے نور جہاں کے باپ، اعتماد الدولہ کی موت کی خبر ملی۔ جہانگیر کو ایک قابلِ اعتبار وزیر اور وفادار ساتھی کی موت پر شدید صدمہ ہوا۔ اعتماد الدولہ کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے کے بعد جہانگیر، کانگڑہ روانہ ہو گیا۔

اسی دوران جہانگیر کو اپنے بڑے بیٹے، خسرو کے انتقال کی خبر ملی۔ اس صدمے نے جہانگیر کی صحت کو بری طرح متاثر کیا۔ نافرمانیوں کے باوجود جہانگیر، شہزادہ خسرو سے بہت محبت کرتا تھا۔

خسرو کی موت کے بارے میں مختلف اطلاعات گردش کر رہی تھیں۔ شاہ جہاں نے باپ کو خبر دی تھی کہ خسرو کی موت دردِ قولنج کے سبب واقع ہوئی تھی۔ کسی نے کہا کہ خسرو کو شاہ جہاں کے اشارے پر گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اس گروہ کے خیال میں شاہ جہاں، شہزادہ خسرو کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتا تھا، اس لئے اس نے بڑی ہوشیاری سے راستے کے اس بھاری پتھر کو صاف کر دیا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ شہزادہ خسرو اپنی طبعی موت مرا ہے۔

غرض اسی قسم کی قیاس آرائیوں کے درمیان شاہ جہاں نے اپنے بھائی کے جنازے کو شاہی اعزاز کے ساتھ پورے شہر میں گھمایا اور پھر امانت کے طور پر برہان پور میں دفن کر دیا۔ بعد میں جہانگیر کے حکم سے خسرو کی لاش، خلد آباد کے باغ میں اس کی ماں کے قریب دفن کی گئی۔ اور اس باغ کو خسرو باغ کا نام دے دیا گیا۔

خسرو کی موت کے چند دن بعد جہانگیر کو مغربی سرحدوں پر گڑبڑ کی اطلاع ملی۔ ایران کے شاہ عباس کی طرف سے دوستی کی علامت کے طور پر وقتاً فوقتاً سفارتیں اور مختلف تحائف بھیجے جاتے رہے تھے۔ مگر اچانک ایران کی طرف سے سرحدوں پر جارحانہ کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ شاہ جہاں کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً سرحدوں کی حفاظت کے انتظامات بڑھا دے۔ لیکن اس سے پہلے کہ شاہ جہاں کچھ کرتا، اسے قندھار کے قلعے پر ایرانی قبضے کی اطلاع ملی۔ اس کے فوراً بعد ایرانی فوجیں، سندھ کی طرف پیش قدمی کرنے لگیں۔

جہانگیر کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ نہ صرف قندھار کو دوبارہ فتح کیا جائے بلکہ خراسان کے خلاف بھی مہم روانہ کی جائے۔ لیکن شاہ جہاں کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ شاہ جہاں نے برہان پور سے اپنی فوج کا ایک حصہ روانہ کر دیا اور شہنشاہ سے مطالبہ کیا کہ اسے اس کے خاندان کے ساتھ رنتھنبور کے قلعے میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ مزید یہ کہ وہ ایک خود مختار سپہ سالار کی حیثیت سے لڑنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ جہاں نے پنجاب کی گورنری کا بھی مطالبہ کیا۔ دراصل ان مطالبات کے پس منظر میں نور جہاں کی وہ خواہش تھی، جو شاہ جہاں سے اقتدار چھین کر اپنے داماد شہریار کو تخت پر بٹھانا چاہتی تھی۔ جہانگیر نے شاہ جہاں کے ان مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی دھول پور کی جاگیر کے معاملے پر شاہ جہاں اور شہریار کے درمیان تنازع کھڑا ہو گیا۔ دھول پور پر دونوں شہزادے اپنا حق ثابت کر رہے تھے۔ بالآخر دونوں کے ہم نوا فوجیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جہانگیر نے ایک بار پھر شاہ جہاں کو حکم دیا کہ وہ اپنے مطالبات سے دستبردار ہو کر قندھار کے محاذ پر چلا جائے۔ مگر شاہ جہاں اپنی ضد پر قائم رہا۔ نتیجتاً شہریار کو قندھار کی فوجوں کا سربراہ بنا دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نور جہاں کی طویل سازشوں کے بعد شہزادہ شہریار، سیاست کے اُفق پر ایک طاقتور مہرے کی حیثیت سے اُبھرا تھا۔

کچھ بگڑتی ہوئی صحت اور کچھ جذباتی محبت، ان دونوں چیزوں نے مل کر جہانگیر کو نور جہاں کا اسیر بنا دیا تھا۔ اب نور جہاں بڑی آسانی کے ساتھ ہندوستان کی قسمت کے فیصلے کرنے لگی تھی..... اور اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

شہریار کو قندھار کی فوجوں کا سالار بنانے کے بعد جہانگیر نے ایک اور جارحانہ کارروائی کی۔ شاہ جہاں کی پنجاب سے متعلق تمام جاگیریں شہزادہ شہریار کے نام کر دیں۔ باپ کی اس غیر منصفانہ کارروائی نے شاہ جہاں کو مزید مشتعل کر دیا۔ پھر بھی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے چند اعلیٰ افسروں کے ذریعے شہنشاہ سے نظر ثانی کی درخواست کی۔ مگر جہانگیر نے ایک لمحہ سوچے بغیر شاہ جہاں کی درخواست مسترد کر دی۔

مجبوراً شاہ جہاں نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور اپنی فوجیں لے کر آگرہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس تنازع میں بہت سے لوگ شاہ جہاں کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ہر شخص اپنی جان اور مفادات کو بچانے کی فکر میں تھا۔ انتہا یہ ہے کہ شاہ جہاں کے خسر، آصف خان نے بھی اپنے داماد سے قطع تعلق کر لیا اور نور جہاں سے جا ملا۔

اس موقع پر آصف خان نے ارجمند کو خط لکھا۔

''بیٹی! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارا شوہر اتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا۔ وہ ایک کھلا باغی ہے..... اور ایک باغی کے لئے ملک کے قانون میں زندگی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ابھی وقت ہے کہ تم شاہ جہاں کا ساتھ چھوڑ کر ایک وفادار کی حیثیت سے قلعے میں داخل ہو جاؤ۔ میں اپنی

سابقہ خدمات کی بنیاد پر شہنشاہ کو راضی کر لوں گا کہ وہ تمہارے خلاف انتقامی کارروائی نہ کریں۔ میرے خط کا ایک ایک حرف غور سے پڑھو اور اس آواز کو سنو، جو وقت کی آواز ہے۔ اگر تم نے اس آواز کو سننے کی کوشش نہیں کی تو میں تمہارے بہتر انجام کی ضمانت نہیں دے سکتا۔''

آصف خان کے خط کا ایک ایک لفظ زمانہ شناسی اور سیاست کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنے شفیق باپ کی تحریر پڑھ کر ارجمند بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر اس نے بہت جلد اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور آنسو خشک کر ڈالے پھر آصف خان کا وہ خط اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیا۔ اپنے مہربان خسر کا یہ دنیادارانہ مشورہ سن کر شاہ جہاں تڑپ اٹھا مگر اس نے ارجمند کے سامنے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''ارجمند! تم بچوں کو لے کر سلامتی کے راستے پر جا سکتی ہو۔'' شاہ جہاں نے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس دوران ارجمند کے یہاں چوتھا بیٹا، شہزادہ مراد بھی پیدا ہو چکا تھا۔ ''میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کون جانے، کسی عشرت کدے میں بسر ہو یا قید کے تاریک گوشے میں۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ میری وجہ سے یہ معصوم جانیں عتابِ شاہی کا ہدف بن جائیں اور میں تمام عمر ایک عجیب سی اذیت و خلش کا شکار رہوں۔ میں زمانے کا یہ طعنہ نہیں سننا چاہتا کہ تمہاری اور بچوں کی پُرسکون زندگی میری ضدوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ مجھے جس کا اندیشہ تھا، آخر وہ دن آ پہنچا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کا بدترین دن ہوگا، جب شہنشاہ ایک عورت کے اشاروں پر رقص کرنے لگیں گے۔ اور آج وہی ہو رہا ہے۔ ظلِ الٰہی کو ملکہ نور جہاں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ میری ساری خدمات کو اس طرح فراموش کر دیا گیا، جیسے میں شطرنج کی بساط کا سب سے ناکارہ مہرہ تھا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ سیاست کے ان ہنگاموں سے دامن بچا کر کہیں دُور چلا جاؤں۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ میرے عظیم آباؤ اجداد کی عظیم سلطنت ایک عورت کی رقص گاہ بن کر رہ جائے گی۔ ہندوستان کا تخت میرا جائز حق ہے۔ میں نے شہنشاہ کے حضور اپنے حق کے لئے درخواست پیش کی۔ مگر اس درخواست کو پڑھے جانے سے قبل ہی چاک کر دیا گیا۔ مجبوراً میں بزورِ شمشیر اپنا حق حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہوں۔ مجھے اس کا غم نہیں کہ وزیر اعظم آصف خان بھی ملکہ نور جہاں کے حامیوں میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے سیاست کے تیور پہچان لئے ہیں۔ وہ ایک زمانہ آشنا انسان ہیں، اس لئے ہواؤں کے رُخ پر چل رہے ہیں۔ اب اسے اتفاق کہا جائے کہ میری زندگی کا چراغ تیز ہواؤں کے سامنے ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ چراغ بجھ جائے، تم اپنی نئی پناہ گاہ حاصل کر لو۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ موت کی منزل میں انسانوں کا بچھڑ جانا عین فطرت کے مطابق ہے۔ اگر تم بچوں کو لے کر شاہی قلعے میں چلی جاؤ گی تو مجھے اطمینان حاصل ہو جائے گا اور پھر میں پیچھے دیکھے بغیر پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے حقوق کی جنگ لڑ سکوں گا۔''

اس دوران ارجمند بانو خاموشی سے شوہر کی باتیں سن رہی تھی مگر اُس کی آنکھوں سے آنسو

جاری تھے۔ جب شاہ جہاں خاموش ہو گیا تو ارجمند بانو کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کو تنہا چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟'' ارجمند بانو کے لہجے میں بڑا درد تھا۔

شاہ جہاں خاموش بیٹھا اس دلکش اور معصوم چہرے کو دیکھتا رہا، جس نے کئی بار اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں رفاقتوں کے نئے پھول کھلائے تھے۔

''میری بات کا جواب دیجئے؟'' ارجمند کے لہجے میں استقامت تھی۔

''دل تو یہی کہتا ہے کہ تم نہیں جاؤ گی۔ مگر عقل کا فیصلہ اس کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔'' شاہ جہاں نے جواب دیا۔ ''اور میں اس وقت عقل ہی کی بات کر رہا ہوں۔''

''زمانہ ہوا کہ میں نے اپنے ہوش و خرد اور دل و دماغ آپ کے حوالے کر دیئے ہیں۔'' ارجمند بانو کے لہجے میں بڑا سوز اور بڑی تڑپ تھی۔ ''جب میں اپنا سب کچھ آپ کی نذر کر چکی تو مجھ سے خالی ہاتھ چلے جانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔''

''یہ میری محبت ہے ارجمند! کہ میں تمہارے اور بچوں کے جسم پر آفات و مصائب کی ہلکی سی خراش بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔'' شاہ جہاں نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اور خود تنہا زخم پر زخم کھاتے رہیں۔'' ارجمند کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور محبت کا گداز بھی۔

''آخر تمہیں اپنے باپ کے خط کا کچھ تو جواب دینا ہے۔'' شاہ جہاں نے لاجواب ہو کر کہا۔

ارجمند بانو نے وزیر اعظم آصف خان کا خط، شمع کی لو پر رکھ دیا۔ ایک شعلہ سا بھڑکا اور پھر تھوڑی سی راکھ قالین پر بکھر گئی۔

''اب اس خط کا کوئی حرف باقی نہیں ہے۔ میں نے دنیا پرستی کے ایک ایک مشورے کو جلا کر خاک کر ڈالا۔''

یہ کہہ کر ارجمند بانو اُٹھی اور آصف خان کے خط کا جواب لکھنے لگی۔

''لائقِ احترام بابا جان! آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ مجھے اپنے شوہر کے طرزِ عمل پر کوئی ندامت نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے قانون کی نظر میں شاہ جہاں باغی ہوں مگر میرے نزدیک وہ اپنے حق کے حصول کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ انہیں اس جنگ میں شکست ہو گئی تو میں آپ کے حوالے سے شہنشاہ کے حضور میں رحم کی درخواست پیش نہیں کروں گی۔ شوہر کے ساتھ مجھے اور میرے بچوں کو بھی حکومت کا باغی سمجھا جائے..... آپ کا قانون ہم سب لوگوں سے وہی سلوک روا رکھے جو باغیوں کا مقدر ہوتا ہے۔ مجھے اس کا افسوس نہیں کہ آپ نے کیا لکھا مگر اس پر ہمیشہ شرمندگی رہے گی کہ ایک ذہین باپ نے اپنی بیٹی کو بہت غلط سمجھا۔''

شاہ جہاں نے عجیب سے عالم میں ارجمند کا خط پڑھا اور دو آنسو اُس کے رخساروں پر لکیریں بناتے ہوئے گزر گئے۔

۞.....۞.....۞

اگرچہ مہابت خان جیسا لائق سپہ سالار بھی نور جہاں کی زیادتیوں کا شکار رہ چکا تھا لیکن شاہ جہاں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے نور جہاں نے سیاست سے کام لیا اور مہابت خان کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ زیادہ تر امراء، نور جہاں کے پرچم تلے جمع ہو چکے تھے۔ صرف خان خاناں، شاہ جہاں کا ساتھ دے رہا تھا۔

شاہ جہاں نے آگے بڑھ کر وہ خزانہ لوٹ لیا، جو قندھار کی مہم کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اب اس کی نظر قلعے کے شاہی خزانے پر تھی۔ مگر شاہ جہاں کو اپنے اس منصوبے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس نے بڑی آسانی کے ساتھ آگرہ شہر کو لوٹ لیا کیونکہ اس کی کوئی فصیل نہیں تھی۔

اس کے بعد شاہ جہاں، شاہی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لئے شمال کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں عبداللہ خان اور شاہ جہاں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ قسمت ابھی تک شاہ جہاں کا ساتھ دے رہی تھی۔ اُس نے عبداللہ خان کو شکست فاش دی۔ شاہ جہاں کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد مزید کامیابیاں حاصل کر لے گا، مگر اب اُس کی گردش کا زمانہ قریب آ چکا تھا۔ مارچ 1623ء میں شاہ جہاں کو بلوچ پور کے مقام پر شکست ہوئی۔ اس معرکے میں شکست کے ساتھ ساتھ شاہ جہاں کو اپنے لائق ترین سپہ سالار، راجہ بکرماجیت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ راجہ بکرماجیت وہی جانباز تھا، جس نے کانگڑہ جیسے ناقابلِ تسخیر علاقے پر مغل فوج کا پرچم لہرایا تھا۔ شاہی فوجوں نے راجہ بکرماجیت کا سر کاٹ کر جہانگیر کی خدمت میں بھیج دیا۔

اس شکست کے بعد شاہ جہاں کی منصوبہ بندیوں کا شیرازہ بکھر گیا اور اسے پسپا ہو کر مانڈو (مالوہ) کی طرف جانا پڑا۔

اس دوران شاہ جہاں کا دوسرا بھائی، شہزادہ پرویز بھی مانڈو پہنچ گیا۔ اس کا بھتیجا داور بخش، احمد آباد کی طرف بڑھا جو گجرات کا دارالحکومت تھا۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر جہانگیر نے اجمیر کا ارادہ کیا تاکہ وہاں سے براہِ راست جنگ کی نگرانی کر سکے۔ شدید بارشوں کے سبب جنگ میں بہت دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔

اس موقع پر شاہ جہاں نے مرہٹہ سواروں کے دستے کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ کیونکہ مہابت خان نے اس کا رابطہ ہی ختم کر دیا تھا۔ بدقسمتی سے کالیہ دیہہ کے قریب شاہ جہاں کے کچھ اور اعلیٰ فوجی افسر اُس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ یہ ایک بڑا بحران تھا۔ مجبوراً شاہ جہاں کو دریائے نربدا کے پار جنوب کی طرف پلٹنا پڑا۔

اس دوران شاہ جہاں نے ملک عنبر حبشی سے مدد چاہی مگر اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اس وقت دریا میں زبردست طغیانی آئی ہوئی تھی۔ شاہ جہاں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ آگے ہی بڑھتا چلا جائے۔ راستے میں ٹھہرنا یا پیچھے ہٹنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ مجبوراً شاہ جہاں کو خوفناک سیلاب کی حالت میں دریا عبور کر کے گولکنڈہ میں پناہ لینا پڑی۔

یہاں بھی قسمت نے شاہ جہاں کا ساتھ نہیں دیا۔ گولکنڈہ کے حاکم نے شاہ جہاں کو مدد دینے سے انکار کر دیا اور بڑے تلخ الفاظ میں کہا۔

''شہزادے! میں گولکنڈہ کی حدود میں ایک لمحے کے لئے بھی آپ کی موجودگی برداشت نہیں کرتا۔ آپ یہاں سے بلا تاخیر چلے جائیے۔''

شاہ جہاں انتہائی مایوسی کے عالم میں تلنگانہ کی طرف بڑھا۔ پھر وہ تلنگانہ سے ہوتا ہوا اڑیسہ پہنچا۔ اڑیسہ بھی مغل صوبہ تھا۔ اس موقع سے شاہ جہاں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے بہار اور بنگال کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد الٰہ آباد اور اودھ کو اپنے زیر اثر لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ لیکن اُسے شاہی توپ خانے کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بار پھر شاہ جہاں کو چاروں طرف سے مایوسیوں نے گھیر لیا تھا۔

اس محاذ پر ناکام ہونے کے بعد وہ روہتاس کی طرف بڑھا۔ میواڑ کا کنور بھیم سنگھ، شاہ جہاں کا اتحادی تھا۔ بھیم سنگھ نے مغل شہزادے کا ساتھ دیتے ہوئے پٹنہ میں داخل ہو کر آسانی کے ساتھ بہار پر قبضہ کر لیا۔ اجین کے راجپوتوں نے شاہ جہاں کی اعانت قبول کرتے ہوئے روہتاس کا قلعہ اُس کے حوالے کر دیا۔

دوسری طرف عبداللہ خان نے الٰہ آباد کا محاصرہ کر لیا اور شاہ جہاں، بنارس میں داخل ہو کر دریائے گنگا عبور کرتے ہوئے ''کانت'' پہنچ گیا۔ اس وقت تک شہزادہ پرویز اور مہابت خان، دکن میں امن قائم کرنے کے بعد دوآبہ تک پہنچ گئے تھے۔

شاہی فوجوں اور باغی لشکروں کے درمیان الٰہ آباد کے ایک موضع ''دمدمہ'' کے قریب ایک بار پھر خونریز معرکہ ہوا۔ 1624ء کا یہ معرکہ باغیوں کے لئے مکمل شکست کا پیغام لے کر آیا۔ اس موقع پر قسمت بھی شاہی افواج کا ساتھ دے رہی تھی۔ جنگ کا پانسہ، شاہ جہاں کے حق میں پلٹ چکا تھا، مگر اس دوران ایک زخمی ہاتھی نے اس کی فوج کو انتشار میں مبتلا کر دیا۔ شاہی فوج نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔

اس خونریز جنگ میں شاہ جہاں کا ایک وفادار ساتھی، بھیم سنگھ بھی مارا گیا۔ شاہ جہاں بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہا تھا مگر زخمی ہاتھی کی وجہ سے بھگدڑ مچ جانے کے سبب ساری صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اس قدر سنگین اور نازک لمحات میں شاہ جہاں کے دو افسروں نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے مغل شہزادے کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور اسے میدانِ جنگ سے نکال کر لے گئے۔

اب شاہ جہاں بہت شکستہ ہو گیا تھا۔ اس نے شدید مایوسی کے عالم میں باپ کو آخری خط لکھا۔

''ظلِ الٰہی کو نصیحت کرنا ایک فرزند کے لئے مناسب نہیں۔ مگر کیا کروں کہ اس خادم کے سامنے کچھ ایسی ہی مجبوری آ پڑی ہے۔ یہ بات ہر عاقل و دانش مند پر واضح ہے کہ خودغرضی اور حسد کے جذبات، افلاطون جیسے شخص کو بھی اس کے مرتبے سے گرا دیتے ہیں۔ پھر زندگی کے

ناہموار راستوں میں ایک عورت کی کیا حیثیت ہے؟ خاص طور پر ملکی امور میں عورتوں کی رائے پر عمل کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ناچیز آج تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ اس کی حقیر خدمات کا کچھ نہ کچھ صلہ ضرور دیا جائے گا۔ مگر آج صورتِ حال یہ ہے کہ میری تمام قربانیوں کو نظرانداز کر دیا گیا ہے اور ایک عورت کے کہنے پر شاہی افواج میرے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کر رہی ہیں۔ میری جاگیریں ضبط کر کے اس شخص کو دے دی گئیں، جو اس عنایتِ شاہی کا ہرگز سزاوار نہیں تھا۔ اگر عالم پناہ اپنی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لیں اور اپنے دماغ سے سوچیں تو اس سرکش و باغی فرزند میں محبوبیت کے تمام آثار نظر آ جائیں گے۔ ابھی وقت ہے کہ ظلِ الٰہی اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کر لیں اور اپنی ذات کو اس عورت کے جال سے آزاد کر لیں، جو ذاتی مفاد کے لئے عظیم مغل سلطنت سے ایک خوف ناک کھیل، کھیل رہی ہے۔

آپ کا ناپسندیدہ اور دُور افتادہ فرزند..... شاہ جہاں۔''

جہانگیر نے اس بیٹے کا خط پڑھا جو کبھی تسخیر و فتح کی روشن علامت سمجھا جاتا تھا۔ آج وہی بیٹا شکست و ناکامی کے نرغے میں گھرا ہوا، باپ کے انصاف کو آواز دے رہا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ جہاں کا یہ خط، باپ کے دل میں کسی نہ کسی حد تک گداز پیدا کر دے گا۔ مگر جہانگیر نے ایک لفظ کا بھی اثر قبول نہیں کیا اور باآواز بلند تمام درباری اُمراء کے سامنے کہا۔

''ہم ہندوستان کی حکومت ایک جام شراب کے بدلے نورجہاں کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہیں۔ جسے ہماری توجہ درکار ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ دل و جان سے ملکۂ عالیہ کی اعانت کرے۔''

ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اور نورجہاں کو اسی دن کا انتظار تھا۔ جہانگیر کے دل و دماغ پر قبضہ حاصل کرنے میں اسے بڑی دُشواریاں پیش آئی تھیں، مگر کسی نہ کسی طرح وہ اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

جہانگیر کا یہ اعلان سننے کے بعد ارسلان بیگ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ شاہ جہاں اور ارجمند بانو کی دربدری نے اس کے انتقامی جذبات کو بہت تسکین پہنچائی تھی۔ وہ اسی سرشاری کے عالم میں آتمارام کے پاس پہنچا اور چیخ کر بولا۔

''گیانی! آج میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔'' شدتِ جذبات سے ارسلان بیگ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''اب ارجمند اور شاہ جہاں ذلت و ناکامی کی منزل کے مسافر ہیں۔ شاہی بھیڑیے ان کے تعاقب میں ہیں اور وہ کسی خرگوش کی مانند اِدھر اُدھر جنگلوں میں چھپتے پھر رہے ہیں۔''

''یہ سب میرے منتروں کا کرشمہ ہے ارسلان!'' آتمارام بھی خوشی سے دیوانہ ہو گیا تھا۔ ''میں نے تجھ سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ہمارے دیوتا، شاہ جہاں پر عذاب نازل کر کے رہیں گے۔ اور آج وہ دن آ گیا۔ اب بھکاری مبارک شاہ بھی اسے تباہی سے نہیں بچا سکتا۔''

''آتمارام! تیرا گیان کیا کہتا ہے؟'' ارسلان بیگ نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔ ''شاہ جہاں اور ارجمند بانو کا کیا حشر ہو گا؟''

آتمارام کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا، پھر اس نے کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔ ''ستارے کہتے ہیں کہ شاہ جہاں کو بغاوت کے جرم میں قتل کر دیا جائے گا یا پھر وہ کسی میدان میں لڑتا ہوا مارا جائے گا۔ بس تاریک قید ہی اُس کا مقدر ہے۔ اب اسے مکمل بربادی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

یہ پیش گوئی سن کر ارسلان بیگ جھومنے لگا۔ ''اور ارجمند بانو بیوہ ہو جائے گی؟''

''یقیناً!'' آتمارام نے اونچی آواز میں کہا۔ ''آکاش پر یہی لکھا ہے۔''

''پھر میں ارجمند بانو کو دوسری شادی کے لئے مجبور کر دوں گا۔'' ارسلان بیگ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ ''ملکۂ عالیہ اسے میرے حوالے کر دیں گی اور پھر میں ارجمند بانو کو بتاؤں گا کہ اس جنگ میں کون جیتا؟''

''ارسلان! اب تیرے لئے فتح ہی فتح ہے۔'' آتمارام کی شعبدہ بازیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ''عنقریب تجھے اور بھی کامیابیاں حاصل ہوں گی۔ مگر تیرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ، مبارک شاہ ہے۔ اگر اس موقع پر اس بھکاری سے نجات حاصل کر لی جائے تو قسمت کی دیوی نئے انداز سے تجھ پر مہربان ہو جائے گی۔''

مبارک شاہ کا نام سن کر ارسلان کے ذہن میں کئی مناظر اُبھر آئے۔ وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور پھر ہذیانی انداز میں بولا۔

''ہاں گیانی! اب اس بھکاری کا وقت بھی پورا ہو چکا ہے۔ ملکۂ عالیہ کو بھی اس سے اپنی توہین کا انتقام لینا ہے۔''

یہ کہہ کر ارسلان بیگ، آتمارام کی جھونپڑی سے نکلا اور شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

❀.....❀.....❀

اس وقت نور جہاں اپنی فتح کا جشن منا رہی تھی کہ ارسلان بیگ نے شرفِ باریابی کی اجازت چاہی۔ نور جہاں نے فوراً ہی ارسلان بیگ کو خلوت میں بلا لیا۔

ارسلان بیگ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی نور جہاں کو ایک طویل سجدہ کیا اور پھر سر اُٹھا کر بولا۔

''ملکۂ عالیہ کو یہ عظیم الشان فتح مبارک ہو۔ سارے ہندوستان کی پیشانیاں آپ کو سجدہ کرنے کے لئے بے قرار ہیں۔ میں نے رسمِ سجدہ کی ابتدا کر دی ہے۔ آپ دوسرے اہلِ دربار کو بھی اس امر کے لئے مجبور کریں۔''

ارسلان کے سجدہ ریز ہوتے ہی نور جہاں نے ایک عجیب سی آسودگی کا احساس کیا تھا اور اس کے سینے میں بھی یہ خواہش کروٹیں لینے لگی تھی کہ جس طرح درباری امراء، شہنشاہ کو سجدہ کرتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ اس کے سامنے بھی اپنے اُٹھے ہوئے سر جھکا دیں۔ پھر جب

ارسلان نے اس طرف اشارہ کیا تو نور جہاں کی تمناؤں کی لے تیز تر ہو گئی۔

''ہم نے تیرا سجدہ قبول کیا ارسلان! مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ مغل امراء ہمارے سامنے اپنی پیشانیاں زمین پر رکھ دیں۔'' نور جہاں کے لہجے میں بڑی خلش تھی۔ جذباتی ہونے کے باوجود ابھی اس کے دل پر دماغ کی حکمرانی تھی۔ ''ہمارا یہ حکم، مغل امراء کو مشتعل کر دے گا۔''

''مغل فنا ہو چکے ہیں ملکۂ عالیہ.....!'' ارسلان بدترین انداز میں نور جہاں کی خوشامد کر رہا تھا۔ ''اب ہندوستان پر نور جہاں کی حکومت ہے۔ ملکۂ عالیہ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اس ملک کا قانون ہے۔''

''نہیں ارسلان! ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے۔'' بے جا تعریف اور خوشامد کے درمیان گھرے ہونے کے باوجود ابھی تک نور جہاں کا دماغ جاگ رہا تھا۔

''یہ قوم سجدے کی عادی ہو چکی ہے، ملکۂ عالیہ!'' ارسلان بیگ نے چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''بس یہاں ایک شخص ایسا ہے، جو آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا۔''

''کون؟'' نور جہاں نے چونک کر کہا۔

''وہی بھکاری، مبارک شاہ۔'' قلندر کے لئے ارسلان کا لہجہ بہت تحقیر آمیز تھا۔ ''میرے خیال میں یہی مناسب وقت ہے کہ آپ اس باغی سے نجات حاصل کر سکتی ہیں۔''

''وہ کس طرح؟'' نور جہاں نے پوچھا۔

''مبارک شاہ، خداوند کا باغی ہے۔'' ارسلان بیگ نے کہا۔ ''اسے تشدد کے ذریعے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ خداوند کو سجدہ کرے۔ اگر ایک بار اس کا سر جھک گیا تو مغل امراء بھی اپنے ماتھے زمین پر رکھ دیں گے۔ مبارک شاہ کی اس باغیانہ روش نے بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اندیشے پیدا کر دیئے ہیں۔ اب عام درباری، شہنشاہ کے آگے سر تو جھکاتے ہیں مگر ان کے چہروں پر عقیدت کا رنگ نہیں ہوتا۔ مبارک شاہ نے ایک بری رسم کی بنیاد ڈالی ہے۔ اگر اس رسم کو اسی نقطے پر ختم نہیں کیا گیا تو آگے چل کر اس کے برے نتائج برآمد ہوں گے۔''

نور جہاں پہلے ہی مبارک شاہ سے نفرت کرتی تھی۔ ارسلان بیگ کی باتوں نے مزید آگ لگا دی۔ انجام کار مبارک شاہ کو گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔

❀.....❀.....❀

پھر ملکہ نور جہاں نے مبارک شاہ کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کیا۔ ارسلان بیگ زندان میں قلندر سے گفتگو کرنے گیا تھا۔

''اگر تُو شہنشاہ کو ایک بار سجدہ کر لے تو قید و بند کی یہ زندگی ایک لمحے میں ختم کی جا سکتی ہے اور تیری تمام محرومیوں کو آسودگی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔'' نور جہاں نے بھی الفاظ بدل کر قلندر کو یہی پیشکش کی تھی، جو ایک بار پہلے شہنشاہ جہانگیر کر چکا تھا۔

"میں نے کبھی نا آسودگی کی زندگی بسر نہیں کی۔" مبارک شاہ نے انتہائی مطمئن لہجے میں ارسلان بیگ کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ملکہ نور جہاں کی یہ پیشکش کسی گداگر یا دنیا کے کسی کتے کے لئے ہے۔ میں نہ کوئی گداگر ہوں اور نہ دنیا کا کتا۔"

قلندر کے اس جارحانہ جواب پر ارسلان بیگ چراغ پا ہو گیا۔ "اب تجھے اس عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تُو نے میری بہت دل آزاریاں کی ہیں۔ میں تجھ سے ایک ایک بات کا حساب طلب کروں گا۔"

"تُو جسے عذاب کہتا ہے، میں اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی راحت سمجھتا ہوں۔" مبارک شاہ کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ "تُو مجھ سے کس چیز کا حساب طلب کرے گا؟ یہ توفیق تو تیری ملکہ اور شہنشاہ کو بھی حاصل نہیں۔"

ارسلان بیگ پیچ و تاب کھاتا ہوا چلا گیا۔ اور پھر اس نے نور جہاں کے سامنے رنگ آمیزی کے ساتھ سارا واقعہ بیان کر دیا۔

نور جہاں اپنی یہ توہین برداشت نہ کر سکی اور اس نے یہ حکم جاری کر دیا کہ مبارک شاہ پر اس وقت تک تشدد کیا جائے، جب تک وہ شہنشاہ کو سجدہ کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔

قلندر کے ناتواں جسم پر پوری طاقت کے ساتھ تازیانے برسائے گئے۔ چند لمحوں کی بات تھی، مبارک شاہ کے جسم سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے تڑپا تو زندان کے فرش کا ایک حصہ قلندر کے خون سے لالہ رنگ ہو گیا۔ خون کی کچھ چھینٹیں دیواروں پر بھی گئیں۔ ظلم کے نمائندے جبر و ستم کی نئی تاریخ لکھ رہے تھے..... اس کے جواب میں مبارک شاہ صبر و ضبط کی داستان تحریر کر رہا تھا۔ ایسی داستان، جس کا ایک ایک حرف قلندر کے خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ تازیانے برسانے والوں کے بازو شل ہو گئے مگر قلندر کو شہنشاہ کو سجدہ کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ اس کی زبان سے بار بار یہی الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

"میں تو ایک کو سجدہ کر چکا۔ پھر یہ دوسرا کون ہے؟ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے صرف ایک کی خدائی کا اقرار کیا ہے۔ تم لوگ درمیان میں دوسروں کو کیوں لاتے ہو؟ میں اپنی جان سے گزر جاؤں گا مگر دوسروں کے آگے سر نہیں جھکاؤں گا۔" یہ کہتے کہتے قلندر بے ہوش ہو جاتا۔ اور جب اسے ہوش آتا تو دوبارہ تازیانے برسنے لگتے۔

کئی ماہ تک یہ عمل جاری رہا۔ مبارک شاہ کا پورا جسم زخموں سے بھر گیا تھا مگر اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ جب بھی ہوش میں آتا، سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہتا۔

"اپنے شہنشاہ اور ملکہ سے کہو کہ وہ اپنی طاقت ایک کمزور انسان پر ضائع نہ کریں۔ ان حادثات پر نظر رکھیں، جو ان کے تعاقب میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر ایک مبارک شاہ قتل ہو گیا تو خدا کے نظام میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کوئی دوسرا مبارک شاہ آ جائے گا۔ کتنے مبارک شاہ قتل کرو گے؟ قلندروں کا تو ایک طویل سلسلہ ہے۔ ایک کے بعد ایک آتا رہے گا۔ مگر جہانگیر

اور نور جہاں دوبارہ نہیں آئیں گے۔ ظلم کی چند کالی راتیں رہ گئی ہیں، جو عنقریب گزر جائیں گی۔ اس سے پہلے کہ موت کے دراز ہاتھ ان دونوں کے جسموں کو چھو لیں، انہیں میرا پیغام پہنچا دو کہ وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں۔ اگر یہ وقت گزر گیا تو پھر توبہ کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ میں اب بھی اپنے زخموں کو فراموش کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن انہیں چاہئے کہ وہ شاہ جہاں کی ایذا رسانی سے ہاتھ اُٹھا لیں۔ شاہ جہاں اس زمین پر تنہا نہیں ہے۔ اگر سارا ہندوستان بھی مخالف ہو جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ میرا شہنشاہ ہے۔ میری آنکھیں اُس کے خورشیدِ اقتدار کو طلوع ہوتے دیکھ رہی ہیں۔ ظلم کی سیاہ رات سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے۔ وہ دیکھو! شب کے پس منظر سے روشنی کی مدھم کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ کل یہی کرنیں دہکتا ہوا انگارہ بن جائیں گی۔ میں تم سب کو خبردار کرتا ہوں کہ اپنے اپنے پیرہن بچا لو۔ ورنہ انقلاب کی یہ آگ تمہارے جسموں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔"

سپاہی گھور کر اس طرف دیکھنے لگتے، جدھر مبارک شاہ اشارہ کرتا۔ مگر وہاں انہیں زنداں کے اندھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

پھر جب سپاہیوں نے قلندر کا یہ پیغام، ملکہ نور جہاں تک پہنچایا تو وہ کچھ دیر کے لئے خوف زدہ ہو گئی۔ شاہ جہاں کے اقتدار میں آ جانے کی پیش گوئی بڑی خوف ناک تھی۔ نور جہاں نے اپنی سماعتیں بند کر لیں اور ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

"مبارک شاہ جھوٹ بولتا ہے۔ زخموں کی کثرت اور تشدد کی زیادتی نے اُس کے ہوش و حواس چھین لئے ہیں۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے اور عالمِ وحشت میں بے ربط باتیں کہہ رہا ہے۔ اب شاہ جہاں کو دنیا کی کوئی طاقت عروج سے ہمکنار نہیں کر سکتی۔"

ارسلان بیگ پر بھی مبارک شاہ کی باتوں کی دہشت طاری تھی۔ قلندر نے جس طرح یہ مسلسل تشدد برداشت کیا تھا، ارسلان بیگ کی نظروں میں یہ ایک انہونی اور ناقابلِ یقین بات تھی۔ اس قدر زخم کھانے کے بعد اپنے ارادے پر قائم رہنا ایک حیران کن عمل تھا۔ جب ارسلان بیگ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے نور جہاں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"شاہ جہاں کا یہ حمایتی حکومتِ وقت کا سب سے بڑا باغی ہے۔ اسے اس کے جرم کی عبرت ناک سزا ملنی چاہئے۔"

نور جہاں پریشان نظروں سے ارسلان کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ مبارک شاہ کے قتل کے لئے بہترین موسم ہے۔" ارسلان نے نور جہاں کو قلندر کے خلاف اُکسانے کی کوشش کی۔ "جہاں میدانِ جنگ میں ہر طرف انسانی سر کٹ کٹ کر گر رہے ہیں، وہاں مبارک شاہ کا سر بھی تن سے جدا ہو گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے اندازہ کیا ہے کہ یہ شخص سیاہ زبان رکھتا ہے۔ اگر اس کی زبان نہیں کاٹی گئی تو حکومت کے خلاف کی جانے والی پیش گوئی درست بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"

"نہیں ارسلان!" نور جہاں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی مبارک شاہ کو زندگی کے اندھیروں میں پڑا رہنے دو۔ جس روز شاہ جہاں اپنے انجام کو پہنچے، اسی دن قلندر کو بھی قتل کر دیا جائے۔" نور جہاں، مبارک شاہ کی باتیں سن کر دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ اس لئے قلندر کے قتل کا حکم جاری نہ کر سکی۔

۞.....۞.....۞

دوسری طرف شاہ جہاں کو ہر محاذ پر شکست ہو رہی تھی۔ اب اُس کے پاس مایوسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اگرچہ بعد میں ملک عنبر حبشی نے بھی شاہ جہاں سے اتحاد کر لیا تھا، مگر خود اس کے سپہ سالاروں کی غداری نے اسے یہ برے دن دکھائے۔ اسی معرکہ آرائی کے دوران خان خانا کا بیٹا دراب خان بھی غداری کر گیا تھا، جسے بعد میں قتل کر دیا گیا۔

گردشِ روز و شب سے گھبرا کر شاہ جہاں انتہائی شکستہ دلی کے ساتھ برار کی طرف بڑھا اس دوران ایک اور تکلیف دہ واقعہ پیش آیا، جس نے شاہ جہاں کی پوری بساط ہی اُلٹ کر رکھ دی۔ شاہ جہاں کے سب سے لائق سپہ سالار عبداللہ خان نے اس کے سامنے اپنی تلوار توڑ دی۔

"یہ کیا ہے عبداللہ خان؟" شاہ جہاں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"صاحبِ عالم! اب میں بہت تھک گیا ہوں۔" عبداللہ خان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ مسلسل شکست و پسپائی نے تم سے تمہارے حوصلے چھین لئے ہیں؟" شاہ جہاں نے سوال کیا۔

"ایسا ہی سمجھ لیجئے۔" عبداللہ خان کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

"ہمیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آتا۔" شاہ جہاں نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ اس عبداللہ خان کا لہجہ نہیں ہو سکتا جو ہمیشہ آفات و مصائب کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔ یہ تو کسی اور عبداللہ خان کی آواز ہے۔"

"صاحبِ عالم! بڑھتے ہوئے بڑھاپے نے میرے بازوؤں کی طاقت چھین لی ہے۔" عبداللہ خان نے اپنا دامن بچاتے ہوئے کہا۔ "دست و بازو کی طاقت کے بغیر جنگ میں حصہ لینا کارِ عبث ہے۔"

"نہیں عبداللہ خان! یہ تمہارے الفاظ نہیں ہیں۔" شاہ جہاں نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔ "یہ تو کوئی اور بول رہا ہے۔"

آخر عبداللہ خان نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"صاحبِ عالم! اب میں اس کشت و خون میں مزید حصہ نہیں لے سکتا۔" عبداللہ خان بہت اُداس نظر آ رہا تھا۔ "میرا خیال تھا کہ جنگ کا یہ طوفان کسی بڑی تباہی کے بغیر گزر جائے گا..... مگر موت کی آندھی کے جھونکے دم بہ دم تیز ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس آندھی

میں کیسے کیسے تناور درخت گر گئے..... کاش! ظلِ الٰہی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لیتے اور ایک حق دار کو خوش دلی کے ساتھ اس کا حق دے دیتے۔ مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ سیاسی امور میں ملکۂ عالیہ کی مداخلت بڑا تکلیف دہ عمل ہے۔ اب اس عمل کو کسی طرح روکا نہیں جا سکا۔ ہر گزرنے والا دن بتا رہا ہے کہ ایک عورت ہندوستان کے تمام مردانِ شجاع کو اپنی ضدوں کے مقتل میں لے جا کر ان کے سر نیلام کر دے گی۔ میں موت سے نہیں گھبراتا صاحبِ عالم! مگر یہ صورتِ حال بھی برداشت نہیں ہوتی کہ دونوں طرف سے اپنا ہی زیاں ہو رہا ہو۔ تمام تعلقات میں شگاف پڑ چکے ہیں اور ساری رشتہ داریاں دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ اب مجھ سے یہ جاں گداز منظر نہیں دیکھا جاتا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں آخری سانس تک آپ کا وفادار رہوں گا۔ میری نظر میں شہنشاہ کے بعد یہ مملکت صرف آپ کا حق ہے اور میں اسی حق کے حصول کی خاطر لڑ رہا ہوں۔

"عبداللہ! تم اپنا فیصلہ واپس لے سکتے ہو۔" شاہ جہاں نے اپنے سپہ سالار کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں شہزادے! اب اس بوڑھے کے بچھڑ جانے کا وقت آ گیا ہے۔" عبداللہ خان بہت اُداس نظر آ رہا تھا۔ "میں نے ترکِ دنیا کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب میں اس درماندہ زندگی کے باقی دن یادِ الٰہی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ خدا میرے گناہوں کو معاف فرمائے۔"

عبداللہ خان کے اس فیصلے کے بعد شاہ جہاں آزمائشوں کے میدان میں تنہا رہ گیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ باپ سے معافی مانگ لے۔ شاہ جہاں نے جہانگیر کو خط بھیجا، جس میں لکھا گیا تھا کہ وہ اپنے سابقہ طرزِ عمل پر نادم و شرمسار ہے۔

شاہ جہاں کے اس خط نے دارالحکومت میں ہلچل سی مچا دی۔ شہزادے کے دشمنوں نے اپنی فتح کا جشن منایا۔ نور جہاں کو زمانہ ساز امراء نے مبارکبادیں پیش کیں۔ ان خوشامدیوں کی قطار میں ارسلان بیگ سب سے آگے تھا۔ اس نے نور جہاں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ملکۂ عالیہ! شہنشاہ سے کہئے کہ وہ شاہ جہاں کو آگرہ طلب کر لیں اور پھر اسے قلعہ میں نظر بند کر دیا جائے۔ یہ باپ اور بیٹے کا نازک معاملہ ہے۔ کسی بھی وقت شہنشاہ کے دل میں شاہ جہاں کی طرف سے نرم گوشے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ شفقتِ پدری کے دریا میں طغیانی آئے، شاہ جہاں سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھڑا لیا جائے۔" ارسلان بیگ، نور جہاں کو شاہ جہاں کے قتل کا مشورہ دے رہا تھا۔

نور جہاں نے ارسلان بیگ کی باتیں بہت غور سے سنیں۔ اگر اس کی جگہ کوئی جذباتی عورت ہوتی تو آنکھیں بند کر کے اس کے مشورے پر عمل کر ڈالتی۔ مگر نور جہاں ایک دور اندیش اور ذہین عورت تھی۔ اس نے مغل شہزادے کی گرفتاری کے بجائے صرف شاہ جہاں کی معافی پر قناعت کی۔ فی الوقت اس کے لئے یہی کامیابی کافی تھی کہ شاہ جہاں کو مکمل طور پر شکست ہو چکی

ہے۔نور جہاں نے جہانگیر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ظلِ الٰہی! شہزادہ اپنی حرکات پر نادم ہے..... آپ وسیع القلبی سے کام لیتے ہوئے شاہ جہاں کو معاف فرما دیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی شہزادے سے اس بات کی ضمانت بھی لے لیں کہ آئندہ اس کی طرف سے کوئی باغیانہ اقدام نہیں کیا جائے گا۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ضمانت کس طرح فراہم کی جائے؟" جہانگیر اپنی روز بروز گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے ذہنی طور پر منتشر رہنے لگا تھا اور اس کی قوتِ فیصلہ جواب دیتی جا رہی تھی۔

"شاہ جہاں کو لکھ دیجئے کہ وہ اپنے دو بیٹے بطور ضمانت شہنشاہ کے حضور بھیج دے۔" نور جہاں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے شوہر کو نئی راہ دکھائی۔ "اور اس کے ساتھ ہی شاہ جہاں کو تنبیہہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھ دیجئے کہ اگر پھر کبھی اس نیت میں کوئی خلل واقع ہوا تو دونوں شہزادوں کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔" نور جہاں نے بڑی ذہانت سے اپنا منصوبہ پیش کیا تھا۔

جہانگیر نے حیرت و مسرت کے ساتھ اپنی ہوش مند بیوی کی طرف دیکھا۔

"نور جہاں! اگر اس تھکی ہوئی زندگی کے سفر میں تم ہمارے دوش بدوش چلتے ہوئے ہمیں سہارا نہ دیتیں تو ہم اب تک لڑکھڑا کر زمین پر گر چکے ہوتے۔"

"نہیں ظلِ الٰہی! اس کی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔" ملکہ ہند نے اپنی اس توبہ شکن مسکراہٹ کے ساتھ کہا، جس کے سحر میں جہانگیر بہت دنوں سے گرفتار تھا۔ "جب تک نور جہاں کی آخری سانس باقی ہے، اس وقت تک وہ آپ کو گرنے نہیں دے گی۔ اور خدانخواستہ وہ منحوس ساعت آ گئی تو آپ اس کنیز کو پہلے قربان ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔" نور جہاں کے اندازِ دلربائی نے ایک بار پھر جہانگیر کے دل و دماغ کو جکڑ لیا تھا۔

اور پھر اس کے بعد جہانگیر کی طرف سے شاہ جہاں کو لکھ دیا گیا۔

"مابدولت نے اپنے بے مثال کرم سے کام لیتے ہوئے تمہاری درخواست پر غور کیا۔ تمہارے جرائم بہت زیادہ تھے مگر ہماری شفقت یہ گوارا نہیں کرتی کہ تمہیں اپنے حضور سے خالی ہاتھ لوٹا دیں۔ تمہارے سارے قصور معاف کر کے تمہیں اس شرط کے ساتھ امان دی جا سکتی ہے کہ تم اپنے دو بیٹے ضمانت کے طور پر دربارِ شاہی کی طرف روانہ کر دو۔ یہ ضمانت محض اس لئے ہو گی کہ تم آئندہ احکامِ شاہی کے خلاف سرکشی اختیار نہیں کرو گے۔ اگر تمہارے سینے میں ہوسِ اقتدار نے دوبارہ سر اٹھایا تو دونوں شہزادوں کی زندگی کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

❀.....❀.....❀

شاہ جہاں نے باپ کا خط پڑھا اور اس کے چہرے پر مایوسیوں کا دھواں پھیل گیا۔

"کیا ہوا صاحبِ عالم؟" ارجمند بانو نے شوہر کو اس قدر اُداس دیکھ کر پوچھا۔

شاہ جہاں نے جواب دینے کے بجائے شہنشاہ کا خط، ارجمند بانو کے سامنے رکھ دیا۔

ارجمند نے حکمِ شاہی کا بغور جائزہ لیا اور پھر نہایت شگفتہ لہجے میں کہا۔ "آپ کا مقصد تو پورا ہو چکا۔ پھر آپ اتنے شکستہ کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

"بے شک! شہنشاہ نے شفقت و محبت سے کام لیا مگر میرے بیٹوں کی ضمانت کیوں طلب کی گئی؟" شدتِ جذبات سے شاہ جہاں کی آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ "کاش! یہ شرط عائد نہ کی جاتی تو میں سمجھ لیتا کہ شہنشاہ کے دل میں میرے لئے کوئی گنجائش باقی ہے۔ اس معافی نامے میں بڑی جارحیت پوشیدہ ہے..... جیسے میں ان کا بیٹا نہیں، حکومت کا بدترین باغی ہوں..... جن شہزادوں کو بطورِ ضمانت دربار میں طلب کیا جا رہا ہے، وہ بھی ان ہی کا خون ہیں۔ آخر وہ مجھے اتنا کمزور کیوں کر دینا چاہتے ہیں؟"

ارجمند بانو، شاہ جہاں کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی۔

"میرا خیال تھا کہ اس قدر خونریزی کے بعد شہنشاہ ایک عورت کے طلسم سے آزاد ہو چکے ہوں گے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ظلِ الٰہی نے اپنے دماغ سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ اس معافی نامے کی تحریر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مجھے میرا حق دینا نہیں چاہتے۔ میرا ناکارہ بھائی، شہزادہ شہریار ہی آج کل ان کا منظورِ نظر ہے..... اور یہ انقلاب یوں ہی نہیں آیا ہے۔ شہزادہ شہریار، ملکہ ہند کا داماد بھی ہے۔ شہنشاہ نے باقی سارے رشتے فراموش کر دیئے ہیں اور اب یہی ایک رشتہ معتبر ٹھہرا ہے۔"

"جانے دیجئے صاحبِ عالم! قسمت میں یہی لکھا تھا۔" ارجمند بانو نے شکستہ دل شوہر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی قسمت کا ماتم نہیں کر رہا ہوں ارجمند!" اچانک شاہ جہاں کے لہجے کا وہی جلال لوٹ آیا تھا۔ "میں نے جو کچھ حاصل کیا، اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر بزورِ بازو حاصل کیا۔ مجھے اس کے چھن جانے کا کوئی غم نہیں ہے۔ میں شہنشاہ کا خوشامدی نہیں، ایک جانباز بیٹا ہوں۔ مجھے ہر وقت فردوس مکانی (شہنشاہ ظہیرالدین بابر) کی عظیم وراثت کا خیال ستاتا رہتا ہے۔ آہ! یہ وراثت صرف ایک عورت کی وجہ سے کس طرح برباد ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شہنشاہ ابھی اس عورت کے حلقۂ اثر سے نہیں نکلے ہیں، جو رشتے کے اعتبار سے میری ماں بھی ہے..... مگر ایک نادان اور خودغرض ماں جو معصوم بچوں کو اپنے باپ سے جدا کر رہی ہے۔ آج مجھے اندازہ ہوا کہ ملکہ ہند اقتدار کی حریص ہونے کے ساتھ ساتھ سنگدل اور سفاک بھی ہے۔ وہ شہنشاہ کو مجبور کر سکتی تھی کہ معافی نامے میں یہ شرط نہیں رکھی جائے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دینا چاہتی ہیں کہ میں اپنے بیٹوں کو یرغمال کے طور پر دربارِ شاہی میں بھیج دوں اور اپنی مرضی کے مطابق جنبش تک نہ کر سکوں۔"

"آپ شہنشاہ کی اس شرط کو فوراً تسلیم کر لیجئے۔" ارجمند بانو نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ "مجھے اولاد سے زیادہ آپ کی زندگی عزیز ہے۔ یہ تو صرف دو بیٹوں کی شرط ہے، اگر ظلِ الٰہی میری تمام اولادوں کو ضمانت کے طور پر طلب کریں تو انہیں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر بھیج دیجئے۔"

شاہ جہاں اپنی بیوی کے اس طرزِ کلام پر حیران رہ گیا۔

"صاحبِ عالم! آپ تاخیر نہ کیجئے۔" ارجمند بانو بار بار اصرار کر رہی تھی۔ "میرے تمام بچے آپ کی عزت و وقار پر قربان۔ بے شک یہ سب کی سب آپ کی نشانیاں ہیں مگر جب آپ ہی نہ رہے تو پھر میں ان نشانیوں کا کیا کروں گی؟"

اس شکستگی کے عالم میں بیوی کا یہ سلوک دیکھ کر شاہ جہاں آب دیدہ ہو گیا۔ "ارجمند! میں ہمیشہ تمہاری رفاقت پر نازاں رہا۔ مگر مجھے اتنا اندازہ نہیں تھا کہ میری خاطر تم اپنی اولاد بھی قربان کر دو گی۔ یہ ایثار کی بڑی مثال ہے۔ میں آخری سانس تک تمہارا احسان مند رہوں گا۔ تم اس وقت میرا ساتھ دے رہی ہو، جب ساری دنیا میرے خلاف ہو چکی ہے۔"

"یہ ادنیٰ قربانی ہے صاحبِ عالم!..... ارجمند کو تو اس وقت کا انتظار ہے کہ جب یہ بے وفا دنیا اُس کی جان کا نذرانہ مانگے۔ پھر آپ دیکھئے گا کہ آپ کی یہ ادنیٰ کنیز کس طرح اپنی جان سے گزر جائے گی۔" ارجمند کا جذبۂ جاں نثاری اپنے عروج پر تھا۔

"ایک ماں کے لئے سب سے بڑا امتحان یہی ہے کہ وہ اپنی اولاد سے جدا ہو جائے۔" شاہ جہاں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "میری دعا ہے کہ خدا اب تمہیں کسی مزید آزمائش میں نہ ڈالے۔"

وہ منظر بڑا جانگداز تھا، جب شاہ جہاں کے دو بیٹے، شہزادہ داراشکوہ اور شہزادہ اورنگ زیب، شاہی فوجیوں کی نگرانی میں دارالحکومت آگرہ کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت داراشکوہ کی عمر دس سال تھی اور اورنگ زیب کی عمر آٹھ سال۔ روانگی سے قبل دونوں بچوں نے اپنے ماں باپ سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟

جواب میں ارجمند بانو نے کہا تھا۔ "تم دونوں اپنے محترم دادا سے ملنے آگرہ جا رہے ہو۔ شہنشاہ تمہیں دیکھنے کے لئے بہت بے قرار ہیں۔"

بچوں کو رخصت کرتے وقت ارجمند بانو کے چہرے پر نہ عکسِ ملال تھا اور نہ زبان میں کوئی لڑکھڑاہٹ۔ اس نے غیر معمولی صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ پھر جب دارا اور اورنگ زیب، آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو آنسوؤں کے چند قطروں نے اس کے رخسار کو بھگو دیا تھا مگر ہونٹوں پر شور فغاں نہیں تھا۔

شاہ جہاں نے گھبرا کر اسے تسلی دینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو ارجمند نے شوہر کے شانے پر سر رکھ دیا۔

"نہیں صاحبِ عالم! میں اولاد کی جدائی کا ماتم نہیں کر رہی ہوں۔ یہ تو دل پر چھایا ہوا ہلکا

سا غبار تھا، جو آنکھوں سے برس گیا۔"

❀.....❀.....❀

دونوں شہزادوں داراشکوہ اور اورنگ زیب کو شاہی قلعے میں دیکھ کر نور جہاں کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ اب اس کے تصور میں نئی فتوحات کے نئے رنگ اُبھر رہے تھے۔

جہانگیر نے بجھے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنے دونوں پوتوں کو دیکھا۔ بڑھتی ہوئی بیماری کے سبب وہ بہت زیادہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اس موقع پر سب سے زیادہ خوشی کا مظاہرہ ارسلان بیگ نے کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہ خود فاتح ہو اور شاہ جہاں مفتوح۔ اورنگ زیب اور دارا کے قلعے میں داخل ہونے کے بعد ارسلان بیگ، مبارک شاہ کے پاس پہنچا اور بڑے تحقیر آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

"تیرے محبوب کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اب شاہ جہاں کے پاس ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے بھکاریوں کی طرح باپ سے معافی مانگی ہے اور اپنے دونوں بچوں کو بطورِ ضمانت شاہی محل میں داخل کر دیا ہے۔ وہ طنطنہ، وہ غرور سب خاک میں مل گیا۔ تیری دعائیں بھی کچھ کام نہیں آئیں۔"

ارسلان بیگ کی باتوں کے جواب میں قلندر کچھ نہیں بولا۔ بس کھوئی کھوئی نظروں سے سر اُٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا جو شاہی فوجوں کی کامیابی کو اپنی فتح سمجھ کر قید خانے میں رقص کر رہا تھا۔

"آخر تیری دعائیں کس کام آئیں؟..... تُو تو محض ایک شعبدہ باز ہے..... اور شاہ جہاں کے اقتدار کے ساتھ تیری شعبدہ بازی کے دن بھی پورے ہو چکے ہیں۔ کچھ لمحوں کی بات ہے۔ پھر نہ تُو رہے گا اور نہ تیری قلندری۔"

قلندر بدستور خاموش بیٹھا رہا۔ ارسلان بیگ اپنے دل کا غبار نکال کر گیانی آتما رام کے پاس چلا گیا اور اسے دونوں شہزادوں کے یرغمال بننے کی خوشخبری سنائی۔

آتما رام نے بڑی عیاری کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا اور ایک لمبی سانس کھینچی۔

"پربھو (مالک) تیری عجیب لیلا (شان) ہے۔ اپنے داسوں (غلاموں) کو کیسی عجیب پرتیکشا (انتظار) کراتا ہے..... مگر جب دینے پر آتا ہے تو بے حساب دیتا ہے۔ میری کتنی راتیں آکاش کو تکتے ہوئے گزر گئیں مگر تیری کرپا کا دوار کھلتا ہی نہیں تھا۔ اب یہ دوار (دروازہ) کھلا ہے تو چاروں اور دیا کی ورشا ہو رہی ہے۔ میں اس پانی میں سر سے پاؤں تک بھیگ گیا ہوں۔ بھگوان! تُو تو انتریامی (دلوں کا حال جاننے والا) ہے۔ میں کتنی راتوں سے سکھ کی نیند نہیں سویا ہوں۔ اب تُو نے میرے من کا بوجھ اُتار دیا ہے، اپنی اپار شکتی (غیر محدود طاقت) سے شاہ جہاں کو موت کی نیند سلا دے کہ وہ میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔"

گیانی آتمارام ایسے شخص کی موت کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا، جو تمام ہندوستان کے ساتھ رواداری سے پیش آتا تھا اور جس کے اتحادیوں میں بھیم سنگھ اور راجہ بکرماجیت جیسے راجپوت شامل تھے۔

گیانی آتمارام، شاہ جہاں سے محض اس لئے خفا رہا تھا کہ وہ اپنے باپ اور دادا کی ہندوانہ رسموں سے بیزار تھا۔ اسی بنا پر آتمارام نے یہ مفروضہ قائم کرلیا تھا کہ شاہ جہاں کا دورِ اقتدار ہندوؤں کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ شاہ جہاں ایک اعلیٰ ظرف مسلمان تھا۔ اس نے مذہب کی آڑ لے کر کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ البتہ وہ آتمارام جیسے شعبدہ باز انسانوں کا سخت دشمن تھا۔ وہ اپنی زندگی میں سخت محنت کا عادی تھا اور ایسے لوگوں کو ناپسند کرتا تھا جو مخلوقِ خدا کو بے وقوف بنا کر اپنی روٹی حاصل کرتے تھے۔ شاہ جہاں کے ان ہی نظریات کی وجہ سے آتمارام جیسے شعبدہ باز اور جادوگر ہر وقت سہمے رہتے تھے اور دن رات مغل شہزادے کی موت کی دعا کرتے تھے۔

شاہ جہاں کی شکست کی خبر سن کر آتمارام بہت خوش تھا اور شاہی فوجوں کی اس کامیابی کو اپنے دیوتاؤں کی کامیابی سمجھ رہا تھا۔ بہت دیر تک آسمان کی طرف دیکھنے اور پرارتھنا کرنے کے بعد ارسلان بیگ سے مخاطب ہوا۔

"اب تیرا دور آگیا ہے ارسلان! جو کچھ چاہے گا، وہی ہوگا..... اور جو کچھ مانگے گا، وہی ملے گا۔"

"میں شاہ جہاں کی موت چاہتا ہوں..... اور پھر اس بھکاری کی موت، جس نے تیرے سارے منتروں کو ناکارہ بنا دیا تھا، جس کے نتیجے میں ارجمند مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔"

"وہ زمانہ اور تھا ارسلان!" گیانی آتمارام نے اپنی شکست پر پردہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میرے منتر ناکام نہیں ہوئے تھے۔ وہ ستاروں کی چال تھی، جس نے مبارک شاہ کو موت سے بچالیا تھا۔"

"اب ستارے کیا کہتے ہیں گیانی؟" ارسلان بیگ نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

"تمام ستارے تیری موافقت میں گردش کررہے ہیں۔" گیانی آتمارام نے کہا۔ "اب اگر تُو کسی پتھر کو بھی چھولے گا تو وہ سونے کا ڈھیر بن جائے گا۔ آج فتح کا جھنڈا تیرے ہاتھوں میں ہے۔ جس انداز سے چاہے، لہرادے۔ کوئی تجھے روکنے والا نہیں۔"

۞.....۞.....۞

گیانی آتمارام کی گمراہ کن باتوں، شاہ جہاں کی شکست اور نورجہاں کے بڑھتے ہوئے اثرات نے ارسلان بیگ کو پاگل بنا دیا تھا۔ وہ بڑی آزادی کے ساتھ مبارک شاہ قلندر اور ہندوستان کے دوسرے صوفیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے لگا۔

"ہندوستان کے یہ صوفی، ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حکومتِ وقت سے بغاوت کرنا انہوں نے اپنا پیشہ بنالیا ہے تاکہ اس طرح ان کی دکانیں چمک سکیں اور یہ نذر و نیاز کے بہانے عام لوگوں کی روٹیوں پر گزر اوقات کرسکیں۔"

جہانگیر کے درباری امراء، ارسلان بیگ کی یہ تکلیف دہ باتیں سن کر خاموش ہوجاتے۔ انہیں معلوم تھا کہ ارسلان بیگ، ملکہ عالیہ کا سب سے بڑا مصاحب ہے اور نورجہاں، ہندوستان کے ساتھ ساتھ جہانگیر کے دل و دماغ پر بھی حکومت کررہی ہے۔ اسی مجبوری کے تحت درباری اُمراء، ارسلان بیگ کو برداشت کرتے رہے۔

ارسلان بیگ نے امراء کی اس خاموشی کا غلط مفہوم لیا اور مزید بے لگام ہوگیا۔

ایک دن کسی امیر نے ارسلان بیگ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"تمام صوفیوں کا یہ مزاج نہیں ہوتا۔ وہ عوام کی پیش کردہ نذر و نیاز، ضرورت مندوں میں تقسیم کردیتے ہیں۔ اپنی ذات پر ایک ذرّہ بھی خرچ نہیں کرتے۔"

پھر اسی امیر نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی صوفی تھے اور زندگی بھر دنیا کی کسی طاقت سے متاثر نہیں ہوئے۔ انتہا یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر کے سامنے بھی دستِ طلب دراز نہیں کیا۔ ان کی دعاؤں میں بڑی تاثیر تھی۔ شہنشاہ اکبر بے اولاد تھے۔ اگر حضرت شیخ سلیم چشتیؒ اُن کے حق میں دعائے خیر نہ کرتے تو ہندوستان کا تخت اپنے وارث کے لئے ترستا رہتا اور کون جانے کہ مغل سلطنت کا کیا انجام ہوتا؟"

ارسلان بیگ اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ حضرت سلیم چشتیؒ کی بزرگانہ عظمت کو تسلیم کرنے کے بجائے وہ برہم ہوگیا اور سلسلۂ چشتیہ کے عظیم صوفی کی شان میں بھی گستاخانہ کلمات ادا کرنے لگا۔

درباری امیر خاموشی سے اُٹھا اور جہانگیر کی خلوت میں جاکر عرض کرنے لگا۔

"ظلِ الٰہی! ہم نے اس شخص کی بے ہودگیوں کو بہت برداشت کیا۔ مگر اب وہ حد سے گزر چکا ہے۔ اس کے نزدیک آپ کے شیخ کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔"

کمزوری کے باعث جہانگیر بستر پر دراز تھا۔ مگر جب شہنشاہ نے یہ واقعہ سنا تو اس کے دل و دماغ جل اُٹھے۔

"وہ حرام کار یہاں تک پہنچ گیا ہے۔" جہانگیر پاگلوں کے سے انداز میں چیخا۔ دمے کی وجہ سے اس کا سانس پھول گیا تھا مگر وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اُس ناپاک زبان کو کاٹ کر پھینک دو، جس نے ہمارے شیخ کی شان میں گستاخی کی ہے۔"

جہانگیر کا حکم تھا کہ ایک زلزلہ تھا، جس نے ایوانِ شاہی کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نورجہاں کا منہ چڑھا مصاحب اس طرح قہرِ جہانگیری کا نشانہ بن جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد ہی شہنشاہ نے ملکہ نور جہاں کو خلوت میں طلب کیا۔ ''دربار آراستہ کرنے کا حکم دیا جائے۔ ہم بہ نفسِ نفیس دربار میں شرکت کریں گے۔''

نور جہاں بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ ایک طرف اس کے معتمد خاص ارسلان بیگ کی موت کا حکم.....اور دوسری طرف بگڑی ہوئی صحت کے باوجود جہانگیر کی شاہانہ ضد۔

''ظلِ الٰہی! طبیبوں کا مشورہ ہے کہ آپ اس بے آرامی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔'' نور جہاں نے اپنے بیمار شوہر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی صحت ذرا بہتر ہو جائے تو دربار بھی آراستہ کر دیا جائے گا اور ارسلان بیگ کو بھی اس کے انجام تک پہنچا دیا جائے گا۔''

''نہیں ملکۂ عالیہ! ہم اس معاملے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کر سکتے۔'' شہنشاہ کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں۔ ''ابھی ہم اتنے مجبور بھی نہیں کہ اپنے پیروں سے چل کر تختِ شاہی تک نہ جا سکیں۔ طبیبوں کے مشورے اپنی جگہ.....اور ہمارے دل کے تقاضے اپنی جگہ۔ اس حرام کار کو فوراً ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔''

جب نور جہاں کو یقین ہو گیا کہ شہنشاہ ارسلان کی جاں بخشی نہیں کریں گے تو اس نے اپنی ذات کے حوالے سے درمیان میں مداخلت کی۔

''عالم پناہ! ارسلان سے یہ گناہ نادانستگی کی حالت میں سرزد ہوا ہے۔'' نور جہاں نے اپنے مصاحبِ خاص کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنی اس غلطی پر بہت پشیمان ہے۔ میرے خیال میں اسے معاف کر دیا جائے تو بہتر ہے۔''

''یہ تم کہہ رہی ہو ملکۂ عالیہ!'' جہانگیر نے برہم لہجے میں کہا۔ ''کیا تم نہیں جانتیں کہ ہمیں اپنے شیخ سے کس قدر عقیدت ہے؟''

''میں ظلِ الٰہی کے جذبات سے واقف ہوں.....مگر یہ سب کچھ انجانے میں ہوا ہے۔'' نور جہاں مختلف حربے استعمال کر کے ارسلان بیگ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''وہ محض زبان کی ایک لغزش تھی۔ ورنہ ارسلان بیگ بھی حضرت شیخ کی عظمت و بزرگی کو دل سے تسلیم کرتا ہے۔''

نور جہاں نے جھوٹ بول کر شہنشاہ کے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''ہم اسے ایسی لغزش کی سزا دینا چاہتے ہیں۔'' شہنشاہ کی آتشِ غضب مسلسل بھڑک رہی تھی۔ ''نادانستگی کا گناہ کچھ اور ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید ہم اسے معاف کر دیتے۔ مگر ہمیں بتانے والے نے بتایا ہے کہ وہ پورے ہوش و حواس میں گفتگو کر رہا تھا۔ ہمارے جاں نثار نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ اپنے الفاظ پر قائم رہا اور حضرت شیخ کی شان میں پیہم گستاخیاں کرتا رہا۔ زبان کی لغزش ایک بار ہوتی ہے اور وہ بدنصیب، حضرت شیخ کا مرتبہ کم کرنے کے لئے اپنے دلائل پیش کرتا رہا۔ تم پھر بھی اُس کی اس حرکت کو زبان کی لغزش کہتی ہو۔'' یہ کہہ کر جہانگیر کھڑا ہو گیا۔

نور جہاں نے فوراً آگے بڑھ کر شہنشاہ کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ یہ نور جہاں کی

ادائے خاص تھی کہ جب جہانگیر تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوتا تو اس کے عقب میں ایک پردہ کھینچ دیا جاتا۔ پردے کے پیچھے نور جہاں بیٹھ جاتی اور اپنا ہاتھ شہنشاہ کے کاندھے پر رکھ دیتی۔ یہ مرمریں اور گداز ہاتھ اس وقت تک جہانگیر کے شانے کو مس کرتا رہتا، جب تک دربار برخاست نہ ہو جاتا۔ شہنشاہ کے جنونی عشق کا یہ عالم تھا کہ اگر ایک لمحے کے لئے بھی نور جہاں کا ہاتھ ہٹتا تو وہ بے قرار ہو جاتا۔

مگر آج نور جہاں کے دستِ حنا رنگ کا تمام طلسم بے اثر ہو چکا تھا۔ جہانگیر کی سانس پھول چکی تھی لیکن وہ پھر بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ نور جہاں کی یہ تدبیر رائیگاں گئی تو اس نے واضح الفاظ میں شہنشاہ سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''ظلِ الٰہی! میری خاطر ارسلان بیگ کو معاف کر دیجئے۔''

جہانگیر آگے بڑھتے بڑھتے ٹھہر گیا اور عجیب سی نظروں سے ملکہ ہند کی طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ تم کہہ رہی ہو نور جہاں؟ کیا تمہیں عالم پناہ کے جذبات کا کوئی احساس نہیں؟''

نور جہاں غرورِ حُسن میں مبتلا تھی، اس لئے اس سنگین صورتِ حال کو نہ سمجھ سکی۔

''میں کہتی ہوں، عالم پناہ! کہ ارسلان بیگ کو معاف کر دیجئے۔'' بظاہر یہ ایک درخواست تھی مگر اس میں محبوبیت کا تحکم بھی شامل تھا۔

بیوی کا یہ انداز دیکھ کر جہانگیر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''ملکۂ عالیہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ بھی ہمارے احساسات سے بے خبر رہتی ہیں۔''

نور جہاں سنبھل گئی۔

''عالم پناہ! یہ اس کنیز پر الزام تراشی ہے کہ وہ شاہِ والا کے جذبات کو نہ سمجھ سکی۔'' نور جہاں نے بہت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ ہمارے احساسات کو سمجھ لیتیں تو اس طرح اس مجرم کی سفارش نہ کرتیں۔'' جہانگیر نے تلخ لہجے میں کہا۔

''وہ مجرم آپ کو خداوند کہہ کر پکارتا ہے۔ کم سے کم آج اس کی اسی خدمت گزاری کا لحاظ رکھ لیجئے۔'' نور جہاں مختلف بہانے تراش کر ارسلان بیگ کو بچانا چاہتی تھی۔ ''اگر آپ کو اس خدمت گزاری کا احساس نہیں تو یہ سوچ کر معاف کر دیجئے کہ وہ آپ کی مہرو کا خادمِ خاص ہے۔'' نور جہاں نے جہانگیر پر ایک اور جذباتی حربہ استعمال کیا تھا۔

مگر آج شہنشاہ پر کوئی حوالہ اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔

''اگر وہ ہمیں خداوند کے بجائے خدا کہہ کر بھی پکارتا تو ہم اسے معاف نہیں کرتے۔'' جہانگیر کا لہجہ مزید غضب ناک ہو گیا تھا۔ ''وہ تو محض تمہارا خادم ہے، اگر اس کی جگہ تم ہوتیں تو ہم تمہیں بھی معاف نہیں کرتے۔'' جہانگیر کو بولنے میں بہت دُشواری پیش آ رہی تھی مگر وہ اپنے آپ پر جبر کر کے بول رہا تھا۔ ''کسی دوسرے کا کیا ذکر؟ اگر ہماری زبان بھی لڑکھڑا جاتی تو ہم

اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کرتے۔ اہلِ دنیا اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیتے کہ خود ہماری زبان بھی ہمارے دہن سے جدا ہو گئی ہے۔ یہ جرم ہی ایسا ہے کہ اس میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

یہ کہہ کر جہانگیر دربار کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ طویل راہ داری سے گزر رہا تھا۔ نور جہاں اور کئی خدمت گار پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ دمے کے مرض نے جہانگیر کو کسی قابل نہیں چھوڑا تھا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد اس کی سانسیں بے ربط ہو گئیں۔ جہانگیر کے قدم لڑکھڑائے۔ نور جہاں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کی۔ شہنشاہ رُک گیا اور اس نے آہستہ سے نور جہاں کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اس وقت ہمیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔" جہانگیر کے چہرے پر نفرت و غضب کا رنگ نمایاں تھا۔

خدمت گار لرز کر رہ گئے۔ اور نور جہاں کو پہلی بار اپنی شکست کا احساس ہونے لگا۔

پھر جہانگیر اسی طرح لڑکھڑاتا ہوا دربار تک پہنچا۔ تمام امراء سہمے ہوئے تھے اور بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا شہنشاہ اس قدر کمزور ہو چکا ہے۔ تخت پر چڑھتے ہوئے جہانگیر کے قدم کئی بار غیر متوازن ہوئے اور اہلِ دربار کو یوں محسوس ہوا کہ شہنشاہ فرش پر گر جائے گا۔ مگر جہانگیر نے قوتِ ارادی سے کام لے کر لڑکھڑاتے ہوئے جسم کو سنبھالا۔ پھر ایک ہاتھ سے تختِ شاہی کا پایہ پکڑ کر اپنی مسند تک پہنچا۔

اس دوران اہلِ دربار کی سانسیں رک گئی تھیں۔ ہر شخص آگے بڑھ کر شہنشاہ کو سہارا دینے کے لئے بے قرار تھا مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مزاجِ شاہی کے خلاف اپنی جگہ سے جنبش بھی کر سکے۔

تخت پر بیٹھ کر جہانگیر نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کی سانس اس قدر بے ربط ہو چکی تھی کہ شہنشاہ کے لئے بات کرنا بھی دُشوار تھا۔ اتنا طویل فاصلہ طے کرنے سے جہانگیر کا پورا جسم پسینے میں نہا چکا تھا۔

جب کچھ حالت سنبھلی تو شہنشاہ نے آنکھیں کھولیں۔ اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے درباری سجدۂ تعظیمی بجا لانے کے لئے زمین بوس ہو گئے۔ جہانگیر نے اپنے دائیں جانب کھڑے ہوئے نقیب کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔

دوسرے ہی لمحے پورا دربار ایک زوردار آواز سے گونج اُٹھا۔

"ایوانِ شاہی میں موجود تمام لوگوں کو خوشخبری ہو کہ شہنشاہ کے حضور ان کے سجدے قبول کئے گئے۔"

اس آواز کی بازگشت ختم ہوتے ہوتے تمام درباری ہتھیلیوں کے بل فرش سے اُٹھے اور اپنی نشست پر کھڑے ہو گئے۔

پھر جہانگیر کی لرزتی ہوئی آواز دربار میں گونجنے لگی۔

"اس سیاہ کار مجرم کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے، جس کا پورا وجود ناپاکیوں کا ایک انبار ہے۔" جہانگیر دل کی طاقت سے بول رہا تھا۔ اہلِ دربار نے دیکھا کہ شہنشاہ کہنیوں کا سہارا لے کر آگے کی طرف جھکا ہوا ہے اور اس کے چہرے سے پسینہ ٹپک ٹپک کر قالین میں جذب ہو رہا ہے۔

کچھ دیر بعد ہی ارسلان بیگ کو زنجیروں میں جکڑ کر جہانگیر کے سامنے لایا گیا۔

مجرم کو دیکھ کر جہانگیر اس قدر مشتعل ہو گیا کہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"ناشکر گزار کتے! ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تُو ہماری بخشی ہوئی مراعات کا اتنا ناجائز استعمال کرے گا۔"

ابھی جہانگیر کے الفاظ کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ارسلان بیگ فرش پر گر گیا اور سجدے کی حالت میں روتے ہوئے چیخنے لگا۔

"خداوند رحم!..... خداوند رحم۔"

"ہمارے رحم کے دروازے بند ہو چکے۔" جہانگیر کے لہجے سے نفرت کی آگ برس رہی تھی۔ "اگر تُو ہمیں دنیا کی بدترین گالی بھی دیتا تو شاید ہم تجھے معاف کر دیتے۔ مگر حضرت شیخ کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے۔"

"میں حضرت شیخ کی عظمت و بزرگی کو تسلیم کرتا ہوں۔" ارسلان بیگ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح دراز کر دیئے تھے، جیسے وہ شہنشاہ سے بھیک مانگ رہا ہو۔

"تیرا یہ اقرار موت کے خوف سے ہے۔" جہانگیر کا لہجہ مزید شرر بار ہو گیا تھا۔ "کاش! تُو نے اس وقت حضرت شیخ کی بزرگی تسلیم کی ہوتی، جب تجھ پر ہمارا قہر نازل نہیں ہوا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تیری زندگی کی سانسیں شمار کی جا چکی ہیں۔ ہم تجھے ایسی دردناک سزا دیں گے کہ آنے والی صدیوں کے لوگ بھی اس کے تصور سے کانپیں گے۔"

یہ کہہ کر جہانگیر، درباری امراء سے مخاطب ہوا۔

"اہلِ دربار! تم گواہ رہنا کہ ہمارا دامنِ حیات گناہوں سے بھرا ہوا ہے..... مگر پھر بھی ہم اپنے شیخ کی جناب میں کسی کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے۔ ارسلان بیگ تو محض ہمارے تلوے چاٹنے والا ایک خوشامدی کتا ہے۔ اگر ہمارے کسی بیٹے سے یہ گستاخی سرزد ہوتی تو ہم اسے بھی معاف نہیں کرتے۔ وہ بھی اسی طرح سرِ دربار زنجیروں میں جکڑ کر لایا جاتا۔ اور بیٹے کا ذکر بھی کیا ہے؟ اگر ہماری زبان بھی لڑکھڑا جاتی تو پھر سارا ہندوستان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا کہ ہم خود ہی مجرموں کی قطار میں کھڑے ہو جاتے اور اپنی اس ناپاک زبان کو اپنے ہی ہاتھ سے کاٹ کر پھینک دیتے۔ ہماری تو پہچان ہی حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے ہے۔ شیخ نے ازراہِ عنایت ہمیں اپنا نام بخشا تھا۔ پھر ایک غلام سلیم، اپنے آقا سلیم کی رسوائی کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟ آج

کے بعد سے تمام باشندگانِ ہند کو اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت سلیم چشتیؒ کا یہ ادنیٰ خادم اپنے کے بارے میں کس طرح سوچتا ہے۔'' یہ کہہ کر جہانگیر مسندِ شاہی پر بیٹھ گیا۔

اہلِ دربار کے جسموں پر لرزہ طاری تھا اور ارسلان بیگ کسی دہشت زدہ بچے کی طر فرش پر پڑا ہوا مچل رہا تھا۔ ''خداوند رحم!.....خداوند رحم۔'' ارسلان کی چیخوں سے پورا دربار گو رہا تھا۔

ملکہ نور جہاں نے اپنے مصاحبِ خاص کی جان بچانے کے لئے آخری حربے کے طور مداخلت کی اور خاموشی سے جہانگیر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

یہ وہ ہاتھ تھا، جس کے گداز کو محسوس کرتے ہی جہانگیر پُرسکون ہو جاتا تھا.....مگر آ نور جہاں کے دستِ حنائی میں وہ تاثیر نہیں تھی۔

''اس حرام کار کی گردن میں سوراخ کر کے زبان باہر نکال دو۔ تاکہ مخلوقِ خدا اپنی جا آنکھوں سے دیکھ لے کہ ''عدلِ جہانگیری'' کیا ہے۔''

پھر جیسے ہی جہانگیر کے قہرناک حکم کی گونج ختم ہوئی، کئی سپاہیوں نے ارسلان بیگ کو کھینچ اور دربار سے باہر لے جانے لگے۔

''نہیں۔'' شہنشاہ کی آواز دوبارہ گونجی۔ ''اسے ہمارے سامنے سزا دو۔''

سپاہیوں نے گردنیں خم کر دیں۔

''ظلِ الٰہی! اس کے خون سے دربار کا بیش قیمت قالین داغ دار ہو جائے گا۔'' بیک وقت کئی سپاہیوں کی آوازیں اُبھریں۔

''قالین داغ دار ہو جانے دو۔ مگر اس طرح ہمارے دل کو تو سکون حاصل ہو جائے گا۔'' جہانگیر کے ہونٹوں سے نفرتوں کی آگ برس رہی تھی۔

اس وقت حکمراں کی طرف سے دی جانے والی سزاؤں کے مختلف انداز تھے۔ عام طور پر باغیوں کو پھانسی کی سزا دی جاتی تھی یا پھر انہیں سرِ مقتل لے جا کر تلوار کے ایک ہی وار سے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ مگر ان سب سے دردناک سزا یہ تھی کہ کسی شخص کی زبان گدی سے کھینچ کر باہر نکال لی جائے۔ ایسی سزا ان لوگوں کو دی جاتی تھی، جو فرمانروا کی شان میں کسی خاص گستاخی کے مرتکب ہوتے تھے۔ زندہ انسان کی گردن میں سوراخ کر کے زبان نکالنا ایک لرزہ خیز عمل تھا۔ جہانگیر نے ارسلان بیگ کے لئے یہی خوفناک سزا تجویز کی تھی۔

دس بارہ سپاہیوں نے ارسلان بیگ کو اس طرح جکڑ لیا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کر سکتا تھا۔ بس اُس کی دلدوز چیخیں گونج رہی تھیں۔

''خداوند رحم!.....خداوند رحم!''

پھر یہ چیخیں بھی ختم ہو گئیں۔ ارسلان کی گردن کے عقب سے خون کا فوارہ جاری تھا اور اس کی زبان باہر نکالی جا رہی تھی۔

اس دردناک منظر کو دیکھ کر اہلِ دربار کی سانسیں رُکی جا رہی تھیں مگر شہنشاہ جہانگیر کے چہرے پر عجیب سی آسودگی کا رنگ نمایاں تھا۔ پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی نور جہاں بھی مسلسل کانپ رہی تھی۔ اور دربار کا فرش اس شخص کے خون سے سرخ ہوتا جا رہا تھا جو اس وقت جہانگیر کی نظروں میں دنیا کا سب سے بڑا مجرم تھا۔

جب ارسلان بیگ بے جان ہو گیا تو جہانگیر نے سپاہیوں کو دوسرا حکم دیا۔

''اس کی ناپاک زبان کو ہمارے قدموں میں ڈال دو۔''

ایک سپاہی، ارسلان کی خون آلود زبان لے کر شہنشاہ کی طرف بڑھا اور پھر گوشت کے اس مختصر سے ٹکڑے کو جہانگیر کے پیروں کے پاس رکھ دیا، جس سے اس دنیا میں بڑے ہنگامے برپا ہوتے ہیں۔

جہانگیر اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے فتح پور سیکری کی طرف رخ کیا، جہاں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا مزارِ مبارک روشن ہے۔

''شیخ! آپ کا یہ غلام، نورالدین جہانگیر بہت گناہ گار ہے، مگر پھر بھی آپ سے والہانہ عقیدت رکھتا ہے۔ بے شک! اس کے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی نہیں لیکن وہ آپ کے بدخواہوں کو معاف نہیں کر سکتا۔''

اہلِ دربار نے دیکھا کہ اس وقت جہانگیر کی آنکھوں میں نمی سی محسوس ہو رہی تھی، جیسے وہ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کو مخاطب کر کے رو رہا ہو۔

پھر یکایک وہ پلٹا اور ارسلان بیگ کی کٹی ہوئی زبان کو دیکھنے لگا۔

''اہلِ دربار! تم اس بات کے بھی گواہ رہنا کہ میں نے اس غلیظ زبان کو اپنے قدموں سے روند ڈالا ہے۔'' یہ کہہ کر جہانگیر نے کئی بار اپنے پیروں سے ارسلان بیگ کی زبان کو مسلا۔ پھر اُس کے بے جان جسم کی طرف دیکھتے ہوئے قہر آلود لہجے میں کہا۔

''ہمارا حکم ہے کہ اس کے لاوارث جسم کو قبر کی آغوش نہیں ملنا چاہئے۔ اسے اٹھا کر آگرے کی گھاٹیوں میں پھینک دو۔ اور اس وقت تک بے گور و کفن پڑا رہنے دو، جب تک کہ جنگلی جانور اس کا گوشت نوچ کر نہ کھا جائیں۔'' یہ کہتے کہتے جہانگیر کی زبان پھول گئی اور وہ بری طرح ہانپنے لگا تھا۔

جہانگیر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور پھر بڑی مشکل سے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''ہم محسوس کر رہے ہیں کہ شاید کوئی شخص ترس کھا کر ہمارے معتوب کو قبر کی جگہ دے دے۔'' جہانگیر کا اشارہ، ملکہ نور جہاں کی طرف تھا کیونکہ وہی بار بار ارسلان بیگ کی سفارش کر رہی تھی۔ ''لیکن واضح رہے کہ اگر کسی نے ایسا کیا تو پھر وہ خود بھی ہمارے قہر و غضب کا نشانہ بن جائے گا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے شیخ کی شان میں گستاخی کرنے والے کی لاش کو زمین

قبول کرے۔"

پھر ارسلان بیگ کے بے گور و کفن جسم کو آگرے کی گھاٹیوں میں پھینک دیا گیا۔ جنگلی کتے، چیل، کوے اور گِدھ، انسانی گوشت کی لذت سے آشنا ہو رہے تھے..... اور کئی سپاہی دن رات جاگ کر اس بات کی نگرانی کر رہے تھے کہ کہیں کوئی شخص ارسلان کی شکستہ لاش کو اٹھا کر قبر کے سپرد نہ کر دے۔

اس واقعہ کے بعد نور جہاں نے کئی دن تک شہنشاہ سے گفتگو نہیں کی۔ جواب میں جہانگیر نے اپنی محبوب ملکہ کو سمجھا دیا۔

"ہم سے وہ چیز طلب نہ کرو، جو ہمارے اختیار میں نہیں۔ ہم تمہارے ایک اشارے پر اپنی جان لٹا سکتے تھے، مگر ارسلان بیگ کو معاف کرنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔"

نور جہاں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ اس کا شوہر اپنے شیخ کے سلسلے میں بہت زیادہ حساس ہے۔ مجبوراً اسے اپنی ناراضگی کے اس سلسلے کو ختم کرنا پڑا۔ اب وہ اپنے بڑھتے ہوئے اقتدار کو مکمل طور پر محفوظ کرنے کی تدبیریں سوچ رہی تھی۔

❀.....❀.....❀

ارسلان بیگ کی موت نے گیانی آتمارام کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ کئی دن تک وہ اس خوف سے سو بھی نہیں سکا کہ کہیں مرنے سے پہلے ارسلان بیگ نے شہنشاہ کے سامنے اس کا نام ظاہر نہ کر دیا ہو۔ اس دوران ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ گیانی آتمارام اپنی موت کا انتظار کرتا رہا کہ کب سرکاری ہرکارے آئیں اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر شہنشاہ کے روبرو لے جائیں۔ مگر جب کئی دن تک ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تو آتمارام نے سکون کی سانس لی اور اپنے دیوتاؤں کے چرنوں میں گیندے کے پھولوں کے ساتھ چاندی کے سکوں کی بھینٹ چڑھائی۔

جب یہ خبر اُڑتے اُڑتے شاہ جہاں کو پہنچی تو اس نے خالقِ حقیقی کے سامنے سر رکھ دیا۔ پھر ایک طویل سجدۂ شکر کے بعد وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"ارجمند! شاہ جہاں کے صبر نے ارسلان بیگ کو کھا لیا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا حساب آخرت میں ہوگا اور میں انتظار کرتے کرتے زندگی سے گزر جاؤں گا۔ مگر خدائے بے نیاز کا شکر ہے کہ اس نے میرے صبر کا نتیجہ اسی دنیا میں ظاہر کر دیا۔"

"کیا ہوا صاحبِ عالم؟" ارجمند بانو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ظلِ الٰہی نے ارسلان بیگ کو ایسی دردناک سزا دی ہے کہ رہتی دنیا تک اس کی مثال قائم رہے گی۔" شدتِ جذبات سے شاہ جہاں کی آواز لرز رہی تھی۔

"مگر آپ اس کی موت پر اتنے خوش کیوں ہیں؟" ارجمند بانو نے حیران ہو کر کہا۔ "اس کی یہ تو غلطی تھی کہ وہ میری طلب رکھتا تھا اور اس نے میرے اور آپ کے درمیان کچھ بدگمانیاں

پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"تم نہیں جانتیں ارجمند! کہ اس نے شادی سے چند روز پہلے مجھ سے کیا کہا تھا۔" جوشِ جذبات سے شاہ جہاں کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"کیا کہا تھا اس نے؟" ارجمند بانو کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"بہتر ہے کہ ان باتوں کو میری زبان سے نہ سنو۔ جو گزر گئی، سو گزر گئی۔ میں نے بھی اس واقعے کو فراموش کر دیا ہے۔" اب غصے کے ساتھ ساتھ شاہ جہاں کے چہرے پر اذیت و کرب کی پرچھائیاں بھی لرزنے لگی تھیں۔

ارجمند بانو انسانی فطرت سے مجبور ہو گئی۔ وہ بضد ہو گئی کہ شاہ جہاں پورا واقعہ بے کم و کاست بیان کر دے۔

شاہ جہاں بہت دیر تک اپنی بیوی کو ٹالتا رہا مگر بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ ارجمند اتنی آسانی سے نہیں مانے گی۔ مجبوراً شاہ جہاں کو کہنا پڑا۔

"اس نے تمہارے حوالے سے ایسی تکلیف دہ بات کہی تھی کہ برسوں گزر جانے کے بعد بھی میں اس کی خلش اپنے دل کے قریب محسوس کر رہا ہوں۔" شاہ جہاں پوری کوشش کے باوجود اپنی آواز کے ارتعاش پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ "ارجمند! ارسلان بیگ نے شادی سے پہلے کہا تھا کہ تمہارا کردار مشکوک ہے۔"

شوہر کی زبان سے یہ بات سن کر ارجمند بانو سناٹے میں آ گئی اور اُس کے دل نشیں چہرے پر حیرت و غم کا سیاہ دھواں پھیل گیا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں صاحبِ عالم؟" ارجمند بانو کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔

"اس نے تمہارے شیشے جیسے کردار پر تہمتوں کی کیچڑ ملنے کی کوشش کی تھی۔" یہ کہہ کر شاہ جہاں نے اپنی جاں نثار بیوی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ارجمند! تمہاری بے مثال رفاقت کی قسم! وہ لمحہ مجھ جیسے شخص کے لئے ایک جان لیوا لمحہ تھا..... میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں نے اذیت و کرب میں لپٹے ہوئے ان ماہ و سال کو کس طرح برداشت کیا ہے؟"

"پھر آپ نے اسے کیا جواب دیا صاحبِ عالم؟" ارجمند کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"میں نے خاموشی اختیار کی ارجمند! کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔" شاہ جہاں نے کہا۔

"آپ نے اس کو کچھ تو جواب دیا ہوگا۔" ارجمند بانو کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

"میں نے ارسلان بیگ سے کہا تھا کہ اگر ساری دنیا بھی ارجمند کے خلاف گواہی دینے لگے تو میں ایک ایک کر کے ساری شہادتوں کو جھٹلا دوں گا۔" شاہ جہاں نے ارجمند بانو کے دلکش اور معصوم چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحبِ عالم! کیا آپ کو میری ذات پر اتنا اعتبار ہے؟" ارجمند بانو نے بڑے پُرسوز

لہجے میں پوچھا۔

"اس سے بھی زیادہ۔" شاہ جہاں نے آگے بڑھ کر ارجمند کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لیتے ہوئے کہا۔ "اس اعتبار کی کیفیت ناقابلِ بیان ہے۔ میں اپنے جذبوں کو زبان سے ظاہر نہیں کر سکتا۔"

ارجمند بانو نے وفا کے راستے پر اپنے شوہر کی یہ استقامت دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دو آنسو پلکوں سے رخساروں تک آئے۔

"آپ اس کی زبان بھی کاٹ سکتے تھے صاحبِ عالم!" ارجمند بانو کی آواز لرز رہی تھی۔ اُس کے لہجے میں ایک عجیب سی شکایت پوشیدہ تھی۔

"ہاں! میں اس پر قادر تھا ارجمند! کہ ارسلان بیگ کی زبان کاٹ کر پھینک دوں۔" شاہ جہاں نے اپنی بیوی کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" ایک عورت اپنے محبوب سے اُس کی سرد مہری کا گلہ کر رہی تھی۔

"میں تمہاری رسوائی سے ڈرتا تھا۔" شاہ جہاں نے اپنے طرزِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "الزام تراشی کی چنگاریاں، جو راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی تھیں، اگر میں انہیں ایک بار چھیڑ دیتا تو وہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی شکل اختیار کر لیتیں۔ ارسلان بیگ بھی یہ چاہتا تھا کہ میں اسے سزا دوں اور پھر وہ اس سزا کی وجہ بیان کرتا ہوا گلی گلی چیختا پھرے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان جاں گداز لمحات کو برداشت کیا اور اپنا معاملہ اس ذات پر چھوڑ دیا، جو قادر بھی ہے اور عادل بھی۔ میرے حساب سے انصاف میں کچھ تاخیر ہو گئی مگر خدا کے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ آسمان سے جو فیصلہ نازل ہوا، وہی برحق تھا۔ اگر میں جلد بازی سے کام لیتا تو رسوائیاں میرا اور تمہارا مقدر بن جاتیں۔ خدا نے ہم گناہ گاروں کو مایوس نہیں کیا۔ ارسلان بیگ کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوا اور اسے وہ سزا دی گئی، جو رہتی دنیا تک اس زمین پر بسنے والوں کو یاد رہے گی۔"

ارجمند بانو بہت دیر تک روتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"صاحبِ عالم! یہ کنیز آپ کی شکر گزار ہے کہ آپ نے اسے گردشِ وقت کی بدترین ساعتوں میں سہارا دیا۔ ورنہ میں ایک کمزور عورت لڑکھڑا کر کہیں گر پڑتی۔ اور پھر راستے کا غبار بن جاتی۔"

"نہیں ارجمند! اہلِ وفا ایک دوسرے پر احسان نہیں جتاتے۔" شاہ جہاں نے ارجمند بانو کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو دل پر برسوں کا ایک بوجھ تھا، جسے میں اُتارنا چاہتا تھا۔ مگر میری یہ خواہش نہیں تھی کہ میں اپنی زندگی کا بھیانک راز تم سے بیان کروں۔ اس طرح تمہاری دل آزاری بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر سب کچھ کہہ ڈالا کہ تم میری شریکِ سفر ہو۔ اگر تم سے راستے کے حالات بیان نہیں کروں گا تو پھر کس سے کروں گا؟ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ تم

اسے احسان سمجھ کر مجھ سے شرمندہ ہو جاؤ۔"

ارجمند بانو نے مسکرا کر دیکھا اور اُس کے چہرے کی گم شدہ شادابی لوٹ آئی۔

۞.....۞.....۞

1622ء کی بغاوت کے سبب قندھار، مغلوں کے ہاتھوں سے جاتا رہا اور اس کی بازیابی کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔

شہنشاہ جہانگیر کی صحت روز بہ روز گرتی جا رہی تھی۔ اب وہ ذہنی کام کرنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا۔ مجبوراً 1624ء کے آخر میں اس نے اپنی خود نوشت "توزک جہانگیری" لکھنا بند کر دی۔ پرانے سپہ سالاروں میں سے بیشتر انتقال کر چکے تھے یا پھر شہنشاہ کے زیرِ عتاب تھے۔ بظاہر ہندوستان کے تاج و تخت کو داخلی طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن پھر بھی تخت کی وراثت کا مسئلہ بہرحال موجود تھا جو کسی بھی وقت نازک صورت اختیار کر سکتا تھا۔

اگرچہ مہابت خان اور شہزادہ پرویز نے مل کر شاہ جہاں کو شکست سے دوچار کر دیا لیکن اب وہ حکومت کے لئے ایک مستقل مسئلہ بن گئے تھے۔ خصوصاً مہابت خان کی فوجی طاقت، تخت کی وراثت کے سلسلے میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی تھی۔ آصف خان اور مہابت خان کے درمیان پرانی رنجش تھی، جس پر سیاست و مصلحت نے وقتی پردہ ڈال دیا تھا۔ لیکن دونوں کے سینے میں دبی ہوئی عداوت کی دیرینہ آگ کسی بھی لمحے سیاسی دوستی کے اس پردے کو جلا کر خاک کر سکتی تھی۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر اب نور جہاں اور آصف خان کی نظریں مہابت خان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں مل کر مغلوں کے اس لائق ترین سپہ سالار کی شخصیت کو داغ دار کرنا چاہتے تھے۔

آخر مہابت خان کے گرد سازشوں کا جال پھیلتا چلا گیا۔ اس کے وقار کو صدمہ پہنچانے اور اس کی طاقت کو کم کرنے کے لئے جہانگیر کی طرف سے پہلا حکم دیا گیا کہ مہابت خان، شاہی افواج کی سالاری سے استعفیٰ پیش کر دے اور دوبارہ صوبہ بنگال کی گورنری سنبھال لے۔ بظاہر فرمانِ شاہی پر جہانگیر کی مہر تھی لیکن باخبر حلقے جانتے تھے کہ شہنشاہ اپنی بیماریوں کے سبب نور جہاں کے ہاتھوں میں محض ایک کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔ دراصل نور جہاں کا حکم ہی شاہی حکم تھا۔

شہزادہ پرویز نے مہابت خان کے بنگال جانے پر اعتراض کیا تو نور جہاں کی طرف سے دوسرا حکم جاری ہوا۔

"مہابت خان! تمہیں لازم ہے کہ فوری طور پر دربار میں حاضر ہو جاؤ۔"

اس حکم کے سامنے مہابت خان اور شہزادہ پرویز دونوں کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ پرویز کو گجرات کا نام نہاد گورنر مقرر کر کے خان جہاں کو شاہی افواج کی سالاری دے دی گئی۔

اس کے بعد مہابت خان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ بنگال میں ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت اور ہاتھی وغیرہ فوری طور پر دربارِ شاہی میں پیش کر دے۔ مہابت خان اس مطالبے پر حیران رہ

گیا۔ اب اُسے یقین آ گیا تھا کہ اس کے خلاف شرم ناک سازشیں کی جا رہی ہیں، جن کا ایک ہی مقصد تھا کہ مہابت خان اشتعال میں آ کر کوئی ناشائستہ بات کہہ دے اور پھر اسے بھی بیڑیاں پہنا کر پسِ دیوارِ زنداں ڈال دیا جائے۔ مہابت خان نے اس موقع پر انتہائی صبر وضبط سے کام لیا۔ پھر جب اُس کی طرف سے حکمِ شاہی کی بجا آوری میں تاخیری حربے اختیار کئے گئے تو ایک درباری ایلچی، فدائی خان کو بھیجا گیا کہ وہ مہابت خان سے ساری چیزوں کا حساب طلب کرے۔

یہ مہابت خان جیسے سپہ سالار کے ساتھ بڑا ذلت آمیز سلوک تھا۔ آخر مہابت خان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اور اب اُس کے اس یقین میں شدت آ گئی تھی کہ اسے تباہ و برباد کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مجبوراً مہابت خان کو اپنی مدافعت کے لئے نئے منصوبے پر عمل کرنا پڑا۔

⊛.....⊛.....⊛

جہانگیر تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے کشمیر سے واپسی پر چند ماہ کے لئے لاہور میں ٹھہر گیا تھا۔ مگر اب وہ ایک ایسا ناکارہ انسان تھا، جو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر چند قدم بھی چل نہیں سکتا تھا۔ نور جہاں نے بظاہر اپنے اقتدار کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن درپردہ وہی ہندوستان پر حکمرانی کر رہی تھی۔

شہنشاہ جہانگیر بتقاضائے لاہور کے بعد مارچ 1626ء میں کابل روانہ ہو گیا۔ مہابت خان نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے ہمراہ چھ ہزار راجپوت لے کر دریائے جہلم کے قریب شاہی خیمے میں جا پہنچا۔ مہابت خان یہ انتظام کر کے آیا تھا کہ اگر دربار میں اُس کے ساتھ نامناسب سلوک کیا گیا تو وہ پوری شدت سے اپنی اس بے عزتی کا جواب دے گا۔ اسی خیال کے پیشِ نظر مہابت خان نہ صرف چھ ہزار وفادار راجپوتوں کو لے کر آیا تھا بلکہ ان کے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ پھر اس نے اپنے جاں نثار سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''اگر تم میں سے کسی نے غداری کی تو اس کے بیوی بچوں کی عزت و زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

جواباً تمام سپاہیوں نے بیک زبان کہا۔

''ہم نسلاً راجپوت ہیں۔ مرنا اور مارنا ہی ہمارا مشغلہ ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا ہم لوگوں کا شیوہ نہیں۔''

اپنی صفیں مکمل طور پر مضبوط کرنے کے بعد مہابت خان، شاہی خیمے کی طرف بڑھا۔ نور جہاں نے اسے حکم دیتے ہوئے کہا۔ جب تک خصوصی دعوت نامہ موصول نہ ہو، وہ شاہی خیمے میں مقیم رہے۔ مگر دربار میں آنے کی کوشش نہ کرے۔

مہابت خان گرد و پیش پر نظر رکھتے ہوئے اپنی طلبی کا انتظار کرنے لگا۔

دوسری طرف وزیراعظم آصف خان نے نتائج کی پروا کئے بغیر جہانگیر اور نور جہاں کو چند

خادموں کے ساتھ تنہا چھوڑ کر دریا عبور کر دیا۔

مہابت خان نے اس موقع پر جہانگیر کو حراست میں لینے کی کوشش کی۔ وہ شہنشاہ کو یرغمال کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح اسے نور جہاں اور آصف خان سے نجات حاصل ہو سکتی تھی۔

مہابت خان نے بہت عجلت کے ساتھ اپنے راجپوت فوجیوں کو جمع کیا اور تقریباً دو ہزار سپاہیوں کو لے کر دریا کے کنارے بھیج کر حکم دیا کہ پل کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔

اس منصوبہ بندی کے بعد جہانگیر بے دست و پا ہو گیا تھا۔ مہابت خان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ پہلے شہنشاہ کو گھوڑے پر بٹھایا جائے اور پھر اسے ہاتھی پر سوار کرا کے یہ مشہور کر دیا جائے کہ ہندوستان کا حکمراں شکار کو جا رہا ہے۔

اس طرح جہانگیر نے کچھ فاصلہ ایک گھوڑے کے سہارے طے کیا اور پھر اسے ہاتھی پر بٹھا دیا گیا۔ عام لوگوں نے یہی سمجھا کہ شہنشاہ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے شکار کو جا رہا ہے۔ مگر کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ہاتھی کے ہودے میں جہانگیر کے ساتھ مہابت خان کے کچھ مسلح سپاہی بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔

غرض کچھ دیر شہنشاہ کو اِدھر اُدھر گھمانے کے بعد مہابت خان کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

جہانگیر نے بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر تلوار کھینچ لی اور دو بار مہابت خان کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ یہاں تک کہ فرش پر گر کر ہانپنے لگا۔

''عالم پناہ! اس وقت آپ ایک ناتواں انسان ہیں۔'' مہابت خان نے ادب کے ساتھ کہا۔ ''اوہ جب بازوؤں کی طاقت سلب ہو جائے تو شمشیر زنی کا مشغلہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اب آپ اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور خاموشی سے یہ تماشا دیکھیں کہ وقت کیسی کیسی کروٹیں بدلتا ہے۔''

اس اچانک حادثے پر جہانگیر بہت آزردہ تھا مگر احتجاج نہیں کر سکتا تھا کہ سیاست کی یہ بازی اس کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔

یکایک مہابت خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس افراتفری کے عالم میں وہ نور جہاں کو قطعاً بھول گیا تھا۔ مہابت خان نے سوچا کہ اسے ملکہ ہند کو بھی حراست میں لے لینا چاہئے تھا۔ اس طرح وہ زیادہ آسانی کے ساتھ اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔ مگر جب مہابت خان نے اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہا تو وقت گزر چکا تھا۔

نور جہاں دریا عبور کر کے دوسرے کنارے پر آصف خان کے پاس پہنچ گئی۔ اس سے پہلے نور جہاں بھی یہ سمجھ رہی تھی کہ شہنشاہ شکار کھیلنے جا رہا ہے۔ مگر جب اُسے صحیح حالات کا علم ہوا تو وہ کچھ دیر کے لئے پریشان نظر آنے لگی۔ جہانگیر کے علاوہ اس کا داماد شہریار بھی مہابت خان کی حراست میں تھا۔ نور جہاں نے فوری طور پر ایک اجلاس طلب کیا، جس میں وزیراعظم آصف

خان کے ساتھ دوسرے درباری امراء بھی شریک تھے۔ بہت غور و خوض کے بعد اس اجلاس فیصلہ کیا گیا کہ مہابت خان پر حملہ کر کے شہنشاہ کو آزاد کرایا جائے۔

اس منصوبے کے مطابق دوسرے دن مہابت خان پر حملہ کر دیا گیا لیکن شاہی فوج کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

نور جہاں اپنے بھائی آصف خان پر برہم ہو گئی۔ اور انتہائی تلخ لہجے میں کہنے لگی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اپنے شہنشاہ کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گے۔ جو کچھ ہوا، وہ صرف تمہاری غفلت اور حماقت کی وجہ سے ہوا۔ تمہیں اپنے اس طرزِ عمل خدا اور اس کے بندوں کے سامنے شرم آنی چاہئے۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اپنی اس لغزش ازالہ کرنے کی بھرپور کوشش کرو۔''

آصف خان بہت شرمسار نظر آ رہا تھا۔ اپنے احساسِ ندامت کو مٹانے کے لئے مجبوراً مہابت خان پر حملہ کرنا پڑا۔ حملے سے پہلے جہانگیر نے بار بار یہ پیغام بھیجا کہ ایسی کوئی حرکت نہ کی جائے جس سے مہابت خان کے اشتعال میں اضافہ ہو۔ مگر کسی نے اس کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ عین حملے کے دن نور جہاں نے شہریار کی چھوٹی بچی کو گود میں لیا اور ہاتھی پر بیٹھ کر دریائے جہلم عبور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

کنارے پر راجپوت سپاہیوں کا ایک دستہ موجود تھا۔ نور جہاں کو فرار ہوتے دیکھ کر راجپوتوں نے اس کے ہاتھی پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک تیر، شہریار کی بچی کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ خود نور جہاں بھی زخمی ہوئی۔ مجبوراً اسے واپس لوٹنا پڑا۔

آصف خان بھی مقابلہ کرنے کے بجائے محاذِ جنگ سے نکل کر دریائے سندھ پر واقع اٹک کے قلعے میں چلا گیا۔ اس کے ساتھ تین ہزار سپاہی اور کچھ اعلیٰ افسر تھے۔

اب مہابت خان کی بالادستی قائم ہو چکی تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر اٹک کے قلعے کا بھی محاصرہ کر لیا اس نازک موقع پر آصف خان کے کچھ ساتھیوں نے درمیان میں پڑ کر صلح کرا دی۔ مہابت خان نے آصف خان کی جان بخش دی مگر اس کے بہت سے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

اب نور جہاں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ مہابت خان کے آگے ہتھیار ڈال دے۔ نور جہاں نے اس برے وقت کو ٹالنے کے لئے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے مہابت خان کے سامنے سر جھکا دیا۔

مہابت خان اپنی اس فتح سے بہت خوش تھا۔ اور اب وہ ہندوستان کے نقشے پر ایک نئی فوجی طاقت بن کر سامنے آ چکا تھا۔

❀.....❀.....❀

اب شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں دونوں مہابت خان کے رحم و کرم پر تھے۔ اس نے

سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لئے شاہ اور ملکہ کو یرغمال بنا لیا تھا۔ ورنہ وہ اپنے حکمرانوں کو جسمانی طور پر کوئی گزند پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

جب نور جہاں نے مہابت خان کے آگے سر جھکا دیا تو مغل حکومت کے سپہ سالار نے ملکہ کو شہنشاہ کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ اگرچہ اس موقع پر نور جہاں نے نرم اور خوشامدانہ رویہ اختیار کیا تھا لیکن وہ ان سنگین لمحات میں بھی مہابت خان کی قید سے آزاد ہونے کی تدبیریں سوچتی رہتی تھی۔

اس دوران نور جہاں نے مہابت خان کے سامنے ایک تجویز پیش کی کہ وہ ٹھٹھہ جا کر شاہ جہاں کا مقابلہ کرے اور اسے مکمل طور پر بے دست و پا کر دے۔ نور جہاں نے مہابت خان کو لالچ دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا۔

''میں اور شہنشاہ دونوں شاہ جہاں سے بیزار ہیں اور ہر حال میں اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

مہابت خان نے بڑی حیرت سے نور جہاں کی طرف دیکھا۔

''اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں مہابت خان!'' نور جہاں بڑی عیاری سے اپنے سپہ سالار کے گرد سازشوں کا نیا جال بچھا رہی تھی۔ ''شاہ جہاں سخت مزاج اور خود غرض ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ شہزادہ خسرو اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب وہ شہزادہ پرویز اور شہریار کی تاک میں ہے۔ اگر تم شہزادہ شہریار کو مغل تخت کا وارث مان لو تو پھر ہندوستان میں تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے والا کوئی نہیں۔ بساطِ حکومت پر حکمراں کے بعد تمہارا ہی اقتدار ہو گا۔''

مہابت خان ایک جنگجو اور بہادر سپاہی تھا مگر اس میں سیاست دانوں جیسی عقل نہیں تھی۔ اس لئے ملکہ ہند کی چال بازیوں کو سمجھنے سے عاجز رہا۔

کچھ دن بعد اس گفتگو کا بہتر نتیجہ برآمد ہوا۔ اور نور جہاں بھی یہی چاہتی تھی۔ مہابت خان نے شہنشاہ اور ملکہ کو کابل کی طرف جانے کی اجازت دے دی۔ نور جہاں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اور مئی 1626ء میں شاہی قافلہ کابل پہنچا۔ اب نور جہاں، شہنشاہ اور اپنے آپ کو بہت زیادہ محفوظ سمجھ رہی تھی۔

مہابت خان نے وقتی طور پر جو اقتدار حاصل کیا تھا، وہ اسے برقرار نہ رکھ سکا۔ سب سے پہلے راجپوتوں سے اس کا تنازع ہوا۔ اس جھگڑے میں تقریباً نو سو راجپوت مارے گئے۔ باقی راجپوتوں نے مہابت خان کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد افغانوں نے مہابت خان کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس طرح مہابت خان کے اثرات آہستہ آہستہ کم ہوتے چلے گئے۔

نومبر کے مہینے میں شاہی قافلہ، کابل سے کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ واپسی میں جہانگیر نے

مہابت خان کو پیغام بھیجا۔

''مابدولت فوجی دستوں میں کچھ تبدیلیاں چاہتے ہیں۔''

مہابت خان نے حکم شاہی کو بغور پڑھا اور تصادم سے بچنے کے لئے اپنی فوج کو لے کر ایک منزل آگے چلا گیا۔ اور پھر بہت تیزی سے لاہور کی طرف بڑھا۔ مہابت خان نے شہنشاہ کے حکم کو تسلیم کر لیا تھا لیکن پھر بھی اس نے احتیاط کے طور پر وزیر اعظم آصف خان، اس کے لڑکے اور جہانگیر کے دو بھتیجوں کو یرغمال بنا لیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر نور جہاں نے مہابت خان سے بار بار اصرار کیا کہ وہ ان تمام یرغمالیوں کو آزاد کر دے۔ کچھ دن بعد مہابت خان نے نور جہاں کی بات مان لی۔ پہلے اس نے شہزادوں کو اور پھر کچھ وقفے سے آصف خان کو اس کے لڑکے کے ساتھ واپس کر دیا۔ ان تمام کاموں سے فارغ ہوتے ہی مہابت خان مشرقی علاقے کی طرف بڑھا تاکہ بنگال سے آنے والے خزانے پر قبضہ کر سکے۔

۞.....۞.....۞

جہانگیر کی صحت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ جس زمانے میں شہنشاہ کابل میں تھا تو اُسے اپنے بدترین دشمن، ملک عنبر حبشی کی موت کی خبر ملی تھی۔ شہنشاہ کے لئے یہ بڑا مسرت انگیز حادثہ تھا۔ ملک عنبر حبشی کے بعد جہانگیر کو آئے دن کی بغاوتوں اور ہنگاموں سے نجات مل گئی تھی۔

ابھی وہ اپنی صحت کی خرابی کو بھول کر اپنے دشمن کی موت کا جشن منا رہا تھا کہ اسے شہزادہ پرویز کے انتقال کی جانگداز خبر ملی۔ اس خبر نے جہانگیر کو اس قدر شکستہ کر دیا تھا کہ وہ کئی دن تک بستر پر پڑا رہا۔ جواں سال بیٹے کی موت نے جہانگیر کے سینے کے داغوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ مگر یہ نیا داغ ایسا تھا، جس کی خلش نے جہانگیر کے صبر و قرار چھین لئے تھے۔

شہزادہ پرویز شروع سے رنگین مزاج انسان تھا۔ اس نے باپ کے اقتدار اور دولت سے یہی فائدہ اٹھایا تھا کہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کیف و نشاط میں ڈوبا رہتا تھا۔ خوب صورت عورتوں کا اجتماع..... اور پرانی شراب کا ذخیرہ..... شہزادہ پرویز کی زندگی ان دو تباہ کار محاذوں میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک بلانوش انسان تھا..... اور شراب کو پانی کی جگہ استعمال کرتا تھا۔ شاہی طبیبوں نے اسے کئی بار تنبیہہ کی تھی کہ اگر شہزادے نے شراب نوشی ترک نہیں کی تو آنے والا کوئی لمحہ بھی زندگی کے چراغ کو بجھا سکتا ہے۔

مگر شہزادہ پرویز، طبیبوں کے مشوروں کو مذاق میں اُڑا دیا کرتا تھا۔

''ہم بہت سخت جان ہیں۔ ابھی ہمیں موت نہیں آئے گی۔''

شہزادے کی بے پروائی سے مایوس ہو کر شاہی طبیبوں نے ڈرتے ڈرتے اپنی عرض داشت، شہنشاہ کے حضور پیش کی۔ جہانگیر نے وقتی طور پر اسے خط کے ذریعے سخت الفاظ میں حکم

دیا کہ وہ شراب چھوڑ دے۔ مگر شہزادہ پرویز پر احکام اور نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک تو دونوں کے درمیان طویل فاصلہ..... اور دوسرے جہانگیر کی تھکا دینے والی بیماری..... پھر آئے دن کی شورشیں..... اور مہابت خان کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیاں..... غرض ان تمام چیزوں نے جہانگیر کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ بیٹے کی خبر گیری کر سکے۔

اب یہ لرزہ خیز اطلاع موصول ہوئی تھی کہ اس کا محبوب بیٹا شدید حسرت و ناکامی کے عالم میں خون تھوکتا ہوا دنیا سے گزر گیا۔

شہزادہ پرویز کی موت پر جہانگیر نے اپنا گریبان چاک کر دیا۔ اور پھر ماتمی لہجے میں نور جہاں سے مخاطب ہوا۔

''اور کتنی آفات رہ گئی ہیں، جن کا نزول ابھی باقی ہے؟ ابھی ہم خسرو کی موت کو نہیں بھولے تھے کہ پرویز نے ہمارے دل میں نیا شگاف ڈال دیا۔ آخر یہ زخم ہمیں کیوں دیئے جا رہے ہیں، جن کے علاج کے لئے اس دنیا میں کوئی مرہم موجود نہیں۔''

جہانگیر چند دنوں میں پہلے سے زیادہ بوڑھا اور ناتواں نظر آنے لگا تھا۔

نور جہاں شوہر کو تسلیاں دیتی رہی۔ مگر جہانگیر کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دھواں بھر گیا تھا۔ وہ چپ چاپ روتا رہتا۔ مگر کبھی کبھی اس کے ہونٹوں سے ایک تیز چیخ نکل جاتی۔

۞.....۞.....۞

شہزادہ پرویز کے انتقال کے وقت شاہ جہاں دکن میں مقیم تھا۔ بھائی کے انتقال کی خبر سن کر وہ اُداس ہو گیا۔ آخر شہزادہ پرویز سے اس کا خونی رشتہ تھا اور اسی رشتے نے شاہ جہاں کو افسردہ بنا دیا تھا۔ اگرچہ سیاسی اعتبار سے پرویز اُس کا حریف تھا لیکن شاہ جہاں نے بھائی کی موت پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔

''مجھے پرویز سے بہت سی شکایتیں تھیں، مگر اب ان کا ذکر فضول ہے۔'' شاہ جہاں نے ممتاز محل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جانے والا اتنی دُور جا چکا ہے کہ اسے آواز بھی نہیں دی جا سکتی۔ خدا اس کی مغفرت کرے اور مرحوم کی روح کو سکون بخشے۔''

یہ رسمی کلمات نہیں تھے۔ شاہ جہاں نے بڑی سچائی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

ارجمند بانو فطرتاً ایک رحم دل عورت تھی۔ اسے بھی شہزادہ پرویز کی موت کا صدمہ ہوا تھا۔ مگر ماہ رخ نے اس خبر کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا تھا۔ اسے کچھ دیر کے لئے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ ارجمند بانو نے ماہ رخ کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر کہا۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ماہ رخ؟'' ارجمند بانو کے لہجے میں تشویش بھی تھی اور حیرت بھی۔

ماہ رخ نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''کچھ نہیں آقا زادی! کسی کے مرنے کی خبر سن کر مجھ پر اسی قسم کا ردِ عمل ہوتا ہے۔'' ماہ رخ

نے جھوٹ بول کر اپنی دلی کیفیات پر پردہ ڈالنا چاہا۔ ''میں نے زندگی میں اتنے صدمات برداشت کئے ہیں کہ اب کوئی بھی الم ناک خبر سن کر ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہوں۔ میرے مرحوم باپ نے شہزادہ پرویز کی بہت خدمت کی تھی۔ بس یہی سوچ کر دل اُداس ہو گیا۔ گزرے ہوئے دنوں کی یاد آنے لگی۔ کیسا خوشگوار اور پُرسکون زمانہ تھا۔ شاہی محل کی وہ جگمگاتی ہوئی نغمہ بار تقریبات، وہ جشن، وہ ہنگامہ خیزیاں..... کیسا سہانا موسم تھا..... اب تو چاند ستاروں سے بھی آگ برس رہی ہے۔ اور اب تو بادِ صبا کے جھونکے بھی جلائے ڈالتے ہیں۔'' ماہ رخ نے بڑی ذہانت کے ساتھ موضوع بدل دیا تھا۔ ''آپ کی جلاوطنی، صاحبِ عالم کی دربدری، یہ ایسی تلخ حقیقتیں ہیں جو مجھے چین سے نہیں رہنے دیتیں۔''

ماہ رخ کی باتیں سن کر ارجمند بھی اُداس ہو گئی۔ ''صبر کرو ماہ رخ! یہ دن بھی گزر جائیں گے۔''

ارجمند کے تسلی آمیز کلمات سن کر ماہ رخ رونے لگی۔

ارجمند کا خیال تھا کہ ماہ رخ جلاوطنی کی اس زندگی سے تنگ آ گئی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی وفادار کنیز کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اگر تم موسم کی ان سختیوں کو برداشت نہیں کر سکتیں تو پھر قصرِ شاہی واپس چلی جاؤ۔ صاحبِ عالم تمہیں اپنے فوجیوں کی نگرانی میں آگرہ بھیج دیں گے۔''

اپنی آقا زادی کی اس پیشکش پر ماہ رخ تڑپ اُٹھی۔ ''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی خواہش رکھتی ہوں؟''

ارجمند نے بڑے باوقار انداز میں کہا۔

''ماہ رخ! میں تمہارے جذبات کو سمجھتی ہوں۔ مگر آج ہم پر عجیب وقت آ پڑا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام ساتھی بچھڑ گئے۔ صاحبِ عالم اور میں نہیں چاہتے کہ کوئی شخص ہماری وجہ سے مصائب برداشت کرے۔ تم اگر جانا چاہو تو خوشی سے چلی جاؤ۔ میں کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ زندگی اختیار کرے۔ میں جس راستے پر چل رہی ہوں، وہ ایک ختم نہ ہونے والا خارزار ہے۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے تمہارے پاؤں آبلوں سے بھر گئے ہیں۔ اب میں نہیں چاہتی کہ تم اس راہ میں اچانک لڑکھڑا کر گر جاؤ اور پھر اس قابل بھی نہ رہو کہ دوبارہ اُٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکو۔ یہ میری زندگی کی ایک آزمائش ہے اور میں اس آزمائش سے تنہا گزرنا چاہتی ہوں۔''

''نہیں آقا زادی! اس طرح تو میری زندگی ایک لعنت بن کر رہ جائے گی۔'' ماہ رخ کے لہجے میں بڑا سوز تھا، بڑی خلش تھی۔ ''میں تو آپ کے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر کے رو رہی ہوں۔ میرا ماضی ہی کیا؟ آپ کے یہاں آنے سے پہلے میں ایک ادنیٰ درجے کی کنیز تھی۔ یہ تو آپ کی مہربان ذات ہے، جس نے مجھے برابری کا درجہ دیا۔ ورنہ پوری زندگی بدترین غلامی کے

سائے میں گزر جاتی۔ اتنی نوازشات کے بعد آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ لال قلعے واپس جا کر ان خوشامدیوں کی صف میں شامل ہو جاؤں جو اپنا ضمیر تک فروخت کر چکے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ اب میرا مرنا اور جینا، خوشی اور غم، حال اور مستقبل، آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہے۔ اگر آپ اور صاحبِ عالم، شاہِ والا کی نظر میں باغی ہیں تو پھر میں بھی باغی ہوں۔ آپ میرے پیروں کے آبلوں کی بات کرتی ہیں، اگر اس راستے میں یہ پاؤں کٹ بھی گئے تو میں سینے کے بل چلوں گی مگر واپس نہیں جاؤں گی۔''

ایک کنیز کی جاں نثاری کا یہ جذبہ دیکھ کر ارجمند بانو کے چہرے پر عجیب سا رنگ اُبھر آیا۔

''ماہ رخ! مجھے تمہاری رفاقت پر ناز ہے۔''

ماہ رخ نے بڑی مشکل سے اپنے راز کو پوشیدہ رکھا تھا۔ ارجمند بانو کو ذرا بھی شک نہ ہو سکا کہ ماہ رخ کس لئے آنسو بہا رہی ہے؟ وہ لوگوں کے درمیان جبراً مسکرانے کی کوشش کرتی مگر جب تنہائی میسر آتی تو بے اختیار رونے لگتی۔ رات رات بھر جاگ کر شہزادہ پرویز کے حق میں دعائیں کرتی۔

''اے خدا! اس شخص کو بخش دے، جو میری آبرو کا قاتل تھا۔ میں اپنا خون اس پر معاف کرتی ہوں۔ تُو بھی اسے معاف کر دے کہ تجھ سے زیادہ معاف کرنے والا کوئی نہیں۔ شہزادے کو میرے حساب میں نہ پکڑنا کہ وہ میرا محبوب تھا۔ میں حشر کے میدان میں تجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔ تُو گواہ رہنا کہ میں نے پرویز کو معاف کر دیا۔ میں چاہے آتشِ غم میں جھلس کر راکھ ہو جاؤں مگر تُو اسے دوزخ کی آگ سے بچا لینا۔ اے بے پناہ کرم والے! اس پر اپنا کرم کر کہ آج وہ صرف تیرے کرم کا محتاج ہے۔''

ماہ رخ کو گریہ و زاری کرتے کرتے پوری رات گزر جاتی۔ پھر جب وہ صبح لوگوں کے سامنے آتی تو اس کی آنکھیں متورم ہوتیں۔ سکندر مرزا سے ماہ رخ کی یہ حالت چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے کئی بار اس عورت کا حال پوچھنے کی کوشش کی، جس کا طرزِ عمل بڑا جارحانہ تھا اور جو اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔

''ماہ رخ! مجھے یہ حق تو حاصل نہیں کہ میں تمہارے ذاتی معاملات میں مداخلت کروں، مگر پھر بھی میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کون سا زخم ہے، جس نے یک بیک تمہارے چہرے کی تمام رونقیں چھین لی ہیں؟''

ماہ رخ نے بگڑی ہوئی نظروں سے سکندر مرزا کی طرف دیکھا اور چپ چاپ گزر کر چلی گئی۔

پھر جب ایک دن سکندر مرزا نے ماہ رخ کو روک کر یہی بات پوچھی تو اس کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے۔ ''آخر آپ کو یہ اجازت کس نے دی ہے کہ میرے حالات سے دلچسپی رکھیں؟''

''بے شک! یہ رشتہ یکطرفہ سہی، مگر تم میری محبت سے انکار نہیں کر سکتیں۔'' سکندر مرزا نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"مجھے آپ ہی سے نہیں، اس لفظ سے بھی نفرت ہے۔" ماہ رخ کے ہونٹوں سے تلخیوں ا نفرتوں کی آگ برس رہی تھی۔

"میں پھر بھی تم سے محبت کرتا رہوں گا۔" سکندر مرزا نے بڑی سائستگی سے کہا۔ "میں سے جوابی محبت نہیں مانگتا مگر اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی اُداسی کی وجہ بتا دو۔ جب تک تمہارے ہونٹوں کی گم شدہ مسکراہٹ واپس نہیں آئے گی، میں بھی اذیتوں کی آگ میں جلا رہوں گا۔"

ایک لمحے کے لئے ماہ رخ نے سکندر مرزا کی طرف دیکھا۔ وہ بہت اُداس نظر آ رہا تھا۔ ما رخ کے دل میں خلش سی پیدا ہوئی مگر وہ فوراً ہی پتھر بن گئی۔

"جب مجھ سے آپ کا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے تو پھر یہ پرسش حال کیوں؟" یکایک ماہ رخ بہت زیادہ برہم نظر آنے لگی تھی۔

"رشتہ ہے..... مگر کبھی تم نے محسوس نہیں کیا۔" سکندر مرزا اسی لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

"میں کسی رشتے کو تسلیم نہیں کرتی۔" ماہ رخ پہلے سے زیادہ غضب ناک ہو گئی تھی۔ "قصرِ شاہی کی رنگین فضاؤں نے آپ کو گمراہ کر دیا ہے۔"

سکندر مرزا سناٹے میں آ گیا۔

"آپ سمجھتے ہیں کہ میں ان پُرفریب باتوں سے بہل جاؤں گی؟" ماہ رخ نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

"میں برسوں سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، ماہ رخ!" سکندر مرزا کی آواز بہت مدھم تھی۔ "اگر کسی دوسری منزل کا مسافر ہوتا تو کبھی کا جا چکا ہوتا۔ ایک بار مڑ کر تو دیکھو کہ میں نامراد کب سے اکیلا کھڑا ہوں۔"

"یہ مجھ پر کوئی احسان نہیں۔ میں نے کسی سے کب کہا تھا کہ کوئی میرا انتظار کرے۔ یہ محض دیوانگی ہے۔ اور دیوانوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔" ماہ رخ نے سکندر مرزا کی تمام التجاؤں کو بری طرح جھٹلا دیا تھا۔

سکندر مرزا حسرت زدہ نظروں سے دیکھتا رہا اور ماہ رخ تیز قدموں کے ساتھ چلی گئی۔

پھر جب رات کی تنہائی میسر ہوئی تو ماہ رخ نے پہلی بار سکندر مرزا کے لئے اپنے دل میں گداز محسوس کیا۔

اگر وہ ہوس پرست ہوتا تو بے شمار راستے کھلے ہیں۔ کسی پر بھی چلا جاتا..... ماہ رخ نے سوچا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

'ایک شریف انسان تیری وجہ سے تباہ ہو رہا ہے۔' ماہ رخ نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا۔

'میں بھی کیا کروں؟..... اپنے عہد سے مجبور ہوں۔' ماہ رخ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ 'میں تو ایک کی ہو چکی۔ پھر اُس کی یادوں سے کس طرح بے وفائی کروں؟'

'اور سکندر مرزا کا کیا ہو گا، جس نے تیری خاطر دنیا بھر کی عورتوں کو نظر انداز کر دیا ہے؟' ماہ رخ کے ذہن میں دوسرا سوال اُبھرا۔

ماہ رخ اس سوال کا جواب نہ دے سکی اور بے اختیار رونے لگی۔

'سکندر مرزا! تم میرے راستے میں کیوں آ گئے؟..... میں کس کس کا ماتم کروں؟..... اپنے محبوب کی موت کا یا تمہاری ناکام حسرتوں کا؟..... میرے اختیار میں کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں..... میں بہت مجبور ہوں۔ تم ایک عظیم انسان ہو سکندر مرزا!..... میں تمہارے قابل نہیں۔ کاش! میری تباہی سے پہلے تم مجھے مل جاتے، پھر میں اپنی قسمت پر ناز کرتی۔ تم بہت بلند ہو۔ میرے تصورات کی پرواز سے بھی زیادہ۔ میں بہت پستی میں ہوں۔ تمہیں چھونا چاہتی ہوں مگر چھو نہیں سکتی۔ تم سے تو اس خود غرض دنیا میں وفا کا اعتبار قائم ہے۔ پھر تم کیوں ایک کنیز کی تلاش میں یہاں تک آ گئے؟..... تم واپس چلے جاؤ۔ خدا کے لئے واپس چلے جاؤ۔' ماہ رخ بہت دیر تک اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگتے رہے۔

❀.....❀.....❀

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

یکایک حالات نے ایک اور کروٹ لی۔ جب شاہ جہاں کو مہابت خان کی بغاوت کا علم ہوا تو اس نے خان جہاں سے کہا کہ وہ اپنے باپ کی مدد کے لئے جانا چاہتا ہے۔ مگر خان جہاں نے کسی بھی قسم کے تعاون سے انکار کر دیا۔

مجبوراً شاہ جہاں نے تھوڑی سی فوج لی اور شمال کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب شاہ جہاں اجمیر پہنچا تو اس کے پرانے اتحادی راجہ بھیم سنگھ کا لڑکا کشن مر گیا۔ نتیجتاً راجپوت سپاہی، کشن سنگھ کی لاش لے کر واپس ہو گئے۔ اس طرح شاہ جہاں کی فوج کی تعداد کچھ اور کم ہو گئی۔

شاہ جہاں کا خیال تھا کہ قندھار پر ایرانی قبضے کے باوجود شاہِ ایران اس سے باعزت سلوک کرے گا۔ کیونکہ شاہ جہاں نے اپنی طرف سے تعلقات میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ لیکن ٹھٹھہ کے گورنر کی وجہ سے شاہ جہاں کو تاخیر ہو گئی۔ ٹھٹھہ کا گورنر، شہزادہ شہریار کا اتحادی تھا اور اس نے شاہ جہاں کی مزاحمت کے لئے بڑی فوج جمع کر لی تھی۔

شاہ جہاں کے ساتھیوں نے قلعہ پر حملہ کر دیا مگر انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ حملہ شاہ جہاں کی مرضی کے خلاف کیا گیا تھا۔ ابھی شاہ جہاں اپنی تازہ شکست اور مستقبل کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ اسے نور جہاں کا خط ملا۔ نور جہاں نے مختصراً لکھا تھا۔

"تم اطمینان سے رہو۔ مہابت خان کے اثر و رسوخ کو ختم کر دیا گیا ہے۔"

شاہ جہاں اس خط کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ملکہ ہند اُسے خاموش اور مطمئن رہنے کی تلقین کیوں کر رہی ہے؟

نور جہاں نے ایک طرف شاہ جہاں کو خط لکھ کر مطمئن کرنے کی کی کوشش کی کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے اور دوسری طرف مہابت خان کو حکم دیا کہ وہ شاہ جہاں کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوراً ٹھٹھہ پہنچ جائے۔ اس طرح نور جہاں کا مقصد یہ تھا کہ جب دونوں دشمن آپس میں ٹکرائیں گے تو یقینی طور پر کسی ایک سے نجات حاصل کر لی جائے گی.....اور دوسری طرف مہابت خان، دربارِ شاہی سے دُور ہو جائے گا۔

شاہ جہاں واقعتاً اس بے سرو سامانی کے عالم میں بھی اپنے باپ کی مدد کرنے کے لئے نکلا تھا مگر اس کے خلاف محلاتی سازشوں کا جال مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف مہابت خان، نور جہاں کے کہنے پر شاہ جہاں سے جنگ کرنا چاہتا تھا مگر شاہی خزانے کے لالچ نے اسے بنگال کی طرف جانے پر مجبور کیا۔ مگر جب وہ شاہی خزانہ حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اس نے میوات میں پناہ لی۔ اب مہابت خان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اُس نے دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ اپنی تمام خدمات، شاہ جہاں کے سپرد کر دیں۔ اس طرح نور جہاں کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور اس کے دونوں طاقتور حریف ایک ہی محاذ پر جمع ہو گئے۔ شاہ جہاں کی بدبختی کے سائے آہستہ آہستہ دُور ہوتے جا رہے تھے۔

۞.....۞.....۞

1627ء کے موسمِ بہار میں شہنشاہ گرمیاں گزارنے کی غرض سے کشمیر روانہ ہوا۔ جب شاہی قافلہ لاہور سے روانہ ہوا تو اس وقت بھی جہانگیر کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ دمے کے مرض کی وجہ سے وہ خاصا کمزور ہو گیا تھا یہاں تک کہ سواری کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ جہانگیر کی بھوک مر چکی تھی اور انتہا یہ ہے کہ شراب بھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اُترتی تھی۔

موسمِ خزاں میں شاہی قافلہ کشمیر سے واپس ہوا۔ اس دوران اس نے ایک بار شکار بھی کھیلا مگر اس طرح کہ اس نے ایک خادم کا سہارا لے کر بندوق چلائی۔ یہ بڑی خوف ناک علامت تھی۔ شاہی طبیب سمجھ چکے تھے کہ فرشتۂ اجل دبے قدموں جہانگیر کا تعاقب کر رہا ہے۔ اگرچہ جہانگیر کشمیر کو "دنیا کی جنت" سمجھتا تھا مگر اس بار یہ "جنت" بھی اسے سکون کی چند سانسیں فراہم نہ کر سکی۔

جہانگیر تقریباً روزانہ ہی نور جہاں کے ساتھ سیر کے لئے نکلتا تھا مگر اسے فطرت کے حسین مناظر میں کوئی کشش محسوس نہ ہوتی۔ وہ اکثر نور جہاں کے کاندھے پر سر رکھ کر کہتا۔

"ملکۂ عالیہ! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مابدولت دوبارہ لاہور نہیں دیکھ سکیں گے۔"

نور جہاں اپنی محبوبانہ اداؤں کا مظاہرہ کرتی لیکن اب اس حسین ترین عورت کے غمزوں میں بھی کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ جہانگیر بڑی مایوسی کی باتیں کرتا جیسے اسے اپنی موت سامنے نظر آ رہی ہو۔ نورِ جہاں گھبرا کر شہنشاہ کے خشک ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتی۔

"عالم پناہ! اپنی زبان سے ایسے کلمات ادا نہ کریں جنہیں سن کر آپ کی اس کنیز کا دل بھی ٹوٹ جائے۔"

نور جہاں کو بے قرار دیکھ کر جہانگیر سنبھلنے کی کوشش کرتا مگر اس کے حوصلے جواب دے چکے تھے۔

آخری دنوں میں جہانگیر محل کی کنیزوں سے ایسی شفقت آمیز گفتگو کرتا کہ وہ پریشان ہو جاتیں اور منہ پھیر کر رونے لگتیں۔ بڑی ناسازگار فضا تھی۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آتی تھی۔

ایک دن اس نے نور جہاں کے کاندھے پر سر رکھ کر کہا۔

"اگر یہاں سے کوچ کرنے میں عجلت سے کام لیا گیا تو یہ خطہ میری زندگی میں ہمیشہ خار بن کر کھٹکتا رہے گا۔"

نور جہاں نے گھبرا کر شہنشاہ کی پیشانی کو چھوا اور پھر جہانگیر کو ساتھ لے کر بارہ دری سے باہر نکل آئی۔

اب کی بار شہنشاہ کا جلوس قبل از وقت ہی وادیٔ کشمیر سے روانہ ہو گیا۔ وہ پالکی میں گاؤ تکیے کا سہارا لے کر نور جہاں کے ساتھ بیٹھا اور دور تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلوں کو ویران آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ نور جہاں نے شہنشاہ کا دل بہلانے کی بہت کوشش کی مگر ہر بار اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ اُبھرتی اور ڈوب جاتی۔

بھمبر سے دو میل دُور جب شاہی جلوس خیمہ زن ہونے لگا تو نور جہاں موسمِ گرما کی تھکن اور غنودگی سے چونکی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک محبوبانہ مسکراہٹ سجائی اور دزدیدہ نظروں سے شہنشاہ کی طرف دیکھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے نور جہاں کی دلنواز مسکراہٹ پتھرا کر رہ گئی۔ شہنشاہ کی روح عالمِ خواب ہی میں پرواز کر چکی تھی۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے آنکھیں بند کئے سو رہا تھا لیکن اس طرح کہ یہ اس کی ابدی نیند تھی۔ جہانگیر کو تمام اذیتوں سے نجات مل چکی تھی اور وہ اس فانی دنیا سے بہت دور جا چکا تھا۔

نور جہاں نے فوراً سالارِ قافلہ کو پردے کے پاس بلایا اور انتہائی پُر جلال لہجے میں اسے حکم دیا۔

"پڑاؤ موقوف کر دیا جائے اور سفر تیز رفتاری کے ساتھ جاری رہے۔"

سالارِ قافلہ اور دوسرے خدمت گاروں کو اتنا پوچھنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ سالہا سال کی رسم میں اس اچانک تبدیلی کی کیا وجہ ہے؟"

خواصوں اور کنیزوں کی زبانی جلوس میں یہ خبر اُڑتے اُڑتے گرم ہو گئی کہ شہنشاہ کی طبیعت ناساز ہے۔ اور ملکۂ عالیہ جلد از جلد لاہور پہنچ جانا چاہتی ہیں۔

عنبر اور لوبان کی خوشبو اور عرقِ گلاب کی بارش کے باوجود شہنشاہ کو گرمی کی شدت سے محفوظ رکھنا آسان نہیں تھا۔ گجرات سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر نور جہاں نے قافلہ روک دینے کا حکم دیا

اور فوری طور پر شاہی طبیب کو طلب کر لیا۔

شاہی طبیب لرزتے قدموں سے آگے بڑھا اور پالکی کے قریب پہنچ کر زمین بوس ہو گیا۔ نور جہاں نے اس موقع پر بے مثال قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا۔ وہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ پالکی سے نیچے اُتری۔ اس کا اطمینان دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے صدمے سے دوچار ہو چکی ہے۔

نور جہاں نے شاہی طبیب کا سلام قبول کیا اور ہاتھ کے اشارے سے تخلیے کا حکم دیا۔ تمام کنیزیں اور خدام سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔ یہاں تک کہ پالکی سے دو گز کے فاصلے تک کوئی خدمت گار نہیں تھا۔ جب مکمل تنہائی ہو گئی تو نور جہاں نے شاہی طبیب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے آقائے نعمت اس دنیا سے گزر چکے ہیں؟''

شاہی طبیب بدحواس نظر آنے لگا۔

''نہیں ملکۂ عالیہ! میری سماعت اس خبر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔'' شاہی طبیب کی آواز لرز رہی تھی۔

''ہاں! یہ آفتِ ناگہانی اس زمین پر نازل ہو چکی ہے۔'' یہ کہتے کہتے نور جہاں کے چہرے پر عکسِ ملال اُبھرا مگر اُس نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ ''میرا حکم ہے کہ جب تک میں اپنی زبان سے کچھ نہ کہوں، اس وقت تک یہ راز تمہارے سینے میں دفن رہنا چاہئے۔''

شاہی طبیب نے سر جھکا دیا۔

''اور میری خواہش ہے کہ شاہِ والا کا جسم گرمی سے محفوظ رہے۔''

''اب یہ ممکن نہیں رہا۔'' شاہی طبیب نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''موسم بہت گرم ہے۔''

''کیا تمہاری حکمت میں ایسی کوئی تدبیر نہیں کہ عالم پناہ کا جسم سڑنے سے محفوظ رہ سکے؟'' پہلی بار نور جہاں کے لہجے سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

شاہی طبیب کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا اور پھر سر جھکائے ہوئے بولا۔

''اب ایک ہی صورت باقی ہے کہ جہاں پناہ کے شکم کو تمام آلائشوں سے پاک کر دیا جائے ورنہ شدید گرمی کے سبب پورا جسم سڑ جائے گا۔''

''تو پھر ایسا ہی کرو۔'' نور جہاں نے شاہی طبیب کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''یہ ہاتھ اپنے آقائے نعمت کے جسم کے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتے۔'' شاہی طبیب کی آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔

''میں تمہاری عقیدت اور وفاداری سے خوش ہوں مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔'' اب نور جہاں کے لہجے سے بھی سوگواری ظاہر ہونے لگی تھی۔

مجبوراً شاہی طبیب پالکی میں داخل ہوا۔ اس نے جہانگیر کے چہرے پر نظر کی۔ بڑا عبرت

ناک منظر تھا۔ کل تک جس شخص کے قدموں کی دھمک سے لوگوں کو زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، آج وہ اس طرح خاموش پڑا تھا کہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بے چارگی سی بے چارگی تھی۔ شاہی طبیب کانپ کر رہ گیا۔

پھر اس نے کانپتے ہاتھوں سے جہانگیر کا پیٹ چاک کیا اور شکم سے تمام آنتیں اور دیگر آلائشوں کو نکال کر رات کی تاریکی میں اسی مقام پر دفن کر دیا۔ پھر اس جگہ ایک ایسی نشانی قائم کی، جسے نور جہاں اور شاہی طبیب کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

۞.....۞.....۞

نور جہاں نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے آخری کوشش کی۔ اس نے فوری طور پر ایک قاصد اپنے داماد، شہریار کے پاس بھیجا اور اسے لڑائی کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی نور جہاں نے اپنے بھائی آصف خان کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آصف خان پہلے سے ہوشیار تھا۔ وہ سازشوں کے بچھائے ہوئے ہر جال سے بہت دُور رہا۔ انتہائی اصرار کے باوجود اس نے نور جہاں سے ملنے سے بھی انکار کر دیا اور اپنے حامیوں کی مدد سے شاہ جہاں کی تخت نشینی کا منصوبہ بنانے لگا۔

سب سے پہلے اس نے میر بخشی ارادت خان کو اپنا ہم خیال بنایا۔ پھر اسی کے مشورے سے ایک ایسی تدبیر سوچی کہ قانونی دُشواریاں بھی ختم ہو جائیں اور سیاسی صورتِ حال بھی اس کے حق میں سازگار ہو جائے۔

جہانگیر کے انتقال کے وقت شاہ جہاں دکن میں مقیم تھا اور شہزادے کی عدم موجودگی میں اس کے لئے حمایت حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس زمانے میں لوگوں کا معمول یہ تھا کہ وہ مختلف امیدواروں کے لئے نہیں بلکہ کسی ایک شخص کے لئے لڑتے تھے۔ اس کے علاوہ عوام کی توجہ کا مستحق وہ شخص ہوتا تھا، جو موقع پر موجود ہوتا تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں شاہ جہاں سے زیادہ شہزادہ شہریار، رعایا کے نزدیک تھا۔ اس لئے آصف خان کے سامنے یہ مشکل سوال تھا کہ شہریار سے عنقریب ہونے والی جنگ میں وہ عوام کی ہمدردیاں کس طرح حاصل کرے؟

یہ وہ نازک موقع تھا کہ آصف خان، شاہ جہاں کی تخت نشینی کا اعلان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ رعایا پر اس کا برائے نام اثر ہوتا اور شہزادہ شہریار سے وہ لڑ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قسم کی جنگ بغاوت میں شمار ہوتی۔ نتیجتاً رسم و رواج کے مطابق آصف خان کو ایک ایسے دستور کے جواز کی ضرورت تھی جو اس کی سپاہیانہ نقل و حرکت کو قانونی رنگ دے سکے۔

اس سلسلے میں آصف خان نے فوری طور پر یہ منصوبہ سازی کی کہ مرحوم خسرو کے بڑے بیٹے داور بخش کی تخت نشینی کا اعلان کر دے۔ اس سے حکمرانی کا خلا بھی بھر جائے گا اور بڑی حد تک رعایا بھی مطمئن ہو جائے گی۔ شہزادہ شہریار کے مقابلے میں داور بخش، تاج و تخت کا زیادہ

حق دار تھا۔ ایک تو یہ کہ شہنشاہ جہانگیر اپنے آخری دنوں میں داور بخش کو پسند کرنے لگا تھا۔ دوسرے یہ کہ شہزادہ شہریار ایک معمولی کنیز کے بطن سے پیدا ہوا تھا، اس لئے عوام اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

داور بخش کو ہندوستان کا نیا حکمران بنا کر آصف خان اپنے حامیوں کے ساتھ بھمبر تک پہنچا۔ نور جہاں کو اپنے دشمنوں کی اس غیر متوقع حرکت پر سکتہ سا ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات اس طرح بدل جائیں گے اور سیاست کی بساط یک بیک اُلٹ جائے گی۔ نور جہاں نے جہانگیر کی لاش لے کر اپنے حریفوں کا تعاقب کیا مگر آصف خان کی حکمتِ عملی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ لاہور کی طرف لوٹ جائے اور شہنشاہ کے مُردہ جسم کو اسی مقام پر دفن کر دے۔

حالات پر نور جہاں کی گرفت کمزور ہو چکی تھی۔ چار و ناچار اسے تقدیر کے فیصلے کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ نور جہاں کے لئے وہ بڑے اذیت ناک لمحے تھے جب شہنشاہ جہانگیر کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا۔ والیٔ ہند کے جنازے میں شریک ہونے والوں کی تعداد بہت مختصر تھی۔

نور جہاں نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر شوہر کے بے جان چہرے پر نظر کی۔ بڑی عبرت کا مقام تھا۔ کل تک جس شخص کے جاہ و جلال سے ہندوستان کے در و دیوار لرزتے تھے، آج وہ بڑی خاموشی کے ساتھ دو گز زمین کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ کاندھا دینے کے لئے نہ کوئی بیٹا تھا اور نہ کوئی پوتا۔ سارے خونی رشتے منتشر تھے اور اپنے اپنے اقتدار کے لئے ایک دوسرے سے جنگ کر رہے تھے۔ نور جہاں نے آخری بار بے حس و حرکت شوہر کی جانب دیکھا۔ اس کی خوب صورت آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور آتشیں رخسار اشکوں کی حرارت سے جل اُٹھے۔ پھر وہ جھکی اور اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ شہنشاہ کی سرد پیشانی پر رکھ دیئے۔

"شاہِ والا! آپ کی محبوب مہر النساء جسے آپ "دنیا کا نور" کہا کرتے تھے، آج وہ زندگی کے لامحدود اندھیروں میں تن تنہا کھڑی ہے۔ اب نہ کوئی اس کا پرسانِ حال ہے اور نہ کوئی حکم سننے والا۔ ہر طرف نافرمانی ہی نافرمانی ہے..... اور دل آزاری ہی دل آزاری ہے۔ جسے آپ نے بیوگی کے عذاب سے بچایا تھا، آج ایک بار پھر وہ بیوہ ہو گئی۔

یہ کہہ کر نور جہاں نے قبر کی گہرائی کو دیکھا اور فریاد کے لہجے میں چیخنے لگی۔

"اے زمین! اپنے حکمراں کا ماتم کر کہ آج دنیا سے شہنشاہِ عادل اُٹھ گیا..... اور اے آسمان! اس شخص پر آنسوؤں کی بارش کر جو بڑا بہادر، سخی اور اپنی رعایا کا درد سمجھنے والا تھا..... اور اے مہر النساء! اپنے اس شریکِ سفر کے لئے مرثیہ خوانی کر جو تجھ سے راستے میں بچھڑ گیا۔ ایسا شریکِ سفر کہ جس کے بغیر منزل بے نشان ہے..... اور زندگی کی طویل راہ گزر زہریلے کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔"

پھر جہانگیر کے تابوت پر مٹی ڈال دی گئی۔ نور جہاں نے ایک جگر شگاف چیخ ماری اور قبر سے لپٹ گئی۔ تمام خدمت گار زار و قطار رو رہے تھے۔

جب نور جہاں، شہنشاہ کی تدفین سے فارغ ہو گئی تو آصف خان کے سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ اب وہ لاہور میں نظر بند تھی۔ آصف خان کا لگایا ہوا پہرہ اس قدر سخت تھا کہ نور جہاں سے نہ کوئی مل سکتا تھا اور نہ ہی وہ کسی سے بات کر سکتی تھی۔

❀.....❀.....❀

جب شہریار کو جہانگیر کے مرنے کی خبر ملی تو اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی لاہور کا سارا خزانہ اپنے قبضے میں لے کر اس توپ خانے پر بھی اختیار حاصل کر لیا، جو شہنشاہ جہانگیر نے کشمیر جاتے وقت لاہور میں چھوڑا تھا۔

شہریار بڑے آمرانہ اقدامات کر رہا تھا۔ اُس نے بہت سے امراء کی جاگیریں ضبط کر لیں اور ان کے اہل و عیال کو قید میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے کثیر دولت خرچ کر کے ایک بڑی فوج آصف خان کے مقابلے کے لئے تیار کر لی۔

آصف خان ہاتھی پر سوار ہو کر شہریار کے لشکر کی طرف بڑھا۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنے فوجیوں کی ہمت افزائی کر رہا تھا۔ پھر لاہور سے تین میل کے فاصلے پر دونوں فوجوں کا تصادم ہوا۔ اگرچہ شہریار کے لشکر میں سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں بندوق کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ نتیجتاً آصف خان کے پہلے ہی حملے میں شہریار کے بہت سے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ شہریار اپنے سپہ سالار افضل خان کے اشارے کا منتظر تھا لیکن وہ اپنے خیمے میں ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ افضل خان بظاہر شہریار کا جاں نثار تھا مگر در پردہ اُس کی ہمدردیاں آصف خان کے ساتھ تھیں۔

جب شہریار کو معلوم ہوا کہ اس کی فوجیں پسپا ہو چکی ہیں تو وہ قلعے میں داخل ہوا اور اس نے دروازے بند کر لئے۔ شہریار اس طرح اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہا تھا۔ مگر در حقیقت اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

آصف خان، میدانِ جنگ سے گزر کر قلعے کے قریب آیا اور مہدی قاسم خان کے باغ میں ٹھہر گیا۔ سپہ سالار افضل خان ان فوجیوں کے ہمراہ آصف خان سے ملنے آیا جو شہزادہ شہریار کی صفوں سے الگ ہو چکے تھے۔ اب قلعے میں داخلہ آسان ہو گیا تھا۔ آصف خان کے دو معتمد، ارادت خان اور شائستہ خان رات کے وقت قلعے میں داخل ہو گئے اور اپنا خیمہ شاہی صحن میں گاڑ دیا۔ صبح کو آصف خان کے فوجیوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا اور شہزادہ شہریار کو تلاش کرنے لگے۔

شہریار سلطانی محل سرا میں چھپا ہوا تھا۔ اسے خواجہ سرا فیروز خان اور خدمت خان پر پورا بھروسہ تھا مگر یہ دونوں بھی در پردہ آصف خان سے ملے ہوئے تھے۔ نتیجتاً شہزادہ شہریار کو آصف خان کے ایک اور معتمد، اللہ وردی خان کے سپرد کر دیا گیا۔

شہریار زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اسے کھینچ کر داور بخش کے سامنے لایا گیا جو ہندوستان کا

نام نہاد حکمراں تھا۔ مگر آصف خان اس پر یہی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ سلطنتِ مغلیہ کا حقیقی فرما
ہے۔ شہریار کو مجبور کیا گیا کہ وہ داور بخش کے سامنے کورنش بجا لائے۔ شہریار نے سوچا بھی نہ
کہ بساطِ اقتدار اچانک اس طرح اُلٹ جائے گی۔ وہ بہت دیر دھندلی آنکھوں سے شہزادہ خ
کے بیٹے داور بخش کی طرف دیکھتا رہا جس کے سر پر تاج زرنگار جگمگا رہا تھا۔ شہریار نے بڑے
کے عالم میں سر جھکا کر داور بخش کو سلام پیش کیا۔ پھر آصف خان کے اشارے پر شہریار کو در
سے زنداں کی طرف لے جایا جانے لگا۔

''تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' شہریار نے گھبرا کر سپاہیوں سے پوچھا۔

''اب آپ کا ٹھکانہ زنداں کی تنہائی ہے۔'' سپاہیوں نے جواب دیا۔

''میں داور بخش کے اقتدار کو تسلیم کر چکا ہوں، پھر میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جا
ہے؟'' شہریار نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

''ہم کچھ نہیں کہہ سکتے..... ہمارے لئے یہی حکم ہے۔'' سپاہیوں کے لہجے سے بے نیاز
جھلک رہی تھی۔

''مجھے پابہ زنجیر اور حوالۂ زنداں کرنے کا حکم کس نے دیا ہے؟'' شہریار نے تیز آواز میں کہا

''وزیر اعظم آصف خان کا یہی حکم ہے۔'' سپاہیوں نے جواب دیا۔

''مجھے آصف خان کے پاس لے چلو۔ میں خود اپنا معاملہ ان سے طے کر لوں گا۔'' اس
شہزادہ شہریار نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

''ہم وزیر اعظم کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے۔'' یہ کہہ کر سپاہیوں نے شہریار کو قید خا
میں بند کر دیا۔

جب سپاہی واپس جانے لگے تو شہریار نے التجا کے انداز میں ان سے کہا۔

''تم کم سے کم وزیر اعظم تک میرا پیغام تو پہنچا سکتے ہو۔ یہ مجھ پر تمہارا بڑا احسان ہو گا
شہریار کے لہجے میں بڑی اُداسی تھی۔

آخر ایک سپاہی نے شہریار کی ساری گفتگو، وزیر اعظم کو منتقل کر دی۔

آصف خان رات کی تنہائی میں شہزادہ شہریار سے ملا۔

''مجھے کس لئے قید کیا گیا ہے؟'' شہریار نے نرم لہجے میں آصف خان سے پوچھا۔ وہ ا
وقت انتہائی مصلحت سے کام لے رہا تھا۔

''اس لئے کہ تم اقتدار کے خواب دیکھ رہے تھے۔'' آصف خان نے صاف صاف کہا۔

''اقتدار میرا حق ہے۔'' شہریار کے لہجے میں اچانک سختی آ گئی تھی۔

''شہزادے! تم خوب جانتے ہو کہ تم سے زیادہ حق دار یہاں موجود ہیں۔'' آصف خا
نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

شہریار فوراً ہی سنبھل گیا۔ وہ سیاست سے کام لے کر اپنے پیروں کی زنجیریں توڑنا چاہتا تھا

''میں اپنے بھتیجے، داور بخش کے اقتدار کو تسلیم کر چکا ہوں، اس لئے مجھے آزاد کر دیا جائے
تاکہ میں اپنی زندگی کے باقی دن سکون کے ساتھ کسی گوشۂ گمنامی میں گزار دوں۔'' شہزادہ شہریار
نے ایک چال چلنے کی کوشش کی تھی مگر آصف خان جیسے جہاندیدہ شخص پر اس کی باتوں کا کوئی اثر
نہیں ہوا۔

''شہزادے! تمہارے پیروں میں یہ زنجیریں ہی زیب دیتی ہیں۔'' آصف خان کے
ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ ''جب بھی تمہیں آزاد کیا جائے گا، تم وہی حرکت کرو گے۔
ناجائز طور پر اقتدار مانگنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔''

شہزادہ شہریار بہت دیر تک خوشامد کرتا رہا مگر آصف خان نے اس کی ایک نہ سنی۔

پھر تیسرے دن زنداں کا کمرہ، شہریار کی چیخوں سے گونجنے لگا۔

چار جلادوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر شہریار ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔

''یہ سب کچھ کیا ہے؟..... آخر تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' شہریار نے ایک جلاد کے
ہاتھوں میں جلتی ہوئی سلاخیں دیکھ کر کہا۔

''یہ ایک عذاب ہے، جو اُن آنکھوں پر نازل ہوتا ہے، جو سوتے جاگتے اقتدار کے خواب
دیکھتی ہیں۔'' جلادوں کے بجائے آصف خان کے معتمد شائستہ خان نے جواب دیا۔

''کیا تم لوگ مجھے اندھا کر دو گے؟'' شہریار نے پوری طاقت سے چیختے ہوئے کہا۔

''یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہو گی شہزادے!'' شائستہ خان نے سخت لہجے میں جواب دیا۔
''حکومت کے باغیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔''

''میں باغی نہیں ہوں۔'' شہزادہ شہریار مسلسل چیختا رہا مگر شائستہ خان اور جلادوں پر اس کی
دردناک فریاد کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

پھر شائستہ خان کا ہاتھ بلند ہوا اور تین جلادوں نے آگے بڑھ کر شہریار کو بے دست و پا کر
دیا۔ اس کے بعد چوتھے جلاد نے جلتی ہوئی سلاخیں، شہریار کی دونوں آنکھوں میں پھیر دیں۔

ایک بار پھر زنداں کا وہ تنگ و تاریک کمرہ، شہزادے کی چیخوں سے گونجنے لگا۔

''نمک حرامو! تم نے تاج و تخت کے جائز وارث سے اس کی بینائی چھین لی۔''

یہ کہہ کر شہریار بے ہوش ہو گیا۔ اور آنکھوں سے بہتا ہوا خون اس کے رخساروں پر جمنے لگا۔

۞.....۞.....۞

اس طرح آصف خان نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک ایک کر کے شاہ جہاں کے تمام
حریفوں کو بساطِ اقتدار سے ہٹا دیا۔ خود داور بخش کا یہ حال تھا کہ اُسے اپنی حکمرانی پر یقین نہیں آتا
تھا۔ وہ بار بار آصف خان سے پوچھتا تھا۔

''کیا یہ حقیقت ہے کہ میں ہندوستان کا تاجدار بن چکا ہوں؟..... یا یہ محض ایک خواب

ہے، جو میں جاگتے میں دیکھ رہا ہوں؟"

آصف خان اور اس کے ساتھی ارادت خان نے قسم کھا کر کہا۔

"نہیں شہزادے! تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ تمہارے سر پر ہندوستان کا تاج سجایا جا چکا ہے۔"

یہ سن کر داور بخش خاموش ہو جاتا مگر رازدار حلقے خوب جانتے تھے کہ وہ محض قربانی کی ایک بھیڑ ہے، جسے کسی بھی وقت آسانی کے ساتھ ذبح کیا جا سکتا ہے۔

داور بخش کی بادشاہت کے اعلان کے ساتھ ہی آصف خان نے اپنے دوسرے معتمد، بنارسی داس کو شاہ جہاں کے پاس روانہ کر دیا۔ آصف خان اس قدر عجلت میں تھا کہ وہ اپنے داماد کو کوئی تحریر نہیں بھیج سکا۔ اس نے بنارسی داس کو اپنی خاص مہر دی اور خفیہ طور پر زبانی پیغام دیتے ہوئے کہا۔

"شہزادے کو چاہئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، لاہور پہنچ جائے۔"

بنارسی داس بڑی تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ مگر پھر بھی وہ بیس دن میں جنار پہنچا۔ راستے میں اس کی ملاقات مہابت خان سے ہوئی۔ پھر وہ دونوں مل کر مبارکباد دینے کے لئے شاہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

جب شاہ جہاں نے باپ کے انتقال کی خبر سنی تو وہ سناٹے میں آ گیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"یہ خبر ایسی ہے، جسے سن کر مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ اگرچہ میں شاہِ والا کی نظروں میں ایک معتوب اور باغی تھا لیکن پھر بھی ان کے دم سے اس زندگی میں بڑی رونقیں تھیں۔ آخر وہ میرے محترم باپ تھے۔ ان کا سایہ ہمارے سروں پر موجود تھا اور ہم لوگ اپنے اندر ایک عجیب سی طاقت محسوس کرتے تھے۔ آج عالم پناہ کے نہ ہونے سے ہم بے سہارا ہو گئے مہابت خان!" شاہ جہاں کی آنکھوں سے بدستور آنسو بہہ رہے تھے اور اس کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی۔

مہابت خان اور دوسرے خدمت گار بھی اُداس نظر آ رہے تھے۔

شاہ جہاں نے بنارسی داس کو مخاطب کر کے کہا۔

"ہم اس وقت تک آگرہ نہیں جائیں گے، جب تک کہ شاہِ والا کا چہلم نہیں ہو جاتا۔ ہم عالم پناہ کا پورا سوگ منائیں گے، پھر اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

بنارسی داس کچھ دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا، پھر اس نے بہت آہستہ لہجے میں کہا۔

"صاحبِ عالم! جہاں پناہ کی موت سے ہمارے دل بھی زخمی ہیں اور ہماری آنکھیں بھی خون برسا رہی ہیں..... مگر صورتِ حال کا تقاضا کچھ اور ہے۔"

شاہ جہاں نے غور سے بنارسی داس کی طرف دیکھا۔

"حضور! وزیرِ اعظم آصف خان نے فرمایا ہے کہ ایک لمحے کی تاخیر بھی کوئی نیا ہنگامہ کھڑا کر سکتی ہے۔" بنارسی داس رک رک کر بول رہا تھا۔ "بے شک یہ جانگداز سانحہ رونما ہو چکا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم شاہِ والا کی عظیم وراثت کو دشمنوں سے محفوظ رکھیں۔ اس وقت صاحبِ عالم! دارالحکومت سے دُور رہنا سیاسی مصلحتوں کے خلاف ہے۔"

مہابت خان اور دوسرے مصاحبین نے بھی بنارسی داس کی رائے سے اتفاق کیا جس کے نتیجے میں شاہ جہاں کو جنار سے فوراً روانہ ہونا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک معتمد، امان اللہ کو یہ پیغام دے کر آصف خان کی خدمت میں بھیج دیا گیا کہ شاہ جہاں، احمد آباد کے لئے روانہ ہو چکا ہے۔

اگرچہ ابھی باضابطہ طور پر شاہ جہاں کی بادشاہت کا اعلان نہیں ہوا تھا، لیکن فی الواقع اب وہی ہندوستان کا نیا حکمراں تھا اور اس کی ذمے داریوں کے احساس میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ شاہ جہاں، دکن کے علاقے کے لئے پہلے بھی فکرمند رہتا تھا اور اب سیاسی صورتِ حال بدل جانے کے بعد وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں مزید کوئی پیچیدگی پیدا ہو۔ اس لئے شاہ جہاں نے جنار سے روانہ ہوتے وقت جاں نثار خان کو خان جہاں لودھی کے پاس بھیجا۔ خان جہاں لودھی اپنی بعض حرکتوں کی وجہ سے زیرِ عتاب تھا۔ شاہ جہاں نے بدلے ہوئے حالات میں خان جہاں کو نہ صرف اس کے عہدے پر بحال کیا بلکہ اسے نئی مراعات بھی بخشیں۔

شاہ جہاں مصالحت سے کام لینا چاہتا تھا، مگر خان جہاں لودھی کے دل میں غبار تھا۔ اس نے شاہ جہاں کی بخشی ہوئی مراعات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ خان جہاں، شاہ جہاں کے قاصد کے ساتھ بھی انتہائی سرد مہری کے ساتھ پیش آیا اور کسی جواب کے بغیر اسے واپس کر دیا۔ جاں نثار خان کے لوٹتے ہی خان جہاں لودھی نے نظام شاہ سے اتحاد کر لیا تاکہ ارضِ دکن، مغلوں کے اثرات سے محفوظ رہے۔

شاہ جہاں، شمال کی طرف روانہ ہوا تو دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی فاتح کا جلوس جا رہا ہے۔ اس کی گردش کے ایام ختم ہو چکے تھے اور اب نصرت و شادمانی کی ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ گجرات کی سرحد پر اسے سیف خان کے مشکوک رویے کی خبر ملی۔

سیف خان رشتے میں شاہ جہاں کا ہم زلف تھا۔ ارجمند بانو کی چھوٹی بہن اس سے بیاہی گئی تھی۔ سیف خان کے بارے میں شیر خان نے شاہ جہاں کو اطلاع دی تھی۔ نتیجتاً شاہ جہاں نے شیر خان کو اس علاقے کا حاکم بنا دیا اور سیف خان کے بارے میں حکم جاری کر دیا کہ اسے ایک عام قیدی کی طرح دربار میں پیش کیا جائے۔

ارجمند بانو اپنی چھوٹی بہن سے بہت محبت کرتی تھی۔ اسی رشتے سے ارجمند چاہتی تھی کہ اس کے بہنوئی پر کوئی آنچ نہ آئے۔ بالآخر ارجمند کی مداخلت کے سبب سیف خان، شاہ جہاں کے عتاب سے محفوظ رہا۔

دریائے نربدا پار کر کے شاہی سواروں کا دستہ نومبر کے آخر میں سینور پہنچا جہاں مہینے کی 28

تاریخ کو شاہ جہاں نے اپنی قمری سالگرہ منائی۔ امراء کی طرف سے دعوتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن شیر خان کا خط ملا، جس میں آصف خان کی فتح اور شہریار کی شکست کا تذکرہ تھا۔ اس خبر سے شاہ جہاں اور اس کے حامیوں کی صفوں میں خوشی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ شاہ جہاں نے حکم دیا کہ جشنِ فتح منانے کے لئے نقارے بجائے جائیں۔

شاہ جہاں کو مبارکباد دینے کے لئے شیر خان، محمود آباد تک آیا۔ یہ مقام، احمد آباد سے کچھ فاصلے پر ہے۔ ''کنکریا'' نامی تالاب کے کنارے شاہی خیمہ نصب کیا گیا۔ شاہ جہاں انتظامی معاملات اور آرام کرنے کے لئے ایک ہفتے تک یہاں ٹھہرا رہا۔ شیر خان کو اس کی وفاداریوں کے صلے میں پنج ہزاری ذات اور آٹھ ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے معتمد، خدمت پرست خان کو ایک خفیہ پیغام دے کر آصف خان کے پاس بھیجا گیا۔

شاہ جہاں کے پیغام کا خلاصہ یہ تھا کہ عوامی اور سیاسی حالات کے پیشِ نظر شہزادہ شہریار کی آنکھیں نکلوائی جائیں۔ (شاہ جہاں اس بات سے بے خبر تھا کہ آصف خان بہت پہلے شہزادہ شہریار کو اندھا کر چکا ہے)

اس خفیہ پیغام میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر ممکن ہو تو نام نہاد حکمراں، داور بخش کے دونوں بھائیوں طہمورث اور ہوشنگ کو دربار بھیج دیا جائے ورنہ انہیں صحیح مقام پر پہنچا دیا جائے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ اس پیغام میں ایک خفیہ اشارہ پوشیدہ تھا کہ طہمورث اور ہوشنگ کو قتل کر دیا جائے۔

یکم جنوری 1628ء کو شاہ جہاں گولکنڈہ پہنچا۔ یہاں میواڑ کے راجہ کرن سنگھ نے اس کی خدمت میں قیمتی نذریں پیش کیں۔ 6 تاریخ کو شاہ جہاں نے اپنے وزن کئے جانے کی رسم، منڈل تالاب کے کنارے ادا کی۔ پھر 14 تاریخ کو وہ اجمیر کے انا ساگر پر خیمہ زن ہوا۔ پھر اپنے باپ دادا کی طرح پیدل چل کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضری دینے کے بعد مقامی ضرورت مندوں میں کثیر دولت تقسیم کی اور مزارِ خواجہؒ کے نزدیک سنگِ مرمر کی ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ پھر مہابت خان کو اجمیر کا حاکم مقرر کر کے فوراً آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔

۞.....۞.....۞

امان اللہ اور بایزید کے واپس آنے پر وزیرِ اعظم آصف خان نے دوسرے امراء سے مشورہ کیا، پھر 19 جنوری 1628ء کو شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اسی دن آصف خان نے نام نہاد حکمراں، داور بخش کو قید کر کے زنداں میں ڈال دیا۔ جب سپاہی، داور بخش کو کھینچ کر قید خانے کی طرف لئے جا رہے تھے تو وہ پوری شدت سے چیخ رہا تھا۔

''فریب کارو! اگر تمہیں میرے ساتھ یہی سلوک کرنا تھا تو چند دن کے لئے میرے سر پر

تاجِ شاہی کیوں سجایا تھا؟ اگر تم میری بادشاہت تسلیم نہیں کرتے تو مجھے آزاد چھوڑ دو۔ میں ہندوستان کے کسی دُور دراز علاقے میں چلا جاؤں گا۔ اور پھر ہندوستان کے تخت کے لئے کبھی دعویدار نہیں بنوں گا۔ میری جان بخش دو کہ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

داور بخش کی چیخیں گونجتی رہیں مگر سپاہیوں پر اس کے شور و فغاں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تو محض حکم کے بندے تھے۔ داور بخش کو بے رحمی کے ساتھ کھینچتے ہوئے زنداں کی طرف لے گئے۔

پھر اسی تاریک کوٹھری میں داور بخش کے چھوٹے بھائی کو بھی بھیج دیا گیا۔ دونوں شہزادے اپنے عقب میں موت کے قدموں کی تیز چاپ سن رہے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد ہی اسی کوٹھری میں شہزادہ شہریار کو لایا گیا۔ شہریار اندھا ہونے کے سبب داور بخش اور اس کے بھائی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے چونک کر پوچھا۔

''تم لوگ کون ہو؟ اور یہاں کس لئے آئے ہو؟''

یہ سن کر داور بخش اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے شہریار کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''میں ہوں..... ہندوستان کا حکمراں، داور بخش۔''

''تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' شہریار نے چونک کر پوچھا اور داور بخش کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جب اس کے ہاتھ زنجیروں سے ٹکرائے تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

''تمہارے ہاتھوں میں یہ زنجیریں کیسی ہیں؟'' شہریار نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تم تو تاج و تخت کے مالک تھے۔ پھر اچانک یہ کیا ہو گیا؟''

''میری چند روزہ حکومت ختم ہو چکی ہے۔ اور میں بھی تمہاری طرح ایک سیاسی قیدی ہوں۔'' داور بخش نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''ہمیں یہاں کیوں جمع کیا جا رہا ہے؟'' شہریار کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ہم موت کی منزل کے مسافر ہیں۔'' داور بخش کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے تھے۔ مگر شہریار بینائی سے محروم ہو جانے کے سبب ان آنسوؤں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''کیا مجھے اندھا کرنے اور تمہیں زنجیریں پہنانے کے بعد بھی ان لوگوں کو قرار نہیں آیا؟'' شہریار نے داور بخش سے پوچھا۔

''وہ ہماری اس حالت زار سے مطمئن نہیں ہیں۔'' داور بخش نے کہا۔ ''وہ ہم سے مکمل طور پر نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

''آصف خان سے کہو کہ ہم تاج و تخت کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے۔'' یکایک شہریار کے لہجے سے غصہ جھلکنے لگا تھا۔ ''وہ سنگدل انسان ہمیں کم سے کم زندہ تو رہنے دے۔''

''اب ہر فریاد بے اثر ہے اور ہر احتجاج رائیگاں۔'' داور بخش، شہریار کو چھوڑ کر ہٹا تو اس کی زنجیریں بج اٹھیں۔ ''اب تو صرف مرگِ ناگہاں کا انتظار ہے۔''

دوسرے دن شہزادہ دانیال کے دونوں بیٹوں طہمورث اور ہوشنگ کو بھی اسی تاریک کوٹھری

میں بھیج دیا گیا۔

پانچوں مغل شہزادوں نے یہ رات بڑے کرب کے عالم میں گزاری۔ ایک لمحے کے لئے بھی ان کی آنکھیں نہیں جھپکیں۔ وہ ہمہ وقت ان جلادوں کا انتظار کرتے رہے، جو ان کے لئے موت کا پیغام لے کر آنے والے تھے۔

آخر وہ خونیں ساعت سروں پر آ پہنچی۔ جلاد تیغ بے نیام لئے ہوئے نمودار ہوئے۔ مغل شہزادوں کی سانسیں شمار کی جا چکی تھیں پھر بھی وہ جلادوں سے رحم کی بھیک مانگتے رہے۔ جلادوں کی سماعتیں بھی بند تھیں اور ان کی آنکھوں پر بھی پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ صرف قتل کرنا جانتے تھے۔

زنداں کی فضا کچھ دیر تک انسانی چیخوں سے گونجتی رہی.....اور پھر ایک ہی وقت میں پانچ مغل شہزادے اپنے خون میں نہا گئے۔ چند لمحوں تک ان کے لاوارث جسم تڑپے اور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ جن کے نازک جسموں کو کل تک پھولوں کی سیج بھی گراں گزرتی تھی، آج وہ خاک و خون میں لتھڑے پڑے تھے۔

❀.....❀.....❀

28 جنوری 1628ء کو شاہجہاں، آگرے کے قریب پہنچا اور دھارا باغ میں اٹھارہ دن مقیم رہا۔ پھر 4 فروری کو اسی مقام پر شاہ جہاں کی تاجپوشی ہوئی۔

جب شاہ جہاں کے سر پر تاجِ زرنگار رکھا جا رہا تھا، اس وقت اُسے مبارک شاہ قلندر بہت یاد آ رہا تھا۔ اچانک شاہ جہاں رک گیا اور اپنے خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے بولا۔

''میری خواہش ہے کہ مبارک شاہ قلندر بھی تاجپوشی کی اس تقریب میں شریک ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی کئی خدمت گار گھوڑوں پر سوار ہو کر فتح پور سیکری کی طرف دوڑ پڑے۔

شاہ جہاں کے خدام نے مبارک شاہ کو بہت ڈھونڈا مگر دُور دُور تک اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار کے قرب و جوار میں رہنے والے فقیروں نے شاہی خدمت گاروں کو بتایا۔

''مبارک شاہ، رات کے اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا۔ صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو وہ اپنی جھونپڑی میں موجود نہیں تھا۔''

گداگر آخر مبارک شاہ کے بارے میں کیا بتاتے کہ نور جہاں نے اُسے رات کی تاریکی میں گرفتار کرا کے قید خانے میں ڈال دیا تھا۔

شاہی خدمت گار، ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے۔ قلندر کے غائب ہو جانے کی خبر سن کر شاہ جہاں اُداس ہو گیا تھا۔

قلندر کو شہر بدر تو نہیں کر دیا گیا؟.....شاہ جہاں نے سوچا.....اُس کی جلاوطنی کے زمانے

میں کہیں قلندر کو قتل نہ کر دیا گیا ہو۔ مرحوم شہنشاہ جہانگیر ہمیشہ مبارک شاہ سے ناراض رہتا تھا۔ کہیں حکمراں کے اشارے پر کسی جلاد نے قلندر کو زندگی کی قید سے آزاد نہ کر دیا ہو.....شاہ جہاں کے ذہن میں مختلف اندیشے سر اُبھار رہے تھے۔

مجبوراً اس نے تاج اپنے سر پر رکھا لیکن شاہ جہاں کے دل میں یہ حسرت کروٹیں لیتی رہی کہ کاش! مبارک شاہ بھی تاجپوشی کی اس تقریب میں شریک ہوتا۔

جب شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا تو اس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بار بار اس فرمانِ الٰہی کو زیرِ لب دہرا رہا تھا۔

''خدا جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے اور سارے جہانوں کا مالک ہے۔''

تاجپوشی کے بعد شاہ جہاں، دیوانِ خاص میں پہنچا۔ یہاں تمام امراء نے اپنے شہنشاہ کو حسبِ استطاعت قیمتی نذریں پیش کیں۔

پھر دیوانِ خاص سے اُٹھ کر شاہ جہاں، حرم سرا میں داخل ہوا۔ وہاں ارجمند بانو، جہاں آرا اور دوسری خواتین نے اسے گھیر لیا۔ ہر گوشے سے مبارک بادوں کا شور اُبھر رہا تھا۔

سب سے پہلے ارجمند بانو نے اپنے شوہر کو مبارکباد پیش کی۔

''شاہِ والا! میں آپ کو کیا پیش کروں کہ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں، جو آپ کے شایانِ شان ہو۔'' یہ کہہ کر ارجمند بانو رونے لگی۔

شاہ جہاں نے بے قرار ہو کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''یہ تمہارا انکسار ہے ارجمند بانو!.....ورنہ تم نے ہمیں وہ تحفہ پیش کیا ہے کہ اس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج زر و جواہر سے بھرے ہوئے خوان ہماری نظروں میں بے حقیقت ہیں۔ تمہاری رفاقت و محبت دنیا کی سب سے قیمتی نذر ہے۔ تم نے ہماری خاطر سارے عیش و آرام ٹھکرا دیئے۔ ہم اس وقت کو کبھی نہیں بھول سکتے، جب ہندوستان کی زمین ہمارے لئے تنگ ہو چکی تھی۔ ایسے سنگین لمحات میں بس ایک تمہاری ہی ذات ایسی تھی جس نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا.....کاش! ہم بھی تمہاری جاں نثاریوں کا قرض ادا کر سکتے۔ مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہمیں تمام عمر اس بات پر فخر رہے گا کہ ہم تمہاری محبتوں کے مقروض ہیں۔ ارجمند بانو! ہم نے سب کے قرض اُتار دیئے.....اور جو باقی ہیں، انہیں بھی ادا کر دیں گے۔ لیکن ہم تمہارا قرض اُتارنے کی ہمت نہیں رکھتے۔''

ارجمند بانو نے سر جھکا دیا۔

''شاہِ والا! یہ کنیز کل بھی اپنی قسمت پر نازاں تھی اور آج بھی اسے اس نسبت پر فخر ہے۔ مجھے اس کے سوا کچھ نہیں چاہئے کہ زندگی کے ہر معرکے میں آپ سربلند اور سرخرو رہیں۔''

شاہ جہاں نے تمام بیگمات کو قیمتی تحائف دیئے۔ آخر میں اس نے اپنی بیوی ارجمند کو دو

لاکھ اشرفیاں اور چھ لاکھ روپے بطور تحفہ پیش کئے۔ اس کے علاوہ دس لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ آٹھ لاکھ روپے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے لئے مخصوص کر دیئے۔

آخر میں شاہ جہاں نے ایک اور اعلان کیا جس کے مطابق ارجمند بانو کو ''ممتاز محل'' خطاب دیا گیا تھا۔ یہ ایک منفرد خطاب تھا، جس سے شاہ جہاں کی بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا تھا۔

اس موقع پر ارجمند بانو نے ایک ادائے خاص کے ساتھ سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''شاہِ والا! آپ تو مجھے اسی نام سے یاد کیا کریں۔ میں تو آپ کی وہی ارجمند ہوں۔''

''نہیں۔ جب ہم شاہ جہاں ہو سکتے ہیں تو پھر تمہیں بھی ممتاز محل ہونا چاہئے۔'' شہنشاہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ آنے والی صدیاں بھی تمہیں اسی نام سے پکاریں۔ یہ ہمارا پسندیدہ نام ہے۔ جب ہم جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اسی وقت ہم نے سوچ لیا تھا کہ اگر خدا ہمیں اقتدار بخشے گا تو ہم تمہیں ممتاز محل کہہ کر آواز دیں گے۔ ہماری نظروں میں تم دنیا کی ساری خواتین سے ممتاز ہو۔''

جوشِ مسرت سے ممتاز محل کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ دھندلی آنکھوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی، جس کے چہرے پر ایک عجیب سی روشنی تھی۔ خواتین کی موجودگی کے باوجود ممتاز محل نے شاہ جہاں کی آنکھوں کو بغور دیکھا۔ یہ وہی آنکھیں تھیں، جنہوں نے عہدِ نوجوانی میں اس کی راتوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ آج ان ہی آنکھوں میں محبت کا ایک نیا سمندر موجزن تھا۔

۞.....۞.....۞

اب ملک کے گوشے گوشے میں شاہ جہاں کے نام کے خطبے پڑھے جا رہے تھے۔ اس نے اپنے لئے ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی کا لقب پسند کیا تھا۔ مغل فرمانرواؤں میں صاحبقران اوّل امیر تیمور کو کہا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے شاہ جہاں نے صاحبقران ثانی کا لقب اختیار کیا تھا۔

ابھی تاج پوشی کا جشن جاری تھا کہ شاہ جہاں نے اپنے وفادار امراء اور سپاہیوں کو مختلف خطابات سے نوازا اور ان کے دامن قیمتی انعامات سے بھر دیئے۔ سب سے بڑا اعزاز، آصف خان کو دیا گیا۔ یہی وہ شخص تھا، جس نے بڑے تدبر اور حوصلے سے شاہ جہاں کے اقتدار کے لئے ایک طویل جنگ لڑی تھی۔ آصف خان ایک ذہین انسان تھا۔ اس نے حالات کے نشیب و فراز کا بغور جائزہ لیا..... اور وقت کے تقاضوں کے مطابق شاطرانہ چالیں چلیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ جب آصف خان نے بظاہر شاہ جہاں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن درپردہ وہ اپنے داماد کے اقتدار کے لئے راہیں ہموار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی غیر معمولی ذہانت نے شاہ جہاں کے تمام حریفوں کو راستے سے ہٹا دیا۔ شاہ جہاں اپنے خسر کی اس شفقت سے بہت متاثر تھا۔ نتیجتاً

اس نے مغل سلطنت کا سب سے بڑا منصب، آصف خان کو بخشا اور اس کے ساتھ ہی ''چچا'' کا خطاب بھی دیا تاکہ ہر شخص، آصف خان کا احترام کر سکے۔

جب تاجپوشی کے جشن کا ہنگامہ سرد ہوا تو شاہ جہاں کو انتہائی شدت سے مبارک شاہ کی یاد آنے لگی۔

''آخر مبارک شاہ قلندر کہاں چلے گئے؟'' شاہ جہاں نے ممتاز محل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرے سر پر تاجِ زرنگار دیکھنا چاہتے تھے۔ جب اُن کی خواہش کی تکمیل کا وقت آیا تو خود ایسے غائب ہوئے کہ اپنے پیچھے کوئی نشان تک نہیں چھوڑا۔'' شاہ جہاں بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ ''یہ مبارک شاہ قلندر تمہیں اس وقت ملکۂ عالیہ کہہ کر پکارتے تھے، جب تم نے اس منصب کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔''

ارجمند بھی افسردہ نظر آنے لگی۔

''آج مجھے بھی ان کی بڑی شدت سے یاد آ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے نہ ہونے سے زندگی میں کمی آ گئی ہے۔''

شاہ جہاں کئی دن تک پریشان رہا۔ آخر اس نے آصف خان سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔

''مبارک شاہ کو کہاں ڈھونڈا جائے؟''

آصف خان کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اُس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''ملک کے گوشے گوشے میں اعلان کرا دیا جائے کہ جو شخص بھی قلندر کا پتہ بتائے گا، اسے انعام سے نوازا جائے گا۔''

یہ ایک مناسب مشورہ تھا، جس کے نتیجے میں شاہ جہاں کے گماشتے گلی گلی پھرنے لگے اور عام لوگ اس شخص کو ڈھونڈنے لگے، جس کا حلیہ مبارک شاہ سے ملتا تھا۔

آخر ایک دن نور جہاں کے وہ معتمد سپاہی، شاہ جہاں کے پاس آئے، اس کے قدموں میں گر کر اپنی جاں بخشی کی درخواست کی جنہوں نے مبارک شاہ کو قید کر کے ایک خفیہ تہہ خانے میں پہنچایا تھا۔

''اگر ظلِ الٰہی ہماری جاں بخش دیں تو ہم مبارک شاہ کا پتہ بتا سکتے ہیں۔'' سپاہی شاہ جہاں کے قدموں سے لپٹے زار و قطار رو رہے تھے۔

''ہم تمہیں معاف کر دیں گے۔ مگر خدا کے لئے، ہمیں مبارک شاہ کا پتہ بتا دو۔'' شاہ جہاں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

جاں بخشی کا حکم سن کر سپاہیوں نے لرزتی آواز میں کہنا شروع کیا۔

''شاہِ والا! ہم ملکہ نور جہاں کے حکم پر مجبور تھے۔ ہم ہی بدنصیب ہیں، جنہوں نے مبارک شاہ کو گرفتار کر کے ایک خفیہ تہہ خانے تک پہنچا دیا تھا۔''

شاہ جہاں جوشِ اضطراب میں تخت سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اگر میں تم سے جاں بخشی کا وعدہ نہ کر چکا ہوتا تو اس وقت تمہاری لاشیں فرش پر تڑپ رہی ہوتیں۔ تم سیاہ کاروں نے ایک پاکیزہ انسان کو جو آزار پہنچائے ہیں، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جاؤ! میری نظروں سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاؤ۔''

یہ کہہ کر شاہ جہاں اس خفیہ تہہ خانے کی طرف بڑھنے لگا، جہاں مبارک شاہ قلندر قید تھا۔

۞.....۞.....۞

شاہ جہاں مختلف راستوں سے گزرتا ہوا اس تہہ خانے تک پہنچا، جہاں مبارک شاہ قلندر کو قید کیا گیا تھا۔

شاہ جہاں نے قلندر کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت زیادہ کمزور اور شکستہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم پر تازیانوں کے بے شمار نشانات تھے۔ چہرے پر بھی کئی زخم موجود تھے، جو بظاہر بھر گئے تھے لیکن پھر بھی گہرے نشانات چھوڑ گئے تھے۔

شاہ جہاں کو دیکھ کر قلندر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ نمایاں تھی۔

''آؤ شاہ جہاں!.....آؤ۔'' قلندر نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں خدا کی یہ بے پناہ بخشش و عطا مبارک ہو۔''

شاہ جہاں نے آگے بڑھ کر قلندر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

''بالآخر آپ کی دعائیں رنگ لائیں۔'' شاہ جہاں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا یہ خادم، شاہ جہاں ہزار دُشواریوں کے باوجود تختِ شاہی تک پہنچ گیا۔''

''خدا کی یہی مرضی تھی۔'' قلندر نے مختصراً کہا۔

''میں ان دنوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، جب آپ ایک کمزور شہزادے کو شاہ جہاں کہہ کر پکارتے تھے.....اور مصائب میں گھرے ہوئے ایک انسان کے لئے اقتدارِ اعلیٰ کی پیش گوئی کرتے تھے۔'' شاہ جہاں بڑے اثر انگیز لہجے میں بول رہا تھا۔ ''آج تو ساری دنیا، شاہِ والا اور ظلِ الٰہی کہہ کر پکارتی ہے، مگر آپ کی طرح پکارنے والا کوئی نہیں۔''

مبارک شاہ قلندر مسکرایا۔ ''شاہ جہاں! اس میں میرا کیا کمال ہے؟''

''اس لہجے کے خلوص اور محبت کو میں خوب پہچانتا ہوں۔'' شاہ جہاں، قلندر کے سامنے کچھ اور خم ہو گیا تھا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری عدم موجودگی میں آپ کو اتنے آزار بھی پہنچائے جا سکتے ہیں۔''

''جو گزر گئی، سو گزر گئی۔'' قلندر نے بے نیازانہ کہا۔ ''یہ آزار میری تقدیر میں لکھے ہوئے تھے۔ انہیں کوئی نہیں ٹال سکتا تھا۔''

''آپ ان لوگوں کے بارے میں حکم دیں، جنہوں نے آپ کے جسم پر تازیانے برسائے ہیں۔'' شاہ جہاں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

''جن لوگوں نے میرے جسم پر زخموں کی گل کاریاں کی ہیں، وہ بہت مجبور انسان تھے۔'' قلندر نے اپنے تکلیف دہ ماضی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ان مجبور انسانوں سے اپنے زخموں کا کیا حساب طلب کروں گا؟.....وہ تو کسی اور کے اشارے پر مجھے تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ میں تو ان لوگوں کو بھی معاف کرتا ہوں، جو مکمل با اختیار تھے۔ اب کسی کی طرف میرا کوئی حساب نہیں۔''

''پھر انصاف کس طرح ہو گا؟'' شاہ جہاں نے بڑے کرب کے عالم میں پوچھا۔

''تیرے باپ نے میری طرف سے چشم پوشی کر لی تھی۔'' قلندر نے کہا۔ ''مجھے دوبارہ نور جہاں کے کہنے پر گرفتار کیا گیا.....وہ مجھ سے ہندوستان کی حکومت خریدنا چاہتی تھی.....مگر اُس نادان عورت کو کیا معلوم کہ مبارک شاہ تو خود کسی کے در کا بھکاری ہے.....جسے ایک وقت کی روٹی میسر نہیں، وہ کسی کے ہاتھ ہندوستان کی اتنی بڑی حکومت کس طرح فروخت کر سکتا ہے؟.....بس میری خاموشی نے اس عورت کو تشدد پر اُکسایا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اُس کے شوہر کو سجدہ کر لوں اور ہندوستان کی حکومت اُس کے داماد شہریار کے ہاتھ بیچ دوں.....اُس نے ایک بھکاری کو بہت غلط سمجھا.....حکومت تو صرف تیرا مقدر تھی۔ بھلا ایک حقیر انسان، خدائی فیصلوں میں کس طرح مداخلت کر سکتا ہے؟ اگر ساری کائنات مل کر بھی کوشش کرے تو ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''اگر آپ حکم دیں تو میں اس اذیت رسانی کے سلسلے میں ملکہ نور جہاں سے جواب طلب کر سکتا ہوں۔'' شاہ جہاں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''آپ کے جسم پر یہ زخم مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔''

''وہ ایک رشتے سے تیری ماں بھی ہے شاہ جہاں!'' قلندر نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ''ماں کا احترام کر.....جہاں تک میرا سوال ہے تو میں ایک بیوہ اور مجبور عورت سے کیا حساب طلب کروں گا؟.....وہ تو خود بے چاری بیک وقت کئی عذابوں میں مبتلا ہے۔'' یہ کہہ کر قلندر چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میرے زخموں کی فکر نہ کر شاہ جہاں!.....اگر ان زخموں سے اندھیری رات میں کوئی دُھندلا چراغ بھی جل جائے تو میں سمجھوں گا کہ میرے جسم و جاں کا سرمایہ کسی کے کام آ گیا۔ بھول جا گزری باتوں کو.....مستقبل کی طرف دیکھ کہ تجھے کیا کرنا ہے.....یہ امانت جو تجھے سونپی گئی ہے، شیشے سے بھی زیادہ نازک ہے.....اگر تیری بے پروائی سے اسے ذرا سی بھی ٹھیس لگ گئی تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔''

شاہ جہاں حیرت سے مبارک شاہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''جو چلے گئے، سو چلے گئے۔ اُن کا خیال چھوڑ دے۔'' قلندر نے کہا۔ ''جو زندہ ہیں، انہیں دردناک موت سے بچانے کی کوشش کر.....خدا نے تجھے طاقت دے کر نئی آزمائش میں ڈال دیا ہے.....یہ آزمائش بہت سخت ہے۔ عنقریب تجھ سے بھی حساب طلب کیا جائے گا۔''

قلندر کی باتیں سن کر شاہ جہاں کانپ گیا۔ پھر بہت عاجزی کے ساتھ کہنے لگا۔

''بابا! میں نے تاج پوشی کے دن آپ کو بہت تلاش کیا مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ آپ شاہی محل کے ایک تہ خانے میں قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں..... میں بہت شرمندہ ہوں کہ میرے ہی عزیزوں کے ہاتھوں آپ کو یہ آزار اُٹھانا پڑے۔''

''میں نے تیرے سارے عزیزوں کو معاف کر دیا۔ خدا بھی انہیں معاف کر دے۔'' مبارک شاہ نے انتہائی شگفتہ لہجے میں کہا۔ ''ماضی کی یادوں کو اپنے ذہن سے کھرچ دے شاہ جہاں!..... گزری ہوئی باتوں میں اب کچھ نہیں رکھا ہے۔''

''بابا! میری خواہش ہے کہ آپ ایک بار دربار میں ضرور تشریف لائیں۔'' شاہ جہاں نے رک رک کر کہا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں قلندر انکار نہ کر دے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ مبارک شاہ نے فوری طور پر رضامندی کا اظہار نہیں کیا۔ ''مجھے دربارِ شاہی سے کیا نسبت ہے؟..... مگر تیری خاطر ایک دن ضرور آؤں گا۔''

''آپ ابھی کیوں نہیں چلتے؟'' شاہ جہاں نے عاجزی کے ساتھ کہا۔ ''مجھے یہ اعزاز بخشنے میں آپ کو تامل کیوں ہے؟''

''ابھی وقت نہیں آیا ہے۔'' مبارک شاہ نے مبہم انداز میں کہا۔ شاہ جہاں اس راز کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ خاص وقت کب آئے گا۔

پھر شاہ جہاں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ قلندر کی جھونپڑی کو پختہ مکان میں تبدیل کر دے۔

مبارک شاہ کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''کیسی نادانی کی باتیں کرتا ہے شاہ جہاں! ہم خانماں بربادوں کو پختہ مکانوں سے کیا غرض؟ چار تنکیوں کا یہ آشیانہ بھی بہت ہے۔ کسی دن تیز ہوا چلے گی تو یہ بھی بکھر جائے گا۔''

شاہ جہاں نے بہت اصرار کیا مگر قلندر نے نہ کوئی نذر قبول کی نہ اپنی جھونپڑی کو پختہ بنوانے پر آمادہ ہوا اور نہ محل کے کسی گوشے میں رہائش پسند کی۔ بس قید خانے سے نکلا اور شاہ جہاں کو دعائیں دیتا ہوا حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار کی طرف چلا گیا۔

۞.....۞.....۞

شاہ جہاں نے تخت نشیں ہوتے ہی اپنے باپ دادا کی برسوں پرانی رسم سجدہ کو ختم کر دیا۔

''اہلِ دربار! یہ ایک کافرانہ رسم تھی، جسے آج میں ہمیشہ کے لئے ختم کر رہا ہوں۔'' شاہ جہاں نے پُر جلال انداز میں اپنے امراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سجدہ صرف خالقِ حقیقی کے لئے جائز ہے۔''

شاہ جہاں کے اس اعلان کے بعد مہابت خان نے انتہائی ادب کے ساتھ کہا۔

''شاہِ والا! یہ ایک سجدۂ تعظیمی ہے۔ اس سجدے کو نماز کے سجدے سے مماثلت نہیں دی جا سکتی۔''

''جو سجدہ بھی نماز کے سجدے سے مماثلت رکھتا ہے، میں اسے حرام سمجھتا ہوں۔'' شاہ جہاں کے لہجے میں بڑا جلال تھا۔

مہابت خان خاموش ہو گیا۔

''میں تو چاہتا ہوں کہ بادشاہ کے لئے بھی اسی سلام کو روا رکھا جائے، جسے ہمارے مذہب میں ایک عام مسلمان کے لئے جائز قرار دیا ہے۔'' شاہ جہاں نے بلند آواز میں اعلان کیا۔

اس موقع پر مہابت خان خاموش نہ رہ سکا۔ ''بادشاہ اور عام انسانوں میں ایک نمایاں فرق رکھنا ضروری ہے۔''

دوسرے درباری بھی مہابت خان کی رائے سے متفق تھے۔

پھر سجدے کے بجائے زمین بوسی کی رسم قائم کی گئی۔ رسم سجدہ اور زمین بوسی میں بہت کم فرق تھا۔ دربار میں سجدے کا طریقہ یہ تھا کہ بادشاہ کو سلام پیش کرنے والا گھٹنوں کے بل جھک کر اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیتا تھا۔ (نماز کا سجدہ بھی اسی طرح ادا کیا جاتا ہے) اس کے برعکس زمین بوسی کا طریقہ یہ تھا کہ سلام کرنے والا نصف قد تک جھک جاتا تھا اور پھر زمین چھو کر دونوں ہاتھوں کو اپنی پیشانی تک لے جاتا تھا۔

کچھ دن بعد شاہ جہاں کو خیال آیا کہ اکبر اور جہانگیر کی قائم کردہ رسم سجدہ اور زمین بوسی کی رسم میں برائے نام فرق ہے۔ شاہ جہاں کو اپنے دل و دماغ پر ایک عجیب سے دباؤ کا احساس ہوا۔

''شاہ جہاں! ایک مسلمان حکمران کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنے سامنے اس طرح جھکائے..... یہ کھلا ہوا غیر شرعی عمل ہے..... اس رسم سے انتہائی غرور و تکبر کا مظاہرہ ہوتا ہے۔''

شاہ جہاں نے ایک رات تنہائی کے عالم میں اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر دوسرے دن اس نے زمین بوسی کی رسم کو بھی ختم کر دیا۔

''اس رسم سے بھی کافرانہ روش کا اظہار ہوتا ہے۔'' شاہ جہاں نے اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

زمین بوسی کی رسم کو ختم کرنے کے بعد شاہ جہاں نے ''چہار تسلیم'' کی رسم رائج کی۔ اس رسم کے مطابق ایک درباری کو نیم خم ہو کر چار بار سلام کرنا پڑتا تھا۔ صوفیاء اور علماء اس رسم کے پابند نہیں تھے۔ وہ لوگ ایک عام مسلمان کی طرح بادشاہ کو بھی اسلامی طریقے سے سلام کرتے تھے۔

جب سجدے کی رسم مکمل طور پر ختم ہو گئی تو ایک دن مبارک شاہ قلندر، دربارِ شاہی میں پہنچا۔ قلندر کے جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ ہر درباری اپنی جگہ ساکت نظر آ رہا تھا۔ خود شاہ جہاں کی یہ کیفیت تھی کہ اس نے تخت سے نیچے اُتر کر مبارک شاہ قلندر کا استقبال کیا۔

مبارک شاہ نے چاندی کا ایک روپیہ بطور نذر شاہ جہاں کو پیش کیا۔ فرمانروائے ہند، قلندر کے اس عمل سے بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

''مبارک ہے یہ دن، جب آپ دربار میں تشریف لائے اور اللہ کے اس حقیر بندے شاہ جہاں کو سرفراز کیا۔''

قلندر تخت کے نیچے کھڑا رہا۔ اور پھر اچانک اہلِ دربار سے مخاطب ہوا۔

''اے لوگو! خدا نے ہر انسان کو ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا کیا ہے۔ پھر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے ہی ہم جنس کی گردن میں غلامی کا طوق ڈال دے۔ ازل سے اللہ کا یہی مزاج ہے کہ اللہ پست کو بلند کر دیتا ہے اور بلندی کے غرور میں مبتلا رہنے والوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ تم نے اللہ کی زمین کو غور سے نہیں دیکھا کہ وہاں کیسے کیسے زور آوروں کی قبریں بنی ہوئی ہیں..... یہ وہ لوگ تھے کہ جن کے نقاروں سے فضائیں گونجتی تھیں۔ مگر آج ان کے مقبروں پر جا کر دیکھو تو ویرانیوں کے سوا کچھ نہیں..... تنہائی مرثیے پڑھ رہی ہے اور بے چارگی، ماتم کر رہی ہے۔ زرق برق لباسوں میں ملبوس اور عطر کی خوشبو میں بسے ہوئے جسم گل کر خاک ہو گئے اور حشرات الارض نے ان کی ہڈیوں تک کو چاٹ لیا..... تم بھی ان ہی کی طرح انسان ہو اور ایک دن موت کے دراز ہاتھ تمہیں بھی کھا جائیں گے..... اس سے پہلے کہ تمہیں دو گز زمین کے حوالے کر دیا جائے، اپنی حقیقت کو سمجھو اور خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر مت چلو..... بندگانِ خدا کے حقوق کو پہچانو اور طاقت کے نشے میں بے گناہ انسانوں کا خون بہانے سے گریز کرو۔''

دربارِ شاہی پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ قلندر کی زبان تیغ بے نیام کی مانند تھی۔ یہ وہی مردِ مومن تھا، جس نے جہانگیر کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اور قلندر ہی کی شخصیت سے متاثر ہو کر شاہ جہاں نے یہ کافرانہ رسم ختم کر دی تھی۔

''اے لوگو! مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا..... اگر خدا کے آخری رسول (ﷺ) کے بتائے ہوئے راستے پر چلو گے تو ہمیشہ عافیت کے سائے میں رہو گے اور تمہارا وقار بلند ہو گا..... اگر تم نے اپنے نفس کی اطاعت کی تو خدا بے نیاز ہے۔ وہ کسی دوسرے جابر کو تم پر مسلط کر دے گا۔ ان لمحات کو غنیمت جانو کہ تمہارے درمیان ایک ایسا بادشاہ موجود ہے، جو اپنے خدا سے ڈرتا ہے۔''

یہ کہہ کر مبارک شاہ قلندر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور پھر اُس نے شاہ جہاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں شہزادہ اورنگ زیب سے ملنا چاہتا ہوں..... اسے دیکھے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں۔''

شاہ جہاں اور دوسرے درباریوں کو حیرت تھی کہ مبارک شاہ قلندر، اورنگ زیب پر اس قدر مہربان کیوں ہے۔

کچھ دیر بعد اورنگ زیب دربار میں آیا تو نوعمر شہزادہ اپنی اس طلبی پر حیران تھا۔

''بابا مبارک شاہ تم سے ملنا چاہتے ہیں، شہزادے!'' شاہ جہاں نے اپنے بیٹے اورنگ زیب

کو مخاطب کرتے ہوئے قلندر کی طرف اشارہ کیا۔

اورنگ زیب نے حیرت زدہ ہو کر اس بوڑھے کی جانب دیکھا جو اپنی وضع قطع سے ایک عام انسان نظر آتا تھا۔

''آپ کون ہیں بابا؟'' اورنگ زیب چند قدم آگے بڑھا اور مبارک شاہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ یکایک اورنگ زیب کو محسوس ہوا، جیسے اس کے پورے بدن میں آگ کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے۔ شہزادے نے گھبرا کر آنکھیں جھکا لیں۔ ''آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' اورنگ زیب کی آواز بہت مدھم تھی۔

''ایک مجھے ہی نہیں، سارے ہندوستان کو تجھ سے کام ہے۔'' مبارک شاہ قلندر آگے بڑھا اور اس نے شہزادے اورنگ زیب کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تُو تو وہ ہے، جس کا صدیوں سے انتظار ہو رہا تھا..... تیری راہ تکتے تکتے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں..... کبھی تو یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے تُو نہیں آئے گا..... اور یہ زمین اپنے مسیحا کو پکارتے پکارتے ایک دن موت کے منہ کا نوالہ بن جائے گی۔''

شہزادہ اورنگ زیب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور مبارک شاہ قلندر انتہائی وارفتگی کے عالم میں بولے جا رہا تھا۔ ''اب تُو آ گیا شہزادے! میرا کام ختم ہو گیا۔ اب میں سکون کے ساتھ اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔''

اورنگ زیب حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک عام سے بوڑھے شخص کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ جب مبارک شاہ قلندر نے اورنگ زیب کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھے تھے تو اُسے یوں محسوس ہوا تھا، جیسے اُس کی پیشانی جل اُٹھی ہو۔

قلندر نے آخری بار شاہ جہاں کی طرف دیکھا۔

''میرے شہزادے کا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر قلندر جانے کے لئے مڑا۔ چند قدم چل کر وہ دوبارہ پلٹا اور شاہ جہاں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اب تیرا دربار اس قابل ہو گیا ہے کہ اس میں کوئی انسان قدم رکھ سکے۔ تُو نے رسمِ سجدہ ختم کر کے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا لیا..... سجدہ تو بس اسی کے لئے ہے جو اپنی ذات میں تنہا ہے۔''

اتنا کہہ کر قلندر جانے لگا۔ اہلِ دربار نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ سنا، قلندر سے دربار سے جاتے وقت وہی نعرہ بلند کیا، جو اس کا معمول تھا۔ اس نعرے کو اکثر فتح پور سیکری کے رہنے والے آدھی رات کے وقت سنا کرتے تھے۔

''رہے سدا نام اللہ کا۔''

۞.....۞.....۞

پھر جب دربار ختم ہوا تو اورنگ زیب نے اپنے باپ سے پوچھا۔

"بابا! یہ کون شخص ہے؟ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میری آنکھیں جھکی جاتی تھیں.....اور جب اس نے مجھے چھوا تھا تو میرا پورا بدن ایک عجیب سی آگ میں جل اُٹھا تھا۔"

شاہ جہاں کچھ دیر تک خاموش بیٹھا اپنے بیٹے کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اورنگ زیب خاموش ہو گیا تو شاہ جہاں نے اسے قلندر کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

"میرے بیٹے! یہ وہ شخص ہے، جس نے تمہارے دادا، شہنشاہ جہانگیر کو کبھی سجدہ نہیں کیا۔ اس جرم میں اسے بڑی ایذائیں پہنچائی گئیں مگر وہ ہر تشدد کو برداشت کرتا رہا.....ملکہ نور جہاں نے اس کے لاغر و نحیف جسم پر زخموں کی اتنی گل کاریاں کی ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں.....مگر سجدہ تو کجا، اس کی گردن میں ہلکا سا خم بھی نمایاں نہیں ہوا.....وہ بڑا عارف ہے.....اگر اس کی ذات میرے لئے مثال نہ بنتی تو شاید میں بھی سجدے کی کافرانہ رسم کو اس طرح ختم نہیں کر پاتا۔ قلندر کی استقامت نے مجھے بڑا حوصلہ بخشا ہے۔"

اورنگ زیب بہت غور سے اپنے باپ کی باتیں سن رہا تھا۔

"مبارک شاہ قلندر وہ روشن ضمیر بزرگ ہیں کہ انہوں نے بہت سال پہلے میرے شہنشاہ ہونے کی پیش گوئی کر دی تھی۔" شاہ جہاں نے ماضی کے بعض واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"مبارک شاہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں.....تمہاری پیدائش کی خبر سن کر قلندر تمہیں دیکھنے کے لئے بے چین ہو گئے تھے۔ اور آج بھی انہوں نے صرف تمہیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اب تک اس راز کو نہیں سمجھ سکا.....میری رائے ہے کہ تم مبارک شاہ سے تنہائی میں ملو اور یہ پوچھنے کی کوشش کرو کہ انہیں تمہاری ذات سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ وہ پہلے بھی مجھ سے یہ کہہ چکے ہیں کہ میں تمہارا خیال رکھوں۔ آخر اس بات سے ان کا کیا مطلب ہے؟"

باپ کے کہنے پر شہزادہ اورنگ زیب ایک دن مبارک شاہ قلندر کی جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اورنگ زیب کو دیکھ کر مبارک شاہ کے چہرے پر ناقابلِ بیان خوشی کا عکس اُبھر آیا۔

"آؤ میرے شہزادے!" قلندر، اورنگ زیب کو دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر قریب ہی بچھی ہوئی چٹائی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ "بیٹھ جاؤ شہزادے! یہ کوئی معمولی چٹائی نہیں، یہ ہندوستان کا تخت ہے.....تمہارے ماں باپ بھی یہاں آ کر کئی بار بیٹھ چکے ہیں۔"

اورنگ زیب کچھ دیر تک حیرت و پریشانی کے عالم میں اس خاک آلود چٹائی کو دیکھتا رہا۔ قلندر کی باتیں اس کے لئے ناقابلِ فہم تھیں۔

"میں تیرا چہرہ دیکھ کر جی اُٹھتا ہوں شہزادے!" مبارک شاہ قلندر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تیری ذات اس تپتی ہوئی زمین کے لئے موسم کی پہلی بارش ہے۔ خدا تجھے وقت کی ہر گردش سے محفوظ رکھے۔"

اورنگ زیب نے قلندر کی محبت و شفقت میں ڈوبی ہوئی گفتگو سن کر کہا۔ "آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟"

"میری کیا حقیقت ہے؟" قلندر نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "تجھ پر تو خدا مہربان ہے۔"

"شاہ بابا جاننا چاہتے ہیں کہ آخر یہ کیا راز ہے؟" اورنگ زیب نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ایک راز ہے، جسے میں دنیا پر فاش نہیں کر سکتا۔" مبارک شاہ قلندر نے پُرسوز لہجے میں کہا۔ "انشاء اللہ عنقریب ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی کہ یہ کیا راز تھا اور میں تجھے اتنا کیوں چاہتا تھا۔ بظاہر میرا تجھ سے کوئی رشتہ نہیں مگر پھر بھی تُو میرا عزیز ہے۔ اور جہاں جہاں خدا کا نام لینے والے بستے ہیں، وہ سب تیرے عزیز ہیں۔ ہمیشہ اس بات کو یاد رکھنا کہ جس طرح بدی کا بدی سے تعلق ہوتا ہے اسی طرح نیکی کا نیکی سے رشتہ ہوتا ہے.....یہی رشتہ سب رشتوں سے طاقتور ہوتا ہے جو خون کے رشتوں پر بھی غالب آ جاتا ہے۔" قلندر کی گفتگو بہت مبہم تھی۔ اورنگ زیب اپنی نوعمری کے باعث مبارک شاہ کی باتوں کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ قلندر اس راز کو فاش کر دے گا مگر مبارک شاہ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ پُراسرار تھا۔

پھر جب اورنگ زیب واپس جانے لگا تو مبارک شاہ قلندر نے اسے پکار کر کہا۔

"ایک فقیر کی طرف سے یہ نذر قبول کرو۔"

اورنگ زیب ٹھہر گیا۔ مبارک شاہ آگے بڑھا اور اس نے اپنا رومال اُتار لیا جسے وہ اکثر سر پر ڈالے رہتا تھا۔

"برسوں سے یہ تمہاری امانت میرے پاس تھی، جسے آج میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔" مبارک شاہ نے اورنگ زیب کے سر پر رومال باندھتے ہوئے کہا۔ "یہ بظاہر ایک معمولی سوتی کپڑا ہے، مگر اس کی حفاظت کرنا۔"

"یہ کیا ہے بابا؟" اورنگ زیب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وقت تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔" قلندر نے ایک بار پھر مبہم انداز میں کہا۔ "یہ تمہاری دستار ہے۔ جب تم تاجِ شاہی پہنو گے تو تمہیں اس بے قیمت کپڑے کی حقیقت معلوم ہو گی۔"

اورنگ زیب واپس جانے لگا تو قلندر نے اسے دوبارہ آواز دی۔ "کوئی کچھ بھی کہے، مگر میری باتیں کسی کے سامنے نہ دہرانا.....زندگی ایک راز ہے اور اپنا راز کسی پر فاش نہ کرنا۔"

اورنگ زیب اپنے ذہن میں بے شمار اُلجھے ہوئے سوالات لے کر شاہی محل واپس چلا گیا۔ اس نے راستے میں قلندر کے دیئے ہوئے رومال کو اُتار کر اپنے پیرہن کی جیب میں محفوظ کر لیا تھا۔

جب شاہ جہاں نے اس سے قلندر کی ملاقات کے بارے میں پوچھا تو اورنگ زیب کا دل چاہا کہ وہ مبارک شاہ کی تمام باتیں باپ کے سامنے دہرا دے۔ ابھی وہ کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک اسے قلندر کی ہدایت یاد آئی۔

"زندگی ایک راز ہے۔ اور اپنا راز کسی پر فاش نہ کرنا۔"

اس ہدایت کے یاد آتے ہی اورنگ زیب نے اپنی زبان بند رکھی اور شاہ جہاں کو یہ کہہ کر ٹال دیا۔

''قلندر کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی.....وہ مجھ سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آئے۔ میرے لئے دعائیں کیں۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔''

شاہ جہاں بہت دیر تک مبارک شاہ کے بارے میں سوچتا رہا مگر وہ اس راز کو نہ پا سکا کہ آخر قلندر اس کے چھوٹے بیٹے سے اتنی محبت کیوں کرتا ہے۔

۞.....۞.....۞

اسی رات اورنگ زیب سویا تو اس نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ اورنگ زیب نے دیکھا کہ ایک میدان میں بے شمار انسان جمع ہیں اور ان کے ہاتھوں میں بے نیام شمشیریں ہیں۔ یہ انسانی ہجوم تیز رفتاری کے ساتھ اورنگ زیب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لوگ اپنی شمشیریں فضا میں لہرا لہرا کر چیخ رہے ہیں۔

''اورنگ زیب کو قتل کر دو.....اس کا ہندوستان کے تخت و تاج پر کوئی حق نہیں۔''

اورنگ زیب گھبرا جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں۔ اچانک اُس کی نظر مبارک شاہ پر پڑتی ہے، جو تیز قدموں سے اورنگ زیب کی طرف آ رہا ہے..... پھر قلندر، شہزادے کے قریب پہنچ جاتا ہے اور مشتعل انسانی ہجوم کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

''لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟.....ہوش سے کام لو..... یہ تمہارا شہنشاہ ہے۔''

لوگ، قلندر کی باتوں کے جواب میں چیخ کر کہتے ہیں۔ ''نہیں۔ ہمارا شہنشاہ داراشکوہ ہے۔''

''تم نہیں جانتے کہ آسمانوں پر اورنگ زیب کی شہنشاہیت کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔'' قلندر کی پُرجلال آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔ ''کیا تم آسمان کے فیصلے کے خلاف جنگ کرو گے؟''

چیختے ہوئے لوگ یکایک خاموش ہو جاتے ہیں۔

قلندر فوراً ہی اپنے سر کا رومال اُتار کر اورنگ زیب کے سر پر باندھ دیتا ہے۔ یہ وہی رومال ہے جو مبارک شاہ نے اپنی جھونپڑی میں اورنگ زیب کے سر پر باندھا تھا۔ رومال باندھتے ہی انسانی ہجوم نے تلواریں پھینک دیں اور اورنگ زیب کے سامنے اپنے سر خم کر دیئے۔

اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب کی آنکھ کھل گئی۔ بڑا عجیب خواب تھا۔ خوف و دہشت کی وجہ سے نوعمر شہزادے کا پورا جسم پسینے میں تر ہو گیا تھا۔

اورنگ زیب گھبرا کر اُٹھا اور اس نے قلندر کا دیا ہوا رومال اپنے سر پر باندھ لیا۔ دوسرے ہی لمحے اورنگ زیب کو محسوس ہوا، جیسے اسے قرار آ گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب کے کانوں میں قلندر کی آواز گونجنے لگی۔

''زندگی ایک راز ہے.....اور اپنا راز کسی پر فاش نہ کرنا۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ اورنگ زیب، مبارک شاہ کے لئے اپنے دل میں بے پناہ محبت محسوس کرنے لگا۔ فتح پور سیکری کی ایک جھونپڑی میں رہنے والا ایک فاقہ کش انسان آج اس کی نظروں میں بہت زیادہ محترم تھا۔

۞.....۞.....۞

دوسرے دن شہزادہ اورنگ زیب، مبارک شاہ قلندر کے پاس پہنچا اور اپنا خواب بیان کرنے لگا۔

پھر جب وہ ایک ایک لفظ قلندر کے سامنے دہرا چکا تو مبارک شاہ نے اورنگ زیب سے پوچھا۔

''شہزادے! تم نے اپنا یہ خواب کسی شخص کے سامنے بیان تو نہیں کیا ہے؟''

''نہیں بابا!'' اورنگ زیب نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔ مغل شہزادے پر مبارک شاہ قلندر کی ہیبت طاری تھی۔

''کوئی بھی خواب دیکھو، اسے کسی کے سامنے بیان نہ کرنا۔'' مبارک شاہ کی آواز سے انتہائی شفقت جھلک رہی تھی۔ ''تم برساتی نالوں کی طرح نہ ہو جانا، جو ذرا سا پانی پڑنے کے بعد اُبل پڑتے ہیں۔ خدا نے انسان کو سمندر کی طرح گہرا بنایا ہے جس میں بے شمار ندی نالے گر کر فنا ہو جاتے ہیں۔ شہزادے! تم بھی دنیا میں سمندر بن کر رہنا۔ یہاں تنگ تالابوں اور اتھلی ندیوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ تمہاری پوری زندگی آزمائشوں سے بھری ہوئی زندگی ہو گی۔ وہ خواب اسی کڑے امتحان کا ایک دُھندلا سا عکس ہے۔ ہر مصیبت کے وقت صرف اپنے خالق کو پکارنا اور اس زمین پر فرمانبردار بندوں کی طرح رہنا۔ اہلِ دل کو تم سے بڑی اُمیدیں ہیں۔ تم اس حقیر مبارک شاہ کے خواب کی تعبیر ہو۔ اگر تم سے کوئی لغزش ہو گئی تو بڑی بھیانک تباہیاں آئیں گی۔ بس اب تم جاؤ! مجھے کچھ ضروری کام کرنا ہیں۔''

۞.....۞.....۞

اورنگ زیب کے جانے کے بعد مبارک شاہ قلندر اپنی جھونپڑی سے نکلا اور دریائے جمنا کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں گیانی آتمارام کا آشرم تھا۔

گیانی کے محافظ دھرم پال نے مبارک شاہ کو آتے دیکھا تو وہ بھاگ کر آتمارام کے پاس پہنچا۔ اس وقت شعبدہ باز آتمارام ایک جوان اور خوب صورت ہندو عورت سے اپنے پاؤں دبوا رہا تھا۔ یہ وہ بدنصیب عورت تھی، جس کا شوہر ایک طوائف کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مظلوم عورت اس اُمید پر آتمارام کی ناجائز خدمات انجام دے رہی تھی کہ گیانی اپنے منتروں کے

ذریعے اس کے روٹھے ہوئے شوہر کو واپس لے آئے گا۔

دھرم پال نے دروازے پر کھڑے ہو کر چیختے ہوئے کہا۔ ''گیانی! وہ بھکاری مبارک شاہ اس طرف آ رہا ہے۔''

''اُسے یہاں آنے سے روکو۔'' آتمارام گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''یہ بہترین موقع ہے کہ وہ خود چل کر ہماری طرف آ رہا ہے۔ دھرم پال! اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ اس بھکاری کو ہلاک کر دیں اور پھر اس کی لاش جمنا کے پانی میں بہا دیں۔''

دھرم پال تیزی سے پلٹا اور چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو آوازیں دینے لگا۔ چند لمحوں میں پندرہ مسلح آدمی جمع ہو گئے۔ یہ سب کے سب گیانی کے ٹکڑوں پر پلتے تھے اور ہندوستان کے سادہ لوح عوام کے سامنے آتمارام کو دیوتا بنا کر پیش کرتے تھے۔

مبارک شاہ قلندر بے نیازانہ آگے بڑھتا رہا اور پھر جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر دھرم پال سے مخاطب ہوا۔

''تمہارا گیانی آتمارام کہاں ہے؟''

''تُو اس سے نہیں مل سکتا۔'' دھرم پال نے بڑے ناشائستہ لہجے میں جواب دیا۔ ''گیانی کا حکم ہے کہ تجھے قتل کر کے اس دھرتی کے بوجھ کو ہلکا کر دیا جائے۔'' اس کے ساتھ ہی دھرم پال نے اپنے مسلح ساتھیوں سے کہا۔ ''اس بھکاری کا کام تمام کر دو۔''

گیانی آتمارام کے آدمیوں کے ہاتھوں میں چوڑے پھل کے برچھے اور چمک دار تیر تھے۔

''برائی کے پجاریو! تم بہت نادان ہو۔'' مبارک شاہ قلندر نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''یاد رکھو کہ میری موت تمہارے ہاتھوں سے نہیں لکھی ہے۔''

دھرم پال کے آدمی، قلندر کی بات سن کر سخت برہم ہو گئے اور انہوں نے مبارک شاہ پر اپنے بھالے تان لئے۔ مگر دوسرے ہی لمحے انہیں احساس ہوا کہ ان کے جسم پتھر کے ہو چکے ہیں۔ جو جہاں تھا، اسی حالت میں کھڑا رہ گیا۔

''مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' قلندر نے ان پتھر کے مجسموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف آتمارام کا پتہ پوچھتا ہوں۔''

دھرم پال اور اس کے آدمی اپنی شکستہ حالت پر چیخنے لگے۔ ''مبارک شاہ! ہمیں معاف کر دے کہ ہم تو گیانی کے حکم کے غلام ہیں۔''

''تم اپنی اصلی حالت میں واپس آ سکتے ہو، اگر یہ بتا دو کہ آتمارام کہاں ہے؟''

''وہ جھونپڑی کے اندر موجود ہے۔'' دھرم پال نے انتہائی عاجزانہ لہجے میں کہا۔ جیسے ہی دھرم پال کے الفاظ کی گونج ختم ہوئی، اس کا پتھر جیسا جسم دوبارہ حرکت کرنے لگا۔

مبارک شاہ جھونپڑی کے اندر داخل ہوا مگر آتمارام وہاں موجود نہیں تھا۔ قلندر دوبارہ باہر آ گیا اور اس نے ناگوار لہجے میں دھرم پال سے کہا۔

''تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو..... یہ بات تمہارے حق میں اچھی نہیں ہے۔''

''نہیں مبارک شاہ! میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔'' دھرم پال نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنے زمین دوز کمرے میں چلا گیا ہو گا۔ میرے ساتھ آؤ! میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔''

پھر تھوڑی دیر بعد دھرم پال، مبارک شاہ کو اس کمرے میں لے گیا، جو زیر زمین بنایا گیا تھا۔ قلندر نے اس بدنصیب عورت کو دیکھا جو آتمارام کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھی۔

گیانی کے ہاتھ میں ایک چمک دار خنجر تھا۔ وہ بہت تیزی سے مبارک شاہ پر حملہ آور ہوا، مگر ٹھوکر کھا کر زمین پر گر پڑا۔

''نہیں آتمارام! اب کچھ نہیں ہو گا۔ وقت گزر چکا۔'' قلندر کی پُرجلال آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ ''آج کے بعد سے تُو دوبارہ نہیں اُٹھ سکے گا۔ اب مفلوج زندگی ہی تیرا مقدر ہے۔ ابھی تُو برسوں زندہ رہے گا مگر اس طرح کہ اپنے مرنے کی دعائیں کرے گا اور موت تجھ سے بچ بچ کر گزرے گی۔ تُو نے مخلوقِ خدا کو بڑے آزار پہنچائے ہیں۔ تُو نے اپنے ناپاک عمل سے ہزاروں عورتوں کو ان کے شوہروں سے جدا کر دیا۔ لوگ تیری شعبدہ بازیوں کو دیکھ کر تجھے گیانی کہتے تھے۔ مگر تُو تو بڑا جاہل تھا۔''

یہ کہہ کر قلندر نے جھونپڑی کی چھت کی طرف دیکھا اور بڑے پُرسوز لہجے میں کہنے لگا۔ ''اے خدا! اس کے دست و پا کی طاقت سلب کر لے تاکہ پھر یہ تیرے بندوں کو نقصان نہ پہنچا سکے۔''

جیسے ہی قلندر کے الفاظ کی گونج ختم ہوئی، گیانی آتمارام نے ایک جگر شگاف چیخ ماری۔ اس کا پورا جسم مفلوج ہو چکا تھا۔

''مبارک شاہ! مجھے معاف کر دے۔''

''تیری شعبدہ بازیوں کا دور جہانگیر کے ساتھ ختم ہو چکا۔'' قلندر نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ شاہ جہاں کا عہد ہے اور اس عہد کو تجھ جیسے بدکار انسان کی ضرورت نہیں۔''

یہ کہہ کر مبارک شاہ اس مظلوم عورت سے مخاطب ہوا۔ ''خاتون! تم اپنے گھر کی طرف لوٹ جاؤ۔ تمہارا شوہر واپس آ جائے گا۔''

آتمارام کے آدمی، گیانی کی حالت دیکھ کر کانپ رہے تھے۔

''اسے اُٹھا کر دریا کے کنارے راستے میں ڈال دو تاکہ لوگ اس کی حالت پر رحم کھا سکیں۔'' مبارک شاہ نے دھرم پال اور اس کے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

پھر کچھ دیر بعد آتمارام کے مفلوج جسم کو دریائے جمنا کے کنارے ڈال دیا گیا۔ مبارک شاہ کی روحانی قوت دیکھ کر دھرم پال اور اس کے ساتھی مسلمان ہو گئے۔

آگرہ میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ جس شخص کو شہنشاہ جہانگیر نے بے شمار انعامات سے نوازا تھا، آج وہ دریا کے کنارے بے یار و مددگار پڑا تھا۔ ادھر سے گزرنے والے، آتمارام کی

دردناک چیخیں سنا کرتے تھے۔

''بھگوان کے لئے میرے منہ میں کچھ روٹی کے ٹکڑے اور پانی کے چند قطرے ڈال دو کہ میں بہت مجبور ہوں۔''

۞.....۞.....۞

گیانی آتمارام کے مفلوج ہو جانے کی خبر سن کر آگرہ میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ لوگ اسے دیکھنے کے لئے آتے اور عبرت حاصل کر کے چلے جاتے۔ جس شخص کو شہنشاہ جہانگیر کے دورِ حکومت میں عروج حاصل تھا، آج اس کی زندگی ایک دردناک تماشا بن کر رہ گئی تھی۔ لوگ آتمارام پر ترس کھا کر اس کے منہ میں غذا کے چند لقمے ڈال دیتے۔ گیانی چیخ چیخ کر لوگوں سے کہتا۔

''بھگوان کے لئے مجھے مار ڈالو کہ اب یہ عذاب برداشت نہیں ہوتا۔ اس شہر کا ایک بھکاری بھی مجھ سے زیادہ پُرسکون زندگی گزار رہا ہو گا۔'' گیانی کے آنسو مسلسل بہتے رہتے اور وہ راستہ چلتے لوگوں سے فریاد کرتا رہتا۔ ''لوگو! مجھے زہر دے دو کہ میں سکون کی نیند سو جاؤں۔ یا میرا گلا گھونٹ کر اس پاپی جیون کا انت (خاتمہ) کر دو۔''

لوگ آتمارام کی چیخیں سنتے اور اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے گزر جاتے۔

ایک دن ایک راہ گیر نے ترس کھا کر گیانی کو روٹی کھلانی چاہی تو آتمارام نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔

''میں روٹی نہیں، موت چاہتا ہوں۔''

''میں مسلمان ہوں۔'' راہ گیر نے آتمارام کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے عقیدے کے مطابق موت اپنے وقت پر آتی ہے۔ اگر کسی انسان کو غیر فطری طور پر موت سے ہم کنار کر دیا جائے تو یہ قتل کہلاتا ہے اور قتل ہمارے مذہب میں گناہِ عظیم ہے۔''

''اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ۔'' آتمارام رونے لگا۔ ''مبارک شاہ تک میرا پیغام پہنچا دو کہ وہ بس ایک بار آ کر مجھے دیکھ جائے۔''

آتمارام نے اس قدر عاجزی کے ساتھ راہ گیر سے درخواست کی تھی کہ وہ شخص مجبور ہو گیا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا پیغام مبارک شاہ قلندر تک پہنچا دوں گا۔'' اس شخص نے آتمارام کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارا مجھ پاپی پر بڑا احسان ہو گا۔'' گیانی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ شخص واپس چلا گیا۔ اور پھر مبارک شاہ قلندر سے جا کر ملا۔

''آتمارام بہت خوف ناک عذاب میں مبتلا ہے قلندر!'' اُس شخص نے مبارک شاہ کے سامنے گیانی کی حالت بیان کرتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کروں؟'' مبارک شاہ نے ناگوار لہجے میں کہا۔ ''میں اُس کی حالت کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں نے اُس پر یہ عذاب نازل نہیں کیا ہے۔ آتمارام نے جو بویا تھا، وہی کاٹ لیا۔ اب وہ کس بات کی شکایت کرتا ہے؟''

''وہ اپنے سابقہ اعمال پر بہت نادم ہے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''وہ تم سے بس ایک بار ملنا چاہتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ میں چلنے پھرنے اور اُٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہوں۔ اگر اس قابل ہوتا تو اپنے پیروں سے چل کر خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔''

''مجھ ان کاموں کے لئے فرصت نہیں ہے۔'' مبارک شاہ قلندر نے صریحاً انکار کرتے ہوئے کہا۔

''اس نے تمہیں خدا کا واسطہ دیا ہے قلندر!''

مبارک شاہ چونک کر اس شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ ''وہ اس حال میں بھی فریب کاریوں سے باز نہیں آتا۔ اب میرے خدا کو درمیان میں لے آیا ہے۔'' قلندر، گیانی کی درخواست سن کر پگھلنے لگا۔ اب اُس کے چہرے پر سختی کے بجائے نرمی جھلکنے لگی تھی۔

''تمہیں ایک بار جانا ہی ہو گا قلندر!'' اجنبی شخص نے کہا۔ ''اُس نے بھکاریوں کی طرح تمہیں آواز دی ہے۔''

مبارک شاہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بہت آہستہ لہجے میں اجنبی شخص کو مخاطب کر کے بولا۔ ''تم جاؤ! میں آتمارام سے مل کر دیکھوں گا کہ آخر وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔''

اجنبی شخص نے قلندر کا شکریہ ادا کیا اور اپنے راستے پر چلا گیا۔

پھر جب مبارک شاہ قلندر، گیانی آتمارام کے پاس پہنچا تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں تیرا شکر گزار ہوں مبارک شاہ! کہ تُو یہاں آیا۔'' جوشِ جذبات سے آتمارام کی آواز لرز رہی تھی۔

''مجھے میرے خدا کا واسطہ کھینچ کر یہاں لایا ہے۔'' قلندر نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ ''آج میں تیری عیاریوں کا قائل ہو گیا ہوں کہ اس حالت میں بھی تیرا فتنہ انگیز ذہن خوب کام کر رہا ہے۔''

''نہیں مبارک شاہ!'' آتمارام نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس حادثے کے بعد میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔''

''مجھے تیری باتوں کا یقین نہیں آتا۔'' مبارک شاہ کی آواز میں تلخی پوشیدہ تھی۔ ''ابھی زمین و آسمان تو اپنے محور پر گردش کر رہے ہیں۔ پھر تُو کس طرح بدل گیا؟''

''مجھے میری بے دست و پائی نے بدل ڈالا، مبارک شاہ!'' گیانی آتمارام مسلسل آنسو بہا رہا تھا۔ ''کاش! ایک بار تُو بھی میری بے کسی کا مشاہدہ کر لیتا، میں کتنا مجبور ہوں۔ مجھ سے تو بہتر

وہ بھکاری ہیں، جو صبح سے شام تک چل پھر کر بھیک مانگتے ہیں۔ ذلت کے ساتھ سہی مگر زندگی کا کچھ تو لطف حاصل کر لیتے ہیں۔ اور ایک میں ہوں کہ لوگ مجھے دنیا کا سب سے ناتواں اور بے کس انسان سمجھ کر میرے منہ میں پانی کے چند قطرے ٹپکا دیتے ہیں۔ میں دن رات ادھر سے گزرنے والوں کے سامنے گڑگڑاتا رہتا ہوں۔ اس سے بڑی ذلت اور کیا ہوگی مبارک شاہ؟''

''تُو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟'' قلندر نے آتمارام کی گریہ و زاری کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''جب تیری روحانی طاقت مجھے مفلوج بنا سکتی ہے تو پھر میری التجا ہے کہ میرے حق میں مرنے کی بددعا کر دے۔'' آتمارام کے لہجے سے بڑی شکستگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''تُو غلط سمجھ رہا ہے، آتمارام!'' مبارک شاہ نے بلند آواز میں کہا۔ ''میں اللہ کا ایک عاجز و ناتواں بندہ ہوں۔''

''نہیں مبارک شاہ!..... تجھے تیرے اللہ نے بڑی طاقت بخشی ہے۔'' آتمارام کسی مجبور بھکاری کے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

''میں تو تیری نظر میں خود ایک بھکاری ہوں۔ پھر کسی بھکاری میں اتنی طاقت کہاں سے آ سکتی ہے؟'' مبارک شاہ نے آتمارام کو گزرے ہوئے واقعات کی یاد دلاتے ہوئے کہا جب وہ شہنشاہ جہانگیر اور دوسرے امراء کے سامنے قلندر کو ایک بھکاری کہہ کر پکارتا تھا۔

''وہ میری بھول تھی۔'' آتمارام کے آنسوؤں میں کچھ اور روانی آ گئی تھی۔ ''بھکاری تو میں ہوں، جس کا تماشا ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔''

''کچھ بھی ہو، میں حقیقتاً ایک کمزور انسان ہوں جو صرف اپنے اللہ کے کرم کے سہارے زندہ ہے۔'' یکایک مبارک شاہ کی آواز لرزنے لگی تھی۔ ''اس کے سوا میرا زمین پر کون ہے؟ اگر وہ دستگیری نہ کرتا تو مبارک شاہ کی ذات بھی ایک تماشا بن کر رہ جاتی۔''

''میں تجھے تیرے خدا کا واسطہ دیتا ہوں مبارک شاہ! کہ میرے حق میں موت کی دعا کر دے۔ اب مجھ سے یہ عذاب برداشت نہیں ہوتا۔'' آتمارام کے اختیار میں نہیں تھا، ورنہ وہ اُٹھ کر مبارک شاہ کے پیروں پر سر رکھ دیتا۔''

''وہ اگر چاہے تو ایک پل میں تجھے اس اذیت ناک کشمکش سے نجات دے سکتا ہے۔''

''مبارک شاہ! میں تجھے اسی خدائے واحد کا واسطہ دیتا ہوں کہ میرے حق میں دعا کر۔'' آتمارام ایک بار پھر گڑگڑایا۔

''کیسی دعا؟'' مبارک شاہ قلندر نے آتمارام سے پوچھا۔

''میری صحت کی دعا۔'' آتمارام نے کہا۔

''تاکہ تُو پھر مخلوقِ خدا کو آزار پہنچا سکے؟'' قلندر نے بڑے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں۔ اب میں اللہ کے بندوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔'' آتمارام نے اس بار

پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''اب میری آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹ چکا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اور ارسلان بیگ نے کئی بار تیرے قتل کے منصوبے بنائے مگر تُو ہر مرتبہ محفوظ رہا، تیری حفاظت خدا کر رہا تھا اور ہم پتھر کے مجسموں کی طاقت پر نازاں تھے۔ بالآخر پتھر صرف پتھر ہی ثابت ہوئے۔ ارسلان بیگ اپنے بھیانک انجام کو پہنچ گیا اور میں راستے میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔ اب میں اس راز کی حقیقت تک پہنچ گیا ہوں کہ ایک خدا بے شمار معبودوں پر غالب ہے۔''

مبارک شاہ قلندر بڑی حیرت سے آتمارام کی باتیں سن رہا تھا۔ ''کیا تُو مجھے اس طرح فریب دینا چاہتا ہے؟''

''نہیں۔ میری زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف سچا ہے۔'' آتمارام کا اندازِ گفتگو یکسر بدل گیا۔ ''اب میں تجھ سے بہت محبت کرنے لگا ہوں، مبارک شاہ! میری نظر میں تُو ہندوستان کا سب سے زیادہ سچا انسان ہے۔ نہ تجھے اقتدار کی لالچ ہے اور نہ تُو دولت کی حرص رکھتا ہے۔''

''میری بات چھوڑ دے آتمارام! میں تو کل بھی بھکاری تھا اور آج بھی بھکاری ہوں۔'' مبارک شاہ نے گیانی کی خوشامدانہ گفتگو کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''اُس وقت میں اندھا تھا، مبارک شاہ!'' آتمارام نے کہا۔ ''گزرے زمانے کی بات نہ کر۔ اب مجھے آنکھیں مل چکی ہیں اور میں تیرے چہرے پر ایسی روشنی دیکھ رہا ہوں جو اس سے پہلے میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ میں ایک خدا پر ایمان لے آیا ہوں۔ اب میں نے اپنے باپ دادا کا صدیوں پرانا مذہب ترک کر دیا ہے۔ اس رشتے سے تُو میرا بھائی ہے کیا اب بھی تُو میری مدد نہیں کرے گا؟''

گیانی آتمارام نے عجیب و غریب انکشاف کیا تھا، جسے سن کر قلندر سناٹے میں آ گیا تھا۔

''تُو اس حالت میں ایمان لایا ہے کہ تجھ پر سلامتی کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔'' مبارک شاہ نے آتمارام کے جذبوں پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ ''تُو نے اس وقت خدا کی وحدانیت کا اقرار کیوں نہیں کیا، جب تیرے ہاتھ پاؤں حرکت کر رہے تھے اور تُو خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا۔''

''بے دست و پا ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس کائنات میں سب سے بڑی طاقت موجود ہے اور جسے تُو اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔'' آتمارام نے مبارک شاہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس آفتِ ناگہانی سے دوچار ہونے کے بعد اپنے بے شمار دیوتاؤں کو آواز دی تھی مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ یہاں میرے دیوتاؤں کے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔ مجبوراً میں نے اس کی طرف رجوع کیا۔ اگرچہ میں نے یہ اقرار جبر کے عالم میں کیا ہے لیکن پھر بھی اقرار ہے۔ انکار نہیں۔''

مبارک شاہ خاموشی سے گیانی کی باتیں سنتا رہا۔

''کیا تُو مجھے اب بھی معاف نہیں کرے گا؟'' آتمارام نے قلندر سے پوچھا۔ ''مذہب کے رشتے سے اب میں تیرا بھائی ہوں۔''

مبارک شاہ کچھ دیر تو سوچتا رہا، پھر وہ آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔

''اگر تُو سچے دل سے ایک خدا کا اقرار کر چکا ہے تو پھر واقعتاً تیرے اور میرے درمیان ایک بھائی کا رشتہ موجود ہے۔''

قلندر کے لہجے کی تبدیلی پر گیانی کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔

''جب تُو نے مجھے بھائی کہا ہے تو پھر میں تجھے مایوس نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر قلندر نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''اے علام الغیوب!..... اے دلوں کا حال جاننے والے!..... تُو بہتر جانتا ہے کہ آتمارام کے دل میں کیا ہے؟ تیرا یہ گناہ گار بندہ، مبارک شاہ تو بس اتنی واقفیت رکھتا ہے کہ اس نے اپنی زبان سے تیری وحدانیت کا اقرار کر لیا ہے۔ اس اقرار کے بدلے میں اس کے سابقہ گناہوں کو معاف کر دے۔ اگر آتمارام کے دل میں غبار یا کثافت کی کوئی تہہ باقی رہ گئی ہے تو اپنے رحم و کرم کے صدقے میں اسے آئینے کی طرح صاف کر دے۔ تُو گواہ رہنا کہ اس نے مجھے جس قدر آزار پہنچائے ہیں، میں ان سب کو معاف کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر مباک شاہ قلندر، آتمارام کے قریب آیا اور اس کے مفلوج جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''اے قوی العزیز! اے بے پناہ طاقت رکھنے والے!..... تُو اس بات پر قادر ہے کہ مُردوں میں بھی جان ڈال دے۔ مبارک شاہ تیرے سامنے بھیک کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ آتمارام کے فالج زدہ جسم کو دوبارہ حرکت دے دے کہ یہ تجھ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر سکے۔''

ابھی مبارک شاہ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ آتمارام کو اپنے ناکارہ بدن میں نئی زندگی کا احساس ہوا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اب میں بالکل صحت مند ہوں، مبارک شاہ!'' آتمارام نے جوشِ جذبات میں چیختے ہوئے کہا۔ ''یہ سب تیری دعاؤں کی بدولت ہوا ہے۔ تُو بڑی روحانی طاقتوں والا انسان ہے۔''

یہ کہہ کر آتمارام، مبارک شاہ کے پاؤں چھونے کے لئے آگے بڑھا۔

قلندر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

''ایک خدا پر ایمان لانے کے بعد بھی تیری کافرانہ عادتیں نہیں بدلی ہیں۔''

''میں زندگی میں صرف ایک بار تیرے قدم چھونا چاہتا ہوں، مبارک شاہ!'' گیانی آتما رام نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''آج تک میں بے جان پتھروں، درختوں اور جانوروں کے آگے سر جھکاتا رہا ہوں۔ پھر مجھے اپنے پاؤں چھونے کیوں نہیں دیتا؟ تیری ہی وجہ سے تو مجھے ہدایت ملی ہے۔''

''آخر تُو میرے پاؤں چھونا کیوں چاہتا ہے؟'' مبارک شاہ نے پوچھا۔

''اپنی محبت اور عقیدت کے اظہار کے لئے۔'' آتمارام نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

''یہی عقیدت تو انسان کو گمراہی کے راستے پر لے جاتی ہے۔'' مبارک شاہ کی آواز سے جلالِ روحانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''پہلے وہ اپنے ہم جنس کے ہاتھ چومتا ہے، پھر قدموں پر سر رکھ دیتا ہے اور آخر میں پرستش کے لئے اسی شخص کا بت تراش لیتا ہے۔''

آتمارام لاجواب ہو کر رہ گیا۔

''اگر تجھے مجھ سے محبت ہے تو اہلِ ایمان کی طرح محبت کر۔'' مبارک شاہ نے کہا۔ ''میں بھی تیری طرح ایک فانی انسان ہوں اور کسی فانی شے سے محبت کرنا محض دیوانگی ہے۔''

''پھر میں اپنے جذبات کو کہاں لے جاؤں؟'' آتمارام کی آواز میں دل کا سوز شامل تھا۔

''میرے بجائے خدا کے بندوں سے محبت کر۔ مگر اس طرح کہ تیرا دل، خدا کی محبت سے خالی نہ ہو جائے۔'' مبارک شاہ نے آتمارام کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''محبت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے بندوں کو حقیر خیال نہ کر۔ ان کے دُکھ درد میں کام آ..... اور راہ بھٹک جانے والوں کو سیدھے راستے کی طرف بلا۔'' یہ کہہ کر مبارک شاہ واپس جانے لگا۔

''مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے قلندر؟'' آتمارام نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''تیرے بغیر تو مجھے ایک لمحہ گزارنا بھی دُشوار ہو جائے گا۔''

''اللہ کے سوا ہر شے فنا ہو جانے والی ہے۔'' مبارک شاہ نے جواباً کہا۔ ''اسی سے دل لگا۔ پھر تجھے تنہائی کا احساس نہ ہو گا''

''مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل قلندر! تجھ سے بچھڑ کر میرا دل نہیں بہل سکتا۔'' آتمارام بچوں کی طرح مچل گیا۔

قلندر نے اپنا دامن بچانے کی بہت کوشش کی۔ کئی عذر تراشے مگر آتمارام نہیں مانا۔ مجبوراً مبارک شاہ اُسے اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔

''کیا تُو اس جگہ رہنا پسند کرے گا، جہاں گرد و غبار کے سوا کچھ نہیں؟'' مبارک شاہ نے اپنی شکستہ جھونپڑی کے در و دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو پھر بھی ایک محفوظ جگہ ہے۔'' آتمارام نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''میں تو تیرے ساتھ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کے درمیان رہ سکتا ہوں۔ اب تُو ہی میرا رہنما ہے..... اور تُو ہی میرا مسیحا''

آتمارام اس قدر عقیدت مندانہ لہجے میں بول رہا تھا کہ مبارک شاہ بھی اس کی گفتگو سن کر بے قرار ہو گیا۔

''اب تیری یہی خواہش ہے تو رہ جا ہم فقیروں کے ساتھ۔'' قلندر نے آتمارام کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں بھوک کے سوا کچھ نہیں۔''

''تیرے ساتھ بھوکا رہنے میں بھی ایک خاص لذت ہے۔'' آتمارام کے لہجے میں بڑی

سچائی تھی۔ قلندر اُس کی باتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔

اور پھر آتمارام نے زبانی دعوے کو اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔

وہ دن بھر مبارک شاہ کے ساتھ مزدوری کرتا، پھر شام کو نصف سے زیادہ آمدنی غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔ صرف دو سوکھی روٹیاں کھاتا اور قلندر سے روحانی تعلیم حاصل کرتا۔

گیانی آتمارام کے مسلمان ہو جانے سے آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ قرب و جوار کے ہزاروں ہندو فتح پور سیکری پہنچتے اور مبارک شاہ قلندر کے ہاتھوں پر ایمان لے آتے۔

آنے والوں سے آتمارام چیخ چیخ کر کہتا۔

''لوگو! میری طرف دیکھو۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں میرے گیان کے چرچے تھے۔ مگر کون جانتا تھا وہ سارا گیان محض ایک دھوکا ہے۔ پھر جب ایک حقیقی گیانی آیا تو اس نے ایک نظر میں میرا سب کچھ چھین لیا۔ اب میں مبارک شاہ قلندر کا ایک ادنیٰ غلام ہوں اور مجھے اس غلامی پر اتنا ناز ہے کہ اگر اس کے بدلے میں سارے ہندوستان کی شہنشاہیت بھی ملے تو ہرگز قبول نہ کروں۔''

مبارک شاہ کی یہ بڑی کرامت تھی کہ اس کا عمل دیکھ کر لوگوں نے اپنے عقائد بدل ڈالے۔ اور شہنشاہ جہانگیر یہ حسرت لئے ہوئے قبر کی گہرائیوں میں چلا گیا کہ قلندر صرف ایک بار اس کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔

یہ مبارک شاہ کے اعلیٰ کردار ہی کا نتیجہ تھا کہ شاہ جہاں نے اس سے گہرا تاثر قبول کیا اور انسان کو سجدہ کرنے کی لعنت زدہ رسم اپنے دربار سے ختم کی۔

۞.....۞.....۞

آتمارام کے قبولِ اسلام کی خبر سکندر مرزا نے بھی سنی اور اچانک اُس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ پھر رات کی تاریکی میں سکندر مرزا کے قدم، مبارک شاہ کی جھونپڑی کی طرف اُٹھنے لگے۔

سکندر مرزا نے ایک زمانے میں مبارک شاہ کی بہت خدمت کی تھی۔ جب قلندر نے اسے اپنے سامنے پایا تو بڑی محبت کے ساتھ استقبال کیا۔

''آؤ سکندر مرزا!'' قلندر کا لہجہ نہایت مشفقانہ تھا۔ ''تم نے رات کے وقت کیسے زحمت کی؟.....دن کی روشنی میں چلے آتے۔''

''میرا کام اسی رات کی تنہائی میں ہو سکتا تھا۔'' سکندر مرزا نے انتہائی مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''دن کے اُجالے میں تو ہزاروں انسان آپ کو گھیرے رہتے ہیں۔ پھر میرا گزر کس طرح ہوتا؟''

''تمہارے لئے وقت کی کوئی قید نہیں۔'' مبارک شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری

نوازشات کو بھولا نہیں ہوں۔''

''میں کیا اور میری نوازش کیا قلندر!'' سکندر مرزا نے مبارک شاہ کے سامنے دو زانو بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو میرے لئے ایک بڑی سعادت تھی کہ آپ نے میری حقیر سی خدمت کو قبول کر لیا۔''

''گزری باتوں کا ذکر چھوڑو اور اپنے دل کا حال کہو۔'' قلندر کے لہجے سے اسی شفقت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''قلندر! ہزاروں انسانوں نے آپ کے در سے رہنمائی حاصل کی اور منزلِ نجات تک پہنچے۔ مگر میں آپ کی مملکت میں آج تک بے سکون ہوں۔'' سکندر مرزا کے لہجے میں بڑی خلش تھی۔ ''آپ کے پاس میری بیماری کا علاج بھی ہے کہ نہیں ایک نظر میرے دلِ بے قرار پر بھی ڈال دیجئے کہ اب مجھ سے یہ درد برداشت نہیں ہوتا۔'' سکندر مرزا نے بڑے مبہم الفاظ میں اپنے عشق کا ماجرا بیان کیا تھا۔

''یہ آگ تو خوش نصیبوں کے دلوں میں روشن ہوتی ہے۔'' مبارک شاہ نے سکندر مرزا کے زخموں پر الفاظ کا مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ ''اگر یہ آگ کسی دل میں روشن نہ ہو تو وہ مُردہ کہلاتا ہے۔ میں تجھ جیسے صاحبِ دل کے لئے ہلاکت کی دعا نہیں کر سکتا۔''

مبارک شاہ نے بھی اشاروں میں گفتگو کی تھی۔ مگر سکندر مرزا کو خیال گزرا کہ شاید قلندر اُس کی درخواست کا مفہوم نہیں سمجھ سکا ہے۔ اس لئے وہ اپنے مقصد کی وضاحت کرنے لگا۔

''قلندر! میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ میری طرف ملتفت نہیں ہوتی۔ جس نظر سے آتمارام کی کایا پلٹ دی، وہی نظر ماہ رخ کے دل پر بھی ڈال دے۔'' شدتِ جذبات سے سکندر مرزا کی آواز لرز رہی تھی۔ ''میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، قلندر!''

مبارک شاہ نے بہت غور سے سکندر مرزا کی طرف دیکھا۔

''فرزند! تُو نے مجھے بہت مایوس کیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ تُو مجھ سے آخرت مانگنے آیا ہے۔ مگر کیا خبر تھی کہ تُو بھی ایک دنیا پرست ہے اور دنیا کے فریب کار طلسم میں غرق رہنا چاہتا ہے۔''

''قلندر! میں دنیا دار سہی مگر کوئی ناجائز خواہش نہیں رکھتا۔'' سکندر مرزا کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''ہر چند کہ تیری خواہش جائز ہے۔ مگر یہ گناہ گار، مبارک شاہ کسی کا دل بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔'' قلندر نے سکندر مرزا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر بالفرض محال میں اس لڑکی کا دل بدل بھی دوں تو اس میں تیرے عشق کا کیا کمال ہو گا؟ عشق تو وہ ہے جو اپنی ریاضت سے محبوب کو پرسشِ حال پر مجبور کر دے۔ میرا احسان کیوں اُٹھاتا ہے؟ اپنے اندر وہ طاقت پیدا کر کہ تیری نواؤں سے حریمِ ناز میں زلزلہ آ جائے۔''

''میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں قلندر!'' سکندر مرزا کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔

''مجھے پناہ دے.....ورنہ میں کسی ویران راستے میں دم توڑ دوں گا۔''

''نہیں..... ایسا نہیں ہوگا سکندر مرزا!'' قلندر نے کہا۔ ''اگر تیرا عشق سچا ہے تو یہ تجھے نامرادی کی موت مرنے نہیں دے گا۔ خلشِ دل کو بڑھنے دے کہ یہی خلش ایک دن تجھے سکون دینے لگے گی۔ وصال کو عشق کا حاصل نہ سمجھ! پھر تجھے قرار آجائے گا۔''

سکندر مرزا کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر مبارک شاہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''آتشِ فراق تو بڑی عجیب شے ہے۔ اس آگ میں جلنے سے انسان راکھ نہیں ہوتا، اکسیر بن جاتا ہے۔ تُو جس لڑکی کی بات کر رہا ہے، وہ بھی بڑی صاحبِ دل ہے۔ اُس کی برداشت سے سبق حاصل کر کے وہ خود بھی برسوں سے اسی آگ میں جل رہی ہے مگر اُف تک نہیں کرتی۔ تُو ایک مرد ہوتے ہوئے بھی چیخ رہا ہے اور اپنے شورِ فغاں سے آسمان سر پر اُٹھا لینا چاہتا ہے۔ ضبط کر سکندر مرزا! کہ ضبط ہی انسان کا شرف ہے۔''

''وہ کس آگ میں جل رہی ہے قلندر؟'' سکندر مرزا نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''اگر وہ میرے عشق کی آگ ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتی؟ اس نے تو بارہا کہا ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔''

''یہ میرے اور اس کے درمیان ایک راز ہے۔'' قلندر نے بے نیازانہ کہا۔ ''کچھ دن انتظار کر! پھر تجھ پر بھی یہ راز فاش ہو جائے گا۔''

سکندر مرزا مایوس ہو کر واپس جانے لگا تو قلندر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے سکندر مرزا کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میری دعا ہے کہ خدا تجھے عشق کے مفہوم سے آشنا کر دے۔''

سکندر مرزا تھکے ہوئے قدموں سے واپس چلا گیا۔ قلندر کی بارگاہ سے بظاہر اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔

❀.....❀.....❀

شاہ جہاں بھی اپنی عقیدت کا مظاہرہ کرنے کے لئے روزانہ مبارک شاہ کی خدمت میں حاضری دینا چاہتا تھا مگر ایک دن قلندر نے اُسے سخت لہجے میں منع کرتے ہوئے کہا۔

''شہنشاہ! تجھ سے وقت کی اس بربادی کا حساب لیا جائے گا۔''

شاہ جہاں حیران ہو کر قلندر کی طرف دیکھنے لگا۔

''تجھ پر میری ملاقات فرض نہیں۔'' قلندر کے لہجے سے جلالِ روحانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''تیرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ تُو مجھ جیسے ناکارہ انسان کے پاس آئے اور خدا کے بندوں کی خدمت سے غافل ہو جائے۔''

شاہ جہاں نے اپنے جذبوں کی وضاحت کرنی چاہی تو قلندر نے صاف صاف کہہ دیا۔

''اگر تجھے مجھ سے عقیدت ہے تو میرے پاس آنے کے بجائے بندگانِ خدا کے حقوق ادا کر۔ مملکت کی سرحدوں کو محفوظ کر۔ تاکہ آئندہ کوئی نیا فتنہ سر نہ اُبھار سکے۔''

''میں آپ کی دعاؤں کے سائے میں رہنا چاہتا ہوں۔'' شاہ جہاں نے التجا کی۔

''اگر تُو دعاؤں پر یقین رکھتا ہے تو پھر ان کا سایہ بھی بہت طویل و عریض ہوتا ہے۔'' مبارک شاہ نے اسی بے نیازی کے ساتھ کہا۔ ''تُو تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو یا میدانِ جنگ میں دشمنوں سے مصروفِ پیکار، ہر جگہ میری دعاؤں کے سائے میں رہے گا۔''

''آپ مجھ سے خوش تو ہیں قلندر؟'' شاہ جہاں نے بڑی عاجزی کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں! میں تجھ سے راضی ہوں۔'' مبارک شاہ نے کہا۔ ''اگر راضی نہ ہوتا تو یہاں ایک لمحے کے لئے بھی تیرا وجود برداشت نہیں کرتا۔''

''میرے سامنے بہت مسائل ہیں۔ اور ان کے حل کے لئے میں آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔'' شاہ جہاں نے انتہائی مؤدب لہجے میں کہا۔

''میں دعا کر رہا ہوں۔'' قلندر کی آواز سے گہری شفقت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''مگر دعاؤں کے ساتھ تیرا عمل بھی ضروری ہے۔''

❀.....❀.....❀

شاہ جہاں، قلندر کی بارگاہ سے اُٹھا تو سیاسی مسائل اس کا انتظار کر رہے تھے۔

شاہ جہاں کی تاج پوشی کے کچھ دن بعد ہی بندیلہ قبیلے کی بغاوت کے سبب علاقے کا امن خطرے میں پڑ گیا تھا۔ بندیل کھنڈ کے راجہ، بیر سنگھ کے انتقال کے بعد اُس کا بیٹا جھجر سنگھ، تخت پر بیٹھا۔ جھجر سنگھ نے ریاست کا انتظام اپنے بیٹے بکرماجیت کے سپرد کیا اور خود شاہ جہاں کے دربار میں چلا آیا۔

آگرے کے قیام کے دوران جھجر سنگھ کو اپنے لڑکے کی بدعنوانیوں کی خبر ملی۔ نتیجتاً اس نے اپنے علاقے میں واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس موقع پر جھجر سنگھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ وہ شاہ جہاں کو اطلاع دیئے بغیر آگرے سے روانہ ہو گیا۔

جب شاہ جہاں کو جھجر سنگھ کی روانگی کی اطلاع ملی تو وہ اُس سے بدگمان ہو گیا اور پھر بدگمانی نے بڑھتے بڑھتے جنگ کی شکل اختیار کر لی۔

بندیل کھنڈ کا علاقہ، جنگلوں اور دُشوار گزار راستوں سے بھرا ہوا ہے۔ برسات کے موسم میں اس علاقے سے گزرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ جھجر سنگھ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنے مال و دولت کا سہارا لے کر مغلوں کے خلاف جنگ کا فیصلہ کر لیا۔ آگرے سے روانہ ہونے کے بعد جھجر سنگھ ''اڑچھ'' پہنچ گیا تھا، جہاں اس نے اپنی فوج میں بھرتی شروع کر دی۔ قلعے کو مضبوط کر کے اس نے راستوں کی ناکہ بندی بھی کر دی۔

یہ اطلاع ملتے ہی شاہ جہاں نے جھجر سنگھ کی سرکوبی کا فیصلہ کرلیا۔ شاہی فوج تین اطراف سے روانہ ہوئی۔ ایک طرف سے مہابت خان، دوسری طرف سے خان جہاں اور تیسری طرف سے عبداللہ خان نے پیش قدمی شروع کی۔ ان لوگوں کے ساتھ سید مظفر خان، گوالیار کا راجہ رام داس، حبیب خان، اسلام خان، فیروز جنگ، راجہ بھرت اور آصف خان وغیرہ بھی تھے۔ اس طرح شاہی لشکر کی تعداد پینتیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

شاہ جہاں خود جنوری 1629ء میں آگرہ سے گوالیار پہنچا۔ عبداللہ خان نے حملے کی ابتدا کی اور ''اڑچھ'' کا قلعہ تسخیر کرلیا۔ اس معرکے میں جھجر سنگھ کے تین ہزار سپاہی کام آئے۔ وہ پہلے ہی شاہ جہاں کے لشکرِ جرار کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ جھجر سنگھ نے مزید تباہی سے بچنے کے لئے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ وہ دوبارہ شاہ جہاں کی اطاعت قبول کرلے۔ نتیجتاً جھجر سنگھ نے مہابت خان کے پاس اپنا قاصد بھیجا۔ اس نے مہابت خان کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا۔

''جو کچھ ہوا، وہ دوسروں کی سازشوں اور بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے ہوا۔ بہرحال میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ تم اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے میرا مقدمہ شہنشاہ کے حضور پیش کرو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ شہنشاہ اس نافرمان کو معاف فرمادیں گے۔''

بالآخر مہابت خان کی وساطت سے جھجر سنگھ کی معافی قبول کرلی گئی اور وہ شاہ جہاں کے سامنے پیش ہوا۔

''جھجر سنگھ! کیا تو سمجھتا تھا کہ ہماری افواجِ قاہرہ کو شکست دے کر اپنی گردن سے اطاعت کا طوق اُتار پھینکے گا؟'' شاہ جہاں نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''کیا تجھے یاد نہیں کہ ہم نے تیری ذات پر احسانات کی کس قدر بارش کی تھی۔''

''مجھے سب یاد ہے شاہِ والا!'' جھجر سنگھ نے انتہائی عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''مگر میں مجبور تھا۔ مجھے اپنوں نے دھوکا دیا۔ میرے خلاف ایک خوف ناک سازش کی گئی۔ یہاں تک کہ مجھے حضورِ عالی کے سامنے مجرموں کی طرح لا کھڑا کر دیا گیا۔ اپنی شرمندگی کا اظہار کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں اب بھی میری قوم کے بہت سے افراد مجھے غدار سمجھتے ہیں۔ مگر میں سب کی ناراضگیوں کو بالائے طاق رکھ کر شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔''

شاہ جہاں نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھجر سنگھ کو معاف کر دیا۔ پھر بھی اس سے ایک ہزار طلائی مہریں، پندرہ لاکھ روپے اور چالیس ہاتھی جرمانے کے طور پر طلب کئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی جاگیر کا بڑا حصہ بھی ضبط کرلیا گیا۔ جھجر سنگھ کو مزید حکم دیا گیا کہ وہ دو ہزار سوار تیار رکھے۔ اس طرح شاہ جہاں، دکن کی مہم کی ابتدائی تیاریاں کر رہا تھا۔

معافی ملنے کے بعد جھجر سنگھ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا، جنہوں نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ جھجر سنگھ کو شبہ تھا کہ اس کی بیوی درپردہ طور پر اس کے بھائی ہردور سنگھ سے مل گئی ہے۔

جھجر سنگھ نے بڑی خاموشی سے اپنے بھائی ہردور سنگھ کو اعتماد میں لیا اور اس پر یہ ظاہر نہیں

ہونے دیا کہ وہ اس کی بدکاریوں سے واقف ہے۔ ہردور سنگھ اپنے بھائی کو احمق سمجھ کر سازش کا نیا منصوبہ ترتیب دیتا رہا۔

ایک دن جھجر سنگھ نے اپنے غدار بھائی کی بڑی پُرتکلف دعوت کی۔ اس دعوت میں دونوں بھائیوں کے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ جھجر سنگھ نے اپنے خدمت گاروں کے ذریعے بڑی رازداری کے ساتھ کھانے میں زہر ملوا دیا تھا۔ پھر یہی زہر آلود کھانا، ہردور سنگھ کے سامنے رکھا گیا۔ ہردور سنگھ اس راز سے بے خبر تھا کہ اس کے خلاف بھی کوئی ہولناک سازش کی جاسکتی ہے۔

ہردور سنگھ اسی بے خبری کے عالم میں جی بھر کے کھانا کھاتا رہا۔ جھجر سنگھ نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے زہر آلود شراب کا بھی اہتمام کیا تھا کہ اگر کسی طرح ہردور سنگھ، زہر آلود کھانے سے بچ جائے تو زہر آلود شراب اس کا کام تمام کردے۔ آخر وہی ہوا۔ ہردور سنگھ نے کھانے کے بعد خوب سیر ہو کر شراب پی اور تھوڑی دیر بعد ہی زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ آخری لمحات میں ہردور سنگھ کو احساس ہوگیا تھا کہ اس کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ہردور سنگھ نے ضیافت کے کمرے سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی مگر نشے کی زیادتی کے سبب لڑکھڑا کر گر گیا۔ ہردور سنگھ کو تین بار خون کی قے ہوئی اور پھر اُس کا جسم ساکت ہوگیا۔

جھجر سنگھ نے اپنے بھائی کی لاش پر کئی بار زوردار ٹھوکریں ماریں اور شدتِ جذبات میں چیخ کر کہا۔

''جو لوگ کسی کے اعتماد کا خون کرتے ہیں، ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔''

جھجر سنگھ نے اپنے بھائی ہردور سنگھ سے اس کی شرم ناک سازش کا انتقام لے لیا تھا۔ مگر جب یہ خبر عام ہوئی کہ جھجر سنگھ نے ہردور سنگھ کو زہر دے کر ہلاک کیا ہے تو قبیلے کے لوگ غضب ناک ہوگئے۔ شاہ جہاں کی حمایت کے سبب بندیلہ قبیلے سے تعلق رکھنے والے افراد، جھجر سنگھ کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے مگر پوری قوم کی نظروں میں وہ ایک لعنت زدہ انسان بن گیا۔

آج بھی بندیلہ قبائل میں جھجر سنگھ کو ''شیطان کا چیلا'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ ہردور سنگھ کو ''شہید'' اور ''دیوتا'' کہہ کر پکارتے ہیں۔

بندیلوں کی بغاوت فرو کرنے کے بعد شاہ جہاں دارالحکومت کی طرف لوٹ آیا اور اپنی ساری توجہ دکن کے معاملات پر مبذول کر دی۔

❁.....❁.....❁

خان جہاں کو دوبارہ دکن کی گورنری پر بحال کرنے کے بعد شاہ جہاں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ بالا گھاٹ پر قبضہ کرلے۔ مگر خان جہاں نے اس حکم کی تعمیل میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ مجبوراً شاہ جہاں نے مہابت خان کو دکن کا گورنر بنا دیا۔

اگرچہ خان جہاں کی مسلسل نافرمانیوں کے باوجود شاہ جہاں نے اسے کوئی سزا نہیں دی تھی

لیکن وہ آگرہ میں درباری ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن خان جہاں کے لڑکے کو یہ اطلاع ملی کہ اسے اور اس کے باپ کو بہت جلد زنداں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ خبر سن کر خان جہاں نے دربار میں حاضر ہونا بند کر دیا اور آگرے سے فرار کی تدبیریں سوچنے لگا۔ دو ہزار افغان سپاہی، خان جہاں کی حفاظت پر مامور تھے لیکن وہ پھر بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔

جب شاہ جہاں نے اُس کی غیر حاضری کو محسوس کیا تو اپنے ایک قاصد کے ذریعے اس کی وجہ دریافت کی۔

جواب میں خان جہاں نے اپنے اندیشوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہر وقت اپنے آپ کو نامعلوم خطرات میں گھرا ہوا پاتا ہے۔''

شاہ جہاں نے فوری طور پر آصف خان کے ذریعے خان جہاں کو ایک خط بھیجا جس میں تحریر کیا گیا تھا۔

''مابدولت تجھے یا تیرے لڑکے کو کسی قسم کی سزا دینا نہیں چاہتے۔ اس لئے تم دونوں پر لازم ہے کہ آگرے میں آزادانہ زندگی بسر کرو۔''

اس خط کے آخر میں شاہ جہاں کے دستخط بھی موجود تھے۔

شہنشاہ کی طرف سے یہ ایک واضح یقین دہانی تھی مگر خان جہاں کے دل سے شبہات دُور نہ ہو سکے۔ وہ مسلسل شاہ جہاں کی نیت پر شک کرتا رہا۔ بظاہر اس نے دربار میں حاضر ہونا شروع کر دیا تھا لیکن در پردہ وہ فرار کے راستے ڈھونڈ رہا تھا۔ آصف خان کے جاسوس ہمہ وقت خان جہاں کی حرکات پر نظر رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ شاہی جاسوسوں نے خان جہاں کے تیور پہچان لئے اور فوری طور پر آصف خان کو اطلاع دی کہ خان جہاں کے ارادے نیک نہیں ہیں۔

آصف خان نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شاہ جہاں کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہِ والا! اگر بروقت انتظام نہیں کیا گیا تو خان جہاں فرار ہو جائے گا۔''

''یہ محض شبہ ہے اور ہم شبہ کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔'' شاہ جہاں نے آصف خان کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اسے معافی دی ہے اور ہم کسی واضح ثبوت کے بغیر اپنے وعدے سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا، جب خان جہاں کوئی غلطی کرے اور پھر ہم سختی کے ساتھ اس کا محاسبہ کریں۔''

آخر وزیر اعظم آصف خان کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ چند دن بعد ہی خان جہاں اپنے دو ہزار افغان سپاہیوں کے ہمراہ رات کے وقت آگرے سے فرار ہو گیا۔ فرار کی اطلاع ملتے ہی شاہی فوجوں نے اس کا تعاقب کیا۔ خان جہاں کے گھوڑے کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ شاہ جہاں کے سپاہی بھی برق رفتاری کے ساتھ خان جہاں کا تعاقب کر رہے تھے۔ انجام کار شاہی فوجوں نے دریائے

چنبل کے قریب مفرور سپاہیوں کو جالیا۔

شاہی فوجوں اور خان جہاں کے سپاہیوں کے درمیان پہلی جھڑپ دھولپور کے قریب دریائے چنبل کے کنارے ہوئی۔ اس تصادم میں شاہی فوجی دستوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ خان جہاں نے سب سے پہلے اپنے لڑکوں اور سپاہیوں کے ساتھ تیز رفتار ندی کو عبور کر لیا مگر اپنا خزانہ پیچھے چھوڑ گیا۔ یہاں جھجر سنگھ کے لڑکے بکرماجیت سنگھ نے خان جہاں کے ساتھ تعاون کیا اور اسے بندیل کھنڈ کے آسان اور قریب ترین راستوں اپر ڈال دیا۔ اس طرح وہ احمد نگر ہوتا ہوا دولت آباد جا پہنچا۔

نظام الملک نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ خان جہاں کا استقبال کرتے ہوئے اسے اعلیٰ ترین عہدہ بھی دیا۔ اس کے بعد اسے اور اس کے ساتھیوں کو مغل مقبوضات فتح کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

دسمبر 1629ء میں شاہ جہاں خود آگرہ سے دکن روانہ ہوا۔ جنوری 1630ء میں شاہی فوجوں نے بالا گھاٹ پر حملہ کر دیا مگر خان جہاں کے ہاتھوں انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی کے بعد شاہ جہاں نے پیش قدمی روک دی اور برسات گزر جانے کا انتظار کرنے لگا۔ بارشوں کے موسم میں جنگ کرنا ایک کارِ عبث تھا جس میں نقصان کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ مجبوراً شاہ جہاں نے اپنے منصوبے میں تبدیلی کی اور بڑے صبر وضبط کے ساتھ یہ ناخوشگوار موسم گزار دیا۔

اس وقت شاہ جہاں کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ خان جہاں کے علاوہ احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی حکومتوں سے بھی جنگ کرنے کے لئے مجبور تھا۔ کیونکہ یہ تینوں حکومتیں مغلوں کے خلاف تھیں۔ دوسری طرف مرہٹوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان ہی دشواریوں کے پیشِ نظر شاہ جہاں نے کچھ فوج خواجہ ابوالحسن کی نگرانی میں دھولیہ کی طرف روانہ کی تاکہ اس طرح نہ صرف شمال مغرب کی طرف سے احمد نگر کو متاثر کیا جا سکے بلکہ رسد کا سلسلہ بھی برقرار رہے۔ سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد برار کے جنوب میں ''دیول گاؤں'' کے قریب متعین کر دی گئی تاکہ موقع پڑنے پر شمال مشرق سے حملہ کیا جا سکے۔ کچھ فوج ریاست حیدر آباد کے شمال کی طرف واقع ''تلنگانہ'' کے علاقے میں بھیج دی گئی۔

اس دوران مرہٹوں نے مغل اقتدار کو تسلیم کر لیا اور اپنی مصنوعی وفاداریاں ظاہر کر کے چند عہدے بھی حاصل کر لئے تھے۔ مگر ان کا سردار، جادو رائے منافقانہ حکمتِ عملی سے کام لے رہا تھا۔ ایک طرف وہ مغل سلطنت کی حمایت کا دم بھرتا تھا اور دوسری طرف احمد نگر کی حکومت سے بھی تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جادو رائے کے لڑکوں اور رشتے داروں نے احمد نگر کے حاکم کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ جادو رائے سمجھتا تھا کہ وہ اپنی دوغلی سیاست سے ہندوستان کے حکمراں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مگر شاہ جہاں اُس کی نیت کا حال خوب

جانتا تھا۔

شاہ جہاں ایک عرصے سے جادو رائے کی تاک میں تھا۔ پھر جیسے ہی شاہی کارندوں کو موقع ملا، انہوں نے جادو رائے کو گرفتار کر کے شاہ جہاں کے سامنے دربار میں پیش کر دیا۔ شاہ جہاں نے اسے اس حال میں دیکھ کر پوچھا۔

''جادو رائے! تُو نے ہماری نوازشات کی قدر نہ کی۔''

''شاہِ والا! میرے دشمنوں نے مجھ پر سنگین الزام تراشی کی ہے۔'' جادو رائے لرزتے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ ''میں جانتا ہوں کہ یہاں حاسدوں کی ایک بڑی جماعت موجود ہے، جو یہ پسند نہیں کرتی کہ مجھ غریب پر شاہِ والا کی طرف سے عنایاتِ خسروانہ کی بارش ہو۔''

''تجھ سے کوئی حسد نہیں رکھتا جادو رائے!'' شاہ جہاں نے انتہائی قہرناک لہجے میں کہا۔ ''تُو اپنا دشمن آپ ہے کہ بیک وقت دو کشتیوں پر سوار ہونا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وقت کا تند و تیز طوفان انہیں غرق کر دے۔ اگر تُو ہمارے الطاف و کرم کو کافی سمجھتا تو آج تجھے یہ سیاہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔''

جادو رائے اپنی موت کو قریب دیکھ کر گریہ وزاری کرنے لگا۔ ''میں اپنے دیوتاؤں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری وفاداریاں شبہات سے بالاتر ہیں۔''

''پھر تیرے لڑکے اور دوسرے رشتے دار، احمد نگر کے حاکم کی غلامی پر رضامند کیوں ہیں؟'' شاہ جہاں ایک متحمل مزاج انسان تھا مگر اس وقت اس کی زبان سے آگ برس رہی تھی۔ ''کیا ان لوگوں کے لئے ہماری غلامی کافی نہیں تھی؟ اگر تُو اپنے سینے میں مال و دولت کی حرص رکھتا تھا تو ہم سے کہا ہوتا۔ ہم تیرے سارے خاندان کے پھیلے ہوئے دامن، سیم و زر سے بھر دیتے۔''

''مجھے صرف ایک موقع دیا جائے۔'' جادو رائے گڑگڑانے لگا۔ ''میں اپنے لڑکوں اور تمام رشتے داروں کو لا کر شاہِ والا کے قدموں میں جھکا دوں گا۔''

''دانش مندوں کا قول ہے کہ جو شخص بار بار ایک ہی زاویے سے فریب کھائے، اسے اس دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' شاہ جہاں نے جادو رائے کی رحم کی درخواست مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''وفاداریوں کے امتحان کا وقت گزر چکا۔ اب تو صرف ہمارا آخری فیصلہ باقی ہے۔ ہم نے بہت دن انتظار کیا کہ تُو سچائی کے ساتھ مرکز کی طرف پلٹ آئے۔ یہ مہلت محض اس لئے تھی کہ ہم اچھی طرح تیری منافقانہ فطرت کا اندازہ کر لیں۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ عجلت میں ہمارے ہاتھ سے کسی بے گناہ کا خون ہو جائے۔''

جادو رائے، موت کے خوف سے شاہ جہاں کے سامنے سجدے میں گر گیا مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔

شاہ جہاں نے جادو رائے کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

پھر جب مرہٹہ سردار کا جسم تڑپتے تڑپتے ساکت ہو گیا تو کچھ مشیروں نے شاہ جہاں کو

مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''شہنشاہ کے لئے لازم ہے کہ ایسے غداروں کی موت کی بھرپور تشہیر کی جائے۔''

شاہ جہاں سوالیہ نظروں سے اپنے مشیروں کی طرف دیکھنے لگا

''نمک حرام جادو رائے کا سر کاٹ کر نیزے پر بلند کیا جائے اور پھر اسے گلی کوچوں میں پھرایا جائے تاکہ ان لوگوں کو عبرت حاصل ہو، جن کے سینوں میں غداری کے ناپاک جذبات پرورش پا رہے ہیں۔'' شاہی مشیروں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر جادو رائے کے سر کی تشہیر کرائی جائے تو اس سے حکومت کے جاہ و جلال میں اضافہ ہوگا۔''

''جادو رائے کے لئے بس موت کی سزا کافی تھی۔ ہم کسی سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔'' شاہ جہاں نے اپنے مشیروں کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''دیگر شاہانِ ہند نے بھی بغاوتوں کو کچلنے کے لئے یہ طریق کار اختیار کیا ہے۔'' مشیروں نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''ایک جیتے جاگتے انسان کے لئے یہ سزا بہت ہے کہ وہ زندگی سے محروم ہو جائے۔'' شاہ جہاں نے اپنے مشیروں کا کوئی مشورہ قبول نہیں کیا اور جادو رائے کی لاش اس کے وارثوں کے حوالے کر دی گئی تاکہ وہ اپنے مذہبی رواج کے مطابق مرنے والے کی آخری رسمیں ادا کر سکیں۔

فوری طور پر جادو رائے کی موت کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ مرہٹے، مغلوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اگرچہ یہ شمولیت بھی منافقانہ تھی لیکن شاہ جہاں نے کچھ دن کے لئے مرہٹوں کی شورشوں سے نجات حاصل کر لی تھی۔

۞.....۞.....۞

جادو رائے کا فتنہ ختم ہو چکا تھا۔ اب شاہی لشکر، اعظم خان کی سالاری میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت خان جہاں ''بیر'' میں مقیم تھا۔ جب اُسے اعظم خان کی آمد کی خبر ملی تو اس نے ''بیر'' چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر خان جہاں کی روانگی سے پہلے ہی اعظم خان نے تھوڑی سی فوج اس کے تعاقب میں روانہ کر دی تھی۔ خان جہاں نے اس مختصر سی فوج کو حملہ کر کے منتشر کر دیا۔ لیکن جیسے ہی خان جہاں کے حملہ آور لشکر نے باقی ماندہ شاہی فوج کو آتے ہوئے دیکھا تو اس کے سپاہیوں میں افراتفری پھیل گئی۔ اب خان جہاں پیچھے ہٹنے کے بھی قابل نہ تھا۔ کیونکہ اس کے تمام راستے شاہی فوج نے مسدود کر دیئے تھے۔ مجبوراً اس نے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔

سب سے پہلے خان جہاں نے اپنی تمام خواتین کو ایک محفوظ مقام پر بھیج دیا اور پھر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں

خان جہاں اور شاہی لشکروں کے درمیان ایک خون ریز معرکہ ہوا۔ باغی فوجیوں نے بڑی دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن شکست ان کا مقدر بن چکی تھی۔ خان جہاں کے وفادار سپاہیوں

نے شمشیروں پر اپنی گردنیں رکھ دیں مگر جانوں کے یہ نذرانے بھی کام نہ آئے۔ شاہی فوج کی یلغار کو روکنا خان جہاں کے بس میں نہیں تھا۔ آخر اُسے میدانِ جنگ سے فرار ہونا پڑا۔ مغل سپاہیوں نے بہت دُور تک باغیوں کا تعاقب کیا۔ لیکن ان کے گھوڑے تیز رفتاری کے باعث بہت جلد تھک گئے۔ خان جہاں اپنے چند سپاہیوں اور حرم کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اعظم خان نے اپنی فوج کو قدرے آرام کی مہلت دی اور دوبارہ خان جہاں کا تعاقب شروع کر دیا۔

خان جہاں ایک اور افغان سپہ سالار، دریا خان کے ساتھ جگہ جگہ پناہ کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ احمد نگر کے حکمراں نے خود کو قلعہ بند کر لیا

تھا۔ دوسری طرف وقت کی رفتار دیکھتے ہوئے جادو رائے کے قتل کے بعد اس کے داماد، شاہ جی بھونسلے نے احمد نگر سے تعاون ختم کر دیا تھا۔ اور پھر اس نے اپنی خدمات، شاہ جہاں کو پیش کر دیں۔ شاہ جہاں کی طرف سے اس پیشکش کو بخوشی قبول کر لیا گیا۔

باغیوں نے ایک بار پھر دریا خان کو کچھ فوج دے کر ''چندوڑ'' اور ''چالیس گاؤں'' بھیجا، جہاں افغانوں نے کھانے پینے کی چیزوں کے حصول کی غرض سے لوٹ مار شروع کر دی۔ اس دوران اسے اطلاع ملی کہ عبداللہ خان کو اس کے تعاقب کی ہدایت کی گئی ہے۔ اعظم خان نے احمد نگر کے قلعے کا محاصرہ ضروری نہ سمجھا بلکہ اس کی جگہ باغیوں کے ایک اور اتحادی، مقرب خان کی فوجوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مقرب خان اس وقت بالا گھاٹ کے شمال میں تھا۔ جیسے ہی شاہی افواج وہاں پہنچیں، احمد نگر کی فوجیں ''بیر'' کی طرف پسپا ہو گئیں۔

پھر جب اعظم خان نے ان کا تعاقب شروع کیا تو وہ دولت آباد کی طرف فرار ہو گئیں لیکن وہاں بھی انہیں اشیائے خورونوش کی کمی کے باعث سکون نصیب نہ ہو سکا۔ اس دوران اعظم خان نے شاہ جی بھونسلے کو احمد نگر کے مغربی اور شمالی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

احمد نگر کے حکمراں نے ضروریاتِ زندگی کی نایابی اور خود کو دشمنوں میں گھرا ہوا پا کر خان جہاں کی مدد سے ہاتھ روک لیا۔ اس کے بعد خان جہاں اور دریا خان، مالوہ کے راستے پنجاب میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ یہاں سے انہیں سرحد کے افغانوں کی حمایت حاصل ہونے کی اُمید تھی۔ شاہ جہاں اس وقت برہان پور میں مقیم تھا۔ اس نے ان دونوں کا تعاقب کرنے کے لئے فوری طور پر نئے احکام جاری کر دیئے۔ اس کے نتیجے میں خان جہاں اور دریا خان کو قدم قدم پر شاہی فوجوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ مجبوراً ان دونوں نے ایک بار پھر بندیل کھنڈ میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بکرماجیت سنگھ کو اپنے باپ جھجر سنگھ کا انجام یاد تھا۔ شاہی عتاب سے بچنے کے لئے بکرماجیت سنگھ نے باغیوں پر حملہ کر کے دریا خان اور اس کے بیٹے کو ہلاک کر دیا۔ خان جہاں ایک بار پھر بچ نکلا۔ لیکن اس کے کچھ دن بعد ہی ''سیہوندا'' کے مقام پر شاہی فوجوں اور باغیوں کے درمیان ایک خوفناک جھڑپ ہوئی۔ اس خونریز معرکے میں خان

جہاں مارا گیا۔

جب شاہ جہاں کو یہ خبر ملی تو اس نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ ان طویل معرکہ آرائیوں میں حکومت کے بہت سے باغی موت کی خوراک بن گئے تھے۔ شاہ جہاں نے سکون کی سانس لی مگر ایک اور الم ناک خبر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

❀.....❀.....❀

شہزادہ اورنگ زیب نے مبارک شاہ قلندر کی شخصیت کا خاصا اثر قبول کیا تھا۔ وہ اکثر مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور گھنٹوں قلندر کی باتیں سنا رتا۔ یہ بات بڑی حیرت ناک تھی کہ مبارک شاہ کسی شخص سے گفتگو نہیں کرتا تھا۔ اگر کبھی اسے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو بہت مختصر الفاظ میں بات کرتا، ورنہ عام طور پر خاموش ہی رہتا۔ اس کے برعکس شہزادہ اورنگ زیب پر بہت زیادہ مہربان تھا۔ وہ اپنی عادت کے خلاف اس سے طویل گفتگو کیا کرتا تھا۔

گزشتہ کئی دن سے شہزادہ اورنگ زیب، مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکا تھا۔ اس دوران قلندر نے کئی بار گیانی آتمارام سے پوچھا۔

''شہزادہ کیوں نہیں آیا؟''

گیانی آتمارام نے ادب کے ساتھ سر جھکا دیا۔ ''میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟''

قلندر کچھ دیر تک گیانی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بڑے عجیب لہجے میں کہنے لگا۔ ''آج شہزادے کو آنا ہی چاہئے۔ اسے خبر نہیں کہ مجھے کتنے کام ہیں۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔''

آتمارام نے آج سے پہلے قلندر کو اتنا بے چین نہیں دیکھا تھا۔

''تو پھر کیا میں خود شہزادے کی خدمت میں چلا جاؤں؟'' گیانی نے گھبرا کر کہا۔

''ہاں۔ یہی بہتر ہو گا، آتما رام!'' مبارک شاہ قلندر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''کون جانے، شاہی محل میں شہزادے کو کتنی مصروفیات ہوں۔ اس صورت میں یہی مناسب رہے گا کہ تم خود چلے جاؤ۔''

آتمارام فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور جھونپڑی سے نکل کر شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا

گیانی آگرے کی ایک مشہور شخصیت تھا۔ اسلام لانے کے بعد اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اور لوگ اس کی بہت زیادہ عزت کرنے لگے تھے۔ گیانی کو اس طرح پیدل چلتے ہوئے دیکھا تو لوگ اس کے قریب آ کر صورتِ حال دریافت کرنے لگے۔ مگر گیانی انہیں ایک ہی جواب دیتا۔

''اس وقت مجھے کسی سے بات کرنے کی فرصت نہیں۔ میں قلندر کا ایک خاص پیغام لے کر شاہی محل جا رہا ہوں۔''

فتح پور سیکری سے قلعے کا فاصلہ سترہ اٹھارہ کوس کے قریب تھا۔ اگر ایک بوڑھا شخص مسلسل

چلتا رہتا تو صبح سے شام ہو جاتی، پھر کہیں جا کر وہ شاہی محل تک پہنچ پاتا۔ آتمارام، راستے کی دشواریوں سے واقف تھا لیکن وہ محض قلندر کے حکم کی بجا آوری کے لئے یہ تکلیف برداشت کر رہا تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد گیانی کی نظر ایک شہسوار پر پڑی۔ وہ سپاہی اسی طرف آ رہا تھا۔ جب شہسوار قریب آ گیا تو آتمارام نے اسے آواز دی۔ سپاہی نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اور نیچے اُتر پڑا۔ سپاہی، آتمارام سے واقف تھا۔

''گیانی! تم اس طرح کہاں جا رہے ہو؟''

آتمارام نے مختصراً اُسے پوری روداد سناتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے کبھی مدد نہیں مانگتا۔ مگر قلندر کا پیغام بروقت پہنچانا بھی ضروری ہے۔''

''یہ میرے لئے بڑی سعادت ہوگی کہ میں قلندر بابا کی حقیر سی خدمات انجام دے سکوں۔'' سپاہی نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔ ''تم میرے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ پھر یہ طویل سفر بہت آسانی سے طے ہو جائے گا۔''

گیانی آتمارام اس سپاہی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد آتما رام قلعے کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ قلعے کے پہریدار، آتمارام سے بہ خوبی واقف تھے۔

''شہزادہ اورنگ زیب سے کہو کہ ان کے لئے مبارک شاہ قلندر کا ایک ضروری پیغام ہے۔'' آتمارام نے ایک پہرے دار سپاہی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی قلعے میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اورنگ زیب خود دوڑتا ہوا قلعے کے دروازے پر آیا اور آتمارام کو اپنا منتظر پا کر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

''گیانی! بابا خیریت سے تو ہیں؟''

''ہاں! وہ خیریت سے ہیں۔ مگر آپ کی مسلسل غیر حاضری کے سبب وہ بہت زیادہ پریشان ہیں۔''

''پھر میرے لئے بابا کا کیا حکم ہے؟'' اورنگ زیب نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہ آپ سے ملنے کے لئے بے قرار ہیں۔'' آتمارام نے کہا۔ ''مناسب ہے کہ آپ آج ہی ان سے ملاقات کر لیجئے۔ میں نے قلندر کو اتنا بے قرار کبھی نہیں دیکھا۔''

''پھر میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔'' اورنگ زیب نے کہا اور پھر اسی طرح دوڑتا ہوا قلعے میں واپس چلا گیا۔

جب شہزادہ دوبارہ باہر آیا تو سادہ لباس میں ملبوس تھا۔ محافظ دستہ فوراً آگے بڑھا۔

''صاحبِ عالم! آپ اس طرح فتح پور سیکری نہیں جا سکتے۔ پہلے آپ مسلح ہوں اور پھر محافظ دستے کی نگرانی میں تشریف لے چلیں۔''

''ہم کسی محاذِ جنگ پر نہیں، ایک مردِ قلندر کی بارگاہ میں حاضری دینے کے لئے جا رہے

ہیں۔'' شہزادہ اورنگ زیب نے انتہائی پُر جلال لہجے میں اپنے محافظوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بابا مبارک شاہ کی توہین ہوگی کہ ہم ان کی خدمت میں شاہانہ انداز سے حاضر ہوں۔''

''ہمارے لئے سخت احکام ہیں کہ صاحبِ عالم کسی وقت بھی تنہا نہ رہیں۔'' ایک محافظ نے آگے بڑھ کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''صورتِ حال کے مخدوش ہونے کے سبب ہمہ وقت آپ کی نگرانی ضروری ہے۔''

''ہماری محافظِ حقیقی صرف خداوند ذوالجلال کی ذات ہے۔'' شہزادہ اورنگ زیب نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ فطرتاً ایک انتہائی شجاع نوجوان تھا۔ دارالحکومت کے لوگ اب تک وہ خوفناک منظر نہیں بھولے تھے، جب ہاتھیوں کی ایک لڑائی میں شہزادہ اورنگ زیب کی زندگی کو سنگین خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس وقت شاہ جہاں اور دوسرے امراء کے دلوں کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئی تھیں، جب ایک مست ہاتھی شہزادہ اورنگ زیب پر جھپٹ پڑا تھا۔ اس وقت اورنگ زیب کی عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال ہوگی۔ دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ چند لمحوں میں وہ بگڑا ہوا مست ہاتھی، اورنگ زیب کو کچل کر رکھ دے گا۔ اکثر لوگوں نے تو شدتِ خوف سے اپنی آنکھیں بھی بند کر لی تھیں۔ مگر اچانک صورتِ حال بدل گئی۔ اورنگ زیب، موت سے گھبرا کر بھاگنے کے بجائے پورے ہوش و حواس اور استقامت کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر جیسے ہی وہ فیلِ مست، خوف ناک ارادوں کے ساتھ مغل شہزادے کی طرف بڑھا، اورنگ زیب نے تیزی سے اپنی تلوار کھینچی اور پینترا بدل کر کھڑا ہو گیا۔ مست ہاتھی نے شہزادے پر بھرپور حملہ کیا۔ اورنگ زیب نے بڑی ہوشیاری سے وحشی جانور کا وار خالی دیا اور دوسرے ہی لمحے برق رفتاری کے ساتھ اپنا وار کیا۔ مست ہاتھی کی سونڈ کٹ گئی اور وہ چنگھاڑتا ہوا میدان سے بھاگ گیا۔ ہاتھی کے فرار ہوتے ہی شاہی کارندے بھاگ کر اورنگ زیب کے گرد جمع ہو گئے۔ شاہ جہاں نے اپنے بیٹے کی بہادری سے متاثر ہو کر غریبوں اور محتاجوں میں خیرات تقسیم کی۔

آج اسی اورنگ زیب کو شاہی محافظ سمجھا رہے تھے کہ وہ فتح پور سیکری تنہا نہ جائے۔ مگر مغل شہزادے نے انہیں سختی سے جھڑک دیا تھا اور آتمارام کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر فتح پور سیکری کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

جب اورنگ زیب، حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار کے قریب پہنچا تو مبارک شاہ قلندر بڑی بے قراری کے ساتھ اپنی جھونپڑی کے دروازے پر ٹہل رہا تھا۔

''شہزادے! تم آ گئے؟'' مبارک شاہ قلندر نے بڑے مضطرب لہجے میں کہا۔

اورنگ زیب گھوڑے سے اُتر کر قلندر کے قریب آیا۔ مبارک شاہ نے بے اختیار ہو کر اورنگ زیب کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور پھر اسی طرح اسے اپنے ساتھ لئے ہوئے جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔

آتمارام، قلندر کے احترام کے پیشِ نظر باہر ہی ٹھہر گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مبارک شاہ، مغل شہزادے سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے۔

قلندر نے اپنے کاندھے پر پڑی ہوئی چادر اُتاری اور سامنے بچھی ہوئی چٹائی پر ڈال دی۔

''بیٹھ جاؤ شہزادے!'' مبارک شاہ نے ایک ہاتھ سے چٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شہزادہ اورنگ زیب نے بہت غور سے چٹائی کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی آتا تھا، خالی چٹائی پر بیٹھتا تھا۔ مگر آج قلندر نے روایت بدل ڈالی تھی اور خلافِ معمول اپنی اوڑھنے والی چادر، چٹائی پر بچھا دی تھی۔ مبارک شاہ نے آج تک کسی شخص کے سامنے اس محبت اور وابستگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اورنگ زیب چند لمحوں تک چادر کو دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔

''بابا! میں اس چادر پر بیٹھنے کی گستاخی نہیں کر سکتا، جو آپ کے بدن کی زینت ہے۔'' اورنگ زیب نے قلندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں خوشی سے اجازت دیتا ہوں۔'' مبارک شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ آپ کی محبت ہے کہ اس طرح میرا استقبال کیا۔ اور یہ میری عقیدت ہے کہ میں اسے اپنے سر پر سجاؤں۔'' یہ کہہ کر اورنگ زیب نے مبارک شاہ کی چادر کو اپنے سر سے لپیٹ لیا۔

قلندر کے چہرے پر خوشی کا ایک عجیب سا رنگ اُبھر آیا۔

''اعلیٰ ظرف ہو کہ فقیر کی عزت کی..... اور خوش نصیب ہو کہ درویش کا بھرم رکھا۔'' مبارک شاہ بڑے اثر انگیز لہجے میں بول رہا تھا۔ ''دونوں جہاں میں سعادت پاؤ گے۔ بیٹھ جاؤ!''

''پہلے آپ تشریف رکھیں۔'' اورنگ زیب نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

قلندر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

''شہزادے! تم نے اس فقیر کو مایوس نہیں کیا۔'' یہ کہہ کر مبارک شاہ اپنے مصلے پر بیٹھ گیا۔

''آپ نے مجھے کیوں یاد کیا ہے بابا؟'' اورنگ زیب پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

''میں یہاں سے جا رہا ہوں شہزادے!'' مبارک شاہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس لئے وقتِ رخصت چاہتا تھا کہ تمہیں جی بھر کے دیکھ لوں۔''

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اورنگ زیب نے گھبرا کر کہا۔

''یہاں سے بہت دُور!'' قلندر نے مختصر جواب دیا۔

''کیا ہندوستانی مملکت کی سرحدوں سے بھی دُور؟'' اورنگ زیب نے پوچھا۔

''ہاں! اس آپ کی زمین سے الگ، آسمان سے دُور۔'' قلندر نے اس طرح کہا کہ اس کی آواز میں کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

اورنگ زیب کی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ مبارک شاہ قلندر واضح طور پر سفرِ آخرت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ مگر ظاہری اعتبار سے یہ بات بہت مشکل نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ قلندر پوری طرح

تندرست تھا اور کسی بیماری کی کوئی علامت نمایاں نہیں تھی۔

''بابا! آپ ابھی کس طرح جا سکتے ہیں؟ کیا سرزمینِ ہند کو ویران کر جائیں گے؟'' یکایک اورنگ زیب کے لہجے سے گہری اُداسی جھلکنے لگی تھی۔

''کسی شخص کے چلے جانے سے خدا کی زمین مقبرہ نہیں بن جاتی۔'' قلندر نے بلند آواز میں کہا۔ ''یہ دلفریب اور ایمان شکن رونقیں اس وقت تک برقرار رہیں گی جب تک کہ خداوند ذوالجلال کی عدالتِ عالیہ قائم نہیں ہو جائے گی۔ وہ عدالت، جہاں ایک ایک ذرّے کا حساب لیا جائے گا۔ جہاں بہت سے مزدور، شہنشاہ بن جائیں گے۔ اور شہنشاہ، گداگر ٹھہریں گے۔ جہاں فانوس اور قندیل والوں کا مقدر کبھی نہ ختم ہونے والا اندھیرا ہو گا اور اندھیروں میں رہنے والے، نورِ لازوال سے فیض یاب ہوں گے۔ جہاں ساری ناہمواریاں ختم کر دی جائیں گی اور نیک اعمال کے سوا کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا۔''

مبارک شاہ قلندر کا لہجہ اس قدر پُرجلال تھا کہ اورنگ زیب کانپنے لگا۔

''شہزادے! میں نے تمہیں اسی لئے بلایا ہے کہ آخری بار کچھ نصیحتیں کر سکوں۔'' مبارک شاہ نے اورنگ زیب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے باپ، شاہ جہاں نے میری بہت عزت کی ہے۔ اس لئے میں اس کے حق میں دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نے میری زندگی میں اپنے دربار سے ایک کافرانہ رسم ختم کی اور انسانوں کو انسان سمجھا۔ مگر ابھی اس کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ اور ان دشواریوں کو تم ختم کرو گے۔ یہ بھاری پتھر اور زہریلے کانٹے تم جیسے انسان کے منتظر ہیں۔ جب خدا تمہیں اختیار دے تو کسی پتھر اور کسی کانٹے کو راستے میں نہ چھوڑ دینا..... چاہے تمہارے ہاتھ ہی زخمی کیوں نہ ہو جائیں..... تمہیں ان راہوں کو صاف کرنا ہی ہو گا۔''

''میں کس طرح کروں گا بابا؟'' اورنگ زیب نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''اقتدار میرے بڑے بھائیوں کو ملے گا، پھر اس سلطنت میں میری کیا حیثیت ہو گی؟''

''یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اقتدار کسے حاصل ہو گا؟'' قلندر نے بہت آہستہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے مشروط بات کہی ہے۔ اگر خدا تجھے اختیار دیدے تو ہوش و حواس میں رہنا اور اللہ کے بندوں کو مایوس نہ کرنا۔ تیری خواہشوں سے دنیا کا نظام نہیں بدلے گا مگر کوشش کرنا انسانی فرض ہے۔ اگر اس فرض سے چشم پوشی کی تو ہلاک ہو جائے گا۔ موت تو ان شہنشاہوں کو بھی کھا گئی ہے، جو چار گھڑی کے لئے خدا بن بیٹھے تھے..... تُو بھی ایک دن مر جائے گا..... مگر انہیں دوسری موت نہیں آئے گی جو خدا کے بندوں کے حقوق ادا کرتے رہے۔''

شہزادہ اورنگ زیب پر لرزہ طاری تھا اور آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

''فانی چیزوں کے لئے آنسو نہیں بہاتے۔'' قلندر نے اورنگ زیب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اپنے دل کو خدا کی یاد سے آباد کر اور آنکھوں کو اس دن کے خوف سے اشک ریز کر جب

تمام نسلِ آدم اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہو گی۔'' یہ کہہ کر مبارک شاہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

اورنگ زیب کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

''اور جب میں دنیا سے چلا جاؤں تو میری قبر کو بے نشان رہنے دینا۔'' قلندر نے اورنگ زیب کو ہدایت کرتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کچھ لوگ مرنے کے بعد میری ذات کو تماشا بنانے کی کوشش کریں مگر تُو انہیں سختی سے روک دینا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری قبر کو قیمتی پتھروں سے آراستہ کر کے مقبرہ بنا دیا جائے۔ اسی جھونپڑی کے ایک گوشے میں مجھے دفن کر دینا تا کہ اپنے شاہ کے قدموں میں پڑا رہوں۔'' مبارک شاہ نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی ہو گا، بابا!'' شدتِ غم سے اورنگ زیب کی آواز لرز رہی تھی۔

''بس، اب تم جاؤ شہزادے!'' یہ کہہ کر مبارک شاہ کھڑا ہو گیا۔ ''خبردار! میرے اس سفر کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تجھے اپنا سمجھ کر یہ راز فاش کر دیا ہے۔''

اورنگ زیب نے قلندر کے سامنے اپنی گردن خم کر دی۔

''اگر آپ اجازت دیں تو یہ چادر اپنے پاس رکھ لوں؟'' اورنگ زیب نے چادر کو سر سے کھولتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی اس نشانی کو میں اپنے لئے سعادت سمجھوں گا۔''

''ایک فانی کی نشانی ہی کیا؟'' قلندر مسکرا دیا۔ پھر اورنگ زیب سے چادر لے لی اور اسے دوبارہ اپنے ہاتھ سے شہزادے کے سر پر باندھتے ہوئے بولا۔ ''اگر تُو ایک فقیر کی اس نشانی کو سعادت سمجھتا ہے تو اپنے پاس رکھ لے۔ ورنہ زربفت و کمخواب کی دنیا میں اس معمولی کپڑے کو پوچھنے والا کون ہے؟''

پھر مبارک شاہ نے اورنگ زیب کو گلے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

''تجھے خدا کے حوالے کرتا ہوں کہ اوّل و آخر وہی تیرا محافظ و نگہبان ہے۔''

اس کے بعد قلندر جھونپڑی کے باہر آیا اور مغل شہزادے سے گھوڑے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اورنگ زیب، قلندر کے سامنے گھوڑے کی پشت پر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا مگر مبارک شاہ کے اصرار پر اُسے ایسا کرنا پڑا۔ پھر جب اورنگ زیب، گھوڑے پر سوار ہو گیا تو قلندر، گھوڑے کی لگام پکڑ کر چند قدم تک آگے بڑھا۔ اورنگ زیب بہت شرمسار نظر آ رہا تھا لیکن قلندر کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔ آخر کچھ دُور چل کر مبارک شاہ نے گھوڑے کی لگام چھوڑ دی اور اورنگ زیب کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔

اورنگ زیب مڑ مڑ کر مبارک شاہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ قلندر کا چہرہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر مبارک شاہ نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار پر آخری بار حاضری دی، آتمارام کو کچھ

نصیحتیں کیں اور جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔

آتمارام نے وہ رات جھونپڑی کے باہر گزاری کیونکہ قلندر کا یہی حکم تھا۔

صبح جب مبارک شاہ فجر کی نماز کو نہیں اٹھا تو آتمارام کو فکر لاحق ہوئی۔ مگر پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ قلندر شب بیدار انسان تھا۔ ممکن ہے، نیند غالب آ گئی ہو۔

پھر چاروں طرف دھوپ پھیل جانے کے بعد بھی قلندر باہر نہیں آیا تو آتمارام مضطرب ہو کر جھونپڑی کے اندر داخل ہو گیا۔ مبارک شاہ گہری نیند سو رہا تھا۔ آتمارام نے قریب جا کر دیکھا۔ قلندر بے حس و حرکت نظر آ رہا تھا۔ آتمارام نے گھبرا کر کئی آوازیں دیں مگر قلندر نے نہ کوئی جواب دیا اور نہ کروٹ لی۔ آتمارام نے مبارک شاہ کو چھو کر دیکھا۔ قلندر کا بدن سرد تھا، آنکھیں نیم وا تھیں جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔

آتمارام کچھ دیر تک سکتے کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر اُس کی چیخوں سے آگرے کے در و دیوار گونج اُٹھے۔

''لوگو!..... مبارک شاہ قلندر دنیا سے رخصت ہو گئے۔''

۞.....۞.....۞

مبارک شاہ قلندر کے انتقال کی خبر سے آگرے میں ایک کہرام سا مچ گیا۔

دارالحکومت کے غریب باشندے گریہ وزاری کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نکل آئے اور فتح پور سیکری کی طرف بڑھنے لگے۔

آج وہ شخص دنیا سے اُٹھ گیا تھا، جس نے کبھی شاہانِ وقت کے آگے سر نہیں جھکایا۔ اُس نے جہانگیر اور نور جہاں کے دورِ حکومت میں بڑی اذیتیں برداشت کیں مگر گردن میں معمولی سا کج بھی نمایاں نہیں ہوا۔ قلندر کا پورا جسم زخموں سے داغ دار تھا مگر کبھی اس کے ہونٹوں سے شورِ فغاں بلند نہیں ہوا۔ جہانگیر نے کئی بار اس کا خالی دامن، لعل و جواہر سے بھر دینا چاہا مگر قلندر نے شہنشاہ کی ہر پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ وہ زندگی بھر محنت و مزدوری کر کے اپنی روزی حاصل کرتا رہا۔ اس نے کبھی کسی امیر یا حکمراں کا کوئی عطیہ قبول نہیں کیا۔ وہ آزاد پیدا ہوا اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے زمانے کی تمام بڑی طاقتوں سے ٹکرایا۔ یہاں تک کہ اس نے آخری سانس تک نفس کی غلامی کی زنجیر نہیں پہنی۔

شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں اُس نے چین کی چند سانسیں لیں۔ اور پھر اتنی خاموشی کے ساتھ دنیا سے چلا گیا کہ کسی کو بھی اس کے جانے کا یقین نہیں آتا تھا۔

آگرے کے بے شمار غریب و محتاج مرد اور بہت سی بیوہ عورتیں، قلندر کو یاد کر کے رو رہے تھے کہ مصیبت کے دنوں میں وہی ان کا ایک غمگسار تھا۔ قلندر کی ایک خاص عادت تھی کہ جب ہندوستان کا کوئی امیر وزیر اسے کوئی نذر پیش کرتا تو وہ صاف صاف کہہ دیتا۔

"میں اسے ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اگر تیری خواہش ہے کہ میں اس نذر کو قبول کرلوں تو فلاں دروازے پر جاؤ اور اس بیوہ کو ساری رقم دے دو جس کی چار جوان بیٹیاں شادی کے لئے بیٹھی ہیں۔"

قلندر کا یہی طریقہ تھا کہ وہ اسی طرح غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ اس کے علاوہ خود بھی دن بھر مزدوری کرتا اور جتنی رقم حاصل ہوتی، اسے بھی محتاجوں میں تقسیم کر دیتا۔ قلندر کی غذا نمک کے پانی کے ساتھ صرف دو روٹیاں تھیں۔ آخری سانس تک اس نے اپنے اخراجات کا بار کسی دوسرے شخص پر نہیں ڈالا۔ وہ غریبوں، محتاجوں اور بیواؤں کا مسیحا تھا اور آج وہی مسیحا اس عالمِ فانی سے بہت دُور جا چکا تھا۔

قلندر کے جنازے میں بے شمار انسان شریک ہوئے۔ عوام کا اس قدر ہجوم تھا کہ اس پر قابو پانے کے لئے شہزادہ اورنگ زیب کو فوج طلب کرنا پڑی۔ بڑے بڑے امراء، مبارک شاہ کو کاندھا دینے کے لئے بے قرار نظر آ رہے تھے۔ آگرے کے لاتعداد باشندے، قلندر کا آخری دیدار کرنے کے لئے بے چین تھے۔

اورنگ زیب نے مبارک شاہ کے عقیدت مندوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے قلندر کا جنازہ فتح پور سیکری کے بڑے میدان میں رکھوا دیا اور شاہی نقیبوں کے ذریعے بار بار اعلان کیا جا رہا تھا کہ لوگ نظم و ضبط کے ساتھ آئیں اور قلندر کا چہرہ دیکھ کر تیز رفتاری کے ساتھ گزر جائیں۔

شاہی انتظامات کے باوجود سینکڑوں انسان اپنے مسیحا کے آخری دیدار کی سعادت حاصل کرنے سے محروم رہ گئے۔

بالآخر بہتے ہوئے آنسوؤں اور دبی دبی سسکیوں کے درمیان مبارک شاہ کو قبر میں اُتار دیا گیا۔ شہزادہ اورنگ زیب، تجہیز و تکفین سے تدفین تک ہر مرحلے پر پیش پیش رہا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مغل شہزادے کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے مگر ہونٹوں پر شورِ فغاں نہیں تھا۔ اس نے بڑے صبر و ضبط کے ساتھ مبارک شاہ کو قبر میں اُتارا اور پھر مٹی ڈالتے ہوئے با آواز بلند آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی۔

(ترجمہ) "ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ ایک دن اسی مٹی میں ملا دیں گے اور پھر اسی مٹی سے دوبارہ اُٹھائیں گے۔"

اس موقع پر گیانی آتمارام کا برا حال تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"قلندر! مجھے کس کے سہارے اس ریاکار دنیا میں اکیلا چھوڑ گئے؟..... اب میں کس کی صورت دیکھ کر زندہ رہوں گا؟..... اے موت و حیات کے مالک! مجھے بھی اُٹھا لے کہ مبارک شاہ کے بغیر یہ زندگی ایک الزام بن کر رہ گئی ہے۔"

آتمارام کی فریاد سن کر بے شمار آنکھیں اشک بار ہو گئی تھیں۔ اورنگ زیب اس راز سے

واقف تھا کہ گیانی آتمارام، قلندر کا خادمِ خاص ہے، اس لئے وہ آتمارام کے قریب آیا اور بہت نرم لہجے میں کہنے لگا۔

"اب تم مسلمان ہو گئے ہو۔ اور ایک مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کی قبر پر کھڑے ہو کر ماتم کرے۔ تمہیں صبر سے کام لیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ قلندر نے کس خاموشی سے زندگی بسر کی۔ بڑی سے بڑی آزمائش کے وقت بھی ان کے ہونٹوں سے کوئی چیخ نہیں اُبھری۔ اس دنیا نے انہیں زخموں اور دل کے داغوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ مگر پھر بھی انہوں نے زمانے سے کوئی شکایت نہیں کی۔ ایک خادم کی حیثیت سے تمہیں ان کی تعلیمات پر استقامت کے ساتھ عمل کرنا چاہئے اور ان کے پیغام کو ایسے لوگوں تک پہنچانا چاہئے جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔"

آتمارام نے بڑی حسرت سے اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔

"شہزادے! تم اس شخص کو صبر کی تلقین کر رہے ہو، جس کا سب کچھ چھن گیا۔ میں اپنی ذات کے لئے تو روتا ہی ہوں کہ آج قلندر کے بغیر میں یتیم ہو گیا۔ مگر مجھے ان لاکھوں مسلمانوں کا بھی غم ہے، جو مبارک شاہ سے محروم ہو گئے۔ ابھی یہ لوگ اپنے نقصان کا اندازہ نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جب انہیں محرومی کا احساس ہو گا تو شدتِ غم سے ان کے سینے پھٹ جائیں گے اور بے چین روحوں میں ناسور پیدا ہو جائیں گے۔ ایسے ناسور جو مستقل رِستے ہی رہیں گے اور ان کا کوئی مداوا نہیں ہو گا۔ شہزادے! میں اپنے پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مبارک شاہ قلندر کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ تختِ ہندوستان پر شہنشاہ آتے رہیں گے، جاتے رہیں گے مگر قلندر دوبارہ نہیں آئے گا۔"

یہ کہہ کر گیانی ہچکیوں سے رونے لگا۔ آج بوڑھا آتمارام ایک کم سن بچہ بن گیا تھا۔ ایسا بچہ، جس کے سر سے اچانک باپ کا سایہ اُٹھ جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بھری دنیا میں تنہا پا کر چیخنے لگتا ہے۔

"بے شک! تم سچ کہتے ہو گیانی! کہ قلندر اب دوبارہ نہیں آئیں گے۔ مگر یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ ہم ان کی دعاؤں سے محروم نہیں ہوئے ہیں۔" شہزادہ اورنگ زیب نے آتمارام کو مزید تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھو! کہ دعاؤں کو موت نہیں آتی۔ ہم جب تک قلندر کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے، ان کی دعائیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔"

آتمارام وقتی طور پر خاموش ہو گیا تھا لیکن اُس کی آنکھیں مسلسل اشک برسا رہی تھیں۔

پھر کچھ دن بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آتمارام مستقل طور پر قلندر کی قبر کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ بس پانچ وقت کی نماز کے لئے قریبی مسجد میں جاتا تھا اور پھر واپس آ کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ جاتا۔ (آتمارام جس مسجد میں نماز ادا کرتا تھا، وہ فتح پور سیکری کی جامع مسجد تھی جو حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار سے ملحق ہے)

بعض امراء نے آتمارام کی یہ حالت دیکھ کر اس کے دونوں وقت کے کھانے کا انتظام کرنا چاہا مگر گیانی نے ان کی یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ وہ دن رات میں دو سوکھی روٹیاں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے لنگر خانے سے حاصل کرتا رہا اور با آواز بلند کہا کرتا تھا۔

''میں اپنے شہنشاہ کی رعایا ہوں اور اسی کے خزانے سے یہ دو روٹیاں حاصل کرتا ہوں۔ ہندوستان کے کسی باشندے کا مجھ پر کوئی احسان نہیں ہے۔''

اور جو لوگ نذریں لے کر آتے تھے، انہیں آتمارام، مبارک شاہ قلندر کی طرح غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

اگر کبھی کوئی شخص آتمارام سے دعا کے لئے کہتا تو وہ انکار کر دیتا۔

''میرے پاس کیوں آئے ہو؟ تم نہیں جانتے کہ میں کتنا گناہ گار شخص ہوں۔ میری دعا میں کیا تاثیر ہوگی؟''

پھر بھی اگر کوئی دُکھوں کا مارا بضد ہو جاتا تو آتمارام دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیتا۔

''اے اللہ! تُو خوب جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور میں نے کس طرح زیست بسر کی ہے پھر بھی تیرا یہ ضرورت مند بندہ، میرے پاس حُسنِ ظن لے کر آیا ہے۔ تُو مبارک شاہ قلندر کے طفیل اس کی فریاد سن لے اور اس پر اپنے کرم کی بارش کر دے۔''

''آتمارام کی دعاؤں سے لوگوں کے بگڑے ہوئے کام بن جاتے اور جب لوگ اس کے سامنے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو وہ سخت برہم ہو جاتا۔

''میں اپنی حیثیت سے خوب واقف ہوں۔ اگر تمہارے غم دُور ہو گئے تو اس خدا کا شکر ادا کرو جو اپنی ذات میں تنہا ہے اور اس کے سوا کوئی مشکل کشا نہیں۔ مجھ گناہ گار کو نظر انداز کر دو اور مبارک شاہ قلندر کے حق میں دعائے خیر کرو کہ وہ بھی رات رات بھر تمہاری سلامتی کے لئے دعائیں کرتے رہتے تھے۔''

❀.....❀.....❀

جب سرکاری پرچہ نویسوں نے شاہ جہاں کو مبارک شاہ کے انتقال کے بارے میں تحریر کیا تو ہندوستان کا حکمراں سناٹے میں آ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قلندر اس طرح چپ چاپ دنیا سے گزر جائے گا۔

پھر شاہ جہاں نے نم ناک آنکھوں کے ساتھ ممتاز محل کو یہ غم انگیز خبر سنائی۔

''ممتاز! وہ شخص ہم سے خفا ہو گیا، جو تمہیں ملکۂ عالیہ اور مجھے شاہ جہاں کہہ کر پکارتا تھا۔''

کچھ دیر کے لئے ممتاز محل کی حالت غیر ہو گئی اور اس کی نظروں کے سامنے پورا ماضی اُبھر آیا، جب شاہ جہاں معتوب تھا اور اس کی حیثیت ایک وزیرزادی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس وقت بھی مبارک شاہ قلندر اسے ملکۂ عالیہ کہہ کر آواز دیتا تھا۔

''شاہِ والا! وہ روشن ضمیر، دنیا سے چلا گیا جس نے آپ کے ہاتھوں ہندوستان کی حکومت فروخت کی تھی۔'' ممتاز محل نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ اُس کی خوب صورت اور کشادہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

''ہاں ممتاز!..... ہم مبارک شاہ کی دعاؤں سے محروم ہو گئے۔'' شاہ جہاں کی آنکھیں بھی اشک برسانے لگی تھیں۔ ''حق مغفرت کرے۔ عجب آزاد مرد تھا۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے زنجیر نہیں پہنا سکی۔ مبارک شاہ ایک ایسا سورج تھا، جس کی موجودگی سے اندھیرے کانپتے تھے۔ اب ہندوستان کا خدا حافظ ہے۔'' شاہ جہاں کی آواز لرز رہی تھی۔ ''ہمیں مبارک شاہ کے دم سے بڑی تقویت حاصل تھی۔ ہم اکثر ایوانِ شاہی کے نرم بستروں پر چین کی نیند سو جایا کرتے تھے۔ مگر قلندر سخت اور کھردری زمین پر بیٹھا جاگتا رہتا تھا۔ اس کے ہاتھ اہلِ ہند کی سلامتی کے لئے اُٹھے رہتے تھے اور اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ دعائیہ کلمات لرزتے رہتے تھے۔ مبارک شاہ نے اپنے لئے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ وہ عام مسلمانوں کے لئے فلاح و خیر مانگتا تھا۔ قلندر کی اسی عادت نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اگر اس کے کردار میں دنیا پرستی کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ شہنشاہ جہانگیر سے سونے کا ڈھیر لے کر اپنے لئے شاندار محل تعمیر کر لیتا۔'' یہ کہہ کر شاہ جہاں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر بڑے حسرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ممتاز! افسوس ہے کہ اتنے وسائل رکھتے ہوئے بھی ہم بندگانِ خدا کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ اور مبارک شاہ فاقہ کشی کی حالت میں لوگوں کے دلوں پر حکومت کر گیا۔''

''بے شک! وہ بہت بڑے انسان تھے۔'' ممتاز محل نے شدید جذباتی لہجے میں کہا۔ ''شہنشاہوں سے بھی بڑے۔''

ممتاز نے جوش میں یہ بات کہہ دی تھی مگر پھر فوراً ہی اسے اپنی لغزشِ زبان کا احساس ہو گیا اور اس نے گھبرا کر شوہر کی طرف دیکھا۔

شاہ جہاں اپنی بیوی کی نظروں کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی ممتاز محل کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو ممتاز!..... مبارک شاہ قلندر واقعتاً شہنشاہوں سے بڑے انسان تھے۔ ہم شمشیر کی طاقت کے ذریعے انسانوں کے جسموں پر حکومت کرتے ہیں۔ مگر قلندر نے دلوں کو فتح کر لیا تھا..... اور دلوں کا فاتح ہی سب سے بڑا فاتح ہے۔''

''خدا کا شکر ہے کہ آپ نے میرے الفاظ کے معنی سمجھ لئے۔'' ممتاز نے اطمینان کی ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تمام عمر اس بات کا قلق رہے گا کہ ہم قلندر کی خدمت نہ کر سکے۔''

''میں نے بہت کوشش کی تھی کہ قلندر کچھ دنوں کے لئے محل کے ایک گوشے کو اپنے قیام سے روشن کر دیں مگر انہیں تو وہ کھردری زمین، اُڑتی ہوئی ریت اور بارش میں ٹپکتی ہوئی جھونپڑی پسند تھی۔ آخر میں نے گزارش کی تھی کہ وقفے وقفے سے ان کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں۔

مگر قلندر کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی۔ انہوں نے سختی سے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ان سے ملاقات کرنے کی بجائے خدا کے بندوں کی خدمت کروں۔ یہی ان کی عظمت تھی کہ وہ ہر موقع پر اپنی ذات کی نفی کرتے تھے۔ بس انہیں ایک ہی خیال رہتا تھا کہ کسی طرح اللہ کے بندے سکون پا جائیں۔'' شاہ جہاں نے گزری ہوئی باتوں کو دہراتے ہوئے کہا۔

ممتاز محل کے آنسو بہہ رہے تھے۔

''قلندر ایک باپ سے بھی زیادہ شفیق و مہربان تھے۔ پھول کی پتی اور موم کی طرح نرم..... مگر جب مذہبی اصولوں کی بات آتی تھی تو وہ پہاڑوں کی چٹانوں سے بھی زیادہ سخت نظر آتے تھے۔ افسوس! ہماری مملکت ویران ہوگئی۔ یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ ہم ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکے۔''

''پرچہ نویسوں نے قلندر کی تدفین کی تمام تفصیلات تحریر کی ہیں۔'' شاہ جہاں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''شہزادہ اورنگ زیب، جنازہ اٹھائے جانے سے قبر کی منزل تک ہر مرحلے میں شریک تھا۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے شاہِ والا! اورنگ زیب کی شرکت ہماری محرومی کا علاج تو نہیں۔'' ممتاز نے نمناک آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''ہاں ممتاز! یہ محرومی اپنی جگہ ہے۔ اب اس کا مداوا ممکن نہیں۔'' یکایک شاہ جہاں کی پیشانی پر کچھ لکیریں نمایاں ہوگئی تھیں اور ایک تکلیف دہ خیال بار بار اس کے ذہن میں اُبھر رہا تھا۔ ''میں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں ہندوستان پر کوئی آفت نازل نہ ہو جائے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، شاہِ والا!'' ممتاز نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم نے قلندر کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی۔''

''تمہاری یہ بات درست ہے۔ مگر عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب ایسی کوئی شخصیت دنیا سے اُٹھتی ہے تو بعد میں آنے والا وقت خوشگوار نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی موجودگی ہمیشہ باعثِ رحمت ہوتی ہے۔ میرا معاملہ تو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہم پر کیسی کیسی آزمائشیں آئیں، کتنے جان لیوا لمحات ہمارے قریب سے گزرے مگر دشمن ہم پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے۔ یہ سب قلندر کی دعاؤں کا صدقہ تھا۔ ہم جب بھی مصائب کے اندھیروں میں گھر جاتے تھے تو ہمیں غیر محسوس طور پر مبارک شاہ کی آواز سنائی دیتی تھی کہ ایک دن یہ تمام اندھیرے فنا ہو جائیں گے اور پھر کامرانیوں کا سورج طلوع ہوگا۔ بے شک! ہماری فتوحات کا سورج تو طلوع ہوگیا مگر معرفت کا خورشیدِ ضیاء بارغروب ہوگیا۔ اب مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ خدا خیر کرے! میں سخت بے چینی محسوس کر رہا ہوں۔''

❀.....❀.....❀

مبارک شاہ قلندر کے انتقال کے چند دن بعد ہی ہندوستان کے کچھ علاقوں پر قیامت سی

نازل ہوگئی۔

1630ء میں دکن، گجرات اور خاندیش میں خوفناک قحط پڑ گیا۔ اس قحط کے دوران ہزاروں افراد موت کی خوراک بن گئے۔

بھوک کی شدت کا یہ عالم تھا کہ والدین نے اپنے بچوں کو لقمہ بنالیا۔ تاریخ آدم کا یہ ہولناک ترین باب تھا کہ خون کے رشتے فنا ہوگئے تھے اور اولاد کی محبت پر بھوک غالب آگئی تھی۔

ہر جگہ آفات و مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ اشیائے خورونوش کے تاجر بگڑے ہوئے حالات سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے آٹے میں انسانوں کی ہڈیاں پیس کر ملا دی تھیں اور کتوں کا گوشت بیچنا شروع کر دیا تھا۔

قحط کے دوران مختلف وبائیں پھوٹ پڑی تھیں جن کے باعث مزید ہزاروں افراد موت کے منہ کا نوالہ بن گئے تھے۔ گاؤں کے گاؤں ویران ہوگئے تھے اور گلی کوچوں میں انسانی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ بڑی شاہراہوں پر اس قدر تعفن پیدا ہوگیا تھا کہ وہاں سے گزرنا دُشوار تھا۔ مجبوراً بہت سے لوگ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دوسرے شہروں کی طرف نکل گئے تھے۔

بھوک، تباہی اور بربادی کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے ایک دوسرے کو ہلاک کر کے اپنی خوراک بنالیا تھا۔ مرنے والوں کی وجہ سے گزرگاہیں بند ہوگئی تھیں۔ جس شخص میں ذرا سی بھی سکت باقی تھی، وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، ایک شہر سے دوسرے شہر مارا مارا پھر رہا تھا کہ کسی طرح پیٹ کی آگ بجھا سکے۔ وہ علاقے جو اپنی زرخیزی اور شادابی کے لئے مشہور تھے، بالکل بنجر اور ویران ہوگئے تھے۔

شاہراہیں لاشوں سے اٹی پڑی تھیں اور وہاں سے کسی انسان کا گزرنا محال تھا۔ ہر وقت مُردہ خور گِدھ، چیل اور کوے شہری حدود میں منڈلاتے رہتے تھے۔ وہ بڑا عبرت ناک منظر ہوتا، جب ایک زندہ انسان دوسرے مُردہ انسان کی لاش کو پکڑ کر گھسیٹتا اور شہر سے باہر پھینک آتا۔ اس طرح گزرنے کے لئے تھوڑا بہت راستہ نکل آتا تھا۔

غذائی اجناس کی قلت کا یہ عالم تھا کہ اس سے انگریز بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ قیمتیں سات گنا ہوگئیں۔ غریب اور متوسط طبقے کے لوگ اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ وبائیں پھوٹیں تو مزید ہزاروں افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔ بے شمار لوگ گلیوں میں دم توڑتے اور سسکتے نظر آتے تھے۔ گیارہ انگریز اور تین ولندیزی بھی اس قحط کی زد میں آئے۔ انگریزوں کے ایک کارخانے کا مالک بھی وباء کی لپیٹ میں آکر مر گیا۔

گلیوں میں سسکتے ہوئے لوگ ہر آنے جانے والے سے کہتے۔ ''ہمیں کھانے کو دو یا پھر ہمارا گلا گھونٹ کر ہمیں ہلاک کر ڈالو۔''

پھر کچھ دن بعد طوفانی بارش ہوئی تو اس نے مصیبتوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس قدر شدید سیلاب آیا کہ غریبوں کے مکان بھی بہہ گئے اور ساری زمین بے کار ہو کر رہ گئی۔

شاہ جہاں اور ممتاز محل کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ شاہ جہاں ایک حساس اور دردمند حکمران تھا۔ اس سے رعایا کی تباہی کے یہ مناظر دیکھے نہیں جاتے تھے۔ شاہ جہاں نے عوام کو اس بربادی سے بچانے کے لئے جان توڑ کوششیں کیں۔ اس نے فوری طور پر برہان پور، احمد آباد اور سورت کے کچھ علاقوں میں لنگر جاری کر دیئے۔ عوام میں روزانہ اشیائے خورونوش تقسیم کی جاتیں۔ صرف برہان پور میں پیر کے دن قحط زدہ لوگوں میں پانچ ہزار روپے بانٹے جاتے تھے۔ اس طرح شاہ جہاں نے پانچ مہینے کے مختصر سے عرصے میں ایک لاکھ روپیہ تقسیم کیا۔ احمد آباد میں حالات زیادہ مخدوش تھے، جس کے نتیجے میں صرف اس علاقے کے لئے شاہ جہاں نے پچاس ہزار روپے کی امداد منظور کی۔ اس کے علاوہ ستر لاکھ کا مالیہ معاف کیا گیا۔

ممتاز محل نے اپنے ذاتی وظیفے میں سے ایک کثیر رقم قحط کا شکار ہونے والے مظلوم انسانوں میں تقسیم کی۔ شاہ جہاں کی درخواست پر بہت سے منصب داروں نے بھی اپنی اپنی جاگیروں میں مالیہ معاف کر دیا۔

جب تک ان علاقوں میں قحط کے عفریت منڈلاتے رہے، شاہ جہاں کے شب و روز بڑی بے قراری کے عالم میں گزرے۔

وہ اکثر آدھی رات کو اُٹھتا اور سجدے کی حالت میں بھکاریوں کی طرح گڑگڑاتا۔

''اے خالقِ ارض و سما! ہم تیری مملکت میں رہتے ہیں۔ تجھی سے تیرے رحم کی درخواست کرتے ہیں۔ بحیثیت حکمراں اگر مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے تو مجھے معاف فرما دے۔ میں تجھ سے تیرے فضل و کرم کی بھیک مانگتا ہوں۔ اور اپنے ان بندوں کے گناہوں کو بھی معاف کر دے، جن کے حقوق کی نگرانی میرے سپرد کی گئی ہے..... میں روزِ حشر کے احتساب سے ڈرتا ہوں..... اگر میری غفلت سے کوئی ایک انسان بھی موت کے منہ تک پہنچ گیا تو میں تجھے کیا جواب دوں گا؟..... اے بے پناہ کرم والے! مجھے رُسوائی سے بچا لے کہ تیرے سوا میرا کوئی معبود نہیں، کوئی مددگار نہیں۔''

شاہ جہاں رات رات بھر اپنے خدا کے حضور گریہ وزاری کرتا۔ پھر جب یہ قحط کی وبا ٹل گئی تو وہ اُداس چہرے کے ساتھ دارالحکومت آگرہ پہنچا۔ ہزاروں انسانوں کی موت نے اس کے اعصاب پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔

آگرہ کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس کے سینے کا ایک اور داغ سلگنے لگا۔ یہ مبارک شاہ قلندر کی موت کا غم تھا، جس نے کئی ماہ سے اسے شدید اذیت و کرب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ عام لوگ سمجھ رہے تھے کہ شاہ جہاں آگرہ پہنچنے کے بعد پہلے شاہی محل میں داخل ہوگا اور پھر مبارک شاہ قلندر کی قبر پر جائے گا۔ مگر یہ اندازے اس وقت غلط ثابت ہو گئے، جب شاہ جہاں براہِ راست فتح پور سیکری پہنچا اور قلندر کی قبر پر حاضری دی۔

مقربینِ خاص اور دیگر امراء نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مبارک شاہ کی قبر پر پہنچ کر شاہ

جہاں زار و قطار رو رہا تھا اور اس کی زبان سے بار بار یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

''اے خدا! ہمیں قلندر کی موت کا صدمہ برداشت کرنے کی ہمت دے..... ہم تیرے بہت کمزور اور گناہگار بندے ہیں۔''

اس کے بعد شاہ جہاں نے ایک کثیر رقم غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کی۔

پھر دربار پہنچ کر اس نے سب سے پہلا حکم جاری کیا کہ مبارک شاہ قلندر کی قبر پر ایک شاندار روضہ تعمیر کیا جائے۔

شہزادہ اورنگ زیب دربار میں موجود تھا۔ جیسے ہی شاہ جہاں خاموش ہوا، اورنگ زیب اپنی جگہ سے چند قدم آگے بڑھا اور تختِ شاہی کے قریب پہنچ کر بصد احترام عرض کرنے لگا۔

''شاہِ والا! قلندر کی وصیت تھی کہ اس کی قبر پر کوئی پختہ عمارت تعمیر نہ کی جائے۔''

اورنگ زیب کی بات سن کر دربار پر سناٹا چھا گیا۔

''مبارک شاہ نے یہ وصیت کسے کی تھی؟'' شاہ جہاں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں انتقال کی رات ان کے قریب تھا۔'' شہزادہ اورنگ زیب نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''قلندر مرنے کے بعد بھی کسی کا احسان قبول کرنا نہیں چاہتے تھے۔''

مبارک شاہ کی وصیت کے انکشاف کے بعد بیشتر امراء نے بڑی حیرت سے شہزادہ اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ ان کے خیال میں یہ قربت بے سبب نہیں تھی۔ شاہ جہاں پہلے ہی اس راز سے باخبر تھا کہ مبارک شاہ، اورنگ زیب سے بے پناہ محبت کرتا ہے..... اور اس نے مرتے وقت بھی اپنی اسی والہانہ محبت کا ثبوت دیا تھا۔ شاہ جہاں کے ذہن میں کئی خیال اُبھر کر ڈوب گئے۔

❀.....❀.....❀

شاہ جہاں کو دکن کی طرف سے کچھ سکون حاصل ہوا تو پرتگالیوں کی فتنہ انگیزیوں نے اسے نئی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔

تقریباً ایک سو سال سے پرتگالیوں نے ہگلی میں اپنے قدم جما رکھے تھے۔ وہ ہندوستان کے ایک گوشے میں بیٹھ کر مختلف ممالک کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ نمک بنانے پر ان کی اجارہ داری قائم تھی اور اس علاقے کا انتظام عملی طور پر ان کے ہاتھوں میں تھا۔ پرتگالیوں نے سات گاؤں کی قیمت پر نئی بندرگاہ ''سونارگاؤں'' تعمیر کی تھی۔ جہانگیر کے دورِ حکومت میں مغل گورنروں نے پرتگالیوں کی سرگرمیوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ ان لوگوں نے 1608ء میں اپنا صدر مقام سونارگاؤں سے ڈھاکا منتقل کر لیا اور سیاست سے کام لیتے ہوئے اس کا نام بادشاہ کے نام پر ''جہانگیر نگر'' رکھ دیا گیا۔

پھر جب شاہ جہاں کی تخت نشینی کے بعد قاسم خان، گورنر مقرر ہوا تو اس نے شہنشاہ کو اطلاع دی کہ پرتگالی کسی وقت بھی مغلیہ سلطنت کے لئے بڑا خطرہ بن سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی

آبادیوں کی مضبوط قلعہ بندیاں کر لی ہیں، بحری جہازوں کی آمدورفت پر ٹیکس عائد کر دیا ہے او
سات گاؤں کو تباہی کی آخری حدود تک پہنچا دیا ہے۔

قاسم خان نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا کہ پرتگالی بدترین قزاق ہیں اور عورتوں اور بچوں
اغوا کر لیتے ہیں یا پھر انہیں خرید کر غلام بنا لیتے ہیں۔

شاہ جہاں خود بھی غیر ملکیوں کی اس قسم کی سرگرمیوں سے واقف تھا۔ لہٰذا اس نے ذاتی
دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا۔ اور ایک بار پھر وہ دارالحکومت آگرہ سے نکل کر برہان پور پہنچا۔

شاہ جہاں کو اچھی طرح یاد تھا کہ پرتگالیوں نے اس کے خلاف شہزادہ پرویز کی مدد کی تھی۔
اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان لوگوں نے شاہ جہاں کی تخت نشینی کے موقع پر رسم کے مطابق
تحائف روانہ نہیں کئے تھے۔

اس کے علاوہ ممتاز محل بھی پرتگالیوں سے شدید پرخاش رکھتی تھی۔ ایک بار جب شاہ جہاں
اور ممتاز محل، جہانگیر کے معتوب تھے اور اپنی جان بچانے کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل
ہو رہے تھے، اس وقت ایک پرتگالی نے شروع میں شاہی خاندان کی تھوڑی بہت مدد کی اور پھر
موقع ملتے ہی اپنی کشتیاں لے کر بھاگ گیا۔ اس طرح شاہ جہاں اور ممتاز محل ایک ویرانے میں
بے آسرا ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کشتیوں میں دو کنیزیں بھی تھیں جو ممتاز محل کی ذاتی خدمت گار
تھیں۔ پرتگالیوں نے ان شاہی کنیزوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا۔ پہلے ان کی آبروریزی کی
اور بعد میں جبر و تشدد کے ذریعے انہیں عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

اسی طرح 1629ء میں بھی کچھ پرتگالیوں نے ڈھاکہ کے قریب مسلمانوں کے ایک گاؤں
کو لوٹا تھا۔ پھر مزید وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک مغل خاتون کی آبروریزی کی
گئی۔ بعد ازاں اسے عیسائی مذہب میں شامل کیا گیا اور اس کی شادی ایک اوباش پرتگالی سے کر
دی گئی۔

شاہ جہاں کو پرتگالیوں کے یہ تمام مظالم یاد تھے مگر وہ کسی نئی فتنہ انگیزی کے پیشِ نظر ان تمام
چیزوں کو نظرانداز کر رہا تھا۔ مگر جب قاسم خان نے اپنے خط میں یہ تحریر کیا کہ صورتِ حال بہت
زیادہ سنگین ہے تو شاہ جہاں پرتگالیوں کی سرکوبی کے لئے آگرہ سے روانہ ہوا اور رنتھنبور کے
راستے مالوہ ہوتا ہوا یکم مارچ 1630ء کو برہان پور پہنچا۔

یہاں پہنچ کر تقریباً ایک سال تک شاہ جہاں دوسرے سیاسی مسائل میں اُلجھا رہا اور
پرتگالیوں کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اُٹھا سکا۔

اور پھر وہ لمحہ آ پہنچا جو شاہ جہاں کی زندگی کا سب سے اذیت ناک لمحہ تھا۔

7 جون 1631ء کو ممتاز محل سے ایک لڑکی گوہر آراء بیگم پیدا ہوئی (بعض مؤرخوں نے اس
لڑکی کا نام دہر آراء بیگم تحریر کیا ہے) اس لڑکی کی ولادت اپنی ماں کے لئے موت کا پیغام لے کر
آئی تھی۔

جب ممتاز محل کی حالت زیادہ بگڑنے لگی تو ممتاز محل نے اپنی بڑی بیٹی جہاں آراء بیگم کو
مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شاہِ والا کو فوراً بلاؤ..... شاید میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔"

ماں کی مایوسانہ گفتگو سن کر جہاں آراء رونے لگی۔

"جلدی کرو جہاں آراء!" ممتاز محل کی آواز لرز رہی تھی۔ "یہ گریہ وزاری کا وقت نہیں ہے۔
اگر میں اس دنیا سے چلی گئی تو یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے بھی بے شمار مائیں اپنی
اولاد کو تنہا چھوڑ کر آخرت کے سفر پر جا چکی ہیں۔ میرے بعد حوصلے سے کام لینا کہ اس فانی دنیا
کی یہی رسم ہے۔"

جہاں آراء زار و قطار روتی ہوئی ممتاز محل کے پاس سے اُٹھی اور شاہ جہاں کو تلاش کرنے
لگی۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر باپ پر پڑی، وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی آگے بڑھی۔

"شاہ بابا!..... شاہ بابا!" جہاں آراء بے اختیار چیخ رہی تھی۔ "جلدی چلئے۔ مادرِ گرامی کی
طبیعت بہت خراب ہے۔" یہ کہتے ہوئے جہاں آراء، باپ کے سینے سے لپٹ گئی۔

شاہ جہاں نے بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں جہاں آراء! تمہاری والدہ ٹھیک ہو جائیں گی..... مطمئن رہو۔ انہیں کچھ نہیں
ہوگا۔"

"نہیں شاہ بابا!..... صورتِ حال بہت خراب ہے۔" جہاں آراء کی آنکھوں سے مسلسل
آنسو بہہ رہے تھے۔

شاہ جہاں نے بیٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے سہارا دے کر اس کمرے میں لے
آیا، جہاں ممتاز محل بستر پر دراز تھی۔

شاہ جہاں نے ممتاز محل کے قریب پہنچ کر اسے دیکھا تو اپنی چیخ پر قابو نہ رکھ سکا۔ "یہ تمہیں
کیا ہو گیا ہے ممتاز؟"

ممتاز محل کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی اور اس کی خوب صورت آنکھیں بے
نور ہوتی جا رہی تھیں۔

"شاہِ والا.....!" ممتاز نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا اور بڑی مشکل سے فارسی زبان
میں یہ رباعی پڑھی۔

"ساعتِ وصال ختم ہوئی اور فراق کا لمحہ آ پہنچا..... دنیا کو کیا خبر کہ مصیبت اور جدائی نے
آپس میں اتفاق کر لیا ہے..... اے میرے محبوب کی آنکھ! تُو خون کے آنسو بہا کیونکہ ہمارے
بچھڑنے کا وقت بہت قریب ہے۔"

ممتاز محل کی غم انگیز گفتگو سن کر شاہ جہاں اس قدر بے قرار ہوا کہ اس کی آنکھوں سے بھی
آنسو جاری ہو گئے۔

"نہیں ممتاز! تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گی..... یہ کیسے ممکن ہے کہ خرم اس بے وفا دنیا میں تنہا بھٹکتا رہے اور ارجمند اسے راستے میں چھوڑ کر چلی جائے۔"

"شاہِ والا! یہ جھوٹی تسلیوں اور خوش گمانیوں کا وقت نہیں ہے۔" نقاہت کی وجہ سے ممتاز کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ "میں اپنی آنکھوں سے موت کے فرشتے کو دیکھ رہی ہوں..... وہ میرے قریب ہی کھڑا ہے۔"

یہ سن کر شاہ جہاں کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور اشکوں کی روانی میں شدت آ گئی۔

"خرم! میری باتیں غور سے سنو۔" یکایک ممتاز محل کا لہجہ بدل گیا۔ "دمِ رخصت، میں ہندوستان کے شہنشاہ کو نہیں، محبوب کو پکار رہی ہوں۔"

اس طرزِ تخاطب پر شاہ جہاں لرز اُٹھا اور اُس نے گھبرا کر ممتاز کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

"ارجمند! تم مجھے جس نام سے بھی چاہو پکارو..... یہ تمہارا حق ہے..... آج تم نے خرم کہہ کر ماضی کو زندہ کر دیا..... کاش! ہمارا ماضی کبھی فنا نہ ہوتا..... اور یہ کائنات اسی مقام پر ٹھہر جاتی، جہاں ممتاز محل "ارجمند" تھی اور شاہجہاں "خرم" تھا۔" ہندوستان کا جرأت مند اور بہادر حکمراں کسی بچے کی طرح رو رہا تھا۔

"تم گواہ رہو خرم! کہ میں نے کسی بھی حالت میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ کانٹوں کا سفر ہو یا پھولوں کی راہ گزر، میں ہمیشہ تمہارے دوش بہ دوش چلتی رہی۔ مگر اب مجبور ہوں کہ چند ساعتوں سے زیادہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس لئے میری باتیں غور سے سنو!"

شاہ جہاں نے بے قرار ہو کر اپنے ہونٹ ممتاز کے سرد ہاتھوں پر رکھ دیئے۔

"خدا نے تمہیں ایک عظیم الشان سلطنت کے ساتھ چار بیٹے اور چار بیٹیاں عطا کی ہیں۔ یہ میری نشانیاں ہیں، ان کی حفاظت کرنا..... کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دوسری عورت کی اولاد میری ان نشانیوں سے برسرِ پیکار ہو اور میں حشر تک قبر میں تڑپتی رہوں۔"

"تمہارے بعد ہم نئی شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" شدتِ غم سے شاہ جہاں کے جذبات بے قابو ہو گئے اور وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگا۔

"بس آخری خواہش خرم!" ممتاز محل کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ "میری قبر پر اپنی محبت کی ایسی یادگار تعمیر کرانا کہ رہتی دنیا تک اس کی کوئی دوسری مثال پیش نہ کی جا سکے۔ پھر جب صدیاں گزرنے کے بعد اہلِ دل کے قافلے ادھر آئیں تو بے ساختہ پکار اُٹھیں کہ یہاں ارجمند بانو سو رہی ہے، خرم کی جاں نثار کنیز....."

ان الفاظ کے ادا ہوتے ہی ممتاز کی حالت بگڑ گئی۔

"میں..... جا رہی ہوں..... خرم!..... الوداع!" ممتاز کی زبان سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ "الفراق میرے محبوب!..... میرے آقا!"

پھر دیکھتے ہی دیکھتے خلوص و وفا کا زندہ مجسمہ بے جان ہو گیا۔ موت کے دراز ہاتھوں نے دنیا کی حسین ترین عورت کو مٹی کے ایک ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ انتقال کے وقت ممتاز محل کی عمر بیالیس سال تھی۔

❀.....❀.....❀

ممتاز محل کو بطورِ امانت "دریائے تاپتی" کے کنارے دفن کر دیا گیا۔

جب ممتاز محل کا جنازہ قبر میں اُتارا جا رہا تھا، اس وقت شاہ جہاں کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے ہوئے قبر کے کنارے بیٹھ گیا۔ دو دن سے اس نے نہ کچھ کھایا تھا اور نہ کپڑے تبدیل کئے تھے۔ شاہ جہاں جیسا خوب صورت اور خوش لباس انسان ایک وحشی نظر آ رہا تھا۔ شدتِ غم سے اس کے چہرے کی ساری شادابی رخصت ہو گئی تھی۔ اور برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔

ممتاز کا چہرہ کفن سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور اس کے تابوت پر مٹی ڈالی جا چکی تھی۔ مگر شاہ جہاں اسی طرح قبر پر ایک ہاتھ رکھے ہوئے اُداس بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری تھا۔

درباری امراء کچھ فاصلے پر کھڑے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شہنشاہ کو ممتاز کی قبر سے اُٹھا کر شاہی محل لے جاتا۔ تمام امراء جانتے تھے کہ اگر شہنشاہ اسی طرح قبر پر بیٹھا اشک ریزی کرتا رہا تو اس کی جذباتی حالت مزید بگڑ سکتی ہے۔ مجبوراً کچھ امراء نے سید احمد قادری اور سید جلال گجراتی سے عرض کیا۔

"آپ کسی طرح شہنشاہ کو یہاں سے دور لے جائیں تاکہ غم کا تسلسل ٹوٹ جائے۔ ورنہ ان کا ذہنی دباؤ بڑھ سکتا ہے اور پھر اس صدمے سے قلب بھی متاثر ہو سکتا ہے۔"

سید احمد قادری اور سید جلال گجراتی، صاحبِ معرفت بزرگ تھے۔ شہنشاہ ان دونوں کا بہت احترام کرتا تھا۔

امراء کے اصرار پر سید احمد قادری اور سید جلال گجراتی آگے بڑھے اور شہنشاہ سے محل چلنے کی درخواست کی۔

"شاہِ والا! صبر سے کام لیجئے کہ آفات و مصائب کے وقت صبر ہی مومن کی ڈھال ہے۔" سید احمد قادری نے شاہ جہاں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے دل بھی آپ کے غم میں سوگوار ہیں مگر ساری دنیا اس بات سے قاصر ہے کہ وہ آپ کے غم کا ازالہ کر سکے۔"

شاہ جہاں نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ سید احمد قادری کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"شاہِ والا خوب جانتے ہیں کہ عزب مآب کی ذمہ داریاں ایک عام انسان سے کہیں زیادہ

ہیں۔" سید جلال گجراتی نے بڑی ہوش مندی کے ساتھ شاہِ والا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "آپ کے غم زدہ ہونے سے پوری قوم شکستہ نظر آنے لگی ہے۔ اگر آپ کی آنکھوں سے اسی طرح اشک بہتے رہے تو پھر ملت کا پرسانِ حال کون ہوگا؟..... شاہ کو اُداس دیکھ کر رعایا بھی اپنا گریبان چاک کر ڈالے گی۔ پھر ہر گلی اور کوچہ ماتم کدہ بن جائے گا۔ شاہِ والا! آپ ایک مردِ جانباز ہیں، خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالئے۔"

سید جلال گجراتی کی باتیں سن کر شاہ جہاں نے ایک بار پھر ممتاز کے مرقد کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں بزرگوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"آپ سچ کہتے ہیں۔ جسے ملت کے غموں کا امین بنا دیا گیا ہو، وہ اپنے ذاتی غم کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ ہمیں سہارا دیجئے سید صاحب!"

سید احمد قادری اور سید جلال گجراتی نے آگے بڑھ کر شاہ جہاں کو سہارا دیا۔

"ہم اتنے ضعیف و ناتواں نہیں بزرگانِ محترم!" شاہ جہاں نے ممتاز کی قبر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر پھر بھی انسان ہیں۔ اور ایک انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آ جاتے ہیں جو کچھ دیر کے لئے ذہن و قلب کی طاقت سلب کر لیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی ایک ایسا ہی سانحہ پیش آیا ہے۔ مگر آپ یقین رکھیں کہ ہم بہت جلد سنبھل جائیں گے اور اپنی رعایا کو مایوس نہیں ہونے دیں گے۔"

شاہ جہاں محل واپس آ گیا مگر اس طرح کہ وہ اپنی روح دریائے تاپتی کے کنارے ممتاز محل کی قبر کے نزدیک چھوڑ آیا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ جہاں بہت جلد اس صدمے کو فراموش کر دے گا مگر انہیں اس شخص کی محبت کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ شاہ جہاں نے برہان پور کے محل پہنچ کر اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر لیا۔

حرم سرا کے لوگوں اور تمام امراء نے سفید ماتمی لباس پہن لئے تھے۔ فضائیں اُداس تھیں اور شہر کے بام و در پر ایک اذیت ناک خاموشی مسلط تھی۔ تمام شہزادے اور شہزادیاں دہرے غم سے دوچار تھے۔ ایک طرف انہیں اپنی شفیق ماں کے بچھڑ جانے کا غم اور دوسری طرف انہیں مہربان باپ کی حالتِ زار رونے پر مجبور کر رہی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ شاہ جہاں کو کس طرح تسلی دے اور کس طرح ایک شکستہ انسان کو کھینچ کر غموں کے حصار سے باہر لائے۔

شاہ جہاں کو اپنی بیٹی جہاں آراء سے والہانہ محبت تھی۔ اس خیال کے پیشِ نظر تمام بہن بھائیوں نے باہم مشورہ کر کے جہاں آراء کو باپ کے پاس بھیجا۔ جہاں آراء، شاہ جہاں کے لئے کھانا لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی شاہ جہاں چیخا۔

"کون نافرمان ہے، جس نے یہاں آنے کی گستاخی کی ہے؟ کیا ہم نے یہ حکم جاری نہیں

کیا ہے کہ کوئی شخص بھی ہماری تنہائی میں مداخلت نہ کرے۔"

"شاہ بابا! یہ میں ہوں، آپ کی بیٹی جہاں آراء۔"

شاہ جہاں نے پلٹ کر دیکھا۔ جہاں آراء کھانے کا خوان لئے ہوئے آگے بڑھی۔

"تم غلط وقت پر آ گئی ہو میری پیاری بیٹی!" شاہ جہاں نے اُداس لہجے میں کہا۔ اُس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"آپ دو دن سے بھوکے ہیں شاہ بابا!" جہاں آراء نے ایک طرف خوان رکھتے ہوئے کہا۔ پھر بے اختیار باپ سے لپٹ کر رونے لگی۔

شاہ جہاں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "میری بیٹی! اس وقت تمہارا باپ اس قابل بھی نہیں ہے کہ تم سے تعزیت کر سکے۔"

"میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی، شاہ بابا!" جہاں آراء ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

"میں تمہارے جذبات کی سچائی سے بے خبر نہیں ہوں بیٹی! مگر اس وقت اپنے باپ کو تنہا چھوڑ دو۔"

جہاں آراء انتہائی صبر کے عالم میں باہر چلی آئی۔ پھر جب اس نے اپنے بہن بھائیوں سے باپ کی حالت بیان کی تو ایک بار پھر محل کے در و دیوار سے شورِ ماتم اٹھا اور پورا برہان پور اپنی محبوب ملکہ کی جدائی پر مرثیے پڑھنے لگا۔

شاہ جہاں کا معمول تھا کہ وہ اپنے دادا، شہنشاہ اکبر کی طرح روزانہ درشن کے جھروکے میں آتا تھا اور شاہی رسم کے مطابق تمام رعایا کو اپنے دیدار سے شرف یاب کرتا تھا۔ مگر ممتاز محل کے انتقال کے بعد وہ مسلسل آٹھ دن تک نہ اپنے کمرے سے باہر نکلا اور نہ جھروکے میں آ کر درشن کی رسم ادا کی۔

تمام امراء پریشان تھے اور طبیبوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں شہنشاہ اپنا ذہنی توازن نہ کھو بیٹھے۔

صرف جہاں آرا کبھی کبھی کمرے میں جاتی تھی اور باپ کی شکستگی کو دیکھ کر زار و قطار روتی ہوئی واپس چلی آتی تھی۔ جہاں آرا نے جب بھی شاہ جہاں کو دیکھا تو اس حالت میں کہ اس کے کمرے کی ایک کھڑکی کھلی ہوتی تھی اور وہ دریائے تاپتی کی طرف دیکھتا رہتا تھا، جہاں ممتاز محل کو عارضی طور پر دفن کیا گیا تھا۔ اگرچہ دریائے تاپتی، شاہی محل سے کافی فاصلے پر بہہ رہا تھا اور کھڑکی سے ممتاز کی قبر نظر نہیں آتی تھی لیکن شاہ جہاں کا رخ اسی طرف ہوتا تھا۔

کبھی کبھی وہ کھوئے کھوئے لہجے میں اپنی چہیتی بیٹی کو مخاطب کر کے کہتا۔ "تم ہواؤں کی سرگوشیاں سن رہی ہو جہاں آرا؟"

"کیسی ہوائیں شاہ بابا؟" جہاں آرا حیران ہو کر پوچھتی۔

"وہ ہوائیں، جو دریائے تاپتی کے کناروں کو چھو کر گزرتی ہیں اور روزانہ تمہاری ماں کا سلام لے کر آتی ہیں۔"

باپ کی یہ جذباتی باتیں سن کر جہاں آرا بے قرار ہو جاتی۔

پھر ایک ہفتے کے بعد شاہ جہاں میں صرف اتنی تبدیلی آ گئی کہ اس نے اپنے دوست سکندر مرزا کو حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔

سکندر مرزا نے شاہ جہاں کو دیکھا تو شدتِ جذبات سے اس کے آنسو بھی چھلک اُٹھے۔

سکندر مرزا کو اشک بار دیکھ کر شاہ جہاں نے اپنے بچپن کے دوست سے کہا۔ "سکندر مرزا! کیا تم بھی ممتاز کی موت پر تعزیت کرنے آئے ہو؟"

"ہاں شاہِ والا! میں بھی دنیا کی رسم ادا کرنے آیا ہوں۔" سکندر مرزا کی آواز میں دل کی خلش شامل تھی۔

"تمہیں ہمارے غم کا کچھ اندازہ بھی ہے؟" شاہ جہاں کے لہجے سے ناقابلِ بیان کرب نمایاں تھا۔

"تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہے۔" سکندر مرزا نے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میرے سینے پر بھی جدائی کا ایک زخم روشن ہے۔ اسی زخم کی روشنی میں کسی قدر اندازہ کر سکتا ہوں کہ شاہِ والا کے غم کی کیا نوعیت ہے۔"

"جب تمہیں صحیح اندازہ ہی نہیں سکندر مرزا! تو پھر ہم سے کن الفاظ میں تعزیت کرو گے؟"

سکندر مرزا گھبرا کر شاہ جہاں کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جہاں حزن و ملال کی گہری پرچھائیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"جب تم ہمیں تسلی نہیں دے سکتے تو پھر چلے جاؤ۔" شاہ جہاں نے یکایک منہ پھیر لیا اور کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس طرف دیکھنے لگا، جہاں دریائے تاپتی بہتا تھا اور جس کے کنارے زین آباد باغ میں ممتاز محل کو دفن کیا گیا تھا۔

سکندر مرزا کو چند لمحوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ شاہ جہاں غموں کی گہرائیوں میں ڈوب چکا ہے۔ اس نے فرمانروائے ہند کو مایوسیوں کے حصار سے نکالنے کے لئے نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔

"شاہِ والا کو ملکۂ عالیہ کی سب سے بڑی خواہش کا یقیناً علم ہو گا۔" سکندر مرزا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کیسی خواہش؟" شاہ جہاں یکایک مڑا اور گھبرا کر سکندر مرزا کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم ملکۂ عالیہ کی کس خواہش کا ذکر کر رہے ہو؟"

"ان کی ایک ہی خواہش تھی کہ ہر محاذ پر فتح و کامرانی آپ کے قدم چومے۔" سکندر مرزا بڑی ہوشیاری کے ساتھ ممتاز محل کے حوالے سے گفتگو کر رہا تھا۔ "ملکۂ عالیہ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ آپ کی فتوحات کی دعاؤں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ آپ کو ایک مثالی حکمران دیکھنا

چاہتی تھیں۔

"کیا ہم نے سلطنت کے کاموں میں کسی کوتاہی سے کام لیا ہے؟" شاہ جہاں کے لہجے سے کسی قدر تلخی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"نہیں شاہِ والا!..... میں کسی لغزش کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔" سکندر مرزا نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ "آپ نے جس طرح بندگانِ خدا کے حقوق ادا کئے ہیں، ہندوستان کے حکمرانوں میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔"

"پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس بار شہنشاہ کے لہجے سے نرمی جھلک رہی تھی۔

"آپ کے غم میں پورا ہندوستان سوگوار ہے۔" سکندر مرزا نے بڑی ذہانت سے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "وہ کون سی آنکھ ہے جو ملکۂ عالیہ کی وفات پر اشکبار نہیں۔ اور وہ کون سا دل ہے، جس میں آتشِ غم نہیں بھڑک رہی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے رشتے کے مطابق شاہِ والا سے تعزیت کر رہا ہے۔"

"ہمیں اس کا اندازہ ہے، سکندر مرزا!" شاہ جہاں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"تو براہِ کرم غموں کے اس حصار سے باہر نکل آئیے۔" سکندر مرزا نے اپنے مطلب کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جب سے شاہِ والا نے گوشہ نشینی اختیار کی ہے، نظامِ سلطنت زیر و زبر ہو کر رہ گیا ہے۔ فردوس مکانی (شہنشاہ بابر) کی عظیم وراثت کے بدخواہ قدم قدم پر سازشوں کے جال بچھا رہے ہیں۔ انہیں یقین آ گیا ہے کہ اب ظلِ سبحانی اپنے ماتم کدے سے باہر نہیں آئیں گے۔ اس لئے تمام فتنہ پرداز ایک پرچم کے نیچے جمع ہو رہے ہیں۔"

سکندر مرزا کی باتیں سن کر شاہ جہاں چونک اُٹھا۔

"اگر شاہِ والا فوری طور پر ان فسادیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تو خاکم بدہن مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اور پھر ملکۂ عالیہ کی روح کو حشر تک قرار نہیں آئے گا۔"

ممتاز محل کا نام سن کر شاہ جہاں بے قرار ہو گیا۔

"ہم کیا کریں سکندر مرزا! ملکۂ عالیہ کے بغیر زندگی ایک تہمت نظر آتی ہے۔ اپنی شریکِ حیات سے بچھڑ کر اندازہ ہوا کہ ان کے بغیر نہ فانوسوں میں روشنی ہے، نہ سبزہ زاروں میں تازگی و شادابی ہے، نہ تاج و تخت میں کوئی دل کشی۔ ایسا لگتا ہے کہ سورج بجھ گیا ہے، ہوائیں جل رہی ہیں اور دریا خشک ہو گئے ہیں۔ قبائے شاہی کی طرف دیکھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے سامنے ہمارا کفن رکھا ہے۔"

ایک بار پھر شاہ جہاں کے دل و دماغ پر مایوسیوں نے غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

"کیا آپ ملکۂ عالیہ کے شیشے جیسے خوابوں کو شکست و مایوسی کے پتھروں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دیں گے؟" سکندر مرزا کا لہجہ کچھ اور جذباتی ہو گیا۔ کیا اقتدار کا یہ سفینہ اپنے ناخدا کی

موجودگی میں غرق ہو جائے گا؟ اگر آپ اپنے لئے نہیں تو اس عظیم ہستی کی خاطر غموں کے اس دائرے سے نکل آیئے۔"

شاہ جہاں سنبھل گیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو سکندر مرزا! ایک حکمراں کو اپنے ذاتی غم پر اس طرح ماتم نہیں کرنا چاہئے۔ اس پر رعایا کے بے شمار غموں کا احساس قرض ہوتا ہے۔ ہمارے کاندھے بھی اس قرض کے بارِ گراں سے جھکے ہوئے ہیں۔ امراء کو ہمارا پیغام پہنچا دو کہ وہ اس قدر پریشان نہ ہوں۔ ہم بہت جلد ان سے آملیں گے۔ اور دشمنوں کو بھی خبردار کر دو کہ عظیم مغلوں نے اقتدار کی یہ عمارت کاغذ سے تعمیر نہیں کی ہے کہ چند شر پسند آگ لگا کر اس کے راکھ ہو جانے کا انتظار کرنے لگیں۔ بے شک! ہمارا دل بجھ گیا ہے، مگر ہم ممتاز کے روشن خوابوں کو ذلت و ناکامی کے اندھیروں میں ڈوبنے نہیں دیں گے اور ہماری معصوم رعایا سے کہہ دو کہ شہنشاہ نے ان کی تعزیت قبول کر لی۔ شاہ جہاں ان تمام کرم فرماؤں کا شکر گزار ہے، جو اس کے غم میں شرکت کرنے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کر شاہی محل تک آئے۔"

امراء کے لئے یہ ایک اچھی خبر تھی کہ ان کا شہنشاہ آہستہ آہستہ صدمات کی چار دیواری سے نکل کر درشن کے جھروکے کی طرف آ رہا ہے۔

مگر جب شاہ جہاں جھروکے تک آیا تو دیکھنے والوں کے منہ سے دبی دبی چیخیں نکل گئیں۔

شدتِ احساس سے شاہ جہاں کے بال سفید ہو گئے تھے۔ دیکھنے والوں نے بڑے بڑے غم زدہ لوگوں کو دیکھا تھا مگر شاہ جہاں، ممتاز کی موت سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس کا ظاہری حلیہ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ جواں سال شہنشاہ چند دنوں میں ایک شکستہ دل بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔

"ظلِ سبحانی! ہم سے آپ کا یہ غم دیکھا نہیں جاتا۔" جھروکے کے نیچے کھڑی ہوئی رعایا کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور اکثر لوگ شدتِ غم سے بے قرار ہو کر چیخنے لگے۔ "شاہِ والا! آپ نے محبت کا حق ادا کر دیا۔ مگر خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالیے۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو پوری قوم یتیم ہو جائے گی۔"

شاہ جہاں نے پہلی بار عوامی محبت کا یہ مظاہرہ دیکھا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رعایا اس طرح اس کے غموں میں شرکت کرے گی۔ شاہ جہاں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں پُرسکون رہنے کی ہدایت کی۔

"ہم اس وقت تک چین کی نیند نہیں سو سکتے جب تک حضورِ والا کے ہونٹوں کی گم شدہ مسکراہٹ واپس نہیں آئے گی۔" برہان پور کے عوام بڑی دردناک آوازوں میں چیخ رہے تھے۔ "ہمیں ہمارا وہ شہنشاہ واپس کر دیجئے، جس کا شاداب چہرہ دیکھ کر ہم اپنے غم بھول جایا کرتے تھے۔"

ایک بار پھر شاہ جہاں کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے مگر اس نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور اونچی آواز میں کہا۔

"ہم تمہیں تمہارا وہ شہنشاہ بہت جلد واپس کر دیں گے۔ لیکن تمہیں کچھ دن انتظار کرنا ہو گا۔"

"شہنشاہ! اگر اس غم کے ازالے کے لئے ہماری جانیں کام آسکتیں تو ہم اس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔" عوام کے ہجوم سے ایک شور بلند ہوا۔

"ہم تمہارے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔" شاہ جہاں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔ "کسی حکمراں کو ایسی ہمدرد اور فرمانبردار رعایا بھی قسمت سے میسر آتی ہے۔ ہم شکر گزار ہیں کہ تم اس طرح اپنے شہنشاہ کی پرسش حال کے لئے آئے۔" یہ کہہ کر شاہ جہاں واپس چلا گیا۔

وہ اس کرب ناک فضا سے نکلنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا مگر ابھی ممتاز کی موت کا زخم خون دے رہا تھا اور شاہ جہاں صبح و شام اس خون میں نہا جاتا تھا۔ وہ دن میں دو بار ممتاز کی قبر پر جاتا اور بہت دیر تک اپنی بیوی کے سرہانے کھڑا آنسو بہاتا رہتا۔

دُور کھڑے ہوئے محافظ اکثر اُس کی ایک ہی صدا سنتے۔

"ممتاز! یہ تم ہمیں کس مقام پر چھوڑ گئی ہو؟..... ہم رعایا کی فریاد سنیں یا اپنی محرومیوں کا ماتم کریں؟"

تقریباً چھ ماہ تک شاہ جہاں کی یہی حالت رہی۔ امراء نے کئی بار رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرنی چاہیں مگر شاہ جہاں نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔

"اب اُس کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔"

پھر جب سرکاری مخبروں نے پرتگالیوں کی بڑھتی ہوئی فتنہ انگیزیوں کا ذکر کیا تو شاہ جہاں چونک اٹھا۔ پھر اس نے اپنے امراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ سلطنت خداوند کریم کا عطیہ نہ ہوتی تو ہم اسے اپنے لڑکوں میں تقسیم کر کے دنیا سے دست بردار ہو جاتے۔"

شہنشاہ کے طرزِ عمل میں معمولی سی تبدیلی دیکھ کر امراء میں حوصلہ پیدا ہوا اور وہ یک زبان ہو کر بولے۔ "شاہِ والا درست فرماتے ہیں۔ ظلِ سبحانی کی عدم توجہی سے مغلوں کی عظیم وراثت کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔" شاہ جہاں نے پہلی بار پُرعزم لہجے میں کہا۔ "ہم فردوس مکانی (شہنشاہ بابر) کی اس روشن نشانی کو بجھنے نہیں دیں گے۔ بے شک! اس غم نے ہمیں تھکا ڈالا ہے۔ مگر ہم سلطنتِ مغلیہ کے دشمنوں کو خوش ہونے کا موقع فراہم نہیں کریں گے۔"

شاہ جہاں کی باتیں سن کر امراء کی صفوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب ان کا حکمراں آہستہ آہستہ معمولات کی زندگی کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔

❀.....❀.....❀

تقریباً چھ ماہ بعد ممتاز محل کا تابوت آگرہ کی طرف روانہ کیا گیا۔

اس موقع پر ایک بار پھر شاہ جہاں کی حالت بگڑ گئی تھی۔ مگر اس نے بڑی ہمت سے اپنے آپ کو سنبھالا اور شہزادہ شجاع کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

''تم اپنی ماں کا تابوت دریائے جمنا کے کنارے دفن کر دو۔ ہم بھی ملکہ عالیہ کی تدفین میں شریک ہوتے مگر نمک حرام پرتگالیوں نے ہماری معصوم رعایا پر آفات و مصائب کے پہاڑ توڑ دیئے ہیں۔ ہم انہیں ان کی بداعمالیوں کی سزا دے کر عنقریب تم سے آملیں گے۔''

شہزادہ شجاع غم ناک آنکھوں کے ساتھ باپ کی ہدایات سن رہا تھا۔

''جس زمین پر تم اپنی ماں کو دفن کرو گے، وہ راجہ مان سنگھ کی ملکیت ہے۔'' شاہ جہاں نے شجاع کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''مان سنگھ کے پوتے، جے سنگھ سے کہو کہ وہ یہ زمین ہمارے ہاتھ فروخت کر دے۔ وہ اپنی زمین کی جو قیمت مانگے، اسے ادا کر دو۔ اور اگر اسے زمین کے بدلے زمین چاہئے تو اس سے بہتر قطعۂ زمین فراہم کر دو۔''

شاہ جہاں، ممتاز محل کی آخری وصیت کے مطابق اُس کی یادگار تعمیر کرانا چاہتا تھا اور اس یادگار عمارت کے لئے آگرہ میں اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ موجود نہیں تھی۔

شاہ جہاں اور خاندانِ شاہی کے دیگر افراد نے کاندھا دے کر ممتاز محل کا تابوت ایک بڑے رتھ میں رکھا اور پھر یہ رتھ، شہزادہ شجاع، وزیر خان اور دوسرے امراء کی نگرانی میں برہان پور سے روانہ ہوا۔

شاہ جہاں بہت دیر تک مایوس کھڑا جانے والوں کو دیکھتا رہا۔ پھر جب مختصر سا قافلہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو شاہ جہاں نے آسمان کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اے اللہ! اپنے کمزور بندے، شاہ جہاں کو صبر و استقامت دے۔''

۞.....۞.....۞

ممتاز محل کا تابوت، آگرہ روانہ کرنے کے بعد شاہ جہاں، پرتگالیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ازسرِنو پرتگالیوں کے ظلم و ستم کی داستانیں سنیں۔

کسی نے کہا۔ ''وہ بنگالی مسلمانوں کو جبراً غلام بنا لیتے ہیں۔''

کسی نے کہا۔ ''وہ غلاموں کو زدوکوب کرتے ہیں اور انہیں عیسائی مذہب قبول کرنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔''

کسی نے کہا۔ ''وہ مسلمان عورتوں کی عصمت دری کرتے ہیں اور پھر انہیں کسی عیسائی کی داشتہ بنا دیتے ہیں۔''

شاہ جہاں جبر و استبداد کے ان فسانوں اور وحشت و بربریت کی ان داستانوں کو بہت غور سے سنتا رہا۔ پھر اپنے امراء سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اس سلسلے میں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

''شاہِ والا بہتر سمجھتے ہیں۔'' امراء نے بیک زبان کہا۔

''ہمیں پرتگالیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے.....؟'' شاہ جہاں نے اپنے امراء سے مشورہ طلب کیا۔

''انہیں عبرت ناک سزا ملنی چاہئے۔'' ایک امیر نے عرض کیا۔ ''وہ شاہِ والا کی نرم دلی سے مسلسل ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔''

''انہیں یقین ہو گیا ہے کہ وہ شاہِ والا کی دسترس سے دُور ہیں، اس لئے بے خوفی کے ساتھ سفاکی کے مظاہرے کر رہے ہیں۔'' دوسرے امیر نے پرتگالیوں کی بے رحمانہ فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اخلاق کی زبان نہیں سمجھتے۔'' تیسرے امیر نے کہا۔ ''ان سے قہر و غضب کی زبان میں گفتگو کی جائے۔ ورنہ وہ اسی طرح قتل و غارت کا بازار گرم کرتے رہیں گے۔''

شاہ جہاں نے اس سلسلے میں اپنے ہر امیر سے مشورہ لیا۔ پھر اس نے بہت غور و فکر کے بعد قاسم خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''تم شاہی افواج کی سالاری کرو گے۔ اگر پرتگالی اپنی سابقہ حرکات پر نادم ہو جائیں اور اصلاحِ حال کا یقین دلائیں تو نرمی سے کام لینا۔ اور اگر وہ اپنی فطری عیاری کا مظاہرہ کریں تو تم بے دریغ ان کے لئے موت کا پیغام بن جانا..... اور اس وقت تک جنگ کرنا جب تک کہ ایک بھی سیاہ کار اس زمین پر زندہ ہے۔''

۞.....۞.....۞

قاسم خان نے اس طرح منصوبہ بندی کی کہ بعض جاگیرداروں کے قبضے سے ناجائز اراضی واپس لینے کے بہانے فوج اور کشتیاں جمع کرنا شروع کر دیں۔ پھر جب جون کے مہینے میں مغل فوج کی بھاری تعداد ہگلی پہنچی اور بحری بیڑا بھی قریب ہو گیا تو پرتگالیوں نے کسی نئے خطرے کے پیشِ نظر اپنی قلعہ بندیوں کو مضبوط تر کر دیا۔

اگرچہ مغل سپاہی خاموشی سے کام لے رہے تھے لیکن عیار پرتگالیوں نے محسوس کر لیا تھا کہ شاہی فوجیوں کی آمد بے سبب نہیں ہے۔ نتیجتاً ان لوگوں نے مصالحت کے لئے اپنا ایک سفیر مغل سپہ سالار، بہادر خان کے پاس بھیجا۔ بہادر خان، پرتگالی سفیر کو دیکھ کر برہم ہو گیا۔

''تم وہی تو ہو، جن کے ہاتھوں مخلوقِ خدا اپنی زندگی سے تنگ آ چکی ہے۔''

''ہمیں کسی سے کیا غرض؟'' پرتگالی سفیر نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو محض تاجر ہیں اور تجارتی امور کے سوا کسی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔''

پرتگالی سفیر کی عیارانہ گفتگو سن کر بہادر خان کا غصہ اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ ''تمہارے خلاف سارے شہر نے گواہی دی ہے کہ تم انسانوں کے لبادے میں حیوان ہو..... تم خدا کے آزاد بندوں

کو غلام بناتے ہو..... مسلمان عورتوں کی عصمت دری کرتے ہو اور پھر اُنہیں جبراً اپنے مذہب میں شامل کر لیتے ہو۔"

پرتگالی سفیر دوبارہ جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ وہ خاموش بیٹھا بہادر خان کی قہر آلود گفتگو سنتا رہا۔

"تم لوگوں کی ہندوستان میں کیا حیثیت ہے؟" بہادر خان نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں پرتگالی سفیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مٹھی بھر گیدڑ ہیں۔ مغل شیر جب چاہیں، انہیں اپنی خوراک بنا لیں..... مگر ہم نے اسلام کی روایتی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا اور کبھی تم پر کوئی زیادتی نہیں کی۔ تم اپنے مذہب پر قائم ہو اور تمہیں یہاں ہر قسم کی آزادیاں حاصل ہیں۔ ہم نے تمہاری معاشی حالت کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ پھر تم نے مسلمانوں کے ساتھ یہ درندگی کیوں روا رکھی؟"

پرتگالی سفیر، بہادر خان کی ان باتوں کا کیا جواب دیتا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

"ہندوستان کے مسلمان اس پر قادر تھے کہ وہ تمہاری جاگیریں لوٹ لیتے، تمہارے مردوں کو تہہ تیغ کر دیتے اور تمہاری عورتوں کو داشتہ بنا لیتے۔ یا تم لوگوں پر اتنے مظالم ڈھاتے کہ تم لوگ اپنے عقائد بھول کر مذہب اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ مگر ہم نے تمہیں عزت و آزادی کے ساتھ سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔"

پرتگالی سفیر کی گردن بدستور جھکی ہوئی تھی۔

"مگر تمہاری قوم نے ان مراعات کے بدلے میں ہمیں کیا دیا؟" بہادر خان کی آواز کچھ اور تیز ہو گئی۔ "دل تو چاہتا ہے کہ تیری گردن کاٹ کر تیری قوم کے پاس بھیج دوں۔ مگر ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ بس اسی شرط پر مصالحت ہو سکتی ہے کہ تمام پرتگالی آبادیوں کی تلاشی لی جائے اور جس قدر بنگالی غلام تمہارے قبضے میں ہیں، انہیں آزاد کر دیا جائے۔"

پرتگالی سفیر نے چونک کر بہادر خان کی طرف دیکھا۔

"مزید یہ کہ جن پرتگالیوں نے بے گناہ انسانوں کو غلام بنایا تھا، انہیں عبرت ناک سزا دی جائے۔" بہادر خان نے چیخ کر کہا۔ "اگر تجھے یہ شرائط منظور ہے تو پرتگالیوں کے ساتھ صلح کی بات ہو سکتی ہے۔"

پرتگالی سفیر خاموشی سے اُٹھ کر اپنی قوم کے پاس چلا گیا۔ پرتگالیوں نے تلاشی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً کچھ دن بعد مغلوں نے پرتگالیوں پر بیک وقت خشکی اور پانی کے راستے سے حملہ کر دیا۔ مگر اس حملے میں شاہی فوجوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ابھی بہادر خان نئے حملے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ پرتگالیوں نے امن کے لئے ایک اور سفارت روانہ کی۔ سفیروں نے بنگالی غلاموں کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا مگر یہ ان کی محض ایک چال تھی کہ اس طرح شاہی فوجیں فریب میں آ کر واپس چلی جائیں۔

مگر بہادر خان ان کی چالوں کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے سفیروں کو یرغمال بنا کر مطالبہ کیا کہ اگر

پرتگالی باشندے اپنی نصف جائیداد اور بھاری رقم ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو یرغمالیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔

اسی دوران مغلوں کو تازہ کمک مل گئی اور انہوں نے دوبارہ حملہ کر کے پرتگالیوں کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ محاصرہ تقریباً پانچ ہفتے تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ شاہی توپ خانہ اور گھڑ سوار فوج بھی پہنچ گئی۔ مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر پرتگالیوں نے دو لاکھ روپے ادا کر دیئے۔ اس رقم سے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کی گئیں۔

فیصلہ کن حملہ کرنے کے لئے بہادر خان نے کشتیوں کا بند باندھ دیا اور پرتگالی جہازوں کو جلانے کے انتظامات بھی مکمل کر لئے۔ آخر کار پرتگالیوں نے کشتیوں میں سوار ہو کر شہر خالی کرنے کا ارادہ کر لیا مگر بہادر خان نے کشتیاں کھلنے سے پہلے ہی حملہ کر دیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی، جس میں دس ہزار پرتگالی مارے گئے اور تقریباً تین ہزار جان بچا کر بھاگ گئے۔ چار سو پرتگالیوں کو قیدی بنا کر آگرے کے طویل سفر پر روانہ کر دیا گیا۔

اس فتنے کو مکمل طور پر کچلنے کے بعد خود شاہ جہاں بھی دارالحکومت روانہ ہو گیا۔

❀.....❀.....❀

پرتگالی اسیروں میں کچھ راہب بھی تھے اور عام عیسائی بھی۔ مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

اسیروں کا یہ قافلہ گیارہ مہینے تک دُشوار گزار سفر طے کرنے کے بعد آگرے پہنچا۔ شاہ جہاں کے حکم پر تمام قیدیوں کو شہنشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔

ان قیدیوں میں پادری، ڈی کرسٹو بھی تھا۔ شاہ جہاں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے سفاک راہب! اگر تُو چاہتا تو بنگالی کے مجبور و معصوم مسلمان آفات و مصائب سے محفوظ رہ سکتے تھے۔"

ڈی کرسٹو نے سر اُٹھا کر شاہ جہاں کی طرف دیکھا اور گردن جھکا لی۔

"کیا تیرے پیغمبر نے تجھے یہ حکم دیا تھا کہ تُو کمزور انسانوں پر جبر و تشدد کر کے انہیں عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کر دے؟"

پادری ڈی کرسٹو کے پاس شاہ جہاں کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"اگر میں چاہوں تو تیرے جسم کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے جنگلی جانوروں کے سامنے ڈال دوں۔ یا پھر تجھے اتنے آزار پہنچاؤں کہ تُو ہر لمحہ موت کی تمنا کرے۔"

ڈی کرسٹو اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "شہنشاہ! مجھے قتل کر دے۔ اس غلامانہ زندگی سے تو موت بہتر ہے۔"

"اب تجھے اندازہ ہوا کہ غلامی کی ذلت کیا ہوتی ہے؟" شاہ جہاں نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "ابھی تیرے جسم میں ایک کانٹا بھی نہیں چبھا اور تُو موت کی دعائیں مانگ رہا ہے۔ ذرا

ان مظلوموں کو یاد کر، جن کے جسم بھی لہولہان تھے اور روحیں بھی..... تیرے ہم عقیدہ، کمزور انسانوں کی بستیوں میں وحشت و دیوانگی کے مظاہرے کر رہے تھے اور تُو خاموشی سے ان کا رقص دیکھ رہا تھا۔ تُو نے ایک بار بھی اپنے ہم مذہبوں کو پتھر پھینکنے اور شمشیریں بنام میں کرنے کا حکم نہیں دیا۔ تُو نے کسی ستم گر کا اُٹھا ہوا ہاتھ نہیں روکا اور کسی ظالم کے خونیں ارادوں کو زنجیر نہیں پہنچائی۔ یہ کیسی مذہبی تبلیغ تھی کہ تُو نے بستیوں کی بستیاں اُجاڑ ڈالیں اور ہزاروں انسانوں کو خاک کا پیوند بنا دیا۔"

پادری، ڈی کرسٹو شرم و ندامت کے پسینے میں نہایا کھڑا تھا۔

"میرا بھی دل چاہتا ہے کہ تیرا منہ سیاہ کر کے تجھے ہندوستان کی ایک ایک گلی میں پھراؤں، تیری ہم عقیدہ عورتوں کو اپنے درباریوں میں تقسیم کر دوں اور تیرے جواں مردوں پر اس قدر تشدد کروں کہ وہ اسلام کی پناہ میں آنے پر مجبور ہو جائیں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرا مذہب مجھے اس دیوانگی کی اجازت نہیں دیتا۔" شاہ جہاں کا چہرہ غصے کی آگ سے جل رہا تھا۔ اس نے اپنے سلگتے ہوئے دل و دماغ پر قابو پانے کے لئے پانی کا پیالہ طلب کیا۔

پھر چند لمحے خاموش رہ کر دوبارہ پادری سے مخاطب ہوا۔

"ڈی کرسٹو! میں تجھے اسلام کی رواداری کے نام پر آزاد کرتا ہوں۔ جب تُو یہاں سے رہا ہو کر اپنے ہم مذہبوں میں پہنچے تو انہیں بتانا کہ اہلِ اسلام نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا۔"

اس کے بعد شاہ جہاں نے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔

شہنشاہ کی اس فراخ دلی کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ نصف سے زیادہ پرتگالی مسلمان ہو گئے..... اور جو اپنے مذہب پر قائم رہے، ان کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنے آپ کو بدترین مجرم سمجھ رہے تھے۔

پادری، ڈی کرسٹو جب آگرہ کی حدود سے باہر نکلا تو اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ شاہ جہاں دونوں محاذوں پر فاتح قرار پایا۔ اس نے میدانِ جنگ میں بھی پرتگالیوں کو شکست دی اور اخلاق کی محفل میں بھی وہ عیسائیوں پر غالب رہا۔

❀.....❀.....❀

پرتگالیوں کے مضبوط ٹھکانوں کو نیست و نابود کرنے کے بعد شاہ جہاں کو سیاسی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ مگر جب سے وہ آگرہ آیا تھا، اس کے دل کا زخم دوبارہ خون دینے لگا تھا۔

قلعے سے کچھ فاصلے پر دریائے جمنا کے کنارے ممتاز محل کی قبر تھی اور شاہ جہاں دن میں کئی بار اپنی محبوب شریکِ حیات کے مرقد پر جا کر با آواز بلند کہا کرتا تھا۔

"ممتاز! ہماری فتوحات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے دل کی دنیا تمہارے بغیر ویران تر ہوتی جا رہی ہے۔"

لوگوں کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاہ جہاں کے جذبات کی شدت میں کمی

آ جائے گی اور وہ ممتاز کی موت کے صدمے کو آہستہ آہستہ فراموش کر دے گا۔ مگر یہ ساری قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ سیاست کی ہنگامہ خیزیوں کے بعد شاہ جہاں جب بھی تنہا ہوتا، ممتاز کی یادیں اس کے دامنِ دل کو اس طرح پکڑ لیتیں کہ شاہ جہاں اس خلش سے بے قرار ہو جاتا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگتی۔

شاہ جہاں کی مستقل اُداسی دیکھ کر درباری طبیب، حکیم علیم الدین وزیر خان نے بعض امراء کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"اگر شہنشاہ کسی ایسی عورت سے شادی کر لیں جو اپنے نقش و نگار میں ملکۂ عالیہ سے مشابہت رکھتی ہو یا پھر ان کی طرح حسین ہو، تو اس غم کا ازالہ ہو سکتا ہے۔"

یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا جو حکیم وزیر خان استعمال کرنا چاہتا تھا۔ مقرب امراء نے درباری طبیب کے اس مشورے کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سنا اور پھر بہت غور و فکر کے بعد سکندر مرزا سے کہا۔

"تم شہنشاہ کے عزیز بھی ہو اور بچپن کے دوست بھی۔ ہم انہیں یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ ہمارے اور ان کے درمیان تکلف کی ایک اونچی دیوار حائل ہے۔"

"کیسا مشورہ؟" سکندر مرزا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ شہنشاہ صرف جذباتی فضا کی تبدیلی کے لئے نئی شادی کر لیں۔" امراء نے سکندر مرزا کو حکیم وزیر خان کے مشورے کی تفصیلات سمجھاتے ہوئے کہا۔

سکندر مرزا کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے بھی درباری طبیب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"یقیناً یہ ایک مناسب مشورہ ہے۔ میں اس ذیل میں بہت جلد شہنشاہ سے گفتگو کروں گا۔"

اور پھر جب سکندر مرزا نے ایک دن خلوت میں شاہ جہاں سے نئی شادی کا ذکر کیا تو وہ بھڑک اُٹھا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو سکندر مرزا؟" شاہ جہاں کے لہجے میں انتہائی تلخی شامل تھی۔ "اگر کوئی دوسرا شخص ہمیں یہ مشورہ دیتا تو شاید ہم اس کی زبان کاٹ دیتے۔"

سکندر مرزا شدید حیرت کے عالم میں شاہ جہاں کی طرف دیکھنے لگا۔

"شاہِ والا! میں کوئی مجرمانہ گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔"

"ہماری نظر میں اس قسم کا مشورہ ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔" خلافِ معمول شاہ جہاں کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ شاہ جہاں کی عادت تھی کہ وہ ادنیٰ ترین ملازموں سے بھی بہت نرم لہجے میں بات کرتا تھا۔ پھر سکندر مرزا تو اس کے بچپن کا دوست تھا اور دونوں کے درمیان ہمیشہ بے تکلفانہ فضا قائم رہتی تھی۔

"شاہِ والا! یہ ایک ایسے طبیب کا مشورہ ہے، جسے خود آپ نے اپنے دربار میں بلند ترین

منصب پر فائز کیا ہے۔" سکندر مرزا نے شاہ جہاں کی گرم گفتاری کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"حکیم وزیر خان پاگل ہو گیا ہے۔" شاہ جہاں کے لہجے کی تلخی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ "کیا وہ ہمیں بیمار سمجھ رہا ہے؟"

"نہیں شاہِ والا!" سکندر مرزا نے گھبرا کر کہا۔ اسے اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں شاہ جہاں، حکیم وزیر خان سے ناراض نہ ہو جائے اور ایک غم گسار، خوامخواہ شاہی عتاب کا نشانہ بن جائے۔ "درباری طبیب آپ کو بیمار نہیں سمجھتا۔ وہ تو محض آپ کو اُداس دیکھ کر خود بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ اور ایک حکیم وزیر خان پر ہی کیا منحصر ہے، سلطنتِ مغلیہ کا ہر بہی خواہ اس وقت شدید اضطراب میں مبتلا ہے اور اپنی عقل کے مطابق شہنشاہ کو آسودہ و مطمئن دیکھنے کے لئے مختلف مشورے دے رہا ہے۔"

شاہ جہاں فوراً ہی سنبھل گیا۔ "معاف کرنا سکندر مرزا! ہم اس معاملے میں بہت زیادہ جذباتی ہو گئے تھے۔"

"یہ شہنشاہ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ ایک خادم کو اس طرح مخاطب کر رہے ہیں۔" سکندر مرزا نے شرمساری کے انداز میں کہا۔

"تم ہمارے دوست ہو، کوئی خادم نہیں۔" شاہ جہاں نے اپنے طرزِ عمل پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ہم اپنے غم گساروں کو پہچانتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے جذبات کو نہیں سمجھتے۔ کاش! انہیں اندازہ ہوتا کہ ہمیں ممتاز محل سے کیا نسبت ہے۔ کیا یہ احساس ہمیں مار نہیں ڈالے گا کہ ہم نے اس کے غم کو بھلانے کے لئے کسی دوسری عورت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ لی؟"

سکندر مرزا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

"ہمیں حکیم وزیر خان اور دوسرے درباری امراء سے کوئی گلہ نہیں کہ وہ لوگ محبت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔" شاہ جہاں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مگر تم تو جانتے ہو کہ محبت کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ تم ماہ رخ کے بجائے کسی دوسری لڑکی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ کیوں اپنے دل کو یہ روگ لگائے پھرتے ہو؟ اس درد کی دوا کیوں نہیں کرتے؟"

سکندر مرزا، شاہ جہاں کو دوسری شادی کا مشورہ دے کر سخت پشیمان تھا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "شاہِ والا! میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرے اس گناہ کو معاف کر دیجئے۔"

۞.....۞.....۞

ماہ رخ کے ذکر نے سکندر مرزا کے سینے میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ وہ قصرِ شاہی سے نکل کر دریائے جمنا کی طرف بڑھا، جہاں ماہ رخ، ممتاز محل کی قبر کے نزدیک مختصر سے کمرے میں رہتی تھی۔ شاہ جہاں کے حکم پر ایک طویل و عریض چار دیواری تعمیر کی گئی تھی، جس کے چاروں طرف ہر وقت مسلح سپاہی پہرہ دیتے رہتے تھے۔ اسی چار دیواری کے اندر ماہ رخ کا ایک مختصر کمرہ

تھا۔ جب ممتاز محل کا تابوت برہان پور سے آگرہ لایا گیا تو ماہ رخ بھی اس کے ہمراہ تھی۔

"شہنشاہِ معظم! میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگا۔" ماہ رخ نے زار و قطار روتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمیں معلوم ہے کہ ممتاز تمہیں کس قدر چاہتی تھی۔" شاہ جہاں نے اُداس لہجے میں کہا تھا۔ "اس نسبت سے جو کچھ مانگو گی، تمہیں عطا کیا جائے گا۔"

"ظلِ الٰہی! یہ کنیز اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی کہ اسے آخری سانس تک آقا زادی کی خدمت میں رہنے دیا جائے۔" ماہ رخ نے ہندوستان کے حکمراں سے عجیب و غریب درخواست کی تھی۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو ماہ رخ؟" شاہ جہاں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جس طرح میں نے ملکۂ عالیہ کی زندگی میں ان کی خدمت کی تھی، اسی طرح مرنے کے بعد بھی ان کی قربت درکار ہے۔" ماہ رخ نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھے ماہ رخ!" شاہ جہاں کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ "انتقال کے بعد تم ملکہ عالیہ کی خدمت کس طرح کر سکتی ہو؟"

"شاہِ والا! میں ہر وقت ملکۂ عالیہ کے مرقد کے نزدیک رہنا چاہتی ہوں۔" ماہ رخ نے اپنی خواہش کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اب میں اس طرح خدمت کر سکتی ہوں کہ ان کی قبر پر روزانہ پھول چڑھاؤں اور ہر وقت ان کے حق میں دعائے خیر کرتی رہوں۔"

"یہ کام تو تم قلعے میں رہ کر بھی کر سکتی ہو۔" شاہ جہاں نے ماہ رخ کی اس جذباتی خواہش کے جواب میں کہا۔

"نہیں ظلِ الٰہی!" ماہ رخ نے بڑی بے باکی کے ساتھ کہا۔ "اب آقا زادی کے بغیر مجھے شاہی محلات ایک قبرستان کی مانند نظر آتے ہیں۔ اگر میں قلعے میں چلی جاؤں تو پھر ملکۂ عالیہ سے دُور ہو جاؤں گی۔ اور مجھے یہ گوارا نہیں۔"

شاہ جہاں کچھ سوچنے لگا۔

"اگر ہمارے مذہب میں خودکشی جائز ہوتی تو میں زندگی کا خاتمہ کر کے اپنی آقا زادی کے پاس چلی جاتی۔" ماہ رخ کے لہجے کی رقت اور اشکوں کی روانی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ "ملکۂ عالیہ کے بغیر مجھے یہ زندگی ایک الزام نظر آتی ہے۔ اب زیست کے بسر کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں ہر وقت ملکۂ عالیہ کی خدمت میں موجود رہوں۔"

شاہی کنیز کے جذبوں کی گہرائی نے شاہ جہاں کو بھی رُلا دیا تھا۔

"میں ایک ادنیٰ خدمت گار ہوتے ہوئے یہ خواہش تو نہیں رکھتی کہ مجھے بھی مرنے کے بعد ملکۂ عالیہ کے قدموں میں دفن کیا جائے۔ مگر شاہِ والا سے اتنی درخواست ضرور ہے کہ جب تک یہ سانسیں چل رہی ہیں، اس وقت تک اس کنیز کو آقا زادی سے جدا نہ کیا جائے۔"

شاہ جہاں شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔

''شہنشاہ اس بات پر قادر ہیں کہ وہ کنیز کی درخواست منظور کر سکتے ہیں۔'' ماہ رخ نے اس طرح التجا کی تھی کہ جیسے کوئی گداگر بھیک مانگ رہا ہو۔

''ماہ رخ! تم اپنی جان پر بڑا ظلم کر رہی ہو۔'' شاہ جہاں نے ممتاز محل کی کنیز کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

''شاہِ والا! اس وقت میں ایک فریادی ہوں۔'' یہ کہہ کر ماہ رخ، شاہ جہاں کے قدموں کی طرف جھکنے لگی۔

''نہیں ماہ رخ! ہم تو ایک عام انسان کو بھی پاؤں چھونے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور پھر تم ممتاز کے حوالے سے ہماری عزیزہ ہو۔ ہم تمہاری بہت قدر کرتے ہیں۔ تم نے رشتوں کا حق ادا کر دیا۔ تم ہماری مملکت میں ایک مثالی عورت ہو۔ ہم تمہاری خواہش ضرور پوری کریں گے۔''

یہ کہہ کر شاہ جہاں نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ چار دیواری کے اندر ایک کمرہ تعمیر کرا دیں۔

وہ کمرہ کیا تھا، سر چھپانے کے لئے ایک سائبان تھا جہاں ماہ رخ اپنی زندگی کے باقی دن گزارنا چاہتی تھی۔ ماہ رخ کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح و شام قلعے کے چمن زار میں جاتی اور مختلف پھول لا کر اپنی آقا زادی کی قبر پر چڑھا دیتی۔ پانچوں وقت باقاعدہ نماز ادا کرتی اور رو رو کر ممتاز محل کی مغفرت کے لئے دعا کرتی۔ وہ پہلے ہی شوخ اور ریشمی لباس پہننے سے گریز کرتی تھی اور جب ممتاز محل دنیا سے گزر گئی تو ماہ رخ نے بھی اپنا انداز یکسر بدل ڈالا۔ اب وہ ہر وقت سفید سوتی لباس میں ملبوس رہتی تھی۔ ماہ رخ کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی اور جسم سے لپٹے ہوئے سفید کپڑے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ کوئی بیوہ ہے۔

جب شاہ جہاں نے سکندر مرزا کے سامنے ماہ رخ کا ذکر کیا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور سیدھا دریائے جمنا کے کنارے چلا آیا۔

ماہ رخ نے سکندر مرزا کو اپنے سامنے پایا تو وہ خاموش نہ رہ سکی اور بیزار لہجے میں بولی۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

سکندر مرزا نے اُس کے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف تمہیں دیکھنے آیا ہوں ماہ رخ!'' سکندر مرزا کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

''کیوں؟'' ماہ رخ کی بھنویں کھنچ گئیں اور چہرے پر ناگواری کا گہرا رنگ اُبھر آیا۔

''تم خوب جانتی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔'' سکندر مرزا نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔ ''دلِ وحشی مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ تمہیں دیکھ کر قرار سا آ جاتا ہے۔''

ماہ رخ کے دل میں جذبات کی آندھیاں چلنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی حقیر تنکے کی طرح اُڑ جاتی، اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی غصے کی نقاب ڈالی۔

''میں کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے شدید نفرت ہے۔ پھر یہ بے حسی کیوں؟..... میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''میں نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔'' سکندر مرزا انتہائی شائستہ لہجے میں بولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پھر بھی اس کے ہر لفظ سے دل کی خلش کا اظہار ہو رہا تھا۔

''پھر آپ کسی کی دل آزاری پر کیوں آمادہ ہیں؟'' ماہ رخ نے غضب ناک لہجے میں شکایت کی۔

''میں بہت مجبور ہوں ماہ رخ!'' سکندر مرزا نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''کیسی مجبوری ہے؟'' ماہ رخ کے اندازِ گفتگو میں وہی جارحیت تھی۔

''اس مجبوری کو تم نہیں سمجھو گی۔'' سکندر مرزا نے ماہ رخ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ماہ رخ لرز کر رہ گئی۔

سکندر مرزا کی آنکھوں میں حسرت و یاس کے کئی طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔

نہ تم میرے، نہ دل میرا، نہ جانِ ناتواں میری
تصور میں بھی آ سکتی نہیں مجبوریاں میری!

''کیا آپ اس طرح مجھے رسوا کرنا چاہتے ہیں؟'' ماہ رخ نے گفتگو کا زاویہ بدلتے ہوئے کہا۔

''معاذ اللہ!'' سکندر مرزا تڑپ کر رہ گیا۔

''آپ کے انداز تو یہی کہتے ہیں۔'' ماہ رخ نے اونچی آواز میں کہا۔

''رسوا تو میں ہوا ہوں ماہ رخ!'' سکندر مرزا نے آہستہ سے کہا۔ ''قصرِ شاہی کے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر تمہارے انکار نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ میں اس قابل نہیں تھا۔''

ماہ رخ کے سینے میں درد کا ایک اور طوفان اُٹھا۔ واقعتاً سکندر مرزا ایک ایسا انسان تھا، جو ہندوستان کے بڑے سے بڑے خاندان میں شادی کر سکتا تھا اور لوگ اس رشتے پر فخر کرتے۔ مگر اس نے اپنی جوانی ایک معمولی کنیز کی خاطر برباد کر دی۔

جب ماہ رخ سے سکندر مرزا کی بات کا جواب نہ بن پڑا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔'' ماہ رخ کی آواز کانپ رہی تھی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

''یہ طرزِ عمل تمہارے شایانِ شان نہیں ماہ رخ!'' سکندر مرزا نے چند قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنے آپ کو مجبور اور لاوارث نہ سمجھو۔ دل کے سودے خوشی سے ہوتے ہیں، جبر سے نہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں شکست کھا گیا۔ مگر تمہاری رسوائی مجھے منظور نہیں۔ اگر کبھی ایسا

مرحلہ آیا تو میں اپنے دل کا بھی خون کر دوں گا۔ میں تو کبھی کبھی صرف اس لئے چلا آتا ہوں کہ تمہیں دیکھ کر سانس لے سکوں۔ میں نے شہنشاہ سے کئی بار کہا تھا کہ وہ میرے ہاتھ میں قلم کے بجائے تلوار دے دیں۔ پھر میں اسلام کے دشمنوں سے لڑتا ہوا مارا جاؤں اور یہ ناکارہ جسم ٹھکانے لگ جائے۔ مگر شاہِ والا نے میری ایک نہیں سنی۔ اور اب اگر میں مرنا بھی چاہوں تو مر نہیں سکتا۔ ملکۂ عالیہ میرے دوست کو راستے میں چھوڑ کر چلی گئیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ شہنشاہ اس وقت کس قدر تنہا ہیں۔ مجھے تو اتنی رعایت حاصل ہے کہ تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ مگر شہنشاہ کی محرومیوں کا اندازہ کرو کہ وہ اپنی محبوب ہستی کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔" یہ کہتے کہتے سکندر کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک اُٹھے۔ "اب میں صرف شاہِ والا کی خاطر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میرا فرضِ اوّلین ہے کہ کسی طرح انہیں یاس و محرومی کے حصار سے باہر لے آؤں اور یہ فرض اسی وقت ادا ہو سکتا ہے کہ میں زندہ رہوں۔ اور میری زندگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ میں تمہارا چہرہ دیکھتا رہوں۔ مجھے تم سے نہ کوئی شکایت ہے، نہ طلب۔ اگر تمہارے اختیار میں ہو تو مجھے چند سانسیں فراہم کر دو تاکہ میں زندہ رہ کر شہنشاہ کی تیمارداری کر سکوں۔"

"میرے خدا!..... میرے خدا!" ماہ رخ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

⊛.....⊛.....⊛

ہندوستان کی سیاست اپنے نشیب و فراز سے گزر رہی تھی۔ اور شاہ جہاں ہر وقت ممتاز محل کی یادوں میں کھویا رہتا تھا۔ پہلے اسے اپنی محبوب ملکہ کی موت کا صدمہ تھا اور اب اسے مسلسل ایک ہی فکر ستاتی رہتی تھی کہ وہ ممتاز کی قبر پر ایک عظیم الشان اور بے مثال یادگار کس طرح قائم کرے؟

شاہ جہاں کی حکومت میں بہترین مصور موجود تھے۔ شاہ جہاں کو اپنے باپ جہانگیر کی طرح مصوری سے زیادہ دلچسپی تو نہیں تھی مگر پھر بھی وہ اس فن کے سلسلے میں اعلیٰ ذوق رکھتا تھا۔ دراصل شاہ جہاں کا رجحان فنِ تعمیر کی طرف تھا۔ اس لئے کسی حد تک مصوری کی طرف سے اس کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ تاہم اس نے بڑے مصوروں کو اپنی نوازشات سے محروم نہیں کیا تھا۔ شاہ جہاں کی رغبت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے باقاعدہ مصوری کا ایک شعبہ قائم کر دیا تھا اور اس شعبے کا نگراں، فقیر اللہ خان تھا۔

ممتاز کی قبر پر ایک بے مثال یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں شاہ جہاں نے فقیر اللہ خان کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

"بے شک! تم نے مصوری کی بہت خدمت کی ہے مگر آج تمہارے فن کی آزمائش ہے۔"

مصور فقیر اللہ خان نے ادب سے سر جھکا دیا۔

"ملکۂ عالیہ کی قبر پر ایک ایسی عمارت تعمیر کرو کہ ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے

عاجز رہے۔"

"خادم کوئی دعویٰ تو نہیں کرتا مگر اس کی حقیر کوششیں شاہِ والا کو مطمئن ضرور کر دیں گی۔"

"ہم اس سلسلے میں شدید اضطراب کا شکار ہیں۔" شاہ جہاں نے مصوروں کے نگراں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ملکۂ عالیہ روز ہی ہمارے خوابوں میں آتی ہیں۔ وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتیں مگر ان کی خاموشی بتاتی ہے کہ وہ ہم سے ناراض ہیں اور یہ ناراضگی محض اس لئے ہے کہ ہم اب تک ان کی آخری وصیت پر عمل نہیں کر سکے ہیں۔ ہمیں شرمندگی سے بچا لو کہ ہم بڑی اذیت میں مبتلا ہیں۔"

"شاہِ والا! آپ کے یہ نمک خوار اپنی جانیں نذر کر دیں گے مگر عزت مآب کو شرمندہ نہیں ہونے دیں گے۔" فقیر اللہ خان نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"عمارتیں تو ساری دنیا میں بے شمار ہیں۔ مگر ہمارے خوابوں میں کوئی اور ہی تعمیر گردش کرتی رہتی ہے۔" شاہ جہاں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیسی تعمیر شاہِ والا؟" فقیر اللہ نے عرض کیا۔

"رنگ و نور میں نہائی ہوئی ایک عمارت، جس کا حُسن بے مثال ہے۔" شاہ جہاں کی آواز سے عجیب حسرت جھلک رہی تھی۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ جس دن سے ممتاز محل کا انتقال ہوا تھا، اسی روز سے شاہ جہاں خواب میں ایک عمارت دیکھتا تھا۔ سکون بخش، روشنی میں ڈوبی ہوئی ایک دلکش عمارت۔

مصور فقیر اللہ خان نے بہت غور سے اپنے حکمراں کا خواب سنا اور پھر وہ ایک کمرے میں بند ہو گیا۔ تقریباً آٹھ دن تک اس نے کاغذ پر کئی خوب صورت عمارتوں کے نقوش ثبت کئے۔ مگر شاہ جہاں نے انہیں دیکھ کر نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔

"بے شک! یہ تمام عمارتیں دلفریب منظر پیش کرتی ہیں۔ مگر ان سب سے عامیانہ پن جھلکتا ہے۔ کوئی شخص بھی انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ایسی عمارتیں آج تک نہیں دیکھی ہیں۔ تعمیر ایسی ہو کہ اسے دیکھ کر ہر شخص بے ساختہ پکار اُٹھے۔ لاجواب، بے مثال..... روئے زمین پر ایسی کوئی عمارت موجود نہیں۔"

فقیر اللہ خان نے مزید ایک ماہ تک شب و روز کی محنت کے بعد کاغذ پر نئے نقوش اُبھارے مگر شاہ جہاں کو کوئی عمارت پسند نہیں آئی۔

بالآخر فقیر اللہ خان نے اپنے نائب مصور میر ہاشم کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

"عمارتوں کے نقوش تراشتے تراشتے میرے ہاتھ تو شل ہو چکے ہیں۔ اب تم ہمت کرو اور شہنشاہ کے خواب کو کاغذ پر منتقل کر دو۔"

میر ہاشم نے اپنے نگراں کی باتوں کو بہت غور سے سنا اور پھر نہایت پُرجوش لہجے میں بولا۔

"کوئی انسانی خواب ایسا نہیں، جو مصور کے قلم کی دسترس سے دُور ہو۔ میں کاغذ پر شہنشاہ

کے خواب کا عکس اس طرح منتقل کروں گا کہ میری تصویر کے آگے فرمانروائے ہند کا خواب دھندلا پڑ جائے گا۔"

"یہ بہت بڑا دعویٰ ہے میر ہاشم!" فقیر اللہ خان نے اپنے نائب کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "شہنشاہ کے سامنے ایسا کوئی دعویٰ نہ کرنا کہ بعد میں تمہیں شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑے۔"

میر ہاشم ایک لاجواب شبیہ ساز تھا۔ اگرچہ وہ فقیر اللہ خان کی نیابت کے فرائض انجام دے رہا تھا لیکن فنی اعتبار سے پورے ہندوستان میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔" میر ہاشم بہت زیادہ پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ "میری کھینچی ہوئی لکیریں، انسانی نگاہ کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوگا۔"

مگر جب امتحان کا وقت آیا تو میر ہاشم کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میر ہاشم نے کئی ایسی عمارتوں کی تصاویر بنائی تھیں جو دیکھنے والوں کو زندہ نظر آتی تھیں۔ اہلِ دربار کا خیال تھا کہ اس سے بہتر تصویر کشی ممکن نہیں مگر وہ شہنشاہ کے سامنے اپنی رائے دیتے ہوئے ڈرتے تھے۔

شاہ جہاں نے بہت دلچسپی کے ساتھ ان تصاویر کو دیکھا لیکن کچھ دیر بعد ہی آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کا رنگ اُبھرنے لگا۔

"میر ہاشم! تمہارے قلم میں بہت جان ہے۔ مگر کوئی ایک تصویر بھی ہمارے خواب کی عکاسی نہیں کرتی۔ اگر کسی تصویر میں ہمیں اپنے خواب کی ہلکی سی شبیہ بھی نظر آ جاتی تو ہم مطمئن ہو جاتے۔" یہ کہہ کر شاہ جہاں بہت اُداس نظر آنے لگا۔

اور پھر دوسرے دن شاہ جہاں کے حکم پر ہندوستان کے گوشے گوشے میں شاہی ہرکارے اعلان کرنے لگے۔

"جو شخص بھی ملکۂ عالیہ کے مقبرے کی بے مثال شبیہ تیار کرے گا، اسے بے شمار انعامات سے نوازا جائے گا۔"

اس اعلان نے ہندوستان کے مجسمہ سازوں اور مصوروں کی جماعت میں خوشی کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ ہندو سنگتراش اور مصور بہت خوش نظر آ رہے تھے کہ وہ اس مقابلے میں سبقت لے جائیں گے۔

نزدیک و دور سے روزانہ کئی مجسمہ ساز اور مصور اپنی اپنی کاوشوں کے ساتھ فقیر اللہ خان اور میر ہاشم کے سامنے پیش ہوتے لیکن کسی کو کامیابی نہ ہوتی۔ اس سلسلے میں یہ طریق کار وضع کیا گیا تھا کہ جو تصویر فقیر اللہ خان اور میر ہاشم کو مطمئن کر دے گی، اسے شہنشاہ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ مگر اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ ہندوستان کے نامور مجسمہ ساز اور مصور ابتدائی مرحلے ہی میں ناکام ہو گئے تھے۔

مصوروں کی ناکامی کے سبب شاہ جہاں کی اُداسیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

⊛.....⊛.....⊛

اسی دوران ریاست بیجاپور کے مسئلے نے پوری شدت کے ساتھ سر اُبھارا۔

شاہ جہاں نے سلطانِ بیجاپور کو اس کے باغیانہ طرزِ عمل کے باعث دربار میں طلب کیا تھا۔ یہ 1631ء کا واقعہ تھا۔ سلطانِ بیجاپور نے حکمِ شاہی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ شاہ جہاں نے فوری طور پر آصف خان کو طلب کیا اور نہایت غضب ناک لہجے میں کہا۔

"ہم سلطانِ بیجاپور کو اس حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں اور بارِ ندامت سے اس کا سر جھکا ہوا ہو۔"

آصف خان نے تیزی سے یلغار کی اور بیجاپور کا محاصرہ کر لیا۔ تقریباً بیس روز تک خونریز جنگ ہوتی رہی لیکن رسد کی کمی نے آصف خان کو ہاتھ روکنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری طرف قحط سالی کے سبب انسان اور مویشی بھوک سے مرنے لگے تھے۔ مجبوراً آصف خان کو محاصرہ اُٹھانا پڑا اور مغل فوج، سامانِ خورد و نوش کی تلاش میں بہت دُور نکل گئی۔ اس کے بعد شاہی لشکروں کو اپنے علاقوں کی طرف واپس لوٹنا پڑا۔ آصف خان، دکن کی مہم میں ناکام ہو چکا تھا اس لئے اس کی جگہ مہابت خان کو مقرر کر دیا گیا۔

ملک عنبر حبشی کا بیٹا فتح خان جانتا تھا کہ مہابت خان کس قدر جنگجو اور تجربہ کار سپہ سالار ہے۔ نتیجتاً اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مہابت خان کو پیغام بھیجا۔

"میں یہ قلعہ مغلوں کے سپرد کرنے پر آمادہ ہوں۔ مجھے شاہی افواج سے کوئی اختلاف نہیں۔"

یہ پیغام ملتے ہی مہابت خان نے اپنے لڑکے کو فوج دے کر روانہ کیا اور کچھ دیر بعد خود بھی روانہ ہو گیا۔

مہابت خان کے پہنچنے کے بعد فتح خان نے عیاری سے کام لیتے ہوئے ایک اور پیغام بھیجا۔ "مجھے ایک ہفتے کی مہلت دی جائے تاکہ میں والیٔ بیجاپور کے ساتھ شرائط کے بارے میں مشورہ کر سکوں۔"

مہابت خان، فتح خان کی اس چال کو سمجھ گیا تھا۔ نتیجتاً اس نے فتح خان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے لڑکے کو بطور یرغمال بھیج دے مگر فتح خان نے تاخیری حربوں سے کام لیا۔ اس کے بعد مہابت خان نے کوئی مراسلت نہیں کی۔ اس نے بہت خاموشی سے سرنگ لگائی اور قلعے کے ایک حصے کو تباہ کر دیا۔ پھر قلعے میں داخل ہو کر تباہی مچا دی اور فتح خان کے باپ ملک عنبر حبشی کی قائم کی ہوئی تمام قلعہ بندیوں کو برباد کر دیا۔ ابھی فتح خان اس حملے سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مہابت خان نے نئی سرنگ لگا کر قلعے میں ایک اور بڑا شگاف پیدا کر دیا۔

اب فتح خان نے محسوس کر لیا تھا کہ مزید مزاحمت ممکن نہیں۔ مجبوراً اس نے اپنے بڑے لڑکے کو یرغمالی کے طور پر مہابت خان کے پاس بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہفتے کی مہلت مانگی تاکہ وہ اپنے خاندان کو خطرناک مقامات سے محفوظ جگہ منتقل کر سکے۔

مہابت خان نے فتح خان کی یہ درخواست منظور کر لی۔

فتح خان بہت تیزی سے اپنی روانگی کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا۔ اس کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ فتح خان نے اس موقع پر یہی مناسب سمجھا کہ وہ مہابت خان سے کچھ مراعات حاصل کر لے اور باقی ماندہ زندگی محفوظ انداز میں گزار سکے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر فتح خان نے مہابت خان کو ایک خط تحریر کیا۔

"میں علی الاعلان شہنشاہ شاہ جہاں کی اطاعت قبول کرتا ہوں۔"

فتح خان نے اپنے خط میں یہ درخواست بھی کی تھی۔

"مجھے ساڑھے دس لاکھ روپے عنایت کئے جائیں تاکہ میں ایک پُرسکون زندگی بسر کر سکوں۔"

مہابت خان نے فتح خان کی یہ درخواست قبول کرتے ہوئے اسے ساڑھے دس لاکھ روپے ادا کر دیئے۔ یہ رقم فتح خان کو شاہ جہاں کی اطاعت قبول کرنے کی قیمت کے طور پر ادا کی گئی تھی۔ رقم پاتے ہی فتح خان نے چابیاں مہابت خان کے حوالے کیں اور 18 جون 1633ء کو قلعہ چھوڑ کر چلا گیا۔

آخر دولت آباد کے کھنڈروں پر مغل پرچم لہرا دیا گیا۔ احمد نگر کو مکمل طور پر تسخیر کیا جا چکا تھا۔ ایک طویل کشمکش کے بعد دولت آباد کے در و دیوار مغل سلطنت کی عظمتوں کے ترانوں سے گونجنے لگے۔ پہلی بار ابوالمظفر شہاب الدین شاہ جہاں صاحبقران ثانی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

شاہ جہاں نے اس خبر کو نہایت مسرت کے ساتھ سنا اور مہابت خان کو اس فتح پر مبارکباد دیتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا۔

"شہنشاہ تمہیں اس سرفروشی اور جانبازی پر سلام پیش کرتے ہیں۔ تم مغل سلطنت کے عظیم سپہ سالار ہو۔ خدا تمہیں مزید کامرانیاں بخشے اور شہنشاہ کے حضور نئے انداز سے سرخرو ہونے کا موقع فراہم کرے۔"

⊛.....⊛.....⊛

ابھی بیجاپور کی تسخیر کا مرحلہ باقی تھا۔ احمد نگر کی حکومت ختم ہوتے ہی بیجاپور کی فوجوں نے پیش قدمی کی اور دولت آباد کا محاصرہ کر لیا۔ بیجاپور کے حکمراں کو مہابت خان کی عسکری صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ نتیجتاً جب دونوں لشکر متصادم ہوئے تو بیجاپور کی فوجوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مہابت خان نے آگے بڑھ کر "پارندہ" کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ تقریباً سات ماہ تک جاری رہا۔

اس دوران مہابت خان کے فوجیوں کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ ادھر برسات کے موسم کی وجہ سے بھی مغلوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مجبوراً مہابت خان ناکامی کی حالت میں برہان پور کی طرف چلا گیا۔ ابھی چند ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ مہابت خان ایک جان لیوا بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ ہندوستان کے بہترین طبیبوں نے اس کا علاج کیا مگر بیماری لحظہ بہ لحظہ

بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بالآخر جب اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تو مہابت خان نے ایک طویل خط شاہ جہاں کے نام تحریر کیا۔

"ظلِ الٰہی! اپنے اس نمک خوار کا سلام قبول کیجئے۔ کیسا عجیب وقت ہے کہ طبیب میری صحت کے لئے نئی نئی دوائیں تجویز کر رہے ہیں اور میں اپنی آنکھوں سے موت کو لحہ بہ لحہ قریب آتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میری خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے احمد نگر کی طرح بیجاپور کی فتح کی خوشخبری بھی سناؤں لیکن مقدرات پر کسے اختیار ہے؟ میں شاہِ والا سے بہت شرمندہ ہوں کہ ایفائے عہد نہ کر سکا۔ کاش! یوں ہوتا کہ میں کسی گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتا، دشمن کے سپاہی مجھے گھیر لیتے۔ میرے سینے میں زہر آلود تیر پیوست کرتے یا میرا جسم شمشیر کے زخموں سے لہولہان ہو جاتا۔ یہاں تک کہ میں اپنے حریف سے لڑتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ یہ ایک سپاہی کی موت ہوتی اور میں نے اسی موت کی تمنا کی تھی۔ مگر یہ موت میری قسمت میں نہیں تھی۔ میں عام انسانوں کی طرح بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا ہوں۔ میری یہ حسرت بھی دل ہی میں رہ گئی کہ میں اپنے ہاتھوں سے وہ تلوار، شاہِ والا کے حوالے کرتا جو مجھے بطورِ انعام بخشی گئی تھی۔ مجبوراً وہ شمشیر قاصد کے ذریعے حضور کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ میری تمام کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرما دیجئے گا کہ آخر میں بھی ایک انسان تھا۔ صاحبقران ثانی کا اقبال بلند ہو۔ سلطنتِ مغلیہ پائندہ باد۔"

قاصد کے آگرہ پہنچتے پہنچتے مہابت خان کا انتقال ہو چکا تھا۔

جب شاہ جہاں نے مہابت خان کا خط پڑھا اور اُس کی تلوار دیکھی تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"خدا تمہاری مغفرت کرے مہابت خان!" شاہ جہاں کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "تم نے اپنی شمشیر کا قرض ادا کر دیا اور تم اس حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے ہو کہ تمہارے کاندھوں پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔"

یہ کہہ کر شاہ جہاں خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اُس نے ایک آہِ سرد کھینچی اور زیرِ لب کہا۔

"کیسا سنگین وقت آ گیا ہے کہ ہمارے تمام وفادار ساتھی ایک ایک کر کے بچھڑتے جا رہے ہیں۔"

⊛.....⊛.....⊛

مصوری کے شعبے کے نگراں، فقیر اللہ خان اور میر ہاشم کئی نایاب تصاویر شاہ جہاں کے سامنے پیش کر چکے تھے مگر شہنشاہ کو کوئی ایک تصویر بھی پسند نہیں آئی تھی۔

بالآخر ایک دن اس نے جھنجلا کر کہا۔

"ہمارا خواب اتنا عامیانہ نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ خوامخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ انہیں

انعام واکرام دے کر رخصت کر دو۔"

فقیر اللہ اور میر ہاشم اپنی ناکامی پر بہت شرمندہ نظر آ رہے تھے۔

ممتاز محل کی یادگار تعمیر کرنے کے سلسلے میں شاہ جہاں کا اضطراب دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ اکثر وہ اپنے اہلِ دربار سے مخاطب ہو کر کہتا۔

"کیا پوری سلطنتِ مغلیہ میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ہمارے خواب کی تعبیر پیش کر سکے؟" شاہ جہاں کے لہجے سے شدید مایوسی کا اظہار ہوتا تھا۔

دربار میں استاد عیسیٰ شیرازی بھی موجود تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ استاد عیسیٰ، ترکی النسل تھا۔ مگر اکثریت کا دعویٰ ہے کہ وہ ایرانی باشندہ تھا، جو ترکِ وطن کر کے شاہ جہاں کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ استاد عیسیٰ شیرازی، فنِ تعمیر میں ایک خاص مہارت رکھتا تھا۔ شاہ جہاں کے دور کی بنائی ہوئی اکثر عمارتوں میں اس کے اعلیٰ ذوق کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔

ایک دن جب شاہ جہاں بہت مایوسانہ گفتگو کر رہا تھا تو استاد عیسیٰ شیرازی اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور انتہائی مؤدبانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

"اگر شہنشاہِ ذی وقار اجازت دیں تو یہ خادم بھی آخری کوشش کر دیکھے۔"

"اس کام میں اجازت کی کیا ضرورت ہے عیسیٰ شیرازی؟" شاہ جہاں نے بے دلی کے ساتھ کہا۔ "یہ تو تمہارا فرض ہے کہ اپنے شہنشاہ کو اس اذیت سے نجات دلاؤ۔ تقریباً ایک سال گزر چکا ہے کہ تمہاری ملکۂ عالیہ روزانہ ہمارے خوابوں میں تشریف لاتی ہیں۔ ان کی خاموشی بتاتی ہے کہ وہ ہم سے خوش نہیں ہیں۔ ملکۂ عالیہ کو ہماری مجبوری کا اندازہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ خدا گواہ ہے کہ ہم ایک لمحے کے لئے بھی اس خیال سے غافل نہیں رہتے۔ اگر ملکۂ عالیہ کے مرقد پر ایک عامیانہ یادگار قائم کرنا ہوتی تو اب تک ایسے کئی روضے تعمیر ہو چکے ہوتے۔ لیکن ہم اپنے عہد سے مجبور ہیں۔ جب تک کوئی بے مثال خاکہ ہماری نظروں کے سامنے نہیں آئے گا، ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوں گے۔"

اس واقعے کے بعد استاد عیسیٰ شیرازی فقیر اللہ خان، میر ہاشم اور دوسرے مصوروں کے ساتھ ایک کمرے میں بند ہو گیا۔ وہ روزانہ کئی کئی گھنٹے تک شہنشاہ کے خواب کو مصوروں کے سامنے بیان کرتا اور پھر ان سے کہتا کہ وہ ایک بے مثال عمارت کے نقوش کاغذ پر روشن کریں۔

جواب میں فقیر اللہ خان اور میر ہاشم وضاحت کرتے ہوئے کہتے..... ہم بے شمار خاکے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں مگر شاہِ والا نے کسی ایک کو بھی پسند نہیں فرمایا۔

"کاغذ پر کھینچے ہوئے خاکے، شہنشاہ کو پسند نہیں آئیں گے۔" استاد عیسیٰ شیرازی کہتا۔ "یہ خالص فنِ تعمیر کا مسئلہ ہے۔ آپ حضرات کسی ایک نقشے پر متفق ہو جائیں پھر میں اس خاکے میں ایسے رنگ بھر دوں گا کہ شاہِ والا بھی مطمئن ہو جائیں گے۔"

فقیر اللہ خان، میر ہاشم اور دوسرے مصور، عیسیٰ شیرازی کے منصوبے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

تاہم وہ سب لوگ دن رات محنت کر کے مختلف مقبروں کی تصویریں بناتے رہے۔

اسی دوران شاہ جہاں کو انتظامی امور کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا۔

اس وقت ملکہ نور جہاں مستقل طور پر لاہور میں مقیم تھی۔ شاہ جہاں نے اپنی سوتیلی والدہ کو ہر قسم کی مراعات بخشی تھیں۔ کئی خادم اور کنیزیں نور جہاں کی خدمت پر مامور تھیں۔ اسے دو لاکھ روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ بس نور جہاں پر اتنی پابندی تھی کہ وہ لاہور سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ نور جہاں نے اپنا تمام تر وقت جہانگیر کے مقبرے کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ ذاتی نگرانی میں اپنے شوہر کی آخری یادگار تعمیر کرا رہی تھی۔ اس سلسلے میں جو کچھ اخراجات ہوتے تھے، وہ شاہی خزانے سے ادا کئے جاتے تھے۔

اس بار شاہ جہاں لاہور آیا تو نور جہاں نے اپنے ایک خادم کے ذریعے تحریری پیغام بھیجا۔

"میں شاہِ والا سے ملاقات کی خواہش مند ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میری یہ درخواست رائیگاں نہیں جائے گی۔"..... (بدنصیب نور جہاں)

یہ ایک مختصر سی تحریر تھی جسے پڑھ کر شاہ جہاں کچھ دیر کے لئے اُداس ہو گیا۔ انقلاباتِ زمانہ بھی عجیب تھے۔ کہاں وہ نور جہاں کہ جس کے مقدر کی رسائی پر اہلِ ہند رشک کیا کرتے تھے..... اور کہاں یہ نور جہاں کہ اپنی بدنصیبیوں کا ماتم کرتے ہوئے شاہ جہاں کے حضور میں درخواست پیش کر رہی تھی۔

خط پڑھ کر شاہ جہاں خود نور جہاں سے ملنے گیا۔

جب ہندوستان کی سابق ملکہ پر اُس کی نظر پڑی تو شاہ جہاں حیران رہ گیا۔ نور جہاں سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس تھی۔ کبھی جس عورت کے حُسنِ جاں سوز نے مغل سلطنت کو زیروزبر کر کے رکھ دیا تھا، اب وہی حکمراں خاتون محرومی و شکستگی کا ایک مجسمہ نظر آ رہی تھی۔

"آپ مجھ سے کس لئے ملنا چاہتی تھیں مادرِ گرامی؟" شاہ جہاں نے پورے ادب و احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"شاہِ والا.....!" یہ کہتے کہتے نور جہاں کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے پورا ماضی متحرک نظر آنے لگا تھا۔ کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ اس کے شاہانہ جاہ و جلال کے آگے لوگوں کی سانسیں رکنے لگتی تھیں..... اور آج شاہ جہاں کے سامنے خود اُس کی آواز لرز رہی تھی۔ حکومی کا یہ انداز بڑا ظالمانہ تھا۔ نور جہاں کے زخمی دل سے ایک بار پھر خون رسنے لگا تھا۔

"کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے یا پھر میری لاعلمی میں کسی شخص نے آپ کو آزار پہنچایا ہے؟" نور جہاں کو خاموش پا کر شاہ جہاں نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" اتنی دیر میں نور جہاں سنبھل چکی تھی۔ "بس اتنا گلہ ہے کہ میں اپنی بھتیجی ارجمند بانو کی تدفین میں شریک نہیں ہو سکی۔"

شاہ جہاں نے مناسب نہیں سمجھا کہ وہ ماضی کی راکھ کو کریدے اور نور جہاں کو بتائے کہ اس نے اپنے دورِ اقتدار میں ارجمند بانو پر کیسے کیسے ستم ڈھائے تھے اور اس کے جگر کے ٹکڑوں داراشکوہ اور اورنگزیب کو یرغمال بنالیا تھا۔ شاہ جہاں نے اس موقع پر بڑے صبر وضبط کا مظاہرہ کیا۔

''میں ارجمند کی موت پر شہنشاہ سے تعزیت کرنے آگرہ جانا چاہتی تھی مگر آپ کے سپاہیوں نے مجھے لاہور کی حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔'' نور جہاں کے لہجے سے کرب کے ساتھ ساتھ تلخی بھی نمایاں تھی۔

''وہ حکمِ شاہی سے مجبور تھے۔'' شاہ جہاں بہت آہستہ بول رہا تھا۔ ''میں آپ کی تعزیت قبول کرتا ہوں۔ جانے والے اس طرح چلے گئے کہ ان کے بغیر زندگی بے کیف ہو کر رہ گئی ہے۔'' شاہ جہاں کا لہجہ بہت شکستہ تھا۔

''اب شاہِ والا کو کسی دوسرے کے غم کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔'' یکایک نور جہاں کی آواز بدل گئی تھی اور اب ایک مغرور عورت کی ذات اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہو گئی تھی۔

''آخر آپ کیا کہنا چاہتی ہیں، مادرِ گرامی؟'' شاہ جہاں نے چونک کر پوچھا۔

''یہی کہ جب کسی کا محبوب بچھڑتا ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔'' نور جہاں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''آپ اپنی بھتیجی کی تعزیت کر رہی ہیں یا اس کی موت کا مذاق اُڑا رہی ہیں؟'' شاہ جہاں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پایا۔ ''کیا آپ اسی کام کے لئے آگرہ آنا چاہتی تھیں کہ میرے رنج والم کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھیں؟..... یہ تعزیت پیش کرنے کا طریقہ ہے یا زخمی دلوں پر نشتر زنی کرنے کا انداز؟''

''یقیناً میں شاہِ والا سے تعزیت کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ پوچھنا بھی چاہتی تھی کہ ارجمند سے بچھڑ کر آپ کے دل پر کیا گزری ہے؟'' اب نور جہاں بہت بے باک لہجے میں بول رہی تھی۔

''آپ اس غم کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔'' شاہ جہاں نے ایک بار پھر انتہائی صبر وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر شاہِ والا کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ ایک بیوہ پر کیا گزر رہی ہے۔'' اب نور جہاں کے لہجے کی تلخی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔

''میں تو آپ کی بیوگی کا ذمہ دار نہیں ہوں۔'' شاہ جہاں کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تم ہی میری بیوگی کے ذمے دار ہو۔'' نور جہاں نے ہر تکلف اور رعایت کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ ''اگر تم باغیانہ روش اختیار نہ کرتے تو میرے شوہر کی زندگی زیادہ طویل ہو سکتی تھی۔ تمہاری مسلسل گستاخیوں نے شہنشاہِ عالی مقام کو اس قدر جذباتی صدمے پہنچائے کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئے اور پھر اسی دل کی بیماری نے ان کا کام تمام کر دیا۔ بے خبر

رعایا یہ راز نہیں جانتی کہ ایک باغی اور گستاخ بیٹے نے اپنے باپ کو کس طرح قتل کیا ہے۔ بے شک! تمہارے دامن پر شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے خون کی کوئی چھینٹ نہیں مگر میری نظر میں تم ہی اپنے باپ کے قاتل ہو۔''

یہ سن کر شاہ جہاں کی حالت غیر ہو گئی تھی اور وہ غصے سے کانپنے لگا تھا۔

''مادرِ گرامی! آپ سے میرا نازک وحساس رشتہ بھی ہے اور آپ ایک کمزور عورت بھی ہیں۔ اس لئے میں ان باتوں کا جواب دینا نہیں چاہتا۔''

''شاہِ والا! اب مجھے کسی جواب کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' اچانک نور جہاں کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا تھا۔ ''میرے ساتھ انصاف ہو گیا۔ جس طرح میں لاہور کے ایک گوشے کی تنہائیوں میں قید ہوں، اسی طرح آپ بھی اپنے غموں کی ویرانیوں میں اسیر ہیں۔ جس طرح مجھے صبر وقرار میسر نہیں، اسی طرح آپ کے دل کا سکون بھی لٹ چکا ہے۔ میں تو بدنصیب ٹھہری کہ نہ دولت ہے نہ اقتدار..... مگر آپ اپنی طرف دیکھئے کہ تاج وتخت کی ضوفشانیاں بھی ہیں..... اور خادموں کے جھکے ہوئے سروں کی لمبی قطاریں بھی..... مگر وہ شے میسر نہیں، جسے سکون کہتے ہیں۔ جائیے اور اپنے تمام خزانے لٹا دیجئے۔ لیکن پھر بھی سکونِ دل نہیں خرید سکیں گے۔''

شاہ جہاں نے نور جہاں کی شخصیت کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اپنی محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لئے دوسروں کے غموں پر خوش ہوتی تھی۔

شاہ جہاں نے کئی بار کوشش کی کہ وہ نور جہاں کے سامنے اس کے مظالم شمار کرائے مگر ایک بلند کردار انسان کی حیثیت سے اس نے بڑی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا۔

''مادرِ گرامی! اگر میں وقت کے آئینے کا غبار صاف کر دوں تو اس میں ہر شخص کو اپنا حقیقی چہرہ نظر آنے لگے۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ جب آپ ہی نے مقدس رشتوں کو نفرتوں کی آگ میں جلا ڈالا تو پھر زمانے سے کیا گلہ اور تقدیر سے کیسی شکایت؟''

یہ کہہ کر شاہ جہاں تھکے تھکے قدموں سے واپس چلا گیا۔ نور جہاں نے اس کی نوازشات و عنایات کا جو صلہ دیا تھا، وہ بڑا تکلیف دہ اور لرزہ خیز تھا۔

❀.....❀.....❀

ابھی نور جہاں کی نفرت آمیز گفتگو اور مہابت خان کی موت کا غم تازہ تھا کہ جھجر سنگھ بندیلہ نے ایک بار پھر بغاوت کر دی۔ یہ اطلاع پاتے ہی شاہ جہاں تیز رفتاری کے ساتھ لاہور سے روانہ ہو کر آگرہ پہنچا۔

سب سے پہلے اس نے آصف خان کو ''خان خاناں'' کا خطاب دیا۔ آصف خان سے پہلے یہ خطاب، مہابت خان کو دیا گیا تھا۔

شاہ جہاں کو جھجر سنگھ کی بغاوت کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ فکرمند نظر آنے لگا۔ جھجر سنگھ

بندیلہ نے "چوڑا گڑھ" کے راجہ کو قتل کر کے اس کا تمام خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ جھجر سنگھ پانچ سال تک دکن میں مغلوں کی خدمات انجام دیتا رہا تھا اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے باقی دن بھی مغل سلطنت کی اطاعت و فرمانبرداری میں گزار دے گا۔ مگر اچانک اس کے دل میں آزادی کی خواہش کروٹیں لینے لگی اور وہ اپنے بیٹے کو مہابت خان کے پاس چھوڑ کر "اوڑچھا" کے مقام پر چلا آیا۔ جھجر سنگھ کی اس روش کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یکایک باغیوں کی صف میں کھڑا ہو جائے گا۔ دراصل جھجر سنگھ، گونڈوانہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنے اسی منصوبے کے تحت اس نے چوڑا گڑھ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

اسی دوران چوڑا گڑھ کے مقتول راجہ کے لڑکے نے شاہ جہاں سے مدد کی درخواست کی۔

اس درخواست کے جواب میں شاہ جہاں نے جھجر سنگھ کو بار بار تنبیہ کی کہ وہ جارحانہ اقدامات سے باز رہے مگر جھجر سنگھ پر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کا نشہ طاری تھا۔ اس نے شاہ جہاں کے احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے چوڑا گڑھ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ پریم نرائن ایک کمزور حکمراں تھا۔ اس لئے وہ چوڑا گڑھ کا دفاع نہ کر سکا۔ جھجر سنگھ نے قلعے پر قبضہ کر کے راجہ پریم نرائن کو قتل کر دیا۔

شاہ جہاں نے فوری طور پر جھجر سنگھ کو نیا حکم دیتے ہوئے کہا۔

"تجھے لازم ہے کہ ہماری اطاعت قبول کر لے اور اس کے ساتھ ہی تمام مقبوضہ علاقے واپس کر دے۔"

شاہ جہاں نے جھجر سنگھ کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ دس لاکھ روپے بطور جرمانہ ادا کرے۔ مگر جھجر سنگھ نے شاہ جہاں کے کسی ایک حکم پر بھی عمل نہیں کیا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ احکامِ شاہی کا پابند نہیں ہے۔ یہ کھلی بغاوت تھی۔ جھجر سنگھ کا جواب سن کر شاہ جہاں کی کشادہ پیشانی پر کئی شکنیں نمودار ہو گئیں۔

اس کے علاوہ جھجر سنگھ نے اپنے لڑکے کو پیغام بھیجا کہ وہ بالا گھاٹ سے اپنی فوج لے کر واپس آ جائے۔ یہ وہی فوج تھی جو کئی سال سے مغل سلطنت کی حمایت کر رہی تھی۔ جب جھجر سنگھ کے بیٹے کا لشکر واپس آ رہا تھا تو مغل فوجیوں نے حملہ کر کے اسے شدید نقصان پہنچایا۔ باغی راجہ کا لڑکا بمشکل تمام اپنی جان بچا کر بھاگا اور کسی نہ کسی طرح باپ کے پاس پہنچ گیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر شاہ جہاں نے باغیوں کی سرکوبی کے لئے شہزادہ اورنگ زیب کو روانہ کیا۔ یہ پہلی جنگی مہم تھی جس کی قیادت شہزادہ اورنگ زیب کر رہا تھا۔ جب وہ اپنے لشکر میں نمودار ہوا تو اس کے سر پر شاہی دستار کے ساتھ مبارک شاہ قلندر کی دی ہوئی دستار بندھی تھی اور وہ بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔

"اے خدا! اپنے اس کمزور بندے اورنگ زیب کی آبرو رکھ اور اسے معرکۂ حیات میں سرخروئی و سربلندی عطا فرما۔"

مغل فوج "بھنڈر" سے ہوتی ہوئی اڑیسہ پہنچی۔ یہ تمام علاقہ گھنے جنگلات سے گھرا ہوا تھا
س کے باعث اورنگ زیب کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ اس دوران بندیلوں کے
شکر نے مغل فوجوں پر پے در پے حملے کئے لیکن وہ مسلسل آگے ہی بڑھتی چلی گئیں۔ اس صورتِ
حال کو دیکھتے ہوئے جھجر سنگھ اپنے بیٹے کو چھوڑ کر "اوڑچھا" سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے
خاندان اور خزانے کو جنوب کی طرف "دھمونی" کے مقام پر منتقل کر دیا تھا۔

شہزادہ اورنگ زیب نوعمری کے باوجود ہمہ وقت ہوش و حواس میں رہنے والا سپہ سالار تھا۔
س نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ جھجر سنگھ کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ اورنگ زیب نے برق
رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کی اور "دھمونی" کے قریب پہنچ گیا۔ مغل فوجوں نے مختصر سے وقت
میں اس علاقے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا اور پیش قدمی جاری رکھی۔ جھجر سنگھ مایوس ہو کر "چوڑا
گڑھ" سے فرار ہو گیا۔ وہ تقریباً چھ ہزار سپاہیوں، ساٹھ ہاتھیوں اور اپنے خاندان کے لوگوں کے
ساتھ دکن کی طرف نکل گیا۔

جھجر سنگھ نے پندرہ دن تک مسلسل سفر کیا لیکن مغل فوجوں نے بھی اس کا تعاقب جاری رکھا۔

جھجر سنگھ اپنے اقتدار سے پہلے ہی مایوس ہو چکا تھا، اب اسے اپنی زندگی بھی موت کے
نرغے میں گھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اگر اس موقع پر وہ شہزادہ اورنگ زیب سے امان طلب کرتا
تو یقیناً اُس کی جان بخش دی جاتی لیکن جھجر سنگھ اپنے ضمیر کی عدالت میں بھی مجرم تھا۔ اور یہی
احساسِ جرم اُسے فرار ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔ شاہ جہاں نے اُسے بار بار حکم دیا تھا کہ وہ معافی
مانگ کر سلطنت مغلیہ کے وفاداروں میں شامل ہو جائے۔ مگر جھجر سنگھ ایک عہد شکن انسان تھا۔ اور
اپنی اسی خباثتِ نفس کے باعث وہ شاہ جہاں کی نیت پر بھی شک کر رہا تھا۔

بالآخر جب وہ چاروں طرف سے گھر گیا تو اس نے اپنے چند ساتھیوں کو جمع کر کے کہا۔

"اب یہ تاریک جنگل ہی ہمیں پناہ دے سکتا ہے۔"

"ہم کل تک آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔" جھجر سنگھ کے ساتھیوں نے چیخ کر
کہا۔ "مگر آپ کی ایک غلطی نے ہماری دنیا بھی برباد کر دی۔ آخر ہمیں اس بغاوت کی کیا
ضرورت پیش آئی تھی؟ جب آپ کو معلوم تھا کہ شاہی فوجوں کے سیلاب کو نہیں روکا جا سکتا تو پھر
مٹی کا یہ کمزور بند کیوں باندھا گیا تھا؟"

جھجر سنگھ اپنے ساتھیوں کے سوال کا کیا جواب دیتا؟ یہ انتہائی بدبختی تھی کہ پُرسکون زندگی
گزارتے گزارتے وہ اچانک بغاوت کا پرچم لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

ابھی جھجر سنگھ، فرار کا نیا منصوبہ بنا رہا تھا کہ اس دوران ایک لرزہ خیز واقعہ پیش آیا۔ راجپوت
عورتیں جن گھوڑوں پر سوار تھیں، وہ اچانک بدک کر مغل فوجوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

جھجر سنگھ نے فوراً اپنے تیر اندازوں کو حکم دیا کہ ان عورتوں کو ہلاک کر دیا جائے۔

تیر انداز سپاہی حیرت سے جھجر سنگھ کا منہ دیکھ رہے تھے۔

"بہت کم وقت ہے۔ ان عورتوں کو زندگی کی قید سے آزاد کر دو۔" جھجر سنگھ نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "اگر یہ گھوڑے مغل فوجیوں تک پہنچ گئے تو ہماری عورتیں بھی ان کے قبضے میں چلی جائیں گی۔ راجپوتوں کی غیرت یہ گوارا نہیں کرے گی کہ ان کی آبرو ایک تماشا بن کر رہ جائے۔"

مجبوراً تیر اندازوں نے اپنی کمانیں کھینچیں اور زہریلے تیر راجپوت عورتوں کے نرم و نازک جسموں کو نشانہ بنانے لگے۔ بہت سی عورتیں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین پر گر گئیں اور بھڑکے ہوئے گھوڑے بہت سی عورتوں کو لے کر مغل لشکر کی طرف بھاگ گئے۔ ان خواتین میں بھی اکثر زخمی ہو گئی تھیں۔

جھجر سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ان عورتوں کو ہلاک کر ڈالو۔ مغل فوجی آنے ہی والے ہیں۔ پتہ نہیں کہ یہ ہماری عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔"

"جوہر کی رسم کیوں ادا نہیں کی جاتی؟" بعض سرداروں نے جھجر سنگھ کے فیصلے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"جوہر کا وقت نہیں ہے۔" جھجر سنگھ نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

جوہر کی رسم راجپوتوں کی مشہور رسم تھی۔ یہ رسم اس وقت ادا کی جاتی تھی، جب راجپوت مردوں کو اپنی شکست کا پورا یقین ہو جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر تمام راجپوت عورتیں اپنے جسموں پر بہترین لباس اور زیورات سجا کر ایک حصار میں بیٹھ جاتی تھیں۔ پھر چاروں طرف آگ لگا دی جاتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک بہت بڑا الاؤ روشن کر دیا جاتا اور راجپوت عورتیں اپنی قومی عظمت کے گیت گاتے ہوئے اس آگ میں کود پڑتی تھیں۔ جوہر کی یہ رسم اس لئے ادا کی جاتی تھی کہ راجپوت مردوں کے قتل ہو جانے کے بعد کہیں دشمن ان کی عورتوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک نہ کرے۔

اگرچہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے مفتوح خواتین سے کبھی ایسا سلوک نہیں کیا۔ اور شاہ جہاں تو خود ایک راجپوت خاتون کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کی روایتی رواداری کے ساتھ وہ اپنے دل میں راجپوتوں کے لئے ایک مخصوص نرم گوشہ بھی رکھتا تھا۔ مگر جھجر سنگھ شکست کے خوف سے پاگل ہو گیا تھا۔ اور اپنی عورتوں کو بے دریغ قتل کرنے کا حکم دے رہا تھا۔

"ہم زندہ ہیں..... ہمیں مت مارو..... بھگوان کے لئے ہمیں اپنے ساتھ لے چلو۔"

مگر جھجر سنگھ نے اپنا حکم واپس نہیں لیا۔ راجپوت عورتیں فریاد کرتی رہیں اور قتل ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ زمین کا ایک ٹکڑا انسانی خون سے سرخ ہو گیا۔

اس کے بعد جھجر سنگھ مطمئن نظر آنے لگا۔ اُس نے پُرجوش انداز میں اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ میں نے عورتوں کو قتل کر کے اپنے دل و دماغ کا سارا بوجھ اُتار پھینکا ہے۔ اب میں ان خوفناک جنگلوں میں روپوش رہ کر برسوں تک شاہ جہاں کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔"

مگر جھجر سنگھ کا یہ اطمینان بہت عارضی تھا شاہی فوجوں کے خوف سے اس کے بہت سے ساتھی فرار ہو کر جنگلوں میں چھپ گئے اور جھجر سنگھ کے قریب محض چند آدمیوں کی ایک جماعت رہ گئی۔

مغلوں نے آگے بڑھ کر جھجر سنگھ کے بہت سے رشتے داروں کو گرفتار کر لیا۔ جو زخمی عورتیں اس طرف آ گئی تھیں، اورنگزیب کے سپاہیوں نے انہیں فوری طور پر طبی امداد فراہم کی۔

جھجر سنگھ موقع پا کر فرار ہو چکا تھا۔ گرفتاری کے خوف سے وہ کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس وقت جھجر سنگھ کی حالت اس خرگوش کی سی تھی، جس کے تعاقب میں بہت سے شکاری جانور ہوں اور وہ ایک جھاڑی سے نکل کر دوسری جھاڑی میں چھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس جنگ کو فیصلہ کن بنانے کے لئے شاہ جہاں خود بھی 1634ء کے شروع میں دارالحکومت سے نکل کر "اوڑچھا" کی طرف بڑھا۔ اس دوران اسے خبر ملی کہ شاہ کے جاں نثاروں نے جھانسی کے مضبوط قلعے پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ ایک اچھی خبر تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور خبر بھی کئی دن سے گردش کر رہی تھی کہ جھجر سنگھ اور اس کا بیٹا بکر ماجیت مارے جا چکے ہیں مگر ابھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔

واقعہ یہ تھا کہ جب جھجر سنگھ اور اس کا لڑکا فرار ہو کر گوندہ قبیلے میں پہنچے تو ان لوگوں نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ جھجر سنگھ نے گوندوں کو دیوی دیوتاؤں کا واسطہ دیا تو وہ لوگ کچھ نرم بھی پڑ گئے۔ مگر یہ نرمی بھی مصلحت سے خالی نہیں تھی۔ گوندوں کے سردار نے شاہی قہر و عتاب سے بچنے کے لئے نئی ترکیب سوچ لی تھی۔ جھجر سنگھ اور اس کے بیٹے بکر ماجیت کو عارضی طور پر پناہ دے دی گئی۔ پھر جب وہ دونوں باپ بیٹے مطمئن ہو گئے تو سردار کے حکم پر گوندوں نے ایک رات سوتے میں جھجر سنگھ اور بکر ماجیت کا کام تمام کر دیا۔ اس عرصے میں شاہ جہاں کے پہنچنے کی خبر عام ہو چکی تھی۔ نتیجتاً جھجر سنگھ اور بکر ماجیت کے سر کاٹ کر شاہ جہاں کی خدمت میں بھیج دیئے گئے۔ دونوں باغی اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ شاہ جہاں نے گوندوں کو بڑے انعام و اکرام سے نوازا۔

۞.....۞.....۞

مہابت خان کی موت اور دکن سے مغل فوجوں کے انخلا کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ریاست بیجاپور میں مختلف گروہوں کے درمیان شدید کشمکش شروع ہو گئی۔

بیجاپور کا پیشوا (وزیر اعلیٰ) شاہ جہاں کا حامی تھا اور وہ چاہتا تھا کہ سرکاری احکام کے لئے

شاہی مہریں استعمال کی جائیں۔ مگر بیجاپور کا ایک اور وزیر، خواص خان اس کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے سلطانِ بیجاپور کو بھی اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ شاہی مہریں استعمال نہ کی جائیں۔ اور پھر ایک دن سلطانِ بیجاپور نے مصطفیٰ خان کو بلا کر کہا۔

"آخر تم یہ کیوں چاہتے ہو کہ ہماری ریاست کے کاغذات پر شاہی مہریں استعمال کی جائیں؟"

"میں ریاست کا سچا ہمدرد ہوں۔" مصطفیٰ خان نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "میری نظر میں یہی بہتر ہے کہ شاہی مہریں استعمال کر کے مستقبل کے خطرات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔"

مگر مصطفیٰ خان کی دُور اندیشی کسی کام نہ آئی اور خواص خان نے سلطان کے اشارے پر اسے بلگام کے قلعے میں قید کر دیا۔ سلطانِ بیجاپور کے دربار میں مصطفیٰ خان کے بہت سے ہمدرد موجود تھے اس لئے وہ خواص خان کے جارحانہ اقدام کو برداشت نہ کر سکے اور کچھ دن بعد ہی ایک زیرِ زمین سازش کے ذریعے خواص خان اور اس کے ہمنوا پنڈت مراری کو قتل کر دیا۔ مصطفیٰ خان نے رہائی حاصل کی اور سلطانِ بیجاپور کے حکم پر اسے دوبارہ وزیرِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔

اسی دوران شاہ جہاں نے فیصلہ کیا کہ وہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں سے اطاعت کی تجدید کرائے۔ 1636ء کے آخر میں شاہ جہاں نے دریائے نربدا پار کیا اور دولت آباد پہنچ گیا۔ اس کے بعد سلطانِ بیجاپور کے نام شاہی فرمان تحریر کیا گیا جس کا متن کچھ اس طرح تھا۔

"سلطنتِ مغلیہ کو باقاعدہ خراج ادا کیا جائے۔ احمد نگر کے جو علاقے بیجاپور کے قبضے میں ہیں، انہیں مغل افسروں کے سپرد کر دیا جائے۔"

شاہ جہاں نے سلطانِ بیجاپور کو آخری حکم دیتے ہوئے لکھا تھا۔ "اس کے ساتھ ہی سلطانِ احمد نگر کے قریبی رشتے داروں اور مرہٹوں کو ریاست سے نکال دیا جائے۔"

اس کے ساتھ ہی شاہ جہاں نے بالا گھاٹ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور اپنے سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر "اوگیر" اور "اوسہ" کے ان قلعوں پر قبضہ کر لیں جو کسی وقت میں احمد نگر کی ملکیت تھے۔ مصطفیٰ خان ہمیشہ سے مغلوں کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ لہٰذا اس نے کسی پس و پیش کے بغیر شاہ جہاں کی تمام شرائط قبول کر لیں۔ اس نے فرمانروائے ہند سے ریاست کے رویے کی معذرت کی اور اس سلسلے میں اپنی صفائی بھی پیش کی۔

یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو چکا تھا کہ اچانک شاہی سفیر نے شاہ جہاں کو ایک نئی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

"بیجاپور کے امراء میں اختلافات بدستور موجود ہیں۔ اسی وجہ سے "اوگیر" اور "اوسہ" کے کمانداروں کو قلعوں کی حفاظت کرنے کی غرض سے ایک بڑی رقم بھی بھیجی گئی ہے۔"

یہ اطلاع پاتے ہی شاہ جہاں نے بیجاپور پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مصطفیٰ خان اور دوسرے ہوش مند امراء جانتے تھے کہ اس جنگ کا کیا انجام ہوگا۔ اس لئے ان لوگوں نے مل کر قیامِ امن

کی کوششیں شروع کر دیں۔ مصطفیٰ خان نے فوری طور پر نئی حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے اپنے لڑکے کو شاہ جہاں کے دربار میں بھیج دیا۔

اس طرح شاہ جہاں کے غصے میں کسی حد تک کمی آ گئی اور صلح و امن کی شرائط طے پا گئیں۔ اس معاہدے کے تحت سلطانِ بیجاپور نے مغل سلطنت کی برتری تسلیم کر لی تھی۔ ہر سال بیس لاکھ روپے خراج ادا کرنا منظور کر لیا اور گولکنڈہ کی حکومت کے ساتھ امن قائم رکھنے پر رضامندی کا اظہار بھی کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ اگر کبھی گولکنڈہ کے ساتھ تنازع ہوا تو شاہ جہاں کو ثالث مقرر کیا جائے گا۔ ریاست احمد نگر کی سرحدوں کا دوبارہ تعین کیا گیا۔ مزید یہ بھی طے پایا گیا کہ اگر شاہ جی مرہٹہ نے اطاعت قبول نہیں کی تو بیجاپور کی فوجیں، مغلوں کا ساتھ دیں گی۔ یہ معاہدہ مئی 1636ء میں ہوا۔

اب صرف ریاست گولکنڈہ کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔ اگرچہ اس ریاست کے لوگ شروع ہی سے شاہ جہاں کے حامی تھے، لیکن یہاں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ گزشتہ تیس سال سے گولکنڈہ کی مسجدوں میں ہر جمعہ کے خطبے کے ساتھ شاہِ ایران کا نام پڑھا جاتا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ گولکنڈہ کے عوام، شاہ جہاں کے ساتھ ہیں مگر حکومت ذاتی طور پر شاہِ ایران کی بالادستی قبول کرتی ہے۔

شاہ جہاں نے اس رسم کو ختم کرنے کے لئے گولکنڈہ کے سلطان سے مطالبہ کیا کہ وہ خطبے سے شاہِ ایران کا نام خارج کر دے۔ اس مطالبے پر بعض امراء نے بہت سخت اعتراض کیا۔ مگر سلطان خوب جانتا تھا کہ انکار کی صورت میں گولکنڈہ کا کیا حشر ہوگا۔ بالآخر اس نے تمام فرقوں کے علماء کا ایک اجلاس طلب کیا، جس نے واضح طور پر فیصلہ دیا کہ شاہ جہاں کے مطالبات تسلیم کر لئے جائیں۔ اس طرح شاہ جہاں کا نام، جمعہ کے خطبے میں شامل کر لیا گیا۔

اس کے بعد سلطانِ گولکنڈہ نے شاہ جہاں کو جو تحائف پیش کئے، ان میں فرمانروائے ہند کی ایک خوب صورت تصویر بھی شامل تھی۔ شاہ جہاں کی تصویر کو سونے کے فریم سے آراستہ کیا گیا تھا جس کے چاروں طرف قیمتی جواہرات جگمگا رہے تھے۔ اسی تصویر کے نیچے معاہدے کی نئی شرائط بھی کندہ کی گئی تھیں۔

۞.....۞.....۞

ریاست بیجاپور اور گولکنڈہ کے سلطانوں کے ساتھ معاہدہ طے پا جانے کے بعد شاہ جہاں کو دکن کی طرف سے سکون نصیب ہوا۔ مگر اسی دوران مرہٹوں کی باغیانہ سرگرمیاں بھی شدت اختیار کرتی رہیں۔ شاہ جہاں نے فوری طور پر خان زماں کی سالاری میں فوج کا ایک دستہ شاہ جی مرہٹہ کی سرکوبی کے لئے روانہ کر دیا۔ فوج کا دوسرا دستہ، شائستہ خان کی سربراہی میں بھیجا گیا جس نے وقت ضائع کئے بغیر احمد نگر کے غربی شمالی علاقوں پر حملہ کر دیا۔

شائستہ خان کو اپنی مہم میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے احمد نگر کے ایک سپہ سالار اور ایک مرہٹہ رہنما کو شکستِ فاش دی۔ پھر آگے بڑھ کر کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ شاہ جی مرہٹہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح ''پارندہ'' پہنچ کر بیجاپور کی افواج سے جا ملے۔ مگر اُسے یہ خبر نہیں تھی کہ بیجاپور کے سلطان اور شاہ جہاں کے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے۔ خان زماں مسلسل اس کا تعاقب کرتا رہا۔ جب شاہ جی مرہٹہ، بیجاپور کے علاقے میں داخل ہوا تو خان زماں کو اس کا تعاقب ترک کرنے کا حکم ملا۔

اس کے بعد خان زماں نے کولہاپور اور دیگر علاقوں میں داخل ہو کر ان پر قبضہ کر لیا۔ بیجاپور کی فوجیں معاہدے کے تحت مغلوں کا ساتھ دیتی رہیں۔ نتیجتاً شاہ جی مرہٹہ کو کسی ایک جگہ جم کر مقابلہ کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔ بالآخر اسے ایک چھوٹے سے قلعے میں پناہ لینا پڑی۔ بیجاپور کی فوجوں نے شاہی لشکر کے ساتھ مل کر اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ پھر جب فرار کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تو شاہ جی مرہٹہ نے اپنا سر جھکا کر شاہ جہاں کی اطاعت قبول کر لی۔ وہ اپنے تمام علاقوں سے دستبردار ہو گیا اور اس نے سلطانِ بیجاپور کی ملازمت اختیار کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

۞.....۞.....۞

جب شاہ جہاں سارے سیاسی مسائل حل کرنے کے بعد دارالحکومت لوٹا تو سب سے پہلے ممتاز محل کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے گیا۔ اپنی محبوب ملکہ کو زیرِ زمین سوتا دیکھ کر ایک بار پھر شاہ جہاں کے دل پر چوٹ پڑی اور اس درد کی شدت سے بے قرار ہو کر اس کی آنکھیں اشک برسانے لگیں۔

''ممتاز! یہ دنیا ہمیں ایک بڑے فاتح کی حیثیت سے پہچانتی ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ ہم دل کی دنیا میں سب سے زیادہ شکست خوردہ انسان ہیں۔'' شاہ جہاں وارفتگی کے عالم میں بول رہا تھا۔ ''ہم ابھی تک تمہاری وصیت کے مطابق وہ یادگار قائم نہ کر سکے جو اہلِ دل کے لئے ایک مثال بن جائے۔ ہم تم سے شرمندہ ہیں ارجمند بانو!..... بہت شرمندہ ہیں۔ سیاست کے ہنگامے ہمیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔''

شاہ جہاں بہت دیر تک ممتاز کی قبر پر کھڑا ہوا اشک ریزی کرتا رہا۔ اس دوران ماہ رخ بھی شہنشاہ کے نزدیک آ کر عقب میں کھڑی ہو گئی تھی۔ جب شاہ جہاں، فاتحہ خوانی کے بعد پلٹا تو اُس کی نظر ماہ رخ پر پڑی۔ شہنشاہ اس کنیز کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ماہ رخ کے چہرے کی تمام شادابی رخصت ہو چکی تھی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس وہ ایک بیمار عورت نظر آتی تھی۔

''شاہِ والا کو نئی فتوحات مبارک ہوں۔'' ماہ رخ نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ماہ رخ! اپنی زندگی پر رحم کر کہ یہاں رہتے رہتے تُو خود بھی ایک زندہ قبر بن گئی ہے۔''

شاہ جہاں نے کنیز کی حالت زار دیکھتے ہوئے ہمدردانہ الفاظ کہے۔

''نہیں شاہِ والا! میں یہاں بہت خوش ہوں۔'' ماہ رخ نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ ''آقا زادی کی قربت نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے۔ اگر یہاں سے دُور چلی جاؤں تو شاید ایک سانس بھی نہ لے سکوں۔''

شاہ جہاں نے بہت غور سے ماہ رخ کی طرف دیکھا اور پھر یہ کہتا ہوا چار دیواری سے نکل آیا۔ ''تُو بہت عجیب عورت ہے۔ تجھے دیکھ کر یقین آ جاتا ہے کہ ابھی دنیا اہلِ وفا سے خالی نہیں ہوئی ہے۔''

شہنشاہ چار دیواری سے باہر آیا تو تمام درباری امراء گردنیں جھکائے کھڑے تھے۔ شاہ جہاں کے آتے ہی مبارک بادوں کے شور سے ساری فضا گونج اُٹھی۔ شاہ جہاں دل پر جبر کر کے مسکرایا اور اُس نے امیروں کی نذریں قبول کیں۔

پھر دربار میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس نے اپنے استاد عیسیٰ شیرازی کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے ہم سے کوئی عہد کیا تھا، عیسیٰ!''

''میں تو کئی سال سے انتظار کر رہا تھا کہ حضور، امورِ سلطنت سے فارغ ہوں تو میں اپنی حقیر کوشش ملاحظے کے لئے پیش کروں۔'' استاد عیسیٰ شیرازی دست بستہ شاہ جہاں کے سامنے کھڑا تھا۔

''کاش! تم ہمیں مطمئن کر سکو۔'' یہ کہتے ہوئے شاہ جہاں نے سر کی جنبش سے عیسیٰ شیرازی کو اجازت دی۔

اور جب عیسیٰ شیرازی نے ایک مقبرے کا نقشہ پیش کیا تو شاہ جہاں حیرت زدہ رہ گیا۔

مقبرے کے اس نقشے کو ہندوستان کے کئی نامور مصوروں نے مل کر تیار کیا تھا۔

پھر استاد عیسیٰ شیرازی نے روضے کے نقش و نگار کو لکڑی پر منتقل کیا۔ لکڑی کا یہ روضہ کئی فٹ چوڑا اور کئی فٹ لمبا تھا۔ روضے کے عین درمیان میں ایک بڑا گنبد تھا، جس کی دلکشی بڑھانے کے لئے چار مینار تعمیر کئے گئے تھے۔ عیسیٰ شیرازی نے لکڑی کی اس عمارت کو مکمل طور پر سفید رنگ دیا تھا۔ جسے دیکھ کر یہ تاثر ملتا تھا، جیسے مقبرہ روشنی میں نہایا ہوا ہے۔

عمارت کا موجودہ نقشہ دیکھ کر شاہ جہاں نے بے اختیار کہا۔

''یقیناً..... ہمارے خوابوں میں ایک ایسی ہی تصویر اُبھرتی رہی ہے۔''

تاج محل کی تعمیر کے بارے میں ایک اور روایت بھی مشہور ہے کہ شاہ جہاں ایک دن ممتاز محل کے ہمراہ شکار کھیلنے گیا۔ موضع سبی میں اس نے ایک درویش بہلول شاہ کو مٹی کا ایک روضہ بناتے ہوئے دیکھا۔ یہ روضہ اپنی تعمیر کے اعتبار سے بہت خوب صورت تھا۔ ممتاز محل نے اسے خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ بہلول شاہ نے اس مٹی کے معمولی روضے کی ایک ہزار روپے قیمت

طلب کی۔ ممتاز محل نے فوراً یہ قیمت ادا کر دی۔ بہلول شاہ نے رقم لے کر غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دی۔ اس کے بعد بہلول شاہ نے شاہ جہاں سے کہا کہ وہ اپنے کسی مصور کو بھیج دے پھر جب درباری مصور، بہلول شاہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے کئی گھنٹے تک اسے روضے کا نقشہ سمجھایا۔ بالآخر کافی محنت کے بعد مصور نے وہ نقشہ ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ اور پھر اسی نقشے کے مطابق تاج محل تیار کیا گیا۔ یہ روایت اپنی جگہ کتنی بھی دلچسپ ہو مگر اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ جہاں کے چہرے پر پسندیدگی کے آثار دیکھ کر عیسیٰ شیرازی کی جان میں جان آئی۔

"اگر شاہِ والا نے اس نقشے کو پسند فرمالیا ہے تو پھر مقبرے کی تعمیر کا آغاز کیا جائے۔" عیسیٰ شیرازی نے دست بستہ عرض کیا۔

"عمارت کی یہ شبیہ ہمیں پسند ہے مگر ہم اسے کچھ اور روشن و تابناک دیکھنا چاہتے ہیں۔" شاہ جہاں نے عیسیٰ شیرازی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شاہِ والا! یہ تو محض ایک لکڑی ہے، جسے مصنوعی رنگ سے آراستہ کیا گیا ہے۔" عیسیٰ شیرازی نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جب چاروں طرف سے سنگِ مرمر کی دیواریں اُٹھائی جائیں گی اور پھر ان پر سورج اور چاند کی روشنی منعکس ہوگی تو پھر دیکھنے والوں کو محسوس ہوگا کہ یہ بھی کوئی نور کا مجسم ٹکڑا ہے، جو زمین پر اُتر آیا ہے۔"

"عیسیٰ! ہم تمہاری کاوشوں سے مطمئن ہیں۔" شاہ جہاں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے دل و دماغ پر کیسا بوجھ تھا۔ یہ عمارت ایک امانت ہے، جسے ہم اپنی زندگی میں ملکۂ عالیہ کو لوٹانا چاہتے ہیں۔ اگر اس کی تعمیر سے پہلے ہمیں موت آ گئی تو ہم حشر تک ممتاز محل سے شرمندہ رہیں گے۔"

"ظلِ الٰہی کی عمر دراز ہو۔" عیسیٰ شیرازی نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔ "اس عمارت کی بنیادوں کو ہم اپنا لہو پلائیں گے۔ جب تک یہ نمک خوار زندہ ہیں، اس وقت تک شاہِ والا کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"ہمیں اپنے جاں نثاروں سے یہی توقع ہے۔" شاہ جہاں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "عیسیٰ! تم اس عمارت کی تعمیر کو بھی ایک خوف ناک محاذِ جنگ سمجھو گے۔ یہ جنگ انسانی ہاتھوں اور پتھروں کے درمیان ہوگی۔ پتھر چاہیں گے کہ وہ پھسل کر بے قابو ہو جائیں مگر تم انہیں ان کے صحیح مقام پر چسپاں کرو گے۔ پھر یہی ترتیب روضے کے حُسن میں اضافہ کرے گی۔"

"شاہِ والا! یہ غلام اپنی ذمے داریوں سے بخوبی آگاہ ہے۔" عیسیٰ شیرازی نے نصف قد تک جھکتے ہوئے کہا۔ "اگر کہیں ہمارے ناکارہ ہاتھ بہک جائیں گے تو ظلِ الٰہی کی دُور بیں نظریں خامیوں کو تلاش کر کے انہیں درست فرما دیں گی۔"

شاہ جہاں، عیسیٰ شیرازی کے اس طرزِ کلام سے بہت خوش ہوا۔

اس کے بعد عیسیٰ شیرازی، فقیر اللہ خان، میر ہاشم اور دوسرے مصوروں کو گراں قدر انعامات سے نوازا گیا۔

پھر تاج محل کی تعمیر کا آغاز ہو گیا۔ استاد عیسیٰ شیرازی تمام معماروں کا سربراہ تھا اور مالی امور کی نگرانی مکرمت خان اور میر عبدالکریم کر رہے تھے۔ تاج محل کے اخراجات کے لئے آگرہ کے تیس دیہات وقف کر دیئے گئے تھے۔ ان دیہاتوں سے موصول ہونے والا مالیہ تقریباً ایک لاکھ روپے تھا۔ مکانوں اور سرایوں کے کرائے سے بھی دو لاکھ روپے کے قریب حاصل ہوتے تھے۔ اور یہ ساری رقم بھی تاج محل کے مصارف میں شامل کر دی گئی تھی۔

⊛.....⊛.....⊛

جب تاج محل کی تعمیر شروع ہوئی تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے بہترین معمار طلب کئے گئے۔ مگر عیسیٰ شیرازی نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ ہر اس شخص کو تاج محل کی تعمیر میں شامل کرنا چاہتا تھا جو اپنے فن میں یکتائے روزگار تھا۔ اس سلسلے میں عیسیٰ شیرازی نے ساری دنیا سے بہترین ہنرمندوں کو آگرہ آنے کی دعوت دی۔ اور جب ماہرین کا شمار کیا گیا تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔

کاریگروں کی اس فہرست میں استاد عیسیٰ کے شاگردِ خاص محمد شریف، امانت خان، ظفر نویس ساکن شیراز، محمد حنیف ساکن روم، اسماعیل خان گنبد ساز ساکن روم، عطن محمد سنگ تراش ساکن بخارا، شاکر محمد گل تراش ساکن بخارا، وہاب خان خوشنویس ساکن ایران، روشن خان خوش نویس ساکن شام، قادر زمان ساکن عرب، لاہور کے کلس ساز کاظم خان اور منوہر سنگھ، ملتان کے معمار ابوتراب، جھومر لال، جمنا داس، بھگوان داس، دہلی کے معمار محمد یوسف، محمد صدیق اور بلدیو داس شامل تھے۔ (اگر ان تمام کاریگروں کا ذکر کیا جائے تو ناموں کا ایک طویل دفتر تیار ہو جائے گا)

دریائے جمنا کے کنارے جنوب کی طرف اس مقبرے کی بنیاد رکھی گئی۔ (تاج محل کی بنیادیں اس قدر گہری ہیں کہ آج کا معمار ان کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تمام بنیادیں مضبوط پتھروں سے بھری ہوئی ہیں) سب سے پہلے 374 گز لمبا اور 140 گز چوڑا چبوترہ تعمیر کیا گیا۔ اس کی اونچائی سولہ گز تھی۔ روضے کا گنبد عمارت کے وسط میں ہے جو خالصتاً سنگِ مرمر سے بنایا گیا۔ نیچے کی طرف بائیس گز کا قطر ہے۔ گنبد کی چوٹی مخروطی ہے، جس میں سنگِ مرمر کی سلیں پیوند کی گئی ہیں۔ انتہائی بلندی پر گیارہ گز اونچا سونے کا کلس قائم ہے، جس کی سنہری رنگت سورج کی طرح جھلکتی ہے۔ سطح زمین سے کلس کی بلندی 107 گز ہے۔

بڑے گنبد کے نیچے عین وسط میں ملکہ ممتاز کی قبر ہے۔ قبر کے اوپر سنگِ مرمر کا چبوترہ ہے جس پر قبر کا تعویذ بنایا گیا ہے جس کے چاروں طرف ہشت پہلو جالی دار مجمر ہے۔ اس کا دروازہ

سنگِ یشم کا ہے جس میں ترکی کی طرز کے آہنی قلابے لگے ہوئے ہیں اور ان پر سنہری رنگ چڑھا دیا گیا ہے۔ روضے کے اندر چاروں محرابوں میں آئینے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک محراب میں آنے جانے کا راستہ ہے۔ مقبرے کے چاروں کونوں پر بیس گز اونچی سنگِ مرمر کی کرسی دی گئی ہے اور اس پر 52 گز اونچے سنگِ مرمر کے چار دل آویز مینار تعمیر کئے گئے ہیں۔

روضے سے مشرق کی طرف مہمان خانے کی عمارت ہے۔ اس کے چاروں کونوں میں سنگِ سرخ کی کرسی دے کر تین منزلہ برج تعمیر کئے گئے ہیں۔ ہر برج کے پہلو میں بارہ گز لمبے اور چھ گز چوڑے دالان ہیں جن کے دائیں بائیں ایک ایک حجرہ ہے۔ سنگِ سرخ کی کرسی کے کنارے پر 368 مربع گز ایک ہشت منظر باغ ہے۔ اس میں پھلوں کے درخت لگائے گئے ہیں۔ باغ کے وسط میں چالیس گز چوڑے چار خیابان ہیں جن کے درمیان سے چھ گز چوڑی نہر گزرتی ہے۔ دریائے جمنا کا پانی اس نہر میں داخل ہو جاتا ہے اور فواروں کے ذریعے اُچھل اُچھل کر موتی برساتا ہے۔ باغ کے بیچ میں 28 مربع گز چبوترہ ہے اور چبوترے کے وسط میں 16 گز مربع حوض ہے جس کے چاروں طرف فوارے بنے ہوئے ہیں۔ سنگِ سرخ کی روشنیوں میں بڑی نہر، کہکشاں کی طرح گزرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

دوسرے حصوں کی طرح تاج محل کا دروازہ بھی اپنی آرائش کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ اندر باہر سات چوکھنڈیاں ہیں، جن کے گنبد سنگِ مرمر سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ اس کے سامنے 80 گز لمبا اور 34 گز چوڑا چبوترہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ''جلو خانہ'' ہے جس کی لمبائی 204 گز اور چوڑائی 1150 گز ہے۔ جلو خانے میں 28 حجرے ہیں۔ حجروں کے آگے دالان ہے۔ جلو خانے کے سامنے ایک چوک ہے۔ اس میں سنگِ سرخ کے دالان ہیں۔ چوک کے چاروں جانب 160 مربع گز کی ایک ایک سرائے ہے۔ آگے بڑھ کر ڈیڑھ سو گز لمبا اور 100 گز چوڑا ایک اور چوک ہے، جس کے اندر چار بازار اور دو سرائیں ہیں۔ یہاں دنیا بھر کے نایاب تحائف اور بیش قیمت پارچہ جات کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ تاجروں نے اپنے طور پر جو مکانات اور سرائیں بنا لی ہیں، وہ الگ ہیں۔ مختصر یہ کہ یہاں ایک قصبے کی سی آبادی ہے، جس ''ممتاز آباد'' کہتے ہیں۔

اس ذیل میں معتبر روایات موجود ہیں کہ تاج محل بیس سال میں مکمل ہوا اور تقریباً بیس ہزار مزدوروں نے شب و روز اپنا پسینہ بہا کر اس یادگار عمارت کے نقوش کو زندگی بخشی۔

ہم نے قارئین کی آسانی کے لئے تمام تفصیلات ایک ہی مقام پر درج کر دی ہیں۔ مزید یہ کہ جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، اس کا تعلق شاہ جہاں کے زمانے سے ہے۔ گردشِ روز و شب کے باعث اب تاج محل کی فضاؤں میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔

محبت کی عظیم اور بے مثال یادگار قائم ہوتی رہی اور شاہ جہاں فارغ اوقات میں خود بھی تاج محل کے زیرِ تعمیر حصوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اس دوران لوگوں نے کبھی اسے ہنستے یا مسکراتے ہوئے

نہیں دیکھا۔ ایک گہری سنجیدگی اور اُداسی ہمیشہ اس کے چہرے پر چھائی رہتی تھی۔

ابھی تاج محل کی تعمیر اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی کہ شاہ جہاں کے ایک اور معتمد وزیر، سعد اللہ خان کا انتقال ہو گیا۔ سعد اللہ خان، شاہ جہاں کا وفادار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت ذہین اور مدبر انسان تھا۔ اس نے اکثر مشکل اوقات میں شاہ جہاں کو مفید مشورے دیئے جن کے باعث سلطنتِ مغلیہ کو مزید استحکام نصیب ہوا۔ مہابت خان کی موت کے بعد یہ دوسرا حادثہ تھا، جس کے اثرات شاہ جہاں نے اپنے دل پر محسوس کئے۔

شاہ جہاں اپنے لڑکوں میں سب سے زیادہ داراشکوہ کو چاہتا تھا۔ دارا نے اس محبت و شفقت سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھایا اور تینوں شہزادوں شجاع، مراد اور اورنگ زیب کے خلاف باپ کے کان بھرے۔ جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ داراشکوہ، شاہ جہاں کے قریب ہوتا چلا گیا اور باقی تینوں بیٹے باپ کی محبت سے محروم تو نہیں ہوئے مگر شجاع، مراد اور اورنگ زیب کے لئے شاہ جہاں کے دل میں پہلے جیسی گرم جوشی باقی نہیں رہی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شاہ جہاں کانوں کا کچا تھا اور کسی بات کی تصدیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا۔ دراصل اسے اپنے لڑکوں میں داراشکوہ سے بے پناہ محبت تھی۔ شاہ جہاں کا خیال تھا کہ اس کا محبوب بیٹا جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ دوسرے یہ کہ ممتاز محل بھی دارا کو بے حد چاہتی تھی۔ نتیجتاً داراشکوہ، شاہ جہاں کی محبت کا مرکز بن گیا۔

اس بے پروائی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ ممتاز محل کی موت نے شاہ جہاں کے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ دنیا اور اپنی زندگی سے بیزار نظر آنے لگا۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بقیہ سانسیں گزار رہا تھا۔ اسے حکومت کے کاموں سے زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ ذہنی پریشانی کے اس زمانے میں شاہ جہاں اپنے مشیروں پر بہت زیادہ تکیہ کرتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس کے تمام لائق مشیر ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہوتے جا رہے تھے۔

سعد اللہ خان کے انتقال کے چند سال بعد ہی شاہ جہاں کو ایک اور صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ 1641ء میں شاہ جہاں کے خسر، آصف خان کا بھی انتقال ہو گیا۔ شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں اسے ''یمین الدولہ'' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آصف خان کو پچاس لاکھ روپے سالانہ آمدنی کی جاگیر بھی دی گئی تھی۔ اس کے منصب کو بڑھا کر نو ہزار سوار کر دیا گیا تھا۔ آصف خان نے اپنے دور میں وزارتِ عظمیٰ کے عہدے تک ترقی پائی تھی۔ شاہ جہاں کے عہد میں آصف خان نے اتنی عزت حاصل کی تھی کہ اکثر اوقات اسے شہنشاہ کی نمائندگی اور اس کی طرف سے بات چیت کرنے کے اختیارات دے دیئے جاتے تھے۔ جواباً آصف خان نے بھی آخری سانس تک شاہ جہاں کے اعتماد کو بحال رکھا۔ انجام کار اس نے شدید علالت کی بنا پر امورِ مملکت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ شاہ جہاں نے آصف خان کی علالت کے دوران کئی بار

خود جا کر اُس کی عیادت کی۔

شاہ جہاں کے ساتھ آصف خان کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ اس نے مرنے سے پہلے اپنی تمام جاگیریں شہنشاہ کو پیش کر دیں۔ صرف لاہور میں آصف خان کی رہائش گاہ کی قیمت بیس لاکھ روپے تھی۔ اسی طرح دیگر کئی مقامات پر بھی اس نے عالیشان محل تعمیر کرائے تھے۔ آصف خان کی مالی حیثیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس ڈھائی کروڑ روپے کی مالیت کے زر و جواہر موجود تھے۔ آصف خان نے اپنے سارے اثاثے خوشی اور رغبت کے ساتھ شاہ جہاں کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''شاہِ والا! میں نے یہ سب کچھ سلطنتِ مغلیہ کے دور میں حاصل کیا تھا۔ میں شکر گزار ہوں کہ عزت مآب نے مجھے بے پناہ آسائشیں بخشیں۔ اب جبکہ میں دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں تو چار گز کپڑے کے سوا اپنے ساتھ کوئی چیز نہیں لے جاؤں گا۔ اس لئے اپنی تمام متاع بحق سرکار نذر کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس دولت کو حکومت کے فلاحی کاموں پر خرچ کر دیا جائے۔''

آصف خان کی باتیں سن کر شاہ جہاں اس قدر متاثر ہوا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''تم جلد صحت یاب ہو جاؤ گے آصف خان!'' شاہ جہاں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''نہیں شاہِ والا! میرا وقتِ رخصت قریب آ پہنچا ہے۔'' آصف خان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری سماعتیں بہت دیر سے فرشتۂ اجل کے قدموں کی چاپ سن رہی ہیں۔''

شاہ جہاں نے مزید تسلی آمیز کلمات کہے مگر آصف خان کو اپنی موت بہت قریب دکھائی دے رہی تھی۔ ''وقت بہت کم ہے شاہِ والا! مرنے سے پہلے میں اپنا اطمینان چاہتا ہوں۔''

''کیا اطمینان؟'' شاہ جہاں نے چونک کر کہا۔

''میں نے ہر مقام پر آپ کو سرخرو اور سربلند دیکھنا چاہا۔'' اب آصف خان کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ ''اگر کبھی آپ کو میرا رویہ مختلف نظر آیا ہو گا تو وہ یقیناً کوئی سیاسی مصلحت رہی ہو گی۔ ورنہ میں نے زندگی کی کسی آزمائش میں بھی آپ کی وفاداریوں کا سودا نہیں کیا۔''

شاہ جہاں کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں کچھ اور تیزی آ گئی تھی۔

''شاہِ والا! مجھے وفاداری کی سند دیجئے تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔'' آصف خان کی آنکھیں دُھندلی ہونے لگی تھیں۔ ''اب مجھے آپ کی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔''

شاہ جہاں گھبرا گیا۔

''تمہاری وفاداریاں تو مثالی حیثیت رکھتی ہیں آصف خان! بے شک تم نے اہلِ وفا کی طرح زیست بسر کی۔ میں تمہاری رفاقت پر ہمیشہ نازاں رہوں گا۔''

آصف خان نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی مگر اب اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''خدا کا..... شکر..... ہے۔'' آصف خان کی زبان سے الفاظ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

''سلطنتِ مغلیہ..... پائندہ باد.....'' ان کلمات کی گونج ختم ہوتے ہی آصف خان نے آخری ہچکی لی اور اُس کا جسم بے جان ہو گیا۔

آصف خان کی موت سے شاہ جہاں کے سینے پر ایک اور زخم تازہ ہو گیا۔

شاہ جہاں نے آصف خان کی چھوڑی ہوئی دولت میں سے بیس لاکھ روپے اس کے بیٹے کو دے دیئے اور باقی رقم حکومت کے خزانے میں داخل کر دی۔

آصف خان کے لئے لاہور میں جہانگیر کے مقبرے کے قریب ایک مقبرہ تعمیر کیا گیا اور اس کے بعد اس کے لڑکے کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب دے دیا گیا۔

آصف خان کی وفات کے چند سال بعد 1645ء میں نور جہاں بھی انتقال کر گئی جو ایک طویل عرصے سے لاہور میں گوشہ نشین تھی۔ اسے جہانگیر کے مقبرے سے ملحقہ ایک باغ میں دفن کیا گیا۔ مرنے سے پہلے نور جہاں نے وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر یہ شعر کندہ کرا دیا جائے۔

بر مزار ما غریباں نے چراغے، نے گلے
نے پر پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے!

(ہم غریبوں کے مزار پر نہ کوئی چراغ جلاتا ہے اور نہ کوئی پھول چڑھاتا ہے نہ یہاں کسی پروانے کے پَر جلتے ہیں اور نہ کسی بلبل کی صدا گونجتی ہے)

اگرچہ نور جہاں نے شاہ جہاں کی بہت دل آزاریاں کی تھیں لیکن جب اسے سابق ملکہ کے انتقال کی خبر ملی تو وہ خود نور جہاں کی قبر پر گیا اور فاتحہ خوانی کی۔ پھر جیسے ہی شاہ جہاں نے قبر پر لکھے ہوئے شعر کو پڑھا تو وہ اُداس ہو گیا۔ واقعتاً بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ کل تک جس کے ماتھے کی ایک شکن سے حکومت کا سارا نظام زیر و زبر ہو جاتا تھا، آج اس کے مرقد پر کوئی چراغ روشن کرنے والا بھی نہیں تھا۔ جب تک شاہ جہاں، لاہور میں مقیم رہا، اس وقت تک لوگوں نے شہنشاہ کی خوشنودی کے لئے چند روز تک نور جہاں کی قبر پر پھول بھی چڑھائے اور شمع بھی روشن کی۔ مگر شاہ جہاں کے واپس جاتے ہی چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا، جو نور جہاں کا مقدر تھا۔

⊛.....⊛.....⊛

نور جہاں کے انتقال سے ایک سال پہلے ایک اور الم ناک واقعہ پیش آیا تھا جس نے شاہ جہاں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔

26 مارچ 1644ء کی ایک رات کا ذکر ہے کہ شاہ جہاں کی سب سے بڑی اور چہیتی بیٹی، جہاں آراء اپنے باپ کی خدمت میں حاضر تھی۔ جب وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے اُٹھی تو اُس کے ریشمی لباس کا دامن شمع کے شعلے کی زد میں آ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جہاں آراء کے تمام کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔ اُس کی پشت، دونوں پہلو اور دونوں ہاتھ بری طرح جھلس گئے۔ اس وقت شاہ جہاں کی خدمت میں چار خواصیں بھی موجود تھیں۔ شہزادی کو اس آفتِ ناگہانی کا شکار

دیکھ کر چاروں خواصیں دیوانہ وار آگے بڑھیں اور جہاں آراء کے کپڑوں کی آگ بجھانے لگیں۔ مگر آگ اتنی تیز تھی کہ وہ خواصیں بھی جل کر بے ہوش ہو گئیں۔

پورے محل میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ جہاں آرا، باپ کے سامنے بے ہوش پڑی تھی اور شاہ جہاں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔

جہاں آراء شکل وصورت کے اعتبار سے ممتاز محل کی زندہ شبیہہ تھی۔ اس لئے شاہ جہاں، بیٹی کو ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھتا تھا۔ شاہ جہاں کو جہاں آراء سے جس قدر محبت تھی، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ جہاں آراء جوانی کی منزل کو پہنچ چکی تھی لیکن شاہ جہاں نے ابھی تک اس کی شادی نہیں کی تھی۔ شاہ جہاں کسی صورت میں بھی جہاں آراء کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے بعض مغل خاندانوں میں یہ خراب رسم بھی موجود تھی کہ کوئی لڑکی اپنے باپ کی موجودگی میں رخصت نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی وہ حالات تھے، جن کے باعث جہاں آراء کی شادی نہ ہو سکی اور اس نے اپنی پوری زندگی باپ کی خدمت میں گزار دی۔

جہاں آراء بے ہوش پڑی تھی اور شاہ جہاں کے دل پر قیامت گزر رہی تھی۔

''بیٹی! آنکھیں کھولو۔'' شاہ جہاں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہارے باپ سے تمہاری یہ حالت برداشت نہیں ہوتی۔''

''شاہِ والا! اطمینان رکھیں۔'' درباری طبیبوں نے بیک زبان کہا۔ ''شہزادی معظمہ کی جان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ یہ انتہائی سوزش کا اثر ہے، جس کی تاب نہ لاتے ہوئے شہزادی بے ہوش ہو گئی ہیں۔ مگر ان کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''تم لوگ نہیں جانتے کہ یہ سارے زخم ہمارے دل پر آئے ہیں۔'' شاہ جہاں شدتِ اضطراب میں بار بار اپنے سینے کو مسل رہا تھا۔ ''اس آگ کی تپش سے ہماری روح تک جل اُٹھی ہے۔''

''شاہِ والا! صبر سے کام لیں۔'' درباری طبیب اپنے شہنشاہ کو پُرزور الفاظ میں تسلی دے رہے تھے۔ ''یہ ایک عارضی حادثہ ہے، جس کے اثرات بہت جلد زائل ہو جائیں گے۔''

''جہاں آراء کا علاج کرو۔'' شاہ جہاں نے درباری طبیبوں سے متاثر ہو کر کہا۔ ''اگر تمہارے پاس اس سوزش کی کوئی دوا نہیں تو ہندوستان کے گوشے گوشے میں اعلان کرا دو کہ جس کے علاج سے شہزادی شفایاب ہوں گی، اس کے دامن کو انعاماتِ شاہی سے بھر دیا جائے گا۔''

اسی دوران ماہ رخ کو بھی شہزادی جہاں آراء کے جلنے کی خبر ملی۔ وہ دیوانہ وار تاج محل کی چار دیواری سے نکل کر قلعے میں داخل ہوئی۔ اور جب اس نے جہاں آراء کو بے ہوش دیکھا تو اپنی چیخ نہ روک سکی۔

''ماہ رخ! ہم پہلے ہی بہت غم زدہ ہیں۔ اگر تم اسی طرح چیختی رہیں تو ہم بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے۔'' شاہ جہاں نے انتہائی شکستہ لہجے میں کہا۔

ماہ رخ نے اپنی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ جہاں آراء کے پیروں کے قریب بیٹھ گئی اور

دردناک لہجے میں کہنے لگی۔

''اے خدائے ذوالجلال! اگر تیرے یہاں جان کا بدلہ جان ہے تو شہزادی معظمہ کو صحت بخش دے اور اپنی اس ناچیز بندی، ماہ رخ کو دنیا سے اُٹھا لے۔''

ماہ رخ کی یہ بے تابی دیکھ کر شاہ جہاں سنبھل گیا۔ جب ایک عورت اس کی بیٹی کے لئے جان دینے پر آمادہ تھی تو پھر وہ تو ایک مرد تھا۔ ماہ رخ کی اس بے لوث محبت نے شاہ جہاں کو ہوش وحواس میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

درباری طبیب بڑی جانفشانی کے ساتھ جہاں آراء کا علاج کر رہے تھے مگر ابھی تک کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ شہزادی ہوش میں آ چکی تھی لیکن زخموں کی سوزش سے بار بار چیختی تھی اور شاہ جہاں سے یہ چیخیں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔

شاہ جہاں نے فوری طور پر آگرہ اور اس کے گرد ونواح میں اعلان کرا دیا کہ تمام ہندو اور مسلمان اپنی اپنی مذہبی رسموں کے مطابق شہزادی معظمہ کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگیں۔ اس اعلان کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ آگرے کی ایک ایک مسجد اور ایک ایک مندر، دعاؤں کے شور سے گونج اُٹھا۔ دارالحکومت میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا، جہاں شہزادی کی صحت کے لئے دعائیں نہ مانگی جا رہی ہوں۔

شاہ جہاں نے پہلے دن خود اپنے ہاتھوں سے غریبوں اور محتاجوں میں ساٹھ ہزار روپے تقسیم کئے تھے۔ اور ہر شخص سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی بیٹی کی شفایابی کے لئے دعا کرے۔ اس کے بعد تین دن تک پانچ ہزار اشرفیاں ضرورت مندوں میں تقسیم کی گئیں۔ پھر یہ معمول بن گیا کہ روزانہ رات کو جہاں آراء کے سرہانے پانچ ہزار روپے رکھ دیئے جاتے اور پھر صبح ہوتے ہی وہ تمام رقم محتاجوں میں بانٹ دی جاتی۔

اس دوران کئی بار ایسا ہوا کہ شاہ جہاں نے خود اپنے ہاتھوں سے شہزادی کے جسم کے جھلسے ہوئے حصوں پر مرہم لگایا۔ مگر جہاں آراء کی تکلیف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

علاج کو تقریباً چار ماہ ہو چکے تھے لیکن جہاں آراء کے آبلوں سے ہر وقت ٹیسیں اُٹھتی رہتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی شہزادی کو مستقل بخار رہتا تھا۔ بڑی سنگین اور تشویش ناک صورتِ حال تھی۔

جہاں آراء کو بچاتے ہوئے جو چار خواصیں جل گئی تھیں، ان میں سے ایک سات دن بعد مر گئی اور دوسری بیس دن بعد دنیا سے رخصت ہو گئی۔ مرنے والی کنیزیں، جہاں آراء کے مقابلے میں بہت کم جلی تھیں۔ اس بات کا احساس کرتے ہی شاہ جہاں اپنی بیٹی کی طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔

جب شاہ جہاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے ان مجرموں کو بھی آزاد کر دیا جو بہت عرصے سے زنداں کے اندھیروں میں پڑے ہوئے تھے۔ بہت سے کارکن بھی جن کے ذمے مجموعی

طور پر سات لاکھ روپے تھے، قید سے آزاد ہوئے اور ان پر واجب الادا رقم معاف کر دی گئی۔

ہر قیدی کو رہا کرتے وقت شہنشاہ کا حکم سنایا گیا

"میں تم لوگوں کے جرم معاف کرتا ہوں۔ اس صلہ رحمی کے بدلے میں تم پر لازم ہے کہ شہزادی معظمہ کی صحت یابی کے لئے دعا کرو۔"

قیدیوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر دعائیں کیں مگر جہاں آراء کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ماہ رخ رات رات بھر جاگ کر جہاں آراء کی خدمت میں مصروف رہتی تھی۔

خود شاہ جہاں کا یہ حال تھا کہ وہ ہر وقت آبدیدہ رہتا اور مغرب سے تہجد تک مسلسل عبادت میں مصروف رہ کر اپنی لڑکی کی زندگی کے لئے دعا کرتا۔

شاہ جہاں نے ایک بار حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار پر بھی حاضری دی تھی اور جہاں آراء کی صحت کے لئے دعا مانگی تھی۔ واپسی پر شہنشاہ کچھ دیر کے لئے مبارک شاہ قلندر کی قبر پر بھی حاضر ہوا تھا اور اس نے بڑے دردناک لہجے میں دعا مانگی تھی۔

"اے اللہ!..... بے شک تُو پاک ہے اور میں ظالموں میں سے ہوں۔ اپنے گناہ گار بندے، شاہ جہاں کی خطاؤں سے درگزر فرما اور اس کی بیٹی جہاں آراء کو مبارک شاہ قلندر کی نیکیوں کے طفیل صحت بخش دے۔"

گیانی آتمارام ہر وقت مبارک شاہ قلندر کی قبر پر پڑا رہتا تھا۔ جب اس نے شہنشاہ کی گریہ وزاری دیکھی تو بے چین ہو کر بولا۔

"شہنشاہ! آپ فکر مند نہ ہوں۔ اللہ آپ کی ضرور سنے گا۔ شہزادیٔ عالیہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔"

"گیانی! تم بھی دعا کرو۔" شاہ جہاں نے آتمارام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا شہنشاہ اس وقت بہت غم زدہ ہے۔"

"شہنشاہ! ایک میں کیا، سارا آگرہ اپنے پیدا کرنے والے کے آگے دامن پھیلائے کھڑا ہے۔" آتمارام نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ اپنے منگتوں کی جھولیاں ضرور بھرے گا۔ اور اگر وہ نہیں بھرے گا تو کون بھرے گا؟ اس کے سوا دینے والا کون ہے؟ کوئی بھی نہیں..... کوئی بھی نہیں۔"

آتمارام کا لہجہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ حاضرین کی آنکھیں بھی چھلک اُٹھیں۔

اس کے بعد شہنشاہ نے کئی ہزار روپے کی تھیلی آتمارام کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"گیانی! اسے غریبوں میں تقسیم کر دو۔"

⊛.....⊛.....⊛

چار ماہ تک دربار کے تمام طبیبوں اور جراحوں نے اپنے اپنے نسخے آزمائے مگر جہاں آراء

کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

آخر ایک دن شاہ جہاں کے کسی مصاحب نے حکیم داؤد کا ذکر کیا جو اس وقت لاہور میں تھا اور نیا نیا شاہی ملازمت میں داخل ہوا تھا۔

شاہ جہاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ وہی حکیم طبیب تو نہیں جو کچھ دن پہلے ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچا ہے؟"

"جی ہاں! یہ وہی حکیم داؤد ہے جو شاہِ ایران کی بدسلوکیوں سے تنگ آ کر حضورِ والا کی پناہ میں آیا ہے۔" مصاحب نے شاہ جہاں کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"پھر اسے بھی آزمایا جائے۔" شاہ جہاں نے حکم دیا۔

اور اس کے ساتھ ہی کئی قاصد، برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر لاہور روانہ ہو گئے۔

حکیم داؤد، لاہور سے آگرہ پہنچا اور اس نے شہزادی جہاں آراء کے زخموں کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "مسیحائے حقیقی تو اللہ ہی کی ذات ہے۔ مگر اس کا یہ کم ترین بندہ، حکیم داؤد سمجھتا ہے کہ شہزادی معظمہ صحت یاب ہو جائیں گی۔"

"یہ دعوے تو اور طبیبوں نے بھی کئے تھے۔" شاہ جہاں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"شاہِ والا! میں نے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔" حکیم داؤد بڑی عاجزی کے ساتھ بول رہا تھا۔ "میں تو صرف دوائیں تجویز کروں گا۔ ان میں اثر پیدا کرنا اللہ کا کام ہے۔"

"ہمیں شہزادی کی بیماری نے بہت تھکا دیا ہے حکیم داؤد!" شاہ جہاں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "تم علاج شروع کرو۔ بے شک! معالجِ حقیقی تو اللہ ہی کی ذات ہے۔"

حکیم داؤد نے تقریباً تین ماہ تک مسلسل علاج کیا۔ جس کے نتیجے میں جہاں آراء کا بخار اُتر گیا اور زخموں کی سوزش بھی بہت کم ہو گئی۔

آٹھ ماہ کے شدید اضطراب کے بعد شاہ جہاں اور شاہی خاندان کے دیگر افراد نے سکون کی پہلی سانس لی تھی اور درباری امراء نے پہلی بار شہنشاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

مگر ابھی تک جہاں آراء کے زخم نہیں بھرے تھے۔ حکیم داؤد نے کئی مرہم تبدیل کئے لیکن ایک بھی کارگر ثابت نہیں ہوا۔ بالآخر ایک دن اس نے اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"شاہِ والا! شاید میرے مقدر میں بس اتنی ہی سرخروئی لکھی گئی تھی۔ میں خود حیران ہوں کہ شہزادیٔ عالیہ کے زخم مندمل کیوں نہیں ہوتے۔"

شاہ جہاں نے حکیم داؤد کا حوصلہ بڑھایا اور وہ اپنے تیار کردہ نئے مرہم آزماتا رہا۔

اسی دوران ایک گم نام شخص، عارف نے قلعہ کے پہرے داروں سے کہا۔

"مجھے شہنشاہ کے پاس لے چلو۔ میں شہزادی جہاں آراء کا علاج کروں گا۔"

یہ عارف نامی شخص کسی دُور دراز گاؤں کا رہنے والا تھا، جو اعلانِ شاہی سن کر آگرہ پہنچا تھا۔

شاہ جہاں نے فوری طور پر اسے اپنی خدمت میں طلب کر لیا۔ عارف کے بتائے ہوئے

مرہم نے پہلے دن ہی اپنا اثر دکھایا اور جہاں آراء بہت زیادہ سکون محسوس کرنے لگی۔

پھر ایک ماہ بعد شہزادی کے تمام زخم بھر گئے۔

شاہ جہاں نے جہاں آراء کا جشنِ صحت اس قدر اہتمام سے منایا کہ اس کے آگے دیگر شاہی تقریبات ماند پڑ گئیں۔ آٹھ دن تک دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ غریبوں اور محتاجوں میں لاکھوں روپے تقسیم کئے گئے۔ حکیم داؤد کو پندرہ ہزار روپے کے علاوہ خلعتِ شاہی بخشی گئی اور ڈیڑھ ہزاری ذات، دوسو سوار کا منصب بھی عطا کیا گیا۔

اس گم نام شخص عارف کو چاندی میں تولا گیا۔ اس کے علاوہ اسے مزید انعامات سے بھی نوازا گیا۔

⊛.....⊛.....⊛

شہزادہ اورنگ زیب بھی بڑی بہن کی عیادت کے لئے دکن سے آگرہ آ گیا تھا مگر تین ہفتے بعد ہی اسے اس کے عہدے اور جاگیر سے محروم کر دیا گیا۔ شہزادہ داراشکوہ مسلسل اپنے چھوٹے بھائی کے خلاف باپ کے کان بھر رہا تھا۔ شاہ جہاں نے دارا کی باتوں کا یہاں تک تاثر قبول کیا کہ اورنگ زیب سے بات بھی کرنا گوارا نہیں کرتا تھا۔

شہزادہ اورنگ زیب نے بہت کوشش کی کہ وہ باپ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرے مگر شاہ جہاں نے بیٹے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

"حضورِ والا مجھے میرا قصور تو بتائیں۔" اورنگ زیب نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم اس عہدے کے لائق نہیں ہو۔" شاہ جہاں نے نہایت تلخ لہجے میں کہا۔ اس کا اشارہ دکن کی گورنری کی طرف تھا۔

دکن کی فتوحات کے بعد اورنگ زیب کو صرف اٹھارہ سال کی عمر میں اس علاقے کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ دولت آباد، محمد نگر اور دوسرے اضلاع کو ملا کر صوبہ دکن کا نام دیا گیا تھا۔

"یہ تو کوئی معقول وجہ نہیں ہوئی، شاہِ والا!" اورنگ زیب نے ادب و احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہائی جرأت کے ساتھ کہا۔

"یہ ہماری کم نظری تھی اورنگ زیب! کہ ہم نے تم پر اعتبار کیا۔" شاہ جہاں کے لہجے سے بدستور تلخی جھلک رہی تھی۔ "ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم ہمیں اس قدر مایوس کرو گے۔" شاہ جہاں نے اورنگ زیب کی برطرفی کے سلسلے میں کوئی منطقی وجہ بیان نہیں کی تھی۔ بس وہ مسلسل اپنے غصے اور ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنی گورنری کے عہد میں ایک درویش منش شخص کو قتل کرا دیا تھا۔ اس بات سے مشتعل ہو کر شاہ جہاں نے اورنگ زیب کو برطرف کر دیا۔ (تاریخی اعتبار سے یہ روایت درست نہیں۔ اورنگ زیب اوائل عمر ہی سے درویشوں اور صوفیوں کا احترام

کرتا تھا۔ اسے صرف زمانہ ساز صوفیوں سے نفرت تھی مگر اس قدر بھی نہیں کہ وہ انہیں کسی جرم کے بغیر قتل کرا دے)

دراصل یہ سارا ہنگامہ داراشکوہ نے برپا کیا تھا۔ اس نے ہمیشہ باپ کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور مخالفوں کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔ اورنگ زیب نوعمری کے باوجود ایک اعلیٰ منتظم تھا۔ اس کے برعکس داراشکوہ، عیش و عشرت میں مبتلا رہنے والا ایک کم نظر شہزادہ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اورنگ زیب روز بروز مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے تو وہ چھوٹے بھائی کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھنے لگا۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ شاہ جہاں کے تمام بیٹوں میں اورنگ زیب سب سے زیادہ مدبر، جفاکش اور بہادر تھا۔ حکمرانی کے لئے جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب اس کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔

داراشکوہ یہ سب دیکھ کر آتشِ حسد سے جل اٹھا۔ اور پھر اس نے اورنگ زیب کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ وہ شاہ جہاں کے سامنے اورنگ زیب کو ایک سرکش، ظالم اور نافرمان بیٹے کی حیثیت سے پیش کرتا۔

"اگر وقت سے پہلے اورنگ زیب کی گرفت نہ کی گئی تو وہ شاہِ والا کی تمام محنتوں پر پانی پھیر دے گا۔ اور عظیم مغل سلطنت خس و خاشاک کی مانند بکھر جائے گی۔"

شاہ جہاں پہلے ہی ممتاز محل کی موت کے سبب اپنی ذہنی صلاحیتیں کھو چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے بیٹوں میں سب سے زیادہ داراشکوہ کو چاہتا تھا۔ اور پھر یہی اندھی محبت، عقل پر غالب آ گئی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ نے کسی تحقیق کے بغیر اورنگ زیب کو برطرف کر دیا اور اس کی تمام جاگیریں ضبط کر لیں۔ (اس سلسلے میں ایک تاریخی روایت یہ بھی موجود ہے کہ جب شاہ جہاں نے اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ غیر مشفقانہ سلوک روا رکھا تو اورنگ زیب نے دل برداشتہ ہو کر خود ہی دکن کی گورنری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

اس وقت تک جہاں آراء مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی۔ جب اس نے یہ صورتِ حال دیکھی تو ایک دن چھوٹے بھائی کو تنہائی میں طلب کیا۔ اورنگ زیب اس طرح جہاں آراء کا احترام کرتا تھا جیسے وہ بڑی بہن کے بجائے اس کی ماں ہو۔

"اورنگ زیب یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا شاہ بابا درست کہتے ہیں؟" جہاں آراء نے شہزادے سے دریافت کیا۔

"میں شاہ بابا کے بارے میں کیا کہوں ہمشیرہ محترم!" اورنگ زیب کے لہجے سے گہرے رنج کا اظہار ہو رہا تھا۔ "وہ تو ہر معاملے کو دارا کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ انہیں اس کی صورت کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ دن کو رات کہتا ہے اور شاہِ والا اپنی زبان سے اُس کے جھوٹ کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ میں حادثات کے طوفان سے گزرا اور میں نے موت کی آندھیوں میں بھی اپنا سفر جاری رکھا۔ مگر شاہ بابا نے میری خدمات کا کیا صلہ دیا؟ چند بے جا تہمتیں..... اور چند بے

بنیادالزام..... کیا یہی میرا مقدر ہے؟"

"میرے بہادر بھائی! حوصلہ رکھو۔ میں شاہ بابا سے بات کروں گی۔" جہاں آرا نے اورنگ زیب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کیا اب میری زندگی دوسروں کی سفارشات کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے؟" اورنگ زیب کے لہجے میں تلخی بھی شامل تھی اور شدید مایوسی بھی۔ "کل تک میں سمجھتا تھا کہ میرا منصب ذاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ مگر آج محسوس ہو رہا ہے کہ میں ایک ناکارہ مہرہ ہوں، جو دوسروں کی مرضی کے مطابق حرکت کر رہا ہے۔ ورنہ اس کی اپنی طاقت کچھ بھی نہیں۔ نہیں ہمشیرہ معظمہ! میں وہ عہدہ پسند نہیں کرتا جو بھیک میں دیا گیا ہو۔" اورنگ زیب کی غیرت بیدار ہو چکی تھی۔

"اب میں اپنی کم نصیبی کا کیا ماتم کروں کہ ماں کی محبت سے بھی محروم رہا..... اور باپ کی شفقت سے بھی..... شاہ بابا سے کہو کہ وہ اپنے سارے الطاف واکرام دارا پر نچھاور کر دیں کہ اس کے سوا اس دنیا میں کوئی انسان ہی نہیں ہے۔"

جہاں آراء بڑی ہوشیاری سے اپنے چھوٹے بھائی کے جلتے ہوئے جذبات کو اعتدال پر لائی۔

"اورنگ زیب! تم واقعتاً ایک لائق منتظم ہو۔ مگر اپنے بابا کی مجبوریوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ مادرِ مہربان کی وفات کے بعد وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں۔ غور سے دیکھو کہ سارے خوشامدی ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ تمہیں بڑی احتیاط اور دانش مندی کے ساتھ اس حصار کو توڑنا ہوگا۔ کبھی کبھی حالات کی ہوائیں اس قدر غبار اُڑاتی ہیں کہ ان میں انسان کی منزل گم ہو جاتی ہے۔ تمہیں اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا، جب یہ غبار چھٹ جائے اور مطلع صاف نظر آنے لگے۔"

بڑی بہن کے ہمدردانہ کلمات سے اورنگ زیب کا اشتعال ختم ہو گیا۔

پھر جہاں آراء نے باپ سے گفتگو کی۔ آخر کئی ماہ بعد شاہ جہاں، اورنگ زیب کا عہدہ بحال کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر اس بار اسے دکن کے بجائے گجرات کی گورنری بخشی گئی تھی۔ اورنگ زیب، عہدے کی اس بحالی کو اپنی توہین سمجھ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ شاہ جہاں اسے دوبارہ دکن کا حاکم مقرر کر دے۔ پھر جب احکامِ شاہی جاری ہوئے تو اورنگ زیب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"اس مرتبہ بھی دارا کو فتح حاصل ہوئی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔" اورنگ زیب نے جہاں آراء سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ "ارضِ دکن میں باغی طاقتوں کی سرکوبی میں نے کی..... آفات ومصائب سے میں گزرا مگر اعزاز کسی اور کو نصیب ہوا..... یہ کھلی شکست ہے ہمشیرۂ معظمہ! گجرات کی گورنری قبول کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ میں اپنی ساری زندگی کسی گوشۂ گم نامی میں گزار دوں۔"

جہاں آراء، اورنگ زیب کی فطرت سے واقف تھی کہ ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد وہ اپنی

رائے تبدیل نہیں کرتا تھا۔

"اگر تم ایک گوشے میں خاموش بیٹھ گئے تو کیا ہندوستان کی سیاست بدل جائے گی؟" جہاں آراء نے انتہائی شفقت آمیز لہجے میں بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "شاہ بابا کے گرد خوشامدیوں کا دائرہ اور تنگ ہو جائے گا۔"

"اگر یہ شاہ بابا کا اپنا حکم ہوتا تو میں عزت مآب کے ایک حکم پر سینکڑوں ریاستوں کا اقتدار قربان کر دیتا۔" اورنگ زیب بہت پُرجوش لہجے میں بول رہا تھا۔ "مگر میں جانتا ہوں کہ ظلِ الٰہی، دارا کی زبان سے بول رہے ہیں۔"

"میں چاہتی ہوں کہ تم گجرات کی گورنری قبول کر لو..... اس طرح یکایک اقتدار سے علیحدگی بھی کوئی اچھا سیاسی عمل نہیں۔ اب شاہ بابا کو کون مشورہ دے؟..... مہابت خان انتقال کر گیا..... سعد اللہ خان دنیا سے رخصت ہو گئے..... سلطنتِ مغلیہ کے یہ وہ جاں نثار تھے جو شاہ بابا کو مشورہ دے سکتے تھے۔ مگر اب ان سے کون کہے کہ بعض سیاسی فیصلے ہندوستان کی تاریخ پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔"

بہن کے سمجھانے پر اورنگ زیب نے گجرات کی گورنری قبول کر لی۔ پھر دو سال بعد 1647ء میں اسے گجرات سے ہٹا کر بلخ اور بدخشاں کا گورنر بنا دیا گیا۔

داراشکوہ اپنی ان فتوحات پر بہت خوش تھا۔ اس کے خیال میں اورنگ زیب کو بساطِ سیاست کا ایک ناکارہ مہرہ بنا دیا گیا تھا۔

۞.....۞.....۞

تاج محل کی تعمیر تیزی سے جاری تھی۔ اس بے مثال عمارت کے نقش ونگار روز بروز نکھرتے جا رہے تھے۔ سورج کی تیز روشنی میں ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے زمین پر کوئی بہت بڑا ہیرا جگمگا رہا ہو..... اور جب چاند طلوع ہوتا تو منظر یکسر بدل جاتا۔ سورج کی روشنی تاج محل کے پتھروں سے منعکس ہو کر انسانی آنکھ کو خیرہ کرتی تھی..... مگر چاند کی روشنی میں یوں نظر آتا کہ چاروں طرف نور کی بارش ہو رہی ہے۔ ایک چاند آسمان پر ہے اور ایک زمین پر..... تاج محل کی سیڑھیوں سے ٹکرانے والا دریائے جمنا کا پانی ایک اور جانفزا منظر پیش کرتا۔ ہوا کے دوش پر لہرانے والے پانی کی موجیں اس طرح دکھائی دیتیں جیسے بہت سے محبت کرنے والے دل آپس میں مل رہے ہوں۔

شاہ جہاں، عیسیٰ شیرازی کے کام سے مطمئن تھا۔ ایک دن اُس نے چاندنی رات میں تاج محل کی سیر کرتے ہوئے کہا۔

"عیسیٰ شیرازی! ہمیں یقین ہے کہ تم ہمارے خواب کو زندہ تعبیر بخش دو گے۔"

"شاہِ والا! ابھی یہ روضہ نامکمل ہے۔" عیسیٰ شیرازی نے نصف قد تک جھکتے ہوئے کہا۔

"جب عمارت تکمیل کے مراحل سے گزر جائے گی تو شاید شہنشاہ کا خواب زندہ ہو جائے۔ اور اگر آپ کے خدمت گار عاجز رہ جائیں تو یہ خیال کر کے معاف فرما دیجئے گا کہ آقا کے خواب اور غلاموں کی سوچ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

شاہ جہاں نے تحسین آمیز نظروں سے عیسیٰ شیرازی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری جاں سوزیاں قابلِ قدر ہیں۔ جب کہیں بے کیفی کا شکار ہونے لگو تو یہ سمجھ کر کام کا آغاز کرو کہ تم سے تمہاری کوئی محبوب، ہستی بچھڑ گئی ہے۔ اپنی روح کا سوز، اپنے دل کا گداز اور اپنی آنکھوں کی تمام روشنی تاج محل میں بھر دو۔ پھر تم یقیناً اپنے شہنشاہ کے خواب کو چھو لو گے۔"

عیسیٰ شیرازی نے گردن جھکا دی۔

شاہ جہاں ٹہلتے ٹہلتے ممتاز محل کی قبر تک آ گیا اور پھر یکایک اُس کی حالت غیر ہو گئی۔ عیسیٰ شیرازی نے دیکھا کہ شہنشاہ کا اُداس چہرہ کچھ اور بجھ کر رہ گیا ہے۔ آنسوؤں کا وہ سیلاب جو زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تھم گیا تھا، اچانک دوبارہ جاری ہو گیا۔ شاہ جہاں، ممتاز کی قبر پر کھڑا بہت دیر تک روتا رہا۔

عیسیٰ شیرازی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے شہنشاہ کو تسلی دے۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ شاہ جہاں کے سامنے لب کشائی کر سکے۔ مجبوراً شہنشاہ کی اشک ریزی دیکھتا رہا۔

پھر جب شاہ جہاں کے دل کا غبار دُھل گیا تو اس نے ممتاز محل کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم یہاں، ملکہ عالیہ کے قریب دفن ہوں گے۔"

"خدا، شاہِ والا کی عمر دراز کرے۔" عیسیٰ شیرازی نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں عیسیٰ! موت کوئی کلمۂ بد نہیں ہے۔" شاہ جہاں کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ "ہر انسان کو ایک دن اس دنیا سے گزر جانا ہے۔ کل ہم بھی یہاں سے چپ چاپ گزر جائیں گے۔ مگر ہم اپنے تمام امراء کو وصیت کر چکے ہیں کہ جب ہمارا جسم بے جان ہو جائے تو ہمیں ملکہ عالیہ کے پہلو میں دفن کر دیا جائے۔"

عیسیٰ شیرازی نے سر جھکا دیا۔ وہ اپنے شہنشاہ کی موت پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا تھا۔

"عیسیٰ! جب ہم دنیا سے گزر جائیں اور ہمارا فانی جسم زیر زمین اُتار دیا جائے تو اس حوالے سے بھی تم اس عمارت کو یادگار بنا دینا۔" شاہ جہاں نے تاج محل کے معمار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جب تک شہنشاہ کے نمک خوار زندہ ہیں، وہ اس عمارت کے نقش و نگار کو نکھارتے رہیں گے۔" عیسیٰ شیرازی نے دست بستہ عرض کیا۔ "شاہ کا کوئی غلام اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا، جب تک کہ یہ عمارت عجوبۂ روزگار نہ بن جائے۔"

"ہاں عیسیٰ! ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ یہ عمارت اپنے حُسن کے ساتھ ساتھ فنِ تعمیر میں بھی

منفرد قرار پائے۔" شاہ جہاں نے انتہائی پُر جوش لہجے میں کہا۔ "ہمارے بعد جب صدیوں کے قافلے ادھر سے گزریں تو دیکھنے والے بے ساختہ پکار اُٹھیں کہ واقعتاً یہ محلوں کا تاج ہے۔"

"شاہ ذی وقار! ایسا ہی ہو گا۔" عیسیٰ شیرازی نے سرِ اطاعت خم کرتے ہوئے کہا۔

"عیسیٰ! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ممتاز سے شرمندہ رہیں اور دنیا والے پکار کر کہیں کہ شاہ جہاں کی محبت جھوٹی تھی۔" شہنشاہ ایک بار پھر جذباتی ہو گیا تھا۔

۞.....۞.....۞

1647ء کے موسم بہار میں شاہ جہاں نے اورنگ زیب کو گجرات سے طلب کیا اور بلخ کا گورنر مقرر کر دیا۔ اورنگ زیب کو راستے میں جگہ جگہ قبائلیوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

اس دوران ازبک سردار نذر محمد کے لڑکے عبدالعزیز نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کثیر فوج جمع کر لی تھی۔ پھر جیسے ہی اورنگ زیب بلخ پہنچا، عبدالعزیز نے مغل فوجوں پر حملہ کر دیا۔ اورنگ زیب نے بڑی بے نیازی کے ساتھ ازبکوں کے لشکر کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ دشمن کی فوجیں منتشر ہو گئیں۔ اورنگ زیب نے اتنی شدید جنگ کے دوران بھی نماز قضا نہیں ہونے دی۔ اس نے گھوڑے کی پشت سے اُتر کر مغرب کی نماز اس وقت ادا کی، جب خونریز جنگ جاری تھی۔ بالآخر عبدالعزیز کی فوجوں کو شکست ہوئی اور اورنگ زیب نے میدانِ جنگ ہی میں نمازِ شکرانہ ادا کی۔

ایران کے نئے حکمران شاہ عباس ثانی نے 1642ء میں تخت نشین ہوتے ہی قندھار پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے فوج اور رقم کی فراہمی شروع کر دی تھی۔ ایران کے لئے یہ علاقہ تجارتی اور فوجی اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ جب شاہ جہاں کو شاہ عباس کے ارادوں کا علم ہوا تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کو مغل لشکروں کا سالار بنا کر قندھار کی طرف روانہ کیا۔ شاہ جہاں کو پورا یقین تھا کہ اورنگ زیب اپنی انتظامی صلاحیتوں کے سبب اس مہم میں کامیاب و سرخرو رہے گا۔ مگر ایک ازبکی سردار، شاوی ازبک کی غداری کے سبب قندھار مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

شاوی ازبک گرچہ شاہ جہاں کا ملازم تھا لیکن در پردہ وہ شاہِ ایران سے خفیہ خط و کتابت کر رہا تھا۔ شاہ عباس ثانی نے شاوی ازبک کو بھاری انعام کا لالچ دیا تھا۔ انجام کار چند روپہلی اور طلائی سکوں کی خاطر شاوی ازبک نے اپنا ضمیر فروخت کر دیا۔ اورنگ زیب کی فوجیں تیز رفتاری سے قندھار کی جانب بڑھ رہی تھیں لیکن سازش مکمل ہو چکی تھی۔ شاوی ازبک نے قلعے کا وہ دروازہ کھول دیا، جس کی نگرانی پر اسے مقرر کیا گیا تھا۔

اس غدارانہ حرکت کے بعد مغل توپ خانے کا حوصلہ بھی جواب دے گیا تھا۔ شاوی ازبک چیخ چیخ کر اپنے ساتھی افسروں کو سمجھا رہا تھا۔

"اب مقابلہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ شدید برف باری کے باعث تازہ کمک نہیں پہنچ سکتی۔ اس مجبوری کی حالت میں جنگ کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ اگر اپنی اور اہلِ خاندان کی زندگی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک دو۔"

شاوی ازبک کے ساتھ کچھ مغل سردار بھی سازش میں شریک ہو گئے تھے۔ دراصل انہیں اپنی زندگی عزیز تھی۔ اس لئے جان بچانے کی غرض سے وہ بھی غداروں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ ایک مغل سردار کیچک خان آفریدی آخری دم تک مقابلہ کرنا چاہتا تھا مگر اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا۔

"اگر تم نے شاہِ ایران کا مقابلہ جاری رکھا تو تمہارے بیوی بچے قتل کر دیئے جائیں گے۔"

یہ سن کر کیچک خان اپنے مورچے سے ہٹ گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"شہنشاہ! مجھے معاف کرنا۔ میں ہارہ گیا ہوں۔ یہاں میرا کوئی ہم نوا نہیں ہے۔"

شاوی ازبک نے دوسرے مغل سپاہیوں کو بھی ورغلانا شروع کر دیا۔

"شہنشاہ کو ہماری جانوں کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ہم اس حالت میں مارے جا رہے ہیں کہ ہمارا کوئی یار و مددگار نہیں ہے۔"

"شہنشاہ ہمارے حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتے۔ یقیناً چند دنوں میں تازہ کمک پہنچنے ہی والی ہو گی۔" مغل سپاہیوں نے شاوی ازبک کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

شاوی ازبک نے فوراً ہی دوسری چال چلی۔

"اگر شہنشاہ ہماری مدد کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ شدید برف باری نے تمام راہیں مسدود کر دی ہیں۔ تازہ دم فوج آئے گی بھی تو کدھر سے؟" شاوی ازبک بڑی ہمت شکن باتیں کر رہا تھا۔

آخر اپنے بیوی بچوں کی جانیں بچانے کے لئے ان سپاہیوں نے بھی ہتھیار پھینک دیئے جو آخری سانس تک شاہ جہاں کے وفادار رہنا چاہتے تھے۔

شاوی ازبک کی غداری رنگ لائی اور اس نے ایک جیتی ہوئی جنگ کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اگر قندھار کا گورنر، دولت خان سازشیوں کی باتوں میں نہ آتا تو یقیناً مغل فتح سے ہمکنار ہوتے۔ ایرانیوں کے پاس سامانِ خورونوش ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ مزید محاصرہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ بس چند دنوں کی بات تھی۔ مجبور ہو کر قزلباشوں کو محاصرہ اٹھانا پڑتا اور قندھار کے قلعے پر مغلوں کا پرچم بدستور لہراتا رہتا۔ دولت خان کی غلطی یہ تھی کہ وہ صرف ان ہی لوگوں سے مشورہ کرتا رہا جو درپردہ ایرانیوں کے ساتھ سازشوں میں مصروف تھے۔

باخبر لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی شکست کی ذمہ داری شاہ جہاں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ داراشکوہ اور دوسرے خوشامدی درباریوں کی باتوں میں آ کر اس نے قندھار کی مہم کو موسمِ سرما کے

ختم ہونے تک ملتوی کر دیا تھا۔ اگر شاہ جہاں کے مشیر اُسے برف باری سے خائف نہ کرتے تو شہزادہ اورنگ زیب، تازہ دم فوج لے کر بروقت قندھار پہنچ جاتا اور اس طرح یہ مضبوط قلعہ ایرانیوں کے تسلط سے محفوظ رہتا۔

اورنگ زیب ابھی راستے میں تھا کہ اس نے قندھار کے قلعے پر ایرانی قبضے کی ناگوار خبر سنی۔ اگرچہ اورنگ زیب، آہنی اعصاب رکھنے والا ایک نوجوان تھا لیکن سپاہیوں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں گہری اُداسیوں کی جھلک دیکھی تھی۔ اورنگ زیب کے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھی اور دوسرا ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا۔ وہ بار بار ایک ہی جملے کی تکرار کر رہا تھا۔

"افسوس! صد افسوس! میں بہت دیر سے پہنچا۔ کاش! شاہِ والا نے مجھے کچھ دن پہلے روانگی کی اجازت دے دی ہوتی۔"

داراشکوہ اور اُس کے نااہل مصاحبوں نے اورنگ زیب کی ناکامی کی خبر سن کر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ قندھار کے قلعے پر قبضے سے پہلے اورنگ زیب کو نصرت و کامرانی کی ایک زندہ علامت سمجھا جاتا تھا۔ شاہ جہاں سے لے کر ایک عام سپاہی تک کا یہ خیال تھا کہ جس لشکر کی سالاری اورنگ زیب کرتا ہے، اسے شکست نہیں ہوتی۔ مگر جب قندھار پر ایرانی سپاہی قابض ہو گئے تو دارا نے صاف صاف کہنا شروع کر دیا۔

"اورنگ زیب ناکارہ ہے..... شاہِ والا کے بے جا اعتبار کے سبب آج مغلوں کو یہ برے دن دیکھنا پڑے۔"

۞.....۞.....۞

قندھار کے ہاتھ سے نکل جانے کی خلش شاہ جہاں اور اورنگ زیب دونوں کے دل میں موجود تھی۔ آخر اسی خلش نے دوبارہ شاہ جہاں کو قندھار کا محاصرہ کرنے پر اُکسایا۔

اس مہم میں اورنگ زیب کے ساتھ ساٹھ ہزار گھڑ سوار اور دس ہزار پیدل سپاہی تھے۔ شاہ جہاں نے اس مہم پر پانی کی طرح پیسہ بہایا تھا اور فوج کو بہت زیادہ مراعات بخشی تھیں۔ ایک عام اندازے کے مطابق قندھار کی جنگی مہم کے لئے شاہ جہاں نے دو کروڑ روپے مخصوص کر دیئے تھے۔ وہ اکثر اپنے درباری امراء سے کہا کرتا تھا۔

"یہ مغلوں کے وقار کا مسئلہ ہے۔ ہم قندھار کی فتح حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی قیمت ادا کر سکتے ہیں۔"

اس سلسلے میں شاہ جہاں اس قدر جذباتی نظر آ رہا تھا کہ اورنگ زیب کے روانہ ہوتے ہی وہ خود بھی پچاس ہزار سپاہی لے کر کابل روانہ ہو گیا۔ شاہ جہاں کی منصوبہ بندی تھی کہ اگر اورنگ زیب کو کمک کی ضرورت محسوس ہو تو وہ فوری طور پر تازہ دم فوج قندھار کے محاذ پر بھیج سکے۔ اس جنگ کے لئے خاص طور پر 56 توپیں بھی تیار کی گئی تھیں۔

بالآخر مئی 1652ء کو اورنگ زیب کی زیر قیادت فوج نے قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ ایرانیوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے مغلوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ ایرانیوں کا توپ خانہ مغلوں کے توپ خانے کے مقابلے میں نہ صرف معیاری تھا بلکہ ایرانی توپچی بھی مغل توپچیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور تجربہ کار تھے۔ مغلوں نے قلعے کی دیواروں میں شگاف ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ایرانی توپیں رات دن مغلوں پر آگ برساتی رہیں۔ اس دوران دونوں طرف سے ہزاروں انسان موت کی خوراک بن گئے تھے یا پھر شدید زخمی ہو کر عارضی طور پر جنگ کے قابل نہیں رہے تھے۔

یہ محاصرہ تقریباً 70 دن تک جاری رہا۔ آخر کسی قسم کی کامیابی کی کوئی علامت نہ پا کر شاہ جہاں نے محاصرہ اُٹھانے کا حکم جاری کر دیا۔ اورنگ زیب، شہنشاہ کے حکم کی مخالفت تو نہ کر سکا مگر ابھی وہ کچھ دن اور محاصرہ جاری رکھنا چاہتا تھا۔ فوج کے دوسرے سپہ سالار، اورنگ زیب کی رائے سے متفق نہیں تھے۔ آخر اورنگ زیب جھکے ہوئے سر کے ساتھ بارگاہِ شاہی میں داخل ہوا۔

"شاہِ والا! اگر ہم کچھ عرصے کے لئے مزید صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے تو یقیناً کامیابی کے آثار روشن ہو جاتے۔"

"اورنگ زیب! تم اپنا اعتبار کھو چکے ہو۔" شاہ جہاں نے انتہائی برہم لہجے میں کہا۔ "تم نے دوسری بار مجھے شدید مایوسی میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"میں کوشش کروں گا کہ شاہِ والا کا اعتبار بحال ہو سکے۔" اورنگ زیب نے بصد احترام عرض کیا۔

"اگر میں سمجھتا کہ تم قندھار فتح کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو تو پھر میں تمہاری فوج کو واپس بلانے کا حکم کیوں صادر کرتا؟" شاہ جہاں کے لہجے سے اورنگ زیب کے لئے تحقیر کا رنگ نمایاں تھا۔ "آج یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ ہر شخص دنیا کا ہر کام نہیں کر سکتا۔ اور کسی دانش مند کا یہ قول بھی اپنی جگہ درست ہے کہ تجربہ کار انسان کے لئے ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"شاہِ والا! مجھے ایک اور موقع عنایت کیجئے۔" اورنگ زیب نے التجا کے انداز میں کہا۔ "میں انشاء اللہ ناکامی کے تمام داغوں کو دھو ڈالوں گا۔"

"آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمانا حماقت ہے۔" شاہ جہاں کے لہجے کی تلخی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ "تمہاری غلط منصوبہ بندیوں نے ہمارے کروڑوں روپے پر پانی پھیر دیا اور ہزاروں قیمتی جانیں ضائع کر دیں۔"

اورنگ زیب بار بار درخواست کرتا رہا مگر ہر مرتبہ اُس کی درخواست مسترد کر دی گئی۔

یہ اورنگ زیب کی دوسری ناکامی تھی۔

داراشکوہ نے اپنے چھوٹے بھائی کو شکست خوردہ دیکھ کر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ اس کا سب سے زیادہ طاقت ور حریف ندامت و ناکامی کے پسینے میں نہایا ہوا کھڑا تھا۔ اور شہزادہ

داراشکوہ اپنے خوشامدی مصاحبوں کے ساتھ اورنگ زیب کی حالت پر قہقہہ زن تھا۔

"شکست کا یہ وہ زخم ہے، جو مسلسل سڑتا رہے گا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ اب اورنگ زیب دوبارہ سر اُٹھا کر نہیں چل سکے گا۔ میری شاندار منصوبہ بندی نے اس کا مستقبل تباہ کر دیا۔"

⊛.....⊛.....⊛

قندھار کے دوسرے محاصرے کے وقت اورنگ زیب، ملتان کا گورنر تھا۔ داراشکوہ نے ایک بار پھر سیاسی معاملات میں مداخلت کی جس کے نتیجے میں اسے ملتان اور کابل کا گورنر بنا دیا گیا۔ نو سال بعد اورنگ زیب کو دوبارہ دکن کا حاکم مقرر کیا گیا۔ 1652ء کے آخر میں اورنگ زیب ایک شکست خوردہ سپہ سالار کی حیثیت سے دکن لوٹ آیا۔

قندھار کے محاصرے کے دوران شاہ جہاں خود بھی کابل میں مقیم رہا۔ اس شکست کے غم کو بھلانے کے لئے شاہ جہاں نے واپسی میں نئے دارالحکومت دہلی کی تکمیل کا جشن منایا۔

شاہ جہاں نے بہت غور و فکر کے بعد آگرہ کے بجائے دہلی کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک تو یہ کہ آگرہ کی بہ نسبت دہلی میں زیادہ سہولتیں میسر تھیں۔ دوسرے یہ کہ دہلی کی آب و ہوا بھی آگرے سے قدرے بہتر تھی۔ تیسرے یہ کہ آگرے میں مستقبل قیام کے سبب ممتاز محل کی روح کا زخم ہر وقت تازہ رہتا تھا۔ اس غم سے فرار حاصل کرنے کے لئے شاہ جہاں نے دہلی میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

1639ء میں دہلی کو نیا دارالحکومت بنانے کے لئے تعمیری کاموں کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ اسی سال ایک عظیم الشان قلعہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ (آج بھی یہ عمارت لال قلعہ دہلی کے نام سے مشہور ہے) اس قلعہ میں شاہی محلات تعمیر ہونا تھے۔ قلعہ کے چاروں طرف شہر آباد کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس مقصد کے لئے جمنا کے کنارے دہلی کے پرانے شہر کے شمالی حصے کا انتخاب کیا گیا۔ مسلسل دس سال تک تعمیراتی کام ہوتا رہا۔ تعمیراتی کاموں کے لئے ملک کے گوشے گوشے سے معمار طلب کئے گئے تھے۔ عمارتوں میں استعمال ہونے والا پتھر آگرے کے قریب سے مہیا کیا گیا۔ باربرداری کے تمام وسائل پر سرکاری قبضہ ہونے کے باعث انگریزوں کی تجارت بھی بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ تقریباً ساٹھ لاکھ روپے کی مالیت سے یہ تمام عمارتیں پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ ان عمارتوں میں جامع مسجد دہلی بھی شامل ہے جو اپنے سادہ نقش و نگار کے سبب دنیا کی تمام مذہبی عمارتوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس شہر کو "شاہ جہاں آباد" کا نام دیا گیا۔

جشن کے موقع پر تختِ طاؤس کو آگرے سے دہلی پہنچایا گیا۔ یہ دنیا کا سب سے خوب صورت اور قیمتی تخت تھا جو سات سال کے عرصے میں تیار کیا گیا۔ تختِ طاؤس کے چھ بھاری بھاری پائے تھے جو خالص سونے کے بنے ہوئے تھے۔ جن پر یاقوت، زمرد، لعل، پکھراج اور بڑے بڑے قیمتی ہیرے جڑے گئے تھے۔ ان ہیروں کی قیمت کا اندازہ کرنا دشوار تھا۔ اس لئے

کہ کوئی شخص بھی تخت کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ تخت کو دُور ہی سے دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔

اس تخت کو "تختِ طاؤس" اس لئے کہا جاتا ہے کہ تخت کے پیچھے دو مور اپنی دُموں کو پھیلائے ہوئے تھے۔ موروں کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے ان میں قیمتی ہیرے جڑے گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔ دونوں مور اپنی چونچوں میں نایاب موتی کی تسبیح لئے ہوئے اس طرح نظر آتے تھے جیسے ابھی ابھی وہ رقص شروع کر دیں گے۔ تختِ طاؤس چار کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔

تختِ طاؤس دربار میں سجا دیا گیا۔ جب شہنشاہ تخت نشین ہونے کے لئے آگے بڑھا تو تمام درباریوں نے دیکھا کہ شہنشاہ کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی طاری تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا تخت تک پہنچا۔ پھر جیسے ہی شاہ جہاں تخت پر بیٹھا تو سارا دربار، امراء کی مبارک بادوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ شہنشاہ نے کھوئی کھوئی نظروں سے اپنے درباریوں کی طرف دیکھا، سر کی جنبش سے مبارکبادوں کا جواب دیا اور پھر فوراً ہی تخت سے نیچے اُتر آیا۔

درباری، شہنشاہ کے اس طرزِ عمل پر حیران تھے۔ شاہ جہاں یکایک جھکا اور تخت کے قریب سجدے میں چلا گیا۔ کچھ دیر اسی حالت میں گزار کر شاہ جہاں دوبارہ سیدھا ہوا اور با آواز بلند کہنے لگا۔

"اے خدا! تُو حاضر و ناظر ہے کہ آبنوس کی معمولی لکڑی سے بنے ہوئے تخت پر بیٹھ کر تیرا بندہ فرعون کہا کرتا تھا کہ میں تمہارا بڑا رب ہوں..... مگر اس سے کہیں زیادہ قیمتی تخت پر بیٹھ کر محمد شہاب الدین شاہ جہاں کہتا ہے کہ وہ تیرا ایک حقیر بندہ ہے۔ اگر تُو اس پر اپنا فضل و کرم نہ فرماتا تو اب تک اس کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہوتا۔ بے شک! تُو جسے چاہتا ہے، عزت سے سرفراز کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، ذلت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔"

شکر گزاری کا عجیب مظاہرہ تھا۔ اہلِ دربار کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

پھر شاہ جہاں نے تخلیے کا حکم دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا دربار خالی ہو گیا۔ اگر اس وقت کوئی شخص دربار میں موجود ہوتا تو اپنی آنکھوں سے یہ رقت انگیز منظر دیکھتا کہ شاہ جہاں زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر آہِ سرد تھی اور وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

"ممتاز! کاش تم بھی اس موقع پر ہماری ہم سفر ہوتیں۔ تمہارے بغیر تختِ طاؤس "تختِ مرگ" محسوس ہوتا ہے۔ مگر ہم نے تمہاری خواہش کے احترام میں یہ بے مثال تخت تیار کرایا ہے کہ ہمارے بعد تمہارا محبوب بیٹا، دارا شکوہ اس پر جلوہ افروز ہوگا۔ ہم آخری سانس تک ہر اس شے سے محبت کرتے رہیں گے، جسے تم اپنی زندگی میں چاہتی تھیں۔"

اورنگ زیب کی دو مسلسل ناکامیوں کے بعد دارا شکوہ سیاسی طور پر اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ جشن کی تقریبات میں تمام امراء شریک ہوئے تھے مگر اورنگ زیب کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ دہلی

کے لوگ جشن کی ہنگامہ خیزیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور شہزادہ اورنگ زیب، دارالحکومت سے بہت دُور ارضِ دکن میں اپنا کھویا ہوا مستقبل تلاش کر رہا تھا۔

نئے دارالحکومت کے جشن کی تقریبات ختم ہوئیں تو دارا شکوہ نے بڑی ہوشیاری سے شاہ جہاں کے سلگتے ہوئے زخم کو چھیڑ دیا۔

"شاہِ والا! اگر اورنگ زیب کی جگہ میں ہوتا تو آج قندھار کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔" دارا نے انتہائی پُر جوش لہجے میں کہا۔

شاہ جہاں نے سوالیہ نظروں سے اپنے محبوب بیٹے کی طرف دیکھا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو دارا؟"

"یہ خادم اچھی طرح جانتا ہے کہ شاہِ ذی وقار نے قندھار کی مہم پر کئی کروڑ روپے خرچ کئے مگر جب سپہ سالار ہی ناکارہ تھا تو پھر جانباز سپاہی کیا کرتے؟ انہیں اندھیرے راستوں میں لے جا کر موت کی خوراک بننے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔"

دارا جی کھول کر اورنگ زیب کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کو شہنشاہ کی نظروں سے گرانے کے لئے اس کے پاس اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں تھا۔ دارا اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"شاہِ والا! اس خادم کو بہت دکھ ہے کہ اورنگ زیب نے شاہی خزانہ بھی برباد کیا اور عزت مآب کے وقار کو بھی ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچایا۔"

"ہاں بیٹے! ہمارے اس غم کا کوئی ازالہ نہیں۔" شاہ جہاں نے ایک آہِ سرد کھینچتے ہوئے کہا۔

"بے شک! قندھار ہمارے ذاتی وقار کا مسئلہ تھا مگر ہم بھی کیا کرتے کہ حالات ہمارے حق میں نہیں تھے۔ مجبوراً ہم اپنی زندگی کے اس تکلیف دہ واقعے کو فراموش کر دینا چاہتے ہیں۔"

"میں شاہِ والا کے غم کا ازالہ کر سکتا ہوں۔" دارا، آدابِ شاہی کو نظر انداز کر کے اونچی آواز میں بول رہا تھا۔

"وہ کس طرح؟" شاہ جہاں نے چونک کر کہا۔

"اگر اجازت مل جائے تو آپ کا یہ خدمت گزار صرف ایک ہفتے کے اندر اندر قندھار پر مکمل قبضہ کر سکتا ہے۔" اورنگ زیب کی مخالفت میں دارا شکوہ نے ایک عجیب و غریب دعویٰ کر دیا تھا۔

"کاش! ایسا ہو جائے۔" شاہ جہاں نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ "ہماری تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ دنیا کی ہر فتح، ہر کامرانی تمہارے نام لکھی جائے۔"

باپ کو آمادہ پا کر دارا شکوہ بہت دیر تک مختلف دعوے کرتا رہا۔ بالآخر شاہ جہاں نے اُسے قندھار کی مہم جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

۞.....۞.....۞

داراشکوہ ایک آزاد خیال انسان تھا۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی طرح اسے مذہب اسلام سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی محفلوں میں اکثر ہندو جوگی، سنیاسی، شاعر اور نجومی موجود رہتے تھے۔

کچھ دن پہلے دارا کی مجلس میں ایک اور شخص کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ شخص ایک مجذوب الحال فقیر سرمد تھا۔

سرمد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھا؟ اس کی پوری زندگی ہی ایک حجاب ہے۔ لوگ اس سے خوش ہوئے تو ولیٔ کامل بنا دیا۔ اور خفا ہوئے تو کفر کا فتویٰ لگا کر مقتل میں کھینچ لائے۔ عجیب شخص تھا، جس سے شدید محبتیں بھی کی گئیں اور نفرتیں بھی۔ نہ اُس کا اپنا کوئی گھر تھا اور نہ گھر والے۔ ماں باپ ضرور تھے مگر وہ انہیں بہت دُور چھوڑ آیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ سرمد تجارت کرتا تھا۔ لیکن یہ اس پر الزام ہے۔ تجارت تو بہت باہوش لوگ کرتے ہیں اور وہ بچپن ہی میں اپنے آپ کو کھو چکا تھا۔ روایت ہے کہ اس کے عالمِ جذب و مستی کو دیکھ کر ماں باپ نے گھر سے نکال دیا تھا اور دیگر عزیزوں، غم گساروں نے بھی تمام رشتے ناتے توڑ لئے تھے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اہلِ محبت پر ہمیشہ زمین تنگ رہی ہے۔

سنا گیا ہے کہ سرمد مذہبی اعتبار سے یہودی تھا اور اسے ''توریت مقدس'' پوری حفظ تھی۔ سرمد کتابِ آسمانی کی آیات اس قدر والہانہ انداز میں پڑھتا تھا کہ سننے والے وجد میں آ جاتے تھے۔ پھر ناگہاں اس کے دل پر قیامت گزر گئی۔ سرمد نے ایک دن یونان آئے ہوئے تاجروں کی ایک جماعت کو دیکھا۔ اس میں ایک برہمن زادہ بھی شامل تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ برہمن زادہ ہندوستان کا رہنے والا تھا۔ سرمد پہلے ہی آوارۂ روز و شب تھا۔ اس فتنہ نوخیز کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

جب وہ برہمن زادہ تجارتی کاموں سے فارغ ہو کر ہندوستان واپس جانے لگا تو سرمد نے بھی اپنا رختِ سفر باندھ لیا۔ یونان کے قیام کے دوران اس ہندو لڑکے نے اس سے بات تک نہ کی مگر وہ ایک بت پرست کے لئے اپنی ساری رسمیں بھول گیا۔ چند ساعتوں کی آشنائی زندگی بھر کا روگ بن گئی۔ پھر وہ برہمن زادہ جانبِ ہند چلا تو سرمد نے بھی یونان سے ہر ایک رشتہ توڑ لیا۔ گھر، شہر، دوست و اقارب، سب نے سرمد کو روکنا چاہا مگر اس نے اپنا دامن چھڑا لیا۔

سرمد یونان سے ملتان آیا۔ برہمن زادے نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا، کوئی نہیں جانتا۔ بس یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ سرمد اس ہندو لڑکے کے تعاقب میں ملتان سے دہلی پہنچ گیا۔ کسی تذکرہ نویس نے یہ بھی نہیں لکھا کہ اس عجیب و غریب عشق کا کیا حشر ہوا۔ بعض کتابوں میں سرمد کے متعلق صرف چند سطریں نظر آتی ہیں۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ دہلی آ کر سرمد کے مذہبی عقائد میں زبردست انقلاب آ گیا۔ وہ گھر سے نکلا تو ایک یہودی تھا مگر دہلی پہنچ کر مسلمان ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ برہمن زادے کے عشق میں ہندو ہو جاتا۔ مگر خدا کے آخری مذہب

نے اسے زیادہ متاثر کیا اور وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ یہ انقلاب کیوں آیا اور کیسے آیا؟ اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ چند مؤرخوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ سرمد نے دہلی میں رہ کر علمِ ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کیا۔ ان علوم میں سرمد کا استاد کون تھا؟ کس نے اُس کی روحانی تربیت کی؟ ان سوالوں کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

داراشکوہ ایک جاذبِ نظر شخصیت کا مالک تھا۔ مغل شہزادے کے چہرے کی دلکشی نے سرمد کے سینے کے زخم تازہ کر دیئے تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ برہمن زادے کے بعد سرمد کی جمال پرستی نے دارا کے نقش و نگار میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ وہ داراشکوہ کی محفل میں پابندی سے آیا کرتا تھا اور گھنٹوں پلکیں جھپکائے بغیر مغل شہزادے کی دلفریب شکل دیکھتا رہتا تھا۔

قندھار کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے داراشکوہ نے اپنے حلقے میں بیٹھنے والے نجومیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے شہنشاہ سے وعدہ کیا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر قندھار پر قبضہ کر لوں گا۔ تم لوگ مجھے بتاؤ کہ ستارے کیا کہتے ہیں؟''

نجومیوں نے مختلف کاغذوں پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچیں اور بہت دیر تک غور و فکر کرنے کے بعد کہا۔

''صاحبِ عالم کا دعویٰ درست ہے۔ ستاروں کی رفتار مکمل طور پر آپ کے حق میں ہے۔ یہ وہ نیک ساعتیں ہیں کہ اس وقت جو کام بھی شروع کیا جائے گا اس میں نمایاں کامیابی حاصل ہو گی۔''

ایک نجومی نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

''یہ اس قدر سعد وقت ہے کہ اگر صاحبِ عالم آگ کو چھو لیں گے تو وہ پھول بن جائے گی۔''

نجومیوں کے بعد داراشکوہ نے ہندو سنیاسیوں اور ملنگوں سے پوچھا۔ ''تمہارا گیان کیا کہتا ہے؟''

''شہزادے کو تاریخی فتح حاصل ہو گی۔'' تمام جوگیوں اور سنیاسیوں نے بیک زبان کہا۔ ''سارے دشمن زیر ہو جائیں گے اور صاحبِ عالم کے اقبال میں اضافہ ہو گا۔''

سب سے آخر میں دارا نے سرمد سے پوچھا۔ ''اس سلسلے میں تم کیا کہتے ہو؟''

سرمد ایک جذب کے عالم میں مغل شہزادے کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اہلِ مجلس کو یوں محسوس ہوا جیسے سرمد نے مغل شہزادے کی بات سنی ہی نہ ہو۔

''تم کیا کہتے ہو سرمد؟..... جواب دو۔'' داراشکوہ نے اونچی آواز میں کہا۔ ''کیا میں قندھار کی مہم میں فاتح قرار پاؤں گا؟''

سرمد چونکا اور اس نے دارا کی بات سن کر سر جھکا لیا۔

''تم بولتے کیوں نہیں سرمد؟'' داراشکوہ کی آواز کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ ''کہہ دو کہ فتح میرے

قدم چومے گی اور شاہِ والا پر یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ میں، اورنگ زیب سے بہتر انتظامی صلاحیت رکھتا ہوں۔ قندھار میرے وقار کا مسئلہ ہے۔ بتاؤ کہ اس جنگ میں کیا ہوگا؟''

سرمد بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''کیا تمہارا علم کچھ اور کہتا ہے؟'' اچانک دارا کے لہجے سے پریشانی کا اظہار ہونے لگا۔

''کیا میں اس جنگ میں ناکام ہو جاؤں گا؟''

اس بار بھی سرمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''جواب دو سرمد!..... یہ کیسی خاموشی ہے؟'' دارا نے جھنجلا کر کہا۔

اہلِ مجلس کا خیال تھا کہ سرمد اپنے مخصوص لہجے میں بولے گا اور شہزادے کو فتح کی نوید سنائے گا۔ مگر اس وقت لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سرمد کچھ کہے بغیر محفل سے اُٹھ کر چلا گیا۔

دارا خاموشی سے سرمد کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی یہی ادا تھی کہ وہ اپنی مرضی سے مجلس میں داخل ہوتا تھا اور اپنی مرضی سے آدابِ محفل کا لحاظ کئے بغیر اُٹھ کر چلا جاتا تھا۔ خاموشی اُس کی عادت تھی۔ اکثر و بیشتر چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ اور اگر کبھی بولا تو مشکل سے چند الفاظ اور وہ بھی بے ربط اور غیر متوازن۔

جب سرمد اُٹھ کر چلا گیا تو داراشکوہ نے اہلِ مجلس سے مخاطب ہو کر کہا۔

''سرمد نے میری فتح کی خوشخبری نہیں سنائی۔ اس کی یہ خاموشی کسی بری خبر کا پیش خیمہ تو نہیں؟''

''وہ ایک پاگل شخص ہے حضورِ والا!'' محفل میں بیک وقت کئی آوازوں کا شور سنائی دیا۔ ''ایک دیوانے سے ہوش کی باتوں کی توقع رکھنا فضول ہے۔''

داراشکوہ مطمئن ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ سرمد کی خاموشی ایک پاگل کی خاموشی کے سوا کچھ نہیں۔ دارا کو نجومیوں اور جوگیوں کی پیش گوئی پر پورا یقین تھا کہ وہ قندھار کی مہم میں فاتح قرار پائے گا۔ اس کے علاوہ اسے اپنی ذات پر بھی حد سے زیادہ اعتماد تھا۔ اورنگ زیب سے حسد رکھنے کے باعث یہ خود اعتمادی خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ وہ قندھار کے قلعے پر حملہ آور ہونے سے پہلے ہی کہا کرتا تھا۔

''میں دشمن کا وجود تک مٹا دوں گا اور ایسی یادگار فتح حاصل کروں گا کہ تاریخ اس کی مثال ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جائے گی۔''

الغرض ان ہی خوش فہمیوں کے ہجوم میں داراشکوہ نے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ ملتان اور کابل کے گورنر کی حیثیت سے اس نے جاڑوں کا موسم لاہور میں گزارا۔ اور اسی دوران مغل شہزادے نے فوج میں نئی بھرتی کا آغاز کر دیا۔

دارا نے قندھار کے قلعے میں شگاف ڈالنے کے لئے زیادہ طاقتور توپیں تیار کرائیں اور بڑی

تعداد میں اسلحہ جمع کیا۔ داراشکوہ کی فوج ستر ہزار گھڑ سواروں، آٹھ ہزار پیادوں، دس ہزار توپچیوں، پانچ سو سنگ تراشوں اور چھ ہزار سرنگ لگانے والوں پر مشتمل تھی۔ تقریباً ساٹھ توپیں ایک جگہ رکھنے کا انتظام کیا گیا۔ میرِ آتش (اسلحہ کے ذخیرے کے نگراں) کے پاس 50 ہزار گولے تھے جن میں پانچ ہزار من بارود بھرا ہوا تھا۔ ڈھائی ہزار من سیسہ، چودہ ہزار جرائل (آگ برسانے والے ہتھیار) کے علاوہ ساٹھ ہاتھی بھی اس مہم میں شامل تھے۔ مزید یہ کہ رسد قائم رکھنے کا بھی خاص انتظام کیا گیا تھا۔

شاہ جہاں نے اس مہم کی کامیابی کے لئے ایک کروڑ روپیہ داراشکوہ کے حوالے کیا اور اس کے ساتھ ہی بھاری فوج بھی مہیا کی۔ دارا فروری 1653ء میں ملتان سے روانہ ہوا۔

روانگی کے وقت اس کے تمام مصاحب رخصت کرنے آئے۔ مصاحبوں میں جوگی، سنیاسی، ملنگ، شاعر اور نجومی بھی تھے۔ نجومیوں نے ایک بار پھر دارا کی فتح کی پُرزور پیش گوئی کی۔ جوگیوں اور سنیاسیوں نے ہندو مذہب کی رسموں کے مطابق داراشکوہ کی ''آرتی'' اُتاری اور مغل شہزادے کو دیوتاؤں کے ''آشیرواد'' کی خوشخبری سنائی۔

اس بار بھی سرمد، داراشکوہ کے قریب موجود تھا مگر حسبِ عادت اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی۔

داراشکوہ گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے سرمد کے قریب آیا اور بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''میں جا رہا ہوں سرمد! یہ تمام گیانی لوگ کہتے ہیں کہ فتح میرا مقدر بنے گی۔ مگر تم کیوں خاموش ہو؟''

سرمد نے بڑی عجیب نظروں سے دارا کی طرف دیکھا اور اپنی عادت کے مطابق گردن جھکا لی۔

''کیا تمہیں میری فتح نظر نہیں آتی؟..... آسمان کی طرف دیکھو۔ سب ماہرینِ نجوم یہی کہتے ہیں کہ آسمان پر روشن حروف میں میرا نام لکھا ہوا ہے۔'' اچانک دارا کا لہجہ انتہائی جذباتی ہو گیا تھا۔

سرمد نے آہستہ آہستہ اپنا سر اُٹھایا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ چند لمحوں تک دیکھنے والوں نے یہی محسوس کیا کہ سرمد کی نظریں کسی خاص نقطے پر جمی ہوئی ہیں۔ پھر یکایک وہ چیخنے لگا۔

''مجھے کچھ نظر نہیں آتا..... میں اندھا ہو گیا ہوں۔''

تمام لوگ سرمد کی چیخ سن کر چیخ اُٹھے تھے۔ دارا بھی حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔

''میں اندھا ہو گیا ہوں..... مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔'' یہ کہتے کہتے سرمد بھاگ کھڑا ہوا۔

''یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔'' داراشکوہ نے گھبرا کر اپنے مصاحبوں سے کہا۔

''حضور پھر ایک دیوانے کی باتوں میں آ گئے۔'' جوگیوں، سنیاسیوں اور نجومیوں نے بلند آواز میں کہا۔ ''وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ پھر اسے کیا نظر آئے گا؟''

''ہاں! تم لوگ ٹھیک کہتے ہو۔'' دارا نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"واقعتاً سرمد اپنے ہوش میں نہیں ہے۔" یہ کہہ کر دارا گھوڑے پر سوار ہوا۔

"صاحبِ عالم کا اقبال بلند ہو اور دشمن ہلاکت و بربادی کا منہ دیکھے۔"

نعروں کے شور سے پوری فضا گونج رہی تھی۔

دارا نے اپنی شمشیر نیام سے باہر کی، کچھ دیر تک اسے ہوا میں لہرا کر نعروں کا جواب دیتا رہا۔ اور پھر تیز رفتاری کے ساتھ کابل کی طرف روانہ ہو گیا۔

دارا سے پہلے رستم خان، نجابت خان اور قاسم خان وغیرہ تین ہزار گھڑ سواروں کے ہمراہ کابل روانہ ہو چکے تھے۔

داراشکوہ نے براہِ راست قلعہ قندھار کا رخ کرنے کے بجائے پہلے ان نواحی علاقوں کو فتح کرنے کی کوشش کی، جن سے ایرانی فوجوں کو کمک مل سکتی تھی یا سامانِ رسد پہنچایا جا سکتا تھا۔ دارا نے آگے بڑھ کر "بست" اور "گرشک" کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور دوسرے نواحی علاقوں کو پامال کر ڈالا۔ اس کے بعد قلعہ قندھار کے محاصرے کا آغاز کیا گیا۔ داراشکوہ کے وہاں پہنچتے ہی جنگ چھڑ گئی۔

مغلوں نے بار بار قلعے پر حملے کئے مگر ایرانی فوج ہر مرتبہ ان کے حملوں کو ناکام بنا دیتی تھی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر چھوٹی توپوں کی جگہ بڑی توپیں نصب کر دی گئیں۔ پھر اس کے فوراً بعد ہی دونوں طرف زبردست گولہ باری شروع ہو گئی۔ اس دوران مغلوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اگرچہ مغلوں کی توپوں نے قلعے کی دیواروں میں بعض جگہ شگاف پیدا کر دیئے تھے لیکن اس کے باوجود ایرانیوں نے مغل فوجوں کا قلعہ میں داخلہ ناممکن بنا دیا تھا۔

محاصرے نے اس قدر طول کھینچا کہ موسم سرما کا آغاز ہو گیا۔ مغل فوجوں کے لئے قندھار کی ناقابلِ برداشت سردی میں جنگ جاری رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ محاصرے کو سات ماہ گزر چکے تھے مگر کامیابی کی دھندلی سی کرن بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر طرف مایوسیوں، ناکامیوں کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ داراشکوہ نے شاہ جہاں سے ایک ہفتے کی مہلت طلب کی تھی لیکن سات ماہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اس آزمائش میں پورا نہیں اُتر سکا تھا۔ ایک طرف قندھار کا سخت موسم تھا اور دوسری طرف سامانِ خورونوش میں بڑی حد تک کمی واقع ہو چکی تھی۔ گولہ بارود ختم ہو گیا تھا اور مویشیوں کے لئے چارہ تک باقی نہیں رہا تھا۔ مغل سپاہی حالات سے مایوس ہو چکے تھے اور اب وہ انتہائی بے دلی کے ساتھ محاصرہ جاری رکھے ہوئے تھے۔

اکتوبر کے وسط میں داراشکوہ نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اس نے بڑی مایوسی کے عالم میں اُداس نظروں سے قلعہ قندھار کی دیواروں کی طرف دیکھا اور واپسی کے لئے اپنے گھوڑے کا رخ کابل کی طرف موڑ دیا۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اورنگ زیب جیسے جانباز سپہ سالار پر یہاں کیا گزری ہو گی۔ مگر داراشکوہ ایک خودسر شہزادہ تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کی مجبوریوں کا احساس تک نہیں کیا۔ قندھار کے محاذ پر ناکامی کے بعد اورنگ زیب کی ذات لعنت و ملامت کا

ہدف بن گئی تھی اور اسے ملتان کی گورنری کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ مگر داراشکوہ کو اپنی شکست پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شہنشاہ اس کی محبت میں غرق ہو چکا ہے، اس لئے اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

تمام جوگیوں اور سنیاسیوں کے آشیرواد کسی کام نہیں آئے تھے۔ اور نجومیوں کی ساری پیش گوئیاں غلط ثابت ہو چکی تھیں۔ محاذِ جنگ سے ناکامی کی حالت میں لوٹتے وقت داراشکوہ کی سماعت میں سرمد کے الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔

"میں اندھا ہو گیا ہوں..... مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔"

اب داراشکوہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سرمد پاگل نہیں ہے۔ وہ بہکے بہکے انداز میں بھی بڑے ہوش کی باتیں کرتا ہے۔

شاہ جہاں نے اذیت و کرب کے ساتھ محاصرے کی ناکامی اور مغل فوجوں کی واپسی کی خبر سنی۔ شہنشاہ کو اس خبر سے شدید صدمہ پہنچا تھا مگر اس نے دارا کے سامنے کسی قسم کی تلخی اظہار نہیں کیا۔ بس اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"بیٹے! مقدر سے کوئی جنگ نہیں کر سکتا۔"

اہلِ دربار نے اپنے شہنشاہ کے الفاظ سنے اور انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ اورنگ زیب کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ قندھار کے محاذ پر ناکام ہو جانے کے بعد شاہ جہاں نے اورنگ زیب کے خلاف انتہائی جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ مگر جب اسی محاذ پر داراشکوہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو وہ اپنے بڑے بیٹے سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا اور دارا کی ناکارہ قیادت پر یہ کہہ کر پردہ ڈال دیا کہ "مقدر سے کوئی جنگ نہیں کر سکتا۔"

اس واقعے کے بعد دارا کچھ اور مغرور ہو گیا تھا۔ مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ قندھار کے تین محاصروں نے شاہی خزانے پر کتنا برا اثر ڈالا ہے۔ ان محاصروں پر بارہ کروڑ روپے کی کثیر رقم خرچ کر دینے کے باوجود مغل سلطنت کی حدود میں ایک انچ کی توسیع نہ کی جا سکی۔ قندھار کے حصول میں تین بار ناکامی کے بعد مغلوں کے وقار کو بھی شدید صدمہ پہنچا تھا۔ اب خود شاہ جہاں فکرمند نظر آ رہا تھا کہ کہیں ایران کی طرف سے حملوں کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ کیونکہ مغلوں کے پے در پے شکست کھانے کے بعد ایرانیوں کے وقار میں نہ صرف اضافہ ہوا تھا بلکہ ان کے حوصلے بھی کافی بلند ہو گئے تھے۔

۞.....۞.....۞

دوسری طرف شہزادہ اورنگ زیب، دکن کے سیاسی محاذ پر ایک خوف ناک جنگ میں اُلجھا ہوا تھا۔ اورنگ زیب نے پہلی بار 1644ء میں دکن کی گورنری سنبھالی تھی۔ پھر 9 سال بعد اسے دوبارہ اس علاقے کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس طویل عرصے میں اورنگ زیب کے بعد کوئی بھی ایسا گورنر نہیں آیا جو ریاست کے نظم و نسق اور دیگر اصلاحات کی طرف بھرپور توجہ دیتا۔ اس دوران جو

بھی آیا، اُس نے جیب بھرنے کی کوشش کی۔ جس کا براہِ راست یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ قانون کا احترام ختم ہو گیا۔ کسانوں پر اتنا بوجھ ڈالا گیا کہ پیداوار میں انتہائی حد تک کمی واقع ہو گئی اور بہت سا زرخیز علاقہ ویران ہو گیا۔ صوبائی خزانے کا یہ حال تھا کہ اب وہ دکن میں موجود فوجوں کی تنخواہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجبور ہو کر اورنگ زیب نے باپ کو خط لکھا۔

''شاہِ والا! میں مغل سلطنت کی بھلائی کے نام پر درخواست کرتا ہوں کہ وہ تمام جاگیریں جو نااہل مغل افسروں کے پاس ہیں، صوبائی حکومت کے حوالے کر دی جائیں۔''

شاہ جہاں نے اورنگ زیب کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور اسے جاگیریں ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔ مگر جب یہی نااہل افسر اپنی جاگیروں سے محروم ہو کر دارالحکومت دہلی پہنچے تو انہوں نے شاہ جہاں کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔

''شاہِ ذی وقار! شہزادہ اورنگ زیب اپنے افسروں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے مغل سلطنت کو کسی بھی وقت شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

سازشی عناصر، شاہ جہاں کو اورنگ زیب کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مزید یہ کہ شہزادہ داراشکوہ بھی ان چنگاریوں کو ہوا دے رہا تھا۔ شہنشاہ کی قوتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی۔ باپ اور بیٹے کے درمیان پہلے ہی ایک خلیج حائل ہو گئی تھی، نئی سازشوں نے اس خلیج کو کچھ اور بھی گہرا کر دیا۔ شاہ جہاں نے فوراً ہی اورنگ زیب کو انتہائی ناپسندیدہ انداز میں خط لکھا۔

''ناانصافی مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ یہ کون سا انصاف ہے کہ لوگوں سے شاداب علاقے چھین کر انہیں ویران علاقے دے رہے ہو۔''

اورنگ زیب نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے شب و روز کی محنت کے بعد کسی حد تک حالات پر قابو پا لیا تھا۔

داراشکوہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دن عرض کیا۔

''شہنشاہ عالی قدر! یہ گستاخی اور نافرمانی کی کھلی دلیل ہے کہ اورنگ زیب نے آپ کے خط کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔''

یہ سن کر شاہ جہاں بھڑک اُٹھا اور اُس نے اورنگ زیب کے نام دوسرا خط تحریر کرتے ہوئے لکھا۔

''اگر تم نے جلد از جلد حالات پر قابو نہ پایا تو تمہارے وظیفے میں بڑی حد تک کمی کر دی جائے گی یا اسے مکمل طور پر بند کر دیا جائے گا۔''

جواب میں اورنگ زیب نے بڑا دردناک خط باپ کو تحریر کیا۔

''حضورِ والا! یہ میری زندگی کی سب سے زیادہ سنگین ساعتیں ہیں کہ میں جلالت مآب کی شفقت اور توجہ سے بھی محروم ہو چکا ہوں۔ دہلی میں بیٹھ کر شہنشاہ کو بھڑکانے والے لوگ نہیں جانتے کہ ارضِ دکن کیسے خوف ناک طوفان سے دوچار ہے۔ میں ایک کمزور شخص ہوں، جس نے

اپنے سینے کی طاقت سے ان سرکش موجوں کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ اگر طوفان کی پاگل لہروں نے میرا سینہ چاک کر دیا تو پھر خدا ہی جانے کہ یہ طوفان کہاں تک جائے گا۔ میں اس وقت سے اپنے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، جب یہ طوفان مغل سلطنت کے وقار کو بہا کر لے جائے اور میں ایک بے دست و پا انسان کی حیثیت سے اس عبرت ناک منظر کو دیکھتا رہوں۔''

اورنگ زیب نے اپنے خط کے آخر میں یہ بھی تحریر کیا۔

''اگر میرا وظیفہ بند کر دینے سے میرے دشمنوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے یا شاہی خزانے کا منہ بھر سکتا ہے تو پھر یہ وظیفہ فوراً بند کر دیا جائے۔ میں خشک روٹی کھا کر یا خالی پیٹ رہ کر بھی اپنے اللہ کا شکر ادا کرتا رہوں گا۔''

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ چھوٹے بیٹے کا خط پڑھ کر باپ کا دل پگھل جاتا۔ مگر داراشکوہ نے اورنگ زیب کی اس تحریر کو بھی گستاخی و نافرمانی کی شدید علامت قرار دیا۔

''شاہِ والا! اورنگ زیب کی سرکشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ معذرت کا اظہار کرنے کے بجائے اُس نے شہنشاہ کو دھمکی دی ہے۔''

شاہ جہاں نے بیٹے کی باتوں کا غلط مفہوم اخذ کیا اور اورنگ زیب کی طرف سے اس کے دل میں ناپسندیدگی کا مزید غبار بھر گیا۔

اسی دوران آگرہ سے تاج محل کے نگراں معمار عیسیٰ شیرازی کا خط موصول ہوا۔ عیسیٰ شیرازی نے شاہ جہاں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''شہنشاہِ معظم! آپ کا یہ ادنیٰ ترین خادم اب مسلسل بیمار رہنے لگا ہے۔ میں اپنے خدا سے ہمہ وقت دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اتنی زندگی بخش دے کہ میں اپنی موجودگی میں ملکۂ عالیہ کے روضے کو تکمیل کے مرحلے تک پہنچا دوں۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اعزاز و شرف میری قسمت میں نہیں۔ اس لئے درخواست گزار ہوں کہ میرے جیتے جی شاہِ والا ایک نظر ان تعمیرات کو ملاحظہ فرمالیں۔ اس طرح میرے دل کا بوجھ اُتر جائے گا اور پھر میں سکون کی موت مر سکوں گا۔''

عیسیٰ شیرازی کا خط پڑھتے ہی شاہ جہاں اُداس نظر آنے لگا۔ اگرچہ تاج محل اپنی تکمیل کی آخری منزل سے گزر رہا تھا لیکن ابھی اس بے مثال عمارت کو عیسیٰ شیرازی کی نگرانی کی شدید ضرورت تھی۔ عیسیٰ کا خط ملتے ہی ممتاز محل سے وابستہ تمام یادیں زندہ ہو گئیں اور شاہ جہاں فوراً ہی آگرے کے لئے روانہ ہو گیا۔

آگرہ پہنچتے ہی شہنشاہ نے استقبال کرنے والے امراء کے ہجوم کو دیکھا۔ اس ہجوم میں عیسیٰ شیرازی بھی موجود تھا۔ شاہ جہاں نے اسے غور سے دیکھا۔ عیسیٰ کے چہرے پر بیماری کے آثار صاف نمایاں تھے۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ دو آدمیوں کے سہارے بمشکل اپنے قدموں پر اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

''عیسیٰ تم بیمار ہو۔ اس لئے تم پر ہمارا استقبال فرض نہیں تھا۔'' شاہ جہاں نے تاج محل کے

معمار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں شاہِ والا!" عیسیٰ شیرازی نے رک رک کر کہا۔ نقاہت کے سبب اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ "جلالت مآب کے وقار کی قسم! اگر عیسیٰ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوتا تو وہ سینے کے بل گھسٹتا ہوا شہنشاہ کے استقبال کے لئے حاضر ہوتا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا شفیق و مہربان حکمراں نہیں دیکھا۔ خدا کرے کہ میری عمر بھی شاہِ والا کی عمر میں شامل ہو جائے۔"

شاہ جہاں، عیسیٰ شیرازی کے طرزِ عمل اور اندازِ گفتگو سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔

"خدا تمہیں عمرِ دراز عطا کرے کہ تم ہماری سلطنت کے بہترین فنکار ہو۔" شاہ جہاں نے عیسیٰ شیرازی کے لئے دعائیہ کلمات ادا کئے۔ "عیسیٰ! تم جا کر آرام کرو۔ بہت زیادہ تھکے ہوئے نظر آتے ہو۔"

"شاہِ والا کو دیکھ کر میری بیماری دُور ہو گئی ہے۔" عیسیٰ شیرازی نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں بہت خوش ہوں کہ شہنشاہ عالی مقام نے میری درخواست کو اتنی اہمیت دی اور غلام کی زندگی میں آگرہ تشریف لے آئے۔"

اس کے بعد شاہ جہاں، عیسیٰ شیرازی کو لے کر محل پہنچا اور فوری طور پر شاہی طبیب کو طلب کر کے اس سے مخاطب ہوا۔

"عیسیٰ کو تمہاری توجہ اور نگہداشت کی شدید ضرورت ہے۔"

شاہی طبیب نے عیسیٰ کی نبض دیکھی اور دوا تجویز کرتے ہوئے کہا۔

"کمزوری بہت زیادہ ہے۔ مگر میں اپنے اللہ کی مسیحائی پر یقین رکھتا ہوں۔ انہیں بہت جلد شفا حاصل ہو گی۔"

عیسیٰ شیرازی کا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شاہِ والا! میں اپنا مرض خود پہچانتا ہوں۔ بس چند روز سے زیادہ زندہ نہیں رہوں گا۔ آپ تشریف لے آئیے۔ ایک نظر تاج محل کو دیکھ لیجئے۔ میرا یہی علاج ہے۔"

"تاج محل کو بھی دیکھ لیں گے۔ مگر تم اتنی مایوسی کی باتیں نہ کرو۔" شاہ جہاں نے عیسیٰ شیرازی کو تسلی دی اور وہ معمارِ اعظم، دو آدمیوں کا سہارا لے کر لڑکھڑاتے قدموں سے واپس چلا گیا۔

شاہ جہاں طویل سفر کے دوران تھک گیا تھا۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد اس نے تاج محل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تمام امراء شہنشاہ کے ہمراہ تھے اور عیسیٰ شیرازی بھی دو آدمیوں کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اگرچہ شاہ جہاں نے اسے آرام کرنے کے لئے کہا تھا لیکن وہ شہنشاہ کے ساتھ چلنے پر بضد تھا۔

برسات کا زمانہ گزر چکا تھا، اس لئے موسم کسی حد تک خوشگوار ہو گیا تھا۔ برسات کے پانی کی وجہ سے دریائے جمنا میں طغیانی کی سی کیفیت تھی۔ تاج محل تین اطراف سے پانی میں گھرا ہوا تھا۔ دریائے جمنا کی لہریں بار بار سیڑھیوں سے ٹکرا کر ایک عجیب سا شور پیدا کر رہی تھیں۔ تاج

محل کی تعمیر میں بیس ہزار مزدور حصہ لے رہے تھے مگر اس روز تمام مزدوروں کو کام سے روک دیا گیا تھا۔

جب شاہ جہاں صدر دروازے سے اندر داخل ہوا تو وہ عمارت کی دلکشی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سنگِ مرمر سے تراشا ہوا تاج محل، نور کا ایک پیکر نظر آتا تھا۔ سورج کی تیز روشنی نے تاج محل کی آب و تاب میں اس قدر اضافہ کر دیا تھا کہ انسانی آنکھ خیرہ ہوئی جاتی تھی۔ شاہ جہاں نے بار بار تاج محل کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے روشنی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ کبھی کبھی چند لمحوں کے لئے بڑے گنبد اور چار میناروں کا عکس دکھائی دیتا تھا مگر فوراً ہی تیز روشنی ان کے نقش و نگار پر غالب آ جاتی تھی۔

"عیسیٰ! یہ کیا ہے؟" شاہ جہاں نے گھبرا کر کہا۔ "کیا تم نے روشنی کی عمارت تعمیر کی ہے؟"

"شاہِ والا بھی تو یہی چاہتے تھے کہ روشنی زمین پر اُتر آئے۔" عیسیٰ شیرازی نے سکون کی گہری سانس لی اور اس کے ہونٹوں پر طمانیت کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ "شہنشاہِ معظم کا اقبال بلند ہو کہ حضور کے غلاموں نے روشنی کو پتھروں میں قید کر دیا۔"

"بے شک! ہم یہی چاہتے تھے عیسیٰ!" شاہ جہاں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ "مگر ہم تاج محل کے نقش و نگار کو کس طرح دیکھیں گے؟"

"ذرا دھوپ ڈھل جانے دیجئے۔ پھر ایک ایک نقش آنکھوں کے سامنے اُبھر آئے گا۔" عیسیٰ شیرازی نے کہا۔

شاہ جہاں نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور سیڑھیاں طے کر کے اوپر آ گیا۔ یہاں دلکشی کا کوئی اور ہی منظر نمایاں تھا۔ تاج محل کے عین سامنے فوارے موتی برسا رہے تھے اور سرو کے درخت اس طرح قطار در قطار نظر آ رہے تھے، جیسے ممتاز محل کے خدمت گار اپنی ملکۂ عالیہ کے سامنے باادب کھڑے ہوں۔

"آفرین!..... عیسیٰ شیرازی! ہزار بار آفرین۔" بے اختیار شاہ جہاں کی زبان سے تحسین کے کلمات ادا ہوئے۔ "تم نے ہمارے خواب کو ایسی عجیب زندگی بخشی ہے کہ جسے دیکھ کر ہمارا دشمن بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہم تمہارے خلاق ذہن اور صناع ہاتھوں کو سلامِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔"

"شاہِ والا! تاج محل کی تخلیق میں آپ کے ہزاروں خدمت گار شامل ہیں، صرف شیرازی نہیں۔" عیسیٰ نے انتہائی انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم ان تمام مزدوروں کو بھی سلام پیش کرتے ہیں، جنہوں نے ہمارے خواب کی تعبیر پیش کرنے کے لئے اپنے شب و روز کا خون کر ڈالا ہے۔ آج سے سب لوگوں کے معاوضے میں اضافہ کر دیا جائے۔"

اس اعلان کے بعد شاہ جہاں، تاج محل کے دروازے میں داخل ہوا۔ عیسیٰ شیرازی اور دیگر

امراء پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

ممتاز محل کی قبر دیکھتے ہی شاہ جہاں وارفتہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر یکایک غم و اندوہ کے گہرے سائے لرزنے لگے اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ شاہ جہاں نے امراء کی موجودگی کے سبب اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنے دل سے مجبور تھا۔

بہت دیر بعد جب شہنشاہ کا دل قابو میں آیا تو اس نے روضے کے اندر کی فضا پر نظر ڈالی۔ یہاں سنگ تراشی کا اس قدر باریک کام کیا گیا تھا کہ شاہ جہاں دنگ رہ گیا۔ اسے ممتاز محل کی قبر کے دائیں جانب دیوار پر ایک خلا سا نظر آیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دیوار میں ایک سرنگ موجود ہے، جو ایک خاص زاویے اور ترتیب کے ساتھ دُور تک چلی گئی ہے۔

شاہ جہاں چند قدم آگے بڑھا اور دیوار میں موجود اس سرنگ نما خلا کو دیکھ کر عیسیٰ شیرازی سے مخاطب ہوا۔

"عیسیٰ! کیا یہ دیوار ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے؟"

"شاہِ والا! دیوار کو بہت دن پہلے مکمل کیا جا چکا ہے۔" عیسیٰ شیرازی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ مستقل کھڑا رہنے سے اُس کی سانس پھول گئی تھی۔

"پھر دیوار میں یہ خلا کیوں موجود ہے؟" شاہ جہاں نے سوال کیا۔

"شہنشاہِ ذی حشم! یہ خلا نہیں ہے۔" عیسیٰ شیرازی نے ادب سے عرض کرتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنے دستِ مبارک سے چھو کر دیکھئے۔ یہ پتھروں کی ترتیب کا کمال ہے کہ دیکھنے والوں کو بظاہر دیوار میں ایک خلا سا نظر آتا ہے۔"

شاہ جہاں نے دیوار پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور پھر کچھ دیر بعد اس نے انتہائی حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"دیوار بالکل ہموار ہے عیسیٰ!..... واقعتاً تم نے کمال کر دیا ہے۔ ہر چند کہ اس میں کئی پتھر شامل ہیں مگر کہیں بھی جوڑ محسوس نہیں ہوتا۔"

عیسیٰ شیرازی نے سر جھکا دیا۔

شاہ جہاں بہت دیر تک روضے میں چاروں طرف گھوم کر ایک ایک دیوار کا جائزہ لیتا رہا۔ تعمیر کا ہر زاویہ لاثانی تھا اور ہر نقش بے مثال تھا۔ یکایک ایک درباری امیر نے شہنشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شاہِ والا! یہ پانی کیسا ہے؟" امیر نے ممتاز محل کی قبر کے نزدیک ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شاہ جہاں تیز قدموں سے اس طرف آیا اور جھک کر زمین کی جانب دیکھنے لگا۔ زمین پر ایک مخصوص دائرے میں پانی کے قطرے نظر آ رہے تھے۔ شہنشاہ نے گھبرا کر چھت کی طرف دیکھا۔ وہاں کچھ نمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ جہاں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ کچھ دیر بعد شاہ

جہاں کے ہاتھ پر پانی کا ایک قطرہ ٹپکا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور عیسیٰ شیرازی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"عیسیٰ! اس بے مثال عمارت میں یہ کتنا بڑا عیب موجود ہے۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ چھت سے پانی رِس رہا ہے۔"

"نہیں شاہِ والا! یہ عیب نہیں ہے۔" عیسیٰ شیرازی نے دست بستہ عرض کیا۔ "پانی کے یہ چند قطرے بھی اس عمارت کی ایک خوبی ہیں۔ مگر اس خوبی کو اہلِ دل کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔"

شاہ جہاں نے چونک کر شیرازی کی طرف دیکھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو عیسیٰ! عمارت کا عیب، خوبی میں کس طرح تبدیل ہو سکتا ہے؟ ہم تمہاری بات کا مفہوم نہیں سمجھے۔"

عیسیٰ شیرازی کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔

"وضاحت کرو کہ چھت سے پانی کا ایک ایک قطرہ ٹپکنے میں کون سی ہنرمندی ہے؟" شاہ جہاں نے عیسیٰ شیرازی کو خاموش پا کر کہا۔

"بات بہت نازک ہے شاہِ والا! کہتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے۔" عیسیٰ شیرازی رک رک کر بول رہا تھا۔

"آج ہم تم سے بہت خوش ہیں عیسیٰ! کہہ ڈالو جو کہنا چاہتے ہو۔" شاہ جہاں کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے کسی قریبی دوست یا برابر کے انسان سے گفتگو کر رہا ہے۔ "آج کے دن تمہاری زبان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"

"حضورِ والا نے ایک دن فرمایا تھا....." عیسیٰ شیرازی ایک دم کہتے کہتے رک گیا۔

"کہو، کہو..... کیا کہنا چاہتے ہو؟" شاہ جہاں نے عیسیٰ شیرازی کی ہمت بندھائی۔ "آج تمہارے لب آزاد ہیں۔"

"شہنشاہِ معظم نے ایک دن فرمایا تھا....." عیسیٰ کی زبان دوبارہ لڑکھڑا گئی۔

"ہم نے کیا فرمایا تھا؟" شاہ جہاں نے عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بے خوف ہو کر کہہ ڈالو۔ ہم اپنی بات کو بھولتے نہیں۔"

"شاہِ والا نے فرمایا تھا، خاکم بدہن (میرے منہ میں خاک) جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو ملکۂ عالیہ کے قریب آپ کا مرقد تعمیر کیا جائے گا۔" ایک تو حد سے بڑھی ہوئی کمزوری اور دوسرے شاہ جہاں کی موت کا ذکر، عیسیٰ شیرازی کے پاؤں بری طرح کانپنے لگے اور اس کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔

"ہاں! ہم نے یہ بات کہی تھی۔ مگر تم ہماری موت کے ذکر سے اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟" شاہ جہاں نے حیرت زدہ انداز میں عیسیٰ شیرازی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اہلِ ہند کے سروں پر شاہِ والا کا سایہ تا دیر قائم رہے مگر موت قدرت کا ایک اٹل قانون

ہے۔'' عیسیٰ شیرازی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''اگر شہنشاہِ ذی وقار کا مرقد یہاں تعمیر ہوا تو پانی کے یہ قطرے اس شخص کے سینے پر گریں گے، جس کی محبت ساری دنیا میں بے مثال ہے۔''

عیسیٰ شیرازی کی بات سن کر شاہ جہاں اور دیگر امراء چونک اُٹھے۔

شاہ جہاں نے غور سے اس جگہ کو دیکھا، جہاں پانی کے چند قطرے جمع ہو گئے تھے۔ واقعتاً یہ وہی جگہ تھی، جس کی طرف شاہ جہاں نے چند سال پہلے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''جب ہم دنیا سے رخصت ہو جائیں تو ہمیں ملکۂ عالیہ کے پہلو میں دفن کر دینا۔''

''یہ پانی کے قطرے نہیں، شاہِ والا!'' عیسیٰ شیرازی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ محبت کے آنسو ہیں، جو اس وقت تک بہتے رہیں گے، جب تک دنیا قائم ہے۔ یہ آنسو، اہلِ دل کو احساس دلاتے رہیں گے کہ محبت اپنے محبوب کی جدائی میں ہمیشہ اشک بار رہتی ہے۔''

''مرحبا!..... عیسیٰ شیرازی! تم بہت نازک جذبات رکھتے ہو۔'' شاہ جہاں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''ہمیں خوشی ہے کہ تم نے ہمارے احساس کو سمجھنے کی کوشش کی۔''

''شاہِ والا! میں نے پانی کے ان قطروں سے یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ محبت رو رہی ہے۔'' عیسیٰ شیرازی نے اپنے فن کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس عمارت کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لیجئے مگر کہیں پانی کا کوئی قطرہ نظر نہیں آئے گا۔''

عیسیٰ شیرازی کے اس دعوے کو پرکھنے کے لئے خود شاہ جہاں نے تاج محل کی چھت پر چڑھ کر دیکھا۔ شہنشاہ کے علاوہ تمام امراء بھی تلاش کرتے رہے مگر انہیں چھت میں بال برابر بھی کوئی درز یا جھری نظر نہیں آئی۔

یہی عیسیٰ شیرازی کا کمال تھا کہ جب برسات کے موسم میں پانی برستا تھا تو پانی کے چند قطرے ایک مخصوص راستے سے گزر کر اس جگہ ٹپکتے تھے، جہاں شہنشاہ نے اپنی قبر تعمیر کرنے کی وصیت کی تھی۔

پھر جب شاہ جہاں کے حکم پر قبر کی پیمائش کی گئی تو دیکھنے والوں کو محسوس ہوا کہ پانی کے قطرے شہنشاہ کے سینے پر ٹپک رہے ہیں۔

شاہ جہاں، عیسیٰ شیرازی کی ہنرمندی سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اس نے تمام امراء کی موجودگی میں عیسیٰ شیرازی کو ''استاد'' کا خطاب دیا اور باآوازِ بلند کہا۔

''عیسیٰ! تم نے ہر قدم پر ہمارے خیالات و جذبات کا لحاظ رکھا ہے۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے اس خواب کو زندہ کر دیا، جس کے دھندلے خاکوں میں رنگ بھرنا آسان نہیں تھا۔''

''میں کیا اور میری حقیقت کیا؟'' عیسیٰ شیرازی نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہا۔ ''یہ تو شاہِ والا کے سینے کی آگ تھی، جس نے اس عمارت کے ایک ایک گوشے کو روشن کر دیا ہے۔''

۞.....۞.....۞

تاج محل کی سیر کرتے کرتے شام ہو چلی تھی۔ شاہ جہاں نے واپس جانا چاہا تو عیسیٰ شیرازی دست بستہ عرض کرنے لگا۔

''شاہِ والا! غلام نہیں جانتا کہ اس کی زندگی کا سفر کب ختم ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ میں اس عالمِ فانی کو خیر باد کہوں، میری درخواست ہے کہ صرف آج کی رات تاج محل میں ٹھہر جائیں۔ میں اپنی موجودگی میں عزت مآب کو ایک اور منظر دکھانا چاہتا ہوں۔'' عیسیٰ کی زبان سے بمشکل الفاظ ادا ہو رہے تھے اور شدید نقاہت کے سبب اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

شاہ جہاں نے اُس کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر کہا۔

''ابھی کچھ دن اور ہمارا قیام آگرے میں رہے گا۔ ہم پھر کسی روز رات کو وہ منظر دیکھنے کی کوشش کریں گے، جو تم ہمیں دکھانا چاہتے ہو۔''

''نہیں شہنشاہِ معظم!'' عیسیٰ شیرازی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر آج کی رات گزر گئی تو پھر ایک سال تک انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے اس رات کے لئے اپنے خدا سے بہت دعائیں کی ہیں۔ ہر گزرنے والی سانس مجھے موت کا پیغام دینا چاہتی ہے مگر شاید میں ابھی اس لئے زندہ ہوں کہ میرا کام ختم نہیں ہوا ہے۔''

''تم بیٹھ جاؤ عیسیٰ!'' شاہ جہاں نے استاد شیرازی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور خود تاج محل کی پہلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

امراء بھی تھک گئے تھے۔ شہنشاہ کا حکم پاتے ہی عیسیٰ شیرازی کے ساتھ درباری امیر بھی بیٹھ گئے۔

''اس رات کی کیا خصوصیت ہے عیسیٰ؟'' شاہ جہاں نے استاد شیرازی سے پوچھا۔ ''اور اس رات کا تاج محل سے کیا تعلق ہے؟''

''شاہِ والا نے اس عمارت کو صرف سورج کی تیز روشنی میں دیکھا ہے۔'' عیسیٰ شیرازی نے عرض کیا۔ ''خادم چاہتا ہے کہ جلالت مآب اسے چاند کی ٹھنڈی روشنی میں بھی ملاحظہ کریں۔''

''مگر صرف آج کی رات کیوں؟'' شاہ جہاں نے تاج محل کے معمار سے ایک اور سوال کیا۔

''آج چاند کی چودھویں شب ہے۔'' عیسیٰ شیرازی نے عرض کیا۔

''چاند کی چودھویں رات تو ہر مہینے آتی ہے۔ پھر کسی بھی شب میں تاج محل کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔'' شاہ جہاں نے کہا۔

''حضورِ والا! یہ چودھویں کی رات سال میں صرف ایک بار آتی ہے۔'' عیسیٰ شیرازی نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''برسات گزر جانے کے بعد (اکتوبر کے مہینے میں) یہ وہ زمانہ ہوتا ہے، جب تیز بارشیں تاج کو غسل دے چکی ہوتی ہیں اور چاند ایک مخصوص زاویے سے گزرتا ہے۔''

''کیسا زاویہ؟'' شاہ جہاں نے کسی قدر حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج رات شاہِ والا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس زاویے کا مشاہدہ کریں گے۔" عیسیٰ شیرازی نے عرض کیا۔ "یہ غلام الفاظ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا۔"

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ شاہ جہاں اور دیگر امرائے دربار بڑی بے چینی سے چاند کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

چاند اپنے مقررہ وقت پر طلوع ہوا، پھر آہستہ آہستہ آسمانی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھا۔

"کیا چاند اپنے مخصوص زاویے پر پہنچ چکا ہے؟" شاہ جہاں نے عیسیٰ شیرازی سے پوچھا۔

"ابھی ابتدائے شب ہے۔" عیسیٰ شیرازی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ اُس کی کمزوری مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ "آدھی رات کے قریب یہ چودھویں کا چاند بڑے گنبد کے عین اوپر پہنچ جائے گا۔ بس یہی اس کا مخصوص زاویہ ہوگا۔"

شاہ جہاں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پورا آسمان دُھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جیسے قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے اسے غسل دے دیا ہو۔ شاہ جہاں ٹہلتا ہوا تاج محل کی چار دیواری کے قریب آیا۔ چاند کی روشنی جمنا کے پانی پر اس طرح پڑ رہی تھی، جیسے پورا دریا چاندی کا بنا ہوا ہو۔ اگرچہ ہلکی ہلکی خنکی کا احساس ہونے لگا تھا لیکن موسم پھر بھی خوش گوار تھا۔

"استاد عیسیٰ! بہت دلفریب منظر ہے۔" شاہ جہاں نے شیرازی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بے شمار چاندنی راتیں آئیں اور گزر گئیں مگر ہم نے آج سے پہلے قدرت کے اس حُسن کو اتنی شدت کے ساتھ محسوس نہیں کیا تھا۔"

"بس! کچھ دیر اور انتظار فرما لیجئے شاہِ والا!" عیسیٰ شیرازی کو اپنے سینے میں ہلکے ہلکے درد کا احساس ہونے لگا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنی پوری ہمت سمیٹ کر بول رہا تھا۔ "کچھ دیر بعد قدرت کا ایک اور دلفریب منظر طلوع ہونے والا ہے۔ ایسا منظر جو آج سے پہلے روئے زمین پر کہیں نظر نہیں آیا ہوگا۔"

شاہ جہاں انتہائی حیرت و شوق سے عیسیٰ شیرازی کی باتیں سنتا رہا۔ یہاں تک کہ چاند، تاج محل کے گنبد کے عین اوپر پہنچ گیا۔

"شاہِ والا! اب دیکھئے۔" عیسیٰ شیرازی نے بہت مشکل سے یہ الفاظ ادا کئے۔ اُس کی سانسیں بے ربط ہوتی جا رہی تھیں۔

شاہ جہاں نے غور سے تاج محل کی طرف دیکھا۔ چاند کی کرنیں سنگِ مرمر سے منعکس ہو کر عجیب سا سماں پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کائنات کی ہر شے روشنی میں نہا گئی ہو۔ ایسی روشنی جو ٹھنڈی بھی ہے، مرطوب بھی اور خواب آور بھی..... ایک نشہ سا تھا، جو انسانی اعصاب پر چھائے جا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کے دوش پر دریائے جمنا کا پانی اس طرح بہہ رہا تھا، جیسے کوئی جلترنگ بجا رہا ہو۔

شاہ جہاں نے اپنے وزیر اعظم میر جملہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم اپنی مملکت میں ہیں یا خوابوں کے کسی جزیرے میں چلے آئے ہیں؟"

(میر جملہ کا تعلق اصفہان کے ایک سید خاندان سے تھا۔ وہ جواہرات کے ایک سوداگر کے ساتھ گولکنڈہ آیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب سوداگر کا انتقال ہو گیا تو وصیت کے مطابق اس کا سارا اثاثہ میر جملہ کو مل گیا۔ پھر یہ مالدار ترین شخص، زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر شاہ جہاں کے دربار میں پہنچا۔ شہنشاہ نے بڑی گرم جوشی سے میر جملہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُسے معظم خان کا خطاب دیا۔ میر جملہ نے شاہ جہاں کو جو تحائف پیش کئے، ان میں ایک ایسا ہیرا بھی تھا، جس کی مالیت 15 لاکھ روپے تھی۔ شاہ جہاں نے اسے چھ ہزار ذات اور چھ ہزار سوار کے منصب سے نوازا۔ پھر کچھ عرصے بعد جب وزیر اعظم سعد اللہ خان انتقال کر گیا تو شاہ جہاں نے میر جملہ کو وزیر اعظم بنا دیا)

"شاہِ والا ہیں تو اپنی مملکت میں۔ مگر آج کی رات فضا بدل گئی ہے۔" میر جملہ نے عرض کیا۔

"اس فضا کو بدلنے میں استاد عیسیٰ کا ہاتھ ہے۔" شاہ جہاں نے تاج محل کے معمار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آگرے کی پتھریلی زمین پر ایسا خواب ناک اور ریشم و گل جیسا منظر پیش کرنا بہت دشوار تھا مگر عیسیٰ نے اسے آسان بنا دیا۔ بے شک! یہ رات عام راتوں سے مختلف ہے۔"

(سینکڑوں سال گزرنے کے بعد آج بھی اس رات کی وہی اہمیت برقرار ہے۔ تاج محل کے حوالے سے اکتوبر کے مہینے میں آنے والی چاند کی چودھویں رات کو مون لائٹ کہا جاتا ہے اور اس دلفریب اور جاں پرور منظر کو دیکھنے کے لئے دنیا کے گوشے گوشے سے ہزاروں سیاح آگرہ آتے ہیں۔ اس رات تاج محل جس قدر حسین نظر آتا ہے، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا)

"میری محنت ٹھکانے لگی شاہِ والا! بس اب یہ غلام رخصت چاہتا ہے۔" اتنا کہہ کر عیسیٰ شیرازی زمین پر بیٹھ گیا۔ "شہنشاہِ معظم! گستاخی معاف۔ اب یہ غلام اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔"

"تم بیٹھ جاؤ عیسیٰ!" شاہ جہاں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہاری طبیعت خراب ہے۔ ہم نے تمہیں پہلے بھی چلنے پھرنے سے منع کیا تھا۔"

"میری سانس گھٹ رہی ہے۔" اچانک عیسیٰ شیرازی اپنے سینے کو مسلنے لگا۔

"درباری طبیب کو بلایا جائے۔" شاہ جہاں نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں شاہِ والا!..... اب اس کا..... وقت نہیں ہے۔" یہ کہتے کہتے عیسیٰ شیرازی فرش پر لیٹ گیا۔ "میری زندگی کا سفر ختم ہونے والا ہے۔ بس آپ میرے قریب رہیے۔"

شاہ جہاں، عیسیٰ شیرازی پر جھک گیا۔ "تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"میں ایک ادنیٰ انسان تھا، جسے حضورِ والا نے بڑے اعزاز سے شرف یاب کیا۔" عیسیٰ شیرازی پوری طاقت سے بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی اس کی آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "شہنشاہ نے میرے ناتواں کاندھوں پر جن بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ

ڈالا تھا، شاید میں انہیں پورا نہیں کر سکا۔ اور کرتا بھی کیسے کہ ایک ناکارہ اور نااہل انسان تھا۔"

"نہیں عیسیٰ! یہ تمہارا انکسار ہے۔" شاہ جہاں درمیان میں بول اُٹھا۔ "تم نے اپنے فن کا بھی حق ادا کر دیا اور ہماری خدمت گزاری کا بھی۔ صرف ہم ہی نہیں، تاج محل کو دیکھنے والا کوئی شخص بھی تمہاری خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔"

"شاہِ والا!" عیسیٰ شیرازی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس دوران صبح و شام میرے وطن شیراز سے آنے والی ہوائیں سرگوشیاں کرتی تھیں کہ عیسیٰ! تجھے تیرے شہر کی گلیاں یاد کرتی ہیں، بچپن کے ساتھی آواز دیتے ہیں، عزیز و اقارب بلاتے ہیں، کچھ دن کے لئے آ جا کہ ماضی کے ٹوٹے ہوئے رشتے ایک بار پھر زندہ ہو جائیں۔"

"تم نے ان ہواؤں کو کیا جواب دیا؟" شاہ جہاں اچانک اُداس نظر آنے لگا تھا۔

"میں نے ان ہواؤں سے کہہ دیا کہ ابھی منزلِ فراق ختم نہیں ہوئی ہے۔" یہ کہتے کہتے عیسیٰ شیرازی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "میں ابھی اپنے وطن واپس نہیں آ سکتا۔ ابھی میرے فن کو میری ضرورت ہے۔ ابھی تاج محل مکمل کہاں ہوا ہے؟ ابھی میری تخلیق کو میرا کچھ اور خون درکار ہے۔ اگر جسم میں چند قطرے بچ گئے تو میں یارانِ وطن کو دیکھنے کے لئے ایک دن ضرور آؤں گا..... مگر شاہِ والا! اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں آگرہ چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکوں گا۔ میرے دل میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ طبیبوں نے بہت دن پہلے کہہ دیا تھا کہ یہ بیماریٔ دل ہے۔ اگر اسی طرح شب و روز کام کرتے رہے تو ایک دن تمہارا کام تمام ہو جائے گا۔ میں طبیبوں کا مشورہ کیسے مان لیتا؟ اور وطن سے آنے والی ہواؤں کا پیغام کس طرح سن لیتا کہ اس وقت شہنشاہ کے خواب کی تعبیر بہت دھندلی تھی۔"

"تم نے یہ سب باتیں ہمیں پہلے کیوں نہیں بتائیں؟" شاہ جہاں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"میں تاج محل میں رنگ بھرنا چاہتا تھا، اپنے خون کا رنگ....." عیسیٰ شیرازی کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ "شہنشاہ گواہ رہیں کہ میں نے اپنے خون کے آخری قطرے کا رنگ بھی تاج محل میں بھر دیا۔ بس غلام کے بدن میں اتنا ہی لہو تھا۔ اگر چند قطرے اور ہوتے تو وہ بھی اپنے آقا کی نذر کر جاتا۔"

یہ کہہ کر عیسیٰ شیرازی خاموش ہو گیا۔ وہ تیز تیز سانسیں لے رہا تھا اور اس کے بولنے کی طاقت ختم ہوتی جا رہی تھی۔

پھر بڑی مشکل سے عیسیٰ شیرازی نے یہ الفاظ ادا کئے۔

"میں بہت خوش نصیب ہوں کہ اپنی تخلیق کی آغوش میں مر رہا ہوں۔"

"عیسیٰ! تم ابھی نہیں جاؤ گے۔" تاج محل کے معمار کو مرتے دیکھ کر شاہ جہاں بے قرار ہو گیا تھا۔

"شاہِ والا! میں نے اپنا سارا کام اپنے شاگردِ خاص، محمد شریف کو سمجھا دیا ہے۔" عیسیٰ شیرازی کی آواز بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ شاہ جہاں جھک کر اس کی بات سننے لگا۔ "محمد شریف میرا شاگرد ہے۔ وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔"

شاہ جہاں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ عیسیٰ شیرازی اچانک زور سے چیخا۔

"شہنشاہ معظم ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں زندہ باد..... سلطنتِ مغلیہ پائندہ باد۔"

دل کا درد انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کچھ دیر تک عیسیٰ شیرازی فرش پر تڑپتا رہا اور پھر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا اور عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ گیا۔

تاج محل کا معمار دستِ قضا کی ضرب سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

شاہ جہاں نے استاد عیسیٰ شیرازی کو شاہی اعزاز کے ساتھ دفن کرنے کا حکم دیا۔ خود شہنشاہ بھی آخری وقت تک عیسیٰ کے جنازے میں شریک رہا۔ پھر جب اس معمارِ اعظم کی قبر پر مٹی ڈال دی گئی تو لوگوں نے دیکھا کہ شاہ جہاں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ کسی شکستہ انسان کی طرح قبرستان میں کھڑا تھا۔

۞.....۞.....۞

اگرچہ تاج محل تقریباً مکمل ہو چکا تھا لیکن شاہ جہاں کو عیسیٰ شیرازی کی موت کا بہت غم تھا۔ مرنے والے نے جس جاں فشانی اور جاں سوزی سے اس یادگار عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا، اس کی مثال ملنا مشکل تھی۔ شاہ جہاں کو محسوس ہوا کہ وہ ایک بار پھر اس عالمِ فانی میں تنہا ہو گیا ہے۔ اس کے تمام جاں نثار اور غم گسار ایک ایک کر کے دنیا سے اُٹھ گئے تھے۔ بس ایک سکندر مرزا باقی رہ گیا تھا جو اس کی تنہائی کے اذیت ناک لمحوں کا شریک تھا۔

آگرے سے دارالحکومت دہلی جاتے وقت سکندر مرزا نے عرض کیا۔ "اگر شاہِ والا اجازت دیں تو میں کچھ دن آگرے میں ٹھہر جاؤں۔"

شاہ جہاں جانتا تھا کہ سکندر مرزا، آگرے میں کیوں قیام کرنا چاہتا ہے۔

سکندر مرزا نے کچھ دن پہلے ماہ رخ کو دیکھا تھا۔ موسم کی سختیوں نے حسن و دلکشی کے اس مجسمے کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ کہاں وہ بے پناہ حسن رکھنے والی نوخیز لڑکی اور کہاں یہ کمر خمیدہ بوڑھی عورت۔ سکندر مرزا اور ماہ رخ دونوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ جوانی کب آئی اور کب گزر گئی؟ سکندر مرزا خود بھی بوڑھا ہو چکا تھا لیکن ماہ رخ کے چہرے پر زیادہ ناتوانی اور ضعف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ کسی شمع کی طرح قطرہ قطرہ ہو کر پگھل رہی تھی۔

"بیس سال تک ایک قبر پر پھول چڑھاتے چڑھاتے خود بھی زندہ قبر بن کر رہ گئی ہو۔" سکندر مرزا نے ماہ رخ کی حالت دیکھ کر کہا تھا۔

"بہت دعائیں کیں کہ پتھر بن کر زمین کے کسی گوشے میں دفن ہو جاؤں مگر ابھی خدا کو منظور

نہیں تھا۔" ماہ رخ نے نظریں جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "آپ کیسے ہیں؟"

سکندر مرزا حیران رہ گیا۔ آج زندگی میں پہلی بار ماہ رخ نے اس کا حال پوچھا تھا۔ "بس کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

"گھر والے کیسے ہیں؟" ماہ رخ نے دوسرا سوال کیا تھا۔

"کون گھر والے؟..... ماں باپ اور قریبی عزیز تو کبھی کے مر چکے ہیں اور تم بھی یہ بات بخوبی جانتی ہو۔" سکندر مرزا کے لہجے سے کسی قدر تلخی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"میں آپ کے بیوی بچوں کے متعلق دریافت کر رہی ہوں۔" ماہ رخ نے ایک نظر سکندر مرزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہارے پاس میرے لئے ایک لمحہ بھی نہیں ہے؟" سکندر مرزا نے اُداس لہجے میں پوچھا۔

"کیسا لمحہ؟" ماہ رخ نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ لمحہ، جس میں تم مجھ سے کوئی خوش گوار، کوئی اچھی بات کر سکو۔" سکندر مرزا کی آواز سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔

"آخر میرے سوال میں ایسی کون سی برائی پوشیدہ ہے جس نے آپ کو اذیت پہنچائی ہے؟" ماہ رخ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم خوب جانتی ہو کہ میں نے شادی نہیں کی۔" سکندر مرزا کے لہجے کی تلخی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ "اور میں شادی کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر تمہیں تو نشتر زنی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ جب چاہتی ہو، دل کے زخم کھرچ ڈالتی ہو۔"

"جسے اپنا ہوش نہ ہو، اسے دنیا والوں کی خبر کس طرح مل سکتی ہے؟" یکایک ماہ رخ کا لہجہ سوگوار ہو گیا تھا۔ "آپ نے بتایا تو معلوم ہوا کہ میں بیس سال سے ملکۂ عالیہ کی قبر پر پڑی ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں روز و شب کا حساب بھی بھول گئی ہوں۔ آپ کے سوا کسی شخص کا نام بھی یاد نہیں رہا۔"

سکندر مرزا ایک بار پھر شدید حیرت میں ڈوب گیا۔ آج ماہ رخ عجیب و غریب باتیں کر رہی تھی۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا۔" ماہ رخ، سکندر مرزا سے مخاطب ہوئی۔ "پہلے ہی اس جانِ ناتواں پر کئی عذاب نازل ہو چکے ہیں۔ اب آپ نے ایک اور نیا عذاب نازل کر دیا۔ اب یہ خلش چین سے مرنے بھی نہیں دے گی کہ ایک شخص نے میری خاطر اپنی جوانی برباد کر لی اور دنیا کی ساری راحتوں کو ٹھکرا دیا۔ کم سے کم آپ تو مجھے سکون سے مر جانے دیتے۔" یہ کہتے کہتے ماہ رخ رونے لگی۔ "آپ نے تو میری موت کو کچھ اور مشکل بنا دیا۔"

سکندر مرزا حیران و پریشان کھڑا تھا۔ ایک عورت نے اس کی محبت کا اقرار بھی کس وقت کیا

تھا، جب سارے دلفریب موسم گزر چکے تھے اور پوری دنیا ایک خوف ناک ویرانے میں تبدیل ہو چکی تھی۔

سکندر مرزا جھکا اور اس نے اپنے رومال سے ماہ رخ کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟" ناگہاں سکندر مرزا پر ایک وحشت سی طاری ہو گئی تھی۔

"میں بہت مجبور تھی۔" ماہ رخ نے سکندر مرزا کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"آپ کے اندازوں سے بہت زیادہ مجبور۔"

"مجھے بتایا تو ہوتا کہ وہ کیسی مجبوری تھی۔" سکندر مرزا اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔

"اب اس مجبوری کو میرے ساتھ قبر میں دفن ہو جانے دیجئے۔" ماہ رخ، سکندر مرزا کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھے بہت دیر تک روتی رہی۔ "اب تو تمہیں میرے یہاں آنے سے اپنی رسوائی کا احساس نہیں ہوتا؟" سکندر مرزا نے بڑے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" ماہ رخ نے نفی میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "اب تو آپ کا چہرہ دیکھ کر زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔" ماہ رخ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ساری زندگی دنیا والوں کے خوف سے بھاگتی رہی ہو اور اب اچانک ایک محفوظ چار دیواری میں آ کر اس نے سکون کی گہری سانس لی ہو۔

"تو پھر اس مقبرے سے نکل کر میری دنیا میں چلو۔" سکندر مرزا نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔ "اگرچہ زندگی کی بہاریں بہت دُور جا چکی ہیں، لیکن ہم انہیں واپس لے آئیں گے۔"

"بہاریں ہماری دنیا سے رخصت ہی کب ہوئی تھیں۔" ماہ رخ نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلی بار اس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ "میں اس مقبرے میں رہ کر بھی آپ ہی کی دنیا میں رہتی ہوں۔ جب دلوں کی قربت حاصل ہو تو پھر کسی دوسری قربت کی ضرورت نہیں رہتی۔" ماہ رخ نے چند الفاظ میں جذبوں کی پوری داستان بیان کر دی تھی۔ "میں آپ سے زیادہ دنیا میں کسی کی عزت نہیں کرتی مگر خدا کے لئے مجھے اسی مقبرے میں پڑا رہنے دیجئے۔ اپنی محبت کو تماشا نہ بنائیے۔"

"میں جیت کر بھی ہار گیا۔" سکندر مرزا نے انتہائی اُداس لہجے میں کہا۔

"آپ فاتح ہیں اور فاتح ہی رہیں گے۔" ماہ رخ نے سکندر مرزا کی محبت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "جو دلوں کو فتح کر لیتے ہیں، وہ کبھی نہیں ہارتے۔ آپ نے میرے دل کو فتح کیا ہے۔ مفتوح تو میں ہوں۔ خدا کرے کہ آپ کے دامن تک کبھی کسی شکست کا غبار نہ آئے۔"

"یہ کیسی فتح ہے ماہ رخ! کہ میں دنیا والوں کے سامنے تمہیں اپنا نہیں کہہ سکتا۔" سکندر مرزا بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

"یہی تو محبت کی رسوائی ہے کہ دنیا والوں کے سامنے اس کا اظہار کیا جائے۔" ماہ رخ نے

سر جھکائے ہوئے کہا۔

سکندر مرزا نے بہت چاہا کہ ماہ رخ، تاج محل کے ایک حجرے سے نکل کر اس کی دنیا میں چلی آئے۔ مگر ماہ رخ اپنے حصار سے باہر نہیں نکلی۔ یہاں تک کہ شاہ جہاں کی روانگی کا دن آ گیا۔

سکندر مرزا اس نئے انقلاب کے بعد دہلی جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ دن آگرے میں رہ کر ماہ رخ کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دے گا۔ مگر شاہ جہاں نے یہ کہہ کر سارے راستے بند کر دیئے۔

"اب تمہارے سوا میرا کون ہے؟" شہنشاہ نے اس قدر شکستہ لہجے میں کہا کہ سکندر مرزا نے سر جھکا دیا۔ "تم خوب جانتے ہو کہ میرے سارے رفیق اور غم گسار دنیا سے اُٹھ گئے۔ بس ایک تم رہ گئے ہو، جس سے اپنے دل کی بات کہہ لیتا ہوں..... کیا تم بھی یہ چاہتے ہو کہ تمہارا شہنشاہ اس عالمِ تنہائی میں دیواروں سے باتیں کرتا رہے؟"

سکندر مرزا، شاہ جہاں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکا اور خاموشی کے ساتھ شہنشاہ کے ہمراہ دہلی چلا گیا۔

❀.....❀.....❀

دہلی پہنچتے ہی سیاست کے وہی ہنگامے شروع ہو گئے۔

اگرچہ داراشکوہ، قلعۂ قندھار کے محاصرے کی مہم میں ناکام ہو چکا تھا مگر شاہ جہاں کے نزدیک اس کی محبوبیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دارا کی گورنری بھی سب سے زیادہ زرخیز اور اچھے علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ شاہ جہاں نے اپنے محبوب بیٹے کو کئی خطابات اور عہدوں سے بھی نوازا تھا۔ اب کی بار دہلی پہنچتے ہی شاہ جہاں نے داراشکوہ پر ایک اور کرم فرمایا اور اُسے تخت کا وارث بھی نامزد کر دیا۔

شہنشاہ کے اعلان کو تینوں شہزادوں مراد، شجاع اور اورنگ زیب نے ناپسندیدگی کے ساتھ سنا۔

شہزادہ مراد اور شجاع نے تو غصے میں یہاں تک کہہ دیا۔

"شاہ بابا کی آنکھوں کی بینائی زائل ہو چکی ہے..... انہیں دارا کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

اورنگ زیب نے تخت کی وراثت کے اعلان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ دکن کے علاقے کو مکمل طور پر تسخیر کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اورنگ زیب نے اپنے لڑکے، شہزادہ محمد کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر "گولکنڈہ" کا محاصرہ کر لے۔ شہزادہ محمد نے شدید حملے کر کے حیدر آباد پر قبضہ کر لیا۔ اس موقع پر سلطانِ گولکنڈہ نے شہزادہ محمد کو بھاری رشوت دینے کی کوشش کی..... اس کا خیال تھا کہ یہ سولہ سترہ سال کا لڑکا سونے اور چاندی کے ذخیرے دیکھ کر بہک جائے گا۔

مگر شہزادہ محمد، اورنگ زیب جیسے درویش کا بیٹا تھا۔ اس نے سلطانِ گولکنڈہ کی پیشکش کو انتہائی حقارت کے ساتھ ٹھکراتے ہوئے کہا۔

"اگر ساری دنیا کی دولت بھی میرے قدموں میں ڈھیر کر دی جائے تو میں اسے قبول نہیں کروں گا۔ اس وقت میں صرف اپنے والد محترم کے حکم کا پابند ہوں۔ اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں محاذِ جنگ پر اپنی جان دے دوں یا دشمن کو شہنشاہ شاہ جہاں کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دوں۔"

سلطانِ گولکنڈہ، عبداللہ قطب شاہ اس کم سن سپہ سالار کے کردار سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔

داراشکوہ اس موقع پر بھی اورنگ زیب کو نیچا دکھانے کے لئے احمقانہ چالیں چل رہا تھا۔ اس نے شہنشاہ سے سفارش کی تھی کہ گولکنڈہ کا محاصرہ اُٹھا کر سلطان عبداللہ قطب شاہ کو معاف کر دیا جائے۔ شاہ جہاں نے داراشکوہ کی باتوں میں آ کر یہ حکم بھی جاری کر دیا تھا مگر جواب میں اورنگ زیب نے شہنشاہ کو ایک خط تحریر کیا۔

"شہنشاہِ معظم! میرے اس عمل کو گستاخی و نافرمانی سے تعبیر نہ کریں۔ میں عبداللہ شاہ قطب سے اس وقت تک جنگ جاری رکھوں گا، جب تک ریاست گولکنڈہ مکمل طور پر مغل سلطنت میں شامل نہ ہو جائے۔"

یہ خط لکھ کر فروری 1656ء میں اورنگ زیب خود بھی گولکنڈہ پہنچ گیا۔ مغل افواج نے پے در پے شدید حملے کر کے سلطان عبداللہ قطب شاہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ آخر والیٔ گولکنڈہ نے اپنی ماں کو اورنگ زیب کی خدمت میں اطاعت و فرمانبرداری کا پیغام دے کر بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ وہ شہزادہ محمد کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ طے کرنا چاہتا ہے۔ اورنگ زیب کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے اس رشتے کی منظوری دے کر شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ نے اپنی لڑکی کے جہیز میں تقریباً بارہ لاکھ روپے کے جواہرات دیئے۔

اس کے بعد جو معاہدہ ہوا، اس میں سلطان نے حلف اٹھاتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

"میں ہمیشہ مغل سلطنت کا مطیع و فرمانبردار رہوں گا۔"

اس معاہدے کے بعد سلطان کو اس کے علاقے واپس کر دیئے گئے۔

اس دوران داراشکوہ اور جہاں آراء مسلسل باپ کے کان بھر رہے تھے اور شاہ جہاں کو اورنگ زیب کے ظلم و ستم کی من گھڑت داستانیں سنا رہے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جہاں آراء بھی سیاست کی اس جنگ میں داراشکوہ کا ساتھ دے رہی تھی۔ آخر شاہ جہاں نے نہایت سخت الفاظ میں لکھا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر گولکنڈہ سے چلا آئے۔

اورنگ زیب نے انتہائی مجبوری کے عالم میں فرمانِ شاہی پر عمل کیا اور بادلِ نخواستہ گولکنڈہ سے چلا آیا۔ داراشکوہ کو شہزادہ محمد کی شادی سے بہت تکلیف پہنچی تھی وہ سمجھ رہا تھا کہ اس طرح

دکن کے علاقے میں اورنگ زیب کے اقتدار کی جڑیں زیادہ مضبوط ہو جائیں گی۔ نتیجتاً داراشکوہ نے یہ نئی چال چلی اور اورنگ زیب کو گولکنڈہ چھوڑنا پڑا۔

❀.....❀.....❀

اسی زمانے میں ریاست بیجاپور کی طرف سے ایک نیا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اگرچہ بیجاپور اور مغل سلطنت کے درمیان دوستانہ مراسم قائم تھے لیکن سلطانِ بیجاپور، شاہ جہاں کو کسی قسم کا خراج ادا نہیں کرتا تھا۔ ایک دن شاہی جاسوسوں نے شاہ جہاں کو یہ خبر دی کہ بیجاپور کا سلطان، عادل شاہ اپنے لباس اور دربار کی رونق کے اعتبار سے شہنشاہ کے برابر نظر آتا ہے۔ وہ شاہ جہاں کے انداز میں دربار لگاتا ہے اور اسی طرح لوگوں کو مختلف خطابات سے نوازتا ہے۔

شاہ جہاں کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے عادل شاہ کو تنبیہہ کرتے ہوئے لکھا۔

''اپنے بزرگوں کی روش پر قائم رہو اور شاہ جہاں بننے کی کوشش نہ کرو ورنہ تمہیں سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

پھر جب سلطان عادل شاہ کو خبر ملی کہ اورنگ زیب کا لشکر، حملے کے لئے تیار کھڑا ہے تو اس نے معافی نامہ تحریر کیا اور شاہ جہاں کو یقین دلایا کہ وہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔

4 نومبر 1656ء کو سلطان عادل شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا، علی عادل شاہ ثانی اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشیں ہوا۔ علی عادل شاہ کے تخت نشیں ہوتے ہی چاروں طرف سازشوں کا جال پھیل گیا اور بعض علاقوں میں بغاوت کے آثار نظر آنے لگے۔

اورنگ زیب نے فوری طور پر شاہ جہاں کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور بیجاپور کے معاملات میں مداخلت کی اجازت مانگی۔ اگرچہ داراشکوہ اس سلسلے میں بھی اورنگ زیب کی مخالفت کر رہا تھا لیکن شاہ جہاں نے خلافِ توقع اورنگ زیب کو اجازت دے دی کہ وہ جو مناسب سمجھے، اس پر عمل کرے۔

اجازت ملتے ہی اورنگ زیب نے بیجاپور کی مکمل تسخیر کا فیصلہ کر لیا۔ اس کام کے لئے اس نے مالوہ سے فوج طلب کی۔ مزید یہ کہ وزیراعظم میر جملہ بھی ایک کثیر فوج لے کر اورنگ زیب کے پاس پہنچ گیا۔

اورنگ زیب نے سب سے پہلے ''بدار'' کے مضبوط قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس قلعے کی فصیل کے ساتھ ساتھ پچیس گز گہری خندق کھدی ہوئی تھی۔ قلعے کے اندر بڑی مقدار میں اسلحہ موجود تھا..... اسی لئے بیجاپور کے قلعے کو ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ قلعے کا انتظام ایک تجربہ کار افسر، مرجان کے ہاتھ میں تھا..... اورنگ زیب نے حملے سے پہلے مختلف مقامات کا جائزہ لیا۔ ابھی

حملہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ قلعے کے محافظوں نے اندر سے گولہ باری کا آغاز کر دیا۔ بیجاپور کے نگہبانوں کا خیال تھا کہ آگ کی بارش مغلوں کو آگے بڑھنے سے روک دے گی۔ مگر اورنگ زیب کے سپاہیوں نے اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال کر قلعے کی فصیل تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

مغل فوجیوں نے جگہ جگہ سے خندقیں بھر دی تھیں جس کے نتیجے میں شاہی لشکر کی یلغار کو روکنا ناممکن تھا۔ آخر ایک خون ریز جنگ کے بعد اورنگ زیب کو فتح حاصل ہوئی۔ بیجاپور کے نگراں افسر، مرجان نے بڑی بے جگری سے مغلوں کا مقابلہ کیا مگر وہ اس کشمکش میں شدید زخمی ہوا اور پھر زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا۔ مرجان کی موت کے بعد اس کے لڑکے، قلعے کی چابیاں لے کر اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

اورنگ زیب فاتحانہ انداز کے ساتھ شہر میں داخل ہوا اور پھر شاہ جہاں کے نام پر پہلی بار بہمنی تاریخی مسجد میں خطبہ پڑھا گیا۔

اس کے بعد اورنگ زیب نے ایک خط کے ذریعے باپ کو اس فتح کی خبر دیتے ہوئے تحریر کیا۔

''اس خادم نے اس قلعے پر بھی شاہِ والا کی عظمتوں کا پرچم لہرا دیا، جو اپنی مضبوطی کے اعتبار سے ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔''

شاہ جہاں نے بڑی مسرت کے ساتھ اپنے بیٹے کا یہ خط پڑھا مگر داراشکوہ کو اورنگ زیب کی یہ فتح بہت ناگوار گزری تھی۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور داراشکوہ، اورنگ زیب کے خلاف نئی سازشیں کرتا رہا۔

یہاں تک کہ ستمبر 1657ء میں شاہ جہاں پر شدید بیماری کا حملہ ہوا اور پھر ملک کے طول و عرض میں یہ بات پھیل گئی کہ شہنشاہ کا انتقال ہو چکا ہے۔

ہر طرف یہ خبریں گشت کر رہی تھیں کہ شہنشاہ انتقال کر چکا ہے یا پھر نزع کے عالم میں گرفتار ہے۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ شاہ جہاں نے آٹھ دن سے رزق کا ایک دانہ بھی نہیں کھایا تھا۔ کمزوری اس قدر غالب آ گئی تھی کہ وہ اپنے بستر سے اُٹھ کر غسل خانے تک نہیں جا سکتا تھا۔

شاہ جہاں کی اس ناتوانی کو لوگوں نے نزع کی کیفیت سمجھا اور بعض فتنہ پردازوں نے یہ خبر اُڑا دی کہ ہندوستان کا حکمراں مر چکا ہے۔

الغرض آٹھ دن تک شدید تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد شاہ جہاں اس قابل ہوا کہ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ سکے۔ داراشکوہ ہر وقت باپ کے نزدیک رہتا تھا۔ شاہ جہاں کی طبیعت قدرے سنبھلی تو دارا نے عرض کیا۔

''حضورِ والا! ملک میں عجیب عجیب افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ خاکم بدن یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ عزت مآب کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ اذیت ناک افواہ سن کر رعایا میں وحشت ناک بے چینی

پھیل گئی ہے۔ اس لئے شہنشاہِ معظم پر لازم ہے کہ جھروکے میں تشریف لے چلیں اور بے قرار رعایا کو اپنا دیدار کرا کے تمام افواہوں کا خاتمہ کر دیں۔"

داراشکوہ کی زبانی یہ باتیں سن کر شاہ جہاں کو شدید تکلیف پہنچی۔

"کیا لوگ ہمارے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں؟" شاہ جہاں کے لہجے میں بڑا کرب شامل تھا۔

"لوگوں کو شاہِ والا کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں صرف اقتدار چاہئے۔" ایسے نازک موقع پر بھی داراشکوہ اپنے بھائیوں کی شکایت کرنے سے باز نہیں رہا۔

شاہ جہاں نے بڑی مایوس نظروں سے کمرے کی چھت کی طرف دیکھا اور ایک آہِ سرد کھینچتے ہوئے کہا۔ "اے زمانے! تجھ پر افسوس ہے۔"

پھر وہ آہستہ آہستہ اپنے بستر سے اُٹھا اور تھکے قدموں کے ساتھ جھروکے تک آیا۔

عوام نے اپنے حکمراں کو اس حالت میں دیکھا تو بے اختیار نعرے بلند کئے۔

"شہنشاہِ معظم زندہ باد..... سلطنتِ مغلیہ پائندہ باد۔"

شاہ جہاں نے لرزتے ہاتھوں سے رعایا کے نعروں کا جواب دیا اور کچھ دن تک جھروکے میں کھڑے رہ کر لوگوں کو یقین دلاتا رہا کہ ان کا شہنشاہ ابھی زندہ ہے۔

اس کے بعد شاہ جہاں نے داراشکوہ پر اپنی عنایتوں کے دریا بہا دیئے۔ بڑے شہزادے کو ترقی دے کر پچاس ہزار ذات اور چالیس ہزار سوار کا منصب عطا فرمایا۔ مغل سلطنت میں یہ سب سے بڑا اعزاز تھا۔ اس کے علاوہ داراشکوہ کا وظیفہ پچاس لاکھ روپے سالانہ مقرر کر دیا گیا۔

پھر 28 اکتوبر 1657ء کو شاہ جہاں تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے آگرہ روانہ ہو گیا۔

15 نومبر 1657ء کو آگرہ سے تین کوس دُور دریائے جمنا کے "سامی گھاٹ" پر شاہی سواری اُتری۔ شاہ جہاں نے یہاں دس روز قیام کیا۔ اس دوران مسلسل نگہداشت کے سبب شہنشاہ کی صحت بہت تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔

پھر جب جسمانی کمزوری ختم ہو گئی تو شاہ جہاں کشتی کے ذریعے "سامی گھاٹ" سے روانہ ہو کر آگرہ پہنچا اور شہزادہ داراشکوہ کی حویلی میں قیام کیا۔ اہلِ شہر اپنے شہنشاہ کے استقبال کے لئے دریا کے دونوں کناروں پر صف بستہ کھڑے تھے۔

نو دن بعد شاہ جہاں کی سواری قلعہ آگرہ میں داخل ہوئی اور 30 دسمبر 1657ء کو پیر کے دن قلعے میں شاہ جہاں کی 69 ویں قمری سالگرہ کا جشن منایا گیا۔ اس موقع پر ایسی انجمن آرائی ہوئی کہ لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ دیکھنے والوں نے آج تک ایسی با رونق محفل نہیں دیکھی تھی۔

جشنِ صحت کے خاتمہ پر شاہ جہاں ایک بار پھر داراشکوہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے بھری محفل میں علی الاعلان کہا۔

"بیماری کے دوران میرے اس بیٹے نے جس طرح اپنے باپ کی خدمت کی ہے، اسے عبادت کا درجہ دینا چاہئے۔ میں دارا کی محبت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں تمام امراء کو حکم دیتا ہوں کہ وہ دارا کے ہاتھ پر بیعت کریں اور دارا ہی میرے اقتدار کا جانشین ہے اور وہی تختِ شاہی کا وارث ہے۔"

درباری امراء سر جھکائے کھڑے تھے۔ شہنشاہ کے اس حکم کے بعد تمام امراء ایک ایک کر کے آگے بڑھے اور داراشکوہ کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ کر با آواز بلند ایفائے عہد کی قسمیں کھانے لگے۔

اس وقت داراشکوہ کی خوشی ناقابلِ بیان تھی۔ مغل شہزادے کا چہرہ جوشِ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ تصورات کی دنیا میں سارے ہندوستان کو اپنے آگے سجدہ ریز دیکھ رہا تھا۔

اس بیعت کے بعد شاہ جہاں نے داراشکوہ کو خلعتِ خاص کے ساتھ ایک کروڑ روپے بھی عطا فرمائے۔ پھر عنایات کا سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ شاہ جہاں نے موتیوں کی وہ مالا بھی دارا کو بخش دی، جو اکثر شہنشاہ کے گلے میں پڑی رہتی تھی۔ موتیوں کے اس ہار کی قیمت تیس لاکھ روپے تھی۔

امراء اب سمجھ چکے تھے کہ مستقبل کا شہنشاہ داراشکوہ ہے اس لئے سب نے دارا کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیا۔

اس موقع پر شاہ جہاں نے داراشکوہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"فرزند! تم پر لازم ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ ہر حال میں اپنے مالک کی رضا کا خیال رکھو۔ رعایا کے ساتھ نرمی اور فوج کے ساتھ دلجوئی سے پیش آؤ۔"

اگرچہ شاہ جہاں اپنے تمام بیٹوں میں داراشکوہ کو محبوب رکھتا تھا لیکن پھر بھی اس کی دلی خواہش تھی کہ چاروں بھائیوں میں اتحاد اور محبت کا رشتہ برقرار رہے۔ وہ اکثر داراشکوہ سے کہا کرتا تھا۔

"فرزند! اپنے چھوٹے بھائیوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کرنا۔ اگر تم چاروں متحد رہے تو پھر تمہارے اقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔"

داراشکوہ وقتی طور پر باپ کے سامنے سر جھکا دیتا تھا لیکن دل سے وہ اپنے کسی بھائی کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ دارا کی عین خواہش تھی کہ کسی طرح تینوں بھائی آپس میں ٹکرا کر ختم ہو جائیں اور اس کے اقتدار کی راہ میں کوئی کانٹا یا پتھر باقی نہ رہے۔

⊛.....⊛.....⊛

شاہ جہاں کی دارالحکومت سے آگرہ روانگی اور طویل بیماری نے مسائل کو مزید اُلجھا دیا۔ شاہ جہاں چاہتا تھا کہ دکن اور دوسرے دُور افتادہ علاقوں میں امن و امان برقرار رکھنے

کے لئے ہر بات کی صحیح اطلاع پہنچتی رہے۔ مگر دارا نے ڈاک کی ترسیل بند کر دی اور دوسرے شہزادوں کے وکیلوں کو قید میں ڈال دیا۔ دارا کی اس حرکت سے ملک کا نظم و نسق تباہ ہو گیا اور فتنہ و فساد کے نئے دروازے کھل گئے۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فساد برپا کرنے والوں نے جھوٹی سچی خبریں، شہزادوں کو بھیجنا شروع کر دیں اور ان لوگوں نے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

شاہ جہاں کی بیماری کے دوران شہزادہ مراد نے اپنے وزیر علی نقی کو قتل کر کے ''سورت'' پر حملہ کر دیا اور فوراً بعد اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر کے احمد آباد، سورت اور کمبیر میں اپنے نام کے سکے جاری کر دیئے۔ شہزادہ مراد اس وقت گجرات کا گورنر تھا۔

دوسری طرف شہزادہ شجاع، بنگال کا حاکم تھا۔ اسے شہنشاہ کی بیماری کی خبر ملی تو اس نے اپنی فوجوں کو دارالحکومت کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔

داراشکوہ اس وقت تک خاموش تھا۔ اگرچہ تمام درباری امراء نے شہنشاہ کے حکم کے آگے سر جھکاتے ہوئے دارا کو تخت کا وارث تسلیم کر لیا تھا لیکن درپردہ کچھ امراء، دارا کے خلاف تھے۔ اس طرح دربارِ شاہی میں بھی سازشوں کا جال پھیلتا چلا گیا تھا۔

شاہ جہاں کی علالت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دارا نے وزیراعظم میر جملہ کو الگ کر کے ''پارندہ'' پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ داراشکوہ کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے شہزادہ مراد کا خاتمہ کرے اس کے بعد شہزادہ شجاع کو ٹھکانے لگائے اور پھر آخر میں اورنگ زیب سے نجات حاصل کرے۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ اورنگ زیب ہی سے تھا۔ لہٰذا دارا نے اورنگ زیب کو زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اسی دوران وہ تمام فوجیں جو بیجاپور کی مہم پر روانہ کی گئی تھیں، واپس مرکز میں طلب کر لی گئیں۔ اس کے علاوہ داراشکوہ نے ''برار'' کا علاقہ اورنگ زیب سے لے کر شہزادہ مراد کو اس لئے منتقل کرنے کی کوشش کی تھی کہ دونوں کے درمیان پھوٹ پڑ جائے۔

پھر جب شہنشاہ صحت یاب ہوا تو اسے دو افسوس ناک خبریں ملیں۔ پہلی یہ کہ شہزادہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر چکا ہے اور علاقہ گجرات کی تمام مسجدوں میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا ہے۔

یہ خبر سن کر شاہ جہاں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہندوستان میں بیک وقت دو خطبوں کی گونج سنائی دے۔ شاہ جہاں غضب ناک لہجے میں بول رہا تھا۔

''ابھی ہم زندہ ہیں اور ہماری زندگی میں مراد کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دے۔''

اس موقع پر داراشکوہ، شہنشاہ کے قریب موجود تھا۔ اس نے شاہ جہاں کی نفرت میں اضافہ کرنے کے لئے انتہائی شاطرانہ انداز سے عرض کیا۔

''اگر شاہِ والا حکم دیں تو مراد کو اس گستاخی کی عبرت ناک سزا دی جائے اور اس کا اٹھا ہوا سر دوبارہ حضورِ والا کے قدموں میں جھکا دیا جائے۔''

شاہ جہاں نے بمشکل اپنے غصے کو ضبط کیا اور دوسری تکلیف دہ خبر سننے لگا۔ شاہی پرچہ نویسوں نے شہنشاہ کو بتایا۔

''شہزادہ شجاع، بنگال کے مقامی زمین داروں سے مل کر بغاوت پر آمادہ ہو چکے ہیں اور مرکز کے خلاف بھرپور جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

''کیا ان دونوں کے خیال میں شہنشاہ مر چکا ہے جو وہ اس طرح اپنی اپنی خودمختاری کا اعلان کر رہے ہیں؟'' شاہ جہاں نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

''وہ تو بہت دن سے انتظار کر رہے تھے کہ کوئی موقع میسر آئے تو وہ اپنی گردنوں سے شہنشاہ کا طوقِ فرمانبرداری اُتار پھینکیں۔'' داراشکوہ بڑی ہوشیاری سے شاہ جہاں کے غصے کی چنگاریوں کو ہوا دے رہا تھا تاکہ یہ دبی دبی چنگاریاں بھڑکتا ہوا شعلہ بن جائیں اور پھر ان شعلوں میں شہزادہ شجاع اور شہزادہ مراد کا وجود جل کر خاکستر ہو جائے۔

اس موقع پر حکومت کے بعض ہمدرد امراء نے جھکی ہوئی گردنوں کے ساتھ عرض کیا۔

''اگر شاہِ والا مناسب سمجھیں تو دونوں شہزادوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا مظاہرہ کریں۔ شاہی قاصدوں کو بھیج کر شہزادہ مراد اور شہزادہ شجاع کو صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ شہزادے ہوش مندی سے کام لے کر دوبارہ حلقۂ اطاعت میں شامل ہو جائیں گے۔''

ایک وزیر نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ ''شہنشاہِ معظم! یہ سب کچھ دشمنوں کی فتنہ انگیزیوں کا نتیجہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ دونوں شہزادے حلقۂ اطاعت سے باہر جا چکے ہیں اور انہوں نے اپنے عہد توڑ دیئے ہیں۔ شاہِ والا بہت احتیاط کے ساتھ معاملات کی تحقیق کرائیں۔

ابھی دربار میں اس وزیر کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ داراشکوہ نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔

''تحقیق کا وقت گزر چکا اور شہزادوں کی بغاوت ثابت ہو چکی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انہیں ان کی نافرمانی کی سخت ترین سزا دی جائے۔'' داراشکوہ باپ کی موجودگی میں اس طرح بول رہا تھا کہ جیسے وہ مکمل طور پر شاہانہ اختیارات رکھتا ہو۔

امراء نے آخری دم تک کوشش کی کہ شاہ جہاں، مراد اور شجاع کے سلسلے میں مشفقانہ سلوک روا رکھے مگر شہنشاہ، داراشکوہ کے فیصلے کے آگے مجبور تھا۔ اراکینِ سلطنت کو پہلی بار محسوس ہوا کہ مغل حکمراں اپنے بیٹے کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی بن چکا ہے۔ بالآخر وہی ہوا، جو داراشکوہ چاہتا تھا۔

داراشکوہ کے بڑے بیٹے سلیمان شکوہ کو بیس ہزار سوار اور دس ہزار پیادوں کا لشکر دے کر

شہزادہ شجاع کی سرکوبی کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ اس جنگی مہم میں راجہ جے سنگھ، سلیمان شکوہ کے اتالیق (استاد) کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ شاہی لشکر میں ہزاروں ماہر توپچی اور سینکڑوں ہاتھی بھی شامل تھے۔ جنگی تیاریوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مقابلہ شہزادہ شجاع کے بجائے حکومت کے کسی بدترین دشمن سے ہے۔ داراشکوہ نے اس موقع پر یہ اعلان بھی کیا تھا کہ فاتح لشکر کو بڑے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔

شہزادہ شجاع ایک اچھا منتظم ضرور تھا لیکن عیش پرستی اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ وہ اس وقت بنارس میں خیمہ زن تھا۔ جنگ سے پہلے راجہ جے سنگھ اور شہزادہ شجاع کا آمنا سامنا ہوا۔

''شہزادے! تم کس لئے دارالحکومت پر یلغار کرنا چاہتے ہو؟'' راجہ جے سنگھ نے شجاع سے پوچھا۔

''میں شاہِ والا کو قید سے رہائی دلانا چاہتا ہوں۔'' شجاع نے سخت لہجے میں کہا۔

''کیسی قید؟'' راجہ جے سنگھ نے دوسرا سوال کیا۔

''شاہِ والا، داراشکوہ کی قید میں ہیں اور ان کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہے۔'' شجاع نے بلند آواز میں کہا۔ ''میں نے صرف شہنشاہ کو بچانے کی خاطر اپنی شمشیر بے نیام کی ہے۔''

''شہنشاہ کسی کی قید میں نہیں۔ وہ ہر طرح خیر و عافیت سے ہیں۔'' راجہ جے سنگھ نے شجاع کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اپنے ارادوں سے باز آ جاؤ اور اپنا عہدہ دوبارہ سنبھال لو تو تمہیں نہ صرف معاف کر دیا جائے گا بلکہ بہار کا علاقہ بھی تمہاری تحویل میں دے دیا جائے گا۔''

شہزادہ شجاع نے راجہ جے سنگھ کی بات ماننے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں ایک خوفناک جنگ چھڑ گئی۔

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ جے سنگھ نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ شہزادہ شجاع پر اس وقت حملہ کیا گیا جب وہ اپنے خیمے میں سویا ہوا تھا۔ اس کے بعض معتمد افسر بھی راجہ جے سنگھ سے مل گئے تھے۔

پھر جب توپوں کی گرج اور سپاہیوں کی چیخ و پکار سے شجاع کی آنکھ کھلی تو وہ تلوار لے کر میدان میں آیا مگر وقت اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ نتیجتاً شجاع نے فرار ہونے میں ہی اپنی نجات سمجھی۔ وہ جان بچا کر کشتی میں سوار ہوا اور پٹنہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سلیمان شکوہ کی فوجوں نے شجاع کی لشکر گاہ کو خوب جی بھر کر لوٹا۔ کسی نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔ شہزادہ شجاع پٹنہ سے ہوتا ہوا راج محل پہنچا۔ پھر راج محل سے نکل کر ''مونگیر'' کی دشوار گزار گھاٹی میں پناہ گزیں ہوا۔

کچھ دن اسی طرح دربدری کے عالم میں گزارے۔ پھر شہزادہ شجاع نے شاہ جہاں کے نام ایک طویل معافی نامہ تحریر کیا۔

''شاہِ والا! میں اپنی اس حرکت پر بے حد نادم ہوں۔ میں اپنے گناہ کا اقرار کس طرح کروں کہ مجھے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ یہ میرے اپنے نفس کی سرکشی تھی یا دشمنوں کی فتنہ

انگیزی؟ بہرحال مجھ سے یہ جرم سرزد ہو گیا اور میں کچھ دیر کے لئے دنیا والوں کو باغیوں کی صف میں نظر آیا۔ مگر میرا یہ گناہ بہت عارضی تھا۔ میں اپنے جرم پہ اصرار نہیں کر رہا ہوں۔ میرا سر شرمندگی کے بوجھ سے جھکا ہوا ہے۔ اس کے برعکس حضورِ والا کا مزاج یہ ہے کہ ماضی میں بھی مجھ جیسے گناہ گاروں کو معاف کرتے رہے ہیں۔ میں شہنشاہِ معظم کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میری طرف سے کسی نافرمانی اور کسی ناپسندیدہ حرکت کا ارتکاب نہیں ہوگا۔''

شاہِ والا کے رحم کا طلب گار

گناہ گار شجاع

شجاع کا خط پڑھ کر شاہ جہاں کے آنسو نکل آئے۔ اُس کا ایک بیٹا ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا اور دوسرا مجرموں کی طرح منہ چھپائے دربدر ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔ داراشکوہ نے بہت کوشش کی کہ اس کا چھوٹا بھائی شجاع ہمیشہ کے لئے بارگاہِ شاہی میں معتوب قرار پائے مگر بیٹے کا خط پڑھ کر باپ کی محبت نے جوش مارا اور پہلی بار شاہ جہاں نے داراشکوہ کی درخواست کو رد کرتے ہوئے کہا۔

''شجاع راہِ راست پر آ گیا ہے۔ اب ہمارے پاس اُسے سزا دینے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ ہم اپنی زندگی میں یہ کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ ہمارا ایک بیٹا مجرموں اور بھکاریوں کی طرح زیست بسر کرے۔''

باپ کا فیصلہ سن کر داراشکوہ کا چہرہ اُتر گیا۔

اور اس کے ساتھ ہی شجاع کا قصور معاف کر کے اسے دوبارہ بنگال کی گورنری پر بحال کر دیا گیا۔

۞.....۞.....۞

شاہ جہاں زندگی کی تلخیوں سے اُکتا کر سیر و شکار کے لئے دہلی جانا چاہتا تھا کہ ان ہی دنوں داراشکوہ نے بعض ایسے کام کئے جن سے ملک میں فساد پھیلتا چلا گیا اور رعایا پریشان ہوتی چلی گئی۔ داراشکوہ اس طرح اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شاہ جہاں کے دل میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی کہ شہزادہ مراد مکمل طور پر باغی ہو چکا ہے۔ مثال کے لئے اس نے وہ حوالہ پیش کیا کہ مراد نے اپنے نام کے سکے جاری کر دیئے ہیں اور مسجدوں میں اپنے نام کا خطبہ پڑھواتا ہے۔ اس لئے مراد کو گجرات کی صوبے داری سے برطرف کر کے علاقہ ''برار'' کی جاگیر پر جانے کا حکم جاری کیا جائے۔

داراشکوہ نے باپ سے یہ بھی کہا کہ اورنگ زیب، شہزادہ شجاع کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے اور اس کام کے لئے وہ مراد کو مسلسل کمک پہنچا رہا ہے۔

شاہ جہاں بڑی حیرت اور دکھ کے ساتھ دارا کی باتیں سن رہا تھا۔

دارا نے شہنشاہ سے یہ بھی کہا کہ اورنگ زیب، حضورِ والا کی مزاج پرسی کے بہانے اپنی ذاتی فوج کے ساتھ دارالحکومت پہنچ کر فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتا ہے۔ مزید یہ کہ اس نے قطب الملک سے پیش کش کی کہ جو رقم وصول کی ہے، اسے حضرت کی اجازت کے بغیر نئی فوج بھرتی کرنے میں خرچ کر رہا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ بیجاپور کی تسخیر کی غرض سے جو شاہی لشکر بھیجا گیا ہے، اسے فوراً واپس بلا لیا جائے۔ دکن میں جو امراء موجود ہیں، انہیں دربارِ شاہی میں حاضر ہونے کا حکم دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ پیش کش کی رقم بھیجنے کے لئے بھی شدید تقاضا کیا جائے تاکہ اورنگ زیب کے جاہ وحشمت میں کمی دیکھ کر اس کے رفیق برگشتہ ہو جائیں۔ اس طرح اورنگ زیب کی طاقت کا طلسم ٹوٹ جائے گا اور یہی بات مرکز کے حق میں بہتر ثابت ہوگی۔

اگرچہ شاہ جہاں اپنے دونوں بیٹوں مراد اور اورنگ زیب کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنا چاہتا تھا لیکن دارا شکوہ کی باتوں میں آ کر وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔ امراء کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یا تو شاہ جہاں قوتِ فیصلہ سے بالکل ہی محروم ہو چکا ہے یا پھر وہ دارا کی محبت میں اس حد تک ڈوب گیا ہے کہ خود اس کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔

آخر شاہی قاصد، شاہ جہاں کا حکم نامہ لے کر دکن کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی شہزادہ مراد کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر ''برار'' کی جاگیر کی طرف روانہ ہو جائے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو اسے معزولی اور قید و بند کی ذلتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔

❀.....❀.....❀

اورنگ زیب نے بڑے ضبط وتحمل کے ساتھ فرمانِ شاہی کو پڑھا۔ اسے سخت اذیت پہنچی۔ مگر اس نے شاہی قاصدوں کو کوئی جواب نہیں دیا۔ اورنگ زیب خوب جانتا تھا کہ اس حکم کے پیچھے دارا شکوہ کا ہاتھ ہے جو اپنے تمام بھائیوں کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے۔

''شہزادۂ عالی قدر! ہم شہنشاہِ معظم کو کیا جواب دیں۔'' شاہی قاصدوں نے دست بستہ عرض کیا۔

''تم خاموشی کے ساتھ دارالحکومت کی طرف لوٹ جاؤ۔ بس یہی میرا جواب ہے۔''

شاہی قاصدوں کی واپسی کے فوراً بعد ہی اورنگ زیب نے اپنے طرزِ عمل میں خاصی لچک پیدا کر لی۔ اس نے ''بیجاپور'' اور ''گولکنڈہ'' کے بااثر لوگوں کو یقین دلایا کہ تخت نشین ہوتے ہی انہیں بڑے انعام واکرام سے نوازے گا۔ اس یقین دہانی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ دونوں ریاستوں کے امراء اورنگ زیب کی حمایت کا دم بھرنے لگے۔

اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب نے ایک اور عجیب سیاسی قدم اٹھایا۔ اس نے بیجاپور کے سلطان سے شیواجی مرہٹہ کو کرناٹک میں اعلیٰ عہدہ دینے کی سفارش کی۔ مزید یہ کہ دکن میں بھی

اورنگ زیب نے شیواجی کو مستقل جاگیریں عنایت کیں۔ اس طرح اورنگ زیب کی طاقت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بے شمار خطرات کے پیشِ نظر مسلسل اپنے لشکر میں اضافہ کر رہا تھا۔ اورنگ زیب نے دارا شکوہ سے مقابلے کے لئے جو فوج تیار کی تھی، اس میں بہت سے یورپی توپچی بھی شامل تھے۔

❀.....❀.....❀

اسی زمانے میں اورنگ زیب نے ایک بہت ڈراؤنا خواب دیکھا۔ مغل شہزادے نے دیکھا کہ ایک طویل وعریض میدان ہے جس میں بے شمار انسان جمع ہیں۔ اچانک ایک سمت سے گھڑ سواروں کا ایک دستہ میدان میں داخل ہوتا ہے۔ ایک دراز قامت شخص اس دستے کی قیادت کر رہا ہے۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک نیزہ ہے اور نیزے پر ایک کٹا ہوا انسانی سر بلند ہے جس سے خون بہہ رہا ہے۔

اورنگ زیب بہت غور سے اس سر کو دیکھتا ہے۔ وہ خود اس کا اپنا سر ہے۔

خواب اس قدر بھیانک تھا کہ گھبرا کر اورنگ زیب کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے طور پر خواب کی یہی تعبیر لی کہ دارا شکوہ سے مقابلے میں اسے شکست ہو جائے گی۔ اور وہ اپنی فتح کا جشن منانے کے لئے اس کے کٹے ہوئے سر کی تشہیر کرے گا۔

اورنگ زیب نے اپنے درباری علماء سے اس خواب کی تعبیر لینا چاہی مگر کچھ سوچ کر خاموش رہا۔

پھر دوسری رات بھی اسے یہی خواب دکھائی دیا۔ ایک طویل وعریض میدان میں بے شمار لوگ جمع ہیں۔ اور ایک شہسوار اپنے نیزے پر اس کے سر کو بلند کئے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔

آنکھ کھلی تو اورنگ زیب کچھ دیر تک شدید پریشانی کے عالم میں اپنے بستر پر بیٹھا رہا۔ پھر وہ آہستہ سے نیچے اُترا اور وضو کر کے نماز ادا کرنے لگا۔ نماز کے بعد اس نے ایک طویل سجدہ کیا اور اسی سجدے کی حالت میں اس کے ہونٹوں پر یہ دعائیہ کلمات اُبھرنے لگے۔

''اے خدائے بحر و بر! اگر تیری یہی مرضی ہے کہ میرے جسم کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کر دیا جائے..... اور میرا سر کاٹ کر اس نیزے پر بلند کیا جائے تو پھر تیرے فیصلے کو کون ٹال سکتا ہے؟ اے بے پناہ اور لازوال قوت رکھنے والے! اپنے اس گناہ گار اور کمزور بندے، اورنگ زیب کو استقامت دے کہ میں سرزمینِ ہند پر تیرا قانون نافذ کر دوں..... اور اگر میرے مقدر میں یہ سعادت نہیں ہے تو پھر مجھے عزت وآبرو کے ساتھ واپس بلا لے۔''

یہ دعا مانگنے کے بعد اورنگ زیب کو سکونِ قلب حاصل ہوا۔ مگر جب تیسری رات بھی اس نے وہی خواب دیکھا تو پریشان نظر آنے لگا۔

آخر اورنگ زیب نے چند علماء کو تنہائی میں طلب کر کے اپنا خواب بیان کیا۔

"میں مسلسل تین راتوں سے یہی خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اس خواب کی تعبیر درکار ہے۔ خواہ وہ تدبیر کتنی ہی تلخ ہو۔"

علماء بہت دیر تک خواب کے ہر پہلو پر غور کرتے رہے اور پھر انہوں نے بہت محتاط لہجے میں خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن آپ کے تعاقب میں ہیں۔ اس لئے صاحبِ عالم کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔"

اورنگ زیب خاموشی سے علماء کی گفتگو سنتا رہا۔

"صاحبِ عالم کو چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ صدقہ و خیرات دیں۔" تمام علماء نے بیک زبان کہا۔ "خواب سے کسی آفتِ ناگہانی کا اظہار ہوتا ہے۔"

علماء کا خیال تھا کہا خواب کی تعبیر سن کر اورنگ زیب پریشان ہو جائے گا۔ مگر اس کے چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔

اورنگ زیب نے علماء کا شکریہ ادا کیا اور انہیں مناسب انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا۔

پھر تنہائی میں اس نے نماز ادا کی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

"اے خدائے عزیز و جلیل! اگر تیری یہی مرضی ہے تو پھر اپنے کمزور بندے، اورنگ زیب کو اتنا حوصلہ دے کہ وہ تیری رضا پر مطمئن ہو جائے۔"

⊛.....⊛.....⊛

اورنگ زیب نے پورے زور و شور سے فوجی تیاریاں کیں اور برہان پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ شہر حضرت نظام الدین اولیاؒ کے محبوب خلیفہ، مولانا برہان الدین غریبؒ کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ اورنگ زیب نے یہاں ایک ماہ قیام کیا اور اس دوران کئی بار سلسلۂ چشتیہ کے ان عظیم بزرگ کی روح کو ایصالِ ثواب کیا۔ پھر ایک رات اورنگ زیب نے مبارک شاہ قلندر کو خواب میں دیکھا۔ قلندر حالتِ جلال میں تھا۔ اس نے اورنگ زیب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بادشاہ کو ظلِ الٰہی کہنے والے درباری علماء تیرے خواب کی کیا تعبیر دیں گے۔ اللہ کا نام لے کر اُٹھ اور اپنے دشمنوں کا قلع قمع کر دے۔ ہر محاذ پر تائیدِ غیبی تیرے ساتھ رہے گی۔ بس یہی تیرے خواب کی تعبیر ہے۔"

مبارک شاہ قلندر کا خواب میں آنا بے سبب نہیں تھا۔ قلندر کی محبتوں اور عنایتوں کو یاد کر کے اورنگ زیب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور پھر برہان پور میں ایک ماہ قیام کرنے کے بعد اورنگ زیب، فروری 1658ء میں دارالحکومت دہلی کی طرف بڑھنے لگا۔

اورنگ زیب کا خسر اس معرکہ آرائی کے خلاف تھا۔ اس نے ایک نازک مرحلے میں داماد کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً اورنگ زیب نے اسے نظر بند کر دیا۔

ادھر اورنگ زیب کی فوجیں مسلسل پیش قدمی کر رہی تھیں اور ادھر شاہ جہاں نے مہاراجہ جسونت سنگھ کو مالوہ کا صوبے دار بنا کر شہزادہ مراد کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ جسونت سنگھ کے ساتھ ایک لشکرِ جرار تھا۔ شاہ جہاں نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجین کے قریب قیام کر کے پہلے شہزادہ مراد کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ اگر اس طرح وہ سیدھے راستے پر نہ آئے تو پھر احمد آباد پہنچ کر اس کے صوبے پر قبضہ کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔

شہزادہ مراد نے راجہ جسونت سنگھ کی نصیحت سننے سے انکار کر دیا اور ایک بھاری لشکر لے کر شاہی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ مگر اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ شاہی لشکر پر غلبہ حاصل نہ کر سکے گا۔ اس لئے کسی تصادم کے بغیر شہزادہ مراد، اجین کے قریب پہنچ کر واپس پلٹا۔

اسی دوران اورنگ زیب کا لشکر بھی نزدیک آ پہنچا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنے بھائی کو پیغام بھیجا کہ وہ اس معاملے میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ مراد نے اپنے چھوٹے بھائی کی پیشکش کو قبول کر لیا اور پھر دونوں شہزادوں کی مشترکہ فوجیں، اجین کی طرف بڑھنے لگیں۔

اورنگ زیب نے مصالحت کے لئے راجہ جسونت سنگھ کو پیغام بھیجا۔

"میرے ارادے غیر نہیں ہیں۔ میں صرف حضرت (شاہ جہاں) کی مزاج پرسی کے لئے آگرہ جا رہا ہوں۔ اگر میرا راستہ روکنے کی کوشش کی گئی تو اس سرسبز و شاداب زمین سے قتل و غارت کا ایک طوفان اُٹھے گا اور جس کی تمام ذمہ داری تم پر عائد ہو گی۔"

راجہ جسونت سنگھ طاقت کے نشے میں چور تھا۔ اس نے اورنگ زیب کا خط پھاڑ کر پھینک دیا اور اس کے قاصد کو ذلیل کر کے اپنی لشکر گاہ سے نکال دیا۔ اورنگ زیب اپنے قاصد کے ساتھ اس ذلت آمیز سلوک پر چراغ پا نہیں ہوا۔ اس نے خاموشی سے اپنی صفیں درست کیں اور پھر پوری طاقت کے ساتھ شاہی لشکر پر حملہ کر دیا۔

اورنگ زیب اور شہزادہ مراد کے لشکروں کی یلغار اتنی شدید تھی کہ راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خان کے قدم اُکھڑ گئے۔ وہ دونوں جان لینے اور جان دینے کا عہد کر کے آئے تھے۔ مگر جلد ہی جسونت سنگھ اور قاسم خان نے پشت دکھا دی اور بڑی بے عزتی کے ساتھ میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔ مغل شہزادوں نے تین چار کوس تک ان کا تعاقب کیا اور پھر بے اندازہ مالِ غنیمت لوٹ کر اپنے اپنے لشکروں میں واپس آ گئے۔

⊛.....⊛.....⊛

شہزادہ اورنگ زیب فتح و ظفر کا پرچم لہراتا ہوا اجین میں داخل ہوا۔ یہاں ایک روز قیام کر کے آگرہ کی طرف بڑھا۔

شاہ جہاں کو راجہ جسونت سنگھ کی خبر اس وقت ملی جب وہ آگرہ سے دہلی جاتے ہوئے بلوچ

پور میں قیام پذیر تھا۔ اس موقع پر داراشکوہ نے مشورہ دیتے وقت عرض کیا۔

''اعلیٰ حضرت فوری طور پر آگرہ تشریف لے چلیں۔ اورنگ زیب کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں۔''

شاہ جہاں 12 مئی 1658ء کو سابقہ دارالحکومت پہنچا اور آگرہ پہنچتے ہی اورنگ زیب کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ فوج کے ہر سردار کو اس کے مرتبے کے مطابق انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ داراشکوہ کو شاہ جہاں نے اپنا خاص گھوڑا عنایت کیا، جس کی زین سونے کے کام سے آراستہ تھی۔ اس کے علاوہ شہنشاہ نے اپنے محبوب فرزند کو اپنی مخصوص تلوار بھی عنایت کی اور سواری کے لئے ایک رتھ بھی مرحمت کیا۔

ہندوستان کے شہنشاہ جنوب کی طرف سے سفر کرتے وقت رتھ پر سوار ہونے کو نیک شگون سمجھتے تھے۔ اگرچہ شاہ جہاں ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا لیکن بیٹے کی محبت نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس کافرانہ رسم پر عمل کرے۔

شاہ جہاں بہت دیر تک داراشکوہ کو اپنے سینے سے لگائے رہا۔ پھر بیٹے کو حکم دیا کہ وہ شاہی رتھ پر سوار ہو جائے۔ داراشکوہ بڑے تکبر کے انداز میں رتھ پر سوار ہوا اور شاہ جہاں اس وقت تک کھڑا اُسے دیکھتا رہا جب تک داراشکوہ کی سواری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

جب داراشکوہ آگرہ سے روانہ ہوا تو جہاں آراء نے فتنہ و فساد کی اس آگ کو بجھانے کے لئے اورنگ زیب کے نام ایک خط تحریر کیا اور اپنے بخشی فاروق کے ہاتھ روانہ کیا۔ جہاں آراء کا حکم تھا کہ جنگ چھڑنے سے پہلے ہر حال میں یہ خط اورنگ زیب کو پہنچ جائے۔ جہاں آراء نے اورنگ زیب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''برادرِ عزیز! یہ کیسی نادانی و سرکشی ہے کہ تم اپنے بڑے بھائی سے جنگ پر آمادہ نظر آتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ داراشکوہ، ولی عہدِ سلطنت ہے۔ اور ولی عہدِ سلطنت سے جنگ کرنا ایسا ہی ہے جیسے تم اعلیٰ حضرت (شاہ جہاں) کے خلاف تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاؤ۔ مناسب یہ ہے کہ خلوص و محبت کے ساتھ بڑے بھائی کو اپنی طرف مائل کرو۔ جہاں تک پہنچ چکے ہو، وہیں ٹھہر جاؤ اور مجھے اپنے ارادے سے آگاہ کرو تا کہ ظلِ سبحانی کی خدمت میں تمہاری عرضداشت پیش کی جا سکے۔''

جیسے ہی بخشی فاروق نے جہاں آراء بیگم کا یہ مراسلہ پہنچایا، اورنگ زیب کو خبر ملی کہ داراشکوہ، دھول پور پہنچ چکا ہے۔ اور اس نے دریائے چنبل کے تمام گھاٹوں پر پہرے لگوا دیئے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی اورنگ زیب بھی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا اور راتوں رات ایک نئے راستے سے دریائے چنبل کو عبور کر گیا۔ اس کے بعد اس نے بخشی فاروق کو واپسی کی اجازت دی اور ساتھ ہی ساتھ شاہ جہاں کی خدمت میں ایک عرضداشت بھی ارسال کی۔

''اعلیٰ حضرت کا اقبال بلند ہو۔ اور اللہ جل جلالہٗ شاہِ والا کی عمر میں اضافہ فرمائے۔ پہلے

اس خادم کو اندازہ نہیں تھا مگر اب یقین آ گیا ہے کہ صورتِ حال یکسر بدل چکی ہے۔ پہلے ملک ہندوستان کا اقتدار حضورِ والا کے دستِ مبارک میں تھا لیکن اب سارا انتظام شہزادہ داراشکوہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور برادرِ معظم ہر وقت مجھے نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ انہوں نے میرے لشکر کو تباہ کرنے کے لئے مجھے دکن کے مالیہ سے محروم کرنے کی سازش کی۔ عین اس وقت، جب میری یلغار سے سلطانِ بیجاپور بے دست و پا ہو چکا تھا، شہزادے نے شاہی لشکر واپس طلب کر لیا اور خفیہ طور پر اپنے آدمی بھیج کر اہلِ بیجاپور کا حوصلہ بڑھا دیا۔ اس طرح میری اپنی فوج بھی دل شکستہ ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے اس خادم نے دشمن کو شکست دی اور لشکرِ شاہی کو صحیح سلامت اس کے علاقے سے اورنگ آباد لے آیا۔ تاہم برادرِ معظم نے کسی تقصیر کے بغیر ''برار'' کا علاقہ میری جاگیر سے نکال کر شہزادہ مراد کی جاگیر میں دے دیا اور آپ کو میری ذات سے اس قدر بدظن کیا کہ مجھے جو مختصر سا علاقہ حضور نے عطا فرمایا تھا، اسے چھیننے کے لئے راجہ جسونت سنگھ کو لشکرِ کثیر دے کر بھیج دیا۔ میں نے اس موقع پر خود اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر حقیقتِ حال معلوم کرنے کا فیصلہ کیا تو جسونت سنگھ میرے راستے کی دیوار بن گیا۔ مجبوراً مجھے اس سے جنگ کرنی پڑی۔ اگر خدمتِ والا میں حاضر ہونے کے سوا میرا ارادہ کچھ اور ہوتا تو میرے لئے جسونت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لینا ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ اب سنتا ہوں کہ شہزادہ بلند اقبال داراشکوہ میرے مقابلے کے لئے دھول پور آ پہنچے ہیں، حالانکہ ان کا مجھ جیسے صف شکن سے مقابلہ کرنا بے سود ہے۔ وہ یقیناً ناکام و نامراد ہوں گے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے اپنی جاگیر صوبہ پنجاب میں چلے جائیں اور حضور کی خدمت کا فریضہ مجھ غلام کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت کا جو حکم ہو گا، اس کی تعمیل کی جائے گی۔''

شاہ جہاں کے حضور اپنی عرضداشت بھیجنے کے بعد اورنگ زیب نے اپنی فوجیں ترتیب دیں اور میدانِ جنگ کی طرف بڑھا۔

وہ جانتا تھا کہ شہنشاہ کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں آئے گا۔ داراشکوہ، ہندوستان پر بھی حکومت کر رہا تھا اور شاہ جہاں کے دل و دماغ پر بھی۔ اور اورنگ زیب کے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے۔ شاہ جہاں کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

داراشکوہ، اورنگ زیب اور شاہ مراد کی مشترکہ طاقت کو کچلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے شاہ جہاں کے حکم کے مطابق اپنی فوجوں کو ترتیب دیا اور خود لشکر کے قلب میں نمودار ہوا۔ پھر دونوں لشکر آمنے سامنے آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے آدمیوں کا سمندر لہریں مار رہا ہو۔ یہ سیاست کا بدترین کھیل تھا کہ تین حقیقی بھائی آپس میں ٹکرا رہے تھے۔

شاہ جہاں چاہتا تو اس خونیں تماشے کو روک سکتا تھا۔ مگر حالات اور جذباتی فیصلوں نے اسے بڑے بیٹے کے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا۔ شاہ جہاں کی دلی خواہش تھی کہ مغل سلطنت اس کے چاروں بیٹوں میں خوش اسلوبی کے ساتھ تقسیم ہو جائے۔ مگر داراشکوہ مستقبل کے خطرات کے

پیشِ نظر اپنے تینوں بھائیوں کو راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ نتیجتاً خاندان بکھر گیا اور خونی رشتے اس طرح کٹ گئے کہ پھر انہیں جوڑنا ناممکن ہو گیا۔

سلطنت کا ہر دعوے دار ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مغل اقتدار کے بد خواہ اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ فتنہ پردازوں نے فضا کو اس قدر مسموم بنا دیا تھا کہ باپ کو بیٹے پر اعتبار نہیں تھا اور بیٹا، باپ کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اورنگ زیب کے مقابل صف آراء ہونے سے پہلے داراشکوہ، سرمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شہزادے کے مشیروں نے بہت سمجھایا کہ وہ ایک پاگل شخص ہے۔ اس سے کسی قسم کا فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر داراشکوہ کو یقین تھا کہ سرمد ایک روشن ضمیر بزرگ ہے۔ قندھار کے محاصرے کے موقع پر تمام نجومیوں اور سیاسیوں نے داراشکوہ کے فتح یاب ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ لیکن سرمد نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اندھا ہو چکا ہے، اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر جب دارا کو اس مہم میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو اسے اندازہ ہوا کہ سرمد کی آنکھیں دیوار کے پیچھے دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ماضی کے اسی واقعے سے متاثر ہو کر داراشکوہ آج پھر سرمد کے پاس آیا تھا۔

''سرمد! میرے حق میں دعائے خیر کرو کہ یہ زندگی اور موت کا معرکہ ہے۔'' داراشکوہ نے بڑے ادب کے ساتھ اس درویش سے دعا کی درخواست کی تھی جو لوگوں کے بقول اپنے ہوش میں نہیں تھا۔

سرمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ آسمان کی طرف اُٹھا ہوا تھا اور نظریں کسی مخصوص نقطے پر مرکوز تھیں۔ داڑھی اُلجھی ہوئی اور سر کے بال گرد آلود تھے۔ سرخ و سفید جسم دھوپ کی تمازت سے سیاہ ہو چکا تھا۔ ویران آنکھوں کی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔

داراشکوہ ادب سے آگے بڑھا اور اپنے لئے دوبارہ دعا کی درخواست کی۔ مگر سرمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور ہر شے سے بے نیاز آسمان کی بلندیوں میں کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ داراشکوہ نے بلند آواز میں تیسری بار سرمد کو پکارا لیکن اس کے جسم کو ہلکی سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں بہت دیر سے کسی چیز کو ڈھونڈ رہا تھا۔

داراشکوہ، سرمد کی حالتِ جذب کو سمجھ گیا تھا۔ مجبوراً مغل شہزادے کو ایک بے سروسامان فقیر کے سامنے بیٹھ جانا پڑا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ داراشکوہ بڑے جبر کے عالم میں اس تکلیف دہ سناٹے کو برداشت کرتا رہا۔ پھر بہت دیر بعد سرمد، عالمِ خیال سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آیا اور دارا کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ مغل شہزادے نے بارہا سرمد کی آنکھوں کا رنگ دیکھا تھا مگر آج سرخی بہت زیادہ گہری تھی۔

داراشکوہ نے احتراماً سلام کیا اور چوتھی بار اپنی درخواست پیش کی۔ لیکن ہوش میں آنے کے باوجود سرمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دارا کو شدید حیرت تھی سرمد اسے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ دارا

کو ایک مجذوب کی نظریں اپنے جسم میں اُترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سرمد کے چہرے پر کئی رنگ اُبھر اُبھر کر ڈوب رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ کسی اذیت ناک کیفیت سے دوچار ہے۔

''ہندوستان کے تخت پر بیٹھے گا؟'' آخر الفاظ سرمد کے ہونٹوں کی گرفت سے آزاد ہوئے۔ اس کے لہجے میں بڑا جلال تھا۔

دارا کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا۔ بس وہ اقرار میں سر کو ہلکی سی جنبش دے کر رہ گیا۔

''وہ ہے تختِ طاؤس..... وہ ہے مسندِ شاہی..... بیٹھ جا اس پر۔'' سرمد نے ایک ریت کے ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دارا نے اس جانب دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی جدھر سرمد کی اُنگلی اُٹھی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آج پھر مجذوب کی دیوانگی حدوں سے گزر گئی ہے۔

''بیٹھ جا!..... جلدی کر۔'' سرمد نے چیخ کر کہا۔ ''لوگ تخت کو کھینچے لئے جا رہے ہیں۔ چھین لے ان کے ہاتھوں سے..... بیٹھ جا!'' یہ کہتے کہتے سرمد کا چہرہ تانبے کی طرح چمکنے لگا تھا اور آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑی تھیں۔ مجذوب کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی لیکن داراشکوہ بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ سرمد کا ہذیان اس کے نزدیک کسی توجہ کے قابل نہیں تھا۔

''تو پھر قتل ہو جا۔'' سرمد تڑپ اُٹھا۔ ''ہلاک ہو جا۔'' اُس کی آنکھوں میں ناقابلِ بیان وحشت تھی اور ہونٹ بری طرح کانپ رہے تھے۔ ''تیغِ مشیت، گردنِ آدم..... تُو بھی ہلاک ہو جا..... کس کی طاقت ہے کہ اس کے کھینچے ہوئے حصار سے باہر نکل جائے؟ حسرتِ وصال..... داغِ فراق..... تُو بھی قتل ہو جا۔'' سرمد کی زبان سے بے ربط الفاظ ادا ہو رہے تھے اور وہ دیوانہ وار بھاگتا جا رہا تھا۔

اس موقع پر داراشکوہ کے کچھ مصاحب بھی اس کے ہمراہ تھے۔ ایک خوشامدی امیر نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''حضور! اس غلام کی گستاخی معاف! آپ کس دیوانے کے تعاقب میں ہیں؟ ایک پاگل جو ریت کے ٹیلے کو تختِ طاؤس کہہ رہا ہے، آپ اس سے دعائے خیر کے طالب ہیں؟ جسے اپنی ذات کا ہوش نہیں، وہ کسی کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کیا کرے گا؟''

داراشکوہ کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ ''اب کی بار سرمد نے بڑی مایوس کن باتیں کی ہیں۔''

''اس دیوانے کی باتیں ہی کیا؟'' ایک خوشامدی امیر نے کہا۔

''اگر میں سرمد کے کہنے سے ریت کے ٹیلے پر بیٹھ جاتا تو آخر اس میں کیا حرج تھا؟'' دارا کو وقت گزر جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ ''قندھار کے محاصرے کے وقت بھی اس نے ایسی ہی مایوسی کی باتیں کی تھیں اور پھر میں اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا۔''

''کبھی کبھی پاگل کی زبان سے بھی سچی بات نکل جاتی ہے۔ مگر اہلِ ہوش اسے دلیل نہیں بنا

لیتے۔" خوشامدی امیر نے سرمد کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ "تختِ طاؤس تو حضورِ والا کا پیدائشی حق ہے۔ کیا ایک دیوانہ آپ کو اس تخت پر بٹھائے گا؟ آپ ہندوستان کے مطلق العنان شہنشاہ ہیں۔ آپ کو راستے میں پھرنے والے گداگروں کی دعاؤں کی ضرورت نہیں۔"

داراشکوہ نے غور سے اس خوشامدی امیر کی طرف دیکھا۔

"یہ قندھار کی مہم نہیں کہ عالی جاہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔" دوسرے خوشامدی امیر نے کہا۔ "شہزادہ مراد اور شہزادہ اورنگ زیب کے نام لیوا چند باغی آپ کی افواجِ قاہرہ کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ تخت بھی آپ کا ہے اور تاج بھی۔ آگرہ بھی آپ کی ملکیت ہے اور دہلی بھی۔ آپ بے شمار انسانوں کی تقدیروں کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ جس چاہے برقرار رکھیے اور جسے چاہے پامال کر ڈالیے۔ پھر حضور اپنی تقدیر کا حال ایک دیوانے سے کیا پوچھتے ہیں؟"

داراشکوہ اپنے مصاحبوں کی پُرجوش باتیں سن کر مسکرانے لگا۔

"تم نے سچ کہا۔ سرمد کون ہے ہمیں تخت پر بٹھانے والا؟..... ہم پہلے ہی تختِ طاؤس پر جلوہ افروز ہیں۔ ہمارا تخت کوئی نہیں چھین سکتا۔" داراشکوہ نہایت متکبرانہ لہجے میں بول رہا تھا۔

"اقتدار ہمارا حق ہے اور عزت و جلال ہماری میراث۔ آج ملک ہند میں کوئی ہمارا ہمسر نہیں۔ ہم سرفراز بھی ہیں اور سربلند بھی۔"

یہ کہہ کر داراشکوہ میدانِ جنگ کی طرف بڑھا۔

اُس کے ذہن سے سرمد کی بے ربط باتوں کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ اور اب اسے اورنگ زیب کی فوج حقیر چیونٹیوں کی فوج نظر آرہی تھی۔

۞.....۞.....۞

جنگ سے پہلے اورنگ زیب نے اتمام حجت کے لئے بڑے بھائی کے نام ایک مختصر پیغام بھیجا۔

"میں جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا کہ اس طرح بے شمار انسانی جانیں ضائع ہو جائیں گی اور اس ناحق کشت و خون کا سلطنتِ مغلیہ کے استحکام پر برا اثر پڑے گا۔ میں اعلیٰ حضرت (شاہ جہاں) سے ملاقات کے لئے جا رہا ہوں۔ میرا راستہ چھوڑ دیجئے اور میرے حقوق کو پہچانئے۔"

داراشکوہ نے اورنگ زیب کے پیغام کا غلط مفہوم لیا۔ اس نے سمجھا کہ اورنگ زیب اس کے لشکرِ جرار کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا ہے۔ جواب میں داراشکوہ نے اپنے چھوٹے بھائی کے نام ایک نہایت تحقیر آمیز پیغام بھیجا۔

"اگر تم اور شہزادہ مراد اپنی غلطی کی معافی طلب کرتے ہوئے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو تو تم دونوں کی زندگی کی رعایت دی جاسکتی ہے۔"

بڑے بھائی کا پیغام پڑھ کر اورنگ زیب چند لمحوں کے لئے اُداس ہو گیا۔

"نوشتۂ تقدیر کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ اس زمین کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ انسانی خون سے سرخ ہو جائے۔"

یہ کہہ کر اورنگ زیب نے اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔ پھر خیمہ گاہ سے نکل کر گھوڑے کی پشت پر سوار ہوا اور اپنی تلوار کو فضا میں لہرا کر با آواز بلند بولا۔

"یلغار کرو! یہاں تک کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا وجود مٹ جائے۔"

اورنگ زیب کے اس اعلان کے ساتھ ہی جنگِ مغلوبہ شروع ہو گئی۔

پورا میدان تلواروں کی جھنکار سے گونج رہا تھا۔ فولاد سے فولاد ٹکرایا تو ہر طرف چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔

یہ اقتدار کی جنگ تھی، جس میں بظاہر داراشکوہ کو برتری حاصل تھی۔ شمشیریں اس طرح انسانی سروں کو قلم کر رہی تھیں جیسے ان کے سامنے آدم زادوں کے بجائے جنگلی درختوں کی قطاریں ہوں۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر اس طرح شہ رگوں میں اُتر رہے تھے جیسے درندوں کا شکار کھیلا جا رہا ہو۔ ہر طرف نفسا نفسی کی گرم ہوائیں چل رہی تھیں اور کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

شہزادہ مراد بہت پُرجوش نظر آرہا تھا۔ وہ داراشکوہ کے لشکر پر پے در پے حملے کر رہا تھا۔ اسی دوران مراد کے چہرے پر دو تیر لگے اور وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔

دوسری طرف داراشکوہ کے ایک سپہ سالار، رستم خان نے اورنگ زیب کے لشکر کے قلب پر حملہ کیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری فوج منتشر ہو گئی اور اورنگ زیب کے ہاتھی کے گرد گنتی کے چند جاں نثار باقی رہ گئے۔ داراشکوہ کے فوجیوں نے خوشی کے عالم میں ایک فلک شگاف نعرہ مارا۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ جیتی جا چکی ہے۔ بس کچھ دیر کی بات ہے کہ شہزادہ اورنگ زیب یا تو قتل ہو جائے گا یا پھر زنجیریں پہنا دی جائیں گی۔ شہزادہ مراد پہلے ہی زخمی ہو کر اپنی خیمہ گاہ میں واپس جا چکا تھا۔

جب شہزادہ مراد کو اس جنگی صورتِ حال کی خبر ملی تو وہ اسی حالت میں اپنے خیمے سے باہر نکلا اور اورنگ زیب کی ٹوٹی ہوئی صفوں کو دوبارہ سنبھالا۔

اس دوران اورنگ زیب نے غیر معمولی شجاعت و استقامت کا ثبوت دیا۔ وہ اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ اتنی مہارت سے لڑا کہ دارا کا لشکرِ کثیر بھی اس پر قابو نہ پا سکا۔ اور پھر یکایک جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ داراشکوہ کا ایک جانباز سپہ سالار رستم خان بازو میں گولی لگنے سے شدید زخمی ہوا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مزید کئی گولیاں، رستم خان کے جسم میں اُتر گئیں۔ وہ گھوڑے سے گرا، چند ہچکیاں لیں اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔

رستم خان کے مرتے ہی داراشکوہ کے لشکر میں انتشار کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔ نوعمری کے باوجود اورنگ زیب اپنی فوجوں کو بڑی ذہانت سے لڑا رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسے مزید کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ کئی راجپوت سردار، راجہ روپ سنگھ راٹھور، راجہ شیو رام گوڑ اور ارجن

سنگھ بھی دادِ شجاعت دیتے ہوئے قتل ہو گئے۔ ان راجپوت سرداروں کی موت نے دارا کے لشکر میں ہلچل سی مچا دی۔ دارا کو محسوس ہوا کہ فتح کی منزل کے قریب پہنچ کر اچانک قسمت اس پر نامہربان ہو گئی ہے۔ وفا کا دم بھرنے والے، جان چراتے نظر آنے لگے۔

دارا نے اپنی بکھری ہوئی قوت کو سمیٹنے کی کوشش کی اور پورے زور و شور سے اورنگ زیب کی فوج پر حملہ آور ہوا۔ مگر یہ ایک جذباتی اقدام تھا۔ جنگ میں قدم قدم پر جاگتی ہوئی عقل کی ضرورت ہوتی ہے اور دارا اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ وہ آگ اور خون کے دریا میں کود الیکن اس طرح کہ اس کی کشتیاں بہت کمزور تھیں۔ مستقل بدحواسی نے دارا کو بہت نقصان پہنچایا۔ اورنگ زیب کا توپ خانہ مسلسل آگ برسا رہا تھا۔ مگر دارا نے اپنے توپ خانے کو ہلکی سی جنبش بھی نہیں دی اور یہی غلطی اُسے لے ڈوبی۔ ایک تو جنگ کی سیاست سے ناواقفیت اور دوسرے بعض سرداروں کی بزدلی۔ ان دونوں چیزوں نے مل کر دارا کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

لشکر میں ہر طرف افراتفری پھیلا گئی۔ سپاہیوں کے دلوں پر اورنگ زیب کی ایسی ہیبت بیٹھی کہ وہ میدانِ جنگ سے فرار ہونے لگے۔

داراشکوہ نے چیخ چیخ کر اپنے جاں نثاروں کو آوازیں دیں۔

''فرار کی راہ اختیار نہ کرو۔ فتح کے بعد میں تم لوگوں کو ایسے منصب و جاہ سے نوازوں گا کہ تم نے اس کا تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ ٹھہر جاؤ کہ تمہارا شہنشاہ تمہیں پکار رہا ہے۔ دشمن کی فوجی طاقت زیادہ نہیں ہے۔ تمہاری ایک ہی ضرب باغیوں کی صفوں کو درہم برہم کر دے گی۔ واپس لوٹ آؤ اور اپنی شمشیروں کا قرض ادا کر دو۔''

دارا مسلسل اپنے سپاہیوں کو پکار رہا تھا۔ مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے فوجی اپنی سماعتیں کھو چکے ہیں اور کسی نامعلوم منزل کی جانب بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ داراشکوہ کے سپاہیوں کے فرار کا یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا۔ دارا نے بڑی حسرت سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ تمام جاں نثار، مغل شہزادے کو موت کے منہ میں چھوڑ کر عافیت کی تلاش میں بہت دُور جا چکے تھے۔ بس گنتی کے چند رفیق تھے، جو دارا کو گھیرے ہوئے تھے۔ دارا نے بڑے حسرت زدہ انداز میں میدانِ جنگ پر نظر ڈالی۔ شہزادہ مراد اور شہزادہ اورنگ زیب کے سپاہی، ہواؤں کے دل کو چیرتے ہوئے عقابوں کی مانند بڑھے آ رہے تھے۔

''فیصلہ ہو چکا۔'' دارا نے بڑے کرب ناک لہجے میں اپنے رفیقوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی اپنے اپنے جسموں کو بچاؤ۔ اب یہ آندھی کسی درخت کو زمین پر کھڑا رہنے نہیں دے گی۔''

یہ کہہ کر داراشکوہ نے اپنے گھوڑے کی لگام پھیری اور اس مسافر کی طرح میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا، جس کا سارا ساز و سامان لٹ چکا ہو اور جس کے تعاقب میں بے شمار لٹیرے ہوں۔

دارا کے فرار ہوتے ہی اورنگ زیب کے سپاہیوں نے اس کے خیموں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ عبرت ناک منظر تھا۔ ہندوستان کے تخت کا وارث جنگ ہار چکا تھا اور اس کی میراث، گھوڑوں کے سموں کے نیچے روندی جا رہی تھی۔

داراشکوہ شام کے وقت آگرہ میں داخل ہوا۔ مغل شہزادے پر اس قدر وحشت طاری تھی کہ وہ شاہ جہاں سے بھی ملاقات نہ کر سکا اور رات کی تاریکی میں لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

❀.....❀.....❀

شہزادہ اورنگ زیب اپنے جاہ و جلال کا پرچم لہراتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے آگرہ کے نواحی باغ ''نورمنزل'' میں قیام کیا۔ دارا کی شکست فاش نے ہندوستان کے اقتدار کا فیصلہ کر دیا تھا۔ مجبوراً آگرہ کے تمام امراء اور منصب دار اپنی اطاعت کا اظہار کرنے کے لئے اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شاہ جہاں کو جب ان تمام واقعات کی خبر ملی تو دل پر قیامت سی گزر گئی۔ دو تین روز تک وہ انتظار کرتا رہا کہ اورنگ زیب، خدمتِ شاہی میں حاضر ہو کر سلامِ عقیدت پیش کرے گا۔ مگر جب اورنگ زیب کی طرف سے کوئی عرضداشت موصول نہیں ہوئی تو شاہ جہاں پر رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس نے بڑی شکستہ حالت میں بیٹے کو خط لکھا۔

''فرزند! ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ تم اپنے باپ کی طرف سے اس قدر بے نیاز ہو جاؤ گے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تم کئی روز سے آگرہ کی حدود میں قیام پذیر ہو لیکن اب تک جلالت مآب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ کیا تم نے شوقِ کشور کشائی میں تمام رشتے اور آداب بھی قتل کر ڈالے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو فوراً مابدولت کی قدم بوسی کو حاضر ہو کر اپنی اطاعت و وفاداری کا ثبوت پیش کرو۔''

اورنگ زیب نے فرمانِ شاہی کو بڑے ادب سے بوسہ دیا اور پھر ایک ایک حرف کو بغور پڑھا۔ اس دوران اورنگ زیب کے چہرے پر کئی رنگ اُبھر کر ڈوب گئے۔ شاہ جہاں کا معتمدِ خاص، فاضل خان یہ خط لے کر آیا تھا۔ وہ رُکی ہوئی سانسوں کے ساتھ اورنگ زیب کے تاثرات پڑھتا رہا۔ اور جب شہزادے کے چہرے پر جذبات کی ایک تیز لہر اُبھری تو فاضل خان مطمئن نظر آنے لگا۔ اُسے اُمید ہو چلی تھی کہ باپ اور بیٹا ایک بار پھر گلے مل جائیں گے اور فتنوں کا یہ طوفان کسی نئی تباہی کے بغیر گزر جائے گا۔

اورنگ زیب نے فرمانِ شاہی کے جواب میں ایک مختصر عرضداشت پیش کی۔

''یہ غلام، اعلیٰ حضرت کی قدم بوسی کے لئے بے قرار ہے۔ کسی مبارک گھڑی میں اس خاکسار کو خدمتِ عالیہ میں حاضر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''

فاضل خان خوشی خوشی اورنگ زیب کی درخواست لے کر خدمتِ شاہ میں حاضر ہوا۔

شاہ جہاں نے بیٹے کی تحریر دیکھ کر انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور دوسرے دن نیا حکم دے کر فاضل خان کو اورنگ زیب کے پاس بھیجا۔ لیکن اس عرصے میں فتنہ پردازوں کی جماعت اپنا کام دکھا چکی تھی۔ اورنگ زیب کے دل میں باپ کی طرف سے شکوک وشبہات سر اُبھارنے لگے۔ فاضل خان ایک انتہائی خوش گفتار انسان تھا۔ وہ اپنے دلائل اور پُرجوش تقریر سے دشمنوں کو بھی رام کرلیا کرتا تھا۔ مگر اورنگ زیب نے اس کی کسی بات کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔

''کیا صاحبِ عالم، قلعہ معلّٰی تشریف نہیں لے چلیں گے؟'' فاضل خان نے اورنگ زیب کو خاموش پاکر عرض کیا۔

''ابھی ہم حالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔'' اورنگ زیب نے بے پروائی کے لہجے میں جواب دیا۔

فاضل خان ناکام وانامراد لوٹ گیا اور اُس نے بگڑی ہوئی صورتِ حال کا ایک ایک پہلو پوری تفصیل کے ساتھ شہنشاہ کے گوش گزار کردیا۔

شاہ جہاں نے تیسرے دن ایک اور فرمان اپنے حکم سے تحریر کیا جس میں ایک باپ کی بے [illegible] کو بڑی شدت سے ظاہر کیا گیا تھا۔

اس بار شاہ جہاں نے فاضل خان کے ہمراہ اپنے ایک اور معتمد، خلیل اللہ خان کو بھی اورنگ زیب کے پاس بھیجا تاکہ دونوں مل کر شہزادے کے شبہات کو دُور کرسکیں۔

شاہ جہاں بڑے صبر وتحمل سے اس اُلٹی ہوئی بساط کو دوبارہ آراستہ کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر تقدیر کچھ اور ہی چال چل رہی تھی۔ خلیل اللہ خان، شہنشا کی طرف سے اپنے دل میں کدورت رکھتا تھا۔ عین موقع پر اس نے شاہ جہاں کو دھوکا دیا اور مصالحت کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

''میں صاحبِ عالم سے تنہائی میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔'' خلیل اللہ خان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اورنگ زیب نے فوراً ہی اسے خلوت میں طلب کرلیا۔

''میں روزِ اوّل ہی سے صاحبِ عالم کا وفادار ہوں۔'' خلیل اللہ خان نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''اسی عقیدت کے سبب اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ حضورِ والا کو شہنشاہ کے ارادوں سے باخبر کردوں۔''

اورنگ زیب نے چونک کر خلیل اللہ خان کی طرف دیکھا۔

''دراصل اعلیٰ حضرت اس بہانے آپ کو قلعے میں بلا کر قید کرنا چاہتے ہیں۔'' خلیل اللہ خان بڑے شاطرانہ انداز میں شاہ جہاں سے انتقام لے رہا تھا۔ ''صاحبِ عالم کے لئے یہی مناسب ہے کہ جلد از جلد شاہی خزانے پر قبضہ کرلیں۔''

خلیل اللہ خان ایک چرب زبان شخص تھا۔ اس نے الفاظ کے ذریعے بدگمانیوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ باپ اور بیٹے کے درمیان شکوک وشبہات کی وہ دیوار کھڑی ہوگئی، جسے آخری سانس تک نہ گرایا جاسکا۔

اورنگ زیب نے خلیل اللہ خان کو نظربند کرنے کے بہانے اپنے پاس روک لیا۔ فاضل خان اکیلا شہنشاہ کے پاس گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے

''شاہِ والا! دشمن اپنا کام کرچکے۔ اب یہ ٹوٹے رشتے جوڑنے والا کوئی نہیں۔''

شاہ جہاں نے احتیاط کے طور پر قلعے کے دروازے بند کرادیئے کہ کہیں فتنہ پردازوں کی جماعت اورنگ زیب کی اجازت کے بغیر قلعے پر حملہ نہ کردے۔

رات گزرتے ہی اورنگ زیب کے کچھ سپاہیوں نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ اہلِ قلعہ پہلے ہی پریشان تھے۔ محاصرے کی خبر سن کر اورنگ زیب سے امان مانگنے لگے۔ شاہ جہاں نوشتۂ دیوار کو پڑھ چکا تھا مگر پھر بھی اس نے آخری کوشش کے طور پر اورنگ زیب کو خط لکھا۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مابدولت نے ظاہری سلطنت کو ترک کرکے گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے۔ اس لئے تم پر بھی لازم ہے کہ سعادت مند بیٹوں کی طرح باپ کا احترام کرو۔''

جواب میں اورنگ زیب نے شہنشاہ کے حضور اپنی عرضداشت بھیجی جس میں یقین دلایا گیا تھا۔

''میں اب اپنے آپ کو اعلیٰ حضرت کا عقیدت مند مرید سمجھتا ہوں لیکن بعض باتوں کے سبب شاہِ والا مجھ سے ناخوش نظر آتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیش نہ آئے۔ اس لئے اگر قلعہ کے دروازوں کی نگہبانی میرے ملازموں کے سپرد کردی جائے تو میرا وہم ختم ہوجائے گا۔ پھر یہ خاکسار خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوکر اپنی اطاعت وفرمانبرداری کا ثبوت پیش کرے گا۔''

قسمت کا فیصلہ ہوچکا تھا۔ مجبوراً شاہ جہاں نے قلعہ کو خالی کردیا۔ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے دروازون پر قبضہ کرتے ہی شاہ جہاں کے خدمت گاروں کو آنے جانے سے روک دیا۔

ماہ رخ کو جب اس حادثے کی خبر ہوئی تو وہ تاج محل کے حجرے سے باہر نکلی، اورنگ زیب کے سپاہیوں سے پوچھنے لگی۔

''شہنشاہ کہاں ہیں؟''

''وہ قلعے میں نظربند ہیں۔ اب ان کے پاس کوئی نہیں جاسکتا۔'' سپاہیوں نے بڑے غور سے اس عورت کو دیکھا جو تاج محل کے دروازے پر حیران وپریشان کھڑی تھی۔

''میں شاہِ والا کی پرانی خدمت گار ہوں۔ مجھے اُن کے حضور جانے کی اجازت دی جائے۔'' ماہ رخ نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

سپاہیوں نے ایک کنیز کی درخواست سننے سے انکار کردیا۔ آخر بہت گریہ وزاری کے بعد سپاہی، ماہ رخ کو اورنگ زیب کے سامنے لے گئے۔ اورنگ زیب نے پوری توجہ سے اس بوڑھی عورت کی التجا سنی۔

''صاحبِ عالم! میں آپ کی والدہ محترمہ کی کنیز ہوں۔ شہنشاہ اس وقت اکیلے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے ان کے پاس جانے دیجئے۔'' ماہ رخ اس انقلابِ زمانہ کو دیکھ کر زار و قطار رو رہی تھی۔

اورنگ زیب کچھ دیر تک بوڑھی عورت کی فریاد سنتا رہا اور پھر اس نے ماہ رخ کو شاہ جہاں کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔

ماہ رخ قلعے کے صدر دروازے میں داخل ہوئی تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ قدم قدم پر اورنگ زیب کے مسلح سپاہی نظر آ رہے تھے۔ شاہ جہاں اب ایک مجبور قیدی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تمام شاہی خزانوں پر اورنگ زیب کی مہریں لگائی جا چکی تھیں۔

تمام اقتدار اور ساز و سامان سے دستبردار ہونے کے بعد شاہ جہاں نے اورنگ زیب کو آخری خط لکھا۔

''اگر اسیری ہی میرا مقدر ہے تو پھر مجھے قلعے کے بجائے تاج محل میں قید کر دیا جائے۔ اس طرح میں اپنی اس رفیق و غم گسار کے پاس پہنچ جاؤں گا جو خاک کے نیچے سو رہی ہے۔ فرزند! میری بدنصیبی کا اندازہ کرو کہ آج کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں۔ اقتدار بھی مجھ سے روٹھ گیا اور میرے اپنے بیٹے بھی۔ میں کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتا۔ مگر مجھ پر اتنا کرم ضرور کرو کہ میں ممتاز کے پاس پہنچ جاؤں۔''

بڑا دردناک خط تھا۔ لیکن اورنگ زیب پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ جہاں آخری وقت تک داراشکوہ کی محبت میں گرفتار رہا۔ ایک طرف وہ اورنگ زیب سے ملنا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف وہ داراشکوہ کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ قلعے کے محاصرے کے دوران شاہ جہاں کا ایک جاسوس گرفتار کر کے اورنگ زیب کے پاس لایا گیا۔ پھر جب اس کی جامہ تلاشی لی گئی تو شہنشاہ کا ایک خط برآمد ہوا، جو داراشکوہ کے نام تھا۔ شاہ جہاں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''فرزند! یہ عارضی حالات ہیں۔ ان سے پریشان نہ ہونا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

یہ خط پڑھ کر اورنگ زیب نے باپ سے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا اور فوجی طاقت استعمال کرتے ہوئے قلعے پر قبضہ کر لیا۔

پھر جب شاہ جہاں نے قلعے کے بجائے تاج محل میں منتقل ہونے کی خواہش ظاہر کی تو اورنگ زیب نے جواباً ایک خط تحریر کیا۔

''اعلیٰ حضرت کے لئے یہی مناسب ہے کہ قلعے کے ایک گوشے میں اس وقت تک مقیم رہیں، جب تک قسمت میرے اور داراشکوہ کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کر دے۔''

اورنگ زیب کا خط پڑھ کر شاہ جہاں نے ایک آہِ سرد کھینچی اور ممتاز محل کی قبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ملکۂ عالیہ! تم اپنے بیٹوں کی نافرمانی دیکھ رہی ہو کہ کسی کو بھی باپ کی فکر نہیں ہے۔

سب کے سب تاج و تخت کے حصول کے لئے ایک دوسرے کا خون بہانا چاہتے ہیں۔ میری کوئی نہیں سنتا۔ آج میں تمہارے ایک بیٹے کا قیدی ہوں۔ اس نے مجھے ایسی عجیب زنجیریں پہنائی ہیں کہ میں تم تک پہنچنے سے قاصر ہوں۔ میری مجبوریاں دیکھو ممتاز! کہ میں چند قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکتا۔ یہ کیسی دیوار ہے جو اپنوں نے مل کر میرے اور تمہارے درمیان کھینچ دی ہے۔''

شاہ جہاں کا لہجہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ وہاں موجود ہر شخص بے اختیار رونے لگا۔

جس شخص کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ہزاروں انسان تپتی ہوئی دھوپ میں کھڑے رہتے تھے، آج اُس کی خدمت گزاری کے لئے صرف چار افراد موجود تھے۔ شاہ جہاں کی چہیتی بیٹی جہاں آراء، جس نے اپنی جوانی کو باپ کی خدمت پر قربان کر دیا تھا۔ قنوج کے مشہور بزرگ سید محمد جو شاہ جہاں کو احادیثِ رسولؐ سنایا کرتے تھے۔ تیسرا شاہ جہاں کا بچپن کا دوست سکندر مرزا۔ اور چوتھی ممتاز محل کی کنیز ماہ رخ۔ بس یہ چار خدمت گار تھے جو صاحبقران ثانی کے حضور دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔

شاہ جہاں نے اپنے تمام آراستہ کمرے چھوڑ دیئے تھے۔ اور اب وہ ''ثمن برج'' کے ایک گوشے میں خاموش پڑا رہتا تھا۔ آگرے کے قلعے کا یہ وہ برج ہے جہاں سے ممتاز محل کی قبر صاف نظر آتی تھی۔ شاہ جہاں جب تک جاگتا رہتا، اس وقت تک اس کی نظریں ممتاز محل کے مرقد پر مرکوز رہتیں۔ فرمانروائے ہند کو دیکھ کر گمان ہوتا کہ جیسے وہ پتھر کا کوئی مجسمہ ہے۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوتی اور یہ الفاظ ''ثمن برج'' میں گونجنے لگتے۔

''اے زمانے! تجھ پر افسوس ہے کہ تُو نے کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔''

۞.....۞.....۞

تخت پر قبضہ کرتے ہی اورنگ زیب نے آگرہ میں دربار منعقد کیا اور پھر کسی تاخیر کے بغیر داراشکوہ کے تعاقب میں پنجاب کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابھی اورنگ زیب متھرا میں خیمہ زن تھا کہ اسے شہزادہ مراد کے منصوبوں کی خبر ملی۔ دارا کی شکست کے بعد وہ بادشاہت کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اورنگ زیب کے جاسوسوں نے خبر دی کہ شہزادہ مراد نئی فوج بھرتی کر رہا ہے۔ سپاہیوں کو بھاری تنخواہیں دی جا رہی ہیں اور افسروں کو مختلف خطابات سے نوازا جا رہا ہے۔

اورنگ زیب نے نئی حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے مراد کو ایک کثیر رقم بھیجی اور بہت سے گھوڑے روانہ کئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک خط بھی تحریر کیا۔

''تم دارا کا تعاقب کرو۔ مگر اس سے پہلے میری دعوت میں شریک ہو۔ تاکہ مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کی جا سکے۔''

شہزادہ مراد کے کئی معتمد افسروں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''صاحبِ عالم اس دعوت

میں شرکت نہ کریں تو بہتر ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اگلے لمحے کیا صورتِ حال پیش آ جائے۔"

فوجی افسر اسے اورنگ زیب کے پاس جانے سے روکتے رہے لیکن مراد نے اپنے تمام جاں نثاروں کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنے بھائی کے پاس جا رہا ہوں۔"

"مگر آپ حکومت کے دعویدار بھی ہیں اور یہ بات شہزادہ اورنگ زیب سے پوشیدہ نہیں ہے۔" فوجی افسروں نے مختلف زاویوں سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن مراد پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس وقت شراب کے نشے میں بدمست تھا۔

"میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" یہ کہتا ہوا مراد اپنے خیمے سے باہر نکلا اور اورنگ زیب کی دعوت میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

اورنگ زیب نے بظاہر بڑے تپاک کے انداز میں اپنے بھائی کا خیر مقدم کیا۔ پھر صبح سے شام تک شکار کھیلا گیا۔ اس دوران شہزادہ مراد کو احساس تک نہ ہو سکا کہ اس کی آزادی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔

شکار سے واپسی کے بعد وہ اورنگ زیب کی پُرتکلف دعوت میں شریک ہوا کھانے کے بعد مراد سے آرام کرنے کے لئے کہا گیا۔ وہ شراب کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اس کی کوئی رات اس نشہ آور شے کے بغیر نہیں گزرتی تھی۔ مراد نے اس رات بہت زیادہ شراب پی اور پھر جب وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تو اورنگ زیب کے حکم پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔

دونوں لشکر گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ اورنگ زیب نے رات کے اندھیرے ہی میں شہزادہ مراد کو زنجیروں میں جکڑ کر دہلی کی طرف روانہ کر دیا۔ مراد شراب کے نشے میں غرق ہونے کے سبب اس تمام صورتِ حال سے بے خبر تھا۔ اسے پتہ ہی نہیں چل سکا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔

اپنے ایک حریف سے نجات حاصل کرنے کے بعد اورنگ زیب، داراشکوہ کی طرف متوجہ ہوا جو لاہور میں لشکر جمع کر کے اورنگ زیب سے مقابلہ کرنے کی فکر میں تھا۔ اورنگ زیب نے اس کے تعاقب میں پنجاب کا رخ کیا۔ اس وقت برسات کا موسم تھا۔ اورنگ زیب نے دریائے ستلج پر کشتیوں کا پل تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ پھر جب وہ دریا عبور کر کے میدانی علاقے میں داخل ہوا تو داراشکوہ کے دو معتمد سردار، راج روپ اور خنجر خان اپنے آقا سے غداری کر کے اورنگ زیب سے آ ملے۔ داراشکوہ اس غداری سے دل شکستہ ہو کر ٹھٹھہ کی طرف فرار ہو گیا۔ اورنگ زیب نے اپنی کچھ فوج کے ساتھ قصور کے راستے سے ملتان تک اس کا تعاقب کیا۔

اسی دوران اورنگ زیب کو خبر ملی کہ شہزادہ شجاع اپنی جاگیر کی حدود سے نکل کر الہ آباد میں خیمہ زن ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نے علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے۔

اورنگ زیب یہ اطلاع پاتے ہی آندھی کی طرح دارالحکومت دہلی پہنچا اور بھاری ساز و

سامان وہاں چھوڑ کر الہ آباد کی طرف بڑھا۔

پھر جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو گھمسان کا رن پڑا۔ اس خونریز معرکے میں ہزاروں سپاہی مارے گئے مگر شام تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ مجبوراً دونوں لشکر اپنے اپنے کیمپوں کی طرف لوٹ گئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ راجہ جسونت سنگھ، اورنگ زیب سے غداری کر کے اپنے حامی سپاہیوں کے ساتھ بھاگ گیا اور جاتے جاتے اپنے لشکر کا بہت سا ساز و سامان، اونٹ اور گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

راجہ جسونت سنگھ کی غداری سے اورنگ زیب کے لشکر میں ایک ہلچل مچ گئی۔ لیکن اس جانباز مغل شہزادے کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی اس نے اپنے مختصر سے لشکر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جنگ کا فیصلہ کثرتِ افواج سے نہیں ہوتا۔ میدانِ کارزار میں فاتح وہی قرار پاتے ہیں جن پر خدا کی رحمت سایہ فگن ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فتح تمہارے نام رہے گی۔ آگے بڑھو اور دشمن کی صفوں کو درہم برہم کر دو۔"

اورنگ زیب کے چند الفاظ نے سپاہیوں کے جسموں میں بجلیاں سی بھر دیں۔ رگوں میں دوڑنے والا خون جلنے لگا اور پھر اورنگ زیب کے سپاہی بھوکے شیروں کی طرح شجاع کے لشکر پر جھپٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ جنگ خون سے سرخ ہو گیا اور سینکڑوں جوان خاک میں مل گئے۔

اچانک شہزادہ شجاع کے سپہ سالاروں سردار ظریف، سید اعظم اور شیخ ولی نے تین اطراف سے اورنگ زیب کے لشکر پر حملہ کیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ پل بھر میں صفیں کی صفیں اُلٹ گئیں اور اورنگ زیب کے بہت سے سپاہی فرار ہو گئے۔

بڑے سنگین لمحات تھے۔ اورنگ زیب نے اپنے گرد و پیش پر نظر کی۔ میدان میں تین ہزار کے قریب جاں نثار باقی رہ گئے تھے۔ شکست منہ کھولے سامنے کھڑی تھی۔ مگر اورنگ زیب نے حوصلہ نہیں ہارا۔ ایک مختصر اور منتشر فوج کو نہایت سلیقے کے ساتھ سمیٹا اور شجاع کے لشکر پر آخری حملہ کیا۔

اچانک حالات نے نئی کروٹ لی۔ شہزادہ شجاع کے کئی نامور سردار اُس سے بدظن ہو کر اورنگ زیب کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ اورنگ زیب نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بھرپور حملہ کیا اور شجاع کے توپ خانے پر قبضہ کر لیا۔ شجاع اس صورتِ حال سے مایوس ہو کر فرار ہو گیا۔ اورنگ زیب کے سپاہی مسلسل اس کا تعاقب کرتے رہے۔

گردشِ حالات سے تنگ آ کر شجاع کے تمام حامی ایک ایک کر کے اس سے بچھڑ گئے۔ یہاں تک کہ وہ تنہا رہ گیا۔ برسات کے موسم کی وجہ سے شجاع کے بہت سے سپاہی مارے جا چکے

تھے۔ مجبوراً شجاع حرم سرا کی چند خواتین اور چالیس پچاس وفادار ملازموں کے ساتھ کشتیوں میں سوار ہو کر ''اراکان'' کی طرف بڑھا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا کہ شجاع کہاں گیا؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دریا میں طغیانی آ جانے کے سبب شہزادہ شجاع ڈوب کر مر گیا۔

۞.....۞.....۞

شہزادہ مراد اور شہزادہ شجاع، اقتدار کی بساط سے ہٹائے جا چکے تھے۔ اورنگ زیب کو مسلسل فتوحات حاصل ہو رہی تھیں۔ اب صرف اس کا ایک حریف داراشکوہ باقی رہ گیا تھا جو خانماں بربادوں کی طرح دربدر مارا مارا پھر رہا تھا۔

شاہ جہاں پر پابندیاں اور بڑھا دی گئی تھیں۔ بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ بالکل ختم کر دیا گیا تھا۔ قنوج کے ایک پارسا بزرگ سید محمد، اُس کی بیٹی جہاں آراء، بچپن کا دوست سکندر مرزا اور ممتاز محل کی کنیز ماہ رخ۔ بس یہی چند افراد اس کی تنہائی کے شریک تھے۔

شاہ جہاں نہ کسی کو خط لکھ سکتا تھا اور نہ باہر کے کسی شخص سے ملاقات کی اجازت تھی۔ اگر کبھی کوئی خواجہ سرا کسی کام سے قلعہ کے باہر جاتا تو بڑی سختی کے ساتھ اس کی جامہ تلاشی لی جاتی۔ شاہ جہاں نے کئی بار داراشکوہ کو خطوط لکھے مگر وہ راستے ہی میں پکڑے گئے۔ ان خطوط میں دارا شکوہ کو صبر و استقامت سے کام لینے کی تلقین کی گئی تھی۔

''فرزند! میں اپنے ہی قلعے میں ایک بدترین قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ تم پر لازم ہے کہ جلد از جلد میری خبر لو اور مجھے اس اذیت ناک اسیری سے نجات دلاؤ۔''

جب شاہ جہاں کے یہ خطوط اورنگ زیب کے بیٹے، شہزادہ محمد کے ہاتھ لگے تو اس نے اپنے باپ کے حکم کے مطابق پہرہ اور بھی سخت کر دیا۔

شاہ جہاں کی بے کسی ناقابلِ بیان تھی۔ وہ ہر وقت ''ثمن برج'' میں بیٹھا ممتاز محل کی قبر کو تکتا رہتا۔ پھر جب وحشتِ دل حد سے گزر جاتی تو وہ پہرے داروں کو مخاطب کر کے چیخنے لگتا۔

''تم مجھے نہیں پہچانتے کہ میں کون ہوں؟'' شاہ جہاں کی آواز سے جلالِ شاہی کا اظہار ہوتا۔ مگر اب وہ آواز کسی گداگر کی آواز سے بھی زیادہ بے اثر محسوس ہوتی تھی۔ اورنگ زیب کے مقرر کردہ پہرے دار ادب سے سر جھکا لیتے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتے تھے۔

''مجھے کم سے کم ملکۂ عالیہ کی قبر تک تو جانے دو۔'' یکایک شاہ جہاں کا تمام تر رعب و جلال کسی بجھے ہوئے شعلے کی طرح نظر آنے لگتا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اس حالت میں فرار نہیں ہو سکتا۔ پھر مجھ پر یہ پابندیاں کیوں ہیں؟''

پہرے دار سپاہی کیا جواب دیتے۔ شہنشاہ کا سوال سن کر ان کی گردنوں کے خم کچھ اور نمایاں ہو جاتے۔

بالآخر مجبور ہو کر شاہ جہاں نے پہرے داروں سے کہا۔ ''شہزادہ محمد کو خبر کرو کہ شاہ بابا اس

سے ملنا چاہتے ہیں۔''

اورنگ زیب نے قلعہ آگرہ کی نگرانی اپنے بیٹے شہزادہ محمد کے سپرد کی تھی اور واضح طور پر حکم دیا تھا کہ اس کے کسی طرزِ عمل سے شہنشاہ کی دل آزاری نہیں ہونی چاہئے۔

جب دادا کا پیغام ملا تو شہزادہ محمد فوراً شاہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''میرے لئے کیا حکم ہے شاہ بابا؟'' شہزادہ محمد نے قدرے خم ہوتے ہوئے کہا۔

''حکم نہیں فرزند! ایک مجبور قیدی کی التجا ہے۔'' شاہ جہاں کے ایک ایک لفظ سے شدید طنز کا اظہار ہو رہا تھا۔

ندامت سے شہزادہ محمد نے سر جھکا لیا۔

''آپ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک کلمہ میرے لئے حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔'' شہزادہ محمد، ادب و احترام کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا۔

شاہ جہاں کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا۔ پھر اس نے کھڑے ہو کر تاج محل کی طرف اشارہ کیا۔

''فرزند! تم جانتے ہو کہ وہاں کون سو رہا ہے؟''

شہزادہ محمد اس عجیب سوال سے گھبرا گیا۔ پھر اس نے فوراً سنبھلتے ہوئے کہا۔

''شاہ بابا! ایک میں ہی کیا، سارا ہندوستان جانتا ہے کہ وہاں دادی محترمہ محوِ خواب ہیں۔''

''میں کچھ دیر کے لئے اسی عورت کی قبر پر جانا چاہتا ہوں۔ مگر تمہارے سپاہی مجھے قلعے سے نکلنے نہیں دیتے۔'' شاہ جہاں نے اس طرح کہا جیسے کوئی فریادی انتہائی کرب ناک لہجے میں فریاد کر رہا ہو۔

''سپاہی بابا جان کے حکم سے مجبور ہیں۔'' شہزادہ محمد نے اورنگ زیب کے احکام کی ضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تم مجھے ملکۂ عالیہ کی قبر تک جانے دو۔'' شاہ جہاں کے لہجے سے بہت زیادہ شکستگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں بھی بابا جان کے حکم سے مجبور ہوں۔'' شہزادہ محمد نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''کیسا حکم؟'' یکایک شاہ جہاں غضب ناک نظر آنے لگا تھا۔

''یہی کہ آپ قلعے سے باہر تشریف نہیں لے جا سکتے۔'' یہ کہتے کہتے شہزادہ محمد کا سر جھک گیا تھا۔

''یہ کیسا حکم ہے؟'' شاہ جہاں کے لہجے میں مزید تلخی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ''کیا حکم دینے والے کو یہ احساس نہیں ہے کہ میں اس کا باپ ہوں؟ اگر اورنگ زیب، فرزندی کے دائرے سے نکل چکا ہے تو اسے میرے اقتدار کا لحاظ ہونا چاہئے۔ میں ہندوستان کا فرمانروا ہوں اور تم ایک

فرمانروا کے ساتھ یہ کیسا سلوک کر رہے ہو؟"

"اب شاہِ والا کا اقتدار قائم نہیں رہا۔" شہزادہ محمد نے سر اٹھا کر کہا۔ مگر اس کے لہجے سے نرمی اور شائستگی جھلک رہی تھی۔

یہ نیا انکشاف سن کر شاہ جہاں سناٹے میں آ گیا۔ پھر اس قدر تھکے ہوئے لہجے میں بولا جیسے کوئی ناتواں مریض بول رہا ہو۔

"تو کیا اورنگ زیب نے بھی وہی کیا، جو اہلِ دنیا کا مذہب ہے۔ باپ کو زنجیریں پہنا کر قیدِ تنہائی میں ڈال دیا اور خود تاجِ زرنگار پہن کر اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔ اے زمانے! تجھ پر افسوس ہے کہ خون کے رشتے بھی نامعتبر ٹھہرے۔ وہ مجھے بار بار یقین دلاتا رہا کہ خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر اپنی سعادت مندی کا ثبوت پیش کرے گا۔" شاہ جہاں اس قدر دردناک لہجے میں بول رہا تھا کہ شہزادہ محمد مجرموں کی طرح نظر چرانے لگا۔ "یہ ہے فرمانبرداری کا ثبوت کہ باپ تنہائی میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور بیٹا، فرمانِ شاہی جاری کر رہا ہے۔"

یکایک شاہ جہاں کا لہجہ بدل گیا۔

"بس اب تم جاؤ۔ مجھ تم سے کچھ نہیں کہنا۔ میں نے تقدیر کے فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ اگر ہو سکے تو اپنے باپ کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ اہلِ وفا کا یہ طریق نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر شاہ جہاں نے منہ پھیر لیا اور ممتاز محل کی قبر کی طرف دیکھنے لگا۔

شہزادہ محمد کچھ دیر تک کھڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ثمن برج سے نکل گیا۔

شہزادہ محمد کے جانے کے بعد شاہ جہاں کی شکستہ آواز اُبھری۔ وہ اپنی محبوب بیوی کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

"ممتاز! تم خوش نصیب تھیں کہ اپنے بیٹوں کا یہ سلوک دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہیں۔ میں کیسے کیسے مناظر دیکھ رہا ہوں، تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ اورنگ زیب نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور اسے یہ احساس نہیں ہوا کہ ابھی باپ زندہ ہے۔ دارا کا کوئی پتہ نہیں کہ وہ کس حال میں ہے؟ مراد اور شجاع بھی مجھ سے دور ہیں..... کوئی میری خبر گیری کے لئے نہیں آتا۔ سب کو تاج و تخت عزیز ہیں۔ سب کے سب باپ کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ باپ تو بہت پہلے مر چکا۔ بس جنازہ اُٹھانے کی رسم باقی ہے۔" یہ کہتے کہتے شاہ جہاں آبدیدہ ہو گیا تھا۔

قنوج کے بزرگ سید محمد نے شہنشاہ کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھی تو آگے بڑھ کر نہایت مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"شاہِ والا! صبر و ہمت سے کام لیں۔"

شاہ جہاں نے پلٹ کر سید محمد کی طرف دیکھا۔ "اب صبر کے سوا باقی ہی کیا رہ گیا ہے؟"

سید محمد خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر تک فضا میں گہرا سکوت طاری رہا۔ پھر شاہ جہاں نے اسی

شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ اپنے چند غم گساروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اب تمہارا شہنشاہ ایک مجبور قیدی کے سوا کچھ نہیں۔ بہتر ہے کہ تم لوگ اورنگ زیب کے اقتدار کو تسلیم کر لو۔ میری خاطر ایک حکمراں کے عتاب کا نشانہ کیوں بنتے ہو؟ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور آزادانہ زندگی بسر کرو۔"

شاہ جہاں کی باتیں سن کر جہاں آراء رونے لگی۔ "بابا حضور! کیا ہم لوگوں کی موجودگی آپ کے لئے باعثِ زحمت ہے؟"

"نہیں بیٹی! میں تم پر فخر کرتا ہوں۔" جہاں آراء کو روتا دیکھ کر شاہ جہاں بھی آب دیدہ ہو گیا۔ "ممتاز کی موت کے بعد تمہاری ہی صورت دیکھ کر اب تک جیتا رہا ہوں۔ اگر تم نہ ہوتیں تو یہ محرومِ تمنا شخص کبھی کا قبر میں جا چکا ہوتا۔ میں اپنے خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جس طرح تم نے میری خدمت کی ہے، اس کی مثال ڈھونڈنے میں صدیاں گزر جائیں گی۔"

"پھر اعلیٰ حضرت ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟" جہاں آراء کے بہتے ہوئے آنسو کچھ اور تیز ہو گئے تھے۔

"بیٹی! اب تمہارا باپ ایک معزول شدہ حکمران ہے۔" شاہ جہاں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ زیادہ دیر تک جہاں آراء کے آنسو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میری بدبختی تم پر بھی سایہ فگن ہو جائے۔ اس لئے تم لوگ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ اورنگ زیب کو صرف میری ضرورت ہے۔ وہ مجھے زنجیریں پہنا کر اپنے اقتدار کو مضبوط بنانا چاہتا ہے۔ پھر تم لوگ میری خاطر یہ آزار کیوں برداشت کرتے ہو؟ مجھے یہ گوارا نہیں کہ تم لوگ میری طرح قلعہ کے ایک برج میں قید ہو کر رہ جاؤ۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ میرے وجود کا انکار کر دو تاکہ تم پر آزادی کی نئی راہیں کھل جائیں۔"

"میں اس قیدِ تنہائی پر ہزاروں آزادیوں کو قربان کرتی ہوں۔" یہ کہتے کہتے جہاں آراء کے چہرے پر ایک نئے عزم کی جھلک نمایاں ہو گئی تھی۔ "اگر آپ کے قدموں میں مجھے موت آ جائے تو میں اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھوں گی۔"

شاہ جہاں نے ستائشی نظروں سے جہاں آراء کی طرف دیکھا۔

"یہ تمہاری عظمت ہے بیٹی! کہ مجبور و بے کس باپ کے غموں میں شرکت کرنے کے لئے تم نے اپنی زندگی کے سارے عیش و طرب قربان کر دیئے۔ ورنہ اس بے وفا زمانے میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے؟ تمہارے تمام بھائی اس شخص کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے جس کی اطاعت و فرمانبرداری ان پر فرض تھی۔"

"بابا حضور! جانے والوں کا ذکر چھوڑیئے۔" جہاں آراء نے باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "وہ جانے ہی کے لئے آئے تھے۔"

جہاں آراء کے بعد شاہ جہاں، قنوج کے بزرگ سید محمد سے مخاطب ہوا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری تنہائی دور کرنے کے لئے اس اسیری کی زندگی کو قبول کیا۔ مگر اب میں نہیں چاہتا کہ اس ضعیفی کے عالم میں آپ مزید تکالیف برداشت کریں۔"

سید محمد نے غور سے شاہ جہاں کی طرف دیکھا اور بہت آہستہ لہجے میں بولے۔

"شاہِ والا! آپ ہم فقیروں کی فکر چھوڑ دیں۔ ہماری اسیری کیا..... اور رہائی کیا؟ شہر بھی ہمارے لئے ویرانے ہیں۔ ہم اپنی خوشی سے یہاں آئے ہیں..... آپ کی ذات پر کوئی احسان نہیں۔"

"میں بہر حال آپ کا احسان مند ہوں۔" شاہ جہاں کے لہجے میں سید محمد کے لئے بڑی عقیدت تھی۔ "آپ نے اس معزول حکمراں کو شکست و تنہائی کے اندھیروں میں ڈوبنے نہیں دیا۔ جب دل و دماغ مایوسیوں کے حصار میں گھر جاتے ہیں تو آپ کی بیان کردہ احادیثِ رسولؐ مجھ میں زندگی کا حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ اگر اس ظلمت کدے میں آپ کی ذات نہ ہوتی تو خدا جانے مجھ گناہ گار کا کیا حشر ہوتا۔"

"شہنشاہِ ذی وقار! آپ مجھ فقیر کو شرمندہ نہ کریں۔" سید محمد نے شاہ جہاں کے حضور انتہائی ادب و احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی غمگساری مجھ پر فرض تھی۔ جب سید، شہنشاہ کے اچھے دنوں کا ساتھی تھا تو اپنے حکمراں کو اس حالت میں چھوڑ کر کس طرح چلا جائے؟ نہیں شاہِ والا! سید سے یہ ذلت برداشت نہیں ہوگی۔"

سید محمد کی باتیں سن کر شاہ جہاں کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگی۔

"خدا آپ کو دونوں جہاں میں اجرِ عظیم عطا کرے۔ آپ نے رفاقت کا حق ادا کر دیا۔"

سید محمد سے گفتگو کرنے کے بعد شاہ جہاں نے سکندر مرزا اور ماہ رخ کی طرف دیکھا۔

"تم دونوں یہ عذاب کس لئے برداشت کر رہے ہو؟ بساطِ اقتدار اُلٹ چکی۔ تمہارا شہنشاہ قیدی بنایا جا چکا۔ اُمید کی تمام شمعیں ایک ایک کر کے بجھ گئیں..... اب روشنی کا انتظار فضول ہے..... اس تاریک زنداں میں آزادی کا فانوس لے کر کوئی نہیں آئے گا..... بس ایک زندگی کا چراغ باقی ہے، جو بہت دیر سے بھڑک رہا ہے..... باغی ہواؤں کا کوئی جھونکا اس چراغ کو کسی وقت بھی بجھا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ چراغ بجھ جائے، میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اُجالے میں یہاں سے نکل کر اپنی اپنی منزلوں کی طرف چلے جاؤ۔"

شاہ جہاں کی باتیں سن کر سکندر مرزا رونے لگا۔ پھر وہ چند قدم آگے بڑھا اور اس نے جھک کر شاہ جہاں کے پاؤں پکڑ لئے۔

"کیا شاہِ والا کو ہمارے چہروں پر بے وفائی کا کوئی عکس نظر آتا ہے؟" سکندر مرزا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔

"نہیں۔" شاہ جہاں نے بلند آواز میں کہا۔ "تمہارا شمار اہلِ وفا میں ہوتا ہے۔ میں تمہیں بچپن سے پہچانتا ہوں۔ تم کسی کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتے۔"

"بس! اس غلام کے لئے اپنے شہنشاہ کی بخشی ہوئی سند کافی ہے۔" سکندر مرزا کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں کچھ اور تیزی آ گئی تھی۔ "اعلیٰ حضرت گواہ ہیں کہ میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔"

"ہمیں احساس ہے سکندر مرزا! کہ تم دولت اور منصب کے بھوکے نہیں تھے۔" شاہ جہاں نے سکندر مرزا کی بے لوث دوستی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"مگر آج میں شاہِ والا سے کچھ طلب کرتا ہوں۔" سکندر مرزا نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"مانگو سکندر مرزا!" شاہ جہاں اپنے بچپن کے دوست کی بات سن کر چونک اُٹھا تھا۔ "مگر اس کا لحاظ رہے کہ ہم بہت مجبور ہیں۔ ہم سے وہ شے طلب نہ کرنا جو ہمارے دستِ قدرت سے باہر ہو..... ہم نے سب کچھ برداشت کر لیا لیکن شرم و ندامت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔"

"شاہِ والا مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کریں۔ یہاں تک کہ اس خادم کو موت آ جائے۔" سکندر مرزا زار و قطار رو رہا تھا۔ "اور پھر کہنے والے کہیں گے کہ کیسا غلام تھا جو مرنے کے بعد ہی اپنے آقا سے جدا ہوا۔"

سکندر مرزا کا لہجہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ شاہ جہاں کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔

"میں تمہیں اپنے آپ سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ یہ سنگین خود غرضی ہو گی۔ اہلِ دنیا کیا کہیں گے کہ اپنے زنداں کی تنہائی دور کرنے کے لئے دوستوں کے گھروں کو ماتم کدہ بنا دیا۔ ابھی وقت ہے سکندر مرزا! میں اورنگ زیب سے تم لوگوں کی بہتر زندگی مانگ لوں گا۔ اگر میں مر گیا تو پھر اس خرابے میں تمہارا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔"

"ہمیں وہ زندگی درکار نہیں جسے مانگنے کے لئے ہمارے شاہ کو دستِ سوال دراز کرنا پڑے۔" سکندر مرزا نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ ہمیں موت آ جائے۔ نہیں شاہِ والا! آپ کے غلاموں کو یہ منظور نہیں۔ آج تک جن ہاتھوں نے لوگوں کے خالی دامن بھرے ہیں، ان ہاتھوں کو ہم کسی کے سامنے پھیلا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔"

شاہ جہاں نے ایک نظر سکندر مرزا کی طرف دیکھا۔

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی کہ تم اپنے مجبور دوست کو کسی کے سامنے رسوا نہیں ہونے دو گے۔ سکندر مرزا! میں تمہاری دوستی پر ناز کرتا ہوں۔"

"ماہ رخ! میں تمہاری طرف سے بہت پریشان رہتا ہوں۔" اچانک شاہ جہاں نے ممتاز محل کی کنیز کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم نے اپنی زندگی کے چاروں طرف جس قدر سنگین پہرے بٹھائے ہیں، انہیں توڑنے کا حکم کس طرح دوں؟"

"شاہِ والا نے مجھ پر بے شمار کرم کئے ہیں۔" ماہ رخ کا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔ "بس آخری عنایت اور کہ ہم غلاموں کو اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے۔"

"تم کیسے عجیب لوگ ہو کہ دنیا بھر کی اذیت برداشت کر کے بھی میرے قدموں سے لپٹے

رہنا چاہتے ہو..... مگر وہ کہاں گئے جو اطاعت و فرمانبرداری کی قسمیں کھاتے تھے۔ وہ تو آزاد بھی ہیں اور مختار بھی..... پھر وہ کیوں نہیں آتے؟ ان پر فرض تھا کہ وہ میرے حضور میں اپنی گردنیں جھکائے رکھیں۔'' شاہ جہاں اپنے بیٹوں مراد، شجاع، دارا اور اورنگ زیب کو یاد کر رہا تھا۔

''بابا حضور! اب وہ نہیں آئیں گے۔'' جہاں آراء نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا اور ''ثمن برج'' کی فضا گہری اُداسیوں میں ڈوب گئی۔

شاہ جہاں ایک بار پھر ممتاز محل کی قبر کو دیکھنے لگا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی صاف نمایاں تھی۔

۞.....۞.....۞

شہزادہ داراشکوہ مسلسل بھاگ رہا تھا۔ اورنگ زیب کی فوجیں اُس کا تعاقب کر رہی تھیں اور وہ کسی مستقل پناہ گاہ کی تلاش میں تھا۔ پہلے داراشکوہ دہلی سے لاہور پہنچا۔ مگر جب اس علاقے میں اسے اماں نہ مل سکی تو وہ گجرات کی طرف فرار ہو گیا۔ احمد آباد کے گورنر نے اُسے دس لاکھ روپے کی رقم دی۔ اس رقم سے داراشکوہ نے بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج تیار کر کے ایک بار پھر قسمت آزمانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر راجہ جسونت سنگھ نے بھی دارا کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

جب اورنگ زیب کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے بڑے سخت الفاظ میں راجپوت حاکم کو ایک خط تحریر کیا۔

''جسونت سنگھ! ہوش و حواس سے کام لے۔ میں بہت جلد دارا پر قابو حاصل کر لوں گا۔ پھر ہندوستان کے کسی گوشۂ زمین میں تیرے سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ اس سے پہلے کہ تجھ پر زمین تنگ ہو جائے، اپنے انجام کی فکر کر۔ میں تجھے آخری موقع دیتا ہوں۔''

اورنگ زیب کے تحریر کردہ الفاظ میں اس قدر جلال تھا کہ راجہ جسونت سنگھ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے وقت ضائع کئے بغیر داراشکوہ کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیا اور راجہ جے سنگھ کے ذریعے اپنی غلطی کی معافی طلب کی۔ اورنگ زیب نے راجہ جسونت سنگھ کو معاف کرتے ہوئے اس کا منصب بھی بحال کر دیا۔

اس دوران ''ڈیوڑھی'' کے مقام پر داراشکوہ اور اورنگ زیب کی فوجوں میں معمولی سا تصادم ہوا۔ دارا کے سپاہی اورنگ زیب کی یلغار کو نہ روک سکے۔ جس کے نتیجے میں ایک بار پھر دارا کو فرار ہو جانا پڑا۔ وہ بھاگ کر گجرات پہنچا مگر وہاں بھی اسے چین نہ مل سکا۔ مجبوراً ایک بار پھر دارا نے احمد آباد کا رخ کیا۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ وہاں کے گورنر نے اسے شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔

بدقسمتی نے ابھی تک داراشکوہ کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ بہت دن تک خانہ بدوشوں کی طرح دربدر پھرتا رہا۔ کئی ماہ تک بے یار و مددگار بھٹکنے کے بعد وہ ''دادر'' کے علاقے میں پہنچا۔ یہاں کے مقامی زمیندار ملک جیون سے اسے بڑی توقعات تھیں۔ داراشکوہ نے ایک بار ملک جیون کو شاہ جہاں کے عتاب سے بچایا تھا۔ اسی باعث دارا سمجھتا تھا کہ ملک جیون احسان مندی کے طور پر نہ صرف اسے پناہ دیدے گا بلکہ پُرجوش انداز میں خاطر مدارات بھی کرے گا۔

ملک جیون نے دارا کو دیکھ کر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔

''آیئے شہزادہ معظم! آپ کو خوش آمدید کہنے کے لئے میری آنکھیں فرشِ راہ ہیں۔ میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوں کہ آپ نے مجھے میزبانی کی سعادت بخشی۔''

''ہمیں تم سے یہی توقع تھی ملک جیون! کہ تم ہمیں مایوس نہیں کرو گے۔'' داراشکوہ نے چین کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

مگر داراشکوہ کی بیوی نادرہ بیگم اپنے شوہر کے فیصلے سے متفق نہیں تھی۔ اس نے رات کی تنہائی ملتے ہی داراشکوہ سے کہا۔

''ابھی وقت ہے، یہاں سے نکل چلئے۔ اگر ہم نے یہ لمحات گنوا دیئے تو ساری زندگی کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔''

داراشکوہ نے سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ نادرہ بیگم کی باتوں کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا۔

''میری آنکھوں نے ملک جیون کے چہرے پر لکھی ہوئی منافقت کی تحریر پڑھ لی ہے۔'' نادرہ بیگم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ کسی زاویے سے بھی وفادار نظر نہیں آتا۔''

داراشکوہ نے بیوی کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

''تم ایک خانہ نشین عورت ہو نادرہ بیگم ہم نے تمام عمر حکومت کی ہے اور ہماری آنکھیں گہرائیوں کی انتہا تک دیکھنے کی عادی ہیں۔ ہمیں اپنی بصارت اور بصیرت دونوں پر یقین ہے۔ ملک جیون ہم سے غداری نہیں کر سکتا۔ مسلسل گردشوں نے تمہیں ذہنی طور پر پریشان کر دیا ہے۔ اس لئے تم اپنے جاں نثاروں پر بھی شک کرنے لگی ہو۔''

نادرہ بیگم آخری وقت تک شوہر سے التجائیں کرتی رہی کہ وہ ملک جیون پر اعتبار نہ کرے مگر داراشکوہ نے اس کی کسی دلیل کو تسلیم نہیں کیا۔

اور پھر رات کے اندھیروں میں داراشکوہ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

ملک جیون نے مغل شہزادے کے گرد بھی ریاکاری کے ساتھ وفاداری کا جال بچھایا تھا۔ پھر جب داراشکوہ اپنے گرد و پیش سے غافل ہو گیا تو ملک جیون نے بڑی احتیاط سے جال کے تمام پھندے اس طرح کس دیئے کہ دارا اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکا۔ راتوں رات اورنگ زیب کے سپاہیوں کا ایک دستہ ملک جیون کی حویلی پہنچ چکا تھا۔

صبح جب داراشکوہ نیند سے بیدار ہوا تو وہ محض ایک قیدی تھا۔ مجبور اور بے بس قیدی۔ بدبختیوں کا ماتم کرتا ہوا قیدی۔

23 اگست 1659ء کو داراشکوہ اور اس کا بیٹا سفیر شکوہ گرفتار کر کے دہلی کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔

داراشکوہ کی بیوی نادرہ بیگم اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور شکست و رسوائی کے سفر کے دوران ہی انتقال کر گئی۔

مرنے سے پہلے نادرہ بیگم نے وصیت کی تھی کہ اسے لاہور میں دفن کیا جائے۔ جب تاج و تخت کے وارث کی بیوی کو قبر میں اُتارا گیا تو نہ اس کا شوہر قریب تھا اور نہ بچے۔ بس حکومت کے چند نمائندے تھے، جن کی نگرانی میں نادرہ بیگم کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

❀.....❀.....❀

داراشکوہ کو اورنگ زیب کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے دہلی کی گلیوں میں پھرایا گیا۔

بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ شاہ جہاں کا محبوب فرزند ایک خارش زدہ اور بدصورت ہاتھی پر سوار تھا۔ کہاں وہ جاہ و جلال کہ ان ہی گلیوں میں رہنے والے لوگ، دارا کو دیکھ کر دست بستہ ہو جاتے تھے اور رعبِ شاہی سے ان کی سانسیں رکنے لگتی تھیں۔ اور کہاں یہ انتہائے زوال کہ اسی دہلی کے باشندے آج اپنے حکمراں کی شکست کے تماشائی تھے۔

دارا نے کئی بار اپنی مجبور رعایا کی طرف دیکھا اور گردن جھکا لی۔ تماشائیوں کی اکثریت اپنے فرمانروا کی شکست پر اشک بار نظر آ رہی تھی۔ دہلی کی گلیوں میں ایک شور سا برپا تھا۔ اورنگ زیب کی ناراضگی سے بے نیاز ہو کر بہت سے مرد، عورتیں اور بچے چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ یہ دارا کی تباہی کا مرثیہ تھا، جو سسکیوں اور آہوں کے درمیان پڑھا جا رہا تھا۔

ملک جیون، دارا کے ساتھ ساتھ ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ شاہراہ کے دونوں طرف کھڑے ہوئے لوگ با آواز بلند ملک جیون پر لعنت بھیج رہے تھے۔

''نمک حرام، بے وفا، منافق، احسان فراموش۔''

لوگ مہذب الفاظ میں اسے گالیاں دے رہے تھے۔ مگر ملک جیون مطمئن تھا کہ اسے اورنگ زیب کے سائے میں پناہ مل گئی تھی۔ اس کی غداری شہنشاہِ وقت کی نظروں میں ایک کارنامہ قرار پائی تھی۔ پھر وہ رعایا کی گالیوں سے کس طرح متاثر ہوتا؟

چند فقیروں اور غریبوں نے جوشِ جذبات میں ملک جیون پر پتھر بھی برسائے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی شمشیر بے نیام کر کے ملک جیون کا کام تمام کر دیتا۔ جن غریبوں اور محتاجوں کے ہاتھوں میں پتھر تھے، ان ہاتھوں کو شاہی کارندوں نے توڑ دیا۔ طاقت کا استعمال ہوا تو ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔

دارا کی شکست و رسوائی کے اس جلوس کو دہلی کی ایک ایک گلی میں پھرایا گیا۔ پھر جب شاہ جہاں کا محبوب فرزند، قلعے کے سامنے پہنچا تو ایک گداگر نے چلا کر کہا۔

''شہزادے! جب تم معتوب نہ تھے تو تم نے ہمیشہ مجھے خیرات دی۔ لیکن آج میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس مجھے دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔''

داراشکوہ نے یہ آواز سن کر اس فقیر کی جانب دیکھا۔ موت کے منہ میں پہنچ جانے کے بعد بھی دارا کا انداز بڑا شاہانہ تھا۔ اس نے گہرے سیاہ رنگ کا اپنا قیمتی دوشالہ اُتارا اور گداگر کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

''بے شک! ہمارا سب کچھ چھین لیا گیا۔ مگر ہم آج بھی تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔''

داراشکوہ نے سرِ عام اپنی بخشش و عطا کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ مگر وہ دوشالہ اس سوالی فقیر تک نہ پہنچ سکا۔ اورنگ زیب کے ایک سپہ سالار، بہادر خان نے وہ دوشالہ ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں ایک قیدی کو کسی چیز کے دینے کا حق نہیں تھا۔

❀.....❀.....❀

دارا کی سزا کے معاملے میں امراء کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔

ایک با اثر امیر دانشمند خان اُس کی جاں بخشی کے حق میں تھا۔ مگر بعض خوشامدی اور زمانہ ساز علماء داراشکوہ کو کافر قرار دے رہے تھے۔

''اگر اس شخص کو معاف کر دیا گیا تو ہندوستان میں شدید گمراہی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔'' ایک درباری عالم نے اورنگ زیب کے سامنے دارا کے قتل کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ مذہب اسلام کا باغی ہے۔ اور ایک باغی کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔'' دوسرے عالم نے فتویٰ دیتے ہوئے کہا۔

اورنگ زیب تمام سیاسی مشیروں اور مذہبی عالموں کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ پہلے ہی دارا سے مستقل نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

بالآخر اس نے اپنے سب سے بڑے حریف کے قتل نامے پر دستخط کر دیئے۔ سیاسی اعتبار سے دارا کا زندہ رہنا اورنگ زیب کے لئے خطرناک ثابت ہوتا۔ اور سیاست میں خطروں کی پرورش کرنا انتہائی حماقت کی دلیل ہوتی ہے۔ شاید اورنگ زیب، دارا کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیتا۔ مگر وہ دارا کی فطرت سے واقف تھا۔ اگر دارا کو اورنگ زیب پر غلبہ حاصل ہو جاتا تو وہ مقدمے کی سماعت کئے بغیر اپنے بھائی کے قتل کا حکم جاری کر دیتا۔ اورنگ زیب کئی ماہ تک غور و فکر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا۔

وہ ایک سیاہ رات تھی، جب دارا کی زندگی کا چراغ بجھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ نذر نامی ایک غلام کو حکم دیا گیا کہ وہ ایک ہی وار میں داراشکوہ کا سر اس کے تن سے جدا کر دے۔

جب شاہی غلام نذر نے دارا کو اس کے بیٹے سفیر شکوہ سے الگ کیا تو دونوں بغل گیر ہوئے اور زار و قطار رونے لگے۔ دارا اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا۔ اس نے اپنے سرہانے چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی چھری نکالی اور شاہی غلام پر حملہ کر دیا۔ مگر دارا کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ نذر ایک طاقتور جلاد تھا۔ اس نے چند لمحوں میں دارا کو بے دست و پا کر دیا اور مغل شہزادے کو دوسری کوٹھری میں لے گیا۔

پھر جب نذر نے دارا کی آنکھوں پر رومال باندھا تو قتل گاہ میں ایک عجیب سا شور سنائی دینے لگا۔ یہ مجذوب سرمد کے الفاظ کا شور تھا۔

''اگر تخت پر نہیں بیٹھتا تو پھر قتل ہو جا۔''

آج دارا کو احساس ہوا کہ وہ دیوانہ کیسی ہوش کی باتیں کرتا تھا۔ دارا لرز کر رہ گیا۔ مگر وقت بہت آگے جا چکا تھا۔ دارا کچھ دیر تک اپنی تباہیوں کا نوحہ پڑھتا رہا۔ پھر اس نے جلاد کے سامنے سر جھکا دیا۔ شاہی غلام نذر کی تلوار فضا میں بلند ہوئی اور پھر ایک دردناک چیخ اُبھری۔ یہ دارا شکوہ کی چیخ تھی جسے چند سرکاری کارندوں کے سوا سننے والا کوئی نہیں تھا۔ انسانی زندگی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ اور حرص و ہوس کا وہ سلسلہ بھی، جو آخری سانس تک ختم نہیں ہوتا۔

دارا نے عمر بھر اورنگ زیب کو حقیر سمجھا، اس کے خلاف باپ کو ورغلایا، اسے ماں کی محبتوں کے سائے سے محروم کیا، اس کی جاگیریں ضبط کیں، اس کے ساتھ ایک انتہائی ذلت آمیز سیاسی کھیل کھیلا۔ مگر قسمت نے دارا کے ساتھ جو مذاق کیا، وہ لرزہ خیز بھی تھا اور عبرت ناک بھی۔ دارا کسی کی شرکت کے بغیر تختِ طاؤس پر بیٹھنا چاہتا تھا مگر اس کی تقدیر میں خونیں قبر لکھ دی گئی تھی۔

قتل کے بعد بڑی خاموشی سے دارا کو ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔

۞.....۞.....۞

جس رات دارا شکوہ کو قتل کیا گیا، اسی رات شاہ جہاں نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔ خواب اس قدر دہشت خیز تھا کہ گھبرا کر شاہ جہاں کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا نحیف و ناتواں جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ بزرگ سید محمد اس وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ ان کی نظر شاہ جہاں پر پڑی تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر آئے اور شہنشاہ کی مزاج پرسی کرنے لگے۔

''سید صاحب! میں تو ٹھیک ہوں مگر میں نے ابھی ایک عجیب سا خواب دیکھا ہے۔'' شاہ جہاں کی آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ ''کچھ سپاہی مجھے پکڑ کر ایک سنسان جگہ لے گئے ہیں۔ پہلے انہوں نے میرا بایاں ہاتھ کاٹا اور پھر کچھ دیر بعد دایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا۔ آخر یہ کیسا خواب ہے اور اس کی تعبیر کیا ہے؟''

سید محمد گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ شاہ جہاں کے خواب کی تعبیر سمجھتے تھے مگر انہوں نے یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا۔

''اقتدار سے محرومی اور قید و بند کی سختیوں کے سبب شاہِ والا کا ذہن منتشر ہو گیا ہے۔ نماز میں دل لگانے کی کوشش کیجئے۔ یہی انسان کے وحشت و اضطراب اور محرومیوں کا حل ہے۔''

شاہ جہاں خاموش ہو گیا۔ مگر ساری رات جاگتا رہا۔ بظاہر وہ سید محمد کی بیان کردہ تعبیر سے مطمئن ہو گیا تھا مگر دلی طور پر اب بھی بہت زیادہ پریشان نظر آتا تھا۔ وہ مسلح پہرے داروں سے بار بار پوچھتا کہ میرے بیٹے کس حال میں ہیں؟ مراد اور شجاع اس وقت کہاں ہیں؟ اور دارا کیا کر رہا ہے؟ پہرے دار خاموش رہتے۔ وہ کیا بتاتے کہ سیاست کی اس خونریز جنگ میں کس پر کیا گزری ہے۔

شاہ جہاں نے اپنے پوتے شہزادہ محمد سے ملاقات کی درخواست کی۔ اورنگ زیب کا بیٹا ادب و احترام کے ساتھ دادا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ جہاں نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔

''دارا، مراد اور شجاع کہاں ہیں؟''

اس دوران شہزادہ محمد تک دارا اور سفیر شکوہ کے قتل کی خبریں پہنچ چکی تھیں۔ مراد اور شجاع کا انجام اسے پہلے ہی معلوم تھا۔ مگر شہزادہ محمد نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''اعلیٰ حضرت! میں کچھ نہیں جانتا۔ باہر کیا ہو رہا ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ میں بھی آپ کی طرح آگرے کے قلعے تک محدود ہو کر رہ گیا ہوں۔''

شاہ جہاں، شہزادہ محمد کے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ پھر ایک دن اس نے شہزادہ محمد کے مصاحبِ خاص کامران بیگ سے وہی سوال کیا۔

کامران بیگ ایک مردم آزار انسان تھا اور شاہ جہاں کی طرف سے اپنے دل میں ایک خاص پرخاش رکھتا تھا۔ اکثر اوقات وہ شاہ جہاں سے توہین آمیز سلوک کرتا تھا۔ جب معزول شہنشاہ نے اپنے بیٹوں کے بارے میں کامران بیگ سے سوال کیا تو وہ تند مزاج انسان بھڑک اُٹھا۔

''جانے والے بہت دُور جا چکے۔ اب آپ کس کو یاد کر رہے ہیں؟''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو کامران بیگ؟'' شاہ جہاں نے گھبرا کر پوچھا۔

''شہزادہ محمد وضع داری سے کام لے کر حقیقت کو چھپا رہے ہیں۔'' کامران بیگ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''شہزادہ شجاع، حضرت شہنشاہ اورنگ زیب کے جاہ و جلال کی تاب نہ لا سکا اور میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا اور کوئی کہتا ہے کہ مگھ قبیلے کے لوگوں نے اسے ہلاک کر دیا۔ شہزادہ مراد زنداں کے اندھیروں میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے، عنقریب وہ بھی کشمکشِ زیست سے نجات حاصل کر لے گا۔''

اپنے دو بیٹوں کا انجام سن کر شاہ جہاں کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئی تھیں۔

''اور میرا دارا کہاں ہے؟'' شاہ جہاں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تیرے حضرت

شہنشاہ نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"دارا کو وہی سزا دی گئی جو ایک باغی کا مقدر ہوتی ہے۔" کامران بیگ انتہائی سفاک لہجے میں بول رہا تھا۔ "وہ جنت آشیانی (ہمایوں) کے مقبرے میں گہری نیند سو رہا ہے کہ اب اسے کوئی نہیں جگا سکتا۔ حضرت شہنشاہ کی شمشیرِ آب دار نے اس کے سر سے تاج و تخت کا خمار اُتار دیا۔ اب دو گز زمین ہی اس کی پناہ گاہ ہے۔"

"ستم گرو!..... جفا کارو!..... تاج و تخت کے وارث کو پہلے باغی قرار دیتے ہو اور پھر اس کی شہ رگ پر جور و ستم کی تلوار کھینچتے ہو۔ تمہارا یہ کیسا قانون ہے اور کیسا انصاف ہے؟..... اورنگ زیب! تُو نے یہ کیا کیا؟..... میرے محبوب کو تُو نے زیرِ زمین سلا دیا اور بدنصیب باپ کو اس کے آخری دیدار سے بھی محروم رکھا..... اے خدا! میں تیرے قہر سے پناہ مانگتا ہوں۔ اپنے حقیر و ناتواں بندے پر رحم کر!" شدتِ غم سے شاہ جہاں بے ہوش ہو گیا۔

شہزادہ محمد کے حکم پر شاہی طبیبوں نے شاہ جہاں کو تیز اثر دوائیں دیں تا کہ وہ ہوش میں آ سکے۔

چند گھنٹوں کے بعد جب شاہ جہاں ہوش میں آیا اور اس نے اپنے چاروں طرف طبیبوں کی ایک جماعت کو کھڑے دیکھا تو صبر و ضبط کھو بیٹھا۔

"تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ بیٹے کو قتل کرتے ہو اور باپ کو زندہ رکھنے کے لئے مسیحائی کا جامہ پہن لیتے ہو۔ کیسے منافق و ریاکار ہو۔ میری نظروں کے سامنے سے دُور ہو جاؤ۔ اورنگ زیب سے کہو کہ اگر وہ بھیج سکتا ہے تو میرے لئے دنیا کا سب سے تیز اثر زہر بھیج دے۔" شاہ جہاں انتہائی غم زدہ ہونے کے باوجود قہر ناک لہجے میں بول رہا تھا۔ "وہ چاہتا تو اپنے بھائی کو زندہ بھی رکھ سکتا تھا۔ دارا کے گلے پر خنجر آزمائی کرنے سے پہلے ایک بدنصیب باپ کے جذبات کا ہی خیال رکھ لیا ہوتا۔ مگر اس سیاست کے مذہب میں کون باپ ہے اور کون بیٹا؟ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اقتدار کے مذبح خانے میں انسانی گردنیں ہی کاٹی جاتی ہیں۔ رشتوں کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اے زمانے! تجھ پر افسوس ہے۔"

شاہی طبیب سر جھکائے چلے گئے۔ پھر شاہ جہاں نے سید محمد، سکندر مرزا اور ماہ رخ کو بھی باہر چلے جانے کے لئے کہا۔ جب شہزادی جہاں آرا تنہا رہ گئی تو شاہ جہاں، بیٹی کو گلے لگا کر بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر بیوی کی قبر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ممتاز! تمہارے بیٹے بھی تم سے آ ملے۔ بس ایک میں ہی بدنصیب ہوں کہ ابھی تک تم سے دُور ہوں۔ کاش! یہ وفا ناآشنا لوگ میرے جذبات کو سمجھیں اور کچھ دیر کے لئے ان زنجیروں کو کاٹ دیں۔"

دونوں باپ بیٹی بہت دیر تک گریہ و زاری کرتے رہے اور ثمن برج کی فضا آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

سید محمد، سکندر مرزا اور ماہ رخ، شہنشاہ کو تسلی دیتے رہے مگر شاہ جہاں کے آنسوؤں کا سیلاب نہیں رکا۔

"تمہارے اظہارِ تعزیت کا شکریہ۔ مگر تمہارا کوئی لفظ میرے درد کا درماں نہیں ہو سکتا۔" شاہ جہاں اپنے غم گساروں کو جواب دیتا۔ "تم نہیں جانتے کہ دارا کون تھا؟ اور مجھ سے اس کا کیا رشتہ تھا؟..... وہ میرا بیٹا نہیں، محبوب تھا۔ اور ان ستم گروں نے کیسے محبوب کو زیرِ خاک سلا دیا۔"

سید محمد، سکندر مرزا اور ماہ رخ نے اپنے اپنے سر جھکا لئے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ الفاظ کا بڑے سے بڑا ذخیرہ بھی شہنشاہ کے زخموں کا مرہم نہیں بن سکتا۔ دارا کی موت نے شاہ جہاں سے اس کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔

ایک دن شاہ جہاں نے اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ محمد سے درخواست کی۔

"اگر تم مجھے ایک عام انسان کی طرح تاج محل تک جانے کی اجازت نہیں دے سکتے تو پھر کچھ دیر کے لئے زنجیریں پہنا کر ہی لے چلو۔ میں ایک ماں کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ اس کے تین بیٹے اس دنیا میں نہیں رہے۔ اور تینوں بیٹوں کا قاتل اسی کا ایک بیٹا ہے۔ میں ممتاز کو اورنگ زیب کی محبت و وفاداری کی یہ ہوشربا داستان سنانا چاہتا ہوں کہ اس کا یہ جانباز بیٹا اپنے خونی رشتوں کے حق میں کتنا مہربان ہے۔"

شہزادہ محمد انتہائی شرمندگی کے باعث زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا اور دادا کو کوئی جواب دیئے بغیر واپس چلا گیا۔

❀.....❀.....❀

دارا شکوہ کا بڑا بیٹا سلیمان شکوہ ابھی تک آزاد تھا۔ دارا سے نجات حاصل کرنے کے بعد اورنگ زیب، سلیمان شکوہ کی طرف متوجہ ہوا۔ سلیمان اس وقت تک ہندو راجہ کی پناہ میں تھا۔ اورنگ زیب نے ایک فرمانِ شاہی کے ذریعے راجہ کو تنبیہہ کی کہ وہ معتوب شہزادے کو حکومت کے حوالے کر دے ورنہ اسے برے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ راجہ نے انکار کر دیا۔ مگر اس کا بیٹا اس نافرمانی کا انجام جانتا تھا۔ نتیجتاً اس نے سلیمان شکوہ کو مغل سپاہیوں کے سپرد کر دیا۔ سلیمان شکوہ نے لداخ کی طرف فرار ہونے کی کوشش کی لیکن 16 جنوری 1661ء کو اسے گرفتار کر کے سلیم گڑھ کے قلعے میں پہنچا دیا گیا۔

جے سنگھ کا لڑکا، رانا سنگھ اسے گرفتار کر کے دربارِ شاہی میں لایا۔ جب سلیمان شکوہ کو زنجیریں پہنا کر اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے درباری آداب کے مطابق اپنے حقیقی چچا کو سلام پیش کیا۔ پھر سلیمان کے ہونٹوں سے ایک آہِ سرد نکل گئی۔

"عمِ محترم! میں اپنے انجام کو پہنچ چکا۔" سلیمان شکوہ ایک فریادی کے لہجے میں بول رہا تھا مگر اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار نمایاں نہیں تھے۔ "میں جانتا ہوں کہ میرا انجام

موت کے سوا کچھ نہیں لیکن پھر بھی درخواست گزار ہوں کہ مجھے زہر دے کر آہستہ آہستہ ہلاک کرنے کے بجائے تلوار کے ایک ہی وار سے قتل کر دیا جائے۔"

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اور پھر سلیمان شکوہ کو گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا گیا جہاں مئی 1662ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ حکومت کے بعض رازداں کہتے ہیں کہ سلیمان شکوہ کو وہ زہر دیا گیا تھا، جو انسانی جسم پر آہستہ آہستہ اثر کرتا ہے۔

❀.....❀.....❀

شاہ جہاں کی بے چینیاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔ وہ ممتاز محل کی قبر کی طرف دیکھ دیکھ کر مسلسل روتا رہتا تھا۔

"ممتاز! یہ بدنصیب بوڑھا کس کس کا ماتم کرے؟..... تمہیں یاد کروں یا ان بچوں کو جو اس بے کسی کی حالت میں اپنے باپ سے بچھڑ گئے؟"

شاہ جہاں آٹھ سال تک آگرہ کے قلعے میں قید رہا۔ تاج محل کو دیکھتے دیکھتے اُس کی بینائی کمزور ہو چکی تھی۔

پھر جب تمام منظر دھندلے ہو گئے تو شاہ جہاں نے شہزادہ محمد سے درخواست کی کہ وہ "ثمن برج" میں ایک شیشہ لگوا دے۔ شہنشاہ کی یہ التجا سن لی گئی۔ پھر وہ اس شیشے کی مدد سے اپنی محبوب ملکہ کے مرقد کی جانب دیکھتا رہا۔

اس طرح کئی سال اور گزر گئے۔ سنگِ مرمر کا عکس شیشے پر پڑتا رہا۔ یہاں تک کہ شاہ جہاں کی آنکھوں کا رنگ بھی سفید نظر آنے لگا۔ شہنشاہ کے اس عمل سے اس کی بینائی بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ سید محمد نے شاہ جہاں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ہمہ وقت تاج محل کو نہ دیکھا کرے ورنہ شہنشاہ کی بینائی مکمل طور پر زائل ہو سکتی ہے۔

"اگر تاج محل کو بھی نہ دیکھوں تو پھر کسے دیکھوں؟" شاہ جہاں نے انتہائی شکستہ لہجے میں کہا۔ "اب اس دنیا میں دیکھنے کے لئے کوئی شے باقی نہیں رہی۔"

اور پھر ایک دن سارے منظر دُھندلے ہو گئے۔ اب شاہ جہاں کو شیشے کی مدد سے بھی ممتاز محل کی قبر نظر نہیں آتی تھی۔

شہنشاہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اور بیمار پڑ گیا۔ شہزادہ محمد نے شاہ جہاں کو قلعہ کے پُرفضا مقام پر لے جانا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ اب بھی ثمن برج میں مقیم تھا اور بجھتی ہوئی آنکھوں سے ممتاز کے مرقد کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔

شاہی طبیب سخت نگہداشت کر رہے تھے مگر شاہ جہاں کی طبیعت روز بہ روز بگڑتی جا رہی تھی۔

پھر کتابِ زیست کا آخری باب لکھا جانے لگا۔

شاہ جہاں نے مرنے سے ایک دن پہلے خواہش ظاہر کی کہ وہ آخری بار اپنے اقتدار کی نشانیوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔

شہزادہ محمد کو شاہ جہاں کی اس خواہش پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ پھر وہ نحیف و نزار بوڑھا ایک پالکی میں سوار ہو کر ثمن برج سے نکلا۔ جہاں آراء، باپ کو سہارا دیئے ہوئے تھی۔ شاہ جہاں کی سواری "دیوانِ خاص" سے گزری۔ اُس نے دُھندلی آنکھوں سے دیکھا۔ کوئی نقش واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ "دیوانِ خاص" وہ جگہ تھی جہاں شہنشاہ دو گھنٹے تک ان معاملات کے فیصلے کرتا جو کسی سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر علی الاعلان نہیں کئے جا سکتے تھے۔

"الفراق اے میرے اقتدار کی بارگاہ!" شاہ جہاں نے دیوانِ خاص سے گزرتے ہوئے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا۔

پھر شاہ جہاں کی پالکی "شاہ برج" پہنچی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں انتہائی راز کی گفتگو ہوتی تھی۔ شاہ برج میں شہزادوں اور چند معتمد افسروں کے علاوہ کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

"اے شاہ برج کی دیوارو! تم خوب جانتی ہو کہ اب موت کے سوا میرا کوئی رازدار نہیں۔" شاہ برج سے گزرتے ہوئے شاہ جہاں نے بڑے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

شاہ برج کے بعد شاہ جہاں کی پالکی "دیوانِ عام" میں پہنچی۔ یہاں اکثر شاہ جہاں نمازِ عصر کی جماعت میں شرکت کرتا تھا۔ شام کے وقت تمام انتظامی معاملات سرانجام دیتا۔ اس کے بعد گانا سنتا یا ہرنوں کی لڑائی دیکھتا۔ اس وقت دیوانِ عام کے در و دیوار پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ کل یہاں وہی ہنگامے ہوں گے، اے منقش محرابو! اے مرصع دیوارو! کل تم کسی اور کے احترام میں سجدہ ریز ہو جاؤ گے۔ یہی اس دنیا کا دستور ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تم اپنے نئے حکمراں کے استقبال کی تیاریاں کرو۔"

شاہ جہاں کی گفتگو اس قدر جانگداز تھی کہ جہاں آراء ہچکیوں سے رونے لگی۔

"نہیں بیٹی!" شاہ جہاں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ جہاں آراء کے سر پر رکھ دیا۔ "اس طرح تو تمہارا باپ سکون سے مر بھی نہیں سکے گا۔ صبر کرو۔ تم تو بہت جانباز خاتون ہو۔ عظیم مغلوں کی عظیم وارث۔"

جہاں آراء کی ہچکیاں بند ہو گئیں۔ آنسو بہتے رہے۔

دیوانِ عام سے گزر کر شاہ جہاں کی پالکی "دربارِ عدالت" میں پہنچی۔ یہاں شہنشاہ عام مقدمات کے فیصلے کرتا تھا۔ جمعہ کے دن عدالت بند رہتی تھی۔ یہاں پہنچ کر شاہ جہاں نے دھندلی آنکھوں سے اس کرسی کی طرف دیکھا جس پر بیٹھ کر وہ فیصلے کیا کرتا تھا۔

"کیا عجیب وقت ہے کہ آج میں خود یہاں ایک مجرم کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میرا فیصلہ ہو چکا اور زمانے کے منصف نے مجھے زنجیریں پہنا دیں۔"

یہ کہہ کر شاہ جہاں نے پالکی برداروں کو حکم دیا۔

''اس قیدی کو واپس لے جاؤ۔''

پالکی کا رخ ثمن برج کی طرف پھیر دیا گیا۔

''اے میرے گم شدہ جاہ و جلال! تجھے کہاں ڈھونڈوں؟'' شاہ جہاں کے لہجے میں شدید اذیت و کرب شامل تھا۔ ''اے میرے برباد شدہ اقتدار! میں تجھے کہاں تلاش کروں؟..... تم سب بے وفا ہو۔ میں جا رہا ہوں اس پیکرِ مہر و وفا کے پاس، جس پر رسمِ وفاداری ختم ہے۔''

پھر اسی رات 74 سال کی عمر میں شاہ جہاں کا انتقال ہو گیا۔

آخری ہچکی لیتے وقت بھی اس کا چہرہ، ممتاز محل کی قبر کی طرف تھا۔

شاہ جہاں کا جنازہ ''سلمان برج'' کے نیچے ایک خفیہ دروازے سے تاج محل لے جایا گیا۔ مغل شہنشاہ کے جنازے میں کوئی امیر و وزیر شریک نہیں تھا۔

شاہ جہاں کو اُس کی وصیت کے مطابق ممتاز محل کے قریب دفن کر دیا گیا۔

اورنگ زیب، باپ کے انتقال کے ایک ماہ بعد دہلی سے آگرہ پہنچا۔

بڑی عجیب بات ہے کہ جس طرح جہانگیر کے انتقال کے وقت کوئی بیٹا اس کے قریب نہیں تھا، اسی طرح شاہ جہاں کے جنازے میں بھی اس کا کوئی بیٹا شریک نہیں ہوا تھا۔

شاہ جہاں کے انتقال کی خبر سن کر کئی ماہ تک ہر گھر سے رونے کی آوازیں آتی رہیں۔

پھر وقت کی ہنگامہ آرائیوں میں لوگ سب کچھ بھول گئے۔ مگر ایک بوڑھا مرد اور ایک بوڑھی عورت اپنے آقا کو فراموش نہ کر سکے۔ وہ ہر جمعرات کو شاہ جہاں اور ممتاز محل کی قبروں پر آتے اور گریہ وزاری کرتے رہتے۔ بڑے بڑے سخت موسم آئے مگر ان دونوں بوڑھوں نے شہنشاہ اور ملکہ کے مزارات پر آنا نہیں چھوڑا۔ انہوں نے اورنگ زیب سے اس کے رحم کی یہی بھیک مانگی تھی کہ ان پر تاج محل کے دروازے بند نہ کیے جائیں۔

ان دونوں بوڑھوں میں ایک شاہ جہاں کے بچپن کا دوست سکندر مرزا تھا اور دوسری ممتاز محل کی کنیز، ماہ رخ۔

(تمت بالخیر)